The Drinched Book

text fiy book

text cut book only

The ZAMANA, January. 1940. REGD. No A.147

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے۔

جلد [illegible] | جنوری ۱۹۴۰ء | نمبر ۱

فہرست

تصویر: شطرنج (رنگین)

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ پانچ روپیہ — ممالکِ غیر سے آٹھ روپیہ

نمونہ سات آنہ

حضرت پریم چند مرحوم

کے نقالوں اور جانشینوں کی کمی نہیں ہے

لیکن اگر آپ مرحوم کے کمال کا صحیح نمونہ دیکھنا چاہیں تو ان کے افسانوں کے بعد

(۱) پھانسی اور دوسرے افسانے

(۲) بڑا گھر اور دوسرے افسانے

مصنفہ بیتاب بریلوی

ضرور ملاحظہ فرمائیے

ان دونوں مجموعوں میں بالترتیب نو نو افسانے شائع کئے جانے کا اہتمام ہو رہا ہے، اور ان کا ہر افسانہ دنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے ہندوستان کے تمام اہل الرائے نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ منشی جی کے بعد یہ افسانے پلاٹ، زبان و بیان، فراوانی جذبات، ندرت تخیل اور رنگینی کے اعتبار سے بہترین ہیں۔ خود منشی صاحب مرحوم نے اپنی حیات مستعار کے آخری لمحات میں مصنف کے زور قلم کی دل کھول کر داد دی ہے۔

ہر مجموعہ کا نذرانہ تخمیناً ہے تجویز کیا گیا ہے لیکن منیجر آکاش بانی بہاری پور بریلی کو پیشگی آرڈر دینے پر خاص رعایت کیجائیگی۔ فوراً ایک خط لکھکر اپنا نام رجسٹر خریداران میں درج کرا کر اس رعایت کے مستحق بنجائیے کتاب شائع ہونے پر بصیغۂ وی۔ پی ارسال خدمت ہوگی۔

المشتہر

منیجر آکاش بانی۔ بہاری پور۔ بریلی

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۳۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں، زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ سینتیس ۳۷ سال سے اردو زبان و ادب کی کسقدر انہاک و سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانپایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں کے ساتھ حسب ذیل رعایت کی جائے گی:-

۱- تیرہ ۱۳ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے ڈھائی روپیہ فی فائل
۲- چار ۴ سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل
۳- ایک سال کے خریدار سے ہے علاوہ محصول

نوٹ:- آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئے۔ فائل ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے ۱۹۳۲ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں

منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

زمانہ جنوری ۴۰ء کی رنگین تصویر "شطرنج" ایک پرانی تصویر کی نقل ہے جو مغل و راجپوتی آرٹ کی ہم آہنگی کا ایک دل خوش نمونہ ہے۔

زمانہ فروری ۴۰ء میں گذشتہ دسمبر کی تمام قومی کانفرنسوں پر ایک مفصل مضمون شائع ہوگا۔ یہ مضمون جنوری نمبر کے لئے لکھا گیا تھا لیکن بوجہ عدم گنجائش شائع نہیں ہو سکا
منیجر

فہرست مضامین زمانہ جلد ۷۴ بابتہ جنوری لغایتہ جون سنہ ۱۹۴۰ء

تصاویر:- شطرنج (رنگین) ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، مولانا ابوالکلام آزاد و بابو راجندر پرشاد۔ واجد علیشاہ مرحوم (رنگین)

(حصۂ نثر)

حصۂ نظم

کے حالات تغیر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں ترقی و تبدیلی ہونے سے کوئی ملک ایک ہی حالات میں ہمیشہ تک قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا جب کبھی کسی ملک کی بڑھی ہوئی ضرورتوں کے لئے توسیع کی ضرورت درپیش ہوتی ہے اور اس کا کوئی مناسب حل نہیں نکلتا۔ تو ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بھاپ کی طاقت[1] کی دریافت نے مغربی ذہن کو مشین کی ایجاد کی طرف مبذول کیا، اور جب یہ طاقت بڑی بڑی مشینوں کے چلانے میں استعمال کی گئی تو بڑی بڑی فیکٹریاں قائم ہو گئیں اور بڑے پیمانہ پر چیزیں تیار ہونے لگیں، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں تمام مغرب میں صنعتی کارخانوں کی بھرمار ہو گئی اور وہ ملک بھی جہاں کوئلہ اور لوہے کے سوائے اور کوئی دولت نہ تھی سونے چاندی سے مالا مال ہونے لگے۔ چنانچہ صنعت و حرفت نوع انسان کی بہترین رفیق تسلیم کی گئی۔ اور تمام مغربی ممالک اس کے پرستار بن گئے۔ فیکٹریوں کے قائم ہونے کے پہلے مزدور اپنے ہی سرمایہ سے اپنے گھروں میں دستکاری کا کام کرتے تھے مگر اب ان نئے کارخانوں کی موجودگی میں انھیں اپنی خودمختاری چھوڑ کر فیکٹریوں میں مزدور واجیر[2] کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ کیونکہ ان بیچاروں کو نہ تو اتنی استطاعت تھی کہ وہ اپنے سرمایہ سے فیکٹریاں چلا سکیں اور نہ بڑی فیکٹریوں کی بنائی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں وہ ان سے بہتر اور ارزاں مال تیار کر سکتے تھے، اس لئے سوسائٹی کے نظام میں سرمایہ داروں کا طبقہ پیدا ہو گیا اور اسی طبقہ کے ہاتھ میں سیاسی طاقت بھی سمٹ آئی۔ ہر ملک میں سرمایہ داری پر مبنی نظام حکومت کی یہی سرگرم کوشش ہوئی کہ جس طرح ہو سکے دوسرے ملکوں سے سبقت لیجائے۔ ہر جگہ حکومت کو کچا مال دستیاب کرنے اور منڈیوں پر قابو حاصل کرنے کی فکر ہو گئی، اور ملکوں کے پاس تو نوآبادیات تھیں مگر جرمنی نے اس بارے میں اپنی ناداری محسوس کی اور افریقہ کے بیشتر حصہ کو اٹلی۔ پرتگال۔ اسپین۔ برطانیہ۔ فرانس اور بلجیم میں منقسم پایا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے پاس نہ نوآبادیات ہیں اور نہ اُن کو لینے اور اپنے قبضے میں رکھنے کی طاقت ہے چنانچہ اُس نے عظیم الشان حوصلہ مندی اور ہمت و استقلال سے کام لیکر ۱۸۸۲ء میں جرمن نوآبادیاتی انجمن[3] کی تنظیم کی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلیل مدت میں اُس نے اپنی حیثیت ایک نوآبادیاتی طاقت[4] کی کر لی جرمنی کی حوصلہ مندی نے دوسرے ملکوں کے مُدبّروں کے دلوں میں جرمنی کی طرف سے خوف پیدا کر دیا جس کی وجہ سے تمام بین الاقوامی معاملات میں شک و شبہ کے اثرات غالب آ گئے اور بین الاقوامی فرقہ بندیاں شروع ہو گئیں اسلحۂ جنگ کی دوڑ میں ہر قوم نے دوسری قوم سے بڑھ جانے کی انتہائی جد و جہد شروع کر دی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ بالآخر جنگ عظیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ گو بادی النظر میں اس کا بہانہ سراجاوو (Serajavo) کا سانحہ تھا۔ بہرحال جنگ عظیم ہوئی اور جان و مال کا ایسا نقصان ہوا کہ اہل عالم بدحواس اور اس بات سے نااُمید ہو گئے کہ اس

---

[1] Steam Power [2] Wage Earner [3] German Colonial Society [4] Colonial Power

دور کا خاتمہ ہو کر آئندہ پھر کبھی دنیا میں امن و امان کا نیا دور قائم ہو سکے گا مگر امریکہ کے پریسیڈنٹ ولسن نے اس نئے دور کی اُمید دلائی اور مجلس اقوام کا دلآویز مرقع پیش کیا۔ جنگ کے آفات و مصائب سے بدحواس دنیا پریسیڈنٹ موصوف کو مسیحائے امن سمجھنے لگی اور ہر ملک کے لوگوں کی یہی کیفیت تھی کہ ممدوح کے سامنے زار زار روتے تھے اور اُن کے مشوروں پر عمل کرنے کے لئے دل وجان سے تیار تھے۔ مگر پریسیڈنٹ موصوف کو عوام الناس نہیں بلکہ اُن کے قابو یافتہ حکمرانوں سے سابقہ پڑا، جو دراصل قومیت، طاقت و سرمایہ داری کے پرستار اور انسانیت، اخوت و مساوات کے دشمن تھے یہی وجہ ہے کہ جس قومی تنگ نظری نامنصفی اور جبر و تشدد پر پہلے یورپین سلطنتوں کے اتحاد[1] کی بنیاد رکھی گئی تھی اُسی اصول پر مجلس اقوام کا قلعہ بھی تیار کیا گیا اور فاتحانِ جنگ نے اُس کی بدولت اپنی وسیع سلطنت اور مقبوضات کی حفاظت و نگہبانی کی کوشش کی۔ اس جبر و تشدد، خودغرضی و نامنصفی کی بنیاد پر تعمیر کردہ قلعہ کو مشترکہ امن[2] کا حصن حصین و حصار متین ٹھہرایا گیا۔ فتحمند سلطنتیں مطمئن ہو گئیں کہ انھوں نے دنیا سے جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور جنگ پسند جرمنی کو بالکل ہی کچل ڈالا۔ اور آسٹرو ہنگرین سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اب وہ بہ اطمینان اپنے نئے علاقوں پر قابض رہ کر فارغ البالی سے زندگی بسر کریں گے۔ جرمن قوم کو بھوکا ننگا اور ذلیل کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اور مزید برآں جنگ شروع کرنے کے گناہ کی پاداش میں ایک گرانبہا رقم کی ادائیگی تاوانِ جنگ کے نام سے اُس پر لازمی کر دی گئی۔ مجبور جرمنی یہ تاوان محض اس طریق سے ادا کر سکتا تھا کہ مرکھپ کر مال تیار کرے اور ان فتحمند ملکوں میں بھیجے مگر اس صورت میں ان ملکوں کی صنعت کو دھکا لگنے کا اندیشہ تھا، چنانچہ ان ملکوں نے دوسرے ممالک پر تجارتی و دیگر موانع عاید کرنے والی پالیسی پر عملدرآمد کیا۔ اس طرح بین الاقوامی تجارت اور مالیات کی راہیں مسدود ہو گئیں نقص جرمنی یوں ہی تباہ ہو چکا تھا اب اس بے ارتباطی نے تمام دنیا کو مالی زیر باری کے قعرِ مذلت میں گرا دیا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جرمنی کو بھوکا ننگا اور ذلیل کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا یہ دلاور قوم اس حالت میں مستقل حیثیت سے رہنا گوارا کر سکتی تھی؟ خصوصاً جبکہ وہ سو سال سے اپنے کو ایک طاقتور ملک بنانے کا حوصلہ کر رہی تھی اور اہل جرمنی اس تمام مدت میں اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف رہے۔ چنانچہ بالآخر جرمنوں کو بسمارک کی سعی جمیل نے ایک طاقتور و جنگجو قوم بنا دیا۔ قیصر ولیم دوم کی کوشش بلیغ سے جرمنی کو سمندر پار کی نوآبادیات حاصل ہوئیں اور اُس کے حوصلے اور بڑھے، چنانچہ اپنی سرحد کے قریب ہی یورپ میں توسیع سلطنت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور جرمنی کے ہر سربرآوردہ اور ممتاز باشندے نے جذبۂ حب الوطنی سے متاثر ہو کر ہر ممکن خدمت سرانجام دینا قبول کر کے اپنی قوم کے اندر وہ طاقت پیدا کر دی جس نے تمام یورپ

---

[2] Collective Security [1] Concert of Europe

بلکہ ساری دنیا کو ہلا دیا۔ گو جنگ میں جرمنی کو اقتصادی ناکہ بندی کی وجہ سے شکست نصیب ہوئی تاہم اُسے اپنی طاقت پر پُورا بھروسہ تھا اور اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ "چاہ کن را چاہ درپیش" کی مثل اُس پر صادق آئیگی۔

صلحنامہ ورسیلز مرتب کرنے والے مدبروں نے فتح کے زعم میں نفسیاتی پہلو کا احساس نہ کیا اور تنگ نظری اور خود غرضی کی وجہ سے اُس وقت اُن کی دُور اندیشی بھی غائب ہوگئی، مگر دُور بین نظریں اُس وقت بھی دیکھ رہی تھیں کہ اس صلحنامے میں آئندہ لڑائی کا پُورا سامان اکٹھا کر دیا گیا ہے، چنانچہ انھیں وجوہ سے موجودہ جنگ کی بنیاد پڑی اور ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی صداقت کہ "گندم از گندم بروید جو ز جو" ظاہر ہوگئی۔ چیکوسلاوکیہ نے جو تخم بوئے تھے وہی کھیتی کاٹی، اس کا ہرگز حق نہ تھا کہ وہ اپنے حدود کی توسیع کر کے اپنے اندر اُس علاقہ کو بھی شامل کرے جس میں تقریباً تمام تر آبادی اہل جرمنی کی تھی۔ مگر اس کو تو کوہ بوہیمیا کے سلسلہ کو اپنی سرحد بنانے کی فکر تھی، اس لئے اس کے لئے بوہیمیا کے جنوب میں آباد تیس لاکھ جرمنوں کو چیکوسلاوکیہ کی حکومت میں شامل کرنا ضروری ہوگیا۔ ورسیلز کے صلحنامہ نے اس زیادتی کو روا رکھا۔ ہمارے مدبرین نے اس وقت دور بین اہل الرائے کے مشورہ کا کوئی خیال نہ کیا۔ اُنھیں دنوں انگلستان کے حامی امن مدبر رائٹ آنریبل مسٹر آرتھر ہنڈرسن نے ایک پمفلٹ بہ عنوان "شرائط صلح"[1] شائع کیا تھا جس میں اس بات کی تنبیہ کر دی تھی کہ "اس وقت جو لکھو کھا جرمن چیکوسلاویک، پولش اور اطالوی حکومت میں شامل کئے جا رہے ہیں وہ بالآخر ویسی ہی آزادی طلب آبادی ثابت ہونگے جس نے سربیا کا ہنگامہ مشتعل کر دیا تھا۔ لیبر پارٹی نے بھی صلحنامۂ ورسیلز کے شرائط کی سخت مخالفت کی تھی، اس کے علاوہ لارڈ بالفور، لارڈ ملنر اور امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ نے بھی اسی قسم کی تنبیہ کر دی تھی مگر اُس وقت اِن کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی آخر کار ۱۹۳۸ء میں چیکوسلاوکیا کو اپنا بویا ہوا بیج کاٹنا پڑا۔ اور جنگِ عظیم کے فتحمندوں کو بھی اپنے کئے کا پھل مل گیا۔

غرض جس طرح اتحاد یورپ (Concert of Europe) ناکامیاب ثابت ہوا۔ اُسی طرح اس نمونہ پر تیار کردہ لیگ کا بھی انجام ہوا۔ جنگ عظیم سے پہلے ہر ملک غیر ممالک کے بازاروں پر تصرف پانے کے لئے سرگرداں اور کچّے مال کے لئے تسخیر نو آبادیات کی فکر میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جس طرح جنگی طاقت بڑھانے کے خبط میں اسلحہ جات کے اضافے میں بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے کرتے تمام یوروپین ممالک جنگ کے ورطۂ فنا میں پڑ گئے اُسی طرح واقعات نے صلحنامۂ ورسیلز کے چند ہی دنوں بعد واقعات کو دُہرانا شروع کیا اور خفیہ سازشیں بین الاقوامی جتھا بندیاں، اسلحۂ جنگ کی دوڑیں شروع ہوگئیں اور بالآخر جنگ

[1] "The Peace Terms"

کا پُرہول تصادم ہوگیا۔ یہ ہے جنگ کا وہ چکّر جو دنیا اور تہذیب کو اس وقت پامال کر رہا ہے اور پہلے بھی پامال کرتا رہا ہے۔

اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے ۱۷۹۵ء میں جرمنی کا مشہور فلاسفر ایمینول کینٹ اُس وقت کی اسی کیفیت کا رونا رو چکا ہے۔ اس کو شکایت تھی کہ "ہمارے حکمرانوں کے پاس عوام کی تعلیم دینے کے لئے روپیہ نہیں ہے کیونکہ اُن کی تمامتر آمدنی آیندہ جنگ کے لئے وقف ہو چکی ہے"۔

ایک قوم جب اپنی فوجی طاقت بڑھا لیتی ہے تو اُس کی یہ کارروائی دوسری قوموں کے لئے اُس فوجی طاقت کے بڑھانے کی دوڑ میں بازی لے جانے کی جد و جہد کا سبب بن جاتی ہے، اور اس کی کوئی حد نہیں رہتی۔ چنانچہ فوج کو قائم رکھنے کا صرفہ بھی ایسا بارِ عظیم ثابت ہوتا ہے کہ امن قائم رکھنے کی بہ نسبت ایک جنگ ہو جانے کے تکلیف زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ فوج کی توسیع ہمیشہ جارحانہ جنگ آزمائی کا سبب بن جاتی ہے۔ حالانکہ اس کارروائی کے ذریعہ فوجی صرفہ کے بارِ عظیم سے سبکدوشی حاصل کرنا مراد ہوتی ہے۔

کینٹ (Kant) نے جنگ آزمائیوں کی اصل وجہ ممالک یورپ کی سامراجی پالیسی قرار دی ہے۔ اُس نے بھی یورپ کے ممالک کی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں تسخیر و توسیع مملکت کی حکمت عملی اور اُس کے لازمی نتیجہ یعنی مالِ غنیمت کے تقسیم کے قضیّہ کو جنگ کا باعث قرار دیا ہے اس وقت برطانیہ اور اُس کے حلیفوں کا یہی دعویٰ ہے کہ موجودہ جنگ اس مقصد سے لڑی جا رہی ہے کہ دنیا میں نئے دَور کا آغاز کیا جائے۔ مگر وہ دَور کیا ہوگا؟ اس کا خاکہ وزیر اعظم برطانیہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

> "لڑائی کے بعد امن قائم ہوتے وقت ہم ایک نیا یورپ قائم کریں گے، اس کا نقشہ اس طریقے پر نہیں ہوگا جس طرح کہ ایک فاتح بدلتا ہے بلکہ اس کا نقشہ ایک نئی اسپرٹ کے ساتھ بدلا جائے گا جس میں اہل یورپ اپنی مشکلات باہمی رضامندی سے طے کر سکیں، اس یورپ میں حملہ کا خطرہ نہیں ہوگا اس میں پڑوسی اپنی حدوں کو باہمی رضامندی سے طے کریں گے۔ اس یورپ میں کسی ملک کی تجارت پر کوئی پابندی نہیں ہوگی، ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں بغیر کسی رکاوٹ کے جا سکے گا۔ اس کام میں کئی سال لگیں گے اور صحیح جانب یورپ کی رہنمائی کرنے کے لئے ایک مشینری کی ضرورت ہوگی، مجھے اُمید ہے کہ جو قومیں یورپ کا نقشہ تیار کریں گی اُن میں شاید نئی اسپرٹ والا جرمنی بھی شامل ہوگا"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ مشینری جس کا ذکر وزیر اعظم ممدوح نے فرمایا ہے وہی اتحاد Concert of Europe

یا لیگ آف نیشنز کے نمونہ والی مشینری ہوگی جو دوبار محض ہوائی قلعہ ثابت ہو چکی ہے اور جس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم یہ فرما گئے ہیں کہ:-

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اگر وہ مشینری مختلف ہوگی تو اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کس نمونہ پر قائم کی جائے گی، نئی اسپرٹ والا جرمنی کس طرح پیدا ہوگا، اس میں نئی روح کونسا مسیحائے اعظم پھونکے گا۔ سامراجی ممالک کس طرح صلح وصفائی سے مال غنیمت کی تقسیم برقرار اور جاری رکھ سکیں گے، جب تاریخی واقعات ایسی صلح وصفائی کے خلاف شہادت دے رہے ہیں تو جب تک سوسائٹی کے نظام میں جنگ کے اسباب باقی رہیں گے اُس وقت تک دنیا میں بار بار لڑائی ہوتی رہے گی۔

دنیا میں مختلف ملکوں کی تہذیب کے ارتقا کے مطالعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ منظم جبر و تشدد کا عنصر انسانی فطرت کا لازمی جزو نہیں ہے، مگر دنیوی مفادات کے اجارہ دار جن کے ہاتھ میں اقتدار و حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے اپنے اہل ملک کو اسی فریب میں مبتلا رکھتے آئے ہیں اور اب بھی یہی فریب دے رہے ہیں کہ منظم جنگی کارروائی اور لکھوکھا انسانوں کی قربانی اُن کی تہذیب کو برقرار رکھنے اور سوسائٹی کے نظام کو برہم ہونے سے بچانے کا واحد ذریعہ ہے۔ اُن کی رائے میں کوئی دوسرا نظام تمدن ایسا نہیں ہے جس کی بدولت ملک اس ناگزیر قربانی سے بے نیاز ہو جائے اور جنگ کے اسباب پیدا ہی نہ ہوں اور اس کے امکانات باقی نہ رہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ منظم جنگ اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب تہذیب نے ایسا نظام اختیار کیا جس میں چند مخصوص لوگوں کو تمدنی امتیازات اور ملکیت کے اختیارات حاصل ہوگئے۔ چنانچہ مختلف امتیازی طبقے مثلاً راجگان، فرمانروایان اور مذہبی اجارہ داران، سرمایہ داران وغیرہ کے پیدا ہوگئے۔ اور انھوں نے سوسائٹی کے نظام میں ممیز حیثیت واقتدار حاصل کرلیا۔ عیسائیوں، مسلمانوں، سکھوں اور بودھوں کی تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیگا کہ مذہبی جماعتیں اُس وقت تک مذہبی رہتی ہیں جب تک اُن میں کامل روحانی پیشوا رہتے ہیں اور جب اُن کے بعد مذہبی جماعت کی باگ ڈور روحانیت سے ناآشنا، خود غرض گندم نما جو فروش لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو یا تو وہ جماعت ختم ہو جاتی ہے یا اُس کے نام نہاد اجارہ دار اُسے ایک ملکیتی ادارہ Possessive Institution بناکر اپنے مفاد کے تحفظ و توسیع کی خاطر عوام کو مذہب کے نام پر کشت و خون کرنے پر آمادہ کرکے مذہبی جماعت کو جنگجو بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح راجاؤں، مہاراجاؤں

نے منظم فوج قائم کرکے توسیع سلطنت اور حصول زر و مال کے لئے چھوٹے راجاؤں پر حملے کئے۔

انسان فطرتاً جنگ جو نہیں ہے، مگر امتیازی حلقوں نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے منظم فوج کشی کو رواج دیا اور جنگ کی فضا پیدا کردی، جس کا اثر بتدریج لوگوں کے دل و دماغ پر پڑا۔ یہ کیفیت نسلاً بعد نسلاً جاری رہی اور انسانی ضمیر نے فطرتاً نہیں بلکہ اکتسابی طور پر منظم جبر و تشدد کے عنصر کو اپنے اندر جذب کرلیا اور حملہ آوری و جنگ جوئی مستحسن کارروائی شمار ہونے لگی۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کردینا بھی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ لوگ ضمیر کو روح کی آواز سمجھتے ہیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں، یورپ کا مشہور فلسفی اسپینوزا[1] کا قول ہے کہ ضمیر اخلاقی روایتوں و رواجوں کا مظہر ہوتا ہے۔ فرانس کے مشہور فلسفی والٹیر کا بیان ہے کہ "ضمیر کی بنیاد ہمارے نشو و نما پانے والے دماغ میں والدین، اساتذہ اور اخبارات وغیرہ کے ذریعہ پڑتی ہے"۔ چنانچہ جو قومیں اس وقت جنگجو ہیں اور جن کے معرکہ آرائی کا عنصر جزو طبیعت ہوگیا ہے۔ اُن کی جنگ پسندی نسلاً بعد نسلاً اخلاقی روایت و رواج کا نتیجہ ہے۔ ورنہ تاریخ شاہد ہے کہ بنی نوع انسان دنیا کے ہر حصہ میں تہذیب کے اس ابتدائی زمانہ میں جسے پتھر کا زمانہ کہا جاتا ہے اور جب انسان اپنے لئے کوئی غذا پیدا نہ کرتا تھا بلکہ جو کچھ قدرت میں موجود تھا اسی پر اُس کی بسر اوقات تھی۔ صلح و صفائی کی زندگی بسر کرتے تھے، ازدواجی زندگی میں وفاشعاری، بی بی بچوں سے محبت، بزرگوں کا اعزاز و احترام سب آدمی کی صلح جوئی اور امن پسندی کی دلیلیں ہیں۔ دراصل ابتدا میں انسانی طریق عمل میں جبر و تشدد کو کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ عرصہ تک پتھر کے اسلحہ نہیں بنائے گئے کیونکہ اُن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بہر حال مدعا یہ ہے کہ انسان فطرتاً جنگ پسند پیدا نہیں ہوا ہے، بلکہ تہذیب کے خاص اداروں کے قائم ہونے سے اُس کے ضمیر میں یہ عنصر رونما ہوگیا۔ اور ترقی کی رفتار کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتا گیا جس سے رفتہ رفتہ انسان جنگ جو اور جنگ پسند ہوگئے، ورنہ تمدن و معاشرت کے قدیم ترین زمانے کے لوگ صلح پسند تھے۔ شروع میں جو فرمانروا ہوئے اُن کا زمانہ ہر ملک میں عہد زریں[2] شمار کیا جاتا ہے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد راجے مہاراجے بن گئے اور بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کی دُھن میں جنگ آزمائیوں میں مبتلا ہوگئے۔

تشدد کا عنصر ضمیر انسانی میں اوّل اوّل قربانیوں کے رواج سے داخل ہوا۔ قدیم مصر کے حکمران جب بڑھے ہوجاتے تھے تو انھیں قتل کردینے کی رسم رائج تھی، شاید اصل منشا یہ تھا کہ رعایا کی ترقی و فارغ البالی کے لئے حکمران کو نوجوان، پُرجوش اور مستعد ہونا چاہیئے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کارروائی رسمی ہوگئی اور عوام کے ذہن سے

[2] Golden Age   [1] Spinoza

اس کی غرض وغایت معدوم ہوگئی اور یہ رواج توہم پرستی بن گیا۔ چنانچہ حکمرانوں نے اپنی جان بچانے کے لئے اس میں یہ ترمیم کردی کہ اُن کے بجائے کسی غلام کی قربانی کردی جایا کرے۔ اسی طرح زراعتی فارغ البالی حاصل کرنے اور وبائی امراض کی لعنت دُور کرنے کے لئے مختلف دیوی دیوتاؤں کے نام پر بھی قربانیاں ہونے لگیں۔ چنانچہ شروع شروع میں ایک جماعت نے دوسری جماعت پر اسی غرض سے منظم حملے کئے کہ انھیں قربانی کے لئے غنیم کے سر حاصل ہوجائیں۔ اس کے بعد فرمانرواؤں نے اپنی طاقت وسلطنت کے تحفظ وتوسیع کیلئے منظم معرکہ آرائی شروع کی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرمانروا کس طرح سوسائٹی میں پیدا ہوگئے۔ زندگی کی جدوجہد کامیابی سے جاری رکھنے کے لئے انسان نے گروہ بندی کی، یہی گروہ بڑھتے بڑھتے قبیلے بن گئے۔ اندرونی وبیرونی بکھیڑوں کے سلجھانے کے لئے کسی پنچ کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ لوگوں نے اپنے لئے فرمانروا یا راجہ چُنا۔ ایک عرصہ تک یہ فرمانروا اُس غرض وغایت کی تکمیل کو مدنظر رکھتے ہوئے بوجہ احسن اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہے۔ بعدازاں ملک ومال کی لالچ نے انھیں راہ راست سے منحرف کردیا اور وہ ملک گیری کی ہوس میں تبردآزمائی کرنے لگے، چنانچہ خوب خوب معرکہ آرائیاں ہونے لگیں، جہاں یہ راجے عیاشیوں میں پڑ گئے اور اُن کی اولاد ناز ونعم میں پل کر شجاعت ودانشمندی سے محروم ہوگئی۔ وہاں اِن ناز پروردگان کی جگہ مستعد اُمراء ووزراء نے حاصل کرلی۔ اِس طرح شخصی[1] حکومت کی جگہ Oligarachy نے لے لی۔ مگر یہ وزراء واُمراء بھی عیش وعشرت میں پڑ گئے جس سے ان کی حالت بھی خودمختار فرمانرواؤں کی سی ہوگئی، آئے دن کی معرکہ آرائیوں، کُشت وخون اور لوٹ مار کے ہنگاموں نے رعایا کو برانگیختہ کردیا۔ انھیں حالات میں فرانس میں انقلاب عظیم رونما ہوا اور وہاں کے سیاسی نظام نے جمہوریت کا جامہ زیب تن کیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں جمہوریت کے راگ الاپے جانے لگے، مگر جلد ہی اس جمہوریت کا نتیجہ بھی دلشکن ثابت ہوا، حکومت میں خوشامد کے زور اور روپیہ کی طاقت سے ووٹ حاصل کرنے والے نمائندے منتخب ہوئے اور سرمایہ دار طبقے نے دولت کے زور سے ایوان حکومت میں داخل ہوکر اقتدار حاصل کرلیا۔ غرض معرکہ آرائی وجنگ آزمائی میں کوئی کمی نہ ہوئی، قومی جذبہ کا بت عوام کے سامنے پیش کیا گیا اور وہ اس کے پرستار بن گئے، ایک قوم نے دوسری قوم پر سیاسی واقتصادی اقتدار حاصل کرنے کے لئے توسیع اسلحہ کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کردیا جس کا نتیجہ جنگ عظیم کی صورت میں رونما ہوا۔ اس میں جان ومال کا ایسا نقصان ہوا اور تجارت کی تباہی کے باعث ایسی بے سروسامانی ہوگئی کہ عوام میں سامراج وسرمایہ داری کے خلاف جذبات بھڑک اُٹھے۔ سرمایہ دارانہ مفاد پر خواہ مخواہ اُن کے رشتہ داروں کی جانیں بھینٹ چڑھیں۔ جنگ

[1] Autocracy

کے اثرات مابعد اقتصادی حیثیت سے بھی بہت بُرے ثابت ہوئے غریبوں کو روٹی کے لالے پڑ گئے چنانچہ زمانہ نے پھر کروٹ بدلی ۔ مظلوم عوام موجودہ تہذیب اور نظام تمدن ہی سے متنفر ہو گئے خصوصاً روس میں تو حکومت کے خلاف اس قدر جذبات برانگیختہ ہوئے کہ عوام مزاج (Anarchist society) کے خواب دیکھنے لگے مطلق العنان زار کو قتل اور روٗسا کو پامال کر کے ایک انقلاب عظیم برپا ہوا اور لوگوں نے اشتمالیت کی طرف قدم بڑھایا مگر چونکہ جرمنی اور اٹلی شخصی حکومت کے عادی تھے، اس لئے وہاں سیاسی نظام نے ایک نیا روپ بدلا جواب فاسئیت و نازیت کے نام سے موسوم ہے ۔ روس نے تو اپنا نظریہ کم سے کم اصولاً بین الاقوامی ہی رکھا مگر فاسئیت و نازیت کا نقطۂ نظر قومی رہا ۔ مگر عملی حیثیت سے روس بھی قومیت کے تنگ دائرہ سے باہر نہ نکل سکا، اور اس کی پالیسی بھی قومی تنگ نظری پر مبنی رہی ۔ معلوم نہیں مجبوراً یا عمداً ۔ بہرحال اس قوم پرستی اور ملک دوستی نے پھر وہی بین الاقوامی تنازعے جن کا مفصل ذکر اوپر کیا جا چکا ہے پیدا کر دیے، جو بالآخر موجودہ جنگ کی صورت میں رونما ہو رہے ہیں ۔

فرانس میں انقلاب کے بعد دنیا کو جمہوریت کا بت ہاتھ آیا تھا، جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت نے سر نکالا ۔ اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے، یہی وجہ ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ نے جرمنی کو اشتراکیت کا حریف سمجھ کر روس سے معاہدہ کرنے کی بہ نسبت معاہدہ میونچ کو ترجیح دی تھی ۔ اشتراکیت کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور عالمگیر ہے ۔ اس کے حامی سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے دنیا میں ایک عالمگیر نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں سرمایہ دار جماعت اور دوسرے امتیازی طبقوں کا وجود ہی باقی نہ رہے گا، اور آخری مرحلے پر حکومت بھی مفقود ہوگی ۔ لوگ اپنا انتظام اتفاق باہمی سے مجلسیں قائم کر کے خود ہی کر لیں گے ۔ اس نظام میں مذہب کو بھی کوئی دخل نہ ہوگا ۔ روس نے مذہب اور خدا کو تمدن و معاشرت سے خارج کرنے کی غرض سے جو پنج سالہ اسکیم ۱۹۳۲ء میں جاری کی تھی وہ بقول اخبار مارننگ پوسٹ (لندن) یہ ہے:-

> "یکم مئی ۱۹۳۷ء تک علاقہ روس کے اندر کوئی عبادت گاہ باقی نہ رہیگی اور نہ کسی کے ذہن میں خدا کا خیال ہی باقی رہیگا کیونکہ دونوں کی بدولت غریب مزدوروں پر قرون متوسط سے ابتک برابر ظلم ہی ہوتے رہے ہیں ۔ پہلے سال کے اندر تمام مذہبی درسگاہیں بند کر دی جائیں گی اور مذہبی تعلیم دینے والوں کی تنخواہیں اور وظیفے سب بند کر دیے جائیں گے ۔ انھیں کھانے کو ملیگا اور نہ دوسری ضروریات زندگی مہیا ہو سکیں گی ۔ روس کے تمام بڑے شہروں کے گرجے اور دوسرے مذاہب کے عبادت خانے یکم مئی ۱۹۳۲ء تک بند کر دیے جائیں گے، اور آئندہ سال شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر خدا کے متعلق بے اعتقادی (Reasonable unbelief) پیدا کرنے کی کوشش کیجائیگی، اور آئندہ سالوں میں گرجا گھروں اور عبادت خانوں کو کلب گھر اور تفریح گاہ وغیرہ بنا کر خدا و مذہب کا نام و نشان ہی ملک سے مٹا دیا جائیگا۔"

چنانچہ اس پالیسی پر بہت کچھ عملدرآمد ہوا اور بہت سی باتوں میں کامیابی اور بہت میں ناکامی ہی
بہرحال اشتراکی نظام میں جس کا مختصر خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے ایک سوسائٹی کے تعلقات دوسری سوسائٹی کے ساتھ محض ملکی یا قومی بنا پر نہ ہونگے بلکہ اخوت انسانی کے رشتہ سے مربوط ہونگے۔ ایسا عالمگیر نظام قائم ہو جانے پر دنیا میں دولت کی تقسیم بھی حسب ضرورت مناسب طور پر ہو سکے گی۔ مزدوروں پر فی زمانہ سرمایہ داروں کا جو دباؤ رہتا ہے وہ معدوم ہو جائیگا اور دنیا سے جنگ و جدال کا نام بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائیگا، کیونکہ ملکیتی ادارے یعنی شہنشاہیت، سرمایہ داری، مذہبی اجارہ داری وغیرہ جو جنگ و جدل کا باعث رہتے ہیں قطعی معدوم ہو جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ انقلاب فرانس اور اُس کے بعد انقلاب روس نے بنی نوع انسان کی ذہنیت میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے کافی تعداد میں ہر ملک میں عوام کے دلوں میں بین الاقوامی جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ تواریخ بنی نوع انسان شاہد ہے کہ گو دنیا کو متعدد بار ہنگاموں، معرکہ آرائیوں، جنگوں کے طوفانوں سے گزرنا پڑا ہے مگر اس کا نتیجہ مجموعی طور پر ذہنیت کی وہ تبدیلی ثابت ہوتی رہی ہے جو مجلسی ارتقا کے لئے لابدی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی بین الاقوامی جذبہ عوام کے دلوں میں اُسی جوش و خروش کے ساتھ موجزن ہو رہا ہے جیسے انقلاب فرانس کے بعد جمہوریت کا خیال دنیا میں چھا گیا تھا۔

مختلف تہذیبوں کی تباہی کا یہ روشن پہلو ہے، راقم الحروف فلسفۂ یاس کا قائل نہیں۔ بقول کینٹ (Kant) "تواریخ بنی نوع انسان مجموعی طور پر دنیا میں ایک ایسے سیاسی نظام کا خاکہ تیار کر رہی ہے جو اندرونی و بیرونی طور پر ہر لحاظ سے مکمل ہو، اور جس میں انسان کی تمام قدرتی اہلیتوں و قوتوں کو پورے طور پر فروغ دینے کا بابرکت موقعہ نصیب ہو۔" بقول کینٹ اگر ایسا نہیں ہے تو مختلف تہذیبوں کی جدوجہد اس کوشش کے مشابہ ہوگی کہ ایک وزنی پتھر کو بار بار پہاڑ پر لے جا کر عین اُس وقت نیچے لڑھکا دیا جائے جبکہ پتھر چوٹی کے بالکل نزدیک پہونچ گیا ہو۔

بقول کینٹ جب تک قومیں ہم آہنگ ہو کر جنگ و جدل کو ہمیشہ کے لئے خیرباد نہ کہدیں گی اُس وقت تک اُنھیں مہذب ہونے کا موقع حاصل نہ ہوگا۔ اب بھی انسان نہ چیتا تو تہذیب و امن کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

جنگ کے اسباب دُور کرنے کے لئے اہل الرائے اصحاب کا یہی خیال ہے کہ دنیا میں مساوات پر مبنی عالمگیر اشتراکی نظام قائم کیا جائے جس میں کسی چیز کی ملکیت کسی شخص یا جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ مگر یہ

بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی ہے کہ دنیا میں ایسا نظام قائم ہونا ممکن نہیں ہے جس میں افراد میں کوئی امتیاز موجود نہ ہو۔ مساوات صرف اُسی قدر ہوسکتی ہے کہ سب کو ترقی کرنے کا برابر موقع دیا جائے چنانچہ مشہور امریکن فلسفی سنتائن کا قول ہے کہ سوسائٹی کا وہی بہترین نظام ہے جو سب کو ترقی کا یکساں موقع دے۔ کینٹ کا بھی یہی خیال ہے کہ سیاسی نظام ایسا ہونا چاہیئے جس کی بدولت ہر انسان کو اپنی صلاحیت کے نشوونما دینے کا پورا موقع ملے۔ اور نہ کوئی اعلیٰ سمجھا جائے نہ ادنیٰ بلکہ سب برابر سمجھے جائیں اور ہر شخص کو برابر حقوق ملیں۔

مساوات کے متعلق غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے، تدریج و تفریق قدرت میں داخل ہے، ذہنی رُجحانات اور جسمانی ودماغی صلاحیتوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ ہر نظام میں عوام کے ساتھ ہی ساتھ چوٹی کی حیثیت رکھنے والے شخص بھی ہونگے۔ پس بہترین نظام وہ ہے جس میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت اور قابلیت کو فروغ دینے اور ترقی کرنے کا پُورا موقع اور پُوری آزادی ہو، اور جس میں مختلف افراد خواہ وہ شخص واحد ہوں یا فرقے قبیلے، جماعتیں یا قومیں، سب ہم آہنگی، باہمی اعانت و رفاقت کے ساتھ ایک نظام تمدن پیدا کرسکیں جس کی حیثیت کُل کی ہو۔ ایسا نظام اخوت انسانی کی بُنیاد پر قائم ہوسکتا ہے، یہ ہر قسم کے جبر و تشدد سے مبرا ہوگا اور اس میں جنگ کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہیگا، یہ نظام انصاف پر مبنی ہوگا جس کی تعریف افلاطون نے یوں کی ہے کہ:۔

"ہر شخص اُس چیز کا مالک اور اُس کام کا کرنیوالا ہو جو خود اُس کا ہے۔"

غالباً انصاف کی یہ بہترین تعریف ہے۔ بہر حال اس وقت دنیا کو ایسے بین الاقوامی رہنما کی ضرورت ہے جو کل بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ میں اس طرح باندھ دے جس طرح ایک قوم پرست رہنما ملک کے اندر مختلف فرقوں اور جماعتوں کو ہم آہنگ کر کے متحد کر دیتا ہے۔

دوستی لطف باہمی سے بڑھتی ہے، اور بادشاہی انصاف سے،

ملک کی رونق عقلمندوں سے، اور دین کی رونق پرہیزگاروں سے ہوتی ہے۔

مال بغیر تجارت کے، علم بغیر بحث کے، اور ملک بغیر سیاست کے ترقی نہیں کرسکتا۔

آگ۔ قرض۔ بیماری اور دشمن کو کبھی کم نہ سمجھنا چاہیئے۔

آدمی قناعت سے دولتمند ہوتا ہے نہ کہ دولت سے۔

"نوروز"

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ. بی. اے، ایل ایل. بی شاہجہانپوری)

تیری آمد سے ہیں اے نوروز! شاداں خاص و عام اہلِ دنیا کے لئے ہے تو مسرت کا پیام
پھر گل و نسریں کی خوشبو سے معطر ہے مشام خوشنوایانِ چمن کا ہے چمن میں اژدحام

غل ہے ہر سو، باغ میں فصلِ بہاری آگئی
لالہ و گل، سرو و ریحاں کی سواری آگئی

ہے مسیحائی کا دم بھرتی نسیمِ مشک بار سبزۂ نورس لہکتا ہے کنارِ جوئبار
جھومتی ہے شاخ گلبن پی کے صہبائے بہار قلب کو مدہوش کرتی ہے فضائے لالہ زار

زلفِ سنبل عارضِ گل پر پریشاں ہوگئی
یہ نظارہ دیکھ کر بلبل غزل خواں ہوگئی

دیدنی ہے آج گلشن میں تماشائے نشاط طائرانِ بوستاں ہیں نغمہ پیرائے نشاط
گل ہے جامِ خرمی، شبنم ہے صہبائے نشاط غنچہ مینائے طرب ہے سرو لیلائے نشاط

یہ اشارہ کر رہی ہے نزہتِ گلزار آب
کوئی نرگس کو نہ باندھے شعر میں بیمار اب

گرمیِ ہنگامہ ہے پھر محفلِ خاموش میں ہوگئی لذت نئی پیدا مئے سرجوش میں
ہنس رہی ہیں آرزوئیں یاس کے آغوش میں گم ہے شورِ آہ و زاری شورِ نوشانوش میں

دورِ گردوں آج دورِ بادۂ مستانہ ہے
گردشِ ایام بھی اب گردشِ پیمانہ ہے

غرقۂ بحرِ الم ہوں، طائرِ بسمل ہوں میں شاکیِ تقدیر ہوں، بیگانۂ ساحل ہوں میں
شاہراہِ زیست میں واماندۂ منزل ہوں میں تیری عشرت آفرینی کا مگر قائل ہوں میں

ملل

ڈھونڈتی ہے پھر نظر یارانِ مے آشام کو
پھر اُمنگیں گدگداتی ہیں دلِ ناکام کو

آہ، بندِ رنج و غم سے رستگاری ہے محال
خود یہ جذباتِ خوشی ہیں موجبِ حزن و ملال

دیکھتا ہوں جب چمن میں شاہدِ گل کا جمال
خوں رُلاتا ہے مجھے یارانِ رفتہ کا خیال

چند پھولوں کی ہے جا خالی مرے گلزار میں
صورتیں پھرتی ہیں اُن کی دیدۂ خونبار میں

آہ، اے نوروز! اے روزِ سعادت اِنتما
کس لئے سختی کشانِ دہر سے ہے تو خفا

گو ترے دم سے جہاں میں غنچۂ عشرت کھلا
دل کے داغوں کو بھی لیکن تو نے تازہ کر دیا

کچھ مصیبت آفریں ہے، کچھ نشاط انگیز ہے
تیری آمد ایک تسکینِ تپش آمیز ہے

حکمِ مشیت

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ ہر نظام کے ہمراہ ابتری بھی رہے

موحّدوں کو رہے اختیارِ بُت شکنی
برہمنوں کے لئے اذنِ آذری بھی رہے

طلسمِ کوثر و تسنیم بھی نہ ہو باطل
شرابِ ناب کی موجِ فسونگری بھی رہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش
زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

شعارِ عجز و سرِ انکسار کے ہمراہ
سرشتِ حضرتِ انساں میں خودسری بھی رہے

مذاقِ بندگی و ذوقِ سجدہ کے باوصف
مزاجِ آدمِ خاکی میں داوری بھی رہے

غرضکہ حکمِ مشیت یہ ہے کہ دُنیا میں
پیمبری بھی رہے اور کافری بھی رہے

حفیظ جالندھری

تذکرہ نویسوں کی اہم فروگزاشتیں

(از سید رفیق مارہروی)

رسالۂ "زمانہ" کے بعض مضامین پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا تذکروں میں ہندو شعراء کی واقعی حق تلفیاں ہوئی ہیں؟

اِس سوال کے جواب کے لیئے میں نے بعض کتابوں کا مطالعہ کیا، متعدد قدیم و جدید تذکرے دیکھے اور اپنی جگہ ایک رائے قرار دینے میں کامیاب ہوگیا۔ اِس تلاش و تحقیق کے دوران میں جہاں بہت سی ادبی اُلجھنوں سے مقابلہ کرنا پڑا وہیں ہندو شعراء سے متعلق اتنا مفید مسالہ ہاتھ آیا ہے کہ اُس کی امداد سے ایک مستقل کتاب تیار کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اِس ادبی محفل میں یادداشت کا ذرا سا حصّہ پیش کرتا ہوں جو غالباً پسند کیا جائیگا۔

آج سے چالیس پچاس برس پہلے شاعروں کے حالات میں جو تذکرے لکھے جاتے تھے اُن میں تلاش و تحقیق کی جگہ غیر محققانہ واقعات خواہ وہ دو لفظی ہی کیوں نہ ہوں ایک جگہ جمع کر دیئے جاتے تھے جن سے چند شعراء کے محاسن کا بہ طرزِ خاص اشتہار ہوجاتا تھا۔ تاریخی و تنقیدی اعتبار سے اِن تذکروں میں کوئی وزن اور معیار نہیں رکھا جاتا تھا۔ کسی شاعر کا اگر زمانۂ حیات معلوم ہوا تو ضمناً لکھدیا ورنہ اس کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ شعراء کے کلام کے انتخاب میں اکثر صرف دو یا تین شعر دیدیئے جاتے تھے۔ مؤلف کو اس سے بھی سروکار نہ تھا کہ کس شاعر نے کس ماحول میں آنکھ کھولی اور کس نے کس زمانے میں زبان کی کتنی خدمت انجام دی۔ اگر کسی شاعر سے ذاتی خصوصیت ہوئی تو اُس کے حالات دوسروں کے مقابلے میں بڑھا چڑھا کر لکھدیئے، ورنہ اُستاد اور نومشق دونوں کو قدیم تذکروں میں ایک لکڑی سے ہانکنے کا دستور عام تھا۔ اُردو میں فنِ تذکرہ نویسی کی بنیاد بھی فارسی انداز اور ڈھچر پر ہی رکھی گئی، چنانچہ فارسی طور و طریق جن محاسن و معائب کے حامل تھے اُن کا وجود اُردو زبان کی شاعری اور اس سے متعلق تذکروں میں بھی قائم رہا۔ لیکن اُردو زبان کی ترقی کے ساتھ فنِ تذکرہ نویسی بھی ترقی پا رہا ہے۔

دور کی خبر لانا، بال کی کھال نکالنا اور انتہائی گہرائیوں سے موتی نکال کر پیش کرنا آجکل کا عام مذاق ہے اور اسی وجہ سے یہ دور تلاش و تحقیق کا دور کہا جاتا ہے۔ اُردو صحافت بھی بہت سے گمنام شاعروں سے کو

متعارف کر چکے ہیں لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے اخذ وانتخاب کا اتنا غلط انداز اختیار کیا ہے کہ معمولی معمولی باتیں اختلاف کی دلدل میں پھنس کر معما ہو گئی ہیں اور موجودہ بنیادوں پر کوئی نئی عمارت تیار کر لینا مشکل ہو گیا ہے اس وقت تک جتنے قدیم تذکرے منظر عام پر آئے ہیں اُن میں سے تین تذکرے یعنی تذکرۂ سید امام الدین خاں، تذکرۂ خان آرزو اور تذکرۂ سودا ایسے ہیں جن کا ذکر تو چند دوسرے تذکروں میں ملتا ہے لیکن یہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اِن کے علاوہ جن قدیم تذکروں سے ہم روشناس ہو چکے ہیں اُن میں مشہور یہ ہیں:

تذکرۂ نکات الشعراء از میر۔ تذکرۂ تحفۃ الشعراء از افضل بیگ قاقشال۔ تذکرۂ میر حسن۔ تذکرۂ گلشنِ گفتار از حمید اورنگ آبادی۔ تذکرۂ چمنستانِ شعراء از لچھمی نرائن شفیق۔ تذکرۂ سید فتح علی گردیزی۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم مع گلشنِ ہند۔ تذکرۂ ہندی گویاں از مصحفی۔ تذکرۂ مخزنِ نکات از قائم الدین قائم۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب تذکرے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ اِن میں سے اکثر تذکرے میر تقی میر کے نکات الشعراء کے جواب یا اتباع میں لکھے گئے ہیں۔ میر کا تذکرہ جس انداز سے لکھا گیا تھا اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باِمذاق لوگوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور ایک سے زیادہ تذکرے محض میر کے الزامات اور اُن کی خودرائی کی رد میں لکھے گئے۔ اِن تذکروں کو فرداً فرداً پڑھنے سے ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سب میر کی اجتہادی خودپسندی کے جواب ہیں، مگر ان میں بھی اُسی جانبداری کا نقص موجود ہے۔ اس شاعرانہ تعصب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس زمانے کے بیشتر تذکرے مفید و کارآمد ثابت ہونے کے بجائے تاریخی و تنقیدی لحاظ سے ساقط الاعتبار ہیں

اِن تذکروں میں اُردو شعراء کے حالات بھی فارسی زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں، انداز تحریر بعض ادبی محاسن کے باوجود بالکل افسانوی ہے اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بعد کوہ کندن و کاہ برآوردن کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ مؤلفین نے معمولی معمولی باتوں سے قطع نظر بعض حقائق کو بھی افسانوی شکل دے رکھی ہے واقعات کو افسانوں سے جدا کرنے کے بعد بھی مؤلف کی موافق یا خلاف رائے جان لینا دشوار ہے۔ اِن قدیم تذکروں میں تذکرۂ مخزنِ نکات مولفۂ قائم ایک جداگانہ انداز رکھتا ہے۔ اس تذکرے کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کر کے پیش کیا گیا ہے لیکن چونکہ تذکرہ مختصر اور ایک محدود زمانہ سے متعلق ہے اس لئے زبان کی تدریجی ترقی کا اندازہ اس سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تذکرہ نویسی کے اِس دَور کے بعد وہ دَور آیا جب کہ ہر شخص جس کو اپنے اُستاد یا احباب کی مدح سرائی منظور ہوئی ایک تذکرہ لکھنے پر مجبور ہوا۔ اس تقلیدی دَور کے تمام تذکروں کو متقدمین کے فارسی تذکروں کا اُردو ترجمہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس دَور کے مشہور تذکرے یہ ہیں:۔

تذکرۂ گلشن بےخار از شیفتہ۔ تذکرۂ صابر دہلوی۔ تذکرۂ طور کلیم۔ تذکرۂ سراپا سخن۔ تذکرۂ جلوۂ خضر

از صبغۃ بلگرامی ۔ تذکرۂ مجموعۂ سخن از قدر بلگرامی ۔ تذکرۂ نغمۂ عندلیب ۔ تذکرۂ آب حیات ۔ تذکرۂ گلزار سخن ۔ تذکرۂ سخنِ شعرا ۔ تذکرۂ شعرائے ہنود وغیرہ وغیرہ۔

بہ اعتبار تلاش و تحقیق اِن تذکروں کا بھی ادبی نقطۂ خیال سے کوئی وزن نہیں، ان میں بعض تو ایسے دل آزارانہ آب و رنگ کے نمایندے ہیں کہ محض ایک یا دو افراد کی ذاتی رائے کی بنا پر ایک پوری قوم کو اپنی ہم سایہ قوم کے بعض اعتراضات کا شکار ہونا پڑ رہا ہے ، اور ضروری تلافی کے باوجود بات ختم نہیں ہوتی۔ بہر حال تنقیدی و تاریخی اعتبار سے یہ سب بے حقیقت ہیں اور اس دور کا محقق ان سے مناسب طور سے مستفید نہیں ہو سکتا ۔

اس کے بعد جو تذکرے لکھے گئے اُن میں گلِ رعنا ، شعرالہند اور تذکرۂ خمخانۂ جاوید کو بہت خصوصیت حاصل ہے ۔ یہ تذکرے اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے مفید ہیں ۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید جس قدر بھی شائع ہو چکا ہے جامع ترین چیز ہے ، تنقیدی حیثیت سے یک رنگ بھی ہے اور منصفانہ انداز میں جانبدار بھی۔ تاریخی اعتبار سے بھی جہاں تک یہ تذکرہ دیکھا گیا ہے مکمل ہے ۔ مؤلف نے ایسے ایسے نامعلوم اور گمنام شعرا کا کھوج لگایا ہے کہ اُن کے حالات پر آگاہ ہو کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر یہی تذکرہ بقیدِ زمانہ ترتیب دیا گیا ہوتا تو موجودہ قدر و قیمت سے کہیں زیادہ بلند ہوتا ۔ اور قدما کے متعلق وہ سب مسالہ اس میں موجود ہوتا جس کے لئے ہمارا ذوق ادب اب بھی بے چین ہے ۔

شعرا کے تذکرے عام طور سے ردیف وار ترتیب دیئے جاتے ہیں ۔ زمانۂ حال کے چند تذکروں کے سوا باقی تمام تذکرے ردیف وار ہی لکھے گئے ہیں ۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ فضول اور فرسودہ طریقہ کار دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ اس طرح اچھے اور بُرے اور زیادہ سے زیادہ شاعروں کے حالات تو ایک جگہ ضرور مجتمع ہو جاتے ہیں لیکن جہاں تک زبان و فن کے تدریجی ارتقا کے اظہار کا تعلق ہے ایک ردیف وار تذکرہ گورکھ دھندے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ۔ خمخانۂ جاوید کو اس کے مؤلف نے جس عرق ریزی ، دقت نظری ، تحقیق و تلاش سے مرتب کیا ہے وہ قابلِ داد ہے ۔ لیکن یہی چار جلدیں اگر اسی قدر محنت ، اتنے ہی وقت اور اسی قدر روپیہ صرف کرنے کے بعد بقیدِ زمانہ ترتیب دی گئی ہوتیں تو اس نامکمل حالت میں بھی کم از کم اس قدر تو ضرور فائدہ ہوتا کہ متقدمین سے متعلق ایک مستند اور مکمل ریکارڈ ہمارے لئے محفوظ ہو جاتا ، اور لالہ سری رام کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر آئندہ تعمیر کی بلندی بہت آسان ہو جاتی ۔ موجودہ حالت میں اس تذکرے کی یہ چار جلدیں جامع ہونے کے باوجود تشنہ و نامکمل ہیں ۔

موجودہ دور کے بعض پنجابی اور دکنی تذکرے تاریخی و تحقیقی اعتبار سے بہت باوقعت ہیں ۔ پنجاب میں اردو

دکن میں اُردو، اُردو شہ پارے اور مرقع سخن وغیرہ بقیدِ زمانہ لکھے گئے ہیں۔ اِن تذکروں کو پڑھنے والا جہاں افادی اعتبار سے تشنہ نہیں رہ سکتا وہیں اِن تذکروں میں صدہا باتیں ایسی پیش کی گئی ہیں جو انتہائی بصیرت افروز ثابت ہوسکتی ہیں۔ ابھی حال میں حیدرآباد سے نصیرالدین صاحب ہاشمی نے ایک تذکرہ "مدراس میں اُردو" کے نام سے شائع کیا ہے۔ چھوٹے سے سائز پر ۱۹۰ صفحات کا تذکرہ ہے لیکن محض بقیدِ زمانہ ہونے کی بنا پر ایک بہترین چیز ہے جو مدراس کے ادبی ولسانی ارتقاء کے اظہار پر پوری طرح حاوی ہے اور تاریخی وتنقیدی اعتبار سے اس میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

اور بھی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جنھوں نے فنِ تذکرہ نویسی کی آئندہ تمام ترقیوں کو روک دیا ہے، اور تلاش وتحقیق کی تمام راہیں مسدود کردی ہیں۔ تمام قدیم وجدید تذکرے متعلقہ کتابوں کے ماخذ ہیں۔ انتخاب واخذ کے بغیر کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں کسی تذکرے کے ماخذ کا صحیح ودرست ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ روایات کی تکرار پوری صحت اور کلی اطمینان کے ساتھ ہوتی رہے۔ لیکن ہمارے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب ہم بہت سے تذکرہ نویسوں کو اختلافات، تصرفات اور ایجادات کے غلط ونارواارتکاب میں مبتلا پاتے ہیں اس خیال کی وضاحت کے لئے میں بعض ہندو شعراء کے وہ مختلف حالات پیش کرتا ہوں جن سے آپ کو مولفین کے واقعاتی وادبی اختلافات کا اندازہ ہوجائے گا۔ اور پتہ چلے گا کہ تذکروں میں شعراء کے نہ صرف حالات مسخ کئے گئے ہیں بلکہ اِن کے شاعرانہ کمالات میں بھی اختراع وتصرف، اضافہ واصلاح سے کام لیا گیا ہے۔

(۱) منشی شیو سنگھ ظہور۔ ایک قدیم شاعر تھے، دہلی وطن تھا، انعام اللہ خاں یقین سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ نہایت قابل وفاضل افراد میں سے تھے۔ تذکروں میں ظہور کی وطنیت متنازعہ فیہ ہے، کوئی اِن کو دہلی کا باشندہ بتاتا ہے اور کوئی آگرے کا۔ منشی دیبی پرشاد نے ۱۸۸۵ء میں "شعرائے ہنود" کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا اس کی جلد دوم صفحہ ۹۱ پر اور تذکرہ ابراہیمی مولفۂ علی ابراہیم کے صفحہ ۱۷۳ پر ظہور کے دہلوی ہونے کا ثبوت موجود ہے، لیکن سید فتح علی گرویزی اپنے تذکرۂ ریختی گویاں میں صفحہ ۱۰۰ پر ان کے متعلق بوثوق تمام یہ لکھتے ہیں کہ "در اکبرآباد بسری کرد"

ظہور کا ایک شعر ہے:-

بیاباں میں مرے مرنے سے اب تک خاک اُڑتی ہے　　مرے ماتم کے کرنے سیتی ویرانہ نہ باز آیا

تمام قدیم تذکروں میں یہ شعر اسی طرح درج ہے لیکن گرویزی نے اس شعر کو اس طرح لکھا ہے:-

بیاباں میں مرے مرنے سے اب تک خاک اُڑتی ہے　　مرے ماتم کے کرنے سے تو ویرانہ نہ باز آیا

"سیتی" قدیم بول چال کا نمونہ ہے جس کو "سے" کے معنوں میں قدماء نے استعمال کیا ہے۔ گرویزی

کے اندراج کو اگر صحیح مان لیا جائے تو پرانی زبان جو اُس زمانے کا پتہ دیتی ہے باقی نہ رہے گی۔

ہم کسی زبان کی ترقی و توسیع کے مختلف انداز اور مدارج پر اُسی وقت آگاہ ہو سکتے ہیں جب کہ قدیم آثار کا بجنسہٖ تحفظ کیا گیا ہو۔ اُردو اپنی ترقی و وسعت کے اعتبار سے خواہ کسی مرتبے پر ہی کیوں نہ پہونچ جائے، اس کے ترکیبی و لسانی قواعد میں کتنا ہی ردو بدل کیوں نہ ہو جائے لیکن قدیم الفاظ و مستعملات کی تراکیب میں اصلاح و مداخلت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ وہ تو کچھا اپنے دقیانوسی انداز ہی میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) منشی سیتارام عمدہ - یہ بھی قدیم شعرا میں سے تھے، اصل وطن کشمیر تھا، ہندو شعرا میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ بعض تذکروں نے اِن کے نام سے بھی اختلاف کیا ہے۔ تذکرۂ دیبی پرشاد کے صفحہ ۱۰۶ پر ان کا نام "چنتا رام" درج ہے۔ نام کے معمولی اختلاف کے علاوہ عمدہ کے بعض اشعار میں بھی اختلاف ہے۔ عمدہ کا شعر ہے؛

خراب مجکو نہ کر جان آشنا کرکر بُرا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کرکر[1]

منشی دیبی پرشاد نے "شعرائے ہنود" صفحہ ۱۰۶ پر، اور مولوی عبدالغفور نسّاخ نے "سخن شعراء" کے صفحہ ۳۳۷ پر اس شعر کو یوں پیش کیا ہے:

خراب مجکو نہ کر جان آشنا کہہ کر بُرا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کہہ کر

جناب عمدہ کا ایک اور شعر ہے:-

مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولونکی چادر کی کہ میری نعش پر وہ سرو گل رخسار پہونچے گا[2]

منشی دیبی پرشاد نے اس شعر کو بھی قافیہ بدل کر پیش کیا ہے؛

مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی کہ میری نعش پر وہ سرو گل اندام پہونچے گا[3]

منشی آنندرام مخلص - قوم کے کھتری تھے، دہلی وطن تھا۔ محمد شاہ کے عہد میں آپ نامی گرامی اُمرا میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی زبان میں کمال حاصل تھا۔ خان آرزو کے شاگرد رشید تھے۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم صفحہ ۲۱۸ پر ان کا ایک شعر ہے؛

آنے کی دھوم کس کی گلزار میں پڑی ہے ہاتھ ارگجی کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

مخلص کا یہ شعر تذکرۂ چمنستان شعرا صفحہ ۲۸۶ پر یوں درج کیا گیا ہے:-

---

[1] دیکھو چمنستان شعرا صفحہ ۳۴۸ وتذکرۂ گردیزی صفحہ ۱۰۹ [2] دیکھو چمنستان شعرا صفحہ ۳۴۲ وتذکرۂ گردیزی صفحہ ۱۰۸
[3] شعرائے ہنود صفحہ ۱۰۶

دھوم آونے کی کس کی گلزار میں پڑی ہے ہار ار گجے کا یا کہ نرگس لئے کھڑی ہے

تذکرۂ دیبی پرشاد صفحہ ۱۰۸ پر یہ شعر اس طرح لکھا ہے:

دُھوم آونے کی کس کی گلزار میں پڑی ہے ہاتھ ار گجے کا پیالہ نرگس لئے کھڑی ہے

(۴) منشی سیوک رام بیتاب — بقاء اللہ خاں کے شاگردوں میں سے تھے، ان کا تفصیلی حال مجھے قدیم و جدید کسی تذکرے میں نہیں ملا، صرف اُن کا نام اور دو شعر دستیاب ہوتے ہیں۔ بیتاب کے نام اور اشعار میں بہ کثرت اختلاف ہے۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید[1] اور سخن شعرا[2] میں ان کا نام سیوک رائے لکھا ہے تذکرۂ جلوۂ خضر میں شیوک[3] رائے۔ تذکرۂ ابراہیم میں سنتو کھ[4] رائے درج ہے۔ تذکرۂ قائم میں سنتو کھرا[5] اور تذکرہ طبقات الشعرا مؤلفہ شوق سنبھلی میں منتو سکھ[6] رائے لکھا گیا ہے۔ نام کے اس اختلاف کے ساتھ ساتھ بیتاب کے اشعار بھی تصرف و اصلاح کی زد سے محفوظ نہیں رہے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

محبت کی بھی کچھ ہوتی ہیں کیا اے ہم نشیں راہیں کہ خوباں یوں ہمیں دُکھ دیں ہم اُن کو اس طرح چاہیں

نغمۂ عندلیب میں صلالہ پر یہ شعر اس طرح درج ہے:-

محبت کی بھی کیا ہوتی ہیں کچھ اے ہم نشیں راہیں کہ خوباں ہم کو یوں دُکھ دیں ہم اُن کو اس طرح چاہیں

بیتاب کا دوسرا شعر ہے:

اِدھر نالہ کیا میں نے اُدھر وہ مضطرب ہو کر چلا آیا عجب دن تھے کہ جن روزوں میں رکھتی تھیں اثر آہیں

شعرائے ہنود میں منشی دیبی پرشاد نے اس شعر کو یوں لکھا ہے:

اِدھر نالہ کیا اُودھر وہ مضطرب ہو چلا آیا عجب دن تھے کہ جن روزوں میں رکھتی تھیں اثر آہیں

تذکرۂ قائم میں صفحہ ۷۶ پر یہ شعر اس طرح درج ہے:

ادھر نالا کیا اُدھر وہ مضطر ہو چلا آیا عجب دن تھے وہ جن روزوں میں رکھتی تھیں اثر آہیں

(۵) لالہ بندرابن راقم — دہلی کے ایک مشہور شاعر گذرے ہیں۔ میر تقی میر اور مرزا سودا سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر ہے:

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض مجکو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں

لچھمی نرائن شفیق چمنستان شعرا صـ۱۳ پر اس شعر کو یوں لکھتے ہیں:-

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض مجکو قسم ہے توڑوں اگر برگ و بر کہیں

---

[1] خمخانۂ جاوید صـ۱۱۱ [2] سخن شعرا صـ۱۰۱ [3] جلوۂ خضر صـ۱۱۱ جلد اول حصۂ اول [4] تذکرۂ ابراہیم صـ۸۰
[5] مخزن نکات صـ۵۰ [6] علی گڑھ میگزین اگست سنہ ۱۹۳۲ء

راقم کا ایک دوسرا شعر ہے:

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ میگساراں   رہے وہ عمل کہ ہووے سببِ نجاتِ یاراں

اِس شعر میں منشی دیبی پرشاد نے تذکرۂ شعرائے ہنود صفحہ ۶۳ پر یوں ترمیم فرمائی ہے:

مری بدشرابیوں سے کریں توبہ مَے گساراں   رہے وہ عمل کہ ہووے سببِ سحاب باراں

اوپر کا شعر قدیم تذکروں میں کسی اختلاف کے ساتھ نہیں ملتا بجز اِس کے کہ منشی دیبی پرشاد نے اِس شعر کے قافیہ میں ردوبدل فرمایا ہے۔ لیکن ہماری حیرت کی حد نہیں رہتی جب اِسی شعر کو ایک نئے اختلاف کے ساتھ ہم تذکرۂ مخزنِ نکات میں دیکھتے ہیں۔ اس میں صفحہ ۶۰ پر یہ شعر یوں درج ہے:۔

مرے مَے پیئے سے زاہد کریں توبہ میگساراں   رہے وہ عمل کہ ہوئے سببِ نجات یاراں

اوپر کے تمام اختلافات بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو یہی معمولی معمولی باتیں اس دور کے ایک تذکرہ نویس کے لئے انتہائی پریشانی کا باعث بن سکتی ہیں اور وہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کر سکتا کہ یا تو کسی ایک تذکرے پر اطمینان کر کے اس کو اپنا ماخذ قرار دے لے ورنہ پھر اپنی ذاتی رائے کے ماتحت متنازعہ اشعار میں جدّت و تصرّف کا وہ قدیم دستور کے مطابق مجاز ہے۔

ترمیم و تصرّف کی تہمت سے یہ نہ سمجھئے کہ قدیم تذکرے ہی متصف ہیں بلکہ زمانۂ حال کے بھی بعض مؤلفین اس علت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اور یہ غلط فہمیاں محض متقدمین کی مختلف روایتوں کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں

(۶) پنڈت رتن ناتھ سرشار ہندوستان کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں، اُن کا سنہ پیدائش ۱۸۵۱ء اور سنہ وفات ۱۹۰۳ء بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس دور کا ایک تذکرہ نویس جو صحیح حالات کا متلاشی ہے سخت حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے جب وہ ایک ایسے ادیب اور شاعر کے متعلق بھی تذکروں میں غلط روایات پاتا ہے۔ جس کو گزرے ہوئے ابھی نصف صدی بھی نہیں ہوئی ہے۔ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم۔ اے لیکچرر الہ آباد یونیورسٹی نے ادب اُردو کی ایک مختصر تاریخ لکھی ہے اس میں صفحہ ۵۰ پر سرشار کا سنہ ولادت ۱۸۲۶ء یا ۱۸۲۷ء درج ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۵۲ پر سرشار کا سنہ وفات ۱۹۰۲ء دیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ سرشار نے اگر ۱۸۲۶ء میں جنم لیا تو ۷۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور اگر ۱۸۲۷ء میں تولد ہوئے تو ۷۵ سال کی اچھی عمر پا کر فوت ہوئے۔ سرشار کے زمانۂ حیات کے متعلق اختلاف ضرور ہے لیکن جناب اعجاز نے اس کو سب سے زیادہ مشتبہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب الہ آباد یونیورسٹی کے طلبار کے استفادہ کے لئے لکھی گئی ہے، طلبار جن میں توجہ، غور اور تحقیق کا مادّہ کم ہوتا ہے اور وہ جو کچھ پڑھتے ہیں امتحان میں پاس ہونے کے لئے پڑھتے ہیں، لہٰذا اس قسم کی روایت سے وہ

جس قدر بھی غلط اطلاع حاصل کرسکتے ہیں صاف ظاہر ہے۔

تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں سرشار کا سنہ وفات ۱۹۰۳ء دیا گیا ہے اور اُن کی عمر انتقال کے وقت ۵۵ یا ۵۶ سال کی بتائی ہے۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو پھر سرشار کا سنہ ولادت ۱۸۴۷ء یا ۱۸۴۸ء قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۷) منشی لچھمی نراین صاحب شفیق - یہ حضرت چمنستانِ شعرا کے مؤلف تھے اور دکن میں بطور پیشکار صدر الصدور متعین تھے۔ سنہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، شیخ عبد القادر مہربان سے تعلیم حاصل کی، سترہ سال ہی کی عمر میں مختلف علوم سے بدرجۂ کمال آگاہ ہوگئے۔ شعر و شاعری میں علامہ آزاد بلگرامی سے استفادہ کیا اٹھارہ سال کی عمر میں تذکرہ چمنستان شعرا ترتیب دیا۔ شفیق کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا، حالانکہ وہ خود ایک تذکرے کے مؤلف تھے، ان کا یہ تذکرہ نایاب تھا مولوی عبد الحق صاحب نے بڑی کوشش و تلاش کے بعد حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں انجمن ترقی اُردو نے اس کو شائع کیا ہے، اس کا مقدمہ مولوی صاحب نے خود لکھا ہے۔ شفیق کے سنہ ولادت کے متعلق مولوی عبد الحق صاحب کی ایک تحریر نے مجھے عجب غلط فہمی میں مبتلا کردیا ہے۔ مقدمہ کے صفحہ ۲ پر شفیق کا سنہ ولادت سنہ ۱۱۵۵ھ درج ہے۔ اسی مقدمہ کے صفحہ ۱۶ پر چمنستان شعرا کا سنہ تالیف سنہ ۱۱۷۵ھ دیا ہے۔ یہ بھی اقرار ہے کہ شفیق نے یہ تذکرہ ۱۸ سال کی عمر میں لکھا۔ مولوی صاحب کا دیا ہوا سنہ ولادت اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ شفیق نے چمنستان شعرا دس سال کی عمر میں لکھا۔ سنہ تالیف تو صحیح ہے اس لئے کہ چمنستان شعرا، تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۱۷۵ ہی برآمد ہوتے ہیں لیکن سنہ ولادت میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ شفیق اپنی پیدائش کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ:

"تاریخ دوم شہر صفر المظفر سنہ ثمانیہ و خمسین و مائۃ و الف ہجری ایں ہیچمدان جامۂ ہستی پوشید (چمنستان شعرا صفحہ ۱۹۱)

بظاہر یہ غلطی بھی معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ کتاب جس مشکل، کوشش اور تلاش و کاوش سے دستیاب ہوئی ہے اس پر نظر رکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کا نام تاریخی نہ ہوتا یا شفیق کا مقدمہ شاملِ کتاب نہ ہوتا یا شفیق نے اپنے زمانۂ حیات پر روشنی نہ ڈالی ہوتی تو پھر مولوی صاحب کی تحریر پر کس کو شبہ ہوسکتا تھا، یہی سہو اپنی جگہ پر حقیقت بن کر رہ جاتا۔

جس قسم کی اغلاط اور سہو میں پیش کررہا ہوں اُن کو مؤلفین عام طور پر کاتب کے سر ڈال دیا کرتے ہیں یا لیتھو کی چھپائی مورد الزام ہوتی ہے۔ لیکن میں نے جن کتابوں سے مفصلہ بالا غلطیوں کو اخذ کیا ہے، اُن سب میں "غلط نامے" موجود ہیں۔ اور تذکرہ چمنستان شعرا تو ٹائپ میں شائع ہوا ہے جس سے اغلاط کا احتمال کم رہ جاتا ہے۔

ان چھ یا سات مثالوں سے آپ کو تذکروں کے اختلافات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ قدیم تذکرے تو اس قسم کی خامیوں سے بھرے پڑے ہیں، علاوہ ادبی و واقعاتی اختلافات کے تذکروں میں ایک اور زبردست خامی ہے، جس کو مسلمانوں نے تو اتنا محسوس نہیں کیا لیکن ہندو برادران وطن نے شدت کے ساتھ اس کو سمجھا ہے۔ اور اسی باعث آج ہر ہندو زباندان شاکی ہے۔ کہ تذکروں میں ہندو شعرار کے ساتھ انتہائی زیادتیاں کی گئی ہیں۔ ان کے محاسن کو مسلمانوں کے مقابلے میں بُرے انداز سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی معمولی خامیوں کو بھی زبردست ادبی کوتاہیوں کے مترادف ثابت کیا ہے۔ ہندو صاحبان کا یہ خیال تھوڑی واقعیت ضرور رکھتا ہے لیکن اس قدر سنگین ہرگز نہیں جتنا کہ سمجھا اور بتایا گیا ہے کسی ایک تذکرے کو دیکھکر یا کسی ایک شخص کی رائے سے متاثر ہو کر ہنگامہ آرائی پر مستعد نہ ہونا چاہیئے۔ اعتراض کو منصفانہ ذہنیت کے ساتھ پرکھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لئے وہ تمام تذکرے جو شروع سے اس وقت تک شائع ہوئے ہیں دیکھے جائیں تو ہندو صاحبان کے جہاں اس اعتراض کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے وہیں ایک دوسری حقیقت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے اور وہ یہ کہ تذکرہ نویسوں کے تعصب کے صرف ہندو صاحب کمال ہی شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ مسلمان شعرار بھی اس زد سے محروم نہیں رہے ہیں۔ جرأت کی شاعرانہ عظمت سے غالباً کسی ہندو صاحب الرائے کو انکار نہ ہو گا، تذکرۂ گلشنِ بےخار میں جرأت جیسے شاعر کے لئے یہ تحریر دیکھی جا سکتی ہے" یہ شخص اصول و قوانینِ شاعری سے بہرہ نہ رکھتا تھا، نغمات خارج از آہنگ گاتا تھا، اس کی ناموری کا باعث یہ ہوا کہ اشعار موافق طبائع اوباش و الواط کے کہتا تھا" سید انشار کی قادر الکلامی سے بھی آپ انکار نہیں کر سکتے لیکن مؤلف گلشنِ بےخار کو" اس کے کلام کی روش طریقۂ راسخہ پر نہیں" معلوم ہوتی۔ میر سوز بھی مستند شعرار میں سے تھے۔ ان کا کلام بھی مؤلف گلشنِ بےخار کو" جادۂ مستقیم سے ہٹا ہوا" نظر آیا ہے نظیر اکبرآبادی جیسا ہندوستانی شاعر بھی مؤلف مذکور کے نزدیک شاعر نہ تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ" اس کے شعر بازاریوں کے زباں زد ہیں اور بہ اعتبار ایسے اشعار کے اس کا شمار شعرار میں نہیں ہو سکتا" علامہ شبلی بھی موازنۂ انیس و دبیر میں نظیر اکبرآبادی کے کلام کو" سوقیانہ و مبتذل" قرار دیتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ کا اردو شعر و شاعری میں جو مرتبہ ہے اُس سے دنیا واقف ہے لیکن صاحب گلستانِ سخن اس کو بھی" بے معنی گو" بتاتے ہیں اور اس کے اشعار کو مہمل قرار دیتے ہیں۔ ارمغانِ گوکل پرشاد میں بھی ناسخ کے متعلق غلط بیانیوں سے کام لیا گیا ہے۔ منشی شیو پرشاد نے تو ناسخ کے متعلق یہاں تک لکھدیا ہے کہ" سرقۂ مضامین سے متقدمین کے فارسی کلام کو خراب کیا ہے"۔

نوٹ: جو عبارت واوین میں بند ہے تذکروں کی اصل عبارت ہے۔

ان واقعات کے بعد بھی یہ کہنا کہ ہندو شعراء کے حقوق مسلمان تذکروں میں پامال کئے گئے ہیں مضحکہ خیز بات ہے۔ ذرا دیر کے لئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلمان تذکرہ نویسوں نے خصوصیت کے ساتھ ہندو شعراء کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے تو پھر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندو تذکرہ نویسوں نے اپنے قومی شعراء کے حقوق کا کہاں تک تحفظ کیا ہے۔ دو ایک مثالیں اس سے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

(۸) منشی دیپ چند جوشم ۔ دہلی کے معززین میں سے تھے۔ تذکرۂ گلستانِ سخن جو ایک مسلمان کا لکھا ہوا ہے ان کے متعلق بتاتا ہے کہ عربی و فارسی میں منتہی تھے۔ فارسی میں امیر خسرو سے عقیدت تھی اور انھیں کا اتباع کرتے تھے۔ محسنات بدیعی اور مراعات النظیر سے تو ان کو عشق تھا۔ خزائن الفتوح جو امیر خسرو کی تصانیف میں بے بدل ہے جناب جوشم نے اس کا نثر میں ترجمہ فرمایا تھا۔ گلستانِ سخن کے الفاظ میں منشی دیپ چند مخزن العلوم تھے۔ لیکن یہی بلند پایہ ادیب اور شاعر جب تذکرۂ دیبی پرشاد میں مذکور ہوتا ہے تو ایک ہندو صاحبِ قلم ان کے حق میں یہ فیصلہ کرتا ہے:۔

از بسکہ نظم میں مہارت حاصل نہ تھی شعر گوئی کی طرف توجہ کرنا اختلالِ حواس کا نتیجہ تھا۔ اور جوشم تخلص کا اختیار کرنا اس امر پر دال ہے۔ (تذکرہ شعرائے ہنود صفحہ ۵ جلد دوم)

ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے:۔

(۹) جیون مل نامی ایک قدیم شاعر گزرے ہیں۔ اُن کا تخلص "عشاق" تھا۔ تمام تذکروں میں صرف ان کا یہ تخلص اور ایک شعر ملتا ہے۔ ان کا نام قائم کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔ منشی لچھمی نراین شفیق ان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"از قوم کھتری ہندوستان است۔ از تخلص او معلوم می شود کہ بہرہ از علم نمی دارد"[1]

اِس قدر لکھنے کے بعد شفیق نے "عشاق" کا یہ شعر دیا ہے۔

خط سے زیادہ اور ہوا حسن یار کا آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑا بہار کا

شفیق نے عشاق کا یہ حال تذکرۂ گردیزی سے لیا ہے جس کا ایک مسلمان مؤلف تہذیب کو ہاتھ سے دیئے بغیر عُشاق کے متعلق صرف اس قدر لکھتا ہے۔

"رسائی طبعش از تخلص پیدا است و بلندی ذہنش از سخنش ہویدا"[2]

دونوں تذکروں کی تحریروں کو دیکھکر انصاف کیجئے کہ کس کی تحریر سے کراہت محسوس ہوتی ہے اور کس نے ایک اچھے اور مستند شاعر کو صاف صاف لفظوں میں جاہل قرار دے دیا ہے۔ تخلص دیکھکر تردد ضرور ہوتا ہے لیکن عشاق کا شعر اس مشکل کو بھی حل کر دیتا ہے۔ شاعر کا جب پورا حال نہیں معلوم اور صرف اس کا ایک شعر اور نام

---

[1] چمنستان شعرا صفحہ ۲۲۵ ۔ [2] تذکرہ ریختی گویاں صفحہ ۱۰۹

دستیاب ہوتا ہے تو ضرورت اس کی تھی کہ اسی شعر پر غور کر کے کوئی مناسب رائے قائم کی جاتی۔ عشاق کا شعر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک ظریف شاعر کے دل و دماغ کا نتیجہ ہوں، لہٰذا ایک ظریف شاعر کے لئے "بہرہ از علم نمی دارد" کہہ دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اگر صرف تخلص کی عجوبیت ایک شاعر کو جاہل و بے علم بنا سکتی ہے تو پھر تذکرۂ خندۂ گل مولفہ آسی لکھنوی اٹھا کر دیکھئے کہ اس میں کیسے کیسے عجیب و غریب تخلص کے شعرا جلوہ گر ہیں، دو چار نمونے ملاحظہ ہوں:-

منشی مادھو رام باپ۔ سید اسحاق چچا۔ رام نراین بلبلیلے۔ عبدالکریم مہرچند۔ عبدالقادر ریل۔ مصطفےٰ خاں احمق حضرت آبنوس۔ جناب مہتر۔ منشی اکٹرلین۔ جناب ہائے والے۔ میاں چوں چخ۔ اور حضرت بھسنٹ وغیرہ وغیرہ

ان تمام تفصیلات کے بعد غالباً یہ عرض کرنا حق بجانب ہوگا کہ تذکروں میں شعرا کے حقوق کی پامالی کی بنا فرقہ وارانہ ذہنیت یا قومی تعصب نہیں بلکہ ان ناگوار خامیوں کا سبب جہاں متقدمین کی روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آنا ہے وہیں مولفین کی ذاتی رائیں اور خود پسندیاں بھی شامل حال ہیں۔ غرض شعرا کی پگڑیاں اچھالنے میں مسلمان اور ہندو تذکرہ نویس دونوں شریک رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ دکھانے کی بھی ضرورت ہے کہ ہندو تذکروں نے مسلمان شعرا کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا، یہ ایک طول طویل بحث ہے اور اس کے متعلق بھی میرے پاس کافی مسالہ موجود ہے طوالت کے اندیشے سے فی الحال دو ایک معمولی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱۰) شیخ علی حزیں سے کون واقف نہیں، ان کے علمی مرتبے کا بھی سب کو اندازہ ہے، ان کے شاگردوں اور قدردانوں میں متعدد ہندو اہل کمال بھی تھے، ان کے ہمعصر شعرا میں ایک صاحب پنڈت گوبند رام زیرک تھے۔ حزیں سے پنڈت جی کی خوب شاعرانہ نوک جھونک رہا کرتی تھی اور ایک دوسرے پر برابر کی شاعرانہ چوٹیں ہوا کرتی تھیں لیکن یہ مخالفت کسی مذہبی یا قومی تعصب کی بنا پر نہیں تھی، بلکہ اس قسم کی شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا تو ہمیشہ رواج رہا ہے۔ منشی جگموہن ناتھ صاحب رینہ اپنے تذکرۂ "بہار گلشن کشمیر" میں شیخ علی حزیں جیسے بے لوث شاعر کے لئے یوں رقمطراز ہیں:-

شیخ محمد علی حزیں کی طبیعت تعصب سے خالی نہ تھی، وہ زیرک کو ہمیشہ اپنا ایک زبردست حریف سمجھتا رہا۔ چونکہ دل میں غبار بھرا تھا حزیں نے اس کو بھی دل کھول کر ایک ہجو میں نکالا۔ (بہار گلشن کشمیر ص۱۱۱ جلد اول)

اس ناموزوں تحریر کے علاوہ جناب رینہ نے ایک غلط روایت بھی اپنے تذکرے میں درج کر دی ہے وہ بھی سنئیے:-

راجہ جسونت سنگھ پروانہ ہندو شعرا میں ممتاز ترین شخص تھے، یہ بھی حزیں کے ہمعصر تھے ایک روز شیخ سے

ملنے کے لئے گئے اور اطلاع کرائی۔ شیخ چونکہ حد درجہ نازک مزاج تھے پروانہ کی بے وقت تشریف آوری ان کے کسی انہماک میں مخل ثابت ہوئی، از رہِ مزاح یہ مصرعہ کہکر بھیجا،

"دریں بزم رہ نیست بیگانہ را"

پروانہ بھی بڑے حاضر جواب تھے، برجستہ دوسرا مصرعہ فرمایا:

"کہ پروانگی داد پروانہ را"

شیخ علی حزیں پروانہ کی اس برجستگی سے بہت خوش ہوئے، دوڑے ہوئے باہر آئے اور پروانہ کو سینے سے لگا لیا اور نہایت احترام وعزت سے اندر لے گئے[1] رنیہ صاحب نے اس واقعہ کو گوبند رام زیرک سے متعلق بتایا ہے[2]

منشی باس کرن عرف ناتھو جی مروت ایک اچھے اور مستند شاعر تھے، لکھنؤ کے رہنے والے کشمیری برہمن تھے اور جناب امانت سے فیض تلمذ حاصل تھا۔ منشی دیبی پرشاد نے اُن کی ایک غزل جس میں نو شعر ہیں اپنے تذکرے میں صفحہ ۴۰ پر دی ہے۔ یہ غزل تذکرۂ سراپا سخن کے صفحہ ۱۹۵ سے اخذ کی گئی ہے۔ سراپا سخن میں اس غزل کے دو مطلعے لکھے ہیں لیکن منشی صاحب مذکور نے اپنے یہاں صرف ایک مطلع لکھا ہے جو یہ ہے:-

جب مجھ پہ چھوڑ لیتے ہیں تیغِ جفا کے ہاتھ دیتے ہیں خوں بہا وہ حنا کے دکھا کے ہاتھ

دوسرا مطلع منشی دیبی پرشاد نے حذف کر دیا، اور شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس مطلع میں جناب مروت سے ایک اسلامی عقیدے کے اظہار کا قصور سرزد ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

مشکل کشا نہ کیوں کہوں مشکل کشا کے ہاتھ مشہور ہیں جہان میں حیدر خدا کے ہاتھ

بالکل اسی قسم کی ایک مثال اور لیجیے،

منشی راج بہادر زخمی، کاکوری کے رہنے والے تھے، ایک معزز کالیستھ خاندان کے فرد تھے، شاعری کا بہت اچھا مذاق تھا۔ طاہر موہانی سے مشورۂ سخن فرماتے تھے، ان کا ذکر خمخانۂ جاوید میں موجود ہے۔ زخمی کی ایک غزل کا شعر ہے،

کیا ہوائے نفس پر غالب ہو انسانِ ضعیف کچھ ہوا سے زور چل سکتا نہیں ہے کاہ کا

خمخانۂ جاوید میں اس زمین کے چار شعر لکھے گئے ہیں، جن تذکروں میں زخمی کا ذکر ہوا ہے اُن سب میں اس زمین کے چھ شعر ملتے ہیں، لالہ سری رام نے دو شعر حذف کر دیئے، اور کیوں حذف کر دیئے اس کی وجہ خود شعر بتائیں گے،

درکِ ماہیت میں اُس کے عقلِ انساں ہیچ ہے ماعرفنا قول ہے اے دل رسول اللہ کا

---

[1] شعرائے ہنود جلد دوم صفحہ ۳۸ [2] بہارِ گلشن کشمیر صفحہ ۳۷۶ جلد اول

حاسد کج فہم تیغ رشک سے لسبمل ہوئے مدح خواں جب سے ہوا زخمی رسول اللہ کا

بتائیے یہ کیا ہے؟ بظاہر ہمارے اور آپ کے نزدیک یہ معمولی باتیں ہیں جن کو نظرانداز کئے بغیر چارۂ کار نہیں لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ ہندو صاحبان کی طرح مسلمانوں میں بھی ابھی بہت سی ہستیاں ایسی موجود ہیں جو تذکرہ نویسوں کی ان معمولی فروگذاشتوں کو بھی تعصب و فرقہ داری کے مترادف سمجھتی ہیں۔

جس قسم کی بے اعتنائیوں، زیادتیوں اور حق تلفیوں کے انداز ہندو صاحبان کو مسلمان تذکروں میں نظر آتے ہیں بالکل ویسے ہی حالات و واقعات سے تمام ہندو تذکرے مملو ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں جانب داری کو کام فرماتے ہوئے صرف ایک قوم یا کسی ایک فرقے کو ملزم قرار دے لینا انصاف سے بعید ہے، بلکہ یکزبان ہو کر یہ کہنا چاہیئے کہ اِن خامیوں سے نہ تو مسلمان تذکرے خالی ہیں اور نہ ہندو تذکروں نے رواداری و انصاف پسندی کو روا رکھا ہے۔ اور اب وقت اس کا ہے کہ ان فروعی باتوں سے قطع نظر ہم متحد ہو کر کوئی ایسا مفید کام کریں جس کی افادی حیثیت مشترک ہو۔

ستارے کی خودکشی

ایک ستارہ آغوشِ فلک سے تڑپ کر سمندر کے نیلگوں پانی میں کود پڑا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالمِ دیوانگی میں ہے! لاتعداد ستاروں نے خوف و اضطراب کی نظروں سے دیکھا کہ کس طرح آسمان کی ایک روشن قندیل جو ان کے ساتھ مدت مدید سے جگمگا رہی تھی۔ چند لمحات کے اندر تاریکی میں غائب ہو گئی ـــ

میں گہرے سمندر میں اترا ـــ اسکی تہہ میں متعدد ستارے بکھرے ہوئے تھے، جن کی روشنی ہمیشہ کیلئے زائل ہو چکی تھی۔ آخر اس گم شدہ ستارے پر کیا مصیبت نازل ہوئی؟ اس سوال کا جواب صرف میں ہی جانتا تھا ـــ صرف مجھی کو معلوم تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ یہ گم شدہ ستارہ آسمان کی آغوش میں جلوہ طراز تھا۔ کون سی چیز اس کو دعوتِ مرگ دے رہی تھی۔ یہ خندۂ پیہم کا عذاب تھا۔

کوئلے کا ایک ٹکڑا اپنی سیاہی کو چھپانے کے لئے ہنستا ہے۔ جس قدر یہ ہنستا ہے اسی قدر جلتا ہے۔ اسی طرح یہ ستارہ بھی ہنسا اور روشن ہو گیا۔ جب جلنے کی مصیبت زیادہ برداشت نہ کر سکا تو روشنی کی مملکت سے ٹھنڈے سیاہ پانی میں کود پڑا۔

ہزاروں لاکھوں چمکدار ستاروں نے اس گرے ہوئے ستارے کو دیکھا اور مایوسی کا قہقہہ لگا کر زبانِ حال سے کہا کہ ـــ

"اس ستارے کی موت سے ہمارا کچھ نقصان نہیں، آسمان اسی طرح ابدالآباد تک جگمگاتا رہے گا۔

(ماخوذ) ڈاکٹر ٹیگور

ماہِ نو

(از منشی جگدیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے ایل ایل بی)

ضو فگن عرش پہ ہے روحِ بہارِ خنداں　　　عشرتِ دیدۂ نظارہ ہے کیفِ پرّاں
خندۂ غنچۂ گُل چینِ جبینِ تاباں　　　برق سی ایک ہے یَم نیل میں گویا لرزاں
حلقہ زن اوجِ فلک پر یہ ضیا طُور کی ہے　　　قشقۂ مہرِ درخشاں ہے کرن نُور کی ہے
تہِ دامانِ ہوا شمع کوئی ہے روشن　　　کھُل گیا ہے کسی مہوش کا سنہری کنگن
موجِ سیمابِ مطلّا ہے کہ ہیرے کی کنی　　　کہکشاں کا ہے سفینہ کہ عقیقِ یمنی
پرتوِ خور سے ہے زرتار یہ چاندی کی کماں　　　جس کے خم پر ہے تصدق خمِ ابروئے بُتاں
خاتمِ لیلیٰ شب کا ہے دل افروز نگیں　　　یا دہکتی ہوئی کافور کی بندی تو نہیں
لوحِ گردوں پہ کشیدہ ہے طلائی جدول　　　یا کسی حُور کے ماتھے پہ لگا ہے صندل
پردہ پوشِ رُخِ روشن ہے سنہری آنچل　　　یا ہے کافورِ سحر منہ میں چھپائے بادل
شعلۂ برق کی یا کوندا بالی ہوگی　　　یا کسی کان کی ٹوٹی ہوئی بالی ہوگی
کعبۂ حُسن کے محراب جو کہیئے تو بجا　　　موجِ خونِ دلِ بیتاب جو کہیئے تو بجا
طفلِ ناداں ترا بچپن سے تمنّائی ہے　　　دل کے آئینہ میں تصویر اُتر آئی ہے
نوکِ مژگاں ترے اُٹھ اُٹھ کے قدم لیتی ہے　　　تجھکو آنکھوں پہ بٹھاتی ہے تو دم لیتی ہے

عکس افروز ہر اک آنکھ کے تل میں تو ہے
عرش پر رہ کے بھی ساکن مرے دل میں تو ہے

اِس دہر کا بندوبست دیکھو گے اگر　　　شانِ فتح و شکست دیکھو گے اگر
ہو جائے گی سطحِ ذہن خود سے ہموار　　　دنیا کے بلند و پست دیکھو گے اگر

جوش ملیح آبادی

خوابوں کی دُنیا

از حضرت وصل بلگرامی

ہماری دُنیا میں بھلا کون ایسا ہو گا، جس نے خواب نہ دیکھا ہو؟ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جو خواب کی اہمیت کو سمجھ گئے ہوں۔ آیئے، آج ہم آپ کو اُس دُنیا کا کچھ حال سُنائیں، جہاں خواب بستے ہیں۔ اس سے پہلے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے خود اُس دُنیا میں چلنا پڑے گا۔ یہ دُنیا بھی ہماری دُنیا کی طرح ایک حال پر نہیں رہتی۔ جو شخص اُس دُنیا میں پہونچتا ہے اُس کے لئے یہ نئی طرح سے نظر آتی ہے، مختلف قسم کے لوگوں کیلئے یہ دُنیا بالکل مختلف ہے۔ بچّوں کی دنیا کچھ اور ہے، جوانوں کی کچھ اور بوڑھوں کی کچھ اور۔

اِس دُنیا میں پہونچ کر ہمیں عجیب عجیب مناظر نظر آتے ہیں، جو اکثر اوقات ہماری سمجھ میں نہیں آتے، لوگوں سے پوچھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو نہ معلوم وہ کیا کیا باتیں بتلاتے ہیں۔ گویا اس دُنیا کی زبان کچھ ایسی ناقابلِ فہم ہے کہ مختلف لوگ اس کے مختلف معنی سمجھتے ہیں۔ آجکل کے لوگوں نے تو خوابوں کی دُنیا میں بھی سائنس کا عمل دخل قرار دیدیا ہے۔ اب خدا معلوم یہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ۔ سائنس کے آغاز سے پہلے لوگ اس زبان کی ترجمانی جو کچھ کرتے تھے، اُس پر سب کا اتفاق تھا۔ ہر خواب کے متعلق وہ لوگ یقین کے ساتھ کہتے تھے کہ اگر اس دُنیا میں کوئی شخص ایسے ایسے مناظر دیکھے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔

اِن لوگوں میں خواب کے متعلق دُو قسم کے خیالات تھے اور وہ اپنے خواب کو کسی بیرونی طاقت کا مظاہرہ سمجھتے تھے۔ اچھے خواب روحانی اور بُرے خواب شیطانی سمجھے جاتے تھے۔ سائنس کا آغاز ہوتے ہی یہ تمام کائنات علم نفسیات میں تبدیل ہو گئی، تعلیم یافتہ طبقے میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس امر میں شبہ رکھتے ہوں کہ خوابوں کا تعلق روحانیت کے علاوہ جسمانیت سے بھی ہے۔ سائنس کے آغاز نے جہاں ہمارے خوابوں کو باقاعدہ بتانا شروع کیا۔ وہاں اُس نے ہمیں ایک قسم کی مشکل میں بھی پھنسا دیا۔ اِس سے پہلے ہم اپنے خوابوں کی کچھ نہ کچھ تعبیر کر لیا کرتے تھے۔ لیکن سائنس کی وجہ سے اب تعبیریں تو ختم ہو گئیں، مگر اُن کی جگہ خالی ہے۔

خواب کہاں سے پیدا ہوتے ہیں؟ اور جب ہم جاگتے ہوتے ہیں تو اُس وقت کی حالت سے خواب کی حالت کا کیا تعلق ہے؟ اور خواب کے درمیان میں جو ہم اکثر چیختے چلاتے ہیں۔ اس کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ خواب

کی خصوصیات ہماری بیداری کی حالت سے مختلف کیوں ہوتی ہیں؟ آخر یہ سب کیا ہے؟ پھر جب ہم جاگتے ہیں تو خواب ہمارے خیال سے اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ جیسے ہمارے بچپن میں کوئی واقعہ ہوا ہو۔ اور ہم اُن واقعات کی کڑیاں جوڑنے میں بہت کچھ عاجز رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہم سوال تو یہی باقی رہتا ہے کہ آخر خواب کا مطلب کیا ہے؟ اس کے بھی دو رخ ہیں۔ پہلا یہ کہ جسمانی حالات سے ہمارے خوابوں کا کیا تعلق ہے؟ دوسرا یہ کہ آیا واقعی خوابوں کا کچھ مطلب بھی ہے؟ جس طرح اور نفسیاتی کیفیتوں کی حالت ہوتی ہے۔ خواب کے متعلق بھی تین قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں اور دُنیا کے اکثر فلسفیوں نے انمیں سے کسی ایک سے اتفاق کیا ہے۔ سب لوگ کم از کم اس بات کو ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ خواب کی حالت جسمانی حالت سے ضرور متعلق ہے۔ مثلاً شوبرٹ (Schubert) کہتا ہے کہ:۔

"خواب خارجی کائنات سے روح کے آزاد ہو جانے کا نام ہے۔ مادّہ کی بندشوں سے روح کی خلاصی کو خواب کہتے ہیں۔"

ان فلسفیوں میں سے تمام اس بلندی تک نہیں پہونچتے۔ لیکن اُن میں بہت اس امر کے قائل ہیں کہ خواب روحانی کیفیات کے مظاہر ہیں۔ اور روح کی ان اندرونی طاقتوں کے ظہور کا نام ہے۔ جن کے آزادانہ حرکات کو مادی دُنیا روکے رکھتی ہے۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ خواب کی زندگی غیر معمولی قوتوں پر قادر ہو سکتی ہے۔

لیکن تعجب اس امر کا ہوتا ہے کہ اکثر طبی ماہرین اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ جسمانی حالت کا کوئی اثر خواب پر ہو سکتا ہے۔ اِن کے نزدیک خواب قطعاً جسم کے حواس سے متعلق ہوتے ہیں، جو سونے والے کو خارجی یا داخلی طور پر متاثر کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سائنس کے ترقی کرنے اور خواب کے متعلق مختلف خیالات ہونے کے یہ خیال اب تک صحیح مانا گیا ہے کہ خواب کے کچھ نہ کچھ معنی اور اُن کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک حد تک خواب مستقبل کی پیشین گوئی بھی کرتے ہیں۔ اسی بنا پر خواب کی تعبیر بتانے کیلئے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں، خواب کی تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے خواب میں گذرتے ہوئے دیکھا ہے اُن کے بجائے ان سے مختلف یا موافق کچھ اور حالات فرض کرلیں کہ اس کی تعبیر یہ ہے۔ جتنے صحیح یہ حالات ہم کو معلوم ہوتے ہیں۔ اُتنی ہی آسانی ہم کو خواب کی تعبیر میں ہوتی ہے۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ واقعات کی مختلف کڑیوں کے مطالب مختلف طریقے پر جمع کر کے ایک تعبیر بتائی جائے یا اس طرح کہ خواب کو کُلیتاً لے کر اُس کی ایک تعبیر دیدی جاتی ہے۔ لیکن وہ دماغ جو سنجیدگی پسند زیادہ ہوتے ہیں یا اپنے کو اس قسم کا سمجھتے ہیں۔ وہ ان تمام باتوں پر ہنس کر خوش ہو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خواب کا کیا اعتبار۔

پروفیسر سگمنڈ فرائڈ (Professor Sigmund Freud.) جنھوں نے خواب کے متعلق کافی معلومات حاصل کی ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:۔ "ایک دن مجھے یہ معلوم کر کے نہایت تعجب ہوا کہ خواب کی حقیقت

کے متعلق وہی خیال صحیح ہے۔ جس کو ہم نے آج تک واہمہ پر مبنی سمجھا اور طبی خیال غلط نکلا۔

آگے چل کر نہایت وضاحت سے اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ خواب میں مختلف واقعات یکجا ہو جاتے ہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ ایک خواب میں جو مختلف مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا تعلق یکجائی طور پر کسی واقعہ سے ہو۔ بلکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خواب میں مختلف واقعات اور انسانی تجربات کی مختلف کڑیاں آکر مل گئی ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ تجربے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ خواب دماغی اور جذباتی خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں اور یہ غلط ہے کہ خواب حقیقت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

علاوہ اس کے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ خواب جن خیالات اور جذبات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ وہ خواب سے بہت زیادہ وسیع اور زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ جس خیال پر خواب کی بنا ہو، وہ بہت اہم ہی ہو۔ وہ معمولی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ اس معمولی خیال سے غیر معمولی خیالات متفق نہ ہو سکیں۔ تجربہ ہم کو بتاتا ہے کہ جب کسی خواب کے متعلقات کو غور سے دیکھا جاتا ہے تو خیالات کی کڑیاں اس طرح ملتی چلی جاتی ہیں کہ گویا سب ایک واقع سے متعلق ہیں۔

یہاں پہونچ کر ہم ظاہری اور باطنی خوابوں کا فرق سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ خواب جو کہ واقعات سے متعلق ہوتے چلے جاتے ہیں، ہم اُن کو ظاہری خواب کہتے ہیں اور جہاں ہم اس قسم کی تعبیر کرنے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ اور پھر اُن خوابوں کے متعلق یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ اُن کے معنی بہت کچھ ہیں، اُن کو باطنی کہتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی باطنی خواب ظواہر کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں، مثلاً ہم نے ایک خواب دیکھا لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن واقعات نے یہ خواب پیدا کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس خواب کی تعبیر ہم کو عملی صورت میں مل جاتی ہے۔ پھر اس پر یقین کرنا لازم ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی کو لوگ روحانی خواب بھی کہنے لگتے ہیں۔

اسی ظاہری اور باطنی تعلق کی بنا پر خوابوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کے وہ خواب ہیں، جن کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے واقعات کی کڑیاں سمجھ میں بھی آتی ہیں۔ اور جن کے متعلق ہم کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ایسے خوابوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور زیادہ تر چھوٹے بھی ہوتے ہیں، اور عام طور پر ان کی کوئی اہمیت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ان کے واقعات کی کڑیوں سے ہم کسی خاص واقع کو متعلق نہیں کر سکتے۔ ان خوابوں سے یہ بات بھی غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ خواب دماغی کیفیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہم ان خوابوں کو اُن واقعات سے بالکل علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہم کو نیم خوابی یا بیداری کی حالت میں پیش آتے ہیں۔ یہ حالت یقینی طور پر وہ حالت ہوتی ہے جبکہ دماغ مختلف قسم یا ایک اہم معاملے کے متعلق کچھ خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ہم خواب کو ایسے واقعات سے خلط ملط کرنے کی کوشش نہیں کرتے،

دوسری قسم کے خواب وہ ہیں جن کے ایک خاص معنی نکلتے ہیں، لیکن ہمیں وہ کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ہم اپنی دماغی کیفیات سے ان خیالات کا موازنہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس قسم کے خواب ہم کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہمارا ایک عزیز پلیگ میں انتقال کر گیا۔ لیکن اس کو یقین کرنے یا اس قسم کے شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو ہم کو بہت تعجب ہوتا ہے اور ہمارے دماغ میں صرف ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ خیال خواب میں کیوں آیا؟

تیسرے قسم کے خواب وہ ہیں جن کے نہ تو کوئی معنی ہوتے ہیں۔ نہ اُن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ عجیب پیچیدہ اور بے معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی زیادہ تعداد اسی قسم سے ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خوابوں کے متعلق ایک حقارت آمیز برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اور طبی ماہروں نے اس کے متعلق رائے دینے میں کوئی اہمیت نہیں سمجھی۔ تجربہ کرنے کے بعد ہم کو یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ ناقابل فہم اور پیچیدہ قسم کے خوابوں کا صاف اور قابل فہم قسم کے خوابوں سے ایک گہرا تعلق ہے اور وہ تعلق ایک خاص قسم کے خواص کے ماتحت ہے جو خوابوں کیلئے مخصوص ہیں۔

عموماً بچوں کے خواب بہت سادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر اُن کو خواب میں وہی خیالات آتے ہیں جو دن میں اُن کے دماغ میں رہے ہیں۔ مثلاً بچے اکثر خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ فلاں چیز کھا رہے ہیں یا فلاں چیز اُن سے چھین لی گئی۔ فلاں کھیل سے اُن کو منع کیا گیا اور فلاں کھیل وہ کھیل رہے ہیں۔ گویا خواب کی دُنیا میں انھیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو ہماری مادی دُنیا اُن کو نہ دے سکتی تھی۔ مادی دُنیا نے اُن کی آزادی کو محدود کر دیا تھا اور خواب کی دُنیا نے انھیں ہر قسم کی آزادی دے دی تھی کہ جو کچھ وہ چاہیں کر سکتے ہیں۔ گویا بچپن کا خواب نام ہے ناکام آرزؤں کی تکمیل کا۔ وہ تمنائیں جو اُن کے دلوں میں دن کے وقت پیدا ہوتی ہیں اور جن کی تکمیل کی راہ میں روڑے اٹکا دئے جاتے ہیں، رات میں اُن کے پورا ہو جانے کا نام خواب ہے۔ گویا ہماری دن کی زندگی سے خواب کی دُنیا کا ایک اچھا خاصہ تعلق ہے جو غیر محسوس طور پر کافی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ سمجھ لینا یقیناً غلطی ہوگی کہ اس قسم کے خواب صرف بچوں ہی کو نظر آتے ہیں، نہیں بلکہ بچوں کیسے خواب بڈھے بھی عموماً دیکھتے ہیں۔ اکثر ہم اپنی روزانہ زندگی کے واقعات خواب میں دیکھتے ہیں گویا ہم بستر سے اُٹھ کر منھ ہاتھ دھو کر کھانا کھا رہے ہیں اور پھر حسب معمول اپنے کام میں مصروف ہیں اور آخر کار کسی خاص قسم کی گڑبڑ ہوتے ہی اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ اکثر جب لوگ کسی جگہ سفر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو اس سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ ہم واقعی اس سفر کو طے کر رہے ہیں اور جہاں جہاں ہمیں جانا ہے اُن جگہوں کو خواب میں دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح جو کچھ ارادے ہم کرتے ہیں وہ پورے ہونے سے پیشتر ہمارے دماغ میں چکر لگانے لگتے ہیں۔ اس قسم کے طفلانہ خواب کی ایک بڑی عمدہ مثال قطبین کی مہم کے ایک سردار نے پیش کی ہے۔ جو

لکھتا ہے کہ جب ہمارے ساتھیوں کے پاس کھانے پینے کا سامان بہت کم رہ گیا تو وہ معمولاً رات کو خواب دیکھا کرتے تھے کہ اُنکے سامنے عمدہ عمدہ لذیذ کھانے رکھے ہیں۔ اور تمباکو، سگرٹ اور ٹوس کمن کے پہاڑ اُنکے سامنے کھڑے ہیں۔

جس طرح ہر مذہب کے لوگوں نے خواب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ مسلمانوں کے یہاں بھی خواب کے متعلق بہت کچھ لٹریچر موجود ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جس طرح خیالات اور جذبات کا تعلق خواب سے ہے، اُسی طرح طبی ماہرین نے بتایا ہے کہ معدہ کی خرابی کی وجہ سے اکثر متوحش اور ڈراونے خواب نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ خواب دیکھنے والے چیخنے اور چلانے لگتے ہیں، یہی حالت کبھی سینہ اور دل پر ہاتھ رکھنے سے بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

رہ گئی خواب کی تعبیر۔ اُس کے لئے ضروری نہیں کہ ہر خواب کیلئے تعبیر بھی ضروری ہو۔ لیکن یہ ضرور دیکھا اور مانا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن اور دماغ قدرتی طور پر ایسے ہوتے ہیں، جو خواب کی صحیح تعبیر دے سکتے ہیں۔ اُنکا دماغ اور ذہن خواب کے سُنتے ہی فوراً اُس کی تہ تک پہونچ جاتا ہے اور جو تعبیر وہ دیتے ہیں وہ صحیح اُترتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ خالص دُنیا والوں کے خوابوں اور خالص روحانی لوگوں کے خوابوں میں فرق ہوتا ہے۔ روحانی لوگوں کے خواب اکثر صحیح ہوتے ہیں۔ وہ بہت کم خواب دیکھتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں تو اکثر اُنکی کچھ غایت اور اُن کا کچھ سبب ہوتا ہے۔

ان تمام واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک قسم کا خواب اور رہ جاتا ہے۔ جس کی طرف ہم ابھی کچھ اشارہ کر چکے ہیں۔ جسکو ہم رویائے صادقہ کہتے ہیں۔ یہ خیال ہر مذہب اور ہر زمانہ میں صحیح سمجھا گیا ہے۔ یونانی تہذیب میں Delphi کے مندر میں لوگوں کی نیکی اور بدی اس طرح پہچانی جاتی تھی کہ وہاں کا پجاری رات کو اُس شخص کے متعلق نیت کر کے سوجاتا تھا اور خواب میں جو کچھ نظر آتا تھا اُس سے اُس شخص کی بابت حکم لگاتا تھا۔ اسی طرح ابھی تک "بشارت" اور دوسرے لفظوں میں رویائے صادقہ کو یاد کیا جاتا ہے۔ اِس قسم کے واقعات ہماری زندگی میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔

الغرض خواب ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی بابت کوئی فیصلہ کُن خیال ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا خود ایک خواب ہے اور جو زندگی آنے والی ہے اُسمیں جاکر ہم محسوس کریں گے کہ ؎

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

مُسافر کا گیت

(چودھری پربھان شنکر بی، اے آنرز)

مُسافر یونہیں گیت گاتا چلا جا ۔۔۔ یونہیں جھومتا مُسکراتا چلا جا
محبّت بھرے دل کی تابانیوں سے ۔۔۔ یہ ظلمت کدہ جگمگاتا چلا جا
مٹا کر یہ بُنیادِ ظلم و ستم کی ۔۔۔ محبت کی بستی بسا تا چلا جا
نہ ہو جائے جہاں دردمندوں کے نالے ۔۔۔ وہاں شورِ محشر اُٹھاتا چلا جا
غریبی کے بازو میں جو قوتیں ہیں ۔۔۔ وہی قوتیں آزماتا چلا جا
حوادث اگر راہ میں اُٹھ کھڑے ہوں ۔۔۔ حوادث کی گردن جھکاتا چلا جا
یہ مشکل تری ہو کے آساں رہیگی ۔۔۔ ذرا صبر کر۔ مُسکراتا چلا جا
نہ کر فخر اِن پر، یہ ہلکی ہیں موجیں ۔۔۔ سمندر میں طوفاں اُٹھاتا چلا جا
سما جائیں گی وسعتیں دو جہاں کی ۔۔۔ ابھی دامنِ دل بڑھاتا چلا جا
بڑھاپے کی ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو ۔۔۔ جوانی کا نغمہ سناتا چلا جا
جفاؤں کا خرمن یہی پھونکتی ہیں ۔۔۔ اِن آہوں کو شعلہ بناتا چلا جا
تڑپتی ہیں جو بجلیاں تیرے دل میں ۔۔۔ انھیں بجلیوں کو گراتا چلا جا
پرِ شوق کو حکمِ پرواز دیکر ۔۔۔ ستاروں سے نظریں لڑاتا چلا جا
وطن کے لئے جذبۂ زندگی کو ۔۔۔ شہادت کی قسمیں دلاتا چلا جا
رہِ سعیِ پیہم کی تاریکیوں میں ۔۔۔ تمنا کی شمعیں جلاتا چلا جا
وطن کی رگوں کو لہو اپنا دیکر ۔۔۔ فسانہ کو رنگیں بناتا چلا جا
مُسافر یونہیں گیت گاتا چلا جا

فنا کے سامنے ہم کیا، ہماری ہستی کیا ۔۔۔ برائے نام مگر اک نشان پا ہی لیا
صبا جو ہم نفس قطرہ ہوگئی دم بھر ۔۔۔ حباب نے بھی خودی کا مزا اُٹھا ہی لیا

(اکبر مرحوم)

ہندو مسلم مسئلہ

از ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو ایم۔ اے، ایل ایل ڈی سابق وزیر عدالت صوبہ متحدہ

آجکل ہندو مسلم مسئلہ ہندوستان پر چھایا ہوا ہے۔ اور برطانیہ اس کو ہمارے آزادی کے راستہ میں روڑا بناکر اٹکا رہا ہے یہ فرقہ وارانہ مسئلہ کیسے اٹھا، کیسے اس کو ترقی پہونچائی گئی اور کیسے مسلمانوں کا مشہور وفد لارڈ منٹو کی خدمت میں پہونچایا گیا ایک کہانی ہے۔ جسے میں اس جگہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔

لیکن اب اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک تفریق موجود ہے اور مسلم لیگ ہر موقع پر اس کو دگنا تگنا کرنے میں لگی رہتی ہے۔ جلسوں، اخباروں اور قانونی سبھا کے اندر ہر جگہ اس جماعت کا یہی کام رہا کہ یہ برابر چلاتی رہے کہ یو۔پی، بہار، سی۔پی، اڑیسہ اور اسی طرح تمام کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کی جان و مال اور کلچر سخت خطرے میں ہے اور ہندوؤں کی اکثریت اُن کو مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔" [illegible] ایسے پروپیگنڈے کی بُنیاد بار بار دُہرانے پر رکھی جاتی ہے۔ اس کے لئے واقعات بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں خاص واقعات کبھی نہیں بیان کئے جاتے اور صفائی کے لئے جو مطالبہ اُٹھایا جاتا ہے وہ ٹال دیا جاتا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ "اسلام خطرے میں ہے" کی مسلسل پکار ہوتی رہے۔ یہ چنگاری کا کام کرتی ہے، جذبات اُبھرتے ہیں۔ غصہ بھڑک اُٹھتا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی خوب بڑھ جاتی ہے اور یوں کامیابی حاصل ہوجاتی ہے۔ فرقہ وارانہ جھڑپ اور فساد شروع ہوجاتے ہیں، خونریزی ہوتی ہے، جانیں جاتی ہیں۔ لوگ زخمی ہوتے۔ پولیس اور کبھی فوج بُلانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ جس سے اور پیچیدگی بڑھ جاتی ہے کیونکہ الزام اور جوابی الزام، بہتان اور پھر جوابی بہتان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

اقتصادی مسئلہ چاہے آدمی فرقہ وارانہ جذبات سے بالکل ہی اندھا ہوجائے۔ مگر وہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اقتصادی مسئلہ جس کا تعلق ہندوستانی عوام کے افلاس سے ہے، فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل الگ رہے۔ لیکن لوگ عوام کی جہالت اور اُن کے بھولے پن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور "اسلام خطرے میں ہے"۔ "ہندو دھرم خطرے میں ہے" کے نعرے لگاکر عوام کو بھڑکا لیتے ہیں اور پھر اُن کو اپنی پارٹی کی طرف کرکے سیاسی فائدے اُٹھانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ عوام خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اُن کو ملازمتوں اور عہدوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

گزشتہ سو برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ بدیسیوں کی غلامی کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں سے عوام کی

سچی خدمت کرنے کا جذبہ فنا ہو چکا ہے۔ جو لوگ ملازمتوں میں ہیں انہوں نے عوام کی کوئی قابل قدر خدمت نہیں کی حتیٰ کہ اپنے فرقہ کے عوام کی بھی کوئی خاص خدمت نہیں کی۔ لیکن عوام کو دھوکا دیا جاتا ہے اور سچی باتوں اور بڑے مسئلوں کو توڑ مروڑ دیا جاتا ہے اور مذہب خطرے میں ہے کی چال چلکر ہمیشہ آزادی یا عوام کو بری حالت سے باہر نکالنے اور کسی قسم کے فائدہ پہنچانے کی کوشش کو ناکام کر دیا جاتا ہے۔

سول آزادی | سول حقوق اور سول آزادی کے نام سے بار بار اپیل کی جاتی ہے اور اس کے نام پر زبردست پروپگنڈا کیا جاتا ہے۔ لیکن لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ سول آزادی ہو یا سول حقوق وہ اسی وقت مل سکتے ہیں جب حکومت ان کو دے۔ جن ملکوں میں اپنی حکومت ہوتی ہے وہاں حکومت کے قانون میں عوام کا زور ہوتا ہے اور وہ اس کو ذمہ داری سے اپنی مرضی کے موافق چلا سکتے ہیں لیکن جن ملکوں میں بدیسی راج ہے وہاں کی حالت دوسری ہے۔ وہاں قانون کے پیچھے بدیسی فوج اور بدیسی اسلحہ کا دباؤ ہوتا ہے ایسے وقت میں یہ سوال اٹھانا کہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ کا مقابلہ کرنے کو سول آزادی مل جائے کتنا مہمل ہے۔ جبکہ سب فرقے یکساں طور پر ایک زبردست بدیسی شکنجے کے اندر کسے ہوئے ہیں۔ تم جتنا چلاؤ گے کہ ہمارے فرقہ کو دوسرے فرقہ کے مقابلے میں آزادی ملے اتنا ہی تم بدیسی زنجیروں کو اپنے بدن پر مضبوط کرو گے، اور اس کے توڑ دینے کو محال بنا دو گے۔ بدیسی حکومت سول آزادی کو دباتی ہے۔ اس کو دور کرنا بیشک ایک فرض ہے۔ جس کے لئے پوری قوم کو اپنے بدیسی حکمرانوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور عام جلسہ کا حق، آزادی تقریر کا حق، اپنے خیالات کے اظہار کا حق، انجمنیں بنانے کا حق، آزاد تحریر کا حق، ان چیزوں کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ایسے حقوق حاصل ہو جانے سے دنیا رہنے کے قابل ہو جاتی ہے اور ترقی اور آزادی کا راستہ کھلتا ہے۔

لیکن جہاں کے لوگ آپس ہی میں ایسے حقوق کیلئے لڑ رہے ہوں جن کے دینے سے بدیسی راج کا کسی طرح کا نفع نقصان نہیں ہوتا اور اس کیلئے ایک دوسرے کا سر پھوڑ رہے ہوں وہاں کی حالت سخت دردناک ہے۔ کیونکہ وہاں ہر فرقہ پر بلا تفریق غلامی دن بدن مضبوط ہوتی جاتی ہے اور بدیسی حکومت جیسا کہ ہم کو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے لڑوانے میں لگی رہتی ہے تاکہ اس کی طاقت زور پکڑتی جائے اور لوگ خیال کرنے لگیں کہ بدیسی راج کے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے۔ جب غلام آپس میں لڑا کرتے ہوں اور مالک سے امن قائم رکھنے کیلئے التجا کرتے رہتے ہوں تو مالک کا کام آسان ہو جاتا ہے اور اس کی پوزیشن قابل رشک بن جاتی ہے۔ جس ہندوستانی میں خودداری ہے اس کیلئے موجودہ حالت سخت شرمناک اور ناقابل برداشت ہے۔

فرقہ وارانہ حقوق | اس ملک میں ہر طرح کے سول حقوق خواہ وہ گاؤکشی کیلئے ہوں یا مسجد کے سامنے باجہ بجانے کیلئے۔ وہ برطانی سنگینوں کے اختیار میں ہیں جن کو نہ گائے سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ مسجد کے سامنے باجہ بجنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔ جب میں کسی اخبار میں پڑھتا ہوں کہ رام لیلا کا جلوس بخیر و خوبی گذر گیا' یا بقرعید کے موقع پر کوئی فساد نہیں ہوا۔ اور اس پر شہر والوں کا جلسہ ہوتا ہے اور وہ ضلع کے حاکموں کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تو میرا شرم سے سر جھک جاتا ہے۔ کیونکہ مجھے اس بات سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ میرا کوئی مذہبی جلوس برطانی پولیس یا برطانی فوج کی حفاظت میں نکلے۔ اور نہ میں اپنی جان کے سوا کسی دوسرے شخص کی جان سے گائے کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ شرم کی بات ہے کسی ہندو کیلئے کہ وہ اپنے جلوس کی حفاظت کیلئے برطانی پولیس یا فوج کو بلائے۔

جھگڑے کا حل یا پھر اس جھگڑے کا حل کیا ہو؟ پہلے میں اس بحث کے لئے یوپی کو لیتا ہوں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور میرے خیال میں اکثریت ہونے کی وجہ سے انھیں کو اس جھگڑے کا حل نکالنا چاہیئے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے مذہبی اور شہری حقوق یعنی مذہبی جلوس یا برات باجے گاجے کے ساتھ مسجد کے سامنے سے نکالنے کے حق پر امن طریقہ سے چاہتے ہیں تو ان کو تین میں سے ایک راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ (۱) یا تو سب کی مرضی سے (۲) یا عدم تشدد کے ساتھ اپنا خون بہاکر (۳) یا حکومت کی طاقت کے سایہ میں، اور اگر ضرورت پڑ جائے تو حکومت کے ملازموں، پولیس اور فوج کے ہاتھوں اپنی جانیں ضائع کرکے۔

میرے خیال میں تیسری صورت اسوقت تک زیر بحث بھی نہیں آسکتی جب تک بدیسی راج ہے اور دوسری صورت سے کچھ زیادہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ یہ بھی ایک طریقہ ہے دوسرے فرقہ کے دلوں کو صدمہ پہونچانے کا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ بہت دنوں تک عدم تشدد پر لوگوں میں ڈسپلن پیدا کیا جائے۔ اس لئے پہلی ہی صورت سب سے بہتر نکلتی ہے، اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ چونکہ ان شہری حقوق کے حاصل کرنے پر اس زمانہ میں بہت زیادہ ضد سے کام لینے سے ہم کو بہت نقصان پہونچے گا اور مسلمانوں کو بھی اتنا ہی نقصان پہونچے گا، جتنا ہندوؤں کو۔ اس لئے میری التجا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی ان باتوں پر اسی طرح غور کریں۔ اگر وہ غور کریں تو اُن کو معلوم ہوگا کہ اسوقت ایسے لوگ ہیں جو اپنے نفع کے خیال سے اس بات کو نہیں پسند کرتے کہ ہندو مسلم ملاپ ہو جائے اس لئے وہ بہت گندے پروپیگنڈے سے دماغوں کو گندہ کرتے رہے ہیں۔ ان حالات میں گاؤکشی ایک بہت بڑا مذہبی فرض ہو جاتی ہے اور نماز باجماعت کو بالکل سناٹے اور خاموشی کی فضا کے بغیر ادا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ جتنی اُن کی اکثریت ہے اتنی ہی ان کے سر آزادی حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی ہے اس لئے ان کو میل کی سب سے زیادہ کوشش کرنا چاہیئے اور یہ میں انکاری نہ ہو کہ ہم صرف معاف کردیں۔ بلکہ اقراری ہو یعنی ہم آگے بڑھکر کچھ کام بھی کریں اور اپنے حقوق کو ہنسی خوشی چھوڑ دیں۔ ہم کو کوشش کرنا چاہیئے کہ تمام ہندوستانیوں کو چاہے وہ جس فرقہ کے بھی ہوں اپنے ساتھ آزادی کی لڑائی میں لیکر آگے بڑھیں۔ آپس کی پھوٹ اور شکر رنجی ہمارے لئے زہر ہے۔

اپنے حقوق کو ہنسی خوشی چھوڑ کر مجھے یقین ہے کہ ہمیں بہت جلد فائدہ ہوگا۔ اور دوسرے فرقے کو بھی بہت جلد محسوس ہو جائے گا کہ وہ بات کتنی معمولی تھی جس کیلئے ہم جھگڑ رہے تھے۔ اسوقت یہ مسئلے اتنے بڑے نظر آرہے ہیں کہ وہ اصل مسئلوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔

ان سطروں میں میں جو حل پیش کر رہا ہوں بہت سے ہندوؤں کو وہ حل حل ہی نہ معلوم ہوگا بلکہ ان کو خیال ہوگا کہ ہم بہت ذلیل طریقے سے دوسرے کے سامنے جھک رہے ہیں۔ ان کو یہ بہت مایوسی اور بے بسی کا راستہ معلوم ہوگا۔ جس پر چلنا انسانوں کے لئے بالکل ناممکن ہے۔ مجھے ان تمام اعتراضوں کا احساس ہے۔ لیکن میں ان تمام اعتراضوں اور بدگمانیوں کا سامنا ہونے پر بھی یہی کہوں گا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ راستہ بہت آسان اور عملی ہے اور ساتھ ہی بہت سمجھداری کا ہے۔ ساتھ ہی مجھے یقین ہے کہ اس راستہ پر چلنے سے ہندوؤں کو کوئی نقصان بھی نہیں پہونچے گا۔ بلکہ انھیں اور مادی، اخلاقی اور روحانی طاقت حاصل ہوگی۔ جس سے ان کی اندرونی کمزوریاں بھی دور ہو جائیں گی۔

میری تجویز یہ ہے کہ جہاں کہیں مسجد کے سامنے باجے کا جھگڑا اُٹھے وہاں ہندوؤں کو بلا کسی بحث و تکرار اس بات کا عام اعلان کر دینا چاہیئے کہ ایک مقررہ مدت مثلاً پانچ سال تک وہ کسی قسم کا جلوس خواہ مذہبی ہو یا دنیاوی مثلاً شادی بیاہ کا (جو صرف اسی فرقہ میں ہوتا ہے) نہیں نکالیں گے۔ نہ صرف شہر میں بلکہ شہر کے دیہاتوں میں بھی تاکہ پھر جلوس کی وجہ سے کوئی جھگڑا نہ اُٹھ سکے۔ کیونکہ شادی کا جلوس کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایسے جلوسوں میں جو خرچ ہوتا ہے وہ بھی بچ جائیگا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ الٰہ آباد میں بارہ سال تک رام لیلا نہیں ہوا اور اس پر بھی ہندو مذہب کو یا الٰہ آباد کے ہندوؤں کی

مذہبیت کو کوئی نقصان نہیں پہونچا میں تو اس سے بھی آگے جاؤنگا اور یہاں تک کہوں گا کہ اس شہر کے رہنے والوں کو یہاں تک کوشش کرنا چاہئیے کہ نماز کے وقت وہ کسی مسجد کے سامنے سے گذریں ہی نہیں اور ممکن ہو تو کسی وقت نہ گذریں تاکہ مسلمانوں بھائیوں کی عبادت میں ہندوؤں کی وجہ سے کسی قسم کا خلل نہ پڑے۔ میں اس بات کو ان خاص شہروں تک محدود کر رہا ہوں جہاں فساد ہو رہے ہیں۔

اگر میرا بس چلے تو ہندو ہونے کی حیثیت سے امن پسندی کے لئے اور اس بات کے کفارے میں کہ ہم ابھی تک اپنے ہر بھائیوں کیساتھ بہت برا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ تمام شہروں کے ہندوؤں سے یہ اعلان کرا دوں کہ وہ کسی شہر میں ایک خاص مدت تک کوئی جلوس نہیں نکالیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح سے مسجد کے سامنے باجے کا مسئلہ ہمیشہ کیلئے حل ہو جائیگا

اسی طرح سے میں پیپل کی شاخ کٹنے پر بھی کسی جھگڑے کو نہیں پسند نہیں کرتا۔ پیپل کی نئی شاخ پھر نکل آئے گی یا پودا درخت پھر لگایا جا سکتا ہے لیکن آدمی کی جان جہاں ایکبار نکل گئی پھر نہیں آسکتی ہے۔ اسکے علاوہ پیپل کی ایک شاخ سے آزادی کی قیمت کہیں زیادہ ہے

اب میں گائے کی قربانی کا مسئلہ اٹھاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں ایک بار دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تو گائے کی قربانی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ نہیں حل ہوتا ہے تو ہم کو واقعات کا سامنا کرنا چاہئیے۔ ہندو گائے کو ماں سمجھ کر اسکی عزت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک گائے کا مارنا بہت بڑا کفر اور بربریت اور ایک ناقابل برداشت حرکت ہے۔ لیکن تمام میونسپلٹیوں میں مذبح ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کا انتظام ہندو اکثریت اور ہندو چیرمین کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ان مذبحوں کا خرچ ان ٹیکسوں سے نکالا جاتا ہے جنھیں ہندو بھی ادا کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر سال کروڑوں گائیں کاٹی جاتیں ہیں۔ گائے کا گوشت سر بازار بکتا اور علانیہ کھایا جاتا ہے اور برطانی فوج میں بھی جسکی طاقت سے ہم اپنے سول حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں خوب کھایا جاتا ہے۔ یہ سب علانیہ ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں پھر بھی مجبور ہیں۔ اس لئے ہم کو مان لینا چاہئیے کہ ہم گائے کو کٹنے سے نہیں روک سکتے۔ ہم اس کے لئے اپنا خون بہا سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس کو بچا نہیں سکتے۔ وہ صرف دوسرے فرقوں کی مہربانی اور ہمدردی سے بچ سکتی ہے۔ پھر اس بارہ میں فساد ہوں اور جھگڑے کیوں ہوں؟ کرتار پور کے ہندو فساد کرکے گائیوں کو نہیں بچا سکتے۔ اور نہ کسی اور جگہ کے ہندو اس طرح گائے کو بچا سکتے ہیں۔ اس لئے میں تو اپنے غیر ہندو بھائیوں سے یہ کہونگا کہ میں اسے تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا کتنا خیال کرتے ہو، اور اپنی گائے کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔ میں اس بات کے لئے نہ تم پر حملہ کروں گا اور نہ تم سے فساد کروں گا" یہ ہوگا عالم تشدد خیال الفاظ اور عمل والا جو آگے چلکر بڑا اچھا اثر کرے گا اور اس سے گائے کی اتنی حفاظت ہوگی جتنی ابھی کبھی نہیں ہو سکی۔

میں اپنے ہندو بھائیوں سے التجا کروں گا کہ آؤ ہم شہری حقوق کو بدیسیوں سے الگ کرنا چھوڑ دیں اور اسے ہریجنوں کے ساتھ زیادتیاں کرنے کا کفارہ بنائیں۔ وہ ہمارے لخت جگر ہیں۔ ان کو ایک بار گول میز کانفرنس میں ہم سے کاٹ کر جدا کیا گیا تھا۔ لیکن مہاتما گاندھی نے اپنی جان پر کھیل کر ان کو الگ ہونے سے روک لیا۔ آؤ ہم پانچ برس اپنے بچھڑے بھائیوں کو منانے اور اپنانے کے لئے نکال لیں۔

ہندو مسلمانوں کی لڑائی

از منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔اے

رسوا وطن ہوا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں — پامالِ صد جفا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

ذِلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں — لڑنا بہت بُرا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

دونوں کا اِک خدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

ایماں کا جُزو اَمن ہے، یہ جانتے بھی ہیں — ممنوع ہے فساد، اِسے مانتے بھی ہیں

امن و اماں کی قدر کو پہچانتے بھی ہیں — یہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتے بھی ہیں

"لڑنا بہت بُرا ہے،" مگر پھر بھی لڑتے ہیں

خالق ہے ایک دونوں کا معبود ایک ہے — رستے الگ ہوں منزلِ مقصود ایک ہے

اِک زاد بوم اور زیاں سُود ایک ہے — دونوں کے واسطے رہِ بہبود ایک ہے

کچھ بھی نہیں جُدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

یہ بھی غلام غیر کے، وہ بھی غلام ہیں — کرتے ہیں روز و شب جو غلاموں کے کام ہیں

مجبور و بے نوا ہیں کہ پابندِ دام ہیں — نَے پر فشاں ہوا میں نہ بالائے بام ہیں

کنجِ قفس میں جا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

اہلِ وطن! ذرا تو کریں دل میں غور ہم — دُنیا کو کیوں دکھاتے ہیں وحشت کے طور ہم

ہندوستاں میں کونسا لاتے ہیں دَور ہم — ہوتے ہیں کیوں ذلیل سوا اس سے اور ہم

ذِلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

ہندو مسلماں

(از پنڈت جیمنی سرشار، خیرپور ساوات ضلع مظفر گڑھ)

بن بن کے ہر اک کام بگڑتا ہے الٰہی ۔۔۔ بس بس کے چمن اپنا اُجڑتا ہے الٰہی
دونوں پہ اثر ایک سا پڑتا ہے الٰہی ۔۔۔ کس واسطے پھر ہند میں لڑتا ہے الٰہی
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

آپس ہی میں یہ جھگڑے یہ تکرار غضب ہے ۔۔۔ اک دوسرے سے مائلِ پیکار غضب ہے
کیوں گرم تعصب کا ہے بازار غضب ہے ۔۔۔ جب دیکھیے، ہے لڑنے کو تیار غضب ہے
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

ہر سمت سے ہے ملک کی تذلیل کا ساماں ۔۔۔ ہے قوم ستم دیدہ بھی حیران و پریشاں
احباب جو گریاں ہیں تو اغیار ہیں خنداں ۔۔۔ صد حیف! ہے اس حال میں بھی دست و گریباں
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

وہ ظلم کا، بیداد کا طوفان بپا ہے، ۔۔۔ ہے قوم مصیبت میں وطن وقفِ بلا ہے
اے اہلِ وطن! کس قدر افسوس کی جا ہے ۔۔۔ اس پستی پہ بھی لڑنے کو تیار کھڑا ہے
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

ہمدرد کوئی دہر میں اپنا نہ رہے گا ۔۔۔ دنیا میں وقار اپنے وطن کا نہ رہے گا
اس طور سے طور اپنا غلامانہ رہے گا ۔۔۔ جبتک کہ اسی طرح سے بیگانہ رہے گا
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

آپس میں محبت ہو تو کیا ہو نہیں سکتا ۔۔۔ نفرت سے کسی کا بھی بھلا ہو نہیں سکتا
کام اس سے کوئی اور بُرا ہو نہیں سکتا ۔۔۔ سرشار کسی طور جُدا ہو نہیں سکتا
ہندو سے مسلمان، مسلمان سے ہندو

یادِ رفتگاں

نوشتہ پنڈت منوہر لال زُتشی، ایم۔ اے

اِس صوبہ میں سوشل اصلاح کے میدان میں کشمیری پنڈتوں کی مختصر برادری نے اوروں سے پہلے قدم اُٹھایا۔ پنڈت شیونراین بہار کا نام تک بھی اب لوگ نہیں جانتے، یہ اس برادری کے وہ بزرگ تھے، جنھوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے دس ہی برس بعد اصلاح کا خیال کشمیری پنڈتوں کے گروہ میں پھیلایا اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شاید ۱۸۷۰ء کے قریب مراسلہ کشمیر لکھنؤ سے جاری کیا اور دُور افتادگانِ کشمیر کے نام سے ایک انجمن کی بُنیاد اِسی شہر میں ڈالی۔ یہ میرے ہوش سے پہلے کی بات ہے اُنکا مکان ابتک کشمیری محلہ میں موجود ہے گو اس کی ہیئت بدل گئی ہے۔ کئی برس تک چکبست مرحوم کا دفتر وکالت اس مکان میں تھا۔ پنڈت بشن نراین دَر اپنے قصیدہ میں بہار کی نسبت فرماتے ہیں ؎

یہ وہ ہے جس نے نکالا رسالہ کشمیر	اسی سے آج ہے سرسبز قوم کا گلزار
ہمارے واسطے صدہا مُصیبتیں جھیلیں!	اٹھائے سارے زمانے کے سیکڑوں آزار
ہٹے نہ پاؤں مگر راہ خیر سے اُس کے	وطن کے نام پہ کی جاں تک بھی اپنی نثار
اسی نے قوم کے پاؤں کی بیڑیاں کاٹیں	اسی نے سب کو سکھائی زمانہ کی رفتار
ڈرا کسی سے نہ تھا یہ ریفارمر ایسا	کبھی نہ لوگوں کے غصہ سے یہ ہوا ناچار
عیوب بچوں کی شادی کے پوست کندہ لکھے	کئے نقائص تعلیم بے خطر اظہار
جمایا نقش اسی نے یہ قوم کے دِل پر	کہ ہے ترقیِ نسواں ترقی کا معیار
اسی کا آج کرشمہ یہ آپ دیکھتے ہیں	شجر لگایا جو اُس نے وہ آج لایا ہے بار

۱۸۹۱ء میں کشمیری سوشل کانفرنس قائم ہوئی، چکبست مرحوم نے گیارہ برس کی عمر میں اپنی پہلی غزل ۱۸۹۴ء میں اسی کانفرنس میں پڑھی تھی۔ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حُبِ قومی کا زباں پر اِن دِنوں افسانہ ہے	بادۂ اُلفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے
جس جگہ دیکھو محبت کا وہاں افسانہ ہے	عشق میں اپنے وطن کے ہر بشر دیوانہ ہے

جب کہ یہ آغاز ہے انجام کا کیا پوچھنا	بادۂ اُلفت کا یہ تو پہلا ہی پیمانہ ہے
ہے جو روشن بزم میں قومی ترقی کا چراغ	دل فدا ہر اک کا اس پر صورت پروانہ ہے
ہے گُل مقصود سے پُر گلشنِ کشمیر آج	دشمنی نا اتفاقی سبزۂ بیگانہ ہے
یہ محبت کی بنا قائم ہوئی ہے آپ سے	آپ کا لازم نہ دل سے ہیں شکرانہ ہے

اسی جلسہ میں پنڈت بشن نراین درؔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ نے اپنے اپنے قصیدے پڑھے تھے۔ حُسنِ اتفاق سے دونوں قصیدے ایک ہی زمین میں تھے۔ دیکھئے سرشار کا مطلع کس دھوم دھام کا ہے ؎

پھلیں گے پھولیں گے گلزار قوم کے اشجار	اٹھا ہمالیہ پربت سے ابر گوہر بار

اس کے بعد سرشار کا خاص رنگ اور رندانہ بیباکی ملاحظہ ہو:-

بنائے مالنوں نے پیارے پیارے ہاتھوں سے	وفورِ شوق سے گجرائے ترکے بند ھنوار
زباں پہ مغنی کے بات الصبوح کی ہے صدا	جنابِ شیخ نے بھی رہن رکھی ہے دستار
پڑا ہی رہتا ہے بھٹی میں رات دن قاضی:	پسند ایسی کچھ آئی ہے صحبتِ خمّار

اور پھر تعلی شاعرانہ کی ظرافت ؎

نظیر ہی نہیں رکھتا تو اپنے فن میں کوئی	کریں گے صاحبِ انصاف اس سے کب انکار
زباں وہ پائی کہ بے نطق سیکڑوں بوسے	طبیعت ایسی ملی شوخ جیسے چنچل نار
وہی ہے تو کہ ترے فیضِ خوش بیانی سے	نولکشور نے پیدا کئے پچاس ہزار
یقین نہ آئے تو پڑھ لو فسانۂ آزاد	یہ لن ترانی نہیں واقعات ہیں سرکار

میں اس جلسہ میں موجود تھا اور مجھے یاد ہے کہ سرشار نے انگریزی لفظ بار (bar) کا قافیہ نظم کیا تھا اور اس پر اُن کو ناز تھا ؎

اودھ میں لچھمی نراین نے وہ کیا تھا نام	کہ جس کی ذات پر نازاں تھا لکھنؤ کا بار

قصیدے کے آخری اشعار یہ تھے ؎

زبان کی تیغ سے ایران زمین پہ کر دھاوا	کہ خالی اُردو میں کہنا ہے تیرا ننگ اور عار
ہو فارسی کے قصیدے کا رنگ ایسا شوخ	کہ وجد کرنے لگے روح انوریؔ و قار

فارسی کے قصیدے کے بھی دو ایک شعر سُن لیجئے ؎

زہے عروج بہار و خہے نسیم بہار	کہ سرخ سرخ نہادند گل بہ سر دستار
ہواست معتدل و در مزاج صحت	مریض نیست کسے غیر نرگسِ بیمار

ز لطفِ نکہتِ گلہائے تازہ حیرانم　　کہ با نسیم کہ آموخت شیوۂ عطار

اِس قصیدہ میں سرشار نے "فسانۂ آزاد" کی تصنیف پر فخر کیا ہے اور صحیح فخر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات یاد آئی۔ میں نے ایک مرتبہ ہمت کر کے سرشار سے کہا کہ "فسانۂ آزاد" میں بھرتی بہت ہے۔ جواب ملا "بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ مگر یاد رہے کہ "فسانۂ آزاد" روزانہ "اودھ اخبار" میں نکلتا تھا۔ طبیعت ہر وقت حاضر نہیں ہوتی مگر "اودھ اخبار" کے لئے روزانہ چار صفحے لکھنا ناگزیر۔ اسی لئے دیکھتے ہو کہیں سپہر آرا کا خواب ہے اور کہیں تھیا سوفی پر لکچر۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اختصار کر کے چار جلدوں کی دو جلدیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ بشن نراین جی در کے قصیدے کا انداز دوسرا تھا۔ شیو نراین بہار کی تعریف میں اُن کے قصیدے کے چند اشعار نقل کر چکا ہوں۔ چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔ تیسرے شعر کی متانت اور چوتھے شعر میں "برخوردار" کا قافیہ جس خوبی سے نظم ہوا ہے، قابلِ داد ہیں ؎

اناث بھی تھیں شریکِ مباحثہ اس جا　　تھی گوش ہوش سے سُننے کی اُنکی سب گفتار
ہوا تھا علم سے آئینۂ فہم کا روشن　　عفیفہ ایسی کہ مریم ہزار جاں سے نثار
یہ حُسنِ صورت و معنی کہ جس سے ہوتا تھا　　صفائے رُخ سے صفائے قلوب کا اظہار
ہر اک کا فخر تھا لڑکوں کو تربیت دینا　　ہوں مائیں ایسی تو لڑکے ہوں کیوں نہ برخودار

برج نراین چکبست کی شاعری کا یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد اُن کا شوق بڑھتا گیا۔ اور بشن نراین جی در کی صحبت اور اُن کے مذاقِ سلیم نے برج نراین کی نہایت صحیح راہبری کی اور ادھر اُدھر جھکنے سے روکا۔ مجھی سر تیج بہادر سپرو بشن نراین جی در کے معتقدین میں سے ہیں۔ مجھے بھی اس عالی دماغ اور فرشتہ سیرت انسان کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا فخر حاصل ہے۔ جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا تو اکثر کالج کا درس ختم ہونے کے بعد سہ پہر کو بشن نراین جی کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور ادب، اخلاق اور سیاست کے بیسوں نکتے اُن کی زبان سے سُنتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ پہلی کتاب جو بشن نراین جی نے اپنے کتبخانہ سے مجھے پڑھنے کو دی اور جس کا مستقل اثر میرے دماغ پر پڑا وہ Lecky کی مشہور کتاب History of Rationalism تھی۔ یوں تو بشن نراین جی کی عالی دماغی اور تحریر و تقریر کی فصاحت و بلاغت مشہورِ عوام تھی۔ مگر اُن کی اخلاقی عظمت کا علم کم لوگوں کو ہے ایک لفظ میں یوں کہدوں کہ خودی یا اہنکار کا سایہ بھی اس مردِ نیک پر نہ پڑا تھا سوائے خیر کے شر سے اُس کی طبیعت قطعی ناآشنا تھی۔ مولانا صفی لکھنوی نے سچ کہا ہے۔ یہ بتلادوں کہ بشن نراین جی آبر تخلص کرتے تھے ؎

بہارِ گلشنِ کشمیر ابرِ دریا دل | علوم شرقی و غربی کا بحرِ بے ساحل
قلم سے نورِ طبیعت تمام تر پیدا | ہر ایک نقطہ سے اک وسعتِ نظر پیدا
جنابِ آتش و غالب کا ماننے والا | کتابیں دیکھے ہوئے فن کا جاننے والا
مزاج میں نہ تعصب نہ تمکنت نہ غرور | کبھی جو ملئے تو ہوتا تھا اہلِ کا دل مسرور
نہ اُس کو صدر نشینی کانگریس کا ناز | نہ ہو کے ممبرِ کونسل نظر فلک پرواز
غموش طبع مگر خوش مزاج اور ہنس مکھ | شکن جبیں پہ نہ آئی ہزار اُٹھائے دُکھ

برج نراین چکبست کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کو لڑکپن میں ایسا خضرِ راہ مل گیا۔ جو عقیدت برج نراین کو اپنے محسن سے تھی وہ اُن کی "نذرانہ روح" والی نظم سے ظاہر ہے ؎

مجھ سے یارانِ عدم نے یہ اگر فرمایا | حسرت آبادِ جہاں سے تجھے کیا ہاتھ آیا
میں کہوں گا کہ بس اک رہبرِ کامل پایا | زندگی کی یہی دولت ہے یہی سرمایا

لے کے دُنیا سے یہی مہر و وفا آیا ہوں
اپنے محسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

اقبال اور حسرت موہانی کی طرح چکبست کی شاعری میں نئی روشنی کا کافی اثر موجود ہے اور حُبِ وطن اور اصلاحِ قومی اُن کی نظموں کے موضوع ہیں۔ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ موضوع کچھ ہی ہو۔ چکبست شاعری کی لطافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے وہ نصیحت بھی کرتے ہیں تو شاعر کی زبان سے۔ چکبست کے یہاں آپ کو یہ رنگ نہیں ملے گا ؎

چند خطوط اک دانا نے | کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھو تو ان میں جتنے ہیں خط | کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی جو بے ہاتھ لگائے | دے یوں ہی چھوٹے خط کو بڑھا

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی | کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی
دھو شوق سے دھبّے کو پہ اِتنا نہ رگڑ | دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

پند و نصائح چکبست کے یہاں بھی ہیں بلکہ سرزنش بھی۔ مگر وہ ان کو شاعر کی زبان سے ادا کرتا ہے ؎

جو اکبر سے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز | ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر اُنھیں ناز
سیرِ یارانِ طریقت سے ہے غیروں سے ہی ساز | وہ بنائی ہوئی چتوں وہ انیلے انداز
لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے | اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

نشۂ علم میں تم سے نہیں کوئی بھی چور
دخل رہتا ہے طبیعت میں تعلی کو ضرور

ہوگیا ہے جو ذرا چار کتابوں پہ عبور
تو غضب کی ہمہ دانی ہے قیامت کا غرور

شان ارسطو کی ہے فرعون کا سامان بھی ہے
وہی گھر مصر بھی ہے اور وہی یونان بھی ہے

برج نراین اِس نکتہ کو بخوبی سمجھتے تھے کہ محض خیالات عالی کا نظم کردینا شاعری نہیں۔ شاعری میں نئے اور بلند خیالات سے زیادہ زبان کی لطافت ضروری ہے۔ خواجہ آتش فرماتے ہیں ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اگر اسلوبِ بیان کے اصول سے ناواقف ہے اگر الفاظ کو ترکیب دینا نہیں جانتا۔ اگر جو کچھ وہ نظم میں کہتا ہے وہی چیز اِس سے بہتر نثر میں کہی جاسکتی ہے تو وہ ناظم کسی پایہ کا واعظ اور حکیم کیوں نہ ہو شاعر نہیں ہوسکتا۔ شاعری اور غیر شاعری کا فرق دو ایک مثالوں سے واضح ہوجائیگا۔ ایک ناظم فرماتے ہیں ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

اب دیکھئے اِسی خیال کو خواجہ آتش کس طرح ادا کرتے ہیں ؎

تکلف سے بری ہے حُسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

ایک مشہور عقیدہ ہے کہ ماں کی خدمت اولاد کا بڑا فرض ہے اور اس کا صلہ بہشت ہے۔ ایک شاعر نے اس کو یوں نظم کیا ہے ع

زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے

میر انیس فرماتے ہیں۔ ع

سُنتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

چکبست کی نظمیں خاک ہند۔ جنوبی افریقہ والا مسدس۔ ہندو یونیورسٹی کی نظم ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔ بشن نراین در، گوکھلے، تلک، گنگا پرشاد ورما، اقبال نراین مُلّا، ان کے نوحے اچھے بہت اچھے ہیں اور تعریف یہ کہ حفظِ مراتب کا پورا خیال ہے۔ جو جس کی خصوصیت تھی وہ اس کے نوحہ سے آشکارا ہے اگر گوکھلے کے واسطے کہا کہ ع

تو ستون تھا ایوان سلطنت کے لئے

تو تلک کیواسطے کہا ع

پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

بشن نراین در کے لئے ؎

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہونا آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

تو اقبال نرائن مسلد ان کے لئے

پیامِ صلح دینا شکوۂ احباب سُن لینا ترا شیوہ رہا کانٹوں سے بچ کر پھول چن لینا

جو لوگ ان بزرگوں کو جانتے تھے وہ کہیں گے کہ جو کچھ جس کے لئے کہا ہے وہ اس کیلئے کسقدر موزوں و مناسب ہے۔

پنڈت بشن نرائن در کی اُردو نظموں کا مجموعہ نہیں چھپا۔ جو کچھ اُن کا کلام ہے بہار گلشن کشمیر کی جلد دوم میں ہے۔ یہ بھی جناب دیوان رادھے ناتھ صاحب اور پنڈت جگموہن ناتھ شوق صاحب کی عنایت ہے۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں جو قصیدہ اُنھوں نے تصنیف کیا تھا۔ اُس کے کچھ اشعار اوپر نقل کر آیا ہوں۔ اسی زمانہ میں اور اُس کے کچھ عرصہ بعد تک کشمیری محلہ میں پنڈت اجودھیا ناتھ بخشی کے شادی خانہ میں پنڈت للتا پرشاد بٹ پوری کے زیر اہتمام مشاعرے ہوا کرتے تھے ان مشاعروں میں لکھنؤ کے اساتذہ شریک ہوتے تھے اور اپنا اپنا کلام سُناتے تھے۔ ضامن علی جلالؔ، مظہر آغا مظہرؔ۔ یوسف حسین خاں یوسفؔ۔ بچے صاحب مشتاقؔ ہادی علی خاں یکتاؔ۔ جناب امیر کے دونوں صاحبزادے معروف بہ بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا بشن نرائن جی در برج نرائن چکبست۔ ان سب حضرات کو میں نے انہی مشاعروں میں سُنا۔ ایکدفعہ طرح ہوئی "بدن میں" "عدن میں" اسمیں خواجہ آتش کی مشہور اور مقبول غزل ہے ؎

شیریں زبان ہوتی ہے فرہاد کے دہن میں لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

دو روز ہے یہ لُطفِ عیش و نشاط دُنیا ... ئے شب عروسی مہمان ہے پیرہن میں

بازارِ مصر میں چل یوسفؑ کا سامنا کر کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائیگا چلن میں

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی کیا کیا جلا ہے ساکھو پھولا جو ڈھاک بن میں

مجھے یاد ہے یوسف حسین خان یوسفؔ نے اس زمین میں اپنی غزل پڑھی تھی ؎

بوتل کے کاگ اُڑا کر نکلی ہے مے چمن میں ٹوپی اُچھل رہی ہے مستوں کی انجمن میں

ساغر بھرے دھرے ہیں ساقی کی انجمن میں لہرا رہا ہے کوثر فردوس کے چمن میں

بڑے بھیا کا ایک شعر لکھتا ہوں ؎

پھر غیر غیر ہی ہے گو ہے اِس انجمن میں بیگانگی سبزہ جاتی نہیں چمن میں

حکیم رضا حسین سہاؔ، آتش کے خاندان کے شاعر تھے۔ اُن کو بُرا معلوم ہوا۔ بگڑ کر فرمایا ؎

آتش کی یہ زمیں ہے جل جائینگی زبانیں آہو نہ چر سکیں گے اِس شیر نر کے بن میں

مگر جو شعر حاصل مشاعرہ خیال کیا گیا اور دوسرے روز ہر شخص کی زبان پر تھا وہ یہ ہے ؎

دامن کو چاک کرکے رسوا ہوئی ہے کیا کیا　　تھی عصمت زلیخا یوسفؑ کے پیرہن میں

مظہر آغا صاحب مظہر (منشی نوبت رائے نظر کے اُستاد) فخریہ کہا کرتے تھے کہ جس مضمون کو باندھتا ہوں، اپنا کرلیتا ہوں۔ اُن کا بھی ایک شعر خیال میں ہے اور آورد کی پہلوانی کے باوجود اپنے رنگ میں فرد ہے ؎

اشکوں نے عطر کھینچا گلہائے داغ دل کا　　تسخیر شمس شبنم کرتی ہے اس چمن میں

اسی غزل کا ایک اور شعر سُنئے ؎

ناز و نیاز دیکھیں بلبل کے اور گل کے　　ہم بھی چلیں چمن میں تم بھی چلو چمن میں

مظہر آغا صاحب کا ایک اور شعر یاد آیا۔ اس کا رنگ دوسرا ہے۔ اللہ میاں سے گستاخی اور کس مزے سے ؎

طور پر جاتے ہیں مشتاقِ تکلّم موسیٰؑ　　ہاں مری جان پکارو تو ذرا تم مجھ کو

لگے ہاتھ اس اُستاد کے دو ایک شعر اور سُن لیجئے ؎

قبر سے سینہ کو پتھر سے دبایا قبر کو　　دل کی دھڑکن کم نہیں ہوتی کسی تدبیر سے

ہم ملا کر دیکھتے مظہر جو ہوتا دسترس　　اُنکی تلوں کی لکیروں کو خطِ تقدیر سے

سجدے آئینے پر کرتا ہے وہ کافر خود پرست　　چاہتا ہے اپنی صورت کا خدا پیدا کروں

ایک اور شعر جو ناسخیت میں ڈوبا ہوا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

شفق گوں ہے ہوائے بام قاتل　　کبوتر پر کتوبر آرہا ہے

دوسرے روز منشی نوبت رائے نظر نے اُستاد سے اس شعر کے معنی پوچھے۔ اُنھوں نے اسکا مطلب یوں بیان کیا:-

"بام قاتل پر اِس کثرت سے نامہ کبوتر آرہے ہیں، جن کو وہ ذبح کررہا ہے کہ اس کی ہوا تک شفق گوں یا سُرخ ہو رہی ہے۔"

نظر صاحب نے اس بلند پروازی کی شکایت کی۔ فرمایا میں کیا کروں، مولوی علی میاں کہتے ہیں ؎

خوں فشانی میں کمی دیدہ نم کی تونے　　سودۂ لعل غبار رہ منزل نہ ہوا

نواب بنّے صاحب مشتاق کہتے ہیں ؎

حاسد نہ میرے ذروۂ تادیب تک گئے　　رستے میں بال تقفس پرواز تھک گئے

شاگرد کی تشفی نہیں ہوئی۔ سچ ہے یہ شاعری نہیں گادُ زوری ہے اور اسی نے لکھنؤ کو دُنیائے ادب میں بدنام کیا۔ جب میرے عزیز دوست ترلوکی ناتھ جی کول نے "گلزار نسیم" کا نیا ایڈیشن نکالا، اور برج نراین نے اسکا دیباچہ لکھا تو مولوی عبدالحلیم شرر نے جو اُن کے ہم شہر بلکہ ہم محلہ تھے، اپنے رسالہ "دلگداز" میں اسکا ریویو کیا۔ اور نسیم اور ان کی شاعری پر بہت سے جا بیجا الزام لگائے۔ چکبست مرحوم نے اس کا جواب اُردوئے معلیٰ،

میں لکھا، اور بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی کہدوں کہ ۱۸۹۸ء میں سر عبدالقادر نے جو اُسوقت نائٹ نہیں ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کتاب The new School of Urdu Literature کے نام سے شائع کی تھی اور اسمیں سر سید احمد خاں۔ مولوی نذیر احمد۔ محمد حسین آزاد۔ شرر اور سرشار پر مضامین لکھے تھے اور اس بات کی بحث اُٹھائی تھی کہ اُردو ناول لکھنے میں کون قدیم تر ہے، شرر یا سرشار۔ شیخ صاحب کو یہ خبر نہ تھی کہ شرر خود سرشار کی اولیت کا اقرار کر چکے ہیں۔ اور اُن کی نظم ؎

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ کن کن محاوروں کا کیا ہے نباہ واہ

اُودھ اخبار میں چھپ چکی ہے۔ سرشار کو اپنی اوّلیت پر ناز تھا۔ اور بجا ناز تھا۔ وہ کہا کرتے تھے ؎

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری اوّل بہ شگوں کرد طواف حرمِ ما

چکبست کی راماین کا ایک ٹکڑا چھپ گیا ہے۔ کئی اور ٹکڑے چکبست نے کہے تھے اور اُنکے دوستوں نے اُن کی زبان سے سُنے تھے۔ اسمیں آخری جنگ سے پہلے راون کی تقریر خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مگر وہ سب اُن کے ساتھ فنا ہو گئے۔ میں نے اُن کے مرنے کے بعد اُن کے کاغذات کو چھانا۔ مگر افسوس کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ شاعر کو کیا خبر تھی کہ اس کو اسقدر جلد دُنیا سے اُٹھ جانا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا کہا ہوا میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ جب چاہوں گا سپردِ قلم کردوں گا۔ کیا معلوم تھا کہ دفعتاً دیارِ غیر میں ایسی بیکسی کی موت آئے گی کہ دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ بقول مولانا صفی ؎

ہائے بیتابی دل اور وہ بیتابی دل جب زباں بند ہوا اک نکتہ سرا کی افسوس

صفی کے نوحہ کا ایک اور شعر ؎

موت آنے کو آئی سرِ بالیں لیکن ہاتھ ملتی رہی تا دیر کیا کی افسوس

مضمون طویل ہو گیا۔ کیونکہ "افسانہ از افسانہ می خیزد" بات یہ ہے کہ بڑھاپے میں انسان کو گذرے ہوئے فسانے اکثر یاد آتے ہیں اور اُن کی یاد میں اُس کو مزہ آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو پُرانی باتیں اُسکے حافظہ کی امانت میں ہیں اُن سے دوسرے بھی لُطف اُٹھائیں۔ ان آنکھوں سے کیا کیا نہیں دیکھا، اور ان کانوں سے کیا کیا نہیں سُنا۔ بات میں بات نکل آئی اور میری داستان لمبی ہو گئی۔ اگر آجکل کے تیز طبع اور چابکدست صاحبزادوں اور اُن سے زیادہ برق وش اور براق طبیعت صاحبزادیوں کو اس طوالت نے مکدر کیا ہو، تو اُن سے ادب کے ساتھ معافی مانگتا ہوں۔ ع

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

کلامِ فراق

(جذبات پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے)

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں ۔۔۔ کچھ تو ہے زور ناتوانوں میں
انھیں تنکوں میں ڈھونڈھ اے بلبل ۔۔۔ بجلیاں بھی ہیں آشیانوں میں
کتنا خاموش ہے جہاں لیکن ۔۔۔ اک صدا آرہی ہے کانوں میں
ہم اسی زندگی کے در پے ہیں ۔۔۔ موت ہے جس کے پاسبانوں میں
قیدیوں کو پیامِ مرگ ملا ۔۔۔ زندگی سی ہے قیدخانوں میں
کم نہیں بارِ غم سے بادِ نشاط ۔۔۔ درد ہے حسن کے بھی شانوں میں
منزلیں دور سے جھلکتی تھیں ۔۔۔ کھو گئیں آکے کاروانوں میں
کوئی سوچے تو فرق کتنا ہے ۔۔۔ حسن اور عشق کے فسانوں میں
رات دن اک دیا سا جلتا ہے ۔۔۔ اہلِ غم کے سیاہ خانوں میں
اُس کی سفاکیٔ نگاہ بھی ہے ۔۔۔ چمن دل کے باغبانوں میں
ایک جیر کا سا وقت کا کھاکر ۔۔۔ بانکپن آگیا جوانوں میں
آگیا عشق بدگماں آخر ۔۔۔ حسن کے بے کئے بہانوں میں
کیف کیا کیا دلوں کو ملتا ہے ۔۔۔ عشق کے بے کہے فسانوں میں
کس لئے بزمِ یار میں ہیں، کہ ہم ۔۔۔ غمزدوں میں نہ شادمانوں میں
ہم سے بھی تو ہے بدگماں سا کیا ۔۔۔ ہم بھی ہیں تیرے رازدانوں میں
تن گئی ہیں بھویں زمانے کی ۔۔۔ تھرتھری سی ہے کچھ کمانوں میں
موت کے بھی اُڑے ہیں اکثر ہوش ۔۔۔ زندگی کے شراب خانوں میں
لوگ کیا کیا نہ ہار بیٹھے ہیں ۔۔۔ زندگی کے قمار خانوں میں
جن کی تعمیر عشق کرتا ہے ۔۔۔ کون رہتا ہے ان مکانوں میں
کام لے خونِ آرزو سے فراق ۔۔۔ رنگ بھر غم کی داستانوں میں

(۲)

جب لگ گئیں محنتیں ٹھکانے
تقدیر لگی ہے مسکرانے

کچھ بھی نہ تھا عشق کی گرہ میں
اور پھر بھی لُٹا دیئے خزانے

آتے ہی ترا خیال۔ اے دوست
ہر سمت لگیں گھٹائیں چھانے

آدھا گلزار ہے قفس میں
ویران پڑے ہیں آشیانے

آئی تری یاد۔ دل ہوئے خوں
گلزار کھلا دیئے صبا نے

کونین کو نیند آرہی ہے
اُف تیری نگاہ کے فسانے

سب عشق کی کارسازیاں تھیں
جو کچھ بھی ہوا اِسی بہانے

تھا ذکر کرم فراق اس کا
کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے

کلامِ مدہوش

(پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے)

اے جلوہ دوست جانفزائی کی قسم
مت چھپ تجھے تیری خودنمائی کی قسم

پردے سے مجاز کے تو ہٹ آ پیارے
اس دل میں تجھے ہے دلربائی کی قسم

غزل

یوں ہم کو پیر و مرشد مست و خراب کر دے
ہوش و خرد ہمارا نذرِ شراب کر دے

وہ جلوہ حقیقی ایمان و جان اپنا
خلوت کدہ میں دل کے آ بےنقاب کر دے

اے شوخیوں کے مظہر جلوہ طراز ہو کر
خود بےنقاب ہو جا اور بےنقاب کر دے

بحرِ مئے محبت جوشِ کرم دکھا دے
ابرِ بہار بن جا غرقِ شراب کر دے

آئے ہیں تیرے آگے سائل سوال بن کر
بےمثل رحمتوں سے تو لاجواب کر دے

کیفِ نظر سے اپنے بےکیف زندگی کو
لطفِ حیات دے کر مستِ شباب کر دے

خود کردہ عنایت مدہوش اسکا ہے جو
معمور رحمتوں سے چشمِ عتاب کر دے

مدہوش ایم۔ اے

تنقید کتب

معارف جمیل[1]

حکیم ابوالاحسان الطاف احمد آزاد انصاری سہارنپوری نے جو ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر ہیں اپنے کلام کا مجموعہ "معارف جمیل" کے نام سے شائع کیا ہے۔ آپ نے اِس مجموعہ میں اپنی تمام غزلیات بقید سن تصنیف درج کردی ہیں اور جو غزلیات مشاعروں کیلئے لکھی گئی تھیں۔ اُن کے متعلق ضروری نوٹ بھی دیدئے ہیں۔ حضرت آزاد فطری شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اکتسابِ فن کے تمام مدارج بھی طے کر چکے ہیں۔ آپ عرصہ تک مولانا حبیب الرحمن صاحب بیدل محدث سہارنپوری اور خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کو اپنا کلام دکھاتے اور اُن کے مشوروں سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ کا شاعرانہ کمال اور بھی چمک اُٹھا ہے۔ آپ نے اِس مجموعہ کا خود ہی اپنی قلم سے ایک بہت مُفصل و مشرح دیباچہ لکھا ہے۔ جسمیں آپ نے اپنے ذاتی و خاندانی حالات کے علاوہ اپنے شاعرانہ خصوصیات اور خوبیوں کو بڑی شرح و بسط سے بیان کردیا ہے۔ آپ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کے اشعار میں الفاظ کی نشست اِس خوبی سے ہوتی ہے کہ اُن کے نثر کرنے میں کسی طرح کے رد و بدل کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے ؎

اُمیدِ جزا کب تک، اُمید سے کیا ہوگا — کچھ آج ہوا ہوگا، کچھ روزِ جزا ہوگا

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں نازاں بھی — جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

نہ محبت، نہ محبت کے مراسم کا لحاظ — تم کو بیشک روشِ اہلِ وفا آتی ہے

محبت میں بقا میری، محبت میں فنا میری — محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری

آپ کی زبان بھی عموماً سلیس ہوتی ہے، جس سے کلام میں ایک خاص قسم کی روانی موجود رہتی ہے۔ مثلاً

مضطر آیا ہوں، سکوں درکار ہے — درد لایا ہوں، دوا مطلوب ہے

اے وفا کے خبط! لے کچھ اور سُن — اب انھیں شکرِ جفا مطلوب ہے

کون اس یار آشنا سے کہے — حالتِ یار آشنا کیا ہے

---

[1] قیمت اڑھائی روپیہ (عگ)۔ ملنے کا پتہ:- کاشانۂ ناز، بازار گھانسی، حیدرآباد دکن

دردِ بیمار کا مداوا کر شکلِ بیمار دیکھتا کیا ہے

سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو ایک صاحب وفا نہیں، نہ سہی
آپ نے دردِ سن لیا ہوتا درد کی کچھ دوا نہیں، نہ سہی

حضرت آزاد اکثر نادر اور انوکھی ترکیبوں سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً ؎

مطرب نغمہ کار ہو، ساقی بادہ بار ہو زہرہ نوا نگار ہو، میکدہ زا بہار ہو

چارہ سازِ زخمِ دل! درمانِ غم اچھا کیا زخم کی سب لذتیں مجروحِ درماں ہوگئیں

ان دونوں شعروں میں "مطرب نغمہ کار"۔ "ساقی بادہ بار"۔ "میکدہ زا بہار" اور "مجروحِ درماں" کی ترکیبیں بالکل نادر ہیں۔

ایک ہی لفظ کی باربار تکرار بعض اوقات عیب میں داخل سمجھی جاتی ہے لیکن آزاد صاحب نے جہاں کہیں الفاظ کی تکرار کی ہے وہاں اس کو بڑے سلیقہ سے نباہا ہے۔ مثلاً ؎

تم اور دل آزاری اربابِ محبت اربابِ محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا

آزاد صاحب "ترصیع جدید" کے نام سے ایک نئی صفت کے اختراع کے دعویدار ہیں۔ لیکن شاید یہ انگریزی نظم کا تتبع ہے۔ جس طرح انگریزی کی بعض نظموں میں چار چار مصرعوں کے "اسٹینزا" ہوتے ہیں۔ جن میں پہلا اور تیسرا۔ دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں، اسی طرح حضرت آزاد نے بھی "اسٹینزا نما" اشعار لکھے ہیں۔ جن میں پہلا اور تیسرا اور تیسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہیں۔ مثلاً ؎

وہ پھر میرا تری پہلی نظر میں تلملا اٹھنا وہ پھر تیری نظر کا گھاؤ دل سے تا جگر جانا
وہ پھر میرے دلِ مظلوم سے شور بکا اٹھنا وہ پھر تیرا مجھے الٹی چھری سے ذبح کر جانا

غرض حضرت آزاد کے کلام میں نازک تخیلات کے ساتھ ساتھ چست بندش بھی پائی جاتی ہے اور تصوف اور تغزل کا رنگ بھی موجود ہے۔ لیکن اختراع و ایجاد کے دھن میں آپ نے "مصور شاعری" کے نام سے جو اشعار لکھے ہیں۔ وہ ہم کو ہندسوں کے مضحکہ انگیز گورکھ دھندے سے زیادہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتے۔ اسمیں بھی آپ نے ہندی کا تتبع کیا ہے لیکن یہ شاعری نہیں بلکہ چیستاں ہے۔ جسکی شاعرانہ نقطہ خیال سے کوئی وقعت نہیں۔

اس مجموعے میں غزلیات کے علاوہ قطعات، نظمیں، سہرے اور نوحے و مرثیے بھی درج کردئے گئے ہیں خیام کی بعض رباعیات کے ترجمے بہت برجستہ کئے گئے ہیں۔ جس کے لئے حضرت آزاد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مگر اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ وہ حصہ ہے جسمیں آزاد کے کلام پر حضرت بیدل اور خواجہ حالی کی اصلاحوں کے نمونے درج کئے گئے ہیں۔ بیشک یہ ہدایات گرہ میں باندھنے کے قابل ہیں۔

دیگر شعرا کی طرح جناب آزاد انصاری بھی تعلی سے بالاتر نہیں ہیں۔ اس کے متعلق ہم صرف یہی کہیں گے

کہ گو شاعروں کے مسلک میں تعلی بھی سخن گستری کی ایک شان میں داخل ہے لیکن نہ اسقدر کہ تعلی خواہ مخواہ خودستائی اور انانیت کی حد تک پہونچ جائے۔ جیسے حضرت آزاد نے اپنی تصویر پر تنویر کے اوپر یہ شعر درج کیا ہے ؎

اگر آزاد سا شاعر بھی نظروں میں نہیں جچتا　　　توجا' اور جا کے پہلے شعر کی پہچان پیدا کر

اگر احباب اِس شعر کے آخری مصرعہ کو اپنی سخن فہمی پر ایک چوٹ سمجھیں تو بیجا نہ ہوگا۔ باوجود احتیاط اِس مجموعے میں لکھائی، چھپائی کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جو اُمید ہے کہ آیندہ درست کردیجائیں گی۔

اخوان الصفا

حال میں انجمن ترقی اُردو دہلی نے عوام کی دلچسپی کے لئے کئی مفید اور قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں ذیل میں ہم چند مطبوعات کا ذکر کرتے ہیں۔

خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ابوسلیمان، ابوالحسن، ابواحمد وغیرہ دس عالم و فاضل ادیبوں کی ایک انجمن بصرہ میں تھی۔ اور اُن لوگوں نے "اخوان الصفا" کے نام سے اکاون رسالے لکھے تھے۔ انھیں رسالوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ جسے عربی سے مولوی اکرام علی صاحب نے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اِس کتاب میں اِنسانوں اور حیوانوں کا مناظرہ درج ہے اور نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ حیوانات اِنسان کے تابع ہیں۔ کتاب دلچسپ ہے۔

حکایات رومیؒ (پہلا حصہ)

کے نام سے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مشہور و معروف مثنوی کی حکایات کا مرزا نظام شاہ صاحب حبیب نے سلیس اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو دلچسپ ہونے کے علاوہ سبق آموز بھی ہے۔ بعض حکایات کے ضمن میں تصوف کے نکات بھی حل ہو گئے ہیں۔ غرض کتاب بہت دلچسپ ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب

جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے (علیگ) نے زمانہ تعلیم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اپنے پروفیسروں سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے جو نوٹ سیاسیات پر جمع کئے تھے۔ اُن کا لب لباب اب اس چھوٹے سے رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اسمیں ریاست، اس کی تاریخ، اقتدار فرمانروائی اور آزادی رعایا، قومیت، قانون، قومی حقوق وغیرہ پر مُفصل بحث کی گئی ہے۔ رسالہ اگرچہ طلبا کے لئے لکھا گیا ہے۔ مگر دوسرے شائقین بھی اِس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ البتہ اِس کا طرز بیان جو خالص انگریزی ہے عام قدر دانی کے مخالف ہے۔ اس کتاب میں جو سیاسی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں وہ عام طور سے رائج نہیں ہیں۔ اس لئے اگر ان کے ساتھ ساتھ اُن کی توضیح بھی کردی جاتی تو اچھا ہوتا۔

تاریخ اسلام حصہ اولؔ

تاریخ اسلام کا یہ پہلا حصہ ہے، جسے دار المصنفین اعظم گڈھ نے دس بارہ حصوں میں مکمل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس حصے میں اسلام سے پہلے عرب کی حالت، عہد رسالتؐ اور خلفائے کرامؓ کے زمانہ کے حالات سے معقول بحث کی گئی ہے۔ اسمیں مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃ النبیؐ اور الفاروقؓ کے انداز بیان کی تقلید کی گئی ہے۔ البتہ مولانا شبلی کی کتابیں مفصل ہیں اور یہ کتاب مجمل۔ مگر اس کا طرز تحریر اور استدلال ایسا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں حضرات اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس خلیفہ کے حالات لکھے ہیں، آخر میں اس کے زمانہ کے کارنامے بھی تفصیل سے بیان کر دئے گئے ہیں۔ حتی الامکان مستند ذرائع سے حالات درج کئے گئے ہیں اور ان کا پورا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے

دو ایک مقامات پر واقعات کے اندراج میں کچھ فروگذاشت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً کتاب کے صفحہ تین۳ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ:۔

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی سارہؓ تھیں۔ ان کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ اور ہاجرہؓ کے شکم سے حضرت اسحٰق علیہ السلام"

یہ بات اسرائیلیات اور عرب کی مروجہ و مسلمہ روایات کے خلاف ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت سارہؓ کے بطن سے نہیں بلکہ حضرت ہاجرہؓ کے شکم سے پیدا ہوئے تھے۔ اسمٰعیلؑ کی ولادت سے حسب روایت توراۃ، حضرت سارہؓ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ تیرہ۱۳ برس بعد پیدا ہوئے تھے۔ اور جن کو حضرت ابراہیمؑ نے عرب میں آباد کیا تھا وہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ تھیں۔

اسی طرح صفحہ ۳۲ پر لکھا ہے کہ:۔

"اب تک نماز کی صرف دو دو رکعتیں تھیں، سنہ ۱ھ میں فجر اور عصر کے علاوہ چار چار ہو گئیں"

یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ فجر کی رکعتیں اب بھی دو ہیں اور مغرب کی تین۳ ہیں۔ لکھنا یوں چاہئے تھا کہ:۔

"فجر اور مغرب کے علاوہ چار چار ہو گئیں"

کتابت کی بھی اکثر غلطیاں رہ گئی ہیں جو امید ہے آیندہ ایڈیشن میں دور کر دی جائینگی۔ زبان صاف اور عام فہم ہے۔ البتہ کہیں کہیں خاص عربی اصطلاحیں آگئی۔ جن پر حاشیہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً "مثلہ" کرنا۔ جس کے معنی ہیں۔ دشمن کو قتل کر کے، ناک، کان یا دوسرے اعضا کاٹ دینا۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم بڑی تقطیع کے ۳۸۷ صفحات۔

ملنے کا پتہ: مینیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ

اجتماعی زندگی کی ابتدا

یہ رسالہ بھی پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے کی تصنیف ہے۔جسمیں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ انسان نے مل جل کر زندگی بسر کرنا کس طرح شروع کیا اور سوسائٹی یا سماج نے بتدریج کیا کیا صورتیں اختیار کیں۔ اس رسالہ میں بھی مغربی ارباب فکر کے خیالات سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے۔یہ کتاب بھی درسی حیثیت سے بہت قابل قدر ہے۔ہمارا خیال ہے کہ اُردو میں اس موضوع پر شاید یہ پہلی کتاب ہے۔قیمت صرف ۸ر

شہری آزادی

یہ چھوٹا سا رسالہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی تصنیف ہے اور اس کا موضوع شہری آزادی یا سول لبرٹی ہے چنانچہ اس میں شہریوں کے بنیادی حقوق اور فرائض سے بحث کیگئی ہے۔لیکن زیادہ یوروپین فلاسفروں کے خیالات سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔رسالہ کا پہلا ہی باب فرانس سے شروع ہوتا ہے۔رسالہ اپنے مخصوص انداز پر عمدہ اور سبق آموز ہے۔قیمت چار آنے۔

تینوں رسالوں کی لکھائی، چھپائی اور کاغذ پسندیدہ ہیں اور تینوں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لکھنؤ و لاہور سے ملسکتے ہیں

محکومیت نسواں

جان اسٹوارٹ مل ایک بہت بڑے اور مشہور انگریز فلاسفر و مصنف گذرے ہیں۔جو سیاسیات اور معاشیات کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔انھیں کی ایک کتاب "عورتوں کی ماتحتی" (Subjection of Women) کے متعلق ہے۔اسی کتاب کا یہ اُردو ترجمہ ہے، جسے مولوی معین الدین صاحب انصاری بی۔اے بیرسٹرایٹ لا نے نہایت عمدگی سے کیا ہے۔اس کتاب کی زبان بہت عام فہم اور مربوط ہے۔اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی ہے۔

اصل کتاب کے چار باب ہیں۔جن میں عورتوں پر مردوں کی زیادتیوں، عورتوں کے قانونی اور سماجی حقوق اور مردوں کے ساتھ ان کی مساوات کے مسئلوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔بقول مترجم اصل کتاب عورتوں کی آزادی کا محضرنامہ ہے۔اصل مصنف کے زور بیان اور قوت استدلال کی تعریف نہیں ہوسکتی۔مگر یہ کتاب ۱۸۶۳ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔اس وقت سے ابتک گنگا جمنا اور دریائے ٹیمز میں نہ معلوم کتنا پانی بہہ چکا ہے اب عورتوں کی وہ حالت نہیں رہی جو پہلے تھی۔آجکل کی عورتیں خواہ وہ مغرب میں ہوں یا مشرق میں پہلے کی بہ نسبت بہت کچھ آزادی حاصل کرچکی ہیں۔ہندوستان میں بھی جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ قدامت پرست ملک مشہور ہے۔اب عورتوں کی وہ حالت نہیں رہی جو کسی زمانہ میں تھی۔تاہم ابھی اس بارہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے جسکے لئے ہمیں عام رائے کو خاص طور پر تیار کرنا پڑیگا۔اور قانونی مجلسوں سے بھی مدد لینا پڑیگی کتاب جامعہ دہلی

ہندوستان کی کہانی

اس چھوٹی سی کتاب میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے ابتدائی مدرسوں کے بچوں کیلئے آسان اور عام فہم زبان میں ہندوستان کی مختصر تاریخ لکھی ہے۔ پوری تاریخ کو (۱) ہندو دور (۲) مسلم دور اور (۳) انگریزی دور میں بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کا درمیانی حصہ یعنی مسلم دور صحت کے ساتھ لکھا ہے، مگر اختصار کے خیال سے اسقدر کوتاہ قلمی سے کام لیا گیا ہے کہ کتاب اُدھوری رہ گئی ہے۔ اور انگریزی دور کا حال تو بہت ہی کم لکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ کتاب ابتدائی اسکولوں کے بچوں کے لئے ہے اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے غنیمت ہے آخر کے تین صفحوں میں کانگریس کی کارروائیوں پر بھی مختصر سی روشنی ڈالی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب پسندیدہ ہے حجم ۷۶ صفحات۔ شایقین دارالمصنفین اعظم گڈھ سے طلب کریں۔

جدید دستور کا خاکہ

اس رسالہ میں سنہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ہندوستان کی آئینی پوزیشن کی وضاحت کی گئی ہے اور فیڈرل اسکیم وصوبجاتی خود مختاری کی خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صوبجاتی حکومتوں کے اختیارات وغیرہ کا بھی مختصراً تذکرہ کردیا گیا ہے۔ قیمت صرف ۲ ر آنہ۔ شایقین جامعہ ملیہ دہلی سے طلب کریں۔

جیوتی پرشاد

مہاشہ جیوتی پرشاد مرحوم جین مذہب کے مشہور و معروف شاعر و ریفارمر ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں آپکی سوانحمری، مضامین کے اقتباسات اور شاعری کے نمونے درج ہیں۔ شروع میں فاضل مصنف کی تصویر دیدی گئی ہے۔ حالات زندگی کے علاوہ آپ کے بعض خطوط بھی اسمیں شامل کردیئے گئے ہیں۔ جو بہت دلچسپ ہیں قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ لالہ جوہری مل جین صراف۔ دریبہ کلاں۔ دہلی۔

رسولِ پاک

پیغمبر اسلام کے حالات زندگی پر اُردو میں بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ مگر ایسی کتابیں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جن سے رسول اسلام کی اعلیٰ زندگی کے اصول عوام اور چھوٹے بچوں کو ذہن نشین ہوسکیں، مگر اس کتاب میں مولانا عبدالواحد سندھی اُستاد جامعہ ملیہ دہلی نے رسول مقبول کے صحیح و مستند واقعات زندگی موثر پیرایہ میں سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اس لئے اس کے مطالعہ سے بڑے، چھوٹے لڑکے لڑکی مسلم اور غیر مسلم سبھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ قیمت آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، لکھنؤ۔ لاہور۔

رفتارِ زمانہ

پچھلا سال

۱۹۳۹ء کا سال دنیا کے لئے منحوس ثابت ہوا۔ اسی سال یورپ میں لڑائی چھڑ گئی جس کا اثر دُور دُور تک پڑ رہا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کے بعد دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی۔ ہندوستان کے لئے بھی یہ سال اچھا نہیں گزرا۔ کئی نامور ہم سے جُدا ہو گئے، جیسے مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ بنارس، دیش بھگت ہردیال، لارڈ براَبورن گورنر بنگال، انکے علاوہ دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں میں پوپ روم اور لارڈ انچکیپ کی وفات قابل ذکر ہے۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں شاہ عراق موٹر کے حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ ترکی کا ہولناک زلزلہ جسمیں چالیس ہزار جانیں ضائع ہوئیں اور کروڑوں روپئے کی جائداد برباد ہوئی۔ اسی منحوس سال کا اندوہناک واقعہ ہے۔

ان نقصانات کے علاوہ پچھلا سال لڑائی جھگڑا، شور و شر اور فتنہ و فساد کا سال ثابت ہوا۔ چین و جاپان کی لڑائی برابر جاری رہی۔ اور گو جاپان نے چین کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا ہے لیکن چین اب بھی اُسی دم خم کے ساتھ لڑ رہا ہے، اور اُس کی ہمت و استقلال کے سامنے جاپان کی طاقت شل ہو رہی ہے۔

کمزور قوموں کو اس سال ہر جگہ زک اُٹھانا پڑی۔ اسی سال اسپین کی جمہوری حکومت کا خاتمہ ہوا۔ جنوری سے لیکر مارچ تک جنرل فرانکو کا راجدھانی میڈرڈ پر قبضہ ہو گیا، اور مئی میں فرانکو فتح کا ڈنکا بجاتے ہوئے اسپین کے پایہ تخت میں باضابطہ داخل ہو گئے۔ اس طرح اسپین کی لڑائی ڈکٹیٹروں کے موافق ختم ہوئی۔ اس کے بعد اپریل میں مسولینی نے زبردستی فوج کشی کر کے البانیہ کی خود مختاری ختم کر دی۔ جرمنی کے ظلم اور زبردستی کی تو اس سال کوئی حد ہی نہیں رہی، شروع ۱۹۳۹ء ہی سے اس کے تیور بگڑنے لگے۔ مئی ۱۹۳۹ء میں اس نے اٹلی سے فوجی معاہدہ کر کے اپنے ہاتھ پاؤں بڑھانا شروع کئے۔ اٹلی اور فرانس میں بھی اَن بن رہی لیکن کوئی قابل ذکر بات واقع نہیں ہوئی۔

۱۰ مارچ کو جرمنی نے چیکوسلاوکیہ پر ایک دم سے قبضہ کر کے اس کی بیس سال کی آزادی ختم کر دی۔ اُس کی دیکھا دیکھی ۱۶ مارچ کو ہنگری نے روتھینیا (Ruthenia) پر قبضہ کر لیا۔ ۲۳ مارچ کو ہر ہٹلر نے شہر میمل پر قبضہ کیا اور اُس کے بعد ہی پولینڈ کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھنے لگا اور جس طرح چیکوسلاوکیہ پر جرمنوں کو فرضی زیادتیوں سے بچانے کے بہانے سے حملہ کیا گیا اُسی طرح پولینڈ کے خلاف بھی من گھڑت الزامات عائد کئے گئے۔ پریسیڈنٹ امریکہ نے اٹلی اور جرمنی دونوں سے دنیا میں امن اور چھوٹے ملکوں کی آزادی برقرار رکھنے کی اپیل کی لیکن طاقت کے نشے میں چور ہر ہٹلر نے کوئی پرواہ نہ کی، اور آخر اگست میں ہر ہٹلر نے پولینڈ سے بندرگاہ ڈینزگ، پولش کاریڈر اور

سلیشیا کے اوپری حصے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ دوسرے ہی دن سے جرمن فوج پولینڈ میں جمع ہونے لگی،
اسی درمیان میں ہٹلر نے روس کو بھی گانٹھ لیا۔ فرانس اور انگلستان بھی اُس سے سمجھوتہ کی بات چیت کر رہے تھے
لیکن جب ہٹلر نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے روس کی سب باتیں مان لیں تو یہ بات چیت آپ سے آپ ختم ہو گئی۔
اس کے بعد ہی یکم ستمبر کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ جس کے بعد انگلستان اور فرانس کو جرمنی کے خلاف میدان میں
آنا پڑا۔

ایک طرف جرمنی کی ہوائی حملوں نے پولینڈ کے امن پسند شہروں میں اینٹ سے اینٹ بجانا شروع کی، دوسری
طرف جرمن بیڑا ڈینزگ پر گولے برسانے لگا، اُتر کی طرف سے پُوربی پروشیا، پچھم کی طرف سے خاص جرمنی اور دکن
میں آسٹریا کی سمت سے جرمن فوجیں دنا دن حملے کرنے لگیں۔ غرض دو ہی ہفتوں کے اندر پولینڈ کی کمر ٹوٹ گئی
روس نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ۱۶ ستمبر کو پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ ایسے زبردست دشمنوں کے بے پناہ حملوں کے سامنے
پولینڈ کب تک مقابلہ کرتا، آخر ان دونوں حریفوں نے اس کے حصے بخرے کر لئے۔ وارسا تک پولینڈ کا تمام پچھمی
حصہ مع ڈینزگ اور پولش کاریڈر کے جرمنی نے لے لیا، اور سارا پُوربی حصہ جو رومانیہ اور ہنگری کی سرحد تک
پھیلا ہوا ہے روس کے ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد بھی روس نے آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر دست درازی
شروع کر دی۔ لتھونیا۔ اسٹونیا۔ اور لٹویا[1] کو مجبوراً روس کے سمندری اور ہوائی فوج کے ٹھہرنے کے لئے اپنے
خاص خاص مقام حوالہ کرنا پڑے۔

فن لینڈ نے ذرا چوں چرا کی تو اسٹالین نے بلا کہے سُنے اس پر فوراً دھاوا بول دیا۔ اس وقت بیچارہ
فن لینڈ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہا ہے جس میں روس کو بہت کافی نقصان پہونچ چکا ہے۔ موسم بھی
اُسے مدد دے رہا ہے۔ لیکن روس اور فنلینڈ کی لڑائی شیر و بکری کی لڑائی ہے۔

چار مہینے ہی کی لڑائی میں ہر ہٹلر کو فرانس اور برطانیہ کی مضبوط دوستی، اُن کی مجموعی طاقت، خوش انتظامی
اور وسیع ذریعوں کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ جرمنی کے ہوائی طاقت کے مقابلے کا ایسی اتحادیوں نے بندوبست کر رکھا ہے
اسی وجہ سے جرمنی کو ابھی تک فرانس اور انگلینڈ پر کسی بڑے ہوائی حملہ کا حوصلہ نہیں ہوا۔ جرمنی کے مقناطیسی سرنگوں
سے ابتک انگلستان اور دوسرے ملکوں کے کئی بڑے بڑے جہاز ضائع ہوئے، لیکن اب تک جرمنی نے برطانیہ کے
جتنے جہاز ڈبوئے ہیں اُن کی تعداد چار فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی چھیانوے فیصدی جہاز آج بھی پہلے کی
طرح برطانیہ کے کام آ رہے ہیں۔ جرمنی کے بعضے بڑے بڑے جہازوں کا بھی بُری طرح خاتمہ ہوا اور جہاں تک
خبروں سے پتہ چلتا ہے اُس کے سوداگری جہازوں کا سمندروں میں کہیں پتہ نہیں۔ حالانکہ اتحادیوں خصوصاً

[1] Latvia . Estonia . Lithonia,

برطانیہ کے ہزاروں جہاز کھلے بندوں آجا رہے ہیں۔

پچھمی مورچہ پر دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے حفاظتی لائنوں کے پاس جمی کھڑی ہیں، لیکن چھوٹی چھوٹی جھڑپوں۔ توپوں کے معمولی سوال وجواب اور ہوائی جہازوں کے دیکھ بھال کو چھوڑ کر ابتک کسی طرف سے کوئی زبردست معرکہ نہیں ہوا۔ فرانسیسی فوج پہلے جرمنی کے اندر کچھ دور تک گھس گئی تھی لیکن بارش اور سیلاب نے اُسے زیادہ دنوں تک وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس وقت ڈھائی لاکھ انگریزی فوج فرانس کی مدد کے لئے تیار ہے، اس کے بعض دستوں نے میجنو لائن کی لڑائی میں بھی حصہ لیا۔ ہندوستانی فوج کے کچھ دستے بھی فرانس پہونچ گئے ہیں، اور نوآبادیوں کی فوجیں بھی برابر آرہی ہیں۔ انگلستان نے جبری خدمت کے ذریعہ اپنی فوجی طاقت تیس لاکھ تک بڑھائی ہے۔

روس کو اس لڑائی سے ضرور اچھا فائدہ رہا، پولینڈ کا ایک بڑا حصہ اُس نے ایک بوند خون بہائے بغیر پہلے ہی لے لیا تھا، بلقانی ریاستوں سے بھی اُس کو رعایتیں مل گئیں۔ اس طرح اُس نے یورپ میں پھر اپنا دخل جما لیا ہے۔ مگر ان کارروائیوں سے اُس کی انصاف پسندی اور جمہوریت کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

جنیوا کی لیگ اقوام نے اس سال نئی زندگی کا ثبوت دیا، فن لینڈ کے معاملے میں اُس نے روس کو ظالم قرار دے کر اُسے سبھا سے باہر کر دیا۔ اس جلسے میں نو چھوٹی چھوٹی ریاستیں تو روس کے خوف سے شریک نہیں ہوئیں لیکن باقی بیالیس ۴۲ حکومتوں نے روس کے خلاف علانیہ رائے دی۔ جو اخلاقی حیثیت سے روس کے لئے شرم کی بات ہے۔

جرمنی کو روس کا ساتھ دینے سے فائدہ ہوگا یا نقصان یہ تو آئندہ واقعات بتائیں گے، لیکن اس وقت اس سیاسی فتح کا توڑ ترکی اور برطانیہ کے دوستانہ معاہدے سے ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسی کی بدولت روس کا بیڑہ کالے سمندر (بلیک سی) میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔ امریکہ کے قانون غیر طرفداری میں جو تبدیلی ہوئی ہے اُس سے بھی فرانس اور برطانیہ ہی کو فائدہ پہونچے گا۔

ہٹلر کا یہ بھی خیال تھا کہ انگریز دوسروں کے واسطے اُس سے لڑائی مول نہ لیں گے، اور اگر لڑائی ہوئی بھی تو برٹش نوآبادیاں برطانیہ کا ساتھ نہ دیں گی۔ ہٹلر نے فرانس کو بھی انگلستان سے الگ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس میں بھی اُس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اور سمندر پار برٹش نوآبادیاں (شمالی آئرلینڈ کے علاوہ) سب کی سب اس لڑائی میں برطانیہ کے ساتھ کاندھے سے کاندھا جوڑے کھڑی ہیں۔ اس واقعہ سے جرمنی کے علاوہ انگلستان اور ہندوستان بھی بہت کچھ سبق لے سکتے ہیں۔

برٹش پارلیمنٹ نے اربوں پونڈ لڑائی کا خرچ چپ چاپ منظور کر لیا، عام لوگوں نے خوشی سے نہ صرف

Maginot Line ala.

لڑائی کے لئے بھاری بھاری ٹیکس دینا منظور کر لئے بلکہ کروڑوں پاؤنڈ کے جنگی تمسکات خرید لئے ہیں۔ بنکوں نے اپنے سود کی شرح گھٹا دی، کارخانے اپنی پوری طاقت کے ساتھ دن رات لڑائی کا سامان بنا رہے ہیں غرض ہر شخص اس وقت ملک کے خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ یہاں تک کہ سابق بادشاہ ہز رائل ہائی نس ڈیوک آف ونڈسر بھی اس موقعہ پر انگلستان واپس آکر ایک معمولی فوجی افسر کی حیثیت سے لڑائی میں شریک ہو گئے ہیں۔ عام لوگوں نے اپنے باہمی اختلافات بالکل بھلا دیئے ہیں اور پارلیمنٹ کے انتخابات بھی اتفاق رائے سے بلامقابلہ ہو رہے ہیں۔ ان سب باتوں سے انگریزوں کی عقلمندی اور حوصلہ مندی کا ثبوت ملتا ہے اور جمہوری طریقۂ حکومت کی بڑائی ظاہر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں دیسی ریاستوں اور برٹش انڈیا دونوں میں تمام سال ایک نہ ایک ہلچل مچی رہی۔ راجکوٹ کا جھگڑا تو پہلے ہی سے چل رہا تھا، امسال تھوڑے دنوں کے لئے اس نے ملک بھر میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اور مہاتما گاندھی کے علاوہ والسرائے اور چیف جسٹس انڈیا کو بھی بیچ میں پڑنا پڑا تب جا کر یہ معاملہ سلجھا۔ ٹراونکور اور میسور میں بھی جھگڑا رہا۔ لیکن مہاتما گاندھی نے ہر جگہ سہولیت سے کام لیا۔ اور جہاں جہاں لوگوں نے جوش میں آکر ستیہ آگرہ شروع کیا وہاں اُنھوں نے صبر سے کام لینے کی ہدایت کی ۲۲ مارچ کو ٹراونکور کا ستیہ گرہ بھی مہاتما جی کے حکم سے ملتوی ہوا، اور ریاست نے ستیہ گرہی قیدیوں کو رہا کر کے امن قائم کر دیا۔ ریاست جے پور کے افسروں اور اسٹیٹ کانگریس کمیٹی سے بھی جھگڑا رہا، مسلمانوں کو بھی کچھ شکایت ہو گئی تھی، اور تھوڑے دنوں تک یہاں بھی شور و شر رہا، گرفتاریاں ہوئیں، سیٹھ جمنا لال بجاج بھی کئی دفعہ گرفتار ہوئے، آخر مہاراجہ صاحب نے اپنے افسروں کو رعایت سے کام لینے کی ہدایت کی۔ یہاں بھی مہاتما جی نے ستیہ گرہ بند کرا کے سمجھوتے میں سہولت پیدا کی ریاست حیدرآباد دکن میں جہاں اس سے پہلے ہندو مسلمانوں کا کوئی خاص جھگڑا سُننے میں نہ آیا تھا پچھلے سال آریہ سماجی لیڈروں کو نظام گورنمنٹ کے بعض حکم اور قاعدوں کے خلاف ستیہ گرہ کرنا پڑا، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ گرفتار ہوئے۔ آخر اعلیٰحضرت نظام دکن نے نئی اصلاحوں کا اعلان کیا جس سے یہ جھگڑا ابھی خیر و خوبی سے ختم ہو گیا۔ اس کی یادگار میں شولاپور میں ایک آریہ کالج قائم ہو رہا ہے۔ جس کیلئے لاہور سماج نے تین لاکھ روپیہ کا چندہ جمع کر لیا ہے۔ ریاستوں کی رعایا عام طور پر صدیوں کی نیند سے بیدار ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سال بنارس، میسور، گوالیار، بھوپال۔ رامپور۔ کپورتھلہ۔ جودھپور جے پور وغیرہ ریاستوں میں انتظامات کو نئے حالات کے مطابق بنانے کی طرف قدم اُٹھایا گیا۔

برٹش انڈیا میں صوبوں کی وزارتوں نے عام بھلائی کی بہت سی اسکیمیں جاری کیں۔ یو۔پی۔ مدراس بمبئی۔ ورسی پی میں نشہ بندی میں ترقی ہوئی یو۔پی میں چار نئے ضلعوں میں نشہ بندی کی گئی۔ مدراس میں

بھی کئی نئے ضلعوں میں یہ اسکیم جاری کی گئی۔ یکم اگست ۳۹ء کی تاریخ سے بمبئی جیسے بڑے شہر میں شراب کی فروخت کی ممانعت کردی گئی ہے۔

یو۔پی گورنمنٹ نے عوام کو تعلیم دلانے کا کام بھی زور شور سے کیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا گیا۔ لاکھوں روپیئے کے خرچ سے ہزاروں دیہات میں کتاب گھر اور ریڈنگ روم کھولے گئے یہ اسکیم ۳۸ء کے آخر میں جاری کی گئی تھی، اب اس میں مزید ترقی ہونے کی اُمید ہے۔

پست قوموں کو تعلیمی سہولتیں دی گئیں، ہریجنوں کو مندروں، اسکولوں اور ہوٹلوں میں داخل ہونے کا حق دیا گیا۔ جولائی ۳۹ء میں تنجور کا سب سے پرانا چین مندر ہریجنوں کے لئے کھول دیا گیا۔ اگست ۳۹ء میں مدراس اسمبلی نے قانون کے ذریعہ ہریجنوں کو مندروں میں پوجا کرنے کا حق دیا۔ اسی سال بمبئی کے ہوٹل بھی ہریجنوں کے لئے کھولے گئے۔

کئی صوبوں کی قانونی اسمبلیوں نے جہیز کی روک تھام کی کوشش کی۔ گو یہ سوال اب بھی بحث طلب ہے کہ سوشل ریفارم میں کہاں تک قانونی جبر کا سہارا لینا چاہیئے۔ لیکن اس قسم کی تجویزوں سے جو پچھلے سال ہوئیں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے قائم مقام عام بھلائی کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔

آگرہ و اودھ کی وزارت کا سب سے بڑا کام نئے ایکٹ کاشتکاری (Teunancy Act) کا پاس ہونا ہے، گورنر صاحب نے اس قانون کو نئے سال سے جاری کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کی بدولت چند ہی سال میں کاشتکاروں کی حالت سُدھر جائیگی۔

وزارتیں اپنا کام محنت سے کئے جا رہی تھیں کہ یورپ کی لڑائی چھڑ گئی، اور پارلیمنٹ نے اُن کے بعض اختیارات واپس لیکر گورنمنٹ ہند کے سپرد کر دیئے۔ جس پر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے وزیروں کو حکومت سے علیحدہ ہو جانے کی ہدایت کی۔ اور وزارتوں نے اپنے اپنے صوبے کی قانونی اسمبلی میں تائیدی ریزولیوشن پاس کرا کے استعفے داخل کر دیئے۔ آسام چھوڑ کر باقی سات صوبوں میں گورنر صاحبان کو حکومت کا کام پھر سے اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ اُنھوں نے دو تین صلاح کار مقرر کر کے جہاں تک ہوسکا وزیروں کی پالیسی کو قائم رکھا ہے مگر اس موقعہ پر برٹش گورنمنٹ اور کانگریس میں جو اختلاف ہو گیا وہ افسوسناک ہے۔ وائسرائے نے کئی دفعہ سمجھوتہ کی کوشش کی لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ وزیر ہند اور دوسرے مدبّروں نے بھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی اور اس بات کا بار بار اطمینان دلایا کہ اس لڑائی کو امپیریلزم سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور اس کے خاتمے پر برٹش گورنمنٹ ہندوستان کو نوآبادیوں کی طرح آزادی دینے کے لئے تیار ہوگی، اور مختلف پارٹیوں کی رضامندی سے یہاں کے طرزِ حکومت میں ضروری تبدیلی کرنے کی کوشش کریگی۔ ان تقریروں

اور بیانوں میں ہندوستانیوں کی موجودہ نااتفاقی کو اُن کی آزادی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا گیا ہے۔ کانگریس اس نااتفاقی کو آپس میں طے کرنا چاہتی ہے۔ مسٹر جناح اور اُن کے ساتھی چاہتے ہیں کہ کوئی نئی اسکیم مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر جاری نہ کی جائے۔ غرض کئی مہینے سے یہ ناگوار بحث چھڑی ہے اور کانگریس وزارتوں کے خلاف الزامات کا باربار ذکر اسی ناگوار تکرار کا ایک عبرت انگیز پہلو ہے۔ پنڈت نہرو اور بابو راجیندر پرشاد معاملے کی جوڈیشل تحقیقات کے لئے تیار ہیں، لیکن مسٹر جناح نے شاہی کمیشن کا مطالبہ کیا ہے۔ اُنھوں نے ۲۲۔ دسمبر کا دن کانگریسی حکومت سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ کانگریس میں بھی اس سال جھگڑا رہا، یہ جھگڑا تریپوری کانگریس کے پریسیڈنٹ کے انتخاب سے شروع ہوا اور ابھی تک پورے طور پر مٹا نہیں ہے۔ سُبھاش بابو نے کانگریس کی صدارت سے استعفےٰ دینے کے بعد فارورڈ بلاک کے نام سے ایک نئی پارٹی بنائی۔ بنگال اور پنجاب کے کانگریسی حلقوں میں بھی اس سال نااتفاقی رہی۔ ملک میں کئی جگہ ہندو مسلمانوں کے فساد ہوئے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر کانپور۔ الہ آباد۔ بنارس۔ جبلپور۔ بلند شہر۔ میرٹھ وغیرہ مقامات میں جھگڑا ہوا۔ سکھر میں ایک تاریخی عمارت کے سلسلے میں بڑا سنگین فساد ہوگیا جس سے آس پاس کے گانوٗں بھی تباہ ہو گئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ شہر والوں کی لڑائی کا خمیازہ بیگناہ دیہاتیوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ آگے چل کر اس کا نتیجہ کیا ہوگا اس کو سوچتے ہوئے دل لرزتا ہے۔ لیکن امید یہی ہے کہ آخر سمجھداری اور رواداری ہی کی فتح ہوگی۔ بقول مسٹر جناح جب روس اور جرمنی میں اتفاق ہو سکتا ہے تو ہندو اور مسلمانوں میں میل نہ ہونے کے کیا معنی۔ اتفاق رائے سے کیا ہو سکتا ہے، فیڈریشن اسکیم کا ملتوی ہونا اس کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔

۱۹۳۹ء میں بنگال۔ بہار۔ مدراس اور یو۔پی میں نئے گورنر صاحبان آئے۔ مسٹر جیکر پریوی کونسل کے جج بنائے گئے، سر سہروردی وزیر ہند کے صلاح کار مقرر ہوئے، سر راماسوامی مدلیار گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر ہوئے سر راداھاکشن برٹش اکیڈمی کے فیلو چنے گئے، ابتک یہ اعزاز کسی ہندوستانی کو نہ ملا تھا۔

پولیٹیکل باتوں کو چھوڑ کر دیکھئے تو ہر طرف ملکی ترقی کے سامان موجود نظر آتے ہیں۔ تعلیم کا عام شوق ہوگیا ہے، سوشل ریفارم کی ترقی ہے، عورتیں پبلک لائف میں حصہ لینے لگی ہیں، پچھلے سال بھی انکی کئی کانفرنسیں ہوئیں، مسز وجے لکشمی صاحبہ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ یو۔پی کے استعفے کے بعد اب آسام کی نئی گورنمنٹ میں ایک لیڈی وزیر شامل ہیں۔ تجارت۔ آرٹ۔ علم و فن۔ صنعت و حرفت سب ترقی کر رہی ہیں۔ مصوری سانگیت اور نرت وغیرہ کی قدردانی ہونے لگی ہے۔ پچھلے سال بھی کئی ادبی کانفرنسیں ہوئیں ملک میں ادبی ذوق ترقی پر ہے، ہمارے صوبے میں اردو۔ ہندی کے خیرخواہ ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش

کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں دونوں زبانوں کے مطبوعات کا معیار پہلے سے بہت بلند ہو گیا ہے مصنفین اور شاعروں کی قدر دانی کی طرف بھی توجہ ہے۔ چنانچہ پچھلے سال کئی جگہ علامہ اقبال کی برسی منائی گئی موسیقی کانفرنسیں اور صنعتی نمائشیں ہوئیں۔

صنعت و حرفت و دستکاری کو بھی خوب ترقی ہوئی۔ پچھلے سال کئی ریاستوں میں نئے نئے کارخانے کھلے۔ اس سال لڑائی کی وجہ سے نئی نئی چیزوں کی مانگ ہوئی اور لوگوں کو اُن کے بنانے کا شوق پیدا ہوا اس سال ایسے ملکوں سے مانگیں آ رہی ہیں جو پہلے کبھی ہندوستان سے مال نہ خریدتے تھے۔ جوٹ کا کہنا ہی کیا! پچھلی لڑائی میں مشکل سے دس کروڑ بوریاں گئی تھیں۔ اس دفعہ لڑائی جاری ہونے سے پہلے بیس کروڑ بوریاں بھیجی گئیں، لڑائی کے بعد ستر کروڑ تیرہ لاکھ بوریوں کا اور آرڈر آیا ہے جو پورا ہو رہا ہے۔ چار کروڑ گز کرمچ اس کے علاوہ جا چکا ہے۔ اونی کپڑے اور کمبل بنانے والے کارخانے رات دن سرکاری کام کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دستی کرگھے بھی اس وقت فوج کے لئے کمبل بنا رہے ہیں تب جا کر کہیں ۲½ لاکھ کمبلوں کا آرڈر پورا ہوگا۔ اسٹیل کی لاکھوں فوجی ٹوپیاں مانگی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ سرکاری کارخانے گولہ بارود اور لڑائی کا سامان بنا رہے ہیں۔ غرض لڑائی کی بدولت برسوں کا کام دنوں میں پورا ہو رہا ہے۔ اس طرح اس لڑائی سے ہندوستان کو فائدہ ہی پہونچے گا۔ لڑائی شروع ہونے کے پہلے ہی تین ہفتوں میں گیارہ کروڑ روپیہ کے آرڈر ہندوستان میں آئے۔

بُرائی سے بھلائی قدرت کا معمولی انتظام ہے اس لئے موجودہ نسل کی قربانیاں بیکار نہ جائیں گی۔

نیا سال لڑائی کے ہنگامہ خیز فضا میں شروع ہو رہا ہے اور بڑے بڑے ملک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آ رہے ہیں مگر دنیا کی ترقی اور بہبودی کی اُمیدیں بھی قائم ہیں، اور یہی اُمیدیں کیا لڑائی کے میدان اور کیا گھروں کی چار دیواری میں ہمارے حوصلوں کو قائم و برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آخر قدرت قتل و غارت گری اور کشت و خون کے بعد بھی آدمی کو انسانیت کا سبق سکھانے اور دنیا پر امن اور خوشحالی کی برکتیں نازل کرنے میں کامیاب ہوگی۔ بقول شاعر اعظم ٹگور یہ لڑائی انسان کے ضمیر یعنی ہماری آتما یا انتر دیوتا کو جسمانی و روحانی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا کھلا ہوا چیلنج دے رہی ہے۔ مگر جیسا کہ موصوف نے یاد دلایا ہے پراچین ہندوستان آج سے بہت پہلے اس چیلنج کا جواب دے چکا ہے اور اس جواب میں ایسی سچائی ہے جو مٹانے سے بھی مٹ نہیں سکتی ہے۔ اس لئے آج بھی دنیا کے لئے اُسی لافانی پیغام کے دہرانے کی ضرورت ہے جو اُپنشد نے ہزاروں سال ہوئے ہماری ترقی و بہبودی کے لئے دیا تھا۔ آج بھی اُپنشد کی زبان میں آئندہ کیلئے ہماری یہی دُعا ہونا چاہیئے کہ ہمارا ضمیر جو ہمارا انتر دیوتا ہے ہمکو آپس کی بے اعتباری سے بچائے۔ خدائی نعمتوں کی تقسیم میں باہمی لڑائی جھگڑے سے نجات دلائے اور دوسروں کے ساتھ حق و انصاف نہ کرنے میں ہم جس مجنونانہ ضد سے کام لے رہے ہیں جسکی وجہ سے تمام دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا ہے اُس کو دُور کرکے ہم کو انسانی تہذیب کے اعلیٰ ترین مراتب تک پہونچائے۔

نوٹ

کاغذ اور دیگر سامان طباعت کی گرانی نے اخبارات و رسالوں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ حتیٰ کہ یورپ کے بڑے بڑے مقتدر اخبارات نے بھی اپنے صفحات کم اور اشتہارات کے نرخ بڑھا دئے ہیں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے انگریزی پرچوں نے بھی اپنی ضخامت و رعایتی پرچوں کی فہرست میں بہت کمی کر دی ہے۔ یہاں نرخ اشتہارات یا قیمت میں اضافہ کا سوال بہت مشکل ہے۔ اُردو کے بلند آہنگ رسالے بھی جو آئے دن پبلک قدردانی کی داستانیں سُنایا کرتے تھے موجودہ حالات سے تلملا رہے ہیں۔ انجمن خادمان ہند کا پُرانا ہفتہ وار "سرونٹ انڈیا" تو اس سال کے آغاز سے بند ہی کر دیا گیا۔ انگلستان کا اسّی سال کا پُرانا رسالہ کارن ہل میگزین بھی جنگ کی گرانی کا شکار ہو گیا۔ زمانہ کے سامنے بھی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ چنانچہ ہم بھی اس پرچے کے بعد سے "فری لسٹ" رعایتی فہرست میں غیر معمولی کمی کرنے پر مجبور ہیں۔

اس فہرست میں بعض مقتدر معززین کے بھی نام ہیں جن کے پاس عرصہ سے رسالہ بہ اُمید قدردانی حاضر ہو رہا ہے۔ بہت سے اصحاب کی خدمت میں اس اصول پر رسالہ حاضر ہوتا رہا کہ "حیف، بر جان سخن گر بہ سخندان نہ رسد"۔ ہم کو اُمید ہے کہ یہ سب اصحاب زمانہ کی آیندہ غیر حاضری کو گوارا نہ فرمائیں گے۔ اور اسوقت جبکہ ہم کو اُن کی مالی امداد کی ضرورت ہے پانچ روپیہ سالانہ ادا کر کے زمانہ کی فہرست خریداران میں شامل ہو جائیں گے۔ جو صاحب پوری قیمت ادا نہ کر سکیں اُن سے منیجر زمانہ رعایتی قیمت بھی لینے پر تیار ہیں۔ غرض ہم اپنی طرف سے نہیں چاہتے کہ ہمارے جن قدردانوں کی خدمت میں ابتک یہ ناچیز رسالہ حاضر ہوتا رہا ہے اُن کے مطالعہ میں کسی طرح کا فرق آئے۔ لیکن ہماری یہ خواہش ہمارے معززین احباب کے تعاون و امداد کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

لیتھو چھپائی میں کتابت کی غلطیوں کا دکھڑا پُرانا ہے۔ زمانہ بھی اس کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ لیکن سارا قصور کاتبوں کا بھی نہیں ہوتا۔ لیتھو مطبعوں میں تصحیح کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا۔ زمانہ کو اپنی بے بضاعتی کا بھی رونا ہے جس کی وجہ سے اکثر مضامین میں اہم غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ابتدائی غلطی تو کاتبوں کی ہوتی ہے لیکن تصحیح کا خاطرخواہ انتظام ہو، تو یہ غلطیاں بہت کم رہ جائیں۔ بہرحال ہم کو افسوس ہے کہ پچھلے دو پرچوں میں کئی فاش غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً نومبر نمبر زمانہ میں صفحہ ۲۹۲ کی سطر اول پر لفظ "نہ" چھوٹ جانے سے مضمون کا مطلب ہی برعکس ہو گیا۔ مضمون نگار صاحب نے لکھا تھا کہ "جو طلبا بوقت امتحان دونوں (اُردو ہندی) میں کامیاب نہ ہوں اُن کو درجہ نہ چڑھایا جائے۔ مگر اصل عبارت نقل ہوتے وقت لفظ "نہ" لکھنے سے رہ گیا اور یہ چھپ گیا کہ "........ اُن کو درجہ چڑھایا جائے"۔ دسمبر ۳۹ء نمبر میں تنقید کتب کے ذیل میں حضرت اثر لکھنوی کے دو اشعار نقل کرنے میں کتابت کے دو اغلاط رہ گئے۔ جو ذیل میں درست کئے جاتے ہیں۔ اس شعر میں ؎

دل سلامت ہے تو اک روز دکھا ہی دیں گے　　　یہ جو اک شانِ خودی ہے 'ابھی خودداری میں

"دکھا" کی جگہ "مٹا" چاہئے۔

تجکو اپنی ہی دل آزاریٔ پیہم کی قسم　　　لُطف کی ایک نظر 'ہوش میں لانے کے لئے

میں "لانے" کی جگہ "اُڑانے" چاہئے۔

اسی پرچہ میں کاتب نے ٹائٹل اور صفحہ ۳۵۶ پر ڈاکٹر جگدیشور چندر رقیبی کی نظم کے تحت میں اُن کے نام کیساتھ ترنی کی جگہ "بیرلی" لکھدیا ہے۔ اصل لفظ برنی یعنی بلند شہری ہے۔

رفتار زمانہ کے ذیل میں اس دفعہ پچھلے سال کے واقعات پر جو مضمون درج ہے وہ ایڈیٹر زمانہ کی براڈکاسٹنگ تقریر پر مبنی ہے جو لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو نشر کی گئی تھی۔

زمانہ

جلد ۷۴ | فروری سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۲

اُردو۔ہندی۔ہندوستانی

(پروفیسر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ، پنجاب یونیورسٹی)

اُردو کے لغوی معنیٰ "لشکر" ہیں، اور اس کا تواریخی تعلق مسلمان فاتحوں کے اُس لشکر سے ہے جو شہر کے باہر پڑا رہتا تھا۔ یہ لفظ ہندوؤں کو اپنی غلامی کے دنوں کی یاد دلاتا ہے، اِس لئے قدرتی طور پر ہندو اسے ترک کرنا چاہتے ہیں، اور مسلمان اسے ترجیح دیتے ہیں۔ ناظرین کرام کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں نے لفظ "ورنیکولر" ترک[1] کر دیا ہے کیونکہ اس کے لغوی معنیٰ "غلاموں کی زبان" ہے اور اس کے بجائے وہ موجودہ دیسی زبان استعمال کرنے لگی ہیں۔

ہند "سندھو" کا مفرس ہے "سندھو" کو ہند اور سندھو دیش کے رہنے والوں کو "ہندو" کہا جاتا تھا۔ اِس دیس کے باشندے جو زبان (اپ بھرنش) بولتے تھے اُس کا ایران والوں نے ہندوی نام رکھا، بعد میں یہ لفظ کُل ہند کی دیسی زبانوں خصوصًا شمالی ہند کی زبانوں کے لئے استعمال ہوا تغلق بادشاہوں کے عہد میں جب علاقۂ ہندوستان کی حدود قائم ہوئیں تو وہاں کی زبانوں پر ہندی کا عام طور پر اطلاق ہوا۔

ایک ادیب کی نظر خاص طور پر باریک بیں اور نکتہ شناس ہوتی ہے۔ خسرو نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانیں گناتے وقت پنجابی کو "لاہوری اور مُلتانی" کہا، شمالی ہندوستان کی زبانوں

---

[1] کانگریس گورنمنٹوں نے ۔۔ اس لفظ کو اپنے تعلیمی محکموں سے خارج کرنے کا حکم جاری کیا تھا۔

کو مجموعی طور پر "ہندوی" کے نام سے یاد کیا۔ مسلمان مورخوں نے اُس خط یا قصیدہ کو جو کالنجر کے راجہ نے محمود کو بھیجا تھا 'ہندی' لکھا ہے۔

یہاں صوبوں کی تقسیم لسانی اور سیاسی اور قومی یا جماعتی نکتۂ نگاہ سے ہوتی چلی آئی ہے، چنانچہ صوبہ کے نام کے آخر میں 'ی' لگاکر وہاں کی زبان کا نام وضع کیا جاتا رہا ہے۔

تغلق بادشاہوں کے زمانہ میں "ہندوستان" ایک ملکی تقسیم کا نام تھا۔ اکبر کے عہد میں وہ علاقہ بٹ گیا آج کوئی صوبہ ہندوستان نہیں کہلاتا اور نہ ہندوستانی کسی ایک صوبہ کی زبان کا نام ہے۔ اس لئے ہند کی لنگوا فرینکا کے لئے "ہندی" ہی کا نام موزوں ہے۔ گو میں نے کُل ہند کی زبان کو "شمالی ہند منفی پنجاب" کی زبان سے الگ کرنے کے خیال سے اول کو "ہندوی" اور دوسری کو "ہندی" کہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے اکثر اہل قلم یہ امتیاز روا رکھتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں اپنشدونکا ترجمہ کرنیوالا دہلوی مصنف اپنے نثر کو ہندی کہتا ہے

خسرو سے ایک ہزار برس پیشتر جنوبی ہند کی دیسی زبانیں وجود میں آ چکی تھیں۔ اس سے تین سو برس قبل شمالی ہند میں مختلف بولیاں رائج تھیں۔ ان اَپ بھرنشوں" (یعنی پراکرت یا بول چال کی زبان کی ترقی یافتہ یا بگڑی ہوئی صورتیں) کے نام زیادہ تر صوبوں یا ریاستوں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ اور کچھ نام فرقوں، گروہوں، قوموں کے نام پر بھی وضع کئے گئے تھے۔ شمالی ہند کی بھاشاؤں میں باہمی اختلافات کم تھے۔ لسانی اختلافات۔ جسمانی۔ جماعتی۔ جغرافیائی اختلافات کی بنا پر پیدا اور میل ملاپ سے کم ہو جاتے ہیں تحریری زبان کے مطالعہ، حکومت کی وسعت اور موجودہ لفظیات کی رو سے شمالی ہند کی زبانیں مندرجۂ ذیل ہیں

اَودھی روہیلکھنڈی۔ برج بھاشا راجستھانی پنجابی مُلتانی وغیرہ

یہ زبانیں "ہندوی" کہی جا چکی ہیں اور اب بھی کہی جا سکتی ہیں، مگر یہ "ہندی" کہاں سے آ گئی۔ کیا کسی زمانہ میں کوئی ایسی تقریری یا تحریری زبان تھی جو کُل شمالی ہند میں بولی لکھی یا سمجھی جاتی ہو؟ اگر تھی تو اس زبان نے کب اور کیونکر ترقی پائی؟ اُس وقت کے لوگ اُسے کیا کہتے تھے؟ اور موجودہ تحریری ہندی اور اُردو سے اس کا کیا تعلق ہے؟

ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والے عموماً تاجر، مذہب کے مبلغ، جاتری یا فوجی لوگ ہوتے ہیں۔ ہند قدیم میں یہ نقل وحرکت زیادہ تر کھتریوں، بنیوں، راجپوتوں، جوگیوں اور سنیاسیوں تک محدود تھی۔ تاریخی حیثیت سے ہم تک جوگیوں اور سنیاسیوں کا کلام ہی پہونچا ہے جن کی زبان کے تجزیہ سے ہم ذیل کے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

نثر کا وجود دیر میں ہوا، پھر بھی جس قدر ملتا ہے اُس سے ہندی۔ ہندوستانی اور اُردو کا بکھیڑا بخوبی

بٹ سکتا ہے۔

زبان کے تجزیہ میں تین باتیں اہم ہیں: اسم، فعل اور حروفِ جار، اِن پر ترکیب کو اضافہ کیجیے۔ جن جوگیوں، سنیاسیوں اور بھگتوں کا کلام میرے ذاتی مطالعہ میں آیا ہے اُن کے نام اور عہد یہ ہیں سنین کے بارے میں اختلاف کی گنجایش ہے۔

گورکھ ناتھ	دسویں صدی عیسوی
چرپٹ ناتھ	
رنورتی ناتھ	بارھویں صدی
نام دیو	تیرھویں صدی
رامانند	چودھویں صدی
پیپا	
رو داس	
نانک	پندرھویں صدی
سندر داس	سولھویں صدی

اِن کے نفس مضمون اور طرز بیان کے اختلافات نے اکثر نقادوں کو پریشان اور غلطی میں مبتلا کر دیا ہے۔ بہرحال جہاں تک موجودہ مضمون کا تعلق ہے، اس کلام کی شہادت یہ ہے کہ اسما میں سنسکرت پراکرت، اُپ بھرنش سبھی صورتیں موجود ہیں۔ فارسی، عربی کے الفاظ ہیں مگر ہندی بول چال کی صورت میں نہ کہ اپنی اصلی صورت میں۔ سنسکرت کے لفظ ہوں یا پراکرت یا فارسی اور عربی کے اُن سب کو ہندی صرف و نحو کے تحت میں لایا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ جو یوگ، ویدانت، بھگتی وغیرہ سے متعلق ہیں وہ مختلف طبقوں کے ادیبوں اور مختلف مقامات کے باشندوں کی تحریروں میں مشترک ہیں۔ یہی اشتراک سماجی اور سیاسی زندگی سے متعلق الفاظ میں بھی موجود ہے۔ افعال میں عجیب تنوع ہے۔ مقامی، جماعتی اور صوبائی خاص افعال اور فعلی صورتیں الگ الگ ہیں۔

حروفِ جار کے معاملہ میں بھی یہی برتاؤ ہوا ہے اور ان کا استعمال اس بات کو صاف طور پر واضح کر دیتا ہے کہ یہاں ہمارا واسطہ سنسکرت اور فارسی ایسی تصریفی (Synthetic) زبانوں سے نہیں بلکہ نحوی (Analytic) زبانوں سے ہے جن میں وبھوتیاں اور ترکیبیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مثلاً "ی" لگا کر اسم صفت بکثرت بنایا جاتا ہے اور اسم کے فعل بنا لینے میں کوئی دریغ نہیں کیا جاتا۔

ترکیب سنسکرت میں گردان بہت کم ہے۔ یونہی دو لفظوں کو جمع کر کے ایک نئی صورت نئے معنوں پر حاوی بنالی جاتی ہے۔

مگر سب سے بڑی بات اور ہمارے مطلب کی بات جو ان بھگتوں کے کلام سے ٹپکتی ہے یہ ہے کہ ایک ایسی تحریری بلکہ ادبی زبان ظہور میں آچکی ہے جو کسی قدر محدود اور بناوٹی ہونے کے باوجود شمالی ہند کے تمام صوبوں میں ہر طبقہ کے خواندہ یا ان پڑھ معرفت دوست لوگوں میں سمجھی جاتی ہے اور جسے اپنی مقامی یا صوبائی زبان کے ساتھ ساتھ اپنانا ہر اہل قلم کا فرض تھا۔ اس زبان میں نظم تو موجود ہی ہے اُس کی نثری صورت بھی نظموں سے کافی حد تک جھلکتی ہے اور اخذ کی جاسکتی ہے۔ شمالی ہند کی اس مشترکہ ادبی زبان کو ہندی کہتے رہے ہیں۔

اُس ادبی زبان کی نثری صورت ہمارے پاس صرف دو تین مجموعوں میں پہونچی ہے۔ دیکھیے پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کا قلمی نسخہ نمبر ۴۰۸۴ جو ۱۶۰۰ء میں تیار ہوا۔ اس کے آخری حصہ میں متعدد مکالمے ہیں جو گورو نانک اور اُن کے مستفسرین میں ہوئے۔ ان کے علاوہ انھی دنوں ہوگ بششٹ اور اپنشدوں کے ترجمے اور کبیر، ردو داس اور محمد صاحب کی سوانح عمریاں ہیں۔ یہی کھڑی بولی ہے اور یہی آپ کی ہندی یا مرکزی پنجابی ہے، یہی آپ کی وہ نثر و نظم ہے جسے مسلمان صوفیہ نے دکن۔ گجرات، دہلی اور پنجاب میں یکساں استعمال کیا۔ اس قلمی نسخہ کی موجودگی میں یہ کہنا کہ کھڑی بولی مسلمانوں کی ایجاد ہے یا ہندی نثر اُردو نثر کی دوسری صورت ہے جس میں فارسی عربی کے بجائے سنسکرت پراکرت اپ بھرنش کے الفاظ ہیں یا یہ کہ ہندی نثر کا مولد فورٹ ولیم یا قلعہ معلیٰ ہے قطعی غلط ہے۔ تحقیق سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اکثر ہندو اور مسلم ادیب اور مؤرخ انگریزی مصنفین کی تقلید میں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں

یہ بھی قطعی غلط ہے کہ ہندو بھگت صرف برج بھاشا کا استعمال کرتے تھے یا یہ کہ برج بھاشا عام اور غالب تھی۔ خود متھرا کے رہنے والے نانند ہندی برتتے ہیں، کبیر ہندی برتتے ہیں، تلسی اودھی لکھتے ہیں جائسی بھی اودھی لکھتے ہیں۔ گویشانند کبیر کے ہم عصر تھے۔

اگر مذکورہ بالا اُمور کی تائید موازنہ کی صورت میں درکار ہو تو چند ہمعصر ہندو مسلمان شاعروں کے نام درج کئے جاتے ہیں جن کے کلام میں وہی خصوصیات لسانی۔ اصواتی اور مضمونی نظر آئیں گی جو اُن کے ہمعصر ہندو شعرا کے کلام میں ملتی ہیں:۔

خسرو　　بابا فرید گنج شکر　　نام دیو　　کبیر　　تجید (بایزید)

ردداس　　شاہ میراں جی　　نانک　　دادو

مسلمان شعرا بھی وہی مشترکہ ادبی زبان یا ہندی لکھتے تھے جو ہندو عام اس سے کہ وہ دکن میں ہوں یا پنجاب، گجرات یا اودھ میں ہوں۔ عام طور پر وہ اپنی زبان کو ہندی ہی کہتے تھے۔ اگر کہیں انھوں نے اس زبان کو گوجری۔ اودھی۔ پنجابی۔ دہلوی یا دکنی کہہ دیا تو کوئی ہرج کی بات نہیں۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ وہاں کی تحریری یا ادبی زبان اُن کے (خاص) صوبہ کی بول چال سے اور مقامی کلیتہً ادبی زبان سے کافی مختلف ہے۔ پھر یہ ہندی اُردو کیونکر اور کب ہوگئی؟

ایک زبان کا دوسری زبان سے فرق ظاہر کرنے والی چیزیں ان کے افعال اور حروف جار اور الفاظ کی لسانی اور اصواتی صورتیں ہوتی ہیں۔ اسمار کو اس سے چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ فارسی الفاظ کی کثرت ہندی کو اُردو نہیں بنا سکتی اور نہ سنسکرت الفاظ کی موجودگی فارسی یا اُردو کو اپ بھرشٹ کرکے ہندی یا سنسکرت بنا سکتی ہے۔ اول تو عوام غیر زبانوں کے الفاظ کو قبول کرتے وقت ادیبوں سے مشورہ نہیں کرتے۔ پھر جس صورت میں وہ اجنبی الفاظ کو روزمرہ میں داخل کرلیتے ہیں اور جو صرفی ونحوی برتاؤ اُن سے روا رکھتے ہیں اُس کا ادیبوں کی رائے پر قطعی انحصار نہیں ہوتا۔

درحقیقت ہندی نظم اُس وقت اُردو بنی جب بقول سر چارلس لائل ہندی بحروں کے بجائے فارسی اوزان اور بحریں مستعمل ہونے لگیں۔ اور ہندی نثر اُس وقت اُردو بنی (حالانکہ اس سے قبل بھی ہندی نثر کی ساخت میں فارسی نثر کا کافی اثر پڑ چکا تھا) جب اضافت اور ترکیب نے دخل پایا، اور جب نظم و نثر دونوں میں فارسی عربی کے اجنبی الفاظ کو اُن کی اصلی صورت میں لکھنے باندھنے اور صرف ونحو کے تحت میں لانے کا عمل شروع ہوا، اور جب اسمار کی جمع عربی فارسی طریقہ سے بنائی جانے لگی۔ اس سے قبل عربی فارسی کے مخصوص حروف کو ایک طرف رکھدیا جاتا تھا اور اُن کے اصوات کو لیکر انھیں ہندی طریقہ پر بولا اور لکھا جاتا تھا۔ اضافت بہت ہی کم برتی جاتی تھی اور وہ بھی بہ مجبوری اور عجز کے اعتراف کے طور پر پھر اضافت سے ہندی اور فارسی الفاظ کو جوڑ دیا جاتا تھا۔ اکثر حروفِ جار محذوف کردیے جاتے تھے۔ فعل کی پوری صورت میں سے کچھ کم کردیا جاتا تھا اور عبارت کی ترکیب ہندی طریقہ پر اور ہندی افعال سے تکمیل پاتی تھی۔ یہ باتیں سترھویں صدی کے آخری زمانہ سے آغاز ہوئیں اور اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں عروج کو پہونچیں۔[1]

(۲)

قبل اس کے کہ ہم کسی ایک صوبہ یا علاقہ کی بول چال (یا تحریر) کی زبان کو کُل ہند کی زبان بنانے کی

---

[1] اس مضمون میں زیادہ تر یادداشت سے کام لیا گیا ہے جن اصحاب کو حوالے درکار ہوں وہ میری ذیل کی کتابیں دیکھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

Urdu Literature, Hindi Literature

Moderan Urdu Poetry. History of Panjabi Literature.

کوشش کریں، ہمیں ذرا اُن تاریخی واقعات کا بغور مطالعہ کرلینا چاہیئے جن کے ماتحت دیسی زبانوں نے موجودہ صورت اختیار کی۔ ہندوستان کے جغرافیائی و جماعتی اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ کوئی ایسا بھی وقت تھا جب تمام ہند میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی، مگر ہم کو یہ ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہند میں ایک وقت سنسکرت کافی طور پر رائج تھی۔ زباندانوں کا کہنا ہے کہ سنسکرت جس کے لغوی معنی "مصفّا و مہذّب" ہیں دراصل ایک تحریری زبان ہے اور پراکرت جس کے لغوی معنی بول چال کے ہیں مقدم ابتدائی بول چال کی زبان تھی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا پراکرتوں نے بگڑ کر اپ بھرنشوں کی صورتیں اختیار کیں۔ اور ان مختلف اپ بھرنشوں سے ہمارے صوبوں کی موجودہ دیسی زبانیں پیدا ہوئیں۔

یہ جو کچھ ہوا قدرتی اثرات کے ماتحت ہوا، کیونکہ کائنات کے ہر جزو میں تغیر و تبدل کا سلسلہ جاری ہے اور ہم اِن قدرتی تبدیلیوں کو اپنی زبان اور قلم سے روک نہیں سکتے ہیں، ہماری قدامت پرستی اور مذہبی جذبات بھی اِن تبدیلیوں کے متعلق بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ لسانی اور ادبی تبدیلیاں دوسری تبدیلیوں کے پہلو بہ پہلو اور قدم بہ قدم چلتی ہیں۔ اور اپنے اندر تمام تہذیبی و سماجی تبدیلیوں کی جامع و مانع نمایندگی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اصوات اور صرف و نحو کے قواعد میں وہی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو کسی آبادی یا خطّہ کے لسانی جوہر (Linguistic Genius) کے ہم آہنگ اور مطابق ہوتی ہیں۔ مسلمان ادیب مسلمان عوام کی بول چال کو اُن کے ہندو پڑوسیوں کی زبان سے متاثر اور اُس کے ہم صَوت اور ہم قدم ہونے سے نہیں روک سکتے۔ پھر جو ادیب روزمرہ بول چال کی زبان کی اہمیت ہمہ گیری اور آزاد روی کو سمجھتے ہیں وہ عوام کی خدمت اور نمایندگی کے جذبات کے ماتحت اپنی ادبی تحریروں میں عام بول چال سے بہت زیادہ تفاوت نہیں ہونے دیتے۔ ہاں اُن حضرات کی اور بات ہے جو دوسرے ملکوں کے رہنے والے ہم مذہبوں کو مخاطب کرنے کی دُھن میں اپنے پڑوسیوں کی پروا نہ کریں۔ یہ اصحاب جو کچھ بھی کرگذریں تھوڑا اور اُن کی نظر میں درست ہے۔

شمالی ہند کی موجودہ بولیاں اپنی پیشرو اپ بھرنشوں کی اولاد ہیں، ہم ان قدرتی صلبی وارثوں کو موروثی علاقوں کی حکومت سے کیوں محروم کریں، اور کریں بھی تو کیا فطرت کی زبردست قوتیں اس خلاف ورزی کو قائم رہنے دینگی؟ اب جس ہندی کو ہم راجستھانی، برجی، روہیلکھنڈی، ملتانی، پوربی وغیرہ علاقوں میں رائج کرنا چاہتے ہیں، کیا وہ اپنے اندر اِن زبانوں کے مشترکہ جوہر رکھتی ہے؟ اور کیا وہ ان علاقوں میں ہر روزمرہ بول چال کی زبان بننا چاہتی ہے یا فقط تحریری زبان؟ اگر بول چال کی زبان بننا چاہتی ہے تو اول تو یہ بات کبھی وجود میں آ ہی نہیں سکتی اور اگر آ بھی گئی تو سو دو سو برس میں قدرتی اسباب کے ماتحت پھر اسی

درجہ کے اختلافات اور تصرفات پیدا ہو جائیں گے جو اس وقت اِن علاقوں کی زبانوں میں ہیں۔ اگر تحریکی زبان بننا چاہتی ہے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ اور ایسی صورت میں جب مختلف صوبوں کے رہنے والوں کے باہمی تبادلۂ خیالات کے لئے انگریزی موجود ہی ہے تو کوئی دوسری زبان کیوں لی جائے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اپنی زبان پھر بھی اپنی ہی ہے، تو میں عرض کرونگا کہ کُل ہند کی اس دیسی زبان کو ان صوبوں یعنی صرف شمالی ہند میں رواج دیجئے جہاں بول چال کی زبانیں آپس میں قرابت و مماثلت رکھتی ہیں نہ کہ اُن صوبوں میں جہاں کی زبانوں کو شمالی ہند کی پُرانی اپ بھرنشوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ (جیسے دکن) اور نہ اُن صوبوں میں جہاں کی دیسی زبانیں اس قدر ترقی کر چکی ہیں کہ اب اُن کی موت سے دنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچے گا۔

دوسرے کُل شمالی ہند کی اس زبان میں وہ عنصر برقرار رکھنا چاہئیے جو شمالی ہند کے صوبوں کی زبانوں میں اب تک مشترک رہا ہے۔ یعنی اس زبان میں وہ سب مشترکہ عناصر بہم کر دیئے جائیں جو کسی وقت بھگتوں اور صوفیوں کے کلام میں یکجا کر دیئے گئے تھے۔ اس زبان میں اُن خصوصیات کو داخل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن کی بدولت اٹھارویں صدی کے آخر کے مسلمان شعرا اور اُنیسویں صدی کے ادیبوں نے ہندی کو اُردو بنا دیا یعنی تمام شمالی ہند کی مشترکہ ادبی زبان کے بجائے عربی فارسی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ ان زبانوں کے حروف، اصوات صرف و نحو وغیرہ تک کو ایک خاص درجہ دیدیا۔ چنانچہ اگر آج تحریری اُردو سے اضافتیں، فارسی عربی طرز کی جمع اور فارسی عربی ترکیبیں نکال دی جائیں تو پھر شمالی ہند کے ہندو مسلمانوں کی ایک مشترکہ زبان خود بخود موجود ہو جائے۔ ہم کو کوئی خاص مشترکہ زبان بنانے کی تکلیف اُٹھانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

یہاں پر میں اپنے مسلمان دوستوں سے ایک بات یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا مسلمان عوام کی بول چال میں (خواہ وہ جونپور، گورکھپور، اور عظیم آباد کے لوگ ہوں یا حصار، بیکانیر اور بہاولپور کے باشندے) اضافتیں اور فارسی عربی طرز کی جمع اور ترکیبیں موجود ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کیا یہ خصوصیات ہماری ہندی لسانی[1] اور اصواتی جوہر کے خلاف نہیں ہیں؟

خالص ہندی صوتیات اور لسانیات کا مطالعہ کرنے والے اس نکتہ کی داد دیں گے اور اسباب کے ضرور تسلیم کریں گے کہ فی الواقع ایک خالص تواریخی اور لسانی مسئلہ کو خواہ مخواہ ایک مذہبی، تمدنی اور سیاسی سوال بنا دیا گیا ہے۔ دیہاتی آبادی میں زبان کا جھگڑا نہ پہلے کبھی تھا، نہ اس وقت ہی ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے دراصل ہمارے درباری ادیبوں بغیتوں اور ادبی حلقوں کے ہوس پرستوں کو کچھ ایسی باتیں پسند اور ناپسند ہوئیں۔

---

[1] Linguistic Genius.

جو بدقسمتی سے ابتک ہمارے گلے کا ہار بنی چلی آتی ہیں، اٹھارویں صدی کے نصف تک شمالی ہند کے ہندو شاعروں اور نثر نویسوں میں کوئی احساس کہتری نہ تھا، مگر اس وقت سے اُن میں ایک احساس کمتری (Inferiority Complex) پیدا ہوگیا ہے۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ ہندو ادیب مسلمان نقادوں سے کچھ اس طرح ڈرتے ہیں جیسے چوہے بلی سے۔ دراصل وہ مسلمان ادیب کے منہ سے اپنے متعلق تعریفی کلمات سننے کو ترستے ہیں، اور ہر وقت کسی نہ کسی مسلمان اُستاد کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ دکن، گجرات، پنجاب اور اودھ کے مسلمان صوفی اور شاعر اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اسلامی تہذیب سے متعلق فارسی عربی الفاظ کھپا کر تبلیغ کا کام نکا لتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ اب ہندو فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار کرنے پر بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی مسلمان ان کی حرف گیری نہ کرے کہ میاں یہ ہماری زبان ہے، ہمارے پرکھوں نے پراکرت سے اپ بھرنش اور اپ بھرنش سے دیسی بنائی ہے، ہم جو لکھیں وہ صحیح۔ عربی فارسی کا اجنبی لفظ ہمارے سوراج میں آئیگا تو ہمارے لسانی احکام کے ماتحت ہو کر رہیگا۔ ہندی لکھنے کے لئے ہندو کو دلی اور لکھنؤ کی سند درکار نہیں ہوتی، وہ ماں اور بہن اور دوستوں سے جو کچھ سُنتا ہے وہی لکھتا ہے پھر تلسی اور سور اور کبیر اور دادو نے ہزارہا اپ بھرنش کے الفاظ ایسی دلکش اور سادہ صورت میں رائج کردیئے ہیں جس کی بدولت آج ہندوؤں کو سنسکرت کی بھی غلامی نہیں کرنی پڑتی۔ جان بوجھکر کوئی سنسکرت صورتوں اور سنسکرت گرامر کی تقلید کرے تو یہ اس کی کوتہ اندیشی اور بد ذوقی ہے۔

زبان تہذیب و تواریخ، مذہبی عقائد، عقلی دلائل اور روحانی مشاہدات و تجربات کی محافظ اور نمایندہ ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ہندوؤں سے کس طرح یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کو خیرباد کہدیں اور ان الفاظ اور محاوروں کو جو ہزارہا برس سے ایک متبرک و پُرمعنی فضا اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں ترک کردیں آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان بھی عربی فارسی الفاظ سے دست کش نہیں ہوسکتے، لیکن میں نہ مسلمانوں سے اور نہ ہندوؤں سے اس قسم کا مطالبہ کرتا ہوں۔ مسلمانوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے اُردو کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اب وہ عربی فارسی تمدن اور زبان کی مکمل علمبردار اور نمایندہ بن گئی ہے۔ پھر اب وہ کسی سیاسی غرض و رعایت کے لئے اُردو کو کیوں ترک کریں۔ میرے خیال میں اُن کو ایسا کرنا بھی نہ چاہیئے۔ رہے وہ ہندو جو اُردو کے شایق و قدردان ہیں، تو یہ اُن لوگوں کی پست خیالی ہے اگر وہ مسلمان مورخوں اور ادیبوں سے اپنے علمی و ادبی شوق کی داد چاہتے ہیں اور جب وہ ان کا ذکر توصیفی کلمات میں نہیں کرتے تو اُن سے خفا ہوتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے کشمیری پنڈت اور کایستھ مصنفین زیادہ سمجھدار تھے، وہ اُردو کو ایک غیر زبان سمجھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتے تھے کہ ہندو تہذیب کی ترجمانی اور نمایندگی کرنے والی بہترین

ہندی اور سنسکرت کتابیں اُردو میں منتقل ہو جائیں تاکہ دوسری قوموں اور اس زبان کے ہندو جاننے والوں کے پڑھنے کے لئے کچھ سامان مہیا ہو جائے۔ یہ کام اُنھوں نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔ درحقیقت اُنھوں نے اُردو کو بعینہ وہی درجہ دیا جو آج ہم انگریزی کو دیتے ہیں، جس زبان میں آج بہت سے ہندو ویدانت اور بھگتی پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔

قومیت کے ساتھ زبان کے مسئلہ کو منسلک کرکے ہم عوام اور قدرتی طور پر ارتقا یافتہ دیسی زبانوں اور خود اپنے آپ اور اپنی تہذیب سے ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ دوسرے ملکوں کو دیکھئے، ادبی زبان درکنار لوگ بول چال کی زبانوں تک میں نظم و نثر لکھ رہے ہیں، اور ہمارے ایک ایک صوبہ کے برابر بلکہ اس سے بھی کم رقبہ کے ملک اپنی زبان اور اپنے ادب کو دنیا بھر کے لئے قابل رشک بنا رہے ہیں۔

ہمیں شمار و اعداد کا خبط ہو گیا ہے اس لئے ہم ہر وقت اپنی تعداد بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ ہماری زبان بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ عوام جو زبان کے اصلی مالک ہیں کیا چاہتے ہیں اور خود ہمیں اپنی ذہنی ترقی کے لئے اپنی مادری بولی (نہ کہ تحریری زبان) کے کس قدر قریب جانے کی ضرورت ہے۔ ہر ہندوستانی کے لئے اپنی مادری زبان، اپنے صوبہ کی تحریری زبان اور انگریزی زبان کا جاننا تو پہلے ہی سے ضروری تھا، اب ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایک چوتھی زبان کے اضافہ کرنے کی بھی سازشیں ہو رہی ہیں۔ اور تو اور ہندی کے حامی بھی بہاری۔ اودھی۔ پوربی۔ روہیلکھنڈی۔ راجستھانی۔ برج بھاشا وغیرہ کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو مٹانے کے درپے ہیں اور وہی یکرنگی اور مرکزیت اور وہی حکومت اور قدامت پرستی چاہتے ہیں جس کے مسلمان درپے ہیں۔ عوام کا کسی کو خیال نہیں اور نہ اُن سے کوئی مخاطب ہوتا ہے۔ اور نہ لسانیات کا مطالعہ کسی سائنٹیفک زاویۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔

(۳)

ٹیگور نے کہیں پر ہندو تہذیب کو سبزہ زاروں کی تہذیب کہا ہے (Civilization of the Forest) اس سے مراد یہ ہے کہ تنہائی میں متین فطرت کی گود میں بیٹھکر اس تہذیب کے اُصول وضع کئے گئے ہیں اِس مفہوم کو ہم اس طرح بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہندو تہذیب کی بُنیاد روحانیت، انفرادی ترقی اور دیہاتی زندگی پر رکھی گئی ہے۔ اِسی لئے ہندوؤں کی قدیم اور موجودہ زبانوں میں زیادہ تر الفاظ اور محاورات تشبیہیں اور استعارات، دیہاتی زندگی، روحانی ترقی اور سماجی سنگھٹن سے متعلق ہیں۔ اور صنعتی، حرفتی اور سائنٹیفک الفاظ کی بڑی کمی ہے۔ اس نظریہ کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ ہم ہندوستان بھر

کے لئے ایک ایسی مشترکہ زبان تیار کرنا چاہتے ہیں جو آسان اور عام فہم ہو، اور جس میں سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ کی بھی کثرت نہ ہو۔ ایسی زبان فقط دیہاتی زندگی سے متعلق باتوں اور چیزوں پر حاوی ہوسکتی ہے صنعتی و حرفتی اور سائنٹیفک معاملات کے لئے مغربی زبانوں کے الفاظ مستعار لینا ہونگے (اور اس وقت بھی لئے جا رہے ہیں) پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی زبان کے اختراع کی ضرورت ہی کیا ہے؟ مختلف صوبوں میں جو دیہاتی بول چال رائج ہے وہ عوام کی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ جن لوگوں کو وہاں کے عوام کے لئے کچھ لکھنا ہو وہ اسی زبان میں لکھیں اُن کا مقصد پورا ہو جائیگا۔

یہ بھی ایک لسانی اور تاریخی حقیقت ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کا ہر لفظ یا تو سنسکرت، پراکرت اور پالی کی اپ بھرنشی صورت ہے یا کسی دوسری قدیم ہندی یا غیر ہندی زبان کی، جسے یا تو باہر سے آنے والے یا یہاں سے جانے والے لوگ لائے۔ عقلی دلائل، سائنس کی اختراعات اور صنعتی اور حرفتی چیزوں اور کاموں کے لئے ہمیں یا تو پرانی سنسکرت کی امداد لینا پڑیگی یا موجودہ عربی فارسی یا مغربی زبانوں کے الفاظ کی۔ سنسکرت ہم سے سب سے زیادہ نزدیک ہے، اور مغربی زبانوں کے الفاظ کو بھی ترجیح دی جا سکتی ہے کیونکہ عوام انھیں نہ صرف روزانہ سنتے رہتے ہیں بلکہ ان کی بگڑی ہوئی صورتوں میں انھیں استعمال بھی کرتے ہیں، اور خواص یعنی انگریزی جاننے والے لوگ تو انھیں نہ صرف سُنتے اور پڑھتے ہی ہیں بلکہ اصلی صورتوں میں انھیں لکھتے بھی رہتے ہیں۔ اس لئے کسی ایسی نئی آسان زبان کی تلاش جو آپ کو دیہاتیوں، بیوپاریوں اور فوجیوں تک لے جائے فضول ہے۔ ایسی زبان ہر شخص جس کو ان لوگوں سے واسطہ رہتا ہے روزانہ وضع کر رہا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان دیہاتیوں کی بول چال کی صورت میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ ہر صوبہ کے دیہاتیوں کی زبان پر ضروری اجنبی الفاظ کا اضافہ کرنے سے بھی یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ مرہٹی۔ تلنگی۔ تامل۔ بنگلہ وغیرہ زبانوں کے ادیب بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ وہ ادیب جو بقول پنڈت جواہر لال نہرو قوم پرستی اور خدمتِ خلق کے جذبات کے ماتحت عوام کے لئے لکھتے ہیں۔ تحریری زبان اور خصوصاً نظم۔ افسانہ۔ ڈرامہ و ناٹک اور سیاسی مضامین کی زبان کو عوام کی زبان سے جس قدر دُور رکھا جائیگا اُسی قدر وہ بے اثر اور اصلی اَدبی خوبیوں سے محروم رہیگی۔ اہل قلم میں بھی ایک طرح کا مادۂ انانیت (Superiority Complex) پیدا ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے اہل قلم میں یہ جذبہ خاص طور پر کارفرما ہے، اس لئے وہ اپنے کو عوام سے اعلیٰ اور برتر سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنیاد اور اُس کی ترقی کی ذمہ داری اس تعلق پر ہے جو ہندوستانی ادیبوں کو شاہی درباروں اور اُمراء سے رہا ہے یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سو سال سے بھگتوں اور صوفی درویشوں سے قطع نظر ہندوستان میں کوئی ایسا

شاعر و نثر نگار پیدا نہیں ہوا جس نے صحیح معنوں میں عوام کی اور عوام کے ماحول کی اصلی ترجمانی کی ہو۔
اُردو غزل، اُردو قصیدہ۔ اُردو رباعی کو عوام کی زبان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ عوام کے رنج و خوشی کے اسباب، اُن کے روز کے واقعات و تجربات، اُن کے گندے یا صاف ماحول کے نقشے یا خود اُن لوگوں کے دماغوں میں ہیں یا خدا کی نگاہ میں ہمارا ادب ان سے کنارہ کش ہی نہیں بلکہ نفور رہا ہے
پس یہ کہنا کہ تحریری یا ادبی زبان بول چال کی زبان سے مختلف اور بعید ہوا کرتی ہے اور رہونی چاہئیے بڑی حد تک نادرست اور ناواجب ہے۔ دنیا کے بہترین ادیبوں نے زمانۂ قدیم اور حال میں بھی اپنی ادبی زبان کو عوام کی زبان کے نہایت قریب رکھا ہے یوں بھی دنیا کے مؤثر ترین شاہکار عوام کی زندگی سے متعلق جذبات و واقعات، خیالات و استعارات پر مشتمل ہیں
یو۔ پی کے ایک ہندو ادیب نے ہمت کر کے بالکل درست کہا ہے کہ اُردو محض کاغذی زبان ہے چند شہروں کے علاوہ کہیں نہیں بولی جاتی۔ نہ اس کا کوئی معین علاقہ ہے اور نہ اس کا کوئی خاص ماخذ اور نہ یہ عوام کی بول چال ہے۔ اگر کہیں یہ عام طور پر بول چال کی زبان ہوتی تو اس کا کوئی گھر گھاٹ ہوتا۔ اور اس میں کچھ نہ کچھ عوام کا ادبی ذخیرۂ بھی ہوتا۔
ہندی ایک جامع اصطلاح (Generic Term) ہے، اور اُس کے ذیل میں آنے والی دیسی بول چال کی زبانیں نصف درجن سے زیادہ ہیں جو میں گنا چکا ہوں۔ اُن سب بولیوں میں عوام کا ادب موجود ہے اور اُن بولیوں کے ٹھکانے ہیں۔ اُن کے لسانیاتی جوہر اور صوتیاتی خصوصیات ہیں جو خواہ وہ رو بہ ترقی ہوں یا رو بہ تنزل مگر نہ ضرور ہیں۔ جس قسم کی اردو اکثر مسلمان ادیب اور اُن کے پیرو لکھتے ہیں وہ خواص میں بھی استعمال نہیں ہوتی۔ فصیح سے فصیح زبان کا مالک مسلمان بھی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ میں ملتے چلتے وقت بھی بول چال میں اضافت کا، فارسی طرز کی جمع اور تراکیب کا استعمال نہیں کرتا ایک آدھ ترکیب کہیں آ جائے تو اور بات ہے۔
صرف و نحو کے قواعد جن سے ہندی "ہندی" رہ سکتی ہے بحث میں آ چکے۔ اب الفاظ کے ذخیرہ کے مسئلہ پر غور کیجئے۔ ہر تہذیب و تمدن سے کچھ الفاظ مخصوص ہوتے ہیں جن کے بغیر چارہ نہیں ہے اور نہ اُن کا ترک کرنا مناسب ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ہندی میں سنسکرت کے اصلی یا بگڑی ہوئی صورت کے الفاظ کی خاصی تعداد رہے گی۔ اسی طرح اُردو میں عربی فارسی الفاظ ضرور ہونگے۔ اب رہا اُن کے خزانوں کی توسیع کا سوال تو مغربی تہذیب کا اثر ہم پر صاف ظاہر ہی ہے۔ اُسی اثر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ خاص و عام دونوں بول چال میں بیشمار انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ پھر

جب بول چال میں انگریزی اور دوسری یورپین زبانوں کے انڈسٹریل اور سائنٹیفک الفاظ اس بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں تو لکھتے وقت قلم ہاتھ میں لیتے ہی کیوں ان سے پلّہ چھڑانے کی کوشش کی جاتی ہے نظم کو تو اس قدر پاک اور پوتر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں صنعتی و حرفتی، سائینسی وغیرہ الفاظ اور اشیاء کے نام تک نہیں لائے جاتے اور فرسودہ مضامین پر جو عربی فارسی ادب سے واقفیت میں ملے ہیں بار بار بے معنی طبع آزمائی کی جاتی ہے، اور چبائے ہوئے نوالے پھر چبائے جاتے ہیں۔ نثر میں بھی انھیں الگ رکھکر عربی فارسی اور سنسکرت سے تراشے ہوئے الفاظ کھپائے جاتے ہیں۔ اکبر کے علاوہ دوسرا کون اُردو یا ہندی شاعر ہے جس نے اپنی نظموں میں قابل ذکر تعداد میں انگریزی الفاظ استعمال کئے ہوں؛ اسی طرح نثر نگار بھی روز کی بول چال کے (انگریزی) الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے جھجکتے ہیں، آخر اس تہذیب پرستی مذہب نوازی اور قدامت پروری کی بھی کوئی حد ہونا چاہیئے۔ حالانکہ جس تہذیب پر ہم اس قدر ناز کرتے ہیں وہ خود ہم میں آج بہت کم نظر آتی ہے۔ بہر حال موجودہ زمانہ کی ضروریات کا لحاظ ضروری ہے۔ یوں بھی ہم دوسروں کی ہر بات سے اثر پذیر ہو رہے ہیں، اور اکثر باتوں میں اُن کی تقلید کر رہے ہیں۔ مگر جب دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان میں داخل کرکے اپنے ادب کو وسیع کرنے کا موقعہ آتا ہے تو منہ پر قفل خاموشی لگا لیتے ہیں۔

ضروری الفاظ مستعار لینے میں ہمارے بزرگوں کو کبھی لیس و پیش نہیں ہوا، بلکہ اُنھوں نے خالص مذہبی تحریروں میں بھی غیر زبانوں کے الفاظ کو کافی تعداد میں داخل کیا۔ چنانچہ گورونانک دیو اور گوروگوبند سنگھ کے کلام میں ہزاروں فارسی عربی کے الفاظ موجود ہیں۔ ہاں دو باتیں ضروری تھیں اور یہ ہونا بھی چاہیئے، اوّل ان الفاظ کو ہندوستانی صورت میں لیا گیا، دوسرے انھیں اپنی ہندی صرف و نحو کے تحت میں لایا گیا۔ اُن کے معنوں میں تبدیلی اور وسعت پیدا کی گئی اور اُن کو جس طرز پر اہل ہند بولتے تھے ویسا ہی لکھا گیا۔ یعنی اُن کی صوتی ہجا (Phonetical spelling) اختیار کی گئی۔

ابھی تک صرف "ہندوی" زبان کی گرامر اور الفاظ سے بحث کی گئی ہے لیکن اب محاورات اور وضع اصطلاحات کو لیجئے۔ مسلمانوں نے ہماری زبان کو لیا۔ ایک حد تک ہماری گرامر کو لیا، اپنے لسانی خصوصیات کو جن کی بنیاد نسلی اور گروہی خصوصیات پر ہوتی ہے عمل میں لاکر اکثر الفاظ میں صوتی تبدیلیاں کیں اور بہت سے الفاظ کے معنوں میں تغیر کئے، بہت سے محاورے بدلے اور نئے محاوروں کی ایک بہت بڑی تعداد فارسی محاوروں کے لفظی ترجمہ سے وضع کی۔ تجنیس کی بنیاد الفاظ کے ہم معنی فارسی عربی لفظوں پر رکھی۔ پہلے تو ترک اور افغان لہجہ آیا بعدہٗ مغل لہجہ۔ ان تمام تغیرات کا تختۂ مشق پہلے ملتانی اور ہوریانی بانہی

پھر دہلی اور اُس کے نواح کی زبان اور دکنی پھر صوبہ آگرہ کی زبان اور آخر میں صوبہ اودھ کی دیسی زبان۔
کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ دیس کے رہنے والے اپنے دیسی محاورات، لب ولہجہ لسانی اور صوتیاتی خصوصیات اور ترکہ کو ترک کردیں اور ترک اور افغان اور مغل کے لسانی اور صوتی قالب میں ڈھلی ہوئی دیسی زبان کو استعمال کریں، اور روزمرہ محاوروں اور اصطلاحوں میں صرف اُن درباری شعراء اُمراء اور بادشاہوں کی تقلید کریں اور انھیں سے سندلیں جو اپنی چار دیواریوں میں بند عام لوگوں سے دُور رہتے تھے۔
کانگریس والے زبردستی صوبہ آگرہ و اودھ کی اس مسلمانی تحریری زبان کو کُل ہندوستان کے ہندوؤں کے حلق سے اُتارنا چاہتے ہیں، مگر ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ صدیوں کے تاریخی لسانی اور معنوی ارتقا اور ہندوستان کی دیسی زبانوں کی گذشتہ ترقی کو قطعاً نظرانداز کرکے ایسی ضرر رساں اور بیجا تحریک کو تقویت دینا نہ صرف اپنے وقار کو کھونا ہے بلکہ ہندوؤں کے ادبی ذوق کے گلے پر کند چھری پھیرنا اور اُن کے ذہنی قویٰ کو معطّل کرنا ہے۔
گذشتہ دو تین سو سال سے ہندو مسلمان ایک ہی جگہ پڑوسی کی حیثیت میں رہتے چلے آئے ہیں درحقیقت ہندوستانی یا اُردو کا تعلق صرف صوبہ آگرہ و اودھ سے ہے۔ اب اس کے ساتھ بہار اور راجپوتانہ اور دہلی کو بھی شامل کر لیجئے۔ یہاں کے ہندو مسلمان دیہات میں یہی زبان بولتے ہیں، لیکن اگر مسلمان اور کانگریسیوں کا کہنا صحیح ہے کہ چند مخصوص الفاظ کے علاوہ ہندی اُردو میں کوئی فرق نہیں تو مسلمانوں کی اُردو کیوں درست ہے اور ہندوؤں کی کیوں نادرست؟ شمالی ہند کی دیسی زبانیں پالی اور پراکرت اور اپ بھرنش کے راستے سے براہ راست سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ ان کے لئے سنسکرت کے الفاظ ماں کا دودھ ہیں۔ اس کے برعکس عربی فارسی کے الفاظ ہندو مسلمان دونوں کے لئے اجنبی ہیں، خصوصاً وہ الفاظ جس رنگ، جن اصوات اور جن خصوصیات کے ساتھ جن ترکیبوں میں لائے جاتے ہیں اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف اجنبی ہی معلوم ہوتے ہیں بلکہ صریحاً ناقابل قبول ہو جاتے ہیں۔ ہندی تحریروں میں بیحد وسعت دی جارہی ہے مگر ادبی تراش خراش اور وضع کاری کے نتائج کو اُردو میں جو دیسی زبان بحروف فارسی ہے قبول نہیں کیا جاتا، اور مختلف صوبوں کے مخصوص مقامی محاورات واصوات و لسانی خصوصیات کو بھی تحریر میں (وہ تحریر اُردو ہو خواہ ہندی) کوئی جگہ نہیں دی جاتی اس پر ستم یہ کہ ہمیں صدیوں کی ارتقا یافتہ لسانی اور محاوراتی اختلافات کو قطعاً نظرانداز کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ مجوزہ ہندوستانی یا اُردو کل شمالی ہند کی زبان ہے تو ان تمام علاقوں کے رہنے والے عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، جونپوری ہوں یا بیکانیری، کیوں نہیں

اہلِ زبان تسلیم کئے جاتے؟

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان برادرانِ وطن الگ رہنا چاہتے ہیں اور اُس وقت تک چاہتے رہیں گے جب تک اُن کو اس زمین سے پوری محبت نہ ہوگی۔ وہ زبان کے اثر کو جو تہذیب و تمدن پر پڑتا ہے خوب سمجھتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو دوسرے اسباب اور تحریکوں کے علاوہ ایک زبان کی تحریک اور ترویج سے ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے متحد اور منظم رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے وہ بضد ہیں کہ اُن کی علیحدہ زبان زندہ اور شگفتہ رہے۔ کانگریسی ہندو شہری مسلمانوں کی زبان کو تمام ہندوستان میں جبریہ جاری کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کی کیا ضرورت ہے؛ اِن علاقوں اور صوبوں کے دیہات میں تو عموماً سب ہندو مسلمان ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ دوسرے صوبوں میں ہندو مسلمان دونوں اپنے صوبوں کی خاص زبانیں استعمال کرتے ہیں۔ شہری ہندو مسلمانوں کو اگر ایک زبان بولنا ہوگی تو وہ انگریزی سے کام لیں گے۔ مگر گاندھی جی انگریزی نہیں چاہتے اور مسلمان برادرانِ وطن اُردو کو نہیں چھوڑتے۔ رہے ہندو اور اُن کی مختلف صوبائی زبانیں، سو گاندھی جی ان میں سے ایک خطّے کی تحریری زبان کو لینا چاہتے ہیں جو دراصل وہاں کی زبان سے نکلی ہے اور اُسے تمام دوسرے صوبوں میں ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ سیاسی نقطۂ خیال سے یہ درست ہو تو ہو مگر تمام ہندوستانی اس زبان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی گرامر، الفاظ، صوتی خصوصیات اور محاورے شمالی ہند کی دیسی زبانوں سے بہت دُور جا پڑے ہیں؛ سارا جھگڑا اسی بات کا ہے۔ اس کا ایک پہلو عام مسلمانوں کے ذہنی اور ادبی ترقی کے لئے نقصان دہ ہے۔ کیونکہ دیہاتوں میں مسلمان ایسی مقامی بولیاں (Dialects) بولتے ہیں جو اس تحریری زبان سے بعید مختلف ہیں، اُن کے لئے یہ نئی زبان ہے جس کا سیکھنا اُس کی تمام خصوصیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے انگریزی سیکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

مختلف صوبوں کے نسلی جغرافیائی اور دوسرے اختلافات جن کی وجہ سے ہر صوبہ کی زبان علیحدہ ہے آج بھی زندہ اور عمل پیرا ہیں اور صدیوں تک رہیں گے۔ اُن کی موجودگی میں ہر جگہ عام بول چال کی زبان کی مختلف صورت ہوگی، اور اس میں ایسے مقامی رنگ پیدا ہوتے رہیں گے جو ایک دوسرے سے مشابہت یا مماثلت نہ رکھیں گے۔ ہاں اس زبان کی تحریری صورت منضبط ہو جائے تو وہ کچھ عرصہ تک ضرور یکساں رہ سکتی ہے۔ مگر یہ یکسانیت بھی ایک موہوم چیز ہے، کیونکہ مذہبی، جغرافیائی اور نسلی امتیازات تا ابد مٹنے والے نہیں معلوم ہوتے۔ کسی ایک صوبہ کی بول چال یا تحریری کی زبان کو یکساں بننے کی اجازت نہ دیں گے۔ شروع کے تھوڑے بہت اختلافات مرورِ زمانہ سے مضبوط اور وسیع صورتیں اختیار کر لیں گے۔

غرض قدرتی حالات اور اصولوں کے خلاف جو کوشش کی جائیگی وہ کبھی انجام بخیر نہ ہوگی، اور نہ اس کا نتیجہ دیرپا ہوگا۔ میری رائے میں تو انگریزی زبان سے چھٹکارا آسان نہیں، کیونکہ یہ ساری دنیا پر محیط ہے کم از کم آئندہ سو سال تک تو ہم کو انگریزی (خواہ وہ چوتھی یا پانچویں زبان ہی کی حیثیت سے کیوں نہ ہو) ضرور سیکھنا ہوگی، پھر کم سے کم اس عرصے تک اپنی مادری زبان میں تخلیقی کام سے کیوں دست بردار ہوں۔

بسنت رُت

(ملک الشعرا کالی داس کی سنسکرت نظم کے ایک بند کا ترجمہ)

پھر بسنت آیا ہے معشوق پری رو بنکر — گلرخوں کی نگہِ ناز کا جادو بنکر
بزمِ ہستی پہ جمانے کے لئے رنگ آیا — دلِ عشاق کے کرنے کو یہ چورنگ آیا
یہ وہ موسم ہے کہ دلکش ہیں مناظر اس کے — حیرت افزا ہیں قیامت کے مظاہر اُسکے
بھینی بھینی اسی موسم میں ہوا چلتی ہے — گُل کھلاتی ہوئی ہر سمت صبا چلتی ہے
پھول کھلتے ہیں جو ٹیسو کے بیابانوں میں — جان پڑ جاتی ہے عشّاق کے ارمانوں میں
اِسی موسم میں کنول کھِل کے دکھاتے ہیں بہار — جھومتے ہیں اِسی موسم میں لبِ جو اشجار
آتے ہیں روپ پہ آموں کے اِسی رُت میں شجر — کوئل آتی ہے اسی رُت میں درختوں پہ نظر
چھیڑتی ہے لبِ جو آکے ترانہ اپنا — سارے عالم کو سناتی ہے فسانہ اپنا
یہ وہ موسم ہے ٹپکتی ہے مسرت جس سے — یہ وہ رُت ہے دلِ مضطر کو ہے راحت جس سے
شام اس رُت کی ہے یا سایۂ گیسوے دراز — دلفریبی کا ہے ایک ایک ادا میں انداز
جلوۂ صبح ہے، یا شاہدِ رعنا کوئی — محوِ گلگشت ہے یا دلبرِ زیبا کوئی
فرحت افزا ہے عجب چاندنی کرنوں کی بہار — نشۂ حسن میں ہر ماہ لقا ہے سرشار
نازنینوں کو جو ہے مدِ نظر وضع کا پاس — زعفرانی ہے دوپٹہ، تو بسنتی ہے لباس
ساریاں رنگ میں ڈوبی ہوئیں کیسر سب کی — چوٹیاں پھولوں کے ہاروں سے معطر سب کی

مشک و صندل سے معطر تنِ زیبا سارا
غیرتِ شاخِ گلِ تر، قدِ رعنا سارا

لختِ جگر

(از حضرت جگر مراد آبادی)

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

اگر حل ہو گئی مشکل تو آسانی نہیں جاتی
بہرصورت مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں ناآشنا بنا تو آ جائے
خزاں میں بھی چمن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں رہتے ہیں لیکن
خوشا حسنے کہ طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے شور و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گُل سے پریشانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو آئینہ کی حیرانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

بلندی چاہیئے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر اُن کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

"جہاں میں ہوں"

(از پنڈت آنند نرائن مُلّاؔ، ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔)

وہی حرص و ہوس کا تنگ زنداں ہے جہاں میں ہوں
وہی انساں وہی دنیائے انساں ہے جہاں میں ہوں

تمنا قید، ہمت پابجولاں ہے جہاں میں ہوں
مجھے جکڑے ہوئے زنجیرِ امکاں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بیکس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن تپتے تپتے یہ بھی شاید سُرخ ہو جائے
ابھی پانی کا ایسا خونِ دہقاں ہے جہاں میں ہوں

افق پر ہوں تو ہوں دُھندلے سے کچھ جلوے مسرت کے
ابھی راحت فقط اک شوخیِ ارماں ہے جہاں میں ہوں

کبھی شاید فرشتہ آدمِ خاکی بھی بن جائے
ابھی تو بھیس میں انساں کے شیطاں ہے جہاں میں ہوں

غرضمندی کی پُوجا عام ہے یوں ہر شوالے میں
محبت اپنی فطرت پر پشیماں ہے جہاں میں ہوں

وہی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

کسی دن کوئی چنگاری نہ دُنیا کو جلا ڈالے
جہاں خود اپنے شعلوں سے ہراساں ہے جہاں میں ہوں

غلاموں کی ہنسی ہی کیا بس اک آوازِ بے نغمہ
بہارِ باغ ہم رنگِ بیاباں ہے جہاں میں ہوں

نظر میں ہیں تصور کے وہی موہوم نظارے
ابھی انساں حقیقت سے گریزاں ہے جہاں میں ہوں

فقط ہلکی سی سطحِ آب پر ہے ایک جنبش سی
زبانوں پر فقط اک ذکرِ طوفاں ہے جہاں میں ہوں

خُدا وہ دن تو لائے سوز بھی اک ساز بن جائے
ابھی ہر ساز میں اک سوزِ پنہاں ہے جہاں میں ہوں

مجھے بھی شوقِ آزادی ہے لیکن کیا کروں اس کو
مرے چاروں طرف زنداں ہی زنداں ہے جہاں میں ہوں

بدلنے کو بدل جائے جہاں لیکن ابھی مُلّاؔ
وہی دنیائے برق و باد و باراں ہے جہاں میں ہوں

دیوان غالب اردو کے قلمی نسخے

از پروفیسر مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل ہندو یونیورسٹی

رقعات وحالات غالب کے سلسلے میں جو چیزیں میری نظر سے گذری ہیں۔ انمیں سے مرزا غالب کے اُردو دیوان کے چار قلمی نسخے بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات میں ہیں، مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور مختلف حضرات کے تصرف میں ہیں۔ ممکن ہے کہ ان نسخوں سے بعض شیدائیاں کلام غالب کچھ فائدہ اُٹھاسکیں۔ لہذا اُن کے بارے میں کچھ باتیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔

۱۔ رام پور

یہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء یا ۱۸۵۵ء) میں لکھا گیا ہے بہت ہی عمدہ لکھا ہوا ہے۔ ریاست کے سرکاری کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا ذکر مکاتیب غالب میں شرح وبسط کے ساتھ ہے۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں جب مرزا رامپور گئے تھے تو اسی نسخے کی نقل لی اور اُسے نواب ضیاء الدین خان بہادر کے پاس بھیجا اور بعدۂ اسی کو منشی شیو نراین صاحب متوطن آگرہ کو دیدیا۔ چنانچہ آیندہ سطور میں اُس کے بارے میں زیادہ لکھا جائے گا۔

۲۔ رام پور

یہ نسخہ بھی ریاست کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ وہیں تیار کرایا گیا تھا، اس کی ترتیب غالباً مروجہ نسخوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ بھی عمدہ لکھا ہوا ہے، میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا کہ بہ نظر عمیق اس کو دیکھتا۔ تاہم میرے لئے ضروری تھا کہ اسمیں چند امور کو دیکھتا۔ چنانچہ میں نے دیکھا اور مناسب نتیجہ پر پہونچا۔ کلام غالب کے قدر دانوں کو اس کو بھی غور وخوض سے دیکھنا چاہئے۔

۳۔ مقبوضہ پنڈت گوپی ناتھ کنزرو

یہ نسخہ، رام پور کے نسخہ ۱ (محررہ ۱۲۷۱ھ) سے منقول ہے۔ یہی منشی شیو نراین صاحب کے پاس آگرہ جون ۱۸۶۰ء میں بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا۔ اور اب پنڈت گوپی ناتھ کنزرو صاحب کے پاس الہ آباد میں ہے۔ اِس کے ساتھ ایک اصل خط کا جزو بھی ہے۔ جسے مرزا نے دیوان کے ساتھ

منشی شیو نرائن صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ چونکہ یہ خط کہیں شائع نہیں ہوا اور اس کا جو حصہ محفوظ ہے، وہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے لہٰذا اس جز کی عبارت ذیل میں دی جاتی ہے:۔

"صاحب، میں تمھارا گنہگار ہوں۔ تمھاری کتاب میں نے دبا ...... بڑی کوشش و محنت سے اس کو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوالیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون[1] کو پارسل کی ڈاک میں روانا[2] کیا ہے۔ لو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔ یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو۔ میں نہیں کہتا نہ چھاپو۔ جو تمھاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھ کو لکھ لو اور چھاپا میان زرا[2] تصحیح کا خیال رکھیو ۱۲"[3]

یہ نسخہ بھی عمدہ لکھا گیا ہے۔ مرزا چاہتے تھے کہ یہ نسخہ آیندہ اشاعت کا موجب ہو۔ لہٰذا صحت کا خاص اہتمام کیا ہے اور مرزا نے اس کو اتم و اکمل بتلایا ہے[4]۔ اسی نسخہ کا ذکر مرزا کے کئی خطوط میں ہے۔ جو اُردوے معلیٰ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہاں اب میں اپنے کرم فرما جناب پنڈت صاحب کا بہت شکر گذار ہوں جنکی عنایت سے میں دیوان کو کئی مرتبہ بخوبی دیکھ سکا۔ اُنھوں نے خط کی نقل لینے کی بھی بخوشی اجازت دی۔ اب رہا یہ کہ دیوان و خط کیونکر اُنھیں میسر آئے۔ ان امور پر پھر کبھی روشنی ڈالی جائے گی۔

۴۔ مقبوضہ جناب سید احمد میرزا صاحب

یہ بھی ایسا نسخہ ہے جس کے بابت میں مرزا کو کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ یہ دسمبر ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہے اس کے کاتب جناب سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف حسین میرزا صاحب، مرزا غالب کے گہرے دوست تھے۔ یہ نسخہ اب جناب سید احمد میرزا صاحب کے پاس ہے جو کاتب موصوف کے پوتے ہیں۔ جن کا اصلی مکان چھتہ چوہیا محلہ فراش خانہ دہلی میں ہے۔ لیکن میں نے جناب سید صاحب اور اُن کے اعزہ کی مہربانی سے اس نسخہ کو مارچ ۱۹۳۴ء میں ٹیلیگراف اسکوائر نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں کہ جناب سید صاحب اُس وقت مقیم تھے۔

اسی نسخہ کو جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرۂ مولانا محمد حسین آزاد صاحب نے شائع کیا ہے۔ اس

---

[1] مراد جون ۱۸۶۰ء۔ مضمون نگار

[2] "روانا" اور "زرا" جیسا مرزا نے لکھا ہے۔ ویسا ہی یہاں لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار

[3] خط بنام منشی شیو نرائن صاحب محررہ ۳ر جولائی ۱۸۶۰ء (اُردوے معلیٰ میں)۔ مضمون نگار

[4] اس کے آخیر میں مرزا کی تحریر و مہر ہے۔ مضمون نگار

نسخہ کے زائد اوراق میں مرزا کے کہے ہوئے مرثیے کے وہ تمام بند بھی درج ہیں۔ جس کا محض پہلا بند مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں درج کیا ہے۔

ہاں یہ بھی واضح رہے کہ رام پور میں جو نسخہ نقل ہوا تھا وہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے گیا۔ پس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اُس کی مدد سے تیار نہیں ہوا ہے اور نہ یہ اُس کی نقل ہے۔ بلکہ جناب سید صاحب کی جداگانہ کوشش کا ثمرہ معلوم ہوتا ہے۔

اِن کے علاوہ ڈیڑھ دو نسخوں کا پتہ بعض حضرات کی تحریروں سے اور چلا ہے۔ لیکن میں نے یہاں محض اُنھیں نسخوں کا ذکر کیا ہے جن کو مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قلمی نسخوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو بعض نظموں کے وقت تصنیف معین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور بعض لفظوں یا مصرعوں کے باب میں مناسب رائے قائم کیجا سکتی ہے۔

پینتیس سال پہلے

زمانہ فروری ۱۹۰۵ء میں حضرت شرر سہارنپوری مرحوم کی "خاک" پر ایک دلاویز نظم شائع ہوئی تھی۔ جس کا پہلا بند یہ ہے:۔

تجھ پہ سو جان و دل فدا اے خاک — کہ چمکتا ہے تجھ میں جلوۂ پاک
ہاں! ظہور وجود ہے تجھ سے — اس جہاں کی نمود ہے تجھ سے
تجکو مرتبہ ملا ہے پستی کا — ہے تجھی پر مدار ہستی کا
سامنے ہے یہ جتنی موجودات — اصل اس کی ہے ایک تیری ذات
نظر آتے ہیں مختلف اجسام — ایک تو ہے ہزار تیرے نام
تجھ سے بننا ہے ہست ہوجانا — تجھ میں ملنا ہے نیست کہلانا
خاکساری ہے تیری طینت میں — انکسار اور عجز خلقت میں
آسمان دیکھنے میں ہے بالا — مرتبہ تیرا عرش سے اعلیٰ
تو ہے الحق مفخر عالم — آسمان جھک کے لے رہا ہے قدم

تیرے وصفوں کا وہ کرے اظہار
ذرہ ذرہ کیا ہو جس نے شمار

"بے ثباتیِ زمانہ"

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ، بی۔اے، ایل ایل۔بی)

کل تھی گلشن میں بہار آج خزاں ہے ساقی! طبعِ نازک پہ یہ نیرنگ گراں ہے ساقی!
موسمِ گُل میں بھی ہر زمزمہ پیرائے بہار غمِ فردا سے نوا سنجِ فغاں ہے ساقی!
زلفِ سُنبل ہے پریشاں تو قبائے گل چاک غمکدہ ہے کہ چمن زارِ جہاں ہے ساقی!
گلشنِ دہر کا ہر منظرِ دلکش مجھکو وجہِ افزایشِ غمہائے نہاں ہے ساقی!
کس لئے سُرخ ہے لیلائے شفق کا دامن ق کِس کے ماتم میں یہ خوننابہ فشاں ہے ساقی؟
اُن عزیزوں کو کہاں پائیگی، جن کے غم میں جوئے خوں دیدۂ گریاں سے رواں ہے ساقی!
کوئی ہنستا ہے زمانہ میں تو رونے کے لئے ہر خوشی مقدمۂ رنجِ نہاں ہے ساقی!
خندۂ برق کی مانند زوال آمادہ زینتِ حسنِ حسینانِ جہاں ہے ساقی!
اب وہ ایوانِ فریدوں ہے نہ طاقِ کسریٰ داستانوں میں فقط اُن کا بیاں ہے ساقی!
جس میں دیکھا تھا نگاہوں نے تماشائے جہاں آہ وہ ساغرِ جمشید کہاں ہے ساقی!
وارثِ قیصر و فغفور سے کہہ دے کہ عبث خواہشِ نام و تمنائے نشاں ہے ساقی!
دستِ بیدادِ اجل سے کوئی محفوظ نہیں زیست کہتے ہیں جسے، وہم و گماں ہے ساقی!
ہائے انجام یہ ہستی کے پرستاروں کا گوشۂ قبر ہے اور خواب گراں ہے ساقی!

مرنے جینے کی حقیقت نہ کھُلی انساں پر موت، ہستی کی طرح رازِ نہاں ہے ساقی!
روح فرسا ہے سکوں بخشیِ داروئے اجل زندگی کی بھی تڑپ کاہشِ جاں ہے ساقی!

حسرت آبادِ جہاں میں تیری بزمِ عشرت لوگ کہتے ہیں کہ ماوائے اماں ہے ساقی!
کعبہ و دَیر سے بڑھکر ہے ترا میخانہ کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں ہے ساقی!

لطفِ مے نوشی و مدہوشی و شاہد بازی — سبزہ زاروں میں لبِ آب رواں ہے ساقی!
زندگی اصل میں اُس مردِ خوش اوقات کی ہے — جس کے دل میں طلبِ رطلِ گراں ہے ساقی!

خوشتر از فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن (حافظ)

جذباتِ فراق

نتیجۂ فکر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے

خود کو کھویا بھی کہاں عشق کو پایا بھی کہاں — ختم ہو دیکھیے تیرا سر و سودا بھی کہاں
رنج و راحت سے بہت دور ہے اب حالتِ عشق — آج پہونچی ہے تری رنجش بیجا بھی کہاں
جورِ پیہم سے ترے چھوٹ رہے ہیں۔ لیکن — آج ہم اہلِ وفا پائیں گے ایسا بھی کہاں
نام بدنام ہوا مفت میں بدنامی کا — ہو سکا کوئی ترے عشق میں رسوا بھی کہاں
اہلِ دل جس کو تری برقِ نظر کہتے ہیں — ہاں وہ اندازِ فنا عشق کو آیا بھی کہاں
ضبط کی تاب نہ تھی پھیرتے ہی دستِ نگاہ — آج پیمانۂ دل ہاتھ سے چھوٹا بھی کہاں
مشکلیں عشق کی پا کر بھی تجھے کیا مٹتیں — اتنا آسان ترے ہجر کا غم تھا بھی کہاں
اس کا اندازِ تغافل وہ نہیں اب۔ لیکن — عشق کی آنکھوں سے اُٹھتا ہے یہ پردا بھی کہاں
ایک ہی کام ہوا یعنی ترا نظارہ — نگہِ شوق نے لیکن تجھے دیکھا بھی کہاں
یہ بھی سچ ہے کہ تغافل ترا ایسا بھی نہیں — یہ بھی سچ ہے کہ محبت کا زمانا بھی کہاں
آج ساقی کی نظر اک نئی دنیا سے لڑی — میکشو ساغرِ سرشار یہ چھلکا بھی کہاں
میں یہ کہتا ہوں کہ افلاک سے آگے ہوں بہت — عشق کہتا ہے ابھی دردِ دل اٹھا بھی کہاں
تذکرہ اس نگہِ مست کا دل والوں میں — دوستو چھیڑ دیا تم نے یہ قصا بھی کہاں
چھوٹ پڑتی ہے سرِ راہ عدم کوسوں تک — آج چمکا ہے ترا حُسنِ خود آرا بھی کہاں
اہلِ دل حُسن پر الزامِ ستم کیا دھرتے — اُس کا پیمانِ وفا یاد انھیں آتا بھی کہاں
کاوشیں زندگی و موت کی سچ ہے نہ گئیں — درد وہ تیری نگاہوں نے اُٹھایا بھی کہاں
جیسے کچھ چونک پڑیں سوئی ہوئی تقدیریں — آج ہوتا ہے اِن آنکھوں کا اشارا بھی کہاں
فیصلہ عشق کی تقدیر کا ہونا معلوم — آپ نے کچھ مگر اس باب میں سوچا بھی کہاں
ہم نے مانا کہ غمِ ہجر بھی دھوکا ہے فراق — اور اگر غور کریں دل میں تو دھوکا بھی کہاں

گاندھی کے خیالات

(مرتبہ ابوالفاضل حضرت راز چاندپوری)

گاندھی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اُن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور وہ موجودہ زمانہ کے بہترین مفکر و سیاست داں خیال کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کے بعض خیالات سے نیک نیتی کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے، تاہم اُن کے اکثر خیالات اخلاقی حیثیت سے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لئے یکساں مفید و کارآمد ہیں۔ خصوصاً اُن حضرات کے لئے اِن کا مطالعہ بہت مفید ہوگا جو راہِ حقیقت میں گامزن ہونا اور ملک و قوم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اِسی خیال سے گاندھی جی کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں:-

تعلیم و تربیت

تعلیم کی بنیاد تعمیر سیرت ہے اور طالب علم کے لئے بہترین درسی کتاب اُس کا معلّم ہے۔ بچے کانوں سے سُنکر جتنا سیکھ لیتے ہیں، کتابیں پڑھکر نہیں سیکھ سکتے۔

معلّم کو بچوں کے سامنے اور اُن کے پیچھے ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اُس سے کوئی نامناسب فعل سرزد نہ ہو۔

بُزدل معلّم اپنے شاگرد کو بہادر نہیں بنا سکتا۔

جو ہندوستانی والدین اپنے بچوں کو بچپن سے انگریزی بولنا اور انگریزی میں سوچنا سکھاتے ہیں، وہ اپنے بچّوں اور ملک دونوں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ اُن کو قوم کے روحانی و مجلسی ورثہ سے محروم کر دیتے ہیں۔

فرض و خدمت

آدمی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنا کام انجام دینا چاہیئے، خواہ اس میں اُسے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔

اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مرجانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اُس کو کبھی ادھورا نہ چھوڑنا چاہیئے، سوائے اس صورت کے کہ اُس میں

کوئی اخلاقی خرابی نظر آئے۔

خدمت اُسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے جبکہ آدمی کو اُس میں کچھ لُطف آئے۔ وہ خدمت جس میں آدمی کو خوشی نہ ہو، نہ خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے، لیکن دلی مسرت کے ساتھ جو خدمت کی جائے اُس کے سامنے دنیا کی تمام دولت وراحت ہیچ ہے۔

خدمت کوئی ایسا درخت نہیں ہے کہ ہر زمین پر نشوونما پا سکے۔ اس کے لئے پہلی شرط خلوص نیت اور دوسری تجربہ ہے۔

حکمت وسیاست

کسی شخص کے ظاہری افعال سے اُس کی نیّت پر حکم لگانا گویا ناکافی شہادت پر فیصلہ کرنا ہے۔

دولت، قوت اور عزت کی خاطر آدمی کو کیسی کیسی ذلتوں اور گناہوں کا بار اُٹھانا پڑتا ہے۔

جو باتیں ہو چکیں، اُن کی بھلائی یا بُرائی کا فیصلہ کرنا فضول ہے۔ جو فائدہ ہے وہ اس بات میں ہے کہ آدمی اُن کو سمجھے اور اگر ممکن ہو تو آئندہ کے لئے سبق حاصل کرے۔

اگر کسی کو خدا کے بے حساب عفو وکرم کی شان دیکھنا ہو تو اُن مقدس مقامات کو دیکھے جہاں جوگیوں کا داتا لوگوں کو اپنے نام پر کیسی ریاکاری و بیدینی کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور درگذر کرتا ہے۔

اس دنیا میں اطمینان کی توقع رکھنا سخت غلطی ہے۔ یہاں صرف ذاتِ حق کے علاوہ کسی کا ٹھکانا نہیں۔ یہ تمام کھیل جو دنیا کے پردے پر نظر آتے ہیں چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ یہاں کسی کو ثبات نہیں ہاں اس پردے کے اندر ایک بلند و برتر ذات ہے اور وہ سراپا حقیقت ہے۔ خوشحال اُس کا جو اس حقیقت کی جھلک دیکھ لے!

مجھے زندگی بھر حق پرستی نے یہی سبق سکھایا ہے کہ صلح کی خاطر کسی قدر دب جانا بہت اچھی بات ہے

جس شخص کو نئے تجربے کرنے ہوں، وہ اپنی ذات سے ابتدا کرے۔ اس سے تلاشِ حق میں آسانی ہو جاتی ہے۔ جو شخص خلوص نیت سے تجربہ کرتا ہے اُس کو خدا ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔

عوام شور وشر اور ہنگامہ کو پسند کرتے ہیں اور خاموش تعمیری کاموں سے گھبراتے ہیں۔

جب تک آدمی اپنی غلطیوں کو بڑھا کر اور دوسروں کی غلطیوں کو گھٹا کر نہ دیکھے، اُس کو دونوں میں صحیح تناسب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

سچا حسن پاک باطنی و پاک دامنی میں ہے۔

شاعر وہ ہے جو انسان کے دل میں خوابیدہ نیکیوں کو بیدار کردے۔ شاعر کے کلام کا اثر سب

پر یکساں نہیں ہوتا، کیونکہ جوہر قابل کسی شخص میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتا ہے۔

ایسا کونسا حجاب ہے جو محبت سے دُور نہیں ہو سکتا ہے۔

قومی خدمت کرنے والے کو کوئی ایسی بات نہ کہنا چاہیئے جس کی اُس نے اچھی طرح تحقیق نہ کرلی ہو۔ خصوصًا سچائی کے اُستاد کو تو اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

کسی شخص کو ایسی بات کا یقین دلانا جس پر خود پورا وثوق نہ ہو، حق کو منہ چڑانا ہے۔

میرا راسخ عقیدہ ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو قیمتی تحفے قبول نہ کرنا چاہیئے۔

مجھے یہ گوارا نہیں کہ اپنی قوم کی کمزوریوں پر پردہ ڈالوں یا اُن سے چشم پوشی کروں۔ اگر میں ایک طرف اپنی قوم کے حقوق کے لئے لڑتا ہوں تو دوسری جانب اُس کے عیوب کی اصلاح بھی کرتا ہوں۔

قومی ادارہ وہ ہے جو قوم کی مرضی سے اور اُس کے روپیہ سے چلایا جائے۔ جب یہ ادارہ قوم کی امداد سے محروم ہو جائے تو اُس کو باقی رہنے کا کوئی حق نہیں رہتا۔ میری رائے میں قومی اداروں کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کو اُن چیزوں کی طرح جو فطرت کی آغوش میں پرورش پاتی ہیں اپنی غذا روز کی روز حاصل کرنا چاہیئے۔

کسی نظام کی مزاحمت یا اُس کی تخریب کی کوشش جائز ہے۔ مگر اُس کے بانی کے درپے آزار ہونا خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص بحرِ حقیقت کا ایک قطرہ ہے اور قطرہ بحر کی طرح غیر محدود ہے۔ کسی قطرہ کو حقیر سمجھنا دریا کی حقارت کرنا ہے، اور کسی بندہ کا دل دُکھانا ساری خدائی کو دُکھ دینا ہے۔

حقیقت و معرفت

حق وہ روحِ کُلّی ہے جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان اُسکے جلوے کی جب ہی تاب لا سکتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھے۔

انسان کی نجات اسی پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہر ذی حیات سے کمتر سمجھے

جو دل نورِ ایمان سے منور ہے اُس کو مصیبت و تکلیف کے پردے میں رحمتِ ایزدی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے رنج و غم کی تلخی میں حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔

جو شخص جذبات سے متاثر ہو جاتا ہے وہ خواہ کتنا ہی نیک نیت اور سچا ہو حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتا

تلاشِ حق کی سعی جب ہی مشکور ہوتی ہے کہ محبت و نفرت اور رنج و راحت کے احساس سے نجات مل جائے

جن لوگوں کو اپنی ذات اور دوسروں کی ہستی میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اُنھیں بے ہمہ اور با ہمہ

زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنا چاہیئے۔ یہ عادت اِس طرح پڑتی ہے کہ جب خود بخود دوسروں سے ملنے کا موقع نکل آئے تو آدمی اپنا پہلو نہ بچائے بلکہ سچے جذبۂ خدمت کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کرے مگر اپنے دل کو اُن سے وابستہ نہ ہونے دے۔

ایک طالبِ حق کو لازم ہے کہ وہ اپنے خیال اور کلام کی طرح غذا کے کیف و کم میں بھی ضبطِ نفس سے کام لے۔ غذا کا مقصد کام و دہن کی لذت نہیں بلکہ جسم کی بقا ہے۔

جو شخص دیدہ و دانستہ دل میں ناپاک خیالات رکھتا ہے، اُس کے نفس کا تزکیہ فاقہ سے نہیں ہو سکتا دل کی عیاشی کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان سختی سے اپنے نفس کا احتساب کرے اور خدا کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دے۔

روحانی کمال یا عصمت توفیقِ ایزدی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ کامل تسلیم و رضا کے بغیر خیال پر پُورا قابو پانا محال ہے۔

کامل عفت کے لئے ضروری ہے کہ انسان خیال، قول اور فعل میں جذبات کے تعلق سے آزاد ہو جائے۔ محبت و عداوت اور نفرت و رغبت کی دوئی سے نجات حاصل کرے۔

انسان کی ذات اور اُس کے افعال دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اچھے فعل پر تحسین اور بُرے پر نفرین کرنی چاہیئے، لیکن فاعل اگر اچھا ہے تو عزت کا اور بُرا ہے تو رحم کا مستحق ہے۔ نفرت جُرم سے کرنا چاہیئے نہ کہ مجرم سے۔

مَیں نے اکثر یہ بے بنیاد عقیدہ سُنا ہے کہ معرفتِ نفس صرف زندگی کی چوتھی منزل یعنی سنیاس میں قدم رکھنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ اِس بیش بہا تجربہ کی تلاش زندگی کے آخری دَور پر اُٹھا رکھتے ہیں اُن کو معرفت نفس حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کا بڑھاپا بچپن کی بگڑی ہوئی تصویر بن جاتا ہے اور اُن کا وجود زمین پر بار ہو جاتا ہے۔

مجھے نہ خدا کا دیدار نصیب ہوا نہ اُس کی معرفت حاصل ہوئی۔ ساری خدائی کو خدا کا قائل دیکھکر میں بھی قائل ہو گیا۔ مگر میرا عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ مَیں اس کو تجربہ کے برابر سمجھتا ہوں۔ حق کی تلاش زندگی کی معراج ہے۔

بادۂ حُبِّ وطن

(خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی، آو۔بی۔ای)

صبحِ بہارِ گل، نہ ہوائے چمن میں ہے
وہ سرخوشی جو بادۂ حبِّ وطن میں ہے

ہر نغمہ کیوں نہ قالبِ فریاد میں ڈھلے
دَورِ خزاں ہمیشہ ہمارے چمن میں ہے

کیونکر ترانے گائیے عیش و نشاط کے
ہم بیکسوں پہ عالمِ غربت وطن میں ہے

شعلے بھڑک رہے ہیں فساد و عناد کے
اِک آگ سی لگی ہوئی ہر سُو چمن میں ہے

رہنے دے اے ہجومِ غم و یاس و بیکسی
وہ دلکشی جو دُور وطن سے وطن میں ہے

گُل جھومتے ہیں، نشے میں میخوار جس طرح
کِس نو بہارِ ناز کی آمد چمن میں ہے

کچھ دیر فکر عالمِ بالا کی چھوڑ دے
اِس انجمن کا راز اِسی انجمن میں ہے

آئینۂ جمال ہے وہ پیکرِ جمال
کیونکر کہوں کہ فرق کوئی جان و تن میں ہے

واحسرتا کہ وعدے کی تجدید بھی رہی
لُکنت غضب کی اُس لبِ پیماں شکن میں ہے

اے میرا حال پوچھنے والے ترے نثار
اِک زخم تو بھی پہلوئے زخمِ کہن میں ہے

ہے بات یوں کہ مجھکو ہے مرغوب سادگی
ہر چند ایک لطف ترے بانکپن میں ہے

خمخانۂ الست ہے گویا کھُلا ہوا
کیفِ ہزار بادہ اثرؔ کے سخن میں ہے

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے
لذّت وہ ہے کہ جو ہوش و صحت سے ملے

ایمان کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے
عزّت وہ جو اپنی مِلّت سے ملے

ہے وہم نقشِ ہستی ہر چند دل نشیں ہے
دیکھو اسے تو سب کچھ سوچو تو کچھ نہیں ہے

(اکبرؔ)

زمانہ ۱۹۰۵ء

ہندو مسلم اختلافات

(از مسٹر فیاض الدین احمد فیاض گوالیاری، بی اے)

ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلافات بنیادی ہیں اور تاوقتیکہ ملک سے ان کے بیخکنی کی کوشش نہ کی جائے سطحی تدبیریں کامیاب نہ ہونگی۔ اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ملک کی ان دونوں بڑی قوموں میں اجنبیت ورمنافرت دُور ہوکر باہمی اعتماد پیدا ہو۔ لیکن اگر سماجی حیثیت سے ہم ایسی اصلاح کرنے کے قابل نہیں ہیں تو سیاسی اتحاد کا خواب دیکھنا بے معنی ہے!

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس وقت ہندومسلمانوں کو ایک دوسرے سے غلط فہمی اور بے اعتمادی ہے، اس لئے تاوقتیکہ قلبی طور پر ان کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے انسانیت کے گلے پر چھری چلانا بند نہ ہوگا۔ اور ہماری متفرق و منتشر کوششیں کمزور ثابت ہونگی۔ اور اغیار ہماری کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔

ہندو مسلم اختلافات مہذب دنیا کی نظر میں کتنے ہی حقیر اور مضحکہ خیز کیوں نہ ہوں، لیکن اُن کے وجود سے جو نقصان وطن کی متحدہ قومیت کو پہونچ رہا ہے اُس کی اہمیت کا احساس رکھنے والا اُنھیں کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کے متعلق عام ہندوؤں کے خیالات حسب ذیل پائے جاتے ہیں:-

۱- یہ بدلیشی مذہب والے ہیں جن کے عہد حکومت میں ہندوؤں پر بڑے بڑے ظالمانہ حملے ہوئے۔

۲- ہماری ان کی تہذیب اور معاشرت متضاد ہے اور وہ جو کچھ کرتے ہیں ہماری ضد پر کرتے ہیں ہندو جس گؤ ماتا کو پوجتے ہیں مسلمان اُسی کے گلے پر چھری چلاتے ہیں۔

۳- ہم روز نہاتے ہیں، یہ کبھی مہینہ اٹھوارے نہاتے ہیں، ان کے گھر اور رہن سہن کے طریقے گندے ہیں۔

۴- مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ افغانستان، عرب، ترکی اور ایران کے ساتھ ملکر پان اسلام ازم کے خواب دیکھتے ہیں۔

۵- اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔

۶۔ ہمارا مذہب اور تہذیب قدیم ہے۔

۷۔ یہ لوگ عورتوں کو اغوا کرکے مسلمان بنا لیتے ہیں اس لئے ان کے پڑوس سے بھی بچنا چاہیئے۔

اِسی طرح ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے جذبات یہ ہیں کہ:۔

۱۔ ہندو صدیوں سے غلام رہے ہیں، اُن کی ذہنیت غلامانہ ہے، انھوں نے کبھی وسیع النظری سے کام نہیں لیا۔ ہم نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ان کے ساتھ رواداری برتی، اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کیا لیکن انھوں نے جب موقع پایا غدّاری اور سرکشی کی

۲۔ یہ لوگ پتھروں اور جانوروں تک کو پوجتے ہیں، ہماری زبان اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں، چنانچہ ہر قومی و ملکی تحریک کی آڑ میں ان کا یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔

۳۔ ان کی طہارت برائے نام اور نمایشی ہے، حیوانات کے بول و براز کو مقدس اور پاک سمجھتے ہیں۔

۴۔ ہمارا مذہب ایک عالمگیر مذہب ہے اس لئے ہماری نظر وسیع اور ہمارا دائرہ لامحدود ہے

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

۵۔ یہ لوگ ہندوستان میں ہندو راج اور ہمارے مذہب کو مٹا دینے کے خواب دیکھتے ہیں۔ آریہ سماجی علانیہ ہمارے اور ہمارے مذہب کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ ان کے کھان پان کی چھوت چھات دل آزارانہ اور نفرت انگیز ہے۔

یہ ہیں مختصراً مہاسبھائی اور لیگی خیالات و جذبات جو ملک میں فساد و منافرت کی آگ بھڑکا رہے ہیں اور جس آگ کو ہوا دے کر فرقہ دارانہ اخبار و رسائل اپنی بکری بڑھاتے اور مادرِ وطن کو ناقابل تلافی صدمات پہونچا رہے ہیں۔

پان اسلام ازم کا خواب دیکھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ بیرونی ممالک کو اُن کے حالات سے کوئی ہمدردی و دلچسپی نہیں ہے۔ غیر ملکوں کے لوگ اپنے وطنی دائرہ و قومیت پر نازاں ہیں اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے باشندوں کو حقارت نہیں تو اجنبیت کی نظر سے ضرور دیکھتے ہیں۔ نہ ٹرکی نے کسی ہندو مسلم فساد میں کوئی طبی مشن بھیجا اور نہ کوئٹہ کے زلزلہ کے مصیبت زدہ مسلمانوں کے لئے مصر و عرب میں کوئی چندہ کیا گیا۔ تمھارا ملک دُنیا کے ہر ملک سے بہتر اور تمھاری ہندو مسلم تہذیب بہترین انسانی تہذیب ہے، اور یہی تمھارے لئے مایۂ ناز ہونا چاہیئے۔ اِسی سرزمین میں صدیوں سے رہتے سہتے، مرتے کھپتے آئے ہو۔ تمھارے آبا و اجداد نے اپنے پسینے اور خون سے اِسی چمن کی آبیاری کی ہے۔ تمھارے بادشاہوں نے یہاں کی دولت یہیں صرف کی ہے۔ غیر ممالک میں نہ تمھارے لئے کوئی گنجایش ہے نہ تمھارا کوئی وزن۔ تم

جنھیں اپنانے کا دعوے کرتے ہو، پہلے یہ تو دیکھ لو کہ وہ بھی تمھیں اپنا سمجھتے ہیں! یا یہ عالمگیر اخوت و وطنیت کا سبق ایک خطرناک دھوکا ہے

کانگریسی حکومت کی فروگذاشتوں، کمزوریوں یا ~~ظلم~~ زیادتیوں کا دن منانا گویا دیسی راج سے چھٹکارا پانے پر خوشی منانا تمام ملک کے لئے ایک سیاہ ترین دن تھا جس پر وطنیت برسوں آنسو بہائیگی!

آریہ ورت میں مکمل ہندو راج اور ویدک تہذیب کے خواب دیکھنے والوں کو بھی آنکھیں کھول کر محسوس کرنا چاہیئے کہ حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے رفتار زمانہ کا ساتھ نہ دینا خودکشی کے بمنزلہ ہے۔ عوام کے جذبات سے زیادہ دنوں تک نہیں کھیلا جا سکتا۔ وسیع النظری انصاف اور ایثار جب وقت تک ست پریم اور اہنسا کے ہم آہنگ نہ ہونگے، دُنیا کی کوئی تہذیب اور تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس نفرت، عداوت تنگ دلی اور کوتہ نظری دوامی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گی اور ہم ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلا سکیں گے۔

درحقیقت ہندو مسلم جذبات منافرت کے اسباب سے صرف چار خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ~~مسلمانوں میں وطن پرستی کی کمی~~

(۲) گاؤکشی کا مسئلہ

(۳) ہندوؤں کی طرف سے کھان پان میں پرہیز۔

(۴) اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف آریہ سماجیوں کی پالیسی۔

اب رہیں مخالفانہ تاریخی داستانیں، طرز رہائش میں ستھرے پن کی کمی، آوارگی، سُود خواری وغیرہ کی شکایات سو وہ غلط تاریخ۔ کمزور سماج۔ گوشت خوری۔ سرمایہ داری اور بے اعتمادی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے چنداں قابل لحاظ نہیں ہیں۔ تاہم یہ اسباب بجائے خود ایک لعنت ہیں جن کا دُور کرنا ہمارے اصلاحی پروگرام میں لازمی طور پر شامل ہونا چاہیئے۔

میری رائے میں اقوام ہند میں ذات پات، قوم و فرقہ کی بنا پر کھان پان میں علحدگی دُور کرنے کے خلاف علی جہاد کیا جانا چاہیئے۔ ایسی تقریریں اور لٹریچر کی اشاعت کی جائے جس کی بدولت یہ پرہیز انسانیت کے خلاف سمجھا جائے۔ مشترکہ خورونوش کی حوصلہ افزائی کی جائے اور علانیہ شرکت کے لئے کٹر پنتھیوں کو سماجی دباؤ سے مجبور کیا جائے کہ وہ ایک دسترخوان پر بیٹھکر کھانے سے پرہیز نہ کریں۔

۲۔ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والے اخبارات کا مکمل سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔ اور صوبجاتی حکومتوں کو اُن کی اشاعت خلاف قانون قرار دینے پر مجبور کیا جائے۔ تاکہ سادہ لوح عوام کی ذہنیت مسموم نہ ہونے پائے اور اس کے برعکس اتحاد پیدا کرتے والی اور ایک دوسرے کی طرف سے دل میں جگہ پیدا کرنے والی خبروں

کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

(۳) ہندوستان کی تاریخ اس التزام سے تالیف کی جائے جس کی بدولت مختلف فرقوں میں پریم اور ملاپ کا جوش پیدا ہو۔اور تاریخ کا روشن پہلو پیش کیا جائے۔

(۴) اسکول میں بچوں کی اس طریق پر تعلیم دی جائے کہ اُن میں آئندہ چلکر باہمی مغائرت و منافرت کا امکان باقی نہ رہے۔بلکہ غیر قوموں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

(۵) اس میں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام لازمۂ شرافت قرار دیا جائے اور اس کے خلاف ہر عمل پر علانیہ اظہار نفرت و ملامت کیا جائے۔

(۶) ہندوؤں کے تیوہاروں کو مسلمان اور مسلم تیوہاروں کو اہل ہنود اپنائیں، اور مل جل کر اُن میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔

(۷) مسلمانوں سے گاؤکشی ترک کرنے کے لئے پُرامن اور برادرانہ اپیل کی جائے۔انھیں جیسے جیسے یقین آتا جائیگا کہ یہ اپیل اُن کا حق چھیننے کے لئے نہیں بلکہ اُن کے جذبات شرافت و انسانیت سے ایک برادرانہ اپیل ہے۔وہ رفتہ رفتہ اپنے بھائیوں کے جذبات کا احترام کرنے لگیں گے۔

(۸) گوشت خوری جہاں تک ہو کم کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے حیوانی جذبات بڑھتے ہیں۔سبزی اور دودھ کا استعمال جتنا زیادہ کیا جائے گا دماغی اور روحانی قوتوں کو فروغ حاصل ہوگا۔

(۹) صفائی اور سُتھرے پن کے طریقے عوام کے ذہن نشین کئے جایئں اور گندے طریقوں کے خلاف جدوجہد کی جائے

(۱۰) ایک دوسرے کے رسم ورواج اور روایات کو ہمدردی اور محبت کی نظر سے دیکھنے کی تعلیم دیجائے۔

(۱۱) عورتوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور اُس تعلیم میں وطن پرستی کا عنصر زیادہ سے زیادہ رکھا جائے۔

(۱۲) ہر قوم و فرقہ کو ملک کا ضروری عضو سمجھکر باکار اور کارآمد بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۱۳) کوئی کام خواہ تفریحی ہو خواہ سیاسی، فرقہ وارانہ بنیادوں پر نہ کیا جائے بلکہ مشترکہ محاذ پیدا کئے جائیں مثلاً قوم وار کرکٹ میچز کے بجائے صوبجاتی میچیز کی تجویز مستحسن ہے۔تاکہ عوام کی دلچسپی اپنے متعلقہ فرقہ تک محدود نہ رہے اور وہ ہندوستان کی ہر قوم کے کھلاڑی کو اپنا ہیرو قرار دے سکیں۔

رفتہ رفتہ لباس اور زبان کا فرق مٹایا جائے۔زبان سہل اُردو یعنی ہندوستانی ملک کے گوشے گوشے میں پھیلائی جائے۔رسم الخط دونوں جاری رہیں مگر اُردو رسم الخط کو ہندوستانی ضروریات کے مطابق سہل تر بنایا جائے۔لباس اور زبان سہولت کے لحاظ سے اختیار کی جائے۔مذہب سے اسکا کوئی تعلق نہ ہے

مذہب کو دل تک اور زیادہ سے زیادہ گھروں تک محدود سمجھنے کی تعلیم دی جائے گھر کے باہر کی زندگی میں اس کے نام سے کام لینا روحانیت نہیں بلکہ ریا اور فساد میں داخل ہے۔

بین الاقوامی شادیوں کا رواج ڈالا جائے تاکہ دونوں قومیں آپس میں متحد و منسلک ہو جائیں مجھے اندازہ ہے کہ کٹر ہندو مسلمان دونوں ان باتوں کے راستے میں ضرور روڑے اٹکائیں گے کیونکہ ان کا ایک بزدلانہ خیال یہ ہے کہ اگر اقوام ہند کا منتشر شیرازہ اس طرح یکجا کر دیا گیا تو ہماری منفرد حیثیت اور تہذیب باقی نہ رہے گی۔ اس کے جواب میں میں یہی عرض کرونگا کہ اگر واقعی کوئی مذہب سچا اور کوئی تہذیب حقیقی تہذیب ہے تو وہ یقیناً ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ ورنہ جو شئے کمزور اور مٹنے کے قابل ہے اُسے کتنا ہی بچا بچا کر رکھا جائے وہ مٹ کر رہیگی۔

وسیع پیمانے پر سماجی اصلاح کا پروگرام جاری کرنا کوئی ناممکن العمل پروگرام نہیں ہے۔ لیکن دلوں میں اس کے لئے حقیقی جذبۂ اخوت اور دماغوں میں ملکی ضرورت کا احساس موجود ہونا چاہیئے۔ یہ جذبہ اور احساس رہنمایانِ وطن کی زبان و قلم سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک بار یہ دھارا بہ نکلا تو پھر روکے نہ رُکے گا۔ اور اس سیلاب میں ساری قومی منافرت و مناقشات خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے۔

صفحہ ۳۵ دیکھو

اِعجازِ کلام

(از مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔ اے)

عشق جفا نواز کو پاسِ جاں اگر نہیں
نالوں میں کیوں ضرر نہیں آہوں میں کیوں اثر نہیں

شیفتگانِ حسن میں شور نہیں ہے شر نہیں
عشق ہے لفظِ پُرسکوں، زیر نہیں زبر نہیں

حاصلِ زندگی ہے عشق، حاصلِ عشق لطفِ غم
غم کے ہیں یوں تو حرف دو معنی میں مختصر نہیں

لیکے ازل سے تا ابد، میرا فسانہ ہے دراز
شوق سے آپ سویئے، قصہ مختصر نہیں

حسن ہے چار دن کا رنگ، عشق ہی عارضی نہ ہو
حسن کا اعتبار کیا، عشق بھی معتبر نہیں

قول کے ساتھ جان ہے جانِ کے ساتھ آبرو
وعدے میں وعدہ ہے وہی جس میں اگر مگر نہیں

شعر کہیں تو کیا کہیں، لطفِ کلام کچھ نہیں
بزمِ سخن ہے بے مزہ پاس اگر جگر نہیں

حضرت جگر مرادآبادی

شورشِ کائنات

(حضرت اعجاز صدیقی، مدیر "شاعر" آگرہ)

نہ دیتا کاش مجھ کو وقت، فرصتِ نواگری — کہ داستانِ زندگی بہت ہی آج دُکھ بھری
خداشناسیاں کہاں، خودی پسند ہے جہاں — کہیں حرم کی خشکیاں، کہیں بتانِ آزری
نہیں محبت و ہوس میں امتیاز مطلقاً — وفا کی ہر ادا سے آشکار ہے جفاگری
صداقتیں خیال و خواب ہیں، حقیقتیں سراب — قدم قدم پہ دہر میں بپا ہے جنگِ زرگری
جو راز آج ہے اصولِ زندگی بنا ہوا — جو بتکدے میں کھول دوں تو بت کہیں ہری ہری!
غریب کیلئے نہیں ہے ایک نانِ خشک بھی — امیر کے نگاہ و دل میں سیم و زر کی ہے تری
جہاں کا خون کر کے ہو رہی ہیں ملک گیریاں — کہیں ہے جورِ قیصری کہیں جفائے ہٹلری
غلام ڈھل رہے ہیں ہر طرف بشر کی شکل میں — کچھ اس قدر عروج پر ہے کاروبارِ قیصری
ہے بزمِ ہست و بود ایک رزم گاہِ خونفشاں — نہیں ہے ممکنات سے احاطۂ ستمگری
ہیں بات بات پر نبرد آزما بہم دگر — یہ چند دن کی زندگی، یہ آدمی کی خودسری
بدل کے رہ گیا ہے مطلقاً نظامِ زندگی — نہ وہ فضائے دلنشیں، نہ وہ ادائے دلبری
نہ پریم ہے نہ پیار ہے، نہ حسن پر نکھار ہے — نہ وہ جبینِ برہمن، نہ وہ نگاہِ کافری

الٰہی رنگِ کائنات ہو تغیر آشنا
نہیں ہے راس دہر کو یہ دورِ جورِ ناروا

اے کعبہ و کلیسا بالفعل بل کے بیٹھو — جھگڑے کو اپنے چھوڑو کل کے لئے خدا پہ

پچھتاوا

(ایک قصہ)

از مسٹر رہبر بی۔اے

"ماں! کیا عورتوں کا جنم ایکادشی کے برت رکھنے اور کتھائیں سننے کے لئے ہی ہوتا ہے؟"
کمسن برج نے اپنی بوڑھی ماں سے پوچھا۔
"بیٹا! جیون میں دھرم کرم نہ ہو، تو جیون کس کام کا؟" بوڑھی ماں نے کتھا سننے کی سامگری گڑ۔ چاول، آٹا اور پیسے وغیرہ ایک تھالی میں رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ اچھا دھرم کرم ہے۔ بھوکے مرو اور براہمنوں کی باتیں سنو۔"
"گیان کی باتیں کہتے ہیں، بیٹا۔"
ماں نے تھالی کو سفید کپڑے سے ڈھانکتے ہوئے جواب دیا۔
"تو یہ گیان کی باتیں مجھ سے سن لو۔ اور یہ گڑ اور پیسے مجھے دیدو۔" برج نے بچپن کے معصومانہ انداز میں کہا۔
"وہ شاستر کی باتیں ہیں تم کیا جانو۔" ماں نے اعتراض کیا۔
"میں تو جانتا ہوں۔ تم نہ سنو تو دوسری بات ہے۔"
"اچھا سناؤ تو بھلا" ماں نے تھالی ایک طرف رکھدی اور بیٹے کے منھ کی طرف ٹکٹکی لگا کر بیٹھ گئی۔
"ایک راجہ بڑا انیائی[1] اور پاپی[2] تھا۔" برج نے کتھا شروع کی۔ "اس نے جنم بھر دان دھرم کا نام نہیں لیا۔ اپنی پرجا کو دکھ دیتا رہا۔" وہ بالکل پنڈتوں کے ڈھنگ میں کہہ رہا تھا۔ "ایکدن شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے بہت دور نکل گیا۔ گرمی کے دن تھے۔ لو چل رہی تھی۔ اسے مارگ[3] نہیں ملتا تھا۔ بھوکا پیاسا تھک کر ایک برکش (درخت) کے نیچے بیٹھ گیا۔ سندھیا[4] ہوگئی۔ کھیل تک بھی اڑ کر منھ میں نہ گئی۔ وہ راجہ تھا اس نے بھلا بھوک پیاس کاہے کو دیکھی تھی۔ وہیں بے ہوش ہوکر پران نکل گئے۔ ایشور کی مایا! اس دن نرجلا ایکادشی تھی۔" بوڑھی ماں حیرت سے سن رہی تھی اور بیٹا کہہ رہا تھا۔ "جب یم[5] راج کے دوت اس کی

[1] نا منصف　[2] گنہگار　[3] راستہ　[4] شام　[5] موت کا فرشتہ

آتما کو دھرم راج کے پاس لے گئے۔ تو اُس نے اس کا کھاتہ دیکھ کر کہا۔ اِس نے جنم بھر پاپ کئے ہیں۔ پرنتو ایکادشی کا برت رکھتے ہوئے مرا ہے۔ اِس لئے اِسے سورگ لے جاؤ۔ یہ ہے" برج نے مسکرانا شروع کیا "ایکادشی کے برت کا مہاتم۔ جو ایکادشی کا برت رکھتا ہے۔ اُسے ایسا ہی پھل ملتا ہے۔" یہ کہکر اُس نے ماں پر گہری نگاہ ڈالی اور پھر کہا۔ "کیوں ٹھیک ہے نا ماں؟"

"ٹھیک تو ہے۔ پر اب تمھیں بتاؤ۔ یہ گیان ہے کہ نہیں؟"

"گیان! اسمیں گیان کی کونسی بات ہے"؟ برج نے ہنستے ہوئے کہا۔

"گیان کیوں نہیں؟ صاف تو بتایا ہے کہ برت رکھنے سے پاپی بھی تر جاتے ہیں"۔

"تو سورگ میں پاپی بستے ہیں؟" برج نے سوال کیا۔

"ارے باؤلے۔ سورگ میں پاپی نہیں دھرماتما بستے ہیں"۔

"نہ کہیں سورگ ہے اور نہ کوئی ایسے سورگ میں پہونچ سکتا ہے۔ یہ سب ڈھکو......"

ماں زمین کے متحرک ہونے میں یقین کر سکتی تھی۔ مگر اس کے لئے یہ ماننا ناممکن تھا کہ کہیں سورگ ہے ہی نہیں۔ اس کی عمر بھر کی تمنا، اُمنگ اور ریاضت اسی سورگ سے وابستہ تھی۔ اُس نے نہ جانے سورگ کے کتنے حسین تصور باندھ رکھے تھے۔ اب ان تصوروں کو مٹانا اتنا ہی سوہانِ روح تھا۔ جتنا کہ ایک پیاسے سے یہ کہنا کہ جس ندی کی طرف وہ دوڑا جا رہا ہے وہ خشک ہے۔ چنانچہ اُس نے بیٹے کی بات کاٹ کر کہا۔

"تو یہ شاستر اور برہمن سب جھوٹے ہیں؟"

"ہاں جھوٹے۔ صاف جھوٹے" برج نے سر ہلاتے ہوئے اعتمادِ کلی سے کہا۔

عمر رسیدہ ماں کو اپنے سورگ کی فکر تو جاتی رہی بیٹے کی عاقبت کی فکر پیدا ہوگئی۔ اس نے شفقت آمیز لہجے میں کہا:۔

"نا بیٹا شاستر اور برہمنوں کی نندا نہیں کرتے"۔

اس نے یہ الفاظ کئی مرتبہ کتھا میں سُنے تھے اور یہ بھی سُنا تھا کہ جو ان کی نندا کرتا ہے۔ وہ نرک میں جاتا ہے۔ ماں نے بیٹے کا نرک جانا درکنار اُسے یہ بتانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔

(۲)

کئی سال گذر گئے۔

اب برج موہن تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اشتراکی خیالات کا حامی اور ملک کی ترقی اور آزادی کا خواہاں۔

اب تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں بسیکھا میں رہنے لگا تھا۔ گرام سدھار کی کچھ کتابیں منگوا رکھی تھیں۔ ان میں سے اقتباسات پڑھ پڑھ کر دیہاتیوں کو سناتا۔ اور عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں انکی وضاحت کرتا اور بتلاتا تھا کہ کسان بیچارے صبح سے شام تک کام کرتے ہیں۔ اساڑھ بھادوں کی گرمی اور پوس ماگھ کی سردی سہتے ہیں۔ پھر بھی اِن کا پیدا کیا ہوا اناج اِنھیں نہیں ملتا۔ اور سب کا سب لگان اور کچہری کے جرمانوں میں چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں بنیئے کے ہاں سے قرض لینا پڑتا ہے۔ جس کے سُود سے وہ زندگی بھر اُبھر نہیں سکتے۔ انھیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ان کے بچّے تعلیم سے کورے رہ جاتے ہیں....."

دیہاتی اِن باتوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ اور کیوں نہ کرتے، ان میں حقیقت تھی، ہمدردی تھی۔ اور ان کے دلی جذبات کی ترجمانی تھی۔ سینوں میں برسوں کی سوئی ہوئی اُمنگیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ جگ پلٹ رہا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں۔ جب انھیں بھی آدمی سمجھا جائے گا۔ آرام حاصل ہوگا اور ان کے بچے بھی کتابیں پڑھیں گے۔"

لیکن اقتصادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ برجموہن ان میں سوشل تبدیلی بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹونے ٹوٹکے اور جنتر منتر کے خلاف کہتے ہوئے پنڈتوں، مُلاؤں، سادھوؤں اور مہنتوں کو جی بھر کر کوستا تھا۔ وہ کہتا تھا "یہ پنڈت۔ فقیر۔ مُلّا اور سادھو، راجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے ایجنٹ ہیں، جو بھولے بھالے اَن پڑھ بھائیوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ سب کو پرار بدھ کا لکھا ملتا ہے۔ چھوٹے بڑے ایشور نے بنائے ہیں۔ جس کی کرم ریکھا ہی مدھم ہو۔ وہ بھاگوان کیسے بن سکتا ہے؟ بھائیو! یہ کرم اور تقدیر سب دھوکا ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ ہم ایسے ہی غفلت میں پڑے رہیں اور یہ دھرم اور دولت کے ٹھیکیدار مزے اُڑاتے رہیں...."

لوگ یہ باتیں سُنتے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے۔ "آدمی پڑھ ہی کر آدمی بنتا ہے۔ ہم تو مٹی کی دیوار ہیں۔ نہ سمجھیں نہ بوجھیں۔ ہمارا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

غرض برجموہن کے آنے سے گاؤں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی اور لوگوں کو صفائی اور خودداری کا خیال ہونے لگا۔ سب لوگ برجموہن کی عزت کرتے اور اس کی باتوں کو دلچسپی سے سُنتے تھے۔ آس پاس کے دیہات میں بھی خبر ہوگئی۔ وہاں سے بھی لوگ سُننے آجاتے تھے۔

برجموہن کی ماں بیٹے کی یہ شہرت اور عزت دیکھتی تو فخر کرنے لگتی۔ مگر جو دوسروں کو سدھارنا چاہتا ہے، وہ اپنے نقائص پہلے دیکھتا ہے۔ اس لئے برجموہن کو بوڑھی ماں کی دقیانوسی باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ جب وہ دیکھتا کہ ماں شام کو دیئے جلانے لگتی ہے تو جلاتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک تلسی کے بوٹے تلے۔ ایک نالی میں۔ ایک کوئیں کی منڈیر پر۔ غرض یہ سلسلہ ختم ہونے ہی نہیں آتا۔ کبھی وہ بچّوں کی طرح ہنس کر اور

کبھی جھنجھلا کر کہتا۔

"ماں! جب ایک لالٹین جلانے سے کام چل سکتا ہے تو دیوں کا یہ تانتا باندھنے سے کیا فائدہ؟"

ماں ہنس کر ٹال دیتی۔ اسے بیٹے کے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ پھر بھی یہ بات چیت کبھی کبھی بڑی لمبی اور دلچسپ ہو جاتی تھی۔

(۳)

برجموہن کی ماں گاؤں کی بزرگ عورت تھی۔ عورتیں اکثر اس سے دھرم کرم اور ٹونے ٹوٹکے کے سلسلہ میں صلاح مشورہ لینے آیا کرتی تھیں۔ کیونکہ ان باتوں میں اس کی رائے ناطق سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب نہ جانے کیوں اُسے اس قسم کے مشورے دینے میں پہلی سی خوشی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے اندر ایک طرح کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ بظاہر وہ سب باتیں اسی طرح سمجھا دیتی۔ مگر دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے جنھیں وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ برج کی باتوں سے اس کے من میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب اسکا اعتقاد پہلا سا کامل اعتقاد باقی نہیں رہا تھا۔ گو وہ برج کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اور انھیں یہ سوچ کر جھٹلاتی تھی۔ کہ "برج ان باتوں کو کیا جانے؟ اس نے تو انگریزی پڑھی ہے۔ اور انگریزی پڑھکر دھرم سے وسواس اُٹھ جاتا ہے۔"

ہم دوسروں کو لاکھ دھوکا دیں۔ مگر اپنے من کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتے۔ جس طرح زبان بار بار تکلیف زدہ دانت سے ٹکراتی ہے۔ وہ بھی شک کو کریدتی تھی اور اُن شکوک کے زیر اثر اکثر سوچتی تھی کہ کوئی ایسی بات نکالے۔ جس کا جواب برجو سے بن نہ پڑے۔ اس لئے وہ خود ہی برجو سے بحث کرتی اور سوالات پوچھتی۔ مگر برجو ان کا جواب دے دیتا۔ لیکن ماں کو بیٹے کی ہمہ دانی پر وہ خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ جو اُسے لاجواب کر کے ہوتی۔ یہ اس کے دھرم کا سوال تھا۔ جیسے اُس نے بیٹے کی پرورش سے زیادہ ریاضت کر کے پالا تھا۔ وہ جس طرح بیٹے کو تمام تکالیف سے محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ اُسی طرح اپنے دھرم کو بھی شکوک سے مبرا رکھنا چاہتی تھی۔ اب اپنے ہی گھر میں دھرم اور بیٹے میں جنگ چھڑ گئی۔ وہ کہاں جائے؟

(۴)

سوموتی اماوس کا دن تھا۔ لوگ نہر پر نہانے جا رہے تھے۔ بڑھیا کی پڑوسن اُسے بلانے آئی۔

برجو سیر سے لوٹ کر آیا تھا۔ اور نہانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے ماں کو تیار دیکھ کر کہا۔

"اتنی دور جاتے تھک نہ جاؤ گی ماں؟"

"ہے تو دُور، بیٹا۔ مگر لوگ تیرتھوں پر جاتے ہیں۔ کیا ہم سے اِتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ نہر ہی میں نہا آئیں۔"
"نہ تیرتھوں میں نہانے سے کچھ ملتا ہے اور نہ نہر میں۔ بلکہ میل اور لگ جاتا ہے۔ گھر پر ہی کیوں نہ نہائیں۔ دیکھو کتنا صاف پانی ہے۔" اس نے برتن میں سے پانی اُچھالتے ہوئے کہا۔

ماں تو خاموش ہوگئی۔ مگر پڑوسن نے کہا۔
"تو کیا سب لوگ بے ارتھ جاتے ہیں؟"
"ہاں میں تو یہی کہوں گا۔ بے ارتھ بالکل بے ارتھ۔"
"اچھا تو بتاؤ۔ گنگا کا پانی برسوں رکھ لینے پر بھی خراب کیوں نہیں ہوتا؟"
"ہاں ہاں بتاؤ۔ اِس میں کوئی تو کرامات ضرور ہے۔" ماں نے جلدی سے کہا۔ اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھی تھیں۔

"اسمیں پہاڑوں کی بوٹیاں اور ہڈیوں کا فاسفورس ملا ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کرامات نہیں۔" برجو نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

ماں کے دل میں اُمید پیدا ہوئی تھی، پر مٹ گئی۔ اور وہ افسردہ سی ہوگئی۔ مگر پڑوسن نے ہنس کر کہا:۔ "دادی تمھارا برجو تو بڑی باتیں جانتا ہے۔"

"اری، اس کی باتوں کا کیا ٹھکانا ہے۔ لوگ سُنتے ہیں۔ تو دنگ رہ جاتے ہیں۔" بوڑھی ماں نے اپنی خشک آنکھوں کو دوبارہ چمکا کر کہا۔

دونوں نہانے چلی گئیں۔

(۵)

ایک سال گذر گیا۔ بوڑھی ماں اب بھی بدستور کتھا کیرتن میں جاتی تھی۔ مگر خوشی سے نہیں عادت سے مجبور ہوکر۔ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ اِدھر کی چیز اُدھر رکھ دیتی اور اُدھر کی اِدھر۔ اندر کے کپڑے باہر اور باہر کے کپڑے اندر۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے خیالات کو کس مرکز پر لائے۔ ماں کو برجو سے پہلے ہی محبت تھی۔ مگر اب اُسے پہلا سا سکھ اور شانتی حاصل نہ تھی۔ شاید اِس لئے کہ اُسے یہ خیال ہونے لگا تھا۔ کہ برجو اب اس سے اِتنی محبت نہیں کرتا۔

آج وہ اپنی پٹیاریوں کو کھول کھول کر دیکھ رہی تھی کہ برجو بھی باہر سے آگیا۔
"کیا کر رہی ہو ماں؟" اُس نے پوچھا۔
"کچھ نہیں بیٹا۔ ایسے ہی بکھت (وقت) بتا رہی ہوں۔" ماں نے پرانے چیتھڑے کی گرہ کھولتے ہوئے جواب دیا

"وقت کیا بتانا ہے۔ آخر کچھ تو کر رہی ہو؟"

"پڑھو اِس کاگد میں کیا لکھا ہے؟" ماں نے ایک کاغذ کا لال ٹکڑا بیٹے کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمھارے پتا لائے تھے۔"

یہ کاغذ اس گانٹھ سے نکلا تھا۔ جسے وہ کھول رہی تھی۔ برج کے پتا کو مرے آٹھ سال سے اوپر ہو گئے تھے۔ نہ معلوم یہ کاغذ کتنی دیر سے اُسی طرح سے رکھا ہوا تھا۔ برج نے اسے بڑے اشتیاق اور احتیاط سے کھولنا شروع کیا۔ جیسے اس میں کوئی خاص منتر لکھا ہو۔ تبھی تو ماں نے اسے اتنی حفاظت سے رکھا تھا۔ لیکن جب کھولا۔ تو نسوار کا اشتہار نکلا۔ جو آدھا اُردو اور آدھا گورمکھی میں چھپا ہوا تھا۔ اب شاید شہر میں وہ دُکان ہی نہ ہو۔ جس کی طرف سے یہ شائع ہوا تھا۔ اس کے پتا کو اکثر شہر جانا پڑتا تھا۔ کبھی لے کر جیب میں ڈال لیا ہوگا۔ وہاں سے ماں کے ہاتھ لگا۔ تو اس نے سنبھال کر رکھ لیا۔

برج نے ایک نظر اشتہار پر، ایک نظر ماں پر ڈالی۔ وہ سراپا حیرت بنی کھڑی تھی۔ نہ جانے عالم غیب سے عالم شہود میں کیا آنے والا ہے؟ برج کو ماں کی حالت پر ہنسی اور اس کی ناسمجھی پر ترس آیا۔ اور اشتہار کو پرزے پرزے کر کے ہوا میں پھینک دیا۔

"کیا تھا بیٹا؟" ماں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" برج نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

کچھ کیوں نہیں۔ کتنے سُندر اچھر (حروف) لکھے تھے؟

برج بغیر جواب دیئے ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ ماں پہلے تو اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر پٹاری بند کر دی۔

(۲)

برج، ماں کے لئے ایک معمہ تھا۔ جسے وہ سمجھ نہ سکتی تھی۔ کبھی تو میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ اور کبھی دل کو مسل کر چل دیتا۔

بہار کا خوشگوار موسم تھا۔ درختوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ صبح کے وقت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ماں اور برج دونوں بیٹھے تھے۔ ماں نے سوچا۔ کیوں نہ برج ہی سے یہ پہیلی سمجھ لوں۔

"بیٹا ایک بات بتاؤ گے؟" اس نے بڑے دُلار سے کہا۔

"پوچھو ماں کیا بات ہے؟"

"میں یہ پوچھتی ہوں کہ لڑکوں کو پڑھ لکھ کر ماں باپ سے کیوں محبت نہیں رہتی؟"

"آخر ماں، تم یہ سوال کیوں پوچھتی ہو؟" برج نے ایک گونہ تکلیف محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے ہی"

اس "ویسے ہی" میں بھی ایک بھید تھا۔ اُس کا رُواں رُواں چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح تملا اٹھا۔ وہ تو بنی نوع انسان کی محبت کا علمبردار تھا۔ مگر اس کی اپنی ہی ماں اس کی محبت سے ناآشنا ہے یہ خیال اس کے لئے کتنا تکلیف دہ، اور کتنا سوہانِ روح تھا۔ اِس پر پانچ منٹ تک غم کی حالت طاری رہی۔ جب پھر آپے میں آیا۔ تو اس پر نئی دُنیا اور نئی زندگی کا نیا باب کُھل رہا تھا۔ اس نے آج پہلی دفعہ محسوس کیا۔ کہ اس نے سُدھار کی دُھن میں ماں کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہونچائی ہے۔ جو ماں ایک اشتہار کے ٹکڑے کو کوئی مقدس دستاویز سمجھ کر سینے سے لگائے رہی ہو۔ اُس کو روحانی حقائق و معارف سمجھانے سے کیا حاصل؟ میرے لئے جو بوسیدہ اشتہار کا پرزہ تھا۔ اس کے لئے وہ کتنی ہی شیرین یادوں کا مرقع تھا۔ میرے لئے جو توہمات ہیں۔ اُس کی زندگی کا سرمایۂ نازش ہیں۔ میں نے اُسے بلا سوچے سمجھے تباہ کر دیا۔ جس روح میں علم کے لئے جگہ ہی نہیں۔ اس میں علم ٹھونسنا اتنا ہی ناممکن ہے، جتنا اندھی آنکھوں کو بینائی دینا۔ ہندوستان کی جہالت کا سدباب اس کے عوام کی لغویات سے اُلجھنا نہیں بلکہ ان کو علم سے روشناس کرنا ہے۔ جب علم ان کے دلوں میں اعلیٰ خیالات پیدا کریگا، تو توہمات خود بخود اس طرح نکل جائیں گے۔ جیسے موسم بہار میں درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹنے سے پہلے پُرانے اور بوسیدہ پتے جھڑ جاتے ہیں۔

یہ سوچ کر اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سسکتے ہوئے بولا۔ "ماں مجھے تم سے محبت ہے۔ بیحد محبت۔ مجھے مُعاف کرو۔ میں آیندہ تمھاری باتوں میں دخل نہ دونگا۔"

اُس کے آنسو ماں کے ہاتھ پر اور ماں کے اُس کے گالوں پر گر رہے تھے۔

ماں اور محبت

راہ میں اک غریب عورت کے — عشق نے بڑھ کے تیر مار دیا
ایک رہرو نے اُس کے سینے میں — جذبہ دلبری اُبھار دیا
قلب نازک کو آنِ واحد میں — شوق نے مژدۂ بہار دیا
عشق نے حُسن کی نگاہوں کو — جلوۂ تیغ آبدار دیا
اور عورت نے ایک لوچ کیساتھ — طفل کو گود سے اُتار دیا

جوش

"الوداعی سلام"

(از مسٹر راجیندر نرائن سکسینہ، بریلی کالج - بریلی)

وہ جو پوچھیں پیام کہہ دینا
میری حالت تمام کہہ دینا
جا رہا ہے غلام کہہ دینا
یاد رکھیں مدام کہہ دینا
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

اے صبا، یعنی طائرِ بے پر
تیرا قبضہ ہے ساری دنیا پر
عیش و عشرت کی تو ہے پیغمبر
اُن کے کوچہ سے ہو کبھی جو گذر
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

دیکھ آئینۂ رُخِ ہمدم
میری حیرت کے نقشۂ پُر غم
اُن کو دیکھے اگر کبھی برہم
میری حسرت بھری نظر کی قسم
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

اے گلو ہوش میں جب آؤ تم
جوشِ مستی سے مسکراؤ تم
ہار میں اُن کے گندھ کے جاؤ تم
اُن کی زینت کو جب بڑھاؤ تم
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

رات کے وقت اے نجوم و قمر
تم تو جاؤ گے گھومنے باہر
خوابِ راحت میں اُن کو دیکھو اگر
روئے روشن پہ صدقے ہو ہو کر
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

عالمِ غیب کے نمائندو
زہرہ و مشتری کے سازندو
کام مَردوں کے تم کرو زندو
قول تم سے اگر ہو ممکن، دو
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

جب یہ محبوب بے وفا نکلیں
حوصلے اپنے دل کے کیا نکلیں
دُور دنیا سے کیوں نہ جا نکلیں
ذرّو! جب بھی اِدھر وہ آنکلیں
الوداعی پیام کہہ دینا
"اُن سے میرا سلام کہہ دینا"

کرب کی آواز

ابن آدم کی شادکامی کا — مسئلہ ہے عجیب زہرہ گداز
آدمی کھُل کے ہنس نہیں سکتا — غم نہ بخشے اگر پرِ پرواز
ایک کلفت کا عارضی انجام — ایک وقتی طرب کا ہے آغاز
جس میں پنہاں نہ ہو خراشِ الم — کونسا ہے طرب کا وہ انداز
ایک پژمردگیِ نامحسوس — دہر کی ہر شگفتگی کا ہے راز
ایک مبہم سا نوحۂ ابدی — چھیڑتا ہے مسرتوں کا ساز

قہقہے تک میں جوش غلطاں ہے
ایک دھیمی سی کرب کی آواز

تنقید کتب

حضرت دانش کے مجموعہ کلام

ہر قدر دانِ اُردو کو یہ دیکھکر خوش ہونا چاہیے کہ موجودہ زمانہ کی شاعری میں جذبات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ ملکی ضروریات کا احساس بھی نمایاں ہو رہا ہے۔ دراصل اسوقت جدید شاعرانہ دور کے عروج کا زمانہ ہے۔ جس کی شروعات حالی و آزاد نے کی اور ترقی اکبر، سرور، چکبست اور اقبال نے دی۔ موجودہ شاعروں میں حضرت جوش ملیح آبادی نے حقیقت نگاری کے علاوہ ملکی جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرکے اُردو شاعری کو واقعی چار چاند لگا دئیے ہیں۔ حُب وطن کو شاعری میں مستقل جگہ دینے کے علاوہ جوش نے تصنع، تکلف، ریاکاری، فرقہ پرستی اور سرمایہ داری کے خلاف جہادِ عظیم بھی برپا کر رکھا ہے۔ جسمیں ملک کے اکثر مشہور شعرا اُن کے ہمنوا ہیں۔ ان شاعروں میں حضرت احسان بن دانش کاندھلوی کو ایک خاص وقعت حاصل ہوگئی ہے۔ ناظرین زمانہ اُن کی دلگداز شاعری اور برجستہ و دلکش نظموں سے بخوبی واقف ہیں، اور اب یہ سُنکر اُنھیں مزید خوشی ہوگی کہ حال میں اِس مقبولِ عام شاعر کی مختلف بلند پایہ نظموں کے کئی دلپذیر مجموعے شائع ہوگئے ہیں۔ انمیں سے دو مجموعے جو "آتشِ خاموش" اور "چراغاں" کے نام سے چھپے ہیں۔ اِسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ واقعی اِن مجموعوں سے اُردو ادب میں ایک خاص اضافہ ہوا ہے۔ حضرت احسان جوان طبیعت شاعر ہیں۔ اُن کی دردرس طبیعت اہلِ وطن کے دُکھوں سے دُکھی اور ان کی مسرتوں سے شادماں ہوتی ہے۔ اُن کی نظموں کے عنوان مصنوعی یا فرضی نہیں ہوتے بلکہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں دیکھ بھال کر لکھتے ہیں ۔ اسی وجہ سے انھیں تفصیلات و جزئیات بیان کرنے میں اتنا کمال حاصل ہوگیا ہے۔ منظر کشی میں بھی وہ بہت کامیاب ہیں۔ اُنکا دردمند دل وطن کے جفاکش مزدور بھائیوں کی حالت دیکھ دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے چنانچہ اِن دونوں کتابوں میں سرمایہ اور محنت کی کشمکش، مزدور طبقہ کی کس مپرسی اور عام ہندوستانیوں کی غلامی کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں۔ انھیں پڑھ کر ناظرین کا دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت احسان کی زبان صاف وسلیس اور اُن کی ترکیبیں چست اور تخیل بلند ہوتی ہے۔ احسان صحیح معنوں میں فطری شاعر ہیں۔ ہندوستانیوں کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اُنھوں نے اپنی نظموں میں روشنی نہ ڈالی ہو۔ نمونہ کے طور پر ہم آپ کو ایک چھوٹی سی نظم سناتے ہیں۔ جسمیں احسان نے منظر نگاری کا کمال دکھانے کے بعد ریاکاری کی پردہ دری کی ہے۔ اُنھوں نے خود اِس نظم کی

یہ تمہید لکھی ہے :-

"ایک صبح میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ اُن کے کولہو کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ایک مزار آیا۔ جہاں فاتحہ خواں مرد و زن کا ہجوم چڑھاوے چڑھا رہا تھا۔ وہاں کے سجادہ نشین نے مجھے تہی دست و تہی دامن دیکھکر سب کے بعد فاتحہ خوانی کی اجازت دی۔"

اس کے بعد کولہو کا منظر پیش کرتے ہیں۔ اس کی تفصیلات و جزئیات سُننے کے قابل ہیں کہتے ہیں کہ ؎

یہ سردیوں میں خموش جنگل، فضا میں مستی ہوائیں نرمی
پڑا ہے پالا، دبی ہوئی ہے زمیں کے قلب و جگر کی گرمی

ہنکلتے سُورج کی زرد کرنیں فضا سے چھن چھن کے آرہی ہیں
غنودگی میں ہیں نرم پودے، ہوائیں جھولا جھلا رہی ہیں

وہ اک کھٹولے پہ جھونپڑی میں کسان بیچارہ سو رہا ہے
جہاں سے ٹوٹا تھا ایک پایہ وہاں کنستر لگا ہوا ہے

کڑاہوں میں رس اُبل رہا ہے، ہوا میں خوشبو رچی ہوئی ہے
رچی ہوئی ہے دھوئیں سے تھوڑی گھڑوں پہ کائی جمی ہوئی ہے

پڑی ہے اک الگنی پہ صافی سیاہ جالے لٹک رہے ہیں
سیاہ جالوں میں خار و خس کے مہین تنکے اٹک رہے ہیں

بلی نہیں خواب سے جو فرصت، ہوا کمیروں پہ کسل طاری
مگر ابھی تک ہنکار رہے ہیں غریب بیلوں کو باری باری

ہیں جمع دہقاں آگ کے گرد، دور حقہ کا چل رہا ہے
دھواں زمیں سے بلند ہو کر ہوا پہ کروٹ بدل رہا ہے

فضا میں بیلوں کی گھنٹیوں سے چھڑی ہوئی جلترنگ سی ہے
ہیں رقص میں زر فروش کرنیں ہر ایک شے پر اُمنگ سی ہے

ان جزئیات کے بعد حضرت احسان پیر خانقاہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں ؎

یہ بات احسان راز کی ہے، بجز مرے اور کون جانے
کہ خانقاہوں کی محفلوں سے مفید تر ہیں [illegible] خانے

یہاں کی تقدیس میں ریا ہے، نہ آستینوں پہ خون ایماں
یہاں تو ہر اک نظر ہے سجدہ، وہاں ہے موہن شکار قرآں

بہار فردوس کا ہے ضامن ہر ایک رنگیں گناہ ان کا
عروج دیتا ہے کافری کو یہ نعرۂ لا الٰہ ان کا

ان آدمی زاد بھیڑیوں نے ہزاروں کافر بنا دئے ہیں
گھنیری داڑھی کی جنبشوں نے چراغ ایماں بجھا دئے ہیں

فریب ہے ہر خیال اُن کا، ریا ہے سب حال و قال اُنکا
گذرتا ہے عرس کی بدولت قمر جبینوں میں سال اُنکا

جو لوٹ لیتے ہیں دن دہاڑے وہ راہزن رہنما بنے ہیں
شریر عصیاں شعار دیکھو خدا کے ہوتے خدا بنے ہیں

احسان نے ایک مصیبت زدہ مزدور کا جو فوٹو کھینچا ہے وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے ؎

مزدور کی شام

غروب مہر، گردوں پہ شفق ہے چپ چاپ ویرانہ
زبان شام پر ہے دن کی ناسازی کا افسانہ

رواں ہے اس طرح مزدور گھر کی طرف جنگل سے
کھنچا جاتا ہے جیسے شمع کے جلووں میں پروانہ

تہی آنکھیں، تہی سینہ، تہی کیسہ، تہی دامن
سلگتا آتشِ سب رنگ سے راحت کا کاشانہ

چٹختی ہڈیوں سے اک خشک صحرا کے سینہ میں
دھڑکتے دل کے سازِ غم سے پیدا سوزِ عرفانہ

پھٹے کرتہ کی ہلتی دھجیاں ٹھنڈی ہواؤں میں
زبانِ حال سے کہتی ہوئی عسرت کا افسانہ

برستی جا رہی ہے ٹوکری سے بھربھری مٹی
نکھرتا جا رہا ہے خاک سے حسنِ شریفانہ

تصور بال بچوں کا، تفکر اپنی روزی کا
قدم دھندلی سی بٹیا پر، تخیل میں الم خانہ

پھٹی دستار کا ہر تار ہے عنوانِ مجبوری
برہنہ پاؤں کا ہر نقش ہے نکبت کا افسانہ

"آتشِ خاموش" میں "باغی کا خواب"۔ "مزدور کی عید" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں۔ جن کو پڑھ کر نا ممکن ہے، دل پر اثر نہ ہو۔ حضرت احسان کے نزدیک دنیا سراب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا وہی رہتی ہے۔ لیکن دنیا والے بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

جو بقا ہے اُسے فنا کیسی؟
اک مسلسل بہار ہے دنیا

تیری ہستی ہی پائدار نہیں
محفلِ پائدار ہے دنیا

دونوں کتابوں کے آخری حصے غزلیات پر ختم ہوئے ہیں۔ جنہیں ہر دلعزیز شاعر نے خوب خوب دادِ سخن دی ہے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

یہ مانا ضبط کیا اور برملا نہ کہا
زبانِ دل سے بھی پوچھا کہ اس نے کیا نہ کہا

میں اُسکا میخانہ پوچھتا ہوں میں ایسا ساقی کو ڈھونڈھتا ہوں
جو آنکھوں آنکھوں میں تشنہ کاموں کو مستِ جامِ شراب کر دے

بہت دور ہیں رسمِ دیر و حرم سے
سجودِ محبت ادا کرنے والے

الٰہی جہانِ محبت سلامت
وفا پر تلے ہیں جفا کرنے والے

ہر گام پر ہزار نشانِ سجود ہیں
کعبہ سمجھ رہا ہوں تری رہگذر کو میں

آنکھوں میں آئی خانۂ دل میں اُتر گئی
اب داد کیوں نہ دوں نظر کارگر کو میں

حوصلے مایوس، ذوقِ جستجو ناکام ہے
یہ دلِ نامحرمِ انجام کا انجام ہے

پھر وہ یاد آئے، ہوئی مدہوش دل کی کائنات
پھر اٹھا دردِ جگر، پھر کچھ مجھے آرام ہے

ذرہ ذرہ میں اُٹھتا ہے کوئی رُخ سے نقاب
اب میں اپنے سے بہت دور ہوا جاتا ہوں

دونوں کتابوں کی لکھائی چھپائی پسندیدہ ہے۔ آتشِ خاموش کا حجم ۲۰۰ صفحات اور قیمت ایک روپیہ۔ چراغاں کی ضخامت ۲۳۲ صفحات، قیمت عہ/۔ شائقین مکتبۂ دانش، مزنگ لاہور سے طلب فرمائیں۔

دیوان ہاجر دہلوی

یہ ضخیم دیوان حکیم رگھناسنگھ مرحوم ہاجر دہلوی کی کاوش دماغی کا نتیجہ ہے۔ جسے اب ان کے فرزند رشید کویراج رگھنندن سنگھ طاہر نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ حضرت ہاجر ایک رنگین طبع، خوش مزاج اور پُرگو شاعر تھے۔ زیادہ تر کلام امیر مینائی اور داغ دہلوی کے رنگ کا ہے جو چوتھائی صدی پہلے مقبول عام تھا۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ ہاجر صاحب نثر میں بھی اچھے انشا پرداز تھے چنانچہ غزلیات کے علاوہ اُنھوں نے "نئی روشنی" اور "شادی خانہ بربادی" دو دلچسپ ڈرامے اور "لاش غائب" نامی ایک جاسوسی ناول بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

اس دیوان میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں، قصیدے اور چند قومی اور نیچرل نظمیں بھی ہیں۔ شروع میں خواجہ عبدالمجید خاں صاحب پروفیسر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کا تبصرہ اور مصنف کی سوانحعمری بھی موجود ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ کتابت کی غلطیاں بیشمار ہیں۔ قیمت سوا روپیہ۔

غنچہ خاطر معروف بہ کلام شاعر

یہ چھوٹی سی کتاب حضرت ہاجر دہلوی کے جواں مرگ فرزند منشی دین دیال سنگھ شاطر دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے شاطر نے پندرہ سولہ برس سے زائد عمر نہیں پائی۔ مگر ان کے کلام میں زبان کی صفائی، ترکیبوں کی چستی تخئیل کی بلندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس مجموعہ کا "پیش لفظ" لکھا ہے اور لالہ سرداری لال بھاردواج لاغر ایم۔اے، نے شاعر کے کلام پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی۔ حجم تین جزو۔ قیمت آٹھ آنہ۔ دونوں دیوانوں کے ملنے کا پتہ:۔ کویراج رگھنندن سنگھ طاہر کناری بازار۔ دہلی۔

تعلیمی مضامین[1]

یہ مسٹر بشیر احمد ہاشمی، پنجاب ایجوکیشنل سروس کے دو درجن فاضلانہ مضامین کا مجموعہ ہے جسمیں ابتدائی گیارہ مضامین فن تعلیم یا درس و تدریس سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنمیں مدرس کی ذمہ واریوں اور طالب علموں کی نفسیات پر اچھی بحث کی گئی ہے۔ تین مضمون زبان کے متعلق ہیں جنمیں ایک مضمون "سندی زبان" خاص طور پر قابل توجہ ہے اسمیں مستند زبان پر بحث کرتے ہوئے لکھنؤ اور دہلی والوں پر چوٹ کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"کیا سندی زبان، دلی اور لکھنؤ کی زبان ہے؟ جو رواج پارینہ کی غلام ہے۔ جسمیں تذکیر و تانیث کے جھگڑے اب تک چلے آتے ہیں۔ جسمیں ولی، دکھنی اور میر تقی کی بندش اور محاورے کو آج تک قابل اتباع سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر اس کے چیرہ دست مدعیوں کی ہر بات مان لی جائے، تو "کھجلائے ہئے" "کھڑکائے ہ" متروکات قرار نہیں دئے جاسکتے۔ جسمیں متقدمین کے دور کے بعد کسی ترقی اور اضافے کا امکان نہیں سمجھا جاتا

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، ایجوکیشنل پبلشرز لاہور۔

جسمیں "چہرہ" اب تک "چاند" ہے۔ جسمیں معشوق کو دیکھنا اور ہوش وحواس کا جانا عشق و محبت کا نہیں،
بلکہ شاعری کا معیار ہے"۔

یہاں دلّی یا لکھنؤ کی وکالت کرنا ہمارا فرض نہیں ہے۔ تاہم یہ بات ضرور قابل نوٹ ہے کہ فاضل مُصنف نے جن باتوں پر اعتراض کیا ہے، وہ اب دلّی اور لکھنؤ میں متروک ہیں۔ دلّی و لکھنؤ کی زبان اب جسقدر صاف اور شستہ ہوگئی ہے اس کا مقابلہ ہندوستان کے کسی اور مرکزی مقام کی زبان نہیں کرسکتی۔ یہاں کے ترقی پسند مُصنفین اب زبان کو عربی و فارسی کے بہت سے ایسے ثقیل وغیرمانوس الفاظ اور ترکیبوں سے بھی پاک وصاف کررہے ہیں، جو اس کتاب کے فاضل مُصنف نے اپنے مضامین میں استعمال کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فاضل مُصنف قلم کی رو میں "رگہائے گردن بہ حجت قوی" لکھ گئے ہیں جس کی تشریح کے لئے انھیں حاشیہ آرائی کرنی پڑی ہے۔ بہرحال آجکل دلّی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم جو زبان لکھ رہے وہ اس زبان سے بدرجہا اچھی اور صاف ہے۔ جو فاضل مُصنف نے اس کتاب میں لکھی ہے۔

اس مجموعہ کے آخری دس مضامین مختلف موضوعات پر ہیں۔ جن کا درس و تدریس اور درستی اخلاق سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ انمیں دو مضمون جن کا عنوان "چون وچرا" اور "قلم اور تعلیم" ہے، بہت قابل قدر ہیں۔ کتاب بحیثیت مجموعی سبق آموز اور ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں جگہ پانیکی مستحق ہے لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ،

شہزادہ زرتاش[2]

یہ کتاب قصہ کے پیرایہ میں انسداد ملیریا اور کونین کے استعمال کے متعلق لکھی گئی ہے۔ مگر یہ پروپیگنڈا اس خوبی سے کیا گیا ہے، اور پوری کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھے بغیر دل نہیں مانتا۔ ہندوستان میں جہاں ملیریا کی منحوس بیماری سے لاکھوں آدمی ہرسال موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کتاب کا وسیع پیمانہ پر پڑھنا بہت مُفید ہوگا۔ اس کی زبان بھی سہل اور عام فہم ہے۔

رہنمائے تاریخ اردو[3]

عربی اور فارسی زبانوں میں کسی اہم واقعہ کی بذریعہ اعداد جمل تاریخ لکھنے کا فن قدیم سے رائج ہے۔ انھیں زبانوں کی تقلید میں یہ فن اُردو زبان میں بھی رائج ہوا۔ چنانچہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب ریٹائرڈ وکیل بنارس نے اس کتاب میں اس فن کی تاریخ لکھدی ہے۔ اسمیں حروف کے اعداد نکالنے کے قاعدے، تاریخی مادوں کی تمثیلیں، ہندوستان کے بادشاہوں اور مشہور ومعروف اُردو شاعروں کے متعلق بہت سے تاریخی قطعے درج کردئے گئے ہیں اور تقریباً ہر قطعہ تاریخ کی شانِ نزول بھی بیان کردی گئی ہے۔ جس سے یہ کتاب بہت دلچسپ ہوگئی ہے۔ اعداد نکالنے کے قاعدوں کی جو مثالیں دیدی گئی ہیں۔ ان سے سمجھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

---

[1] قیمت مجلد ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت پنجاب لاہور۔ [2] قیمت بارہ آنہ ملنے کا پتہ:- معارف پریس اعظم گڈھ

رفتار زمانہ

ہماری سالانہ کانفرنسیں

عرصہ دراز سے کرسمس کا ہفتہ ہندوستان کی ملکی و قومی کانفرنسوں کا ہفتہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اِدھر کئی سال سے کانگریس کا اجلاس کرسمس کے بجائے مارچ میں ہونے لگا ہے۔ اس کا ایک خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کی دوسری تحریکوں کے لئے اِس ہفتہ میں اچھی گنجائش نکل آئی ہے، پہلے ہر قسم کی تحریکیں اپنے اپنے جلسے کانگریس ہی کے ساتھ اسی مقام میں منعقد کیا کرتی تھیں جہاں کانگریس ہوتی تھی۔ بعض کانفرنسیں اور مقامات میں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں لیکن کانگریس کے سامنے تمام جلسے ماند پڑ جاتے تھے۔ اور عوام کو اُن کے ساتھ پوری دلچسپی کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ لیکن اب شکایت باقی نہیں رہی اور ہر تحریک کو اپنا واجبی حق ملنے لگا ہے۔ اِس سال بھی دسمبر ۱۹۳۹ء کے آخری ہفتہ اور جنوری ۱۹۴۰ء کے اول ہفتہ میں بیسیوں ضروری کانفرنسیں ہوئیں۔ چنانچہ اِس مضمون میں ہم انہیں سے چند خاص کانفرنسوں پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

سیاسی حیثیت میں سب سے اہم جلسہ آل انڈیا ہندو مہاسبھا کا کلکتہ میں مسٹر ساورکر کی صدارت میں ہوا۔ جس میں اِس سال معمول سے کہیں زیادہ رونق رہی، اور حاضرین کی تعداد بھی پچھلے تمام اجلاسوں سے بڑھ چڑھ کر رہی۔ پریسیڈنٹ صاحب کا استقبالی جلوس ڈیڑھ میل لمبا تھا اور تمام راستے سڑک سے لیکر مکانوں کی چھتوں تک لکھوکھا تماشائیوں سے کھچاکھچ بھرے تھے۔ سر منمتھ ناتھ مکرجی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ سر مکرجی اور مسٹر ساورکر کی قابلیت مسلّمہ ہے۔ چنانچہ دونوں صاحبوں کی تقریریں پُرزور اور پُرمغز تھیں۔

صدر استقبالیہ کمیٹی نے قدیم ہندو بزرگوں کے کارناموں کا ذکر کرکے مختصراً اس ترقی کی طرف اشارہ کیا۔ جو قدیم ہندوؤں نے ذہنی، اخلاقی اور روحانی غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں حاصل کی۔ ادبیات، فنون لطیفہ و صنعت و حرفت کی ترقی کے سلسلہ میں آپ نے کہا کہ "ہندوؤں نے کس طرح اپنی یہ عظمت کھودی۔ یہ میں نہیں بتا سکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں کی پھوٹ اور ذات کی سختیوں نے ان کو مسلمان اور عیسائی بنانیکی تبلیغی تحریکوں کو بہت تقویت پہونچائی"۔ مگر اسی کے ساتھ اگر سر مکرجی ان سختیوں کے بے جا اثرات دُور کرنے کی عملی تدابیر بھی بیان کردیتے تو بہت اچھا ہوتا۔ بہرحال مسلمانوں کی ذہنیت کو واضح کرتے ہوئے آپ نے پاکستان اور اس قسم کی دوسری اسکیموں کا بھی ذکر کیا۔ اور بعض واقعات حاضرہ کا حوالہ دے کر بتایا کہ بعض مسلمان لیڈران

دوسروں پر خواہ مخواہ حاوی ہوکر اپنے جا بیجا مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ کمیونل اوارڈ اور پوناپیکٹ کے سلسلہ میں آپ نے ان عظیم نقصانات کا ذکر کیا۔ جو بنگال کو خصوصاً برداشت کرنا پڑے۔ آخر میں آپ نے ہندوؤں سے ہندو مہاسبھا کے جھنڈے تلے جمع ہوکر منظم طور اپنے جائز حقوق کی حفاظت کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ ہندوؤں کو حتی المقدور دوسروں کے ساتھ مل کر (اگر وہ تعاون پر آمادہ ہوں) اور دوسری قومیں ان کے شریک نہ ہوں تو یہ تنہا۔ اور اگر اور لوگ مخالفت کریں تو اُن کی مخالفت کے باوجود قومی آزادی کیلئے سرگرم کار ہونا چاہئے۔

مسٹر ساورکر نے بھی نہایت صاف واضح اور دلیرانہ تقریر کی۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک کانگریس نیم قومی اصولوں پر چلیگی جیساکہ آجکل کررہی ہے۔ اس کی پالیسی ہندوؤں کے خلاف ہی رہیگی۔ اور ہندوؤں کے حقوق کو خواہ وہ کتنے ہی جائز اور برحق کیوں نہ ہوں، اس کی ذات سے برابر نقصان پہونچتا رہیگا۔ اس بیان کے ثبوت میں انھوں نے ریاست حیدرآباد کے متعلق کانگریس کے رویہ کو پیش کرکے اس کے مقابلہ پر کشمیر اور راجکوٹ کی تحریکوں کے ساتھ کانگریس کے رویہ کا ذکر کیا۔

آپ نے ہندو تحریک کے اصولوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں کے نزدیک سوراج سے مراد وہ راج ہے جسمیں اُن کی وطنی تہذیب کی تمام خصوصیات کو بلا کسی غیر عنصر کے غالب ہوئے اظہار کا موقع ملے۔ خواہ وہ غیر عنصر اس وقت خود ہندوستان کے ہوں یا باہر کے۔ مگر انھیں وطنی جذبات و خصوصیات پر غلبہ حاصل نہ ہونا چاہئے۔

مسٹر ساورکر کا نظریۂ قومیت کانگریس کے نظریۂ قومیت سے مختلف ہے۔ ہندو مسلم مسئلہ کا جو حل مسٹر ساورکر نے پیش کیا ہے وہ بھی قدرتاً کانگریس کے پیش کردہ حل سے مختلف ہے۔ اُن کی رائے میں موجودہ حالات میں ہندوستانی قومی حکومت کا یہی مفہوم ہوسکتا ہے کہ مسلم اقلیت کو ہندوؤں کے ساتھ برابر کے شہری حقوق حاصل ہوں، برابر کا تحفظ ہو، تعداد کے تناسب سے تمام حقوق حاصل ہوں اور ہندو اکثریت کسی غیر ہندو اقلیت کے جائز حقوق میں ہرگز مداخلت نہ کرے۔ لیکن بحیثیت اکثریت اسے اپنے حقوق سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔ جن کے برتنے کا اُسے جمہوری آئین میں جائز اختیار ہونا چاہیے۔

مسٹر ساورکر نے بار بار اس بات کو دہرایا ہے کہ بلا کسی تفریق مذہب و ملت سب لوگ برابر کے حقدار سمجھے جائیں۔ بشرطیکہ وہ ہندوستان کی مملکت کی خالص اور وفادارانہ متابعت کریں۔ چنانچہ سب باشندوں کو آزادیٔ تقریر و ضمیر و پرستش و جلسہ وغیرہ کرنے کے یکساں حقوق حاصل ہوں اور جو پابندیاں عائد کی جائیں، وہ صرف امن عامہ کے مفاد یا قومی ضرورت پر مبنی ہوں اور ان کا انحصار کسی مذہبی یا نسلی امتیاز پر نہ ہو بلکہ مشترکہ قومی بنیاد پر ہو۔ چنانچہ اُن کی رائے میں ہر اقلیت اپنے بچّوں کو خاص اپنی زبان میں تعلیم دینے کیلئے الگ اسکول کھول سکتی ہے۔ اپنے مذہبی اور تمدنی ادارے قائم کرسکتی ہے اور اُن کیلئے حکومت سے امداد بھی

حاصل کرسکتی ہے۔ لیکن یہ امداد اسی تناسب سے دی جائے گی جس تناسب سے وہ اقلیت مشترکہ خزانہ میں ٹیکس ادا کرتی ہے اُن کی رائے میں اکثریت کو بھی اسی اصول کے ماتحت امداد ملنا چاہیئے۔

اقتصادی حیثیت سے مسٹر ساورکر بڑے پیمانہ پر مشینری کے ذریعہ مال تیار کرنے کے حامی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ دستکاریوں کو بھی فروغ دینا چاہتے ہیں۔

مسٹر ساورکر کی باتیں بطور خود خواہ کتنی صحیح اور درست کیوں نہ ہوں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کے ایڈریس کا سب سے بڑا نقص اُن کا لب ولہجہ ہے۔ دوسرے ان کی تقریر سے ثابت ہوتا ہے کہ بے تعصبی اور رواداری کے متعلق ہندوؤں کی تاریخی روایات اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے قدیم طرزِ عمل کی نسبت اُنھیں سخت غلط فہمی ہے۔ بدقسمتی سے مسٹر ساورکر اور مسٹر جناح دونوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندو و مسلمان دو مختلف اور علیحدہ قومیں ہیں اور اُنمیں کبھی میل جول نہیں ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے نوّے فیصدی مسلمان قومی یا نسلی حیثیت سے کسی طرح ہندوؤں سے مختلف نہیں ہیں۔ اور رسم و رواج اور طور طریق کے لحاظ سے دونوں میں اب بھی بہت کچھ مشابہت ہے۔ البتہ پچھلے تیس سال کی سیاسی تحریکوں اور ہمارے قومی لیڈروں کی مصلحتوں نے دونوں میں بہت کچھ تفرقہ پیدا کردیا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا ملکی سوال یہ ہے کہ جو تفرقے پیدا ہوگئے ہیں یا پیدا کردئے گئے ہیں، وہ کس طرح دُور ہوں۔ ہم مانتے ہیں کہ فرقہ داری لیڈروں سے مصالحت کرنے کا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا وہ کامیاب نہیں ہوا لیکن اس کے متعلق مسٹر ساورکر کا پروگرام بھی کچھ کارگر ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ ہندو اور ہندوؤں کی جو تعریف اُنھوں نے کی ہے اُس کی رُو سے جنوبی ہند کے ہندو باشندے بھی نظرانداز ہوجاتے ہیں حالانکہ کم سے کم ہزار سال سے جنوبی ہندوستان، ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کا اصلی سرچشمہ ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے قطع نظر پریسیڈنٹ ساورکر کا ایڈریس حق و انصاف کی طرف تمام ہندوؤں کی موجودہ مایوسی کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے جو انھیں کانگریس اور گورنمنٹ دونوں سے ہوگئی ہے۔

ہندو مہاسبھا کا پہلا ریزولیوشن جو پاس ہوا۔ اسمیں کمیونل اوارڈ کی مذمت کی گئی اور اُسے قوم پرستی کی جڑوں پر کلہاڑا قرار دیا گیا۔ اور اہلِ ملک سے اس کی منسوخی کے لئے جدوجہد کرنے کی اپیل کی گئی۔ دوسرے ریزولیوشن میں حیدرآباد میں ستیہ گرہ کی کامیابی پر اظہار اطمینان کیا گیا۔ اور اس تحریک میں حصّہ لینے والوں کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ نظام گورنمنٹ کی اعلان کردہ اصلاحات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے ان پر فوری عملدرآمد ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اس بات کی درخواست کی گئی کہ ایسے ہندو مندر اور پرستش گاہیں جو مسجد بنادی گئی ہیں یا جنھیں کسی اور مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے ہندوؤں کو واپس کردی جائیں۔

ایک ریزولیوشن میں سکھر کے فرقہ وارانہ فسادات اور منزل گاہ ایجی ٹیشن کی مذمت کی گئی اور سندھ گورنمنٹ کی نکتہ چینی کی گئی کہ اُس نے ایجی ٹیٹروں سے انتہائی نرم سلوک کیا اور ہندو اقلیت کی جان ومال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا۔ کانفرنس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ سندھ کے فسادات کی تحقیقات کے لئے ایک غیر سرکاری کمیشن مقرر کیا جائے اور وہاں کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کے لئے فنڈ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے ایک ریزولیوشن میں وزارت بنگال کی فرقہ وارانہ پالیسی کی مذمت کی اور نا منصفی کی بیشمار مثالیں پیش کیں۔ کانفرنس نے ہندو سنگٹھن اور شدھی کی بھی تائید کی۔ اور ایک اور ریزولیوشن کے ذریعہ حکومت برطانیہ کو مرکز میں جلد سے جلد ذمہ وار حکومت قائم کرنیکا مشورہ دیا۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ فوج کی بھرتی میں بحالت موجودہ فوجی اور غیر فوجی قوموں کی جو تفریق برتی جاتی ہے وہ اٹھادی جائے اور قانون اسلحہ میں ترمیم کی جائے۔ ہندوستان کا سیاسی مقصد مکمل آزادی حاصل کرنا قرار دیا گیا اور اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ قانون ویسٹ منسٹر کے مطابق درجہ نوآبادیات کا فی الفور اطلاق کر دیا جائے۔

وائسرائے اور وزیر ہند کے ان بیانات کے خلاف پروٹسٹ کیا گیا جنمیں یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی آیندہ آئینی ترقی کا انحصار فرقہ وارانہ اتحاد اور اقلیتوں کے مسائل پر ہے۔

ہماری رائے میں ہندو مہاسبھا کو سیاسی جدوجہد کا کام کانگریس اور لبرل فیڈریشن وغیرہ ملکی جماعتوں پر چھوڑ دینا اور اپنی تمامتر توجہ ہندوؤں اندرونی اصلاح و ترقی کی کوشش و تدبیروں میں مرکوز کرنا چاہیے۔

نیشنل لبرل فیڈریشن

۲۷ دسمبر کو میوہال الہ آباد میں نیشنل لبرل فیڈریشن کا اجلاس ڈاکٹر آر۔ پی۔ پرانجپے کی زیر صدارت ہوا۔ آپ کی تقریر شروع سے آخر تک کانگریس کی مخالفت سے بھری ہوئی تھی۔ آپ نے سب سے پہلے کانگریس کے مقصد حصول آزادی کی نکتہ چینی کی۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ آجکل دنیا میں چھوٹی اور کمزور سلطنتوں کا جو اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتی ہیں کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر پرنجپے خوب واقف ہیں کہ موجودہ لڑائی چھوٹی قوموں کی آزادی کی حفاظت اور چھوٹے ملکوں کی خودمختاری قائم رکھنے کے لئے ہو رہی ہے۔ چنانچہ یہی سوال اسوقت دنیا کا سب سے اہم اور ضروری مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر ڈاکٹر پرانجپے کی تقریر سے یہ دلشکن نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر موصوف سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ ہمیشہ کسی بڑی طاقت سے وابستہ رہے۔ لیکن سلطنتیں کیسے بڑی ہوتی ہیں۔ آخر یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔ لیکن ابتدائی امور کے علاوہ ڈاکٹر پرانجپے کے ایڈریس کے اکثر حصے ایسے ہیں جن سے اکثر مدبرین کو اتفاق ہوگا مثلاً نمایندہ اسمبلی کے متعلق اُنھوں نے جن مشکلات کا ذکر کیا ہے ان کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت ڈاکٹر موصوف

کے ایڈریس کا وہ حصہ بہت زوردار ہے جسمیں خاص خاص امور کی نکتہ چینی کی گئی ہے لیکن اس کا تعمیری حصہ بہت کمزور ہے۔ مثلاً انھوں نے مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد و اتفاق پر بہت زور دیا ہے لیکن یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ یہ اتفاق کس تدبیر سے حاصل ہوسکتا ہے۔ آپ نے کھدر وغیرہ کے متعلق بھی کانگریس کے رویہ کی نکتہ چینی کی۔ اور اسمیں اکثر لوگ آپ کے ہمخیال ہیں۔ لیکن مہاتما گاندھی اس پروگرام کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اسمیں شک بھی نہیں کہ اسی پروگرام نے ملک کے عوام الناس کو کانگریس سے اسقدر وابستہ کردیا ہے اسی کی بدولت کانگریس ملک میں اس درجہ ہردلعزیز ہوگئی ہے اور اسوقت ہندوستان کی کوئی سیاسی جماعت اس کے مدمقابل نہیں ہے۔

انھوں نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا کہ کانگریس نے اگزیکٹو کونسل میں عوام کے لیڈروں کی نامزدگی کے متعلق وایسرائے کی پیشکش کو ٹھکرا کر ہندوستان کو آگے بیجانے کا ایک زرین موقع کھو دیا۔ اکثر مدبرین کا یہی خیال ہے لیکن یہ انکار ملک کے لئے واقعی مفید یا مضر۔ عنقریب ہی پورے طور سے معلوم ہوجائے گا۔ دراصل وائسرائے نے مشیرانہ کونسل کی جو تجویز پیش کی تھی وہ کسی طرح قابل التفات نہ تھی۔ البتہ اگزیکٹو کونسل کی توسیع کا مسئلہ ضرور قابل غور ہے۔ لیکن ابھی اس کے متعلق گفتگو ہورہی ہے۔ اس لئے اسوقت اس بارہ میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا ہے۔

کانگریس وزارتوں کی دست برداری کی وجوہ کے ضمن میں ڈاکٹر پرانجپے نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ برطانوی حکومت نے بہت مصلحت نااندیشی سے کام لیا۔ اور اس صداقت کو نظرانداز کردیا کہ ۱۹۳۹ء کا ہندوستان ۱۹۱۴ء کے ہندوستان سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر پرانجپے نے جنگ کے متعلق گورنمنٹ کے رویہ کو قطعاً غیر تسلی بخش قرار دیا اور جرمنی سے لڑنے والی جمہوریتوں کی حمایت کرتے ہوئے ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ وہ اس عظیم مقصد میں برطانیہ کی تہ دل سے مدد کریں۔ آپ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ آئین حکومت کو اس طرح پر ترمیم کیا جائے کہ صوبجاتی حکومتیں خودمختار حکومتیں بن جائیں۔ اور مرکزی حکومت فیڈریشن کی بنیاد پر قائم ہوجائے اور ہندوستان کو خودبخود ویسٹ منسٹر کا تشریح کردہ درجۂ نوآبادیات حاصل ہوجائے۔

فیڈریشن کے دوسرے اجلاس میں معمولی ریزولیوشن پاس ہوئے اور ان کی تحریک و تائید میں اچھی اچھی تقریریں ہوئیں۔ انمیں فوجی مسئلہ پر آنریبل پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی تقریر بہت ہی قابل قدر تھی۔ دراصل کنزرو صاحب کو اس مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی ہے جس کی وجہ سے آپ اس کے ماہر خاص ہوگئے ہیں۔ کنور سر مہاراج سنگھ صاحب اور مسٹر پرکاش نرائن سپرو کی تقریریں بھی غور سے پڑھنے کے لائق ہوئیں۔ اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر پنڈت اقبال نرائن گرٹو کا خیر مقدمی ایڈریس شروع سے آخر تک ایک سچے محب وطن

کے شایانِ شان تھا۔ لیکن لبرل فیڈریشن کی کارروائی پر مجموعی حیثیت سے غور کرنے کے بعد ہم یہی کہیں گے کہ ہندوستان کی لبرل پارٹی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کے لیڈر اپنے زاویۂ نگاہ کو وسیع کریں۔ انگلستان کی لبرل پارٹی تو بہت کچھ بدل چکی ہے لیکن یہ حضرات ابھی گلیڈسٹون کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھے۔

کانفرنس اعداد و شمار

خوشی کی بات ہے کہ کچھ عرصہ سے سیاسی کانفرنسوں کے علاوہ علم و ادب، سائنس۔ تاریخ و اقتصادیات وغیرہ کو ترقی دینے والی تحریکیں بھی شروع ہو گئی ہیں۔ چنانچہ تین سال سے شمار و اعداد کے متعلق بھی ایک کانفرنس ہو رہی ہے جسکا تیسرا سالانہ اجلاس اس مرتبہ مدراس میں ہوا۔ اس کا افتتاح ہز ایکسیلنسی گورنر مدراس نے ۲ر جنوری کو کیا۔ تقریباً سوا سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ ہز ایکسیلنسی نے اپنی تقریر کے دوران میں ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا جو گہرا تعلق اعداد و شمار سے ہے اس پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کا علم ابھی تک ابتدائی درجے سے آگے بڑھ نہیں سکا۔ اس لئے اس کو ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ کی اقتصادی پیچیدگیوں کے لحاظ سے کوئی مسئلہ اعداد و شمار کی مدد کے بغیر حل کیا جائے گا تو وہ حل محض قیاس آرائی پر مبنی ہوگا۔ دورِ حاضرہ کے اقتصادیات کسی کے بس میں نہیں ہیں۔ بلکہ بین الاقوامی اقتصادیات سے کچھ اس طرح وابستہ ہیں کہ انکو سلجھا کر سمجھ لینا ہمارے امکان سے باہر ہو گیا ہے۔ کھیت سے زیادہ مال کی پیدائش، دولت کی غیر مساوی تقسیم، کساد بازاری کا دور دورہ وغیرہ آجکل کے اقتصادی مسائل ہیں۔ جن کے حل کرنے کے لئے ان کے اسباب اور ان کا علاج تجویز کرنے کے لئے شمار و اعداد سے مدد لینے کی ضرورت رہتی ہے۔ موجودہ صدی میں اکثر پنجسالہ دہ سالہ پروگرام مرتب رہتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ مرض کا علاج مرض سے بدتر ہے (غالباً ممدوح کا اشارہ روس کی قائم شدہ اشتراکیت سے ہے جس کا مدمقابل برطانوی نظام ہے) واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی اسکیمیں سب سے پہلے روس ہی نے مرتب کی تھیں۔ مگر اب تو اس کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ اب کوئی حکومت یا کوئی سیاسی رہنما ایسا باقی نہیں بچا جس نے اس قسم کی اسکیمیں بنائی نہ ہوں۔

مسٹر گری نے جو اس کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ اپنی تقریر میں اس بات کی ضرورت ظاہر کی کہ ہر صوبہ میں بلکہ تمام ملک کے لئے ایسا قانون پاس ہونا چاہئے۔ جس کی رو سے معینہ وقفوں کے بعد اعداد و شمار فراہم ہوتے رہیں۔ اسی قسم کی سفارش ۱۹۲۵ء کے اقتصادی تحقیقاتی کمیشن[۲] اور مزدوری کے متعلق شاہی کمیشن[۳] نے بھی کی تھی۔

واقعی اعداد و شمار کی باضابطہ فراہمی کا کچھ نہ کچھ ضرور انتظام ہونا چاہئے بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ گورنمنٹ ہند

---

[۱] Indian Statistical Conference

[۲] Economic Enquiry Commission of 1925

[۳] Royal Commission on Indian Labour.

کی طرف سے اِس کا باقاعدہ دفتر قائم کر دیا جائے۔ اب تک یہ کام نجی حیثیت سے ہوتا رہا ہے اور اُس کے کارکنوں کو اہلِ ملک سے کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ بلکہ معمولی معمولی اطلاعات بہم پہونچانے میں بھی عوام کی طرف سے پس و پیش ہوتا ہے اور صحیح معلومات فراہم نہیں ہونے پاتیں۔ ان حالات میں اکثر اقتصادی معلومات پر صحیح رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

انڈین اکنومک کانفرنس

امسال انڈین اکنومک کانفرنس کا اجلاس پنڈت جواہرلال نہرو کی زیر صدارت ہوا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ دُنیا کا موجودہ نظام ٹوٹ رہا ہے گو ابھی تک یہ بات صاف طور پر معلوم نہیں ہوئی کہ اس نظام کی جگہ دوسرا کونسا نظام قائم ہوگا۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ جہاں تک نظامِ عالم کا تعلق ہے، اُس میں دولت کی تقسیم کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پیداوار کا معاملہ دُنیا کیلئے طے ہو چکا ہے گو ہمارے ملک میں غیر ملکی حکومت کی موجودگی کی وجہ سے یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان کو اس مسئلہ کے علاوہ دولت کی تقسیم کا مسئلہ بھی حل کرنا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ توجہ اسی مسئلہ کو دینا ہوگی۔ اِس لئے یہی مسئلہ نیشنل پلیننگ کمیٹی کے سامنے سب سے زیادہ غور طلب ہے۔ ممدوح نے کہا کہ یہ کمیٹی فیکٹریاں قائم نہ کرے گی۔ کیونکہ اس کو یہ منظور نہیں کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ مزید مفادات میں اضافہ ہو۔ دراصل یہی سب سے اہم مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس کے حل کرنے کیلئے کمیٹی کو یہ اختیار ہونا چاہئے کہ وہ اپنے فیصلوں کو عملی صورت دیسکے مگر یہ اُس وقت تک نہ ہوگا جب تک مُلک کو سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، مگر اس وقت ہم کو سیاسی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اِس لئے فی الحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ کمیٹی محض خیالی پلاؤ پکا کر دماغی شقیں حل کر رہی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کو بڑے پیمانہ کی صنعتوں، نیز چھوٹے پیمانہ کی دیہاتی صنعتوں کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات میں دیہاتی دستکاریوں کی ترقی کی اشد ضرورت ہے اور بڑے پیمانہ والی صنعتوں کی گنجائش کے لئے ابھی ایک پُشت کا وقفہ ہے مگر اس وجہ سے ان صنعتوں کی اہمیت کو فروگذاشت نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان کے بغیر ملک کی آزادی برقرار نہیں رہ سکتی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ محض سیاسی جمہوریت ناکامیاب ثابت ہوئی ہے اس لئے اس کو اقتصادی جمہوریت سے وابستہ کر کے کامیاب بنانا چاہئے اور اُسے سوشلزم کی بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔ آپ نے کہا کہ گو روس کا نظام کئی وجوہ سے بدنام ہو گیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی بنیاد صحیح اقتصادی اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔

اکنومک کانفرنس نے جو خاص راگ الاپا، وہ اقتصادی بین الاقوامیت کی ضرورت کا راگ تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ قومی تنگ نظری نے بین الاقوامی تجارت اور مالیات کی راہیں مسدود کر دیں۔ اور بالآخر ایک ہنگامہ

برپا ہونے کا سامان پیدا کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر جینؔ کی یہ رائے ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ناکامیاب ہو چکے ہیں۔ اور اب دُنیا کو ایک نئے نظام کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو مہاتما گاندھی کی تحریک چرخہ اور عدم تشدد کے پیام میں ایک کامیاب نظامِ عالم کا امکان نظر آتا ہے لیکن اُنھوں نے اس مسئلہ کی کوئی قابلِ اطمینان وضاحت نہیں کی ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ اور اُردو کانفرنس

۲۹ دسمبر کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پچاسواں اجلاس، نواب کمال یار جنگ بہادر صاحب کی صدارت میں محمد علی پارک کلکتہ میں منعقد ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال تھے جنھوں نے اپنے خیر مقدمی ایڈریس میں فرمایا کہ ۱۸۸۶ء سے جب سر سید احمد خاں نے اس کانفرنس کو قائم کیا تھا۔ اب تک مسلمانوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور تعلیم میں ترقی کی۔ آپ نے فرمایا کہ علیگڈھ کی تحریک نہ ہوتی تو نہ تو مسلم لیگ ہی ہوتی اور نہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمان " ایک آزاد کلچر" کے مالک ہوتے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ تعلیمی ترقیوں اور "کلچر" کو برقرار رکھنے کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جتنی سخت ضرورت آج ہے اتنی کبھی نہ تھی۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے واسطے کیا کیا نئے خطرے پیدا کر دئے گئے ہیں۔ وار دھا اسکیم پر اعتراضات کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مسلمان ایسی تعلیم کی حمایت نہیں کر سکتے جو موجودہ تہذیب کو زمانۂ جہالت کی تہذیب میں ڈھال دے۔ اس کے علاوہ اس اسکیم میں مسلمان بچّوں اور بچیوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ آپ کی رائے میں اس اسکیم کا مقصد اہنسا کی تحریک کی اشاعت اور اسلام کو نقصان پہونچانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تجاویز جو پاس ہوئیں اُن میں ماہرین کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی ہے اور اس کو ایک ایسا "نظام تعلیم" مرتب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو ہندوستانی قومیت کو حتی الامکان مجروح کئے بغیر اسلامی روایات کو برقرار رکھ سکے اور اُن کی معاشی ضروریات کو بھی پُورا کرے۔

صاحب صدر نے اپنی آخری تقریر میں خیرات، زکوٰۃ اور اوقاف کی تنظیم پر بھی زور دیا۔ ہمارے خیال میں اگر ہندو مسلمان اپنے اپنے اوقاف کا مناسب انتظام کر سکیں تو شاید ان کی بہت سی قومی و تعلیمی ضروریات آسانی سے پُوری ہو جائیں۔

اس کانفرنس میں سر شاہ محمد سلیمان صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے علیگڈھ میں ایک صنعتی کالج قائم کرنے کی اپیل کی جس کے لئے کئی قابلِ قدر عطیات مل چکے ہیں۔ زلزلہ ترکی کی امداد کے لئے بھی کانفرنس میں دس ہزار کا چندہ جمع ہوا۔ اس کانفرنس میں اُردو زبان کی ترقی کا ذکر بھی خصوصیت سے ہوا۔ اور اسی ضمن میں ایک اُردو کانفرنس سید سلیمان صاحب ندوی کی صدارت میں ہوئی۔ جسمیں موصوف نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ اور کانفرنس میں کئی

تجویزیں پاس ہوئیں جنمیں سب سے اہم تجویز بنگلہ زبان کو اُردو طرز تحریر میں لکھنے کی تجویز تھی۔ صاحب صدر نے اپنی تقریر میں زبان کے متعلق قریب قریب سب مسائل پر اظہار خیالات کیا۔ لیکن تقریر میں ایک لائق وکیل کی بحث کا رنگ پیدا ہوگیا ہے اور اس کا لہجہ بھی سیاسی پارٹی بندی سے بالاتر نہیں ہے۔ اس پر بھی زبان کے مسائل سے دلچسپی لینے والے اصحاب کے لئے یہ تقریر غور سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے۔ اس کانفرنس کے علاوہ انھیں دنوں انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا اُردو کانفرنس دہلی میں نواب مہدی یار جنگ صاحب وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ہوئی۔ کانفرنس میں مختلف زیر ریزولیوشن پاس ہوئے۔ مثلاً نئے لفظوں، اصطلاحوں اور دوسرے اختلافی مسئلوں کے متعلق بعد غور و مشورہ مناسب فیصلہ کرنے کی غرض سے انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام بائیس ۲۲ اصحاب کی ایک مجلس ادب قائم کی گئی۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دینے کی درخواست کی گئی۔ اُردو میں ٹائپ کے رواج کی سفارش کی گئی۔ قانونی اسمبلیوں کے ممبروں سے اُردو میں تقریریں کرنے کی درخواست کی گئی۔ ملک کے تمام قومی، نیم سرکاری دفتروں اور تجارتی کارخانوں سے حتیٰ الامکان اُردو میں خط و کتابت کرنے اور حسابات رکھنے کی اپیل کی گئی۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے خبروں اور تقریروں میں عام فہم اُردو الفاظ استعمال کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ سے درخواست کی گئی کہ پہلی جماعت سے لیکر میٹریکولیشن تک صرف اُردو ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور طالب علموں کے انگریزی کے پرچے کے سوا اور تمام مضامین کے پرچے اُردو میں حل کرنے کی ہدایت کی جائے۔ صوبہ متوسط کے ہر حلقہ اور رقبہ میں مناسب تعداد میں اُردو اسکول قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور مدراس گورنمنٹ سے درخواست کی گئی کہ ہر سرکاری و امدادی اسکول جسمیں کم سے کم دس طالب علم اُردو پڑھنے والے ہوں اُردو کے ذریعہ تمام مضامین پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔

اس کانفرنس کی صدارتی تقریر میں تو کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ مگر لیڈران ملک نے انجمن ترقی اُردو کے نامور سکرٹری کے نام جو پیغامات بھیجے ہیں، وہ بہت قابل قدر ہیں۔ مہاتما گاندھی نے مولوی عبدالحق صاحب کے نام اپنے ہاتھ سے اُردو حروف میں خط لکھا جسمیں اپنے عدم حاضری کی معافی مانگتے ہوئے جلسہ کی کامیابی کی دعا مانگی اور یہ لکھا کہ میں اُردو زبان کی ترقی چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اُردو سیکھیں اور اسی طرح مسلمان ہندی سیکھیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے معذرت نامہ میں اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ اُردو کی ترقی یا ہندی کی ترقی کو ایک دوسرے کا مخالف خیال کیا جاتا ہے۔ اُنکی رائے میں ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کی اعانت کرنا اور آپسمیں قریب ہونا چاہئے۔ ان کے لکھنے کے حروف اگر الگ الگ رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن دونوں مل کر ایک عظیم الشان مشترکہ زبان کی صورت اختیار کریں اور اس کے ساتھ ہی دونوں کے موجودہ اسلوب بیان کو جو اپنی اپنی خصوصیات اور تاریخی حالات سے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے کی مزاحمت کئے بغیر نشو ونما پانے کا موقعہ دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ گو یہ خواہش اجتماعِ ضدین معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے اور دونوں زبانیں ایک دوسرے کو مالا مال کر سکتی ہیں؛

ہمارا بھی یہی اعتقاد ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُردو کے ترقی خواہ جب تک اِس حقیقت کو (جس کی طرف پنڈت نہرو نے اپنے پیغام میں اشارہ کیا ہے) بخوبی ذہن نشین نہ کریں گے وہ ملکی خدمت کے راستہ سے بھٹکے ہوئے رہیں گے۔ اس وقت ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اُردو کی توسیع و ترقی کا کام حُبِ وطن کی بنیاد پر اور مُلک کی کسی دوسری زبان سے کد و کاوش رکھے بغیر انجام دیا جائے۔ اُردو کی حمایت کو سیاسی اختلافات کا رنگ دینا بھی کچھ مُفید نہ ہوگا۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اِس وقت بعض حامیانِ اُردو کانگریس سے خواہ مخواہ بدظن ہو کر دانستہ یا نادانستہ فرقہ وارانہ سیاسی تحریکوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ چنانچہ پریس اور پلیٹ فارم، دونوں سے مسلسل ایسی شکایتیں سُننے میں آرہی ہیں گویا کانگریس نے اُردو کا گلا گھونٹنے کا تہیہ کر لیا ہے، حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو کانگریس وزارتوں سے سبھی دیسی زبانوں کو بیحد فائدہ پہونچا ہے۔ بیشک بعض لیڈران کانگریس "ہندستانی" زبان رائج کرنا چاہتے ہیں لیکن اسمیں ان کا یہی مقصد ہے کہ وہ علم کی روشنی جلد سے جلد اور آسان سے آسان طریقے سے عوام تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ مگر احباب کی بدگمانی کا یہ حال ہے کہ مہاتما گاندھی نے حامیانِ اُردو کو خوش کرنے کے خیال سے دہلی کانفرنس کے لئے خود اپنے ہاتھ سے اُردو حروف میں اپنا پیغام لکھ کر بھیجا۔ لیکن انجمن ترقی اُردو کے پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" نے اُس کی نہایت حوصلہ شکن نکتہ چینی کی۔ اسی طرح ہمارے معزز ہمعصر "ہمایوں" لاہور نے پنڈت پیارے لال شرما سابق وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کے استعفا کے متعلق ایک بے سروپا قصہ شائع کیا ہے کہ اُن کو اپنے عہدہ سے اس لئے علیحدہ ہونا پڑا کہ دیگر وزرائے صوبہ اُردو کو کُند چھری سے ذبح کرنا چاہتے تھے مگر انھوں نے اس کا گلا کاٹنے سے انکار کر دیا۔ خود پنڈت صاحب موصوف نے اس قصہ کی پُر زور تردید کی ہے۔ لیکن ابھی تک ہمارے معزز ہمعصر نے اس تردید کو شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم کو یہاں پر کسی کی وکالت کرنا منظور نہیں ہے لیکن ہمارا یہ ضرور یقین ہے کہ اُردو کی ترقی خود اُردو دان جماعت کے ہاتھ میں ہے اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ عام شایقین اُردو میں علمی قدر دانی کا جذبہ پیدا ہو اور ہمارے ادیب مُلک کے تبدیل شدہ حالات کا لحاظ رکھیں۔ اس کے لئے ہم کو پروپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس پروپیگنڈا کا رنگ معاندانہ رہیگا تو اس سے فائدہ کے بجائے اُلٹا نقصان پہنچیگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حامیان اُردو کا وہی رویہ ہے جو ایک عاشقِ صادق کا ہوتا ہے یعنی "عشق است و ہزار بدگمانی"۔

ہماری ناچیز رائے میں اُردو کو اسوقت ایسے لیڈران کی ضرورت ہے جو عاشقِ صادق کے بجائے حکیم حاذق ہوں

شیعہ پولیٹیکل کانفرنس

دسمبر گزشتہ میں اور بھی بہت سی کانفرنسیں ہوئیں۔ جن میں دو فرقہ وارانہ کانفرنسوں کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ چھپرا (بہار) میں آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کا آٹھواں اجلاس سید کلب عباس علی صاحب، ایم۔ ایل۔ سی، وکیل رائے بریلی کی صدارت میں ہوا۔ آپ نے اپنی صدارتی تقریر میں شیعہ سنی جماعتوں میں امن و صلح قائم ہونے کی اپیل کی۔ اور گو اقتصادی پروگرام کے متعلق آپ نے شیعہ جماعت کو کانگریس و مسلم لیگ دونوں کے دوش بدوش چلنے کی ہدایت کی۔ لیکن کونسل و اسمبلی کے انتخابات کے لئے آپ نے مشترکہ طریقہ انتخاب کی حمایت کی۔

کرسچین کانفرنس

آل انڈیا کرسچین کانفرنس میں، جس کا پچھلا اجلاس ناگپور میں ہوا، جو تجویزیں پاس ہوئیں۔ اُن پر ہر بہی خواہ ملک اظہار اطمینان کر سکتا ہے۔ ہندوستانی عیسائیوں نے اِس کانفرنس میں اس امر کو بخوبی واضح کر دیا ہے کہ وہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہندوستان کا آئین قومی نقطۂ خیال سے تیار کیا جائے۔ ہندوستانی عیسائی ہندوستان کی آزادی کے طلبگار ہیں۔ ہاں اُن کا یہ ضرور خیال ہے کہ متحدہ قومیت اُس وقت تک نہیں بن سکتی۔ جب تک ملک کے باشندے مذہب و ملت کے خیالات سے بالاتر ہو کر ملک سے وفاداری کا اظہار نہیں کرتے۔ اِس کانفرنس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہر شخص کو اپنے مذہب اور طریقہ عبادت کے تبدیل کرنے کی پوری آزادی ہونا چاہیئے۔

مراسلات

لکھنؤ
۹ فروری

محترمی تسلیم۔ جنوری ۱۹۴۰ء کا نسخہ آیا۔ اُس میں دو مقالے ادبی حیثیت سے خاص طور سے پڑھے جانیکے قابل ہیں۔ پہلا مقالہ وہ ہے جس کا عنوان ہے "تذکرہ نویسوں کی اہم فروگذاشتیں" اور دوسرا مقالہ "یادِ رفتگاں" ہے۔

پہلا مضمون گویا ایک اہم کڑی ہے اُس تاریخی مباحثہ کے سلسلہ کی جسے محترم برق بریلوی نے شروع کیا ہے، اور جناب "حق پسند" صاحب نے اُس میں چار چاند لگائے ہیں۔

جناب برق بریلوی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمان تذکرہ نویسوں نے ہندو شعرا کی بہت زیادہ حق تلفی کی ہے۔ اپنے تذکروں میں یا تو انھیں بالکل نظر انداز کر دیا ہے یا اگر ذکر کیا ہے تو بہت ہی معمولی طور سے۔

اس کے مقابلہ میں "حق پسند" صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ اُردو کا جو ماحول رہا ہے اور جن اثرات کے سایہ میں اُس کی نشوونما ہوئی ہے اُن سے ہندو کبھی مانوس نہیں ہو سکے اِس لئے اُردو شاعری میں کسی ہندو کو کوئی

خاص امتیاز ہی حاصل نہ ہو سکا۔ ذکر ہوتا کہاں سے؟

میرا ذاتی رجحان جناب برقؔ بریلوی کی طرف ہے۔ ہندو شعراء اور اُدباء کی ہمارے مسلمان تذکرہ نگاروں کے ہاتھ سے کسی نہ کسی قدر حق تلفی ضرور ہوئی ہے۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ ان سے اسوقت بحث کرنا نہیں چاہتا۔

اِس سلسلہ میں جناب رفیقؔ مارہروی نے جنوری کے زمانہ میں تذکرہ نویسوں کی اہم فروگذاشتوں کے عنوان سے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ بہت توجہ سے پڑھے جانیکے لائق ہیں۔ اِس سے جناب برقؔ بریلوی کی شکایتوں کا بڑی حد تک جواب نکل آتا ہے اور کم سے کم یہ تو معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ اُن فروگذاشتوں کا سبب مذہبی تعصب نہیں تھا۔

اِس تحقیقی مقالہ میں ایک جگہ یہ عبارت ملتی ہے:۔

"جیون مل نامی ایک قدیم شاعر گذرے ہیں۔ اُن کا تخلص عشاقؔ تھا۔ تمام تذکروں میں صرف اُن کا یہ تخلص اور شعر ملتا ہے۔ منشی لچھمی نراین شفیقؔ اُن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"از قوم کھتری ہندوستاں است۔ از تخلص او معلوم می شود کہ بہرۂ از علم نمی دارد"

انیسؔ صاحب نے شفیقؔ کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"تخلص دیکھ کر تردد ضرور ہوتا ہے لیکن عشاقؔ کا شعر اس مشکل کو بھی حل کر دیتا ہے۔ شاعر کا جب پورا حال نہیں معلوم اور صرف اُس کا ایک شعر اور نام دستیاب ہوتا ہے تو ضرورت اس کی تھی کہ اس شعر پر غور کر کے کوئی مناسب رائے قائم کی جاتی۔ عشاقؔ کا شعر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک ظریف شاعر کے دل و دماغ کا نتیجہ ہوں۔ لہذا ایک ظریف شاعر کے لئے "بہرہ از علم نمی دارد" کہہ دینا کہاں کا انصاف ہے"

مرحوم شفیقؔ کے اِس جملہ کا مطلب واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ "از تخلص او معلوم می شود کہ بہرۂ از علم نمی دارد" شاید اُن کا خیال یہ ہو کہ جیون مل نے "عشاقؔ" کو مبالغہ کا صیغہ سمجھ کر تخلص قرار دیا۔ حالانکہ "عشق" سے "عشاق" مبالغہ کا صیغہ مستعمل نہیں ہے۔ اِس لئے یہ اُن کی بے علمی کی نشانی ہے یا پھر شفیقؔ صاحب نے یہ خیال کیا ہو گا کہ "عشاق" عاشق کی جمع ہے اِس لئے ایک واحد شخص کا ایسا تخلص اختیار کرنا جو جمع کے معنی دیتا ہو غلطی ہے اور شاید فاضل مقالہ نگار نے تخلص کی یہ "اعجوبگی" جیون مل صاحب کو ظریف شاعر قرار دے کر رفع کرنی چاہی ہے۔ لیکن میری گذارش یہ ہے کہ "عشاق" کے معنی ایک راگ کے بھی ہیں، جو دن ڈھلے گایا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں "عشاق" تخلص رکھنا بے علمی کی دلیل کیونکر ہو سکتا ہے؟ نغمہ و شعلہ و خندہ وغیرہ قسم کا یہ بھی ایک تخلص ہے۔

دوسرا مضمون "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے اُردو دُنیا کے مایۂ ناز فرد جناب پنڈت منوہر لال زُتشی ایم۔ اے کا لکھا ہوا ہے۔ یوں تو شروع سے آخر تک یہ مضمون دلچسپ ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ یہ "لذیذ حکایت" ابھی اور دراز ہوتی مگر اِس سلسلہ میں محترم مضمون نگار نے شعر و شاعری کے متعلق جو بعض نہایت ہی حکیمانہ باتیں ارشاد

فرمائی ہیں، ضرورت ہے کہ نوجوان ادیب اور نقاد انھیں آویزۂ گوش بنائیں۔

ایک جگہ آپ نے فرمایا ہے اور کس قدر سچ فرمایا ہے کہ "محض خیالاتِ عالی کا نظم کر دینا شاعری نہیں شاعری میں نئے اور بلند خیالات سے زیادہ زبان کی لطافت ضروری ہے اگر شاعر اسلوبِ بیان کے اصول سے ناواقف ہے اگر وہ الفاظ کو ترکیب دینا نہیں جانتا۔ اور جو چیز وہ نظم میں کہتا ہے وہی چیز اُس سے بہتر نثر میں کہی جا سکتی ہے تو وہ ناظم کسی پایہ کا واعظ اور حکیم کیوں نہ ہو شاعر نہیں ہو سکتا۔"

آجکل کے نئے ادیبوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مخصوص سیاسی نظریہ کے ماتحت شاعری کو جانچا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اگر مارکس اور انجیلز کے خیالات سے اثر لیتے ہوئے شعر و نظم کا کالبد تیار کیا جائے تب تو وہ قابل التفات ہے ورنہ نہیں لیکن حقیقۃً یہ خیال چمنستان شاعری میں سبزۂ بیگانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ "شعریت" کا نشیمن سیاسی نظریوں اور خالص فلسفیانہ افکار میں نہیں ہے۔

مٹے گی مٹے گی یہ سرمایہ داری — گرے گی گرے گی عمارت یہ ساری

یہ ہو کر رہے گا یہ ہو کر رہے گا

"تبلیغِ ادب" کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے شعر کہنا درحقیقت "شاعری" کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ گذشتہ زمانہ میں بھی بہت سے افراد نے صرف و نحو اور منطق و فلسفہ کے مسائل کو نظم کا جامہ پہنایا ہے لیکن اسے شاعری نہیں کہا جا سکتا۔

اگر ایک ناظم اُسلوبِ بیان کے نکتوں سے واقف نہیں۔ اگر الفاظ کو حسن سے ترتیب دینا وہ نہیں جانتا۔ اگر اُسے اِس کا سلیقہ نہیں ہے کہ اچھوتی تشبیہوں اور لطیف استعاروں سے کام لے سکے تو اُسے کتنا ہی فلسفہ پر عبور ہو۔ وہ کتنا ہی مارکس، انجیلز اور لینن کی تصنیفات کا حافظ ہو لیکن وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔

اِس قسم کی نظمیں "نثر منظوم" کے نمونے تو ضرور کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن ادب کی محفل کو شاعری کے گلدستوں سے آراستہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان خالص سیاسی نظریات کے ماتحت طرز ادا اور اُسلوبِ بیان کی لطافتوں سے بیگانہ ہو کر شعر و ادب کے جو سکّے ڈھالے جا رہے ہیں وہ مقبول نہیں ہیں۔ حد یہ ہے کہ خود اُس سرزمین میں جو اشتراکیت کا گہوارہ ہے، شیکسپیر کے ڈرامے اُن کے نئے ادبی سکون کے مقابلہ میں زیادہ ہر دلعزیز ہیں۔ نئے ادیبوں کے لئے روش کے اِس عام پسندیدگی کے میلان کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اگر وہ اس کا تجزیہ کریں گے تو بہت ممکن ہے کہ صحیح صورت حال سمجھ میں آ جائے اور شاعری کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے وہ رفع ہو جائے۔ آتش مرحوم نے بالکل سچ کہا ہے ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں — شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

سید اختر علی تلہری
جوبلی کالج لکھنؤ

زمانہ

جلد ۷۴ — مارچ سنہ ۱۹۴۰ء — نمبر ۳

"تم"

(از پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن چکا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم
تمھیں خیال کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں امید کی رعنائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روح کی گہرائیوں میں دیکھا ہے
جدھر بھی آنکھ اُٹھی ہے فروغِ بام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

ہر اِک اُمید کا میری تمھیں ہو گہوارہ
تمھیں ہو جیسے ہر اِک درد کا مرے چارہ
تمھیں پہ آکے ٹھہرتی ہے چشمِ آوارہ
ہر ابتدائے تمنا کا اختتام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

میں کون؟ اِک گلِ افسردہ و دلِ ناشاد
تم ایک بزم کی زینت، تم اِک چمن کی مراد
کہاں تم اور کہاں مجھ سا زندگی برباد
مرے نصیب کی جس میں نہیں وہ جام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

اُفقِ حیات کا پھر بھی تمھیں سے ہے زرّیں
ہر ایک بزمِ تصوّر تمھیں سے ہے رنگیں
تمھارے سمت ہے دل کی نگاہِ بازپسیں
اندھیری زیست کی اِک زرنگار شام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

کروں میں عرضِ تمنا، مری مجال نہیں
سوال دل میں ہے اور جرأتِ سوال نہیں
تمھاری یاد سے غافل مگر خیال نہیں
مَیں کچھ کہوں نہ کہوں، حاصلِ کلام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

خموشیوں میں ہے دمساز کون؟ تم جو نہیں
نظر نظر کا مری راز کون؟ تم جو نہیں
نفس نفس کی ہے آواز کون؟ تم جو نہیں
پیامبر ہوں اگر مَیں مرا پیام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا
جو سر کبھی کسی چوکھٹ پہ آج تک نہ جھکا
تمھارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا، جہان کا مُلّا سے انتقام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم

بنگالی شاعری

از سید ظہیر الدین علوی ایم۔ اے (فارسی) ایم۔ اے (اردو) ایل ایل۔ بی (علیگ) لکچرار شعبۂ اردو
(مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

ادب اردو کی طرح بنگالی ادب کی ابتدا بھی شاعری سے ہوئی۔ مذہب کو بنگال اور اہل بنگال پر بڑا تسلط حاصل تھا۔ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے، رسم ورواج، سیر وتفریح، غرض ہر انسانی مشغلہ میں اس کو دخل تھا۔ اس لئے دیوتاؤں کی مدح سرائی اور دعا کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے گیت بنائے گئے، جو مرد وزن مل کر کورس کی شکل میں گایا کرتے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے گیتوں میں ردیف وقافیہ کی کوئی قید نہ تھی لیکن فن موسیقی سے ضرور تعلق تھا۔ کیونکہ ان کا مقصد ہی گایا جانا تھا۔ اس زمانے کے کوی (شاعر) ان کے بنانے میں تال سُر کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ یہ گیت تصنع سے معرا اور مذہبی خیالات سے پُر ہوتے تھے۔ ان کی صداقت ان کی سادگی میں چار چاند لگاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہی مختصر گیت طویل افسانوں میں تبدیل ہو گئے، جن کی مثال دھرم منگل، کلاکیتو، چنڈی داس وغیرہ ہیں
چنڈی داس محبت کی عمیق گہرائیوں تک جاتا ہے اور کوئی پہلو نظر انداز نہیں کرتا۔ اُس کا ایک شعر سُنیئے:۔

پُرُو شُونگے نام شُنِی درُو بُوائے ہِیا
پُولک ڈھاکِی تے نانا کو رے پُرکار

یعنی اگر میرے محبوب کے سامنے کوئی میرا نام اتفاقیہ لیتا ہے تو اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا ہے، اور وہ بیکار اِس کیفیت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

اِسی شاعر نے مجنونانہ کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے ع

پودو چِنہ چُمبِئے کان

یعنی مَیں دیوانہ پن میں اُس کے نقش قدم کا بوسہ لیتا ہوں۔ اُردو شاعری اور فارسی شاعری میں بھی یہ خیال موجود ہے، لیکن عاشق کے نقش پا سے محض بے بسی اور بےکسی کا اظہار مقصود ہوتا ہے مثلاً بیٹھے ہیں نقش پا سے تری رہگذر میں ہم

یا اگر محبوب کا نقشِ پا ہے تو اُس میں بھی محبوب کا بانکپن ہونا ضروری ہے مثلاً ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

بنگال اپنی سرسبزی اور شادابی کے باعث نہایت زرخیز خطہ ہے۔ شاید ہی کہیں چپہ بھر زمین ایسی ملے جو بنجر ہو۔ اس لئے اس کی آبادی نوّے فیصدی کسانوں پر مشتمل ہے اور ہمیشہ سے یہی پیشہ رہا۔ لہٰذا مذہب کے بعد اگر کسی دوسری چیز نے اہلِ بنگال کے دل و دماغ پر اثر کیا تو وہ اُن کے کھیت، اُن کی پیداوار، دریا، ابرِ باراں، دھوپ وغیرہ تھی۔ اور یہی چیزیں ہیں جن سے بنگال کی شاعری لبریز ہے۔ کسان دن بھر اپنے کھیتوں پر کام کرتے، شام کو گاتے، پوجا اور برت رکھ کر دیوتاؤں کو خوش رکھتے اور ان کا جلوہ دیکھتے۔ موسمِ بہار میں آم کی ڈالیوں سے کوئل کی کوک، سرما میں کنول کا تالاب میں کھلنا، گلّوں کا چراگاہوں میں چرنا، پانی سے لبریز دھان کے کھیت، گوالن کا سر پر گھڑا لئے ہوئے میٹھے سُروں میں گنگناتے ہوئے جانا نہایت خوش کن مناظر تھے، اور اُن کے گیت انھیں نغموں سے پُر ہوتے تھے اور اس وقت کی شاعری میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ بارہ ماسہ کہے جانے کا بہت رواج تھا جن میں سال کے ہر مہینے کی خصوصیت ہوتی تھی، مثلاً ؎

کارتکے اُول مارگے بیل پوسے کانجی ماگھے تیل

یعنی کاتک میں بنڈا، اگھن میں بیل، پوس میں کانجی اور ماگھ میں تیل کھانا تندرستی کیلئے بہتر ہے یہ بنگالی شاعری کا بالکل ابتدائی دَور تھا۔ اور اس وقت تک بنگالی شاعری تصنّع سے پاک تھی سیدھے سادے الفاظ سچی بات بیش کرتے تھے اس لئے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے تھے۔ شعرا نے اپنے گردوپیش کے ماحول کی منظر کشی بھی کی ہے۔ چنانچہ مکندرام نے اس میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ مذہبی عقائد کے ماتحت گنگا، سرسوتی، سیتلا، لکشمی اور دیگر دیویوں دیوتاؤں کی مدح میں سیکڑوں نظمیں موجود ہیں، کیونکہ خطۂ بنگال پہلے بدھ مذہب اور پھر ہندو دھرم (جس کو وشنوازم کہتے ہیں) کا گہوارہ رہا ہے۔ جیسے جیسے مذہبی تبدیلیاں ہوئیں مذہبی شاعری بھی بدلتی گئی اور بنگالی شاعری میں بیرونِ بنگال کے رسم و رواج اور تلمیحات آ گئے، سنسکرت کا عنصر بھی غالب ہو گیا۔

۱۲۰۳ء میں شاہانِ اسلام نے بنگال فتح کیا اور حکومت کی۔ اس وقت سے بنگالی زبان میں عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے لگے۔

کرتواسا نے رامائن کا ترجمہ کیا جو بنگال میں بیحد مقبول ہوا۔ جوں جوں زبان میں تبدیلیاں ہوتی گئیں پُرانے الفاظ متروک ہوتے گئے اور اُن کی جگہ نئے الفاظ داخل ہوتے گئے۔ اس کتاب کے نسخوں

میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ اس وقت جو نسخہ اس کتاب کا موجود ہے وہ اپنی تبدیلیوں کے باعث اصل سے بالکل مختلف ہے۔ الفاظ ہی نہیں بلکہ خیالات تک تبدیل ہو گئے ہیں۔

رامائن کا دوسرا ترجمہ ساستیوارا کا ہے، اس کا ایک شعر سنئیے:۔

کمتا جتی بندو بندو جو کھتے پڑے پانی رامے سمبودھیا بالے گودو گودو بانی

یعنی سیتاجی جبکہ وہ اپنے پتی رام چندرجی کو مخاطب کر رہی تھیں اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے دُرِ آبدار کی طرح ٹپک رہے تھے اور اُن کے لہجے سے غم کا اظہار ہوتا تھا۔

سولھویں صدی میں اس کتاب کے متعدد ترجمے ہوئے جن میں سے جگت رام کا ترجمہ زیادہ مقبول ہے، اس میں پچیس ہزار اشلوک ہیں۔

دوسری مقدس کتاب مہابھارت کا سب سے پہلا ترجمہ سنجیا نے کیا اور دوسرا ترجمہ نصرت شاہ والیِ بنگال کے حکم سے ہوا جس کا ذکر کوندر پرکلیوارا نے یوں کیا ہے:۔

نصرت تات اتے مہاراجہ رام بوتھ نتہ پالے شتاب پراجا

یعنی نصرت شاہ ایک بڑے راجہ ہیں اور اُنھوں نے اپنی رعایا کو رام کی طرح پالا۔

اس کے بعد شکنتلا اور گوری منگل کے افسانوں کا ترجمہ ہوا۔ تیسری مقدس کتاب بھگوت گیتا کا ترجمہ شہنشاہ حسین شاہ کے حکم سے اُس کے ایک درباری ملادھر واسو نے کیا۔ یہ ترجمہ ۱۴۷۳ء سے شروع ہو کر ۱۴۸۰ء میں ختم ہوا، سلاست زبان اور روانی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، اس کا ایک شعر سنئیے:۔

پربھاتے بھوجن کوی سنگا بجائیا پیچھے پیچھے چلے جاتو با چھور چلائیا

یعنی صبح کے ناشتے کے بعد بانسری بجائی اور گائیں پیچھے پیچھے چرانے کو لے گیا۔

وسطی دَور میں بنگال کے مشہور شاعر مارکنڈے نے چنڈی کا ترجمہ کیا، اس میں اس قصّے کا ذکر ہے جو دُرگا پوجا کے موقع پر بنگال کے گوشے گوشے میں منایا جاتا ہے۔ چنڈی کا ترجمہ بھوانی پرشاد کر، روپ نراین اور جادو ناتھ وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ اس دَور میں مناسا دیوی کے متعلق بھی بہت سی نظمیں لکھی گئیں جن میں وجے گپتا کا مناسا منگل بنگال میں بہت مقبول ہے۔ سید علاول بھی اس دَور کا نہایت مشہور شاعر گذرا ہے اس نے پدماوت کا ترجمہ ۱۶۵۱ء میں کیا جس میں دس ہزار پانچسو اشعار ہیں۔ اس کا ایک شعر سنئیے:۔

چوموکی لے بدرت چوموگی نہٹے لاگے بجرد یاتے کومولی نے تراست ہیا

دھوروئے پوتورگی مے اُودھک آنٹیا

یعنی موسم باراں میں عاشق اور محبوب بیٹھے ہوئے بات کر رہے ہیں کہ دفعتاً بجلی کی کڑک سے چونک کے

محبوبہ اپنے عاشق کی گود میں دبک جاتی ہے۔ اُردو میں بھی یہ مضمون ادا کیا گیا ہے ؎

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے — لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے

علاول نے پدماوت کے علاوہ فارسی زبان سے "سیف الملک" "بدیع الجمال" اور "مثنوی ہفت پیکر" کا ترجمہ منگا ٹھاکر کی خواہش پر کیا۔ علاول بنگال کا پہلا شاعر ہے جس نے الفاظ کی تراش خراش کرکے زبان کو صاف کیا اور اس معنی میں اُسے بنگال کے دیگر شعراء پر فوقیت حاصل ہے۔ ہندو رسومات کا ذکر نہایت گہرے طریقے سے کیا ہے جس سے اُس کی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے میں کریم اللہ، علی میاں، طاہر محمود مرتضیٰ وغیرہ بہت سے مسلم شعراء ہوئے ہیں۔ جن میں سے علی رالج اور علی میاں نے فن موسیقی میں مستقل تصانیف کیں جس میں راگ مالا مشہور ہوئی۔

علاول کے بعد ہی سے شاعروں میں تنزل ہوا کیونکہ اس کے بعد شاعری جذبات سے ہٹکر صرف تصویر کشی تک محدود رہ گئی۔ تصنّفات، استعارات و تلمیحات شاہان اسلام کی آمد کے ساتھ آ گئے تھے جن کی مثال سُنیئے ؎

مکند رام کہتا ہے "میں اُما (پاروتی جی) کے حسن کی کیا تعریف کروں، ان کے حسین چہرے کے سامنے چاند نکلنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اسی حسد کی وجہ سے چاند کا چہرہ زرد ہوگیا اور اُس کے سینے پر داغ پڑگیا ہے۔ انار کے دانے اُما کے دانتوں کے سامنے بے آب ہیں اور انار اس شرم سے اندر ہی اندر گھٹ کر آخرکار پھٹ جاتا ہے"۔

اس دور میں رادھا اور کرشن کی منظوم پریم کہانی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ شاعر نے ایک منظر یوں پیش کیا ہے، "رادھا کہتی ہیں مجھے جب ایک گوالے سے محبت ہوئی تو خوب معلوم تھا کہ بن وصحرا کی خاک چھاننی پڑے گی۔ اس لئے میں نے پہلے ہی سے درختوں کے کانٹے لاکر اپنے آنگن میں بچھائے اور اُن پر چلنے کی مشق کی"۔ اس قسم کی شاعری نے بنگال کے شعراء کے تخیلات اور جذبات پر گہرا اثر کیا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھارت چندر نے شاعری کا معیار بلند کیا اور ایک بڑی حد تک کامیاب ہوئے، اور اب شاعری کسانوں، کیتھکوں اور گوپی ولا سے نکل کر تعلیم یافتہ طبقہ میں آگئی۔ راجہ کرشن چندر اس صدی میں بنگالی شاعری کے بڑے مربی تھے۔ بھارت چندر جدت پسند تھے اور شارع عام سے الگ ہوکر چلنا پسند کرتے تھے اور انہوں نے صحیح معنوں میں مکند رام کی پیروی کی اور اس طرز میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ یہ شوق بنگال میں اس قدر عام ہوا کہ مابعد کے شعراء نے ان کی پیروی کی۔ بھارت چندر کا ایک شعر سنیئے:۔

ہائے رے دوشا کی تماشا باشا رجنو بہا پھو کے نے — وید کھولے دی تے باشا اشا کرہے کو توئی جونے

یعنی کیسا تعجب ہے کہ تم سا حسین جائے قیام کا متلاشی ہو، ہزاروں کنول شہد کی مکھیوں کو اپنے میں جگہ دیتے ہیں تو پھر ایسے دل کیوں نہ ہونگے جو تمھیں خوش آمدید کہیں"۔ بھارت چندر کی نظم آنند منگل جو تیرہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے بنگال میں مقبول خاص و عام ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک شعر بھی ایسا نہیں جو قیود ردیف و قافیہ سے باہر ہو۔ الفاظ آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ اکبر مرحوم نے جس شان سے آب لدّور کی روانی دکھائی ہے اُسی طرح بھارت چندر نے آنند منگل میں ایک سین یوں پیش کیا ہے:۔

مہارو در روپے مہادیو شاجے — دوم بھم دوم بھم سنگھا گھور باجے

لٹاپٹ جٹاجوٹ سنگمت گنگا — چھلچ چھل ٹلٹل کلکل ترنگا

فنافن فنافن فنی فن گاجے — دی نیش پرتاپے نشانات شاجے

دھکت دھوک دھکت دھک جُلے بنہے بہالے — دوم بھم دوم بھم مہاشبد گالے

دھیا تا دھیا تا دھیا بھوت ناجے — اولنگی اولنگے پشاچی پشاجے

یعنی جب شیوجی غصّے میں آتے ہیں تو اُن کے سنکھ سے دوم بھم دوم بھم کی آواز نکلتی ہے، اُن کی جٹا کے ہلنے سے لٹاپٹ لٹاپٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ گنگا کا دھارا چھلا چھل، کلاکل ٹلاٹل کرتا ہوا بہتا ہے۔ سانپ پھنا پھن کی آواز نکالتے ہیں اور چاند اُن کے چہرے پر سورج کی طرح دھکا دھک چمکتا ہے برہنہ بھوت اور پری تا دھیا تا دھیا کر کے ناچتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت چندر نے بنگالی شاعری میں ایسی شمع روشن کی جو آیندہ شعراء کے لئے شمعِ ہدایت بن گئی۔ بھارت چندر کی شاعری ترنّم کا ایک دریا ہے جو لہراتا چلا آتا ہے۔

اُنیسویں صدی میں نوین سین اور ہیم چندر بنرجی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ہیم نے قومی شاعری کا اضافہ کیا ان کی قومی شاعری ادبی شاعری پر فائق ہے۔

مائکل مادھوسودن دت نے بلینک ورس پہلے پہل بنگالی شاعری میں جاری کی۔

ڈی۔ ایل۔ رائے قومی اور نیچرل شاعری میں مشہور ہیں، متعدد ڈرامے لکھے، آپ کی شاعری میں مزاحیہ رنگ ہوتا ہے۔ بنکم چٹرجی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے کیونکہ آپ ہی ترانہ "بندے ماترم" کے مصنّف ہیں۔

بابو مہیش دت نے بھی شاعری کے میدان میں کافی شہرت حاصل کی۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ بنگالی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ٹیگور کے متعلق ابتک کچھ نہیں کہا۔ میرا یہ فعل سہواً نہیں بلکہ عمداً ہے، کیونکہ ٹیگور کی شاعری پر شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس میں متعدد کتابیں موجود نہیں اس لئے ان کے متعلق کچھ کہنا فضول ہوگا۔

ٹیگور کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک نئی شاعری کی دنیا میں قدم رکھنا پڑتا ہے، ٹیگور اپنی شاعری کے خود ہی خالق ہیں۔ اس وقت ادبی دنیا میں اُن کا کوئی نظیر نہیں۔

دو چیزیں شاعری کی جان ہیں، (۱) تخیل کی رنگینی اگر عمق کے ساتھ۔ (۲) زبان کا ترنم، اگر سادگی لئے ہوئے جس کی شاعری میں یہ دونوں باتیں توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں وہ مکمل شاعر ہے۔ ٹیگور میں یہ دونوں خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ٹیگور اپنے رباب سے وہی سرمدی نغمے نکالتا ہے جو ہم رومی کی نے سے سُن چکے ہیں یا جس کو کبیر نے الاپا تھا۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں ؎

آواز آ رہی ہے کبھی کی سُنی ہوئی

فرق صرف اتنا ہے کہ نغمہ وہی ہے مگر ساز بدلا ہوا ہے، مے وہی ہے مگر مینا دوسرا ہے۔

ٹیگور موت کو کتاب زندگی کا خاتمہ نہیں سمجھتے، بلکہ اُن کے نزدیک موت زندگی کے لئے ایک خوشگوار مرحلہ اور حیاتِ جاودانی کا راستہ ہے۔ موت دراصل حیات دنیوی اور حیات ابدی کے درمیان ایک منزل ہے جیسا کہ ایک اُردو شعر سے ظاہر ہے ؎

موت ایک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

ان کی ہر نظم ایک مستقل درس ہے جس کی تفسیر کے لئے ہزاروں کتابیں ناکافی ہیں۔ ان کی مشہور نظم گیتانجلی کے پہلے شعر کا ترجمہ سنیئے ؎

خوشی تیری اسی میں ہے بنا اِک جام گِل مجھکو　　　بھرے خالی کرے ہر دم زلالِ زندگی سے

پھرا اس نے کو تو لے کر ہر اک کوہسار و وادی میں　　　اِسی میں کی ہے دم تو نے ہمیشہ تازہ موسیقی

دَورِ حاضر کے مشہور شعرا میں قاضی نذر الاسلام کا نام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس وقت آپ بنگال کے مشہور و معروف اور مقبول شعرا میں سے ہیں۔ بنگالی شاعری میں غزل کی ابتدا کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ آپ کے کلام میں اُردو فارسی کے الفاظ بنگلہ زبان کے ساتھ مل کر ایک خاص لطافت پیدا کرتے ہیں۔ آپ کی غزل کا ایک شعر سنیئے ؎

بگیچہ بلبلی توئی پھول ساکھتے دیشنا اجی دول

اجو ہائے پھول کولی دیر گھوم ٹوٹے نی مُنذراتے بی نول

(یعنی اے بلبل تو درختوں کی شاخوں میں جو کلیاں لگی ہوئی ہیں اُن کو مت جھلا۔ یہ کلیاں ابھی خواب ناز میں ہیں اور ان کی نیند ابھی پوری نہیں ہوئی۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے جھولا جھلانے سے یہ بیدار ہو جائیں)

اس ایک شعر میں بگیچہ (باغیچہ)، بلبلی (بلبل)، ساکھا (شاخ)، کولی (کلی)، پھول۔ ٹوٹی (ٹوٹنا)

فارسی اور اُردو کے الفاظ موجود ہیں۔

غرض بنگالی شاعری اب بے شمار نئے خیالات، انوکھے مضامین، نئے طرزِ ادا، اچھوتی تشبیہوں، جدید استعاروں اور رنگارنگ جدّتوں سے مالا مال ہے۔ اور اس لئے فطرت اور حقیقت کا آئینہ، روحانیت سے لبریز، ترنم سے پُر اور نغموں سے معمور ہے جس کی وجدانی کیفیات ہمیشہ ہمیشہ تک قائم رہیں گی۔[1]

شانِ کردگار

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے)

نکلا حدودِ ضبط سے جب دل کا اضطرار ۔۔۔ لب نالہ زن ہوئے تو ہوئی چشم اشکبار
اے عندلیبِ زار وہی نالے پھر نہ چھیڑ ۔۔۔ جو رائیگاں گئے ہیں چمن میں ہزار بار
گُل دامنِ بہار کے سب خار ہو گئے ۔۔۔ ناحق کیا تھا شعبدہ بازی کا اعتبار
دنیا کو جانتے ہیں جو دانائے روزگار ۔۔۔ رم کردۂ خزاں ہیں نہ وارفتۂ بہار
دنیا تماشہ گاہ ہے ہنس ہنس کے دیکھیئے ۔۔۔ جو بھی دکھائے رنگ طلسماتِ روزگار
افسردگیٔ دل پہ ہماری نہ جائیے ۔۔۔ رنگِ خزاں سے بھی یہاں پیدا ہے اک بہار

مدہوش سوگوار ہو دنیا میں کس لئے
ہر رنگ میں شریک ہے جب شانِ کردگار

قطعہ

جب ناگزیر ہی ستمِ روزگار ہے ۔۔۔ پھر صبر اگر کریں نہ بتاؤ تو کیا کریں
سارا معاملہ ہے قضا و قدر کے ہاتھ ۔۔۔ مجبورِ محض ہیں تو عبث گر گلا کریں

راس آئی ہے نہ آئیگی آب و ہوائے دہر
خوش ہو کے کیوں ادا نہ نمازِ قضا کریں

---

[1] یہ مضمون مئی سنہ ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کیا گیا تھا اور اب بعد نظر ثانی ہدیۂ ناظرین زمانہ ہے۔

کلامِ جوشؔ

(شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ کا تازہ کلام)

دِل

پہلو میں میرے دیدۂ پُرنم ہے کہ دل؟	معبود! یہ مقیاسِ تپِ غم ہے کہ دل؟
ہو ذرہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے	یہ شیشۂ ناموسِ دو عالم ہے کہ دل؟

شبنم سے نہ گُل دُھلیں تو میرا ذمہ	موتی نہ اگر رُلیں تو میرا ذمہ
اک در جو ہوا بند تو آئی یہ صدا	سَو در نہ اگر کُھلیں تو میرا ذمہ

ظلمت کی رونمائی کو کچھ نور چاہیئے	رونے کو بھی تو خاطرِ مسرور چاہیئے

دل کا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں	آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں

(خاص)

بھیک کی آواز

تصور کیجیئے اُس مُلک کی بے دست و پائی کا	جہاں بنتا ہے شامِ بے نوائی نور کا تڑکا
جہاں بیدار ہوتے ہی فغاں ملتی ہے تانوں میں	گداؤں کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں کانوں میں

(ماخوذ)	جوشؔ

ضبطِ گریہ

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر	سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو، کہ دل ہو آئینہ	ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

(ماخوذ)	جوشؔ

عشق و محبّت

از مشیر احمد انصاری بی۔ اے۔ بارہ بنکی

عشق و محبت کے جس قدر چرچے لوگوں کی زبان پر ہیں، اہل علم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن جناب ایران شہر صاحب نے اس موضوع پر جن خیالات کا اظہار اپنی تصنیف "رہبر نثراد نو" میں فرمایا ہے وہ ترجمہ کی صورت میں ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہی وہ خیالات ہیں جو صحیح معنوں میں معیار قائم کرنے کیلئے کافی ہیں۔ یہ وہ مشہور تصنیف ہے جس پر ہمارے فارسی نثراد مُصنف کو پیرس سے ڈاکٹری کی ڈگری عطا ہوئی ہے۔ مشیر انصاری

اگرچہ معنی کے لحاظ سے "عشق" اور "محبت" میں چنداں فرق نہیں سمجھا جاتا اور بظاہر کوئی فرق معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ہم روحانیات کے نقطہ نظر سے تجربہ اور غور و خوض کریں تو نفس مطلب، موضوع اور اپنے اثرات کی وسعت کے اعتبار سے دونوں میں نمایاں فرق معلوم ہوگا۔ اولاً تو یہ الفاظ بجائے خود ایسی قوت اور اثر رکھتے ہیں جسے ہم بجلی یا مقناطیسی طاقت سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بعض الفاظ اپنے میں تسخیری قوت رکھتے ہیں جسکو "سحرِ حلال یا حرام" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر لفظ اپنی آواز کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی جاذبیت رکھتا ہے جو ہمارے دماغ اور اعصاب میں پہونچکر احساس کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ دماغ ماضی کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے اور فوراً ہی احساسات کی بیشمار موجیں جو عرصہ سے خاموش تھیں بیک وقت متحرک ہوکر دماغ پر پوری طور سے تسلط کرلیتی ہیں۔ یہاں سے دو حالتیں رونما ہوتی ہیں جن کا ادا کرنا آسان نہیں۔ سوا اس کے کہ اُس کیفیت کو ہم "انبساط اور انقباض خاطر"[1] سے تعبیر کریں۔ الفاظ کی آواز کا اثر طبعاً ہمارے لئے مسرور یا ملول کُن ثابت ہوتا ہے مثلاً ہمارے سامنے اگر کوئی ہمارے کسی گہرے دوست کا نام لیتا ہے تو اُس آواز سے ہمارے دل میں ایک انبساط اور فرحت کی لہر سی دوڑ جاتی ہے لیکن برعکس اس کے اپنے دشمن کا نام سُن کر ہمارے دل میں ایک پیچ و تاب پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس حالت سے کوئی مُسرت یا مضرت نہیں ہوتی لیکن اس کا اثر احساسات پر کافی قوت کے ساتھ پڑتا ہے۔

سحر اور جذب کی یہ قوت الفاظ کے اندر دو صورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اولاً اپنی آواز کے ترنم اور باہم لفظی ارتباط کی شکل میں (جیسا کہ علم موسیقی کے اصول سے آوازوں کا اثر ہمارے دماغ کے مرکز اور اعصاب پر ثابت ہوچکا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کسب کمال اور روحی طاقت کی حد تک اس حقیقت کا خود تجربہ کرسکتا ہے یہانتک

---

[1] Relaxation and Contraction of heart with pleasure and pain.

کہ وہ زمانہ دور نہیں جب موسیقی کی ساحرانہ قوت اور الفاظ کی آواز اس درجہ پُر اثر اور کار آمد ثابت ہوگی کہ "علاج بالموسیقی" طب کا ایک اہم جزو ہو جائے گا۔ دوسرے کثرت استعمال بھی الفاظ کی آواز میں ایک مقناطیسی قوت پیدا کردیتی ہے یعنی اہل زبان ایک لفظ سے جسقدر زیادہ کام لیتے ہیں اور ایک لفظ کی عمر جسقدر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے اسمیں قوت جاذبہ بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح عشق و محبت اگرچہ زبانِ عربی کے الفاظ ہیں لیکن ہم اُن سے اس درجہ مانوس ہوگئے ہیں کہ اُن کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ مثل مہر، مہربانی، دلبستگی اور شیفتگی وغیرہ بھلا نہیں معلوم ہوتا اور نہ اِن میں وہ کشش پائی جاتی ہے۔

مادیات اور طبیعات کی دُنیا میں "نظری اور خیالی" احساسات اتنے موثر نہیں ہوتے، جتنے کہ مشاہدات اور عملی احساسات ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص جس نے کبھی سمندر نہیں دیکھا۔ اُس کے سامنے اگر ہم سمندر کی اتنی تعریف کریں کہ بالکل اُس کا فوٹو کھینچ دیں۔ پھر بھی وہ اُس سے متاثر نہیں ہوسکتا۔ یہی صورت عالم روحیات اور معنویات کی ہے۔ ایک شخص جو اپنی زندگی کا ماحصل محض عیش دنیاوی جانتا ہے۔ اُس کے سامنے ہم عالمِ بالا اور عالم ملکوتی کی عیش کا کتنا بھی ذکر کریں، لیکن اُس پر اثر نہیں ہوسکتا۔ اِس سلسلہ میں معرفت اور استعداد کے مراتب اتنے ہی زیادہ اور مختلف انواع و اقسام کے ہیں جتنے کہ دُنیا میں انسان ہیں اور جس حد تک وہ ایک دوسرے سے فرق رکھتے ہیں۔ یوروپ کے زیادہ تر فلسفی اور عقلاء بقائے روح، قضا و قدر، اور عدالتِ مطلق کے قائل نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان کی عقل ہنوز اُن حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہے اور اسی لئے اُن کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خود جہالت کی ایک قسم ہے۔

اِسی طرح عشق و محبت کے موضوع کی تشریح اور اُس کے درجات و احساسات کا ذکر اُسی خوبی سے کرنا جیسا کہ ایک شخص خود محسوس کرتا ہے مشکل ہے۔ بنی نوع انسان کے ہر شخص نے عشق کے تمام درجات کو طے نہیں کیا ہے اور اتنی استعداد ہر شخص میں نہیں کہ اُس کی پوری ماہیت سے آگاہ ہو۔ مثلاً ایک شخص جو اپنی عمر میں ایکبار عاشق ہوا ہو۔ اُس کے لئے لفظِ عشق معنی کے اعتبار سے ایک پوری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اُس شخص کے لئے جس کو عشق کی ہوا بھی نہ لگی ہو عشق کی پوری ضخیم کتاب ایک لفظ کے برابر بھی اثر نہیں رکھتی۔ اسی وجہ سے عشق اور محبت کے درمیان مستقل حدود قائم کرنا امکان سے باہر ہے۔ کیونکہ عشق و محبت ایک فطری اور عالمگیر چیز ہے۔ اس کو صرف کسی ایک جنس یا قوم کے ساتھ نسبت یا خصوصیت نہیں ہے۔ اور نہ یہ ہر مذہب ہر جنس اور ہر زمانہ میں یکساں رہتی ہے بلکہ مختلف جگہ اور زمانہ میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک لفظ ایک موقع پر غضب کا باعث ہوتا ہے اور دوسرے موقع پر اُسی کا اثر برعکس ہوتا ہے۔ کبھی ایک لفظ کے سننے سے وجد طاری ہوتا ہے اور کبھی اُسی سے دل کو ملال ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اُس موقع اور وقت کی دماغی اور احساسی

Theoretical. ط Curing by music. ط

حالت پر منحصر ہے۔ چنانچہ عشق کی مختلف حالتیں بھی اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دقیق ہیں۔

ان مشکلات کے مدنظر عشق کی تعریف کرنا بجز عشق کے دوسرے کے بس کی بات نہیں ہے ہم الفاظ عشق و محبت کے درمیان صرف اتنا فرق ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک محبت عشق سے ایک درجہ اتر کر ہے یعنی وہ طاقت اور قدرت جو لفظ عشق میں مضمر ہے محبت میں نہیں پائی جاتی۔ اگر محبت شفقت کے ساتھ ہم آغوش ہے تو عشق جنون کے دوش بدوش چلتا ہے۔ محبت کے ہمدم نرمی اور ملائمت ہیں لیکن عشق کے ہمراز سختی اور سنگدلی ہیں۔ محبت ایک چراغ ہے جو روشنی پھیلاتا ہے اور عشق وہ آگ ہے جسمیں وہ خود ہی جلتا ہے۔ محبت بارش کی لطیف بوندیں ہیں۔ عشق بجلی، گرج اور طوفان ہے۔ محبت ایک سبک رو اور شفاف دریا ہے۔ عشق ایک خوفناک اور موجیں مارتا ہوا سمندر ہے۔

درجات عشق و محبت

عشق اور محبت کے فرق ظاہری کے بعد چاہتا ہوں کہ اُن کے درجات کو معین کرنے کی بھی کوشش کروں، اگرچہ یہ درجات بھی غیر مکمل اور ظاہری ہوں گے۔ عشق و محبت کو اُن کے موضوع کے لحاظ سے حیوانی، انسانی، روحانی اور رحمانی طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں اور اُنہیں سے ہر ایک میں پھر متعدد شاخیں ہو سکتی ہیں لیکن اُس کو بلحاظ اثر نیز دائرہ وسعت کی تنگی و فراخی کے اعتبار سے میں سات درجوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

۱۔ میل وجاذبہ | یہ ایک فطری شے ہے۔ ہر روح اس کو اپنے ساتھ دُنیا میں لاتی ہے۔ میل وجاذبہ کو محبت کا ابتدائی زینہ سمجھنا چاہئے۔ اس کی کشش اکثر اوقات مجہول صورت میں ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر اوقات ہم ایک شخص، ایک منظر یا ایک چیز کی طرف اپنے کو کھینچتا ہوا پاتے ہیں اور ہمارے دل کا میلان اُس طرف ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بظاہر کوئی سبب درمیان میں نہیں ہوتا۔ اس قسم کا میلان طبع اور کشش جو پہلی ہی نظر میں دو شخصوں کے درمیان پائی جاتی ہے اور جس سے بغیر کسی پچھلے تعارف کے دل گرویدہ ہو جاتا ہے حقیقتاً اُس علاقۂ ازلی کا نتیجہ ہے، جو عالم ارواح میں دو روحوں کے درمیان تھا۔

۲۔ دوستی | جب میل وجاذبہ کسی حد تک مستحکم شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہی دوستی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوستی کا احساس کسی چیز کی لذت کے احساس کے برابر ہے۔ اس کا لطف قربت میں ہے۔ اگر ہم کسی چیز کو عزیز رکھتے ہیں، تو اُس کو دیکھنے یا اپنے پاس رہنے سے ہم کو ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ لہذا ہم کوشاں رہتے ہیں کہ ہم اُس شخص یا چیز کو ہر وقت اور ہر جگہ جہاں چاہیں اپنے قریب پا سکیں۔

انسانوں کے درمیان دوستی کے بھی مختلف درجے ہیں اور صرف سرفروشی اور دوست کیلئے محنت شاقہ کا برداشت کرنا ہی دوستی کی کسوٹی ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے دوست کے لئے جان نثاری نہیں کر سکتا تو

سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کی دوستی خالص نہیں۔ لیکن اس قسم کی زحمتیں اور فداکاریاں اگر کسی صلہ اور مکافات کی اُمید پر کیجائیں تب بھی دوستی سچی نہیں۔ فی زمانہ دوستی اسی قسم کی پائی جاتی ہے جو خود پرستی پر مبنی ہے۔ اچھے سچے دوست محدودے چند ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم اپنے دوستوں کو اس کسوٹی پر نہ آزمائیں، ورنہ ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوگا کہ ہمارا کوئی دوست نہیں۔ میرے نزدیک زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی وہ ہے جب ایک شخص کو اُس بات کا احساس ہوجائے کہ جنکو وہ سالہاسال سے دوست سمجھتا رہا حقیقتاً وہ دوست نہیں ہیں۔ ایک یا چند مخلص اور وفادار دوستوں کا ہونا ایک ایسی نعمت اور خزانہ ہے جو فی زمانہ حاصل نہیں ہوتا۔

۳۔ محبت | یہ درجہ دوستی سے بالاتر ہے۔ اس درجہ میں دوست کی خاطر یا اُس چیز کی خاطر جو محبوب ہو ایک شخص ہردم قربانی کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور مصیبتوں اور دُشواریوں کو صبر سے برداشت کرتا ہے۔ البتہ یہ قربانی اور بُردباری ایک محدود شکل میں ہوتی ہے یعنی اکثر قطعی خطرہ کے موقع پر اپنے نفس کو دوست پر ترجیح دیتا ہے یا کم از کم خطرہ میں پڑنے سے پہلے اپنی جگہ پس و پیش کرتا ہے۔ اور بالآخر دوستی سے مُنھ موڑ لیتا ہے محبت کی یہ وہ منزل ہے جب قلب پر عقل حکمران رہتی ہے۔ یہ محبت خالص اور بااثر نہیں ہوتی۔ کیونکہ زحمتوں، فداکاریوں اور دُکھ درد کی تاب نہیں لاسکتی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ سچی محبت کو عقل سے کوئی سروکار نہیں اور اسمیں کسی وسوسہ کی گنجائش نہیں۔ محبت کے اس درجہ میں ہنوز خود پرستی اور شخصیت باقی رہتی ہے۔ آجکل کی بیشتر دوستیاں اور محبتیں اسی قسم کی ہیں، جن کو غلطی سے لوگ عشق کہنے لگے ہیں۔

۴۔ پاک محبت | یہ درجہ محبت کے درجہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسمیں خود پرستی، خودی، حسد اور کینہ کی گنجائش نہیں، اس درجہ میں عقل اپنی قوت کو بہت کم استعمال کرتی ہے۔ یہ محبت محبوب کے لئے جانثاری میں کسی حد کو نہیں دیکھتی۔ ایسی محبت کی بارگاہ میں شک و شُبہ، ردّ و قدح اور خوف و ہراس کی رسائی نہیں ہوتی۔ وہ محبت جو سچی دوستی کی بنیاد ہے، اسی منزل میں نظر آتی ہے بلکہ یہی وہ محبت ہے جو اُوپر ذکر کی ہوئی بداخلاقی کے زنگ کو دلوں سے دُور کردیتی ہے۔ اولاد سے ماں کی محبت اسی قسم کی ہوتی ہے جو "مقدس ترین" محبت کہی جاسکتی ہے اگر قدرت نے اس پاک محبت کو ماں میں ودیعت نہ کیا ہوتا تو عالم ارواح کی فضا ہمیشہ تاریک رہتی۔ ماں کی بے لوث محبت ہی ہماری زندگی کا باعث ہے۔ افسوس کہ یہ محبت بھی فی زمانہ رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے۔ گوتم بدھ نے اسی سلسلہ میں نصیحتاً کہا ہے کہ "جس طرح ماں اپنے اکلوتے بچے کو عزیز رکھتی ہے آدمی کو چاہئے کہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے اور جاگتے اُسی طرح اپنی محبت کا نور اپنے گرد و پیش پھیلائے۔"

ماں کی محبت اپنی اولاد کے ساتھ قدرت کے عجائب اور خلقت کے اسرار میں سے ہے۔ اُن تمام تکلفوں اور مصیبتوں کے باوجود جو ماں کو برداشت کرنی پڑتی ہیں مہر مادری کا شعلہ کبھی خاموش نہیں ہوتا۔ اولاد کیسی ہی

کیوں نہ ہو، دوسروں کی نظر میں کتنی ہی بُری کیوں نہ ہو لیکن ماں کبھی اُس کو کسی دوسرے بچّے سے بدلنے پر راضی نہ ہوگی اور اُس کی محبت کبھی نفرت سے تبدیل نہ ہوگی۔ اگر ہم ماں کے اثر کو بچہ کی تربیت اور سرشت میں روحیاتی نقطۂ نظر سے تلاش کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ یہ اثرات کس درجہ جادو صفت ہوتے ہیں۔ اور عورتوں کی غفلت اور جہالت بچّوں کے ذریعہ سے کتنی خطاؤں اور گناہوں کی مرتکب ہوتی ہے۔

کوئی زبان اور کوئی قوم ایسی پیدا نہیں ہوئی جس میں محبت مادری کا ذکر نہ ہو۔ ایسی کوئی قوم نہیں جس کے ادیبوں اور شاعروں نے اس سلسلہ میں خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ چنانچہ بزرگوں کے چند اقوال ہم اس جگہ نقل کرتے ہیں:

۱۔ "صرف ماں سمجھ سکتی ہے کہ دوست رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ خوش رہنا کیا چیز ہے؟ میرا دل اُن حضرات کے لئے افسوس کرتا ہے جو ماں کی خوشی کا احساس نہیں کرتے۔" رومن رولاند

۲۔ "اے مہرِ مادری تو مقدس ترین محبت ہے۔ تیری ملکوتی عظمت کی توصیف اِس آب و گِل کی زبان سے ممکن نہیں۔" گوتم بدھ

۳۔ "اگر تمام دُنیا ایک بیکس کا ساتھ چھوڑ دے اور کسی ایک کے دل میں بھی اُس کیلئے ہمدردی باقی نہ ہو پھر بھی اے ماں کی پاک محبت تو ایک مقدس ستارہ کے مانند اِس لازوال آسمان پر ہمیشہ ثابت قدمی سے چمکتی رہے گی۔" فلاطوں

۴۔ "اُن آنکھوں کو یاد کر جو ہر ساعت تیری جستجو میں رہتی ہیں اور تیری خوشی کا سامان مہیا کرنے میں سرگرداں تھیں۔ اُن ہاتھوں کو یاد کر جو راتوں کو اپنی شفقت کی وجہ سے تیرا درد دُور کرنے کے لئے ذرا بھی ساکت نہیں ہوئے۔ اُس گھڑی کو یاد کر جب اُس نے تیری خاطر زخم پر زخم کھائے اور پھر بھی جانثار رہی۔ اور پھر دو زانو ہو جا اور ماں کے لئے دُعائے خیر کر۔" رابندرناتھ ٹیگور

۵۔ "صرف ایک محبت ہی ایسی نعمت ہے جو حقیقتاً مکمل اور خدائی ہے اور یہ وہی محبت ہے جو ماں کو اولاد سے ہوتی ہے۔" موریس ددنی

۵۔ عشق | جب ہم اپنا قدم عشق کے دائرہ میں رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محبوب کا جمال یا اس کا مجسمہ ہماری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اُس کے ذکر اور خیال کے بغیر ہم اپنے کو خوشی اور راحت سے دُور پاتے ہیں۔ اس منزل میں محبوب کی خاطر خطرات سے دوچار ہونے سے گریز نہیں کرتے بلکہ خطرات کا استقبال کرتے ہیں اور مصائب کو جان کے بدلے خریدنے کو تیار رہتے ہیں۔ زندگی کی وہ گھڑیاں جو محبوب کے ذکر سے خالی ہوں، زندگی کا حصہ نہیں سمجھی جاتیں عشق مجازی اس درجہ سے بلند تر نہیں ہوتا اور یہی جگہ مجاز اور حقیقت کے درمیانی حد کی ہے۔ "فنا اور بقا کی درمیانی برزخ[1]" اگر کوئی ہے

[1] The period between death and resurrection al

تو وہ یہی منزل ہے۔ نفس کے امتحان کا یہی مقام ہے۔ کمتر نفس ایسے ہیں جو اس مرحلہ سے نکلکر بلندی پر قدم رکھیں۔

جس چیز کو ہر زبان اور ہر قوم والے عشق کے نام سے پکارتے ہیں وہ یہی ہے۔ یہی عشق ہے جو زندگی کے مرحلہ کو حرکت دیتا ہے۔ اسی عشق کو ہم اس سے قبل جنون سے ہمسر اور ہمدوش ہونا لکھ آئے ہیں۔ اسی عشق کی ثنا و صفت میں شاعروں کے دیوان رنگے پڑے ہیں۔ وہ موضوع جو دُنیا میں سب سے زیادہ زیر بحث ہے اور جو دلوں میں ہیجان پیدا کرکے زبانوں کو بیان کرنے اور آنکھوں کو اُس کی جستجو کرنے پر مجبور کرتا ہے یہی عشق ہے۔ جب تک دُنیا باقی ہے۔ یہ چرچے باقی رہیں گے بلکہ دوسری دُنیا تک یہ سلسلہ جاری رہے گا ؂

آتشِ عشق پس از مرگ نہ گردد خاموش   ایں چراغ ست کہ زیں خانہ بہ آں خانہ برند

لیکن اس عشق کو بہ استثنائے چند تاریخی واقعات کے ہم پاک عشق کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس منزل میں ابھی تزکیۂ نفس نہیں ہوتا اور نفع نقصان کے ساتھ ساتھ اپنی ہستی کا خیال باقی رہتا ہے۔ خود پرستی کا رنگ بالکل زائل نہیں ہوجاتا اور رشک و شبہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ حافظؒ فرماتے ہیں ؂

خواہی کہ روشنت شود احوال سوزِ عشق   از شمع پُرس قصہ ز بادِ صبا مپرس

۶۔ پاک عشق۔ عشق کو پاک عشق ہم اُسوقت کہہ سکتے ہیں جب وہ ہوا و ہوس کی آلائش سے پاک ہو۔ عشق کے ساتھ خود پرستی کے جو خس و خاشاک ہوتے ہیں وہ پاک عشق میں جل کر خاکستر ہوجاتے ہیں۔ اسکے سامنے ہر چیز یکساں ہے اور ہر ذرہ میں ایک ہی نور مطلق کی تجلی نظر آتی ہے۔ اس عشق کی ایک ممتاز ترین صفت یہ ہے کہ اس کا منبع ہماری جاودانی روح ہے اسی لئے ہم اس کو پاک کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ جہاں ہم نے تنہا محبت اور عشق کا ذکر کیا ہے وہاں نفسِ حیوانی کا دخل پایا جاتا تھا۔ چونکہ نفس ناطقہ کو فنا ہے اس لئے وہ عشق اور محبت بھی زوال پذیر ہے اور اسمیں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ عشق جسے ہم پاک عشق کہتے ہیں ہماری روح سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لئے اسمیں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اس منزل تک پہونچنے والے کے لئے پھول کانٹے، سختی نرمی، انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ جسم ظاہری کو نہیں دیکھتا بلکہ روح پر نظر ڈالتا ہے۔

دوسرا امتیاز جو اس عشق کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کا تعلق روحانیت سے ہے اس لئے اس کو عقل پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا سلسلہ عالم غیب سے وابستہ ہے۔ بلکہ یہ خود اکثر اوقات عقل کی دستگیری کرتا ہے اور اُس کو حیرت کے سمندر میں غرق ہونیسے بچالیتا ہے۔ اس منزل میں ہم عشق کے حاکم نہیں رہتے بلکہ اُس کے محکوم ہوجاتے ہیں۔ ہم اپنی ہستی سے بے خبر رہتے ہیں اور صرف اسقدر جانتے ہیں کہ ایک زبردست قوت نے ہم پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہم اُسی کے بس میں ہیں۔ یہی مقام "قاب قوسین" کا ہے۔ یہی جگہ عبودیت اور ربوبیت کی سرحد ہے۔ یہی منزل عشق حقیقی کے بادشاہ کی قلمرو ہے۔ اور یہیں جمال الٰہی کے عشاق کا مسکن ہے۔ یہ جگہ "مقام لی مع اللہ" ہے۔

یہاں تک پہونچنے والی روح کے نزدیک دُنیا کی تمام مخلوق یکساں ہے اور ہر شے میں خالق مطلق کے نور کا جلوہ نظر آتا ہے ۷۔ عشق الٰہی یہ عشق کی آخری منزل ہے۔ اس کی تعریف انسان سے ممکن نہیں۔ کیونکہ آفتاب کی توصیف ایک ذرہ کے امکان سے باہر ہے۔ ایک ذرہ کتنی بھی کوشش کرے لیکن اس کا کیا علاج کہ بہت سی باتیں اس کے قیاس سے باہر ہوں؟ اس منزل میں دوئی کا وہ پردہ اُٹھ جاتا ہے جو حبیب اور محبوب کے درمیان پاک عشق کی منزل میں تھا۔ یہاں بجز عشق کے ایک بحر بیکراں کے کچھ نظر نہیں آتا جسمیں حبیب اور محبوب کا امتیاز کرنا ناممکن ہے مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

گاہ خورشید و گہے دریا شوی　　گاہ کوہ قاف و گہ عنقا شوی

یہ مقام بیخودی اور "فنا فی اللہ" کا ہے۔ جس چیز کو گوتم بدھ نے "نروان" کے نام سے موسوم کیا تھا، وہ یہی ہے کہ نفس کو محبت کی راہ میں تصدق کر دینے سے انسان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہاں اپنے اور بیگانہ کا سوال نہیں رہتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہونچنے کی کوشش ہر روح کو کرنی چاہیئے۔ یہ وصل کی وہ جگہ ہے جہاں جدائی کے نام سے کوئی واقف نہیں۔ اور وہ بادشاہ جو اس وادی کا حکمراں ہے بہ آواز بلند پکار کر کہتا ہے ؎

من آفتاب وحدتم تاباں بہ انساں آمدہ　　من نور اسم اعظمم پیش از تن و جاں آمدہ
ہم نور سبحانی منم، ہم سایہ ہم پرتو منم　　ہم راہ و ہم رہبر و منم، ہم پیر برہ داں آمدہ

لطفِ کلام

حضرت لطیف انور مدیر "کرن"

میری ہستی ہے اے دلِ مغموم　　ذہنِ شاعر کی عشرتِ موہوم
عمرِ فانی ہے خامیٔ مقسوم　　آج موجود ہے تو کل معدوم
حُسن کا اقتضا نہیں معلوم　　عشق لیکن ہے آج تک معصوم
میرا آغاز، رونقِ ہستی　　میرا انجام، ہاں خدا معلوم
کارِ عالم نہیں ہوا یکسو!　　کشمکش میں ہیں خادم و مخدوم
چاک کیا ہو سکیں رفو لیکن　　دامنِ زندگی کو بیٹھا تُوم
میرا نغمہ ہے خندۂ برہم　　گو تجلی ہے یہاں نوائے بُوم
اُس سے ہٹنا محال ہے ناداں　　ایک مرکز ہے چاہے جتنا گھوم
کاش، تیری نظر بڑھے آگے　　حدِ انساں نہیں ہے شام و روم
کتنے خم ہو گئے تہی، انور　　ہم نہیں جانتے؟ نہ اِتنا جھوم

محبّت

(از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری)

محبّت شمع بزمِ انس و جاں ہے　　محبّت حسنِ فطرت بے گماں ہے
محبّت ہے بنائے بزمِ امکاں　　محبّت ہے مدارِ چرخِ گرداں
محبّت نغمۂ سازِ جہاں ہے　　محبّت پردۂ رازِ جہاں ہے
محبّت پرتوِ نورِ ازل ہے　　محبّت شعلۂ طورِ ازل ہے
محبّت شاہدِ اہلِ نظر ہے　　محبّت حق نما و حق نگر ہے
محبّت خضرِ راہِ اہلِ دل ہے　　محبّت سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے
محبّت قبلۂ امن و اماں ہے　　محبّت کعبۂ پیر و جواں ہے
محبّت بزمِ دل کا آئینا ہے　　محبّت جلوۂ معنی نما ہے
محبّت ہے حقیقت کی شریعت　　محبّت کی شریعت ہے حقیقت
اگر ناخوش نہ ہو پیرِ شریعت　　تو کہہ دوں برملا رازِ محبّت

ذرا سی بات، طُرفہ ماجرا ہے
محبّت، درحقیقت خود خدا ہے

اگر قدم نہ محبّت کا درمیاں ہوتا　　تو یہ زمیں ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا
صراحیوں کی ہر اک بوند اشک بنجاتی　　جوانیوں کا ہر اک عشوہ رائگاں ہوتا
نہ یہ خرامِ نسیمِ بہار کو ملتا　　نہ یہ نظام ستاروں کے درمیاں ہوتا
نہ عقل، عشق و جوانی کے بھید پا سکتی　　نہ علم لالہ رخوں کا مزاج داں ہوتا
خدائی، قلب کا ہلکا سا وسوسہ ہوتی　　خدا ضمیر کا دھندلا سا اک گماں ہوتا
بلند و پست کی نبضیں چھٹی چھٹی رہتیں　　حیات و موت کا چہرہ دھواں دھواں ہوتا

کسان کا اقتصادی مستقبل

حلیم سلیمی ایم۔ اے علیگ

پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے لئے یہ بات فیشن میں داخل ہوگئی ہے کہ وہ کسانوں کی حالت کا نقشہ انتہائی بھیانک الفاظ میں کھینچیں۔ چنانچہ اخباروں میں لکھا جاتا ہے کہ کسان تقدیر پر قانع اور روایاتِ قدیم کے زبردست علمبردار ہیں۔ کسانوں کے لفظی ہمدرد اُن کو بالکل بیوقوف اور کاہل سمجھتے ہیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندوستانی کسانوں کا مغربی ملکوں کے کسانوں سے بھی مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اور اس مقابلے کے وقت دونوں ملکوں کے ماحول کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے افلاس کا سارا الزام کسانوں پر عائد کرنا حق و انصاف سے بعید ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ کسانوں کا موجودہ رویہ جائز ہے یا کسانوں میں خامیاں موجود نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی سب خامیاں اور پریشانیاں خود اُن کی بے پروائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ واقعات نے ہمارے کسانوں کو پریشانی اور بدبختی کا شکار بنا دیا ہے۔ جہاں کہیں واقعات نے ساتھ دیا ہے کسان "سب کچھ" ہیں۔

یہاں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر کسان کے افلاس کے وجوہ بیان کرنے میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ اس کا جواب تواریخ کے اوراق سے یہ ملتا ہے کہ ہندوستان میں مغربی ممالک کے ماہرین کسان کے حالات پر نقد و تبصرہ کی غرض سے آئے تو اُنھوں نے اپنے معائنہ و مشاہدہ کے دوران میں یہاں کے واقعات اور فضا کا خیال نہیں رکھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ مختلف پیچیدگیوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور کسان بے جا نکتہ چینیوں کا بھی مرکز بن گیا۔ شہری لیڈروں نے معاملات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ مغربی ماہرین کے محاوروں کو وردِ زبان کر کے اُنھوں نے شور مچانا تو شروع کر دیا۔ لیکن کسانوں کے متعلق اُن کی معلومات چند محاوروں اور بعض سطحی کتابوں تک محدود رہیں۔

مغربی ماہرین کو ہندوستان آکر یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ بڑے بڑے دریا رواں ہیں۔ وسیع جنگلات موجود ہیں اور یہاں کی آب و ہوا بھی قابل رشک ہے مگر قدرت کی ان لامحدود

بخششوں کے باوجود یہاں کے کسان غریب ہیں۔ اِس لئے وہ بلا تامل اِس نتیجہ پر پہونچے کہ خود کسان اپنی پستی کا باعث ہیں اور وہ یقیناً کاہل اور قدامت پرست ہیں۔ اس کے ثبوت میں اُنھوں نے اپنی تسلی کی غرض سے اِس بات کا بھی لحاظ کرلیا کہ اگر ہندوستان کے کھیتوں میں فی ایکڑ گنا اتنا نہیں پیدا ہوتا۔ جتنا جاوا میں ہوتا ہے تو اس کا سبب یہاں کے کسانوں کی کاہلی ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دیہات کے کسان ابھی تک لکڑی کے بنے ہوئے بھدّے، بے مصرف ہل استعمال کررہے ہیں۔ حالانکہ اب بازاروں میں اچھے اور کارآمد ہل آسانی سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔

انھیں باتوں پر نظر کرکے وہ کسانوں کو تحقیر و ملامت کا نشانہ بنالیتے ہیں۔ اور ان کی سماجی، سیاسی و اقتصادی بندھنوں کا غائر مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اور غالباً غائر مطالعہ کی اُن کو مہلت بھی نہیں ہوتی۔ اِس لئے ان کی نظر بالکل "طائرانہ" ہوتی ہے۔ گھومتے ہوئے آئے۔ چند لوگوں سے ملے۔ جن میں زیادہ تر شہری لیڈر رہوتے ہیں، جن کا کام صرف پلیٹ فارم سے شور مچانا ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں ملاحظہ فرمائیں کچھ کاغذات پر نظر ڈالی اور بس۔ کسان کے حالات کا مطالعہ ختم ہوگیا۔ مگر اس کے برعکس یہی ماہرینِ فن جب ہندوستان میں کافی دنوں تک رہتے ہیں تو ان کی رائے کسانوں کے متعلق بالکل دوسری ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم مثال کے طور پر ہوورڈ۔ ڈارلنگ، میگڈوگل اور ایڈریوز کی رائیں پیش کرسکتے ہیں۔ یہ اصحاب اِس بات کے معترف ہیں کہ ہندوستان کے کسان قابلِ تعریف دلیری کے ساتھ قدرتی اور سیاسی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کررہے ہیں۔ یہاں کے طریقۂ زراعت کو بھی وہ ہزاروں برس کے تجربوں کا نتیجہ اور یہاں کے کھیتوں کے حسب حال اور موزوں سمجھتے ہیں۔ شاہی زراعتی کمیشن نے بھی کسانوں کی مشقت و استقلال کا اعتراف کیا ہے اور یہاں کے طریقۂ زراعت کے متعلق لکھا ہے کہ "جن حالات کے ماتحت یہاں کا کسان کام کرتا ہے، اُن پر ماہرینِ فن کو نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوسکتی۔"

درحقیقت ہمارے کسان کی قابلِ رحم حالت کا اصلی سبب چند سماجی، اقتصادی اور سیاسی رکاوٹیں ہیں۔ اگر ان رکاوٹوں کو ایک جامع الفاظ لفظ میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم کو "جہالت" یا "لاعلمی" سے زیادہ موزوں لفظ نہیں مل سکتا ہے۔ اس لفظ کی اہمیت ہم پر اس وقت واضح ہوگی۔ جب ہم یہ غور کریں کہ پینتیس ۳۵ کروڑ کی آبادی میں ایک نہایت ہی قلیل تعداد لکھنے پڑھنے کے قابل ہے۔ اِسی وجہ سے ترقی کے مدارج ہمارے عوام کی پہونچ سے باہر ہیں اور جب تک ناخواندگی کی لعنت دُور نہ ہوگی۔ اِس وقت تک یہ اُمید رکھنا بالکل عبث ہے۔ کسان کا زاویہ نگاہ اقتصادی مسائل کی طرف سے بدل جائے گا۔

یہ امر ضرور اطمینان بخش ہے کہ کسان کی پست حالت کا غم ہر مدبر ملک، قائمقام رعایا، چھوٹے بڑے حاکم

اور اونچے اونچے پلیٹ فارموں سے چیخنے والے عیش پسند لیڈروں کے دل میں پیدا ہو رہا ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ اب بھی "زبانی غمخوار" بہت سے ہیں۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ یہی زبانی غمخوار کبھی کسانوں کے پُرخلوص خادم بھی بنجائیں۔ آئینی تبدیلی اور صوبجاتی خودمختاری نے کسانوں میں ذمہ واری اور خودداری کا احساس پیدا کردیا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس احساس کا باعث "کمونسٹ" پروپیگنڈا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو اب حکومت بھی اُن کی طرف توجہ دینے لگی ہے۔ چنانچہ بڑی بڑی رقمیں صرف کرکے زراعتی تحقیقات کا کام ہو رہا ہے۔

امپیریل کونسل آف ایگریکلچر میں گیہوں، کپاس، گنا، تمباکو، تلہن، پھل، چارا، گھاس وغیرہ کے متعلق بڑے زوروں سے کام ہو رہا ہے۔ جانوروں کے امراض کے دفعیہ کی تحقیق ہو رہی ہے اور مویشیوں کی ترقیِ نسل کے مسئلہ پر بھی غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ کھاد کی فراہمی اور اُس کے استعمال کے متعلق تجویزیں زیرِ غور ہیں۔ جوتنے، بونے اور کاٹنے کی مشینیں تیار ہو رہی ہیں اور اُن کو عام کرنے کی کوشش ہو رہی ہے مگر یہ ساری کوششیں بقول سر جان رسل پورے طور سے حقیقی ترقی کی تمہید بھی نہیں کہی جاسکتی ہیں۔

دُنیا میں بہت کم مُلک ایسے ہوں گے جہاں ہندوستان کے مقابلہ میں زراعتی ترقی کے اِتنے وسیع امکانات ہیں۔ اِس وقت مُلک کی ساری زمین کے ۳/۱ فیصدی حصّہ پر زراعت ہو رہی ہے۔ سائنس کے طریقوں کو عمل میں لانے کے بعد اُس کا کچھ اور حصّہ بھی زراعت کے لئے دستیاب ہوسکتا ہے۔ بقیہ حصّہ بیکار پڑا ہوا ہے مگر سائنس کی مدد سے اس سے آسانی کے ساتھ ملک کی دولت میں اضافہ ہوسکتا ہے یہ بات ضرور ہے کہ کاشت کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اگر اسی نسبت سے آبادی میں اضافہ ہوتا رہا تو عوام کی زندگی کا معیار مشکل ہی سے بلند ہوسکیگا۔ اسی لئے ملک کی پیداوار کے اضافہ کے ساتھ آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو صنعت و حرفت کی طرف رجوع کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ ماہرین اِس بات پر متفق ہیں کہ جب تک مُلک میں زراعتی ترقی کے پہلو بہ پہلو صنعتی ترقی کا بندوبست نہ ہوگا۔ اُس وقت تک پستی کا دیرپا علاج نہیں ہوسکتا۔

یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان کے کھیتوں کی پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔ سرکاری زراعتی کھیتوں کی پیداوار کے مقابلہ میں بھی عام کسان کے کھیتوں کی پیداوار میں بہت بڑا فرق ہے مثلاً پنجاب کے سرکاری کھیتوں میں گیہوں پچاس من فی ایکڑ، کپاس چالیس من فی ایکڑ۔ گنا پندرہ من فی ایکڑ اوسط پیداوار خیال کی جاتی ہے مگر قرب و جوار کے کھیتوں میں اسکی نصف پیداوار بھی نہیں ہوتی۔ ان اعداد سے آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پیداوار میں کتنے اضافہ کی گنجائش ہے۔ اگر کسانوں کو اِس بات کا یقین ہوجائے کہ وہ آسانی سے ترقی کرسکتے ہیں، تو وہ جلد ہی

اس کے لئے پوری کوشش کرنے لگیں۔

پیداوار میں اضافہ کے لئے سب سے ضروری چیز پانی کا میسر ہونا ہے۔ اس ملک میں بارش کا یہ حال ہے کہ چند ماہ میں تو زور و شور کے ساتھ آتی ہے اور پھر گذر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر حصہ میں ایک ہی مقدار میں بارش نہیں ہوتی۔ اسی لئے یہاں کی فصل "بارش کا جوا" سمجھی جاتی ہے۔ نہروں کی اتنی وسعت کے باوجود اب تک کل کھیتوں کا ⅘ حصہ بارش کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اب نہروں کی گنجائش نہیں ہے تو ممالک متحدہ کی نئی اسکیم یعنی ٹیوب ول (Tube Well.) سے تو آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ زمین کے اندر کے پانی کو استعمال میں لانے اور جنگلات کے ذریعہ سے پانی کے بہاؤ کو روکنے سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔ اس مسئلہ پر بھی تحقیقات ہو رہی ہے جس سے امید ہے کہ بہت جلد ایک زراعتی انقلاب رونما ہو جائے گا۔

مختصر یہ ہے کہ موجودہ سیاسی و اقتصادی حالات کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے بھی کیا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی قسمت کی کنجی کسانوں کے ہاتھ میں ہے اور ہندوستان کے سیاسی ڈرامہ میں کسان ہی ہیرو کا پارٹ ادا کریگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس زرین کہاوت کو دہرانے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ کسان ہی ملک کا مالک ہوتا ہے[1]۔

اقوال زریں

"جس گھر یا خاندان میں عورتیں غمگین اور تکلیف میں رہتی ہیں وہ جلد تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔" (منو)

"پارسائی دُنیا کی خواہشوں پر لات مارنے سے حاصل ہوتی ہے۔" (حضرت علیؓ)

"قلب کی راحتِ دوام اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جو دُنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔" (مہاتما بدھ)

"جو ہر چیز میں نیکی دیکھتا ہے۔ اُس کو نیکی ہی ملتی ہے۔"

"دل کی اُمنگیں پراگندہ خیالات ہیں اور رحمتِ خدا سے ناامیدی مضرت بخش ہے۔" (حضرت علیؓ)

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں "انڈین ایکانمک جرنل" سے خاص طور پر استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ حلیم تسنیمی
کسانوں کے اقتصادی مسائل کے متعلق حسب ذیل کتابیں قابلِ مطالعہ ہیں:۔
(۱) سر جان رسل رپورٹ ' (۲) شاہی زرعی کمیشن رپورٹ ' (۳) "Crop Production in India Howard"
(۴) "Wealth of India Wadi and Joshi."

جذباتِ فراق

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری)

بیخودی میں اک خلش سی بھی نہ ہو ایسا نہیں
تو نہ آئے یاد لیکن میں تجھے بھولا نہیں

ہوش و غفلت، رنج و راحت، وصل و فرقت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

عشق میں غافل وہ نگار رنگِ کیفیت نہ ڈھونڈھ
درد کا اٹھنا نگاہِ ناز کا اٹھنا نہیں

ایسی بھی کیا احتیاطیں اے نگاہِ شوخ یار
گدگدانا مسکرانا تیرے بس میں کیا نہیں

دل ہو یا آنکھیں ہوں کیفِ غم ہو یا کیفِ نشاط
کون پیمانہ تھا جو اس بزم میں چھلکا نہیں

حسن کی بیگانگی پر غم کی گویا حد نہیں
دل میں لیکن سوچیے تو عشق خود اپنا نہیں

کیا خبر ہم کو وہ چشمِ آشنا کیوں پھر گئی
بیخودی غم کی حریفِ رنجشِ بیجا نہیں

آج تو حسن و محبت ہو گئے تھے مل کے ایک
تو نے وہ عالم نگاہِ ناز کا دیکھا نہیں

اک جہاں لاکھوں فسانے عشق تصویرِ سکوت
درمیاں رسوائیاں ہیں رازِ دل افشا نہیں

یوں بھی آتی ہے قیامت اے خرامِ ناز یار
مٹ کے بھی دنیا محبت کی تہ و بالا نہیں

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب
عشق کی نالہ کشی تقدیر کا رونا نہیں

ہیں فریبِ احساسِ پنہاں کے سکون و اضطراب
عشق ہے وہ درد جو گھٹتا نہیں بڑھتا نہیں

اک اداسی ہے نگاہِ ناز پر چھائی ہوئی
یہ پیامِ زندگی شاید کوئی سنتا نہیں

حسن سر تا پا تمنا عشق سر تا پا غرور
اس کا اندازہ نیاز و ناز سے ہوتا نہیں

اے نگاہِ بے محابا تو نے یہ کیا کر دیا
آج دل کو دیکھ کر میں نے بھی پہچانا نہیں

اہلِ غم تم کو مبارک یہ فنا آمادگی
لیکن ایثارِ محبت جان دے دینا نہیں

ہاں اٹھا آنکھیں کہ ہو کچھ پردہ داری عشق کی
اتنی رسوائے جہاں یہ نرگسِ رسوا نہیں

زندگیِ عشق میں بھی انقلاب آ ہی گیا
آج اس کو دیکھ کر دل کا سکوں دیکھا نہیں

لے اڑی تجھ کو نگاہِ شوق کیا جانے کہاں
تیری صورت پر بھی اب تیرا گماں ہوتا نہیں

ایک حالت پر زمانے میں نہ گذری عشق کی
درد کی دنیا بھی اب وہ درد کی دنیا نہیں

دل بھی کہتا ہے ٹھہرنا عشق میں دشوار ہے　　میں بھی کہتا ہوں کہ یہ اندازِ غم اچھا نہیں
عشق جو چاہے کہے تیرے نہ سُننے کو مگر　　دل کو جو کہتا ہے وہ کچھ راز بھی ایسا نہیں
سرحدِ جذب و اثر سے حسنِ جاناں دُور ہے　　دل کی دنیا بھی محبت کی مگر دنیا نہیں
غور کر اس کیفیت پر کچھ سمجھ یہ سوز و ساز　　عشق میں دل درد کو ملتا ہے دل دکھتا نہیں
جلوۂ دار و رسن آئینۂ رنگ سکوت　　لب کشائی کو حقیقت کا کچھ اندازہ نہیں
جس کے شعلوں سے تھی کل تک گرمی بزمِ حیات　　آج اس خاکسترِ دل سے دھواں اٹھتا نہیں

تفرقوں سے پاک ہیں آنسو محبت کے فراق
حسن سر تا پا تغافل دوست و دشمن کا نہیں

ڈھارس

(از سید مقبول حسین احمد پوری)

لمبی راتوں میں جب زمستاں کی　　شمع لے کر کبھی جلاتا ہوں
اور ہلکا سگار منہ میں لئے　　گہرا گہرا دُھواں اُڑاتا ہوں

شمع کی لَو کو گھیر کر یہ دھواں　　نقش سا کھینچتا ہے ساون کا
جیسے ہلکے سحاب کے ٹکڑے　　گرد سورج کے باندھ لیں حلقا

لے کے آغوش میں اُسے اپنے　　سرخرو ہو کے مسکراتے ہوں
بھیگی آنکھوں میں ایک شاعر کی　　آنسوؤں کی ہنسی اُڑاتے ہوں

تب میں پاتا ہوں ایک آہٹ سی　　جیسے چپ چاپ کوئی آتا ہے
گدگدا کر مرے دُکھے دل کو　　مشعلِ اُمّید مسکراتا ہے

اتنا معلوم ہے کہ وہ پیکر　　دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے
اور جب یاس و بیم کا ہو وفور　　لحنِ خاموش میں یہ کہتا ہے

"یونہی گر دل کے گرد کوئی دُھواں
بادلوں کی مثال ہو رقصاں
روح ہو جائے فکر میں روپوش
تو نہ گھبرا کہ ہے وہ شعلہ بدوش"

حضرت دیوآنہ اور گاندھی ازم

از مسٹر دھیرج پرکاش بھٹناگر گشتہ

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوآنہ کا شمار ہندوستان کے بلند خیال مفکروں میں ہے اور دُنیائے ادب میں آپ کو ایک بلند مرتبہ اور امتیازی درجہ حاصل ہے۔ آپ ایک باکمال شاعر اور قابل تنقید نگار ہیں۔ سچائی اور اہنسا آپ کے کلام بلاغت نظام کا خاص جوہر ہے۔ آپ انسان کو سلوک، درد و محبت، باہمی اتحاد، کشت و خون سے احتراز، اور خوفِ خدا کی تلقین کرتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں مختلف مسائل مثلاً تصوف، تسلیم و رضا، صدق و صفا، ضبط و سنجیدگی، پختگی ایمان، کیف و سرمستی، شانِ بت پرستی، نظم کئے گئے ہیں اور ذاتی مشاہدات و محسوسات کو نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا گیا ہے۔

آپ مشرقی فلسفہ کے دلدادہ اور مہاتما گاندھی کے سچے پیرو ہیں۔ آپ نے شاعری کے ایک نئے اسکول کی بُنیاد ڈالی ہے۔ آپ کا اندازِ بیان مختلف اور آپکی روش جداگانہ ہے۔ اہنسا آپ کا مسلک ہے۔ اور اعتدال پسندی شیوہ۔ جس کے متعلق آپ خود فرماتے ہیں ؎

جو لذت اعتدال میں ہے میری روح کو — جذب اور سعی کے وہ نہیں فرط و فور میں

آپ نے اپنے کلام کے ذریعہ اعتدال اور اہنسا ہی کا پیغام دیا ہے۔ اسی وجہ سے میں آپکو گاندھی ازم کا خاص شاعر سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک بجز حضرت دیوآنہ کسی شاعر نے اس موضوع پر اظہارِ خیال نہیں کیا ہے ؎

آپ نے اہنسا کے متعلق کتنا بھولا بھالا مضمون قلمبند کرکے اپنی طرزِ زندگی سے آگاہ کیا ہے ؎

چیونٹی کو بھی ہے جان ہماری طرح پیاری — چیونٹی کو بھی دانستہ اذیت نہیں دی ہے

شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بقول حضرت دیوآنہ ؎

مری طرزِ ادا میں میری طرزِ زیست ہے پنہاں — میرا مضموں مرے مقصودِ ہستی سے عبارت ہے

جو مرد باخدا ہے اور جس کو خدا کی ذات پر یقین ہے۔ جو پرماتما سے ڈرتا اور بدی سے احتراز کرتا ہے وہ کبھی کسی کی مزاحمت نہ کرے گا شر و فساد و کشت و خون سے اُسے واسطہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے

نہیں کہ وہ کشت و خون سے گھبراتا ہے یا بزدل ہے اور اپنے دشمن سے خوف کھاتا ہے بلکہ وہ خدا کی نظم کائنات میں کسی قسم کا انتشار پیدا کرنا گناہ عظیم سمجھتا ہے ؎

تیری مدافعت کی تو تھی تاب اے حریف ۔۔۔ اپنے خدا سے ڈر کے میں غصے کو پی گیا
جسے خدا کی تنظیم کائنات کا لحاظ ہو ۔۔۔ وہ دین و دل کی بزم میں فساد کیوں بپا کرے
ہر اک طرح کے کشت و خون سے صوفیہ نفور ہیں ۔۔۔ نہ ڈھائیں گے حریم دل ہو یا کہ سومنات ہو

جو شخص اہنسا کا معتقد ہے اور نیکی ہی جس کا دھرم ہے اور جو دوست دشمن میں کوئی تفریق نہیں سمجھتا۔ اس کو ہر بدی میں بھی نیکی شائبہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بدی کا بدی سے نہیں بلکہ نیکی اور ضبط سے بدلہ لیتا ہے اور دشمن کو اپنی بدی پر پشیمان ہونے کا موقع دیتا ہے۔

دشمن سے بدلہ لینے کا آسان طریقہ حضرت دیوانہ نے تجویز کیا ہے ؎

کہتا ہوں کہ لو نیکی اک اور آپ نے کی ہے ۔۔۔ دشمن سے لیا کرتا ہوں یوں بدلہ بدی کا

اِس سادگی کی شوخی بھی ملاحظہ ہو ؎

اُس کو گالی کا کچھ مزا نہ ملا ۔۔۔ ہم نے دشمن کی بات ہی نہ سنی

دشمن آخر انسان ہی تو ہے، سنگ و خشت تو نہیں۔ کہاں تک شرمندہ نہ ہو ؎

اس کو اُسی کی نظروں میں آخر زبوں کیا ۔۔۔ دشمن کے حملے کا نہ دیا ہم نے کچھ جواب
دیکھا جو ہم حزیں نہیں اپنی شکست سے ۔۔۔ کچھ لطف اُٹھا سکا نہ حریف اپنی فتح سے

حضرت دیوانہ ملکی مفاد کے لئے بجز اہنسا یا عدم تشدد، ہر دیگر تحریک کو بیجا ہے وہ سوشلزم ہو یا اشتراکیت، فیسی ازم ہو یا کچھ اور۔ غیر ضروری اور مضر خیال کرتے ہیں۔ جو اشتراکیت کے حامی ہیں۔ وہ عدم تشدد کو بزدلوں کی تحریک کہکر اُس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں۔ اہنسا بزدلوں کا نہیں جانبازوں کا ہتھیار ہے۔ جس کو بزدل استعمال ہی نہیں کر سکتے۔ اور پھر یوں دیدہ دانستہ نہتے ملک کو تشدد کی آگ میں جھونکا بھی کس طرح جا سکتا ہے؟ مفلس و نادار بے یار و مددگار قوم کو بغاوت کیلئے آمادہ کرنا سراسر نادانی اور صریحاً خلاف دانشمندی ہے۔ جب صدیوں کی غلامی نے اس قوم کے اعضائے عمل کو مضمحل اور دماغی ارتقا کو کمزور کر دیا ہے تو کوئی بھی ٹانک یکدم سے اس کے مفلوج جسم میں برقی حرکت پیدا نہیں کر سکتا۔ بجز عدم تشدد اس کے لئے دوسرا چارہ ہی نہیں۔ اگر ملک کو نجات ہوسکتی ہے تو عدم تشدد سے تشدد کے کارگر نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کے افراد جداگانہ راستوں پر گامزن ہیں۔ اُنمیں صحیح عمل کرنے کی اہلیت نہیں۔ اتفاق و اتحاد کی صلاحیت نہیں۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے ؎

افراد میں جب خوبیٔ کردار نہیں ہے ۔۔۔ ہو قوم میں کس طرح صلاحیتِ نیکی

اِس لئے شاعر اہنسا پر ہی اعتقادِ کلّی رکھتے ہوئے کہتا ہے ؎

عدم تشدّد اصولِ حیات ملی ہے — اسی عمل میں ہے افراد کو ظفر کی اُمید

وہ سوشلزم۔ اشتراکیت وغیرہ سب کو ایک سراب سمجھتا ہے۔

ملوکیت بھی دھوکا، اشتراکیت بھی دھوکا ہے — مجھے اِن سے غرض کیا جب مرا ایماں سلامت ہے

مہاتما گاندھی جی کی طرح دیوانہ صاحب بھی ایسی آزادی کو جو خونریزی اور بے گناہوں کا خون بہا کر حاصل ہو، غلامی سے بدتر خیال کرتے ہیں۔ ایسی آزادی پر وہ غلامی ہی کو ترجیح دیتے ہیں ؎

وہ حریت نہیں اچھی جو خونریزی سے حاصل ہو — وہ دولت ہے بُری ایمان و غیرت جسکی قیمت ہو

گاندھی ازم اور اُس کا حاصل کیا ہے ؎

آفت سے ہے فراغ، حقیقت سے ہے فروغ — گاندھی کی یہ بتا رہی ہیں رہنمائیاں

محبت اور سچائی ہی وہ راستہ ہے جو ہم کو منزلِ مقصود تک لے جاسکتا ہے۔ محبت خدا ہے اور محبت ہی حقیقت ہے، اور خدا کی عبادت کیا ہے؟ محبت! خدمتِ خلق بھی ایشور کی سب سے بڑی عبادت ہے بہت بڑی تپسیا اور قربانی ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں مارے مارے پھرنے کا نام یا جسم کو تکلیف دینے کا نام سادھن یا تپسیا نہیں، بلکہ غریب اور بیکس کی حاجت روائی اور دین دکھیوں کی سیوا کا نام تپسیا ہے معرفتِ حق اور پرماتما کے درشن تارک الدنیا ہونے سے حاصل نہیں ہوتے۔ یہ محض وہم و گمان ہے۔ اگر واقعی خدا کا قرب حاصل کرنا ہے تو دوسرے کا شریکِ درد بن جاؤ ؎

ہر اک کا ہو شریکِ درد محفلِ حیات میں — یہ اشتراک کارتیری سرمدی حیات ہے

جو دوسرے کی تکلیف اپنی تکلیف سمجھتا ہے وہی اِس شعر سے لُطف اندوز ہوسکیگا ؎

کسی محتاج کی حاجت روائی کر کے تم دیکھو — کہ اپنا درد گھٹتا ہے کسی کی شرکتِ غم سے

محبت میں سنگ کو بھی موم بنا دینے کی تاثیر ہے۔ محبت ہی سے دلوں کو تسخیر کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی سے فیضِ روحانی حاصل ہوتا ہے۔ یہاں محبت کی عظمت یوں بیاں کی ہے ؎

محبت ہی عبادت ہے، محبت ہی حقیقت ہے — محبت اک توازن ہے، محبت ایک قوت ہے

اپنی نظم "میرا پیغام" میں لکھتے ہیں ؎

میرا پیغام تو بس بے سروسامانیِ غم ہے — محبت ہے تو سب کچھ ہے، نہیں تو بربریت ہے

اور بغیر محبت، جور و ظلم سے کسی کو زیر کر لیا تو کیا ؎

خدا کے بندوں کو کر لیا غلام تو کیا — تسلطِ دلِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جو طاقتور اور دولتمند ہے وہ اپنی قوت اور ثروت کے زعم میں، غریب اور کمزور کی کوئی بساط نہیں سمجھتا۔

اس کی نظر میں ہر شے حقیر، ذلیل اور بے حقیقت ہے۔ وہ فتح وظفر ہی کو اپنی خوشی کا باعث سمجھتا ہے لیکن یہ خیال حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ اصل میں حقیقی خوشی اور راحت سکونِ قلب سے حاصل ہوتی ہے مادہ پرستی میں اگر دائمی سُکھ اور شانتی ہوتی۔ تو مادہ پرستی سے تنگ آکر اس کی ناپاکیوں سے متنفر ہو کر روحانی کثافتوں سے گھبرا کر خود مادہ پرست قوم کے افراد نہ ویدانت اور روحانیت پر ایمان لاتے اور نہ ہستیٔ غیب کے متلاشی نظر آتے۔ سکونِ قلب ہی سے روحانی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی عالمگیر شانتی اور امن کی بنا ہے ؎

فریب شورشِ فتح وظفر نہ کھا ہرگز سکونِ قلب فراواں نہیں تو کچھ بھی نہیں
سکونِ قلب کے جہاں میں گردشِ زماں نہیں مکاں کی قیود سے پرے سکونِ ذات ہے

دُنیا کے فلاح وبہبود کو حضرت دیوانہ نے بہت بڑا رتبہ دیا ہے اور درد وسلوک ہی کو روح کے فروغ کا باعث ٹھہرایا ہے۔ دُنیا کے جتنے بھی ریفارمر، سادھو، سنت اور صوفی مہاتما گذرے ہیں۔ ہر ایک نے رفاہ عام اور بہبودیٔ عالم کا خیال رکھا۔ جو بھی تحریک یا اسکیم پیش کی دُنیا کی بھلائی کے لئے۔ بھگوان بدھ نے بھی اپنے پیروؤں کو اسی کا اُپدیش دیا کہ ہر جاندار کے ساتھ درد ومحبّت کا سلوک کریں۔ ایذا رسانی گناہ ہے جو کام ہو وہ سنسار کی بھلائی کے لئے ہو۔ مہاتما گاندھی نے بھی اسی تحریک کو از سرِ نو زندہ کیا۔ دُنیا کس طرف جا رہی ہے۔ یہ نظروں کے سامنے ہے۔ ہر شخص امن اور شانتی کا متلاشی نظر آتا ہے۔ لیکن شانتی جنگ وجدل اور خون خرابہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ اسی وقت حاصل ہوگی کہ جب ہر شخص ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھیگا۔ دوسرے کی حق تلفی نہ کریگا۔ بقول دیوانہ ؎

سب کے مفاد شامل اپنے مفاد میں کر آئے خودی میں تیری تا معرفت خُدا کی
وہی ملک شمائل آدمی ہے زینتِ حیات ہو جس کے دل میں جاگزیں فلاح وحش وطیر بھی
سلوکِ درد ومحبت سے روح کو ہے فروغ فراغ عشرتِ عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

حضرت انسان خود کو اشرف المخلوقات کہکر کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اس شرف پر آپ کو کسقدر ناز ہے مگر دوسرے کے حقوق کی پامالی کرتے ہوئے حضرت مطلق نہیں شرماتے۔ غریب کے حقوق دبا کر اسکی حفاظت کا دعویٰ دار بنتا ہے۔ حضرت دیوانہ اس شرف کو یوں نظم کرتے ہیں ؎

ہے وحش وطیر پہ تیرا اشرف محبت سے تو اہلِ حق کا نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مثال کے طور پر وہ مہاتما گاندھی کو اس ثبوت کے لئے پیش کرتے ہیں۔ جو اہلِ حق کا پاسبان اور اُن کا طرفدار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ شاہ بے تاج کہلاتا ہے کیونکہ اس کا تمام دُنیا کے دل پر تسلط ہے۔ وہ

عالمگیر محبت کا پیغامبر اور امن کا دیوتا ہے۔ اور حضرت دیوآنہ اُس کے سفیر ہیں ؎

ہے دل کی مملکت پہ تسلط فقیر کا　　اجسام ناتواں پہ ہو فرماں روا امیر

مہاتما گاندھی ہی کی وہ شخصیت ہے جس نے جبر و تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اسی نحیف الجثہ انسان نے صرف اہنسا اور اپنے روحانی بل سے بارہا تشدد کا مُنھ پھیر دیا ؎

خدا کا شکر کہ نکلا تو مردِ میداں ایک　　لگائیں جس نے تشدد پہ چند ضربِ شدید

ایک محبِ وطن اور حبیب قوم کی طرح جناب دیوآنہ کے حساس دل میں بھی وطن کا درد اور ملک کی محبت ہے۔ وطن کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر اُن کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ گھبرا کر کہنے لگتے ہیں ؎

اے کعبہ و کلیسا بالفعل مل کے بیٹھو　　جھگڑے کو اپنے چھوڑو کل کے لئے خُدا پر

یہ گھریلو معاملات تو پھر بھی طے ہوتے رہیں گے۔ پہلے تو حصول آزادی کے لئے جو ہم سب کا نصب العین ہے اپنے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو بالائے طاق رکھکر، یک دل، یک زبان اور ہمخیال ہو کر دل و جان سے کوشاں ہونا چاہئے۔ وطن کی آزادی ہی ہم سب کی آزادی، اور ہماری آزادی وطن کی آزادی ہے۔ غلام ملک آزاد قوموں کی نظروں میں کوئی جگہ اور وقعت نہیں رکھتا۔ غلام قوم کی ہر جگہ بے عزتی ہوتی ہے ؎

ہے قوم کے عروج پہ، عروجِ فرد منحصر　　ہیں اپنی کامیابیاں وطن کی کامرانیاں

پیشتر اس کے کہ یہ مضمون جسمیں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اِس شعر پر ختم کیا جائے ؎

ہوس زمانے پہ چھا رہی ہے سموم تخریب کار ہو کر　　محبت آفاق پر برس جا تو ابرِ جانِ بہار ہو کر

میں حضرت دیوآنہ کے کلام کے چند اچھوتے نمونے، جنمیں اُنھوں نے ہندو مذہب کی نمایندگی کا اظہار کیا ہے، پیش کرونگا ؎

ہم دیکھتے ہیں نقش و نگارِ صنم کہاں　　محو ستیں ہیں حضرت مبت کے حضور میں

جس کو ہر شے میں اپنے معشوقِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اُس کو اِتنا ہوش کہاں کہ مبت کو مبت سمجھے۔ وہ تو اپنے محبوب کے دھیان میں اِتنا مگن ہے کہ اُس کو اس کے نقش و نگار نظر ہی نہیں آتے۔ اِسی لئے کہتے ہیں ؎

تو بندۂ خیال ہے میں بندۂ صنم　　غار سبہ میں تو ہے میں آغوش نور میں

چوم لے بت خانۂ عالم کا ہر نقش و نگار　　خود خدا کرتا ہے کیا کیا دلبری تیرے لئے

صنم کدوں میں آکے وحشتیں بھی رام ہو گئیں　　ہوس کی موت عشق ہے غم صنم نجات ہے

ایماں جو نہ دل میں ہو آتے ہیں نظر پتھر　　نظروں سے مری دیکھو انوارِ صنم خانہ

مبت شکن لے گیا زر و جوہر　　رہ گئی حسن و عشق کی دولت

ہر اک ضرب بت پر اصل میں خدا پہ چوٹ ہے　　کہ ایک ہے معاملہ خدا و بت تراش کا

ہے شدت یقیں سے کافر حریف مومن　　پتھر کے چومنے سے پتھر بھی بولتا ہے

"میں اور تُو"

از اختر ہوشیار پوری بی۔اے

مرے شباب کی راتوں میں جلوہ گر ہے تُو
ترے شباب کی راتوں کا رازداں ہوں میں

شباب و حُسن کی دُنیا میں تجھ سے رونق ہے
شراب و شعر کی دُنیا کا پاسباں ہوں میں

ملی ہے تجھ کو تو اوّل سے لذّتِ ابدی
ازل کے روز سے مصروفِ امتحاں ہوں میں

تجھے طلسمِ جہاں کی حقیقتیں معلوم
مجھے تو اتنی خبر بھی نہیں کہاں ہوں میں

تو ایک صدر نشینِ بہشتِ ناز و نعم
خراب و خستہ پسِ گردِ کارواں ہوں میں

تو وہ چمن ہے کہ اُگتی ہے زندگی جس میں
اور آرزوئے دلِ مرگِ ناگہاں ہوں میں

ہے تیرا ذکر سرِ عرش و بر سرِ کعبہ
مرا یہ حال کہ گمُ کردۂ جہاں ہوں میں

زمانہ کرتا ہے تجھ سے تو اکتسابِ سرور
جہاں میں باعثِ تکلیفِ دوستاں ہوں میں

ثبات تجھ کو جو حاصل ہے حُسن و خوبی میں
تو اپنے مشربِ وحشت میں جاوداں ہوں میں

اگر تو میری محبت کا آئینہ ہے ندیم
ترے بہشتِ صداقت کی داستاں ہوں میں

تو مجھ کو جان چکا ہے، میں تجھ سے واقف ہوں
کہ میرا راز ہے تو، تیرا رازداں ہوں میں

صوبہ متحدہ کی موجودہ جبریہ تعلیم

از مسٹر شیو نراین نگم، بی۔ کام۔ سی۔ ٹی

ہندوستان میں جہاں سیکڑوں اور خرابیاں ہیں، وہاں تعلیم کے لحاظ سے بھی ہمارا ملک بہت بگڑا ہوا ہے محبانِ وطن نے جہالت کی تاریکی رفع کرنے کیلئے ملک کو تعلیم یافتہ بنانے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی ہے۔ لیکن گورنمنٹ سے کافی مدد نہ ملنے سے ترقی کے راستے میں غیر معمولی رکاوٹیں حائل رہیں۔ تعلیم کی اشاعت میں "بے روزگاری" کا مسئلہ بھی درمیان میں آگیا ہے جو غور طلب ہے۔ جبریہ تعلیم کا موجودہ قانون صرف آنسو پونچھنے کیلئے ہو۔ اس صوبہ میں جبریہ تعلیم کا آغاز ایکٹ ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۶ء کے مطابق ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کا قانون میونسپلٹیوں کے لئے اور ۱۹۲۶ء کا قانون ڈسٹرکٹ بورڈوں کیلئے پاس ہوا تھا۔ ان دونوں میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ کسی شہر یا ضلع کے کسی حصہ میں اس کا نفاذ ہو، اس کی منظوری بورڈ سے لازمی ہے میونسپلٹی میں ⅔ دو تہائی ممبران اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں نصف سے زائد ممبران کی تائید ضروری ہے۔ اس کے بعد اسکیم کی منظوری گورنمنٹ دیتی ہے اور اجازت ملنے پر اسکیم گزٹ میں شائع کی جاتی ہے اور اس کا نفاذ شروع ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی لازمی تعلیم کا آغاز اُسوقت تک نہیں ہوسکتا ہے۔ جب تک لڑکوں کو جبری تعلیم نہ ملنے لگے۔

ان دونوں قوانین کے مطابق جبری تعلیم کے لئے بچوں کی عمر ۶ چھ سے ۱۱ گیارہ سال تک مقرر کی گئی ہے ڈسٹرکٹ بورڈ، پرائمری ایجوکیشن ایکٹ کے مطابق مسلمانوں کی لڑکیوں کے لئے ۵ پانچ سے ۹ نو برس تک تعلیم دینا لازمی ہے۔ اس کے لئے وارڈ یا گاؤں کے بچوں کا شمار ماہ فروری میں کیا جاتا ہے تاکہ آنیوالے تعلیمی سال میں یہ اندازہ ہوجائے کہ کتنے بچے تعلیم پانے کیلئے مستحق ہوگئے ہیں۔ اس کے واسطے اُنکے والدین پر ماہ جولائی ہی سے نوٹس تعمیل ہونے لگتے ہیں۔

سب سے اہم بات جو غور طلب ہے، یہ ہے کہ جو عمر بچوں کے لئے سرکار نے مقرر کی ہے، وہ بہت کم ہے۔ دراصل ۱۱ گیارہ سال کے بجائے ۱۳ تیرہ یا ۱۴ چودہ سال تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اطفال شماری کے دنوں میں بچوں کی عمر اور تاریخ پیدائش وغیرہ ٹھیک ٹھیک درج

نہیں کراتے۔ اکثر لوگوں کو اپنے بچوں کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ بھی نہیں رہتا اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی یادداشت ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ خصوصاً دیہات کے باشندے انگریزی تاریخ و مہینہ سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں اور دیہات میں اموات و پیدائش کے باقاعدہ رجسٹر بھی نہیں رکھے جاتے ہیں۔ اسکا کچھ حال پولیس تھانوں سے ملتا ہے۔ لیکن یہاں کے کل اندراجات چوکیداروں پر منحصر ہیں۔ جو لوگ دیدہ دانستہ ٹھیک عمر وغیرہ جانتے ہوئے بھی پتہ نہیں دیتے ہیں۔ اُن کی تنبیہ کے لئے قانون میں کوئی دفعہ موجود نہیں ہے دوسری دقت طلب بات یہ ہے کہ لازمی تعلیم کے حلقوں میں پست اقوام اور اچھوت ذات کے لوگوں کو عام طور پر تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس لئے اطفال شماری کے وقت وہ لوگ اکثر غلط نام و عمر و سرپرستی لکھا دیتے ہیں۔ اِن غلطیوں کی تصحیح کرنا بہت دشوار طلب ہے۔ شہروں میں فوت و پیدائش کے رجسٹروں سے بھی مدد لینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہ بھی کارگر نہیں ہوتی۔ جس زمانہ میں نوٹس نکلنے شروع ہوتے ہیں اُسی وقت ان کی غلطیوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ عموماً مدرسین جن کی مدد سے اطفال شماری ہوتی ہے اُلٹے سیدھے نام لکھ کر کے روانہ کر دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اِس کام کے لئے اُن کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا ہے۔ اِس لئے انھیں اس بارہ میں کوئی دلچسپی بھی نہیں ہوتی ہے۔

بہرحال بغیر کسی پس و پیش کے کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے یہاں لازمی تعلیم کو وہ کامیابی نہیں ہوئی جو اُس کو ہونا چاہئے تھی۔ اِس کے وجوہ ظاہر ہیں۔ صوبے بھر میں صرف چند مقامات میں لازمی تعلیم کا رواج بالکل اس طرح سے ہے جیسے ریگستان میں پیاس کی شدت دُور کرنے کیلئے کہیں کہیں مسافروں کے آرام و آسائش کے لئے کچھ سایہ دار درخت لگا دیئے جائیں۔ بالکل یہی حال لازمی تعلیم کا ہے جو تمام صوبے کے صرف چند ٹکڑوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ سچ پوچھئے تو اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے بلکہ نفع کے بجائے اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ جسوقت والدین پر نوٹس تعمیل کئے جاتے ہیں تو جو لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانا نہیں چاہتے ہیں وہ مقدمہ قائم ہونے کے خوف سے اپنی جائے سکونت تبدیل کر دیتے ہیں اور قریب ہی کسی ایسی جگہ پر آباد ہو جاتے ہیں جہاں جبری تعلیم رائج نہیں ہے یہ کارروائی دیہات کے بہ نسبت شہروں میں زیادہ آسانی سے ہوتی ہے کیونکہ اکثر شہروں میں صرف چند ہی وارڈوں میں جبریہ تعلیم کا ایکٹ نافذ ہے۔ دیہات میں آمد و رفت کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے لوگ آسانی سے نقل مکان نہیں کر سکتے ہیں۔

نوٹس ماہ جولائی سے تعمیل ہونے لگتے ہیں اور اُن کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہتا ہے اِس درمیان میں بہت سے بچے جن کے ورثا کسی نہ کسی طرح سے قانون کی تعمیل سے بچتے چلے آتے ہیں، زائد عمر حاصل کر لیتے ہیں اور اُن کے والدین قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں۔

بہت سے اصحاب جبریہ حلقہ میں رہتے ہوئے بھی تاوقتیکہ اُن پر نوٹس نہ جاری ہو، بچوں کو کسی اسکول میں بھرتی نہیں کراتے۔ میری رائے میں یہ اشد ضروری ہے کہ والدین کو ماہ جولائی تک اپنے اپنے بچوں کی عمر کی اطلاع دینا لازمی کردیا جائے تاکہ بچوں کا تعلیمی سال ضائع نہ ہو۔

اس قانون کے مطابق چھ وجوہ ایسے ہیں، جن پر کسی بچہ کو جبریہ تعلیم سے مستثنےٰ کیا جاسکتا ہے۔ اسمیں ایک وجہ مذہبی تعلیم بھی ہے۔ مسلمان صاحبان چونکہ مذہبی تعلیم کے زیادہ قائل ہیں۔ اس لئے وہ اکثر اپنے جوابات میں یہی وجہ لکھدیا کرتے ہیں۔ غالباً قانون کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس وجہ سے یہ لوگ بری کردیے جائیں۔ بلکہ ان سے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ بچوں کو تعلیم دلانے میں اُنھیں کون سی مذہبی وجہ حائل ہے اور کس خیال سے وہ اپنے لڑکوں کو تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔

میرے خیال میں باقاعدہ تعلیم دینے سے مذہبی تعلیم پر نہ کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ کسی قسم کے دخل مداخلت کا اندیشہ ہے۔ مذہبی تعلیم جلد شروع ہوجانے سے عموماً بچے ریاضی اور لکھنے والے مضامین سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ اور ان کی علمی لیاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ میری رائے میں اگر والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو یہ تعلیم اُنھیں ایسے وقت میں دی جائے کہ اُنھیں دیگر مضامین سیکھنے کا بھی موقع رہے۔ لیکن اہل اسلام مذہبی تعلیم کے زبردست حامی ہیں۔ اس لئے ان کی جبریہ تعلیم کیلئے ایسے اسکول قائم ہونا چاہئے۔ جہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انھیں لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ بھی سکھایا جاسکے۔ مسلمانوں کیلئے اسلامیہ مکاتب، ہندوؤں کے لئے پاٹھ شالے قائم ہوسکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے کچھ لوگوں کی دلی خواہش پوری ہوجائے گی۔ لیکن ہندوستان ایسے بدقسمت ملک میں جہاں ذرا ذرا سی بات پر فرقہ وارانہ رنگ دیا جاتا ہے، فرقہ وارانہ مدارس کو زیادہ تعداد میں کھولنے سے موجودہ فضا میں ایک اور بدمزگی پیدا ہوجائیگی۔

جبری تعلیم کے ایکٹ کے مطابق جو والدین نوٹس کے تعمیل ہونے پر بھی اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلاتے اُن پر کمیٹی کی منظوری سے مقدمہ چلایا جاسکتا ہے اور پانچ روپیہ جرمانہ ہوسکتا ہے۔ مسلسل جرم کی صورت میں ایک روپیہ روزانہ کا جرمانہ اُس وقت تک کیا جاسکتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بچوں کو کسی اسکول میں داخل نہ کرادیں۔ مگر بعض اوقات عدالتیں اُن کو بلا کسی تنبیہ کے بھی بری کردیتی ہیں جسکا اثر بہت خراب پڑتا ہے۔

جبریہ تعلیم کے لئے شہروں میں ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے، دیہات میں ایک مقامی کمیٹی رہتی ہے۔ مگر دونوں اکثر کمزور ثابت ہوتی ہیں اور مقدمات قائم کرنے یا نہ کرنے کی منظوری دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔ کیونکہ ممبر صاحبان شاذ و نادر کوئی دلچسپی لیتے ہیں۔

ہمارے اسکولوں کی عمارتیں بھی خواہ وہ جبریہ تعلیم کے لئے ہوں یا معمولی مدارس کی۔ گاؤں میں ہوں یا

شہروں میں عموماً سب بے قاعدہ بنی ہیں۔ اور اُنمیں نہ طالب علموں کی تعداد کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ اسکول ایسی جگہ بنائے جائیں، جہاں بچے دن کی تعلیم ختم کر کے کھلے میدان میں جسمانی ورزش اور دوسرے کھیل کود میں شامل ہو سکیں۔ گاؤں کے اکثر اسکول ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے چاروں طرف گندگی اور غلاظت پھیلی ہوتی ہے۔ حالانکہ اسکولوں کو گاؤں کے باہر درختوں کے سایہ تلے بنانا چاہئے اور ہر لڑکے کے لئے کم سے کم نو فٹ مربعہ جگہ کی گنجائش رکھنا چاہئے۔ شہروں میں جگہ کی تنگی خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ اکثر اسکول گلی کوچوں میں ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے کرایہ کے مکانوں میں ہوتے ہیں جن کی عمارتیں یا تو بالکل شکستہ ہیں یا اُنمیں ہوا اور روشنی کا بھی گذر نہیں ہے۔ ان نقائص کے باوجود بھی اسکولوں کی عمارتیں پاس کر دی جاتی ہیں، اور افسرانِ تعلیم بھی ان نقائص کو رفع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کی رپورٹوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ حالانکہ ان تمام باتوں میں سررشتہ تعلیم کو پورے اختیارات حاصل ہونا چاہئے۔ درحقیقت محکمہ تعلیم کے لئے ایک ڈکٹیٹر کی اشد ضرورت ہے۔ جس کے انتظام میں ہر کس و ناکس کو دخل دینے کی اجازت نہ ہو۔ میونسپلٹیوں کو اسکول کی عمارتیں بناتے وقت ان تمام باتوں پر دھیان دینا چاہئے

فریادِ مصیبت یا شکرانۂ رحمت

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے

تاریک فضاؤں میں گھنگھور گھٹاؤں میں
انسان کی کشتی ہے موجوں کی بلاؤں میں

پُرجوش تلاطم میں، پُرہول تصادم میں
ٹوٹا ہوا لنگر ہے آفت کی ہواؤں میں

ہنگامۂ پیہم میں، اس ورطۂ عالم میں
گردابِ مصیبت میں، مغموم گھٹاؤں میں

کرتا ہے سفر انسان مشکل ہے مگر اس سے
وہ سانس نہ لے پایا مسموم ہواؤں میں

ہر موج جفا پرور، ہر لحجہ ستم گستر
جانبر کوئی کیونکر ہو خونخوار ہواؤں میں

انسان تو ناداں ہے رحمت بھی تو پنہاں ہے
اک لطفِ فراواں ہے در پردہ جفاؤں میں

آشوبِ جہاں کی ہے آغوش میں مستقبل
اک شورِ سکوں پرور ہے اسکی صداؤں میں

جب رازِ ہوا روشن منزل ہی چمک اُٹھی
لے ساز کی پائی ہے پُر درد نواؤں میں

محبوب حقیقی وہ محبوب حقیقی ہے
لمعاتِ محبت ہیں جانسوز اداؤں میں

فریادِ مصیبت شکرانۂ رحمت ہے
مدہوش حقیقت کی دلدوز بکاؤں میں

"پیتا ہوں"

(از حضرت تاباں نقوی)

تعیّنات کی قیدیں اُٹھا کے پیتا ہوں
کلیم و طور کے قصّے بُھلا کے پیتا ہوں
حدیثِ دار و رسن گنگنا کے پیتا ہوں
ہر ایک موج میں مے کی سما کے پیتا ہوں
شراب کو بھی شرابی بنا کے پیتا ہوں

کبھی مَیں اُن سے نگاہیں مِلا کے پیتا تھا
تمام ہستیِ دل کو جگا کے پیتا تھا
مسرّتوں کے خزانے لُٹا کے پیتا تھا
اب آئینہ سے نگاہیں لڑا کے پیتا ہوں
تمام عالمِ امکاں پہ چھا کے پیتا ہوں

قسم قسم تری بہکی ہوئی نظر کی قسم!
جو کھیلتی ہے ترے لب پہ اُس سحر کی قسم
رُکا ہوا ہے جو پلکوں پہ اُس گہر کی قسم
بدل بدل کے مزا، مسکرا کے پیتا ہوں
حسیں لبوں کا تبسّم مِلا کے پیتا ہوں

جنابِ شیخ و شریعت کو آنکھ دکھلا کر
غمِ حیات کو موجوں میں مے کی نہلا کر
رگوں میں آتشِ نغمہ و شعر بھڑکا کر
زمیں کی سطح فلک سے مِلا کے پیتا ہوں
فلک کو اپنے قدم پہ جھکا کے پیتا ہوں

گناہ و مذہب و نارِ جحیم و باغ ارم
مساجد اور کلیسا و خانقاہ و حرم
خوشی و عیش و مسرت تفکرات و الم
ہر اک کو موج پہ مے کی بہا کے پیتا ہوں
خرد سے ہوش سے دامن چھڑا کے پیتا ہوں

مری نظر میں ہیں آنکھوں کے اُن کی میخانے
سُنا رہا ہوں اُنہی کو اُنہی کے افسانے
چھلک رہے ہیں مری چشمِ تر کے پیمانے
اچھوتے نغمے، نئی دُھن میں گا کے پیتا ہوں
نہ صرف پیتا ہوں بلکہ پلا کے پیتا ہوں

شراب پیتا ہوں میں بھی بہت مگر الطاف
مری نگاہ نہیں کرتی میکدے کا طواف
مرا ہے دل مئے سیّال کے بغیر ہی صاف
اشارہ چشمِ مشیت کا پا کے پیتا ہوں
کسی کو لوٹ کے خود کو لُٹا کے پیتا ہوں

مری شراب کو کچھ حاجتِ سُبو بھی نہیں
تری شراب کا سا اِس میں رنگ و بو بھی نہیں
لبوں سے جام لگانے کی آرزو بھی نہیں
وفورِ ناز میں سر کو جھکا کے پیتا ہوں
جبینِ شوق میں کعبے بسا کے پیتا ہوں

ترے شباب نے یہ مے اگر نہیں چکھی
تو میں سمجھتا ہوں ناکامیاب ہے تو ابھی
ملی ہے اس میں بھی کچھ کچھ گنہ کی شیرینی
اِسے شراب میں اپنی ملا کے پیتا جا!
ہر ایک قطرہ کو دریا بنا کے پیتا جا!

پگلی

شیورانی دیوی (مسز پریم چند) کا ایک قصہ

اُرملا کو بیوہ ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ زندگی کی بنیادی چیزیں خواب کی سی تصویر بن کر رہ گئی تھیں۔ اسی کے سہارے وہ سوتی، جاگتی، ہنستی اور روتی تھی۔ اُرملا اپنے سسرال نہ جانے پائی تھی۔ شادی کے وقت اُس کی عمر سولہ سال کی تھی۔ اس وقت اس نے ایک ایسی تصویر ضرور دیکھی تھی۔ جس کا عکس اب بھی اُس کے دل پر قائم تھا۔ سیانی ہو کر اُس نے سُنا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ وہ فنِ مصوری سے واقف تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی ایک تصویر تیار کی۔ اُسے ایک بڑے چوکھٹے میں لگا کر اور کمرہ میں آویزاں کر کے اپنے شوہر کا تصور کرنے لگی۔ کچھ دنوں میں وہ اس تصویر سے باتیں کرتے ہوئے دیکھی گئی۔ رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ نہ کھانے کی فکر اور نہ کام کا خیال لوگوں نے سمجھا کہ اُرملا پگلی ہو گئی ہے۔

ایک دن اُرملا کی سہیلی بملا اس کی ملاقات کو آئی۔ اُرملا پگلیوں جیسی بیٹھی تھی۔ بملا کو دیکھتے ہی اُرملا بول اُٹھی "بہن! بہت دنوں کے بعد تم نے میری سُدھ لی؟"

بملا۔ "بہن! میں غافل تھی تو تمھیں نے کون میری خبر لی؟ خیر۔ یہ تمھاری حالت کیا ہو رہی ہے، بالکل پگلی بنی بیٹھی ہو۔"

اُرملا ہنستی ہوئی بولی۔ "نہیں تو! میری حالت بہت اچھی ہے۔"

بملا کو اُرملا کی باتوں سے بہت دُکھ پہونچا۔ وہ دل میں غور کرنے لگی کہ کیا دُکھ بھی لاعلاج مرض ہوتا ہے۔ اُرملا شادی کے پہلے کیسی تھی اور اب اُس کی کیا حالت ہے۔ بملا انھیں خیالوں میں ڈوب گئی۔ اُرملا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اُرملا کی بڑی بھاوج پاربتی نے بملا کو دیکھا۔ دوڑ کر گلے سے لگاتی ہوئی بولی۔ "بی بی! آپ جب سے سسرال گئیں ان کا یہ حال ہو گیا۔ گھر کی ساری رونق جاتی رہی۔"

بملا:۔ "اُرملا تو پگلی ہو گئی ہے۔"

پاربتی "میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔ اچھا ہی ہوا کسی طرح جی تو بہل جاتا ہے آپ کے بھائی صاحب کی رائے تھی کہ دوسری شادی کر دی جائے لیکن یہ راضی نہیں ہوتیں"۔

بملا۔ "کہاں گئیں؟"

پاربتی "آپ نے ان کا کمرہ دیکھا؟ ان کے سر پر کسی کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی صحت درست ہے۔ اسی سے زیادہ فکر نہیں ہے"

بملا۔ "چلو۔ دیکھوں بھابی ادھ کرتی کیا ہیں؟"

دونوں دروازے پر آئیں

اُرملا اپنا کمرہ بند کئے بیٹھی تھی۔ پاربتی اور بملا نے آواز دی۔

اُرملا دروازہ کھولتی ہوئی بولی۔ "یہاں کوئی ضرورت نہ تھی تمھاری"

بملا ہنس کر بولی۔ "بہن! میری کوئی ضرورت نہ تھی، تو میں تم سے روٹھ گئی"

اُرملا ہنسی۔ بملا کو گلے لگا کر بولی "روٹھو نہ بہن! تمھیں جھولا جھلاؤں گی"

بملا ہنستی ہوتی۔ "چلو!"

پاربتی مسکراتی ہوئی بولی "بی۔ بی مجھے نہیں جھلاؤ گی؟"

اُرملا۔ "ہم تینوں جھولیں گے۔"

دونوں طرف ایک ایک کھڑی ہوگئیں۔ بیچ میں اُرملا بیٹھی۔

پاربتی۔ "تیز نہ جھلانا۔ نہیں تو بی بی گر پڑیں گی، بملا!"

بملا۔ "کیا بچی ہیں؟"

پاربتی۔ "نہیں، اُن کے ہواس ٹھیک نہیں۔ ابھی دیکھنا اپنے آپے میں نہ رہیں گی"

اُرملا تصویر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "یہاں آؤ! تم بڑے بیرحم ہو۔ دیکھتے ہی نہیں جیسے۔ میری ان زلفوں کو تو ہٹا دو۔ بار بار میرے منھ پر بکھر جاتی ہیں"...... پھر تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "آؤ میرے ساتھ جھولا جھولو۔ تم جھلاؤ۔ میں ساون گاتی ہوں ؎

اپنے محل میں جھولا جھولت تھی　　سائیں کے آئے کہار ری
سکھی جھولا جھولنے نہ پائی　　آئی گئے ساون بہار ری

پاربتی بولی "دیکھا آپ نے۔ اسی طرح یہ ہمیشہ کیا کرتی ہیں" یہ کہتے کہتے دونوں کی آنکھوں میں آنسو جھلجھلا آئے۔

بملا۔ بڑا دردناک منظر ہے بھابی، اس بیچاری کی زندگی ہی کیا ہے۔ بھگوان بھی کیسے بے رحم ہیں،

ان کے حال پر کچھ دیا نہیں آتی۔"

پاربتی اپنا روندھا ہوا گلا صاف کرتی ہوئی بولی۔ "اب تو بھگوان پر بھی مجھے یقین نہیں رہا۔ یہ سب دھوکا ہے۔ دل بہلانے کے حیلے ہیں"

وہ دونوں محویت کے عالم میں جھولے پر بیٹھی ہوئی خیالات میں اتنی غرق ہوگئیں کہ جھولے کا احساس ہی نہ رہا مگر جھولا اپنی رفتار سے چلا جارہا تھا۔

ارملا دفعتاً ہنس پڑی۔ "واہ رے مذاق! جھولے پر سے کود گئی اور مورتی کے پاس کھڑی ہو کر بولی۔ "تم بڑے مسخرے ہو" سر پر آنچل ٹھیک کرکے ناچنے لگی۔ مورتی کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایسے بھاؤ بتارہی تھی گویا وہ کسی سچے قدردان کے سامنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کررہی ہے۔ اسی دھن میں پھر بول اٹھی۔ "بھاگتے کہاں ہو" تصویر کو پکڑنے دوڑی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بملا اور پاربتی دونوں من مارے بیٹھی تھیں۔

بملا۔ "بھابھی، دیکھا نہیں جاتا۔ چلو"

پاربتی بولی۔ "جائیں کہاں؟ انھیں چھوڑ کر جاتے بھی نہیں بنتا۔ ہاں تم بھی کبھی کبھی آجایا کرو۔ کچھ تو تسکین ہوجائیگی کیا کروں بھابھی' ارملا بہن کی حالت دیکھ کر نہ جانے کیسا جی ہوا جاتا ہے۔"

"ابھی آپ نے دیکھا کیا؟ تھالی ان کے لئے پروسی جاتی ہے۔ وہ تھالی لئے مورتی کے پاس جاتی ہیں۔ سامنے رکھ کر کھانے کا اشارہ کرتی ہیں۔ مورتی کو بے حس دیکھ کر جھلا اٹھتی ہیں۔ ادھر ادھر بھاگنے لگتی ہیں۔ اسی حالت میں غصہ کرتی ہیں۔ تھالی پھینک دیتی ہیں اور خود بھی نہیں کھاتیں۔ اکثر غصہ میں اپنی ساڑی بھی پھینک دیتی ہیں' اور یہی کہتی ہیں جب تم میرے سر کا آنچل ٹھیک نہیں کرتے۔ تو میں ساڑی پھینک دونگی۔ آپ ان کے خط دیکھیں تو دنگ رہ جائیں۔ دو خط روزانہ لکھتی ہیں۔ ایک اپنی طرف سے اور دوسرا انھی کی طرف سے۔ ان کا خط انھی کا ہوا کرتا ہے۔ ہم ویسی چٹھی نہیں لکھ سکتے اور جو پتی کی طرف سے لکھتی ہیں' وہ بھی کمال کی ہوتی ہے۔ میں تو ان کو دیکھکر حیران رہ جاتی ہوں"

بملا۔ "پاگل پن میں اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں بھابی۔ ان کی بات کیا۔ ہم تو خواب میں بھی اس قسم کی باتیں نہیں سوچ سکتے۔ بھابی! وہ خط میں دیکھ سکونگی؟"

"وہ دروازہ بند کرکے لکھتی پڑھتی ہیں"

"تو میں اس وقت آجاؤں؟ کس وقت وہ لکھتی پڑھتی ہیں؟"

"میں نے ایک دفعہ سنا تھا۔ مجھکو بھی تشویش تھی کہ بات کیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ وہ وہیں لکھتی پڑھتی ہیں"

"بھابھی! اُس خط میں تھا کیا؟"

"جیسی جھولے پر کی باتیں تھیں نا۔ ویسی ہی خط میں بھی سمجھ لو۔ جس خط کو میں نے دیکھا تھا۔ اُس میں بھی شکایت تھی۔ "تم آتے کیوں نہیں؟ تم کو آنا منظور نہ تھا تو بیاہ کیوں کیا؟ ساون کا مہینہ آگیا، چونر کی کون کہے، ساڑی تک نہ دی۔ سال میں بارہ ماس ہوتے ہیں تم مجھے ایک مہینہ بھی خوش نہیں کرسکتے؟ کیا یہی تھارا فرض ہے؟ اگر تمھیں یہی کرنا تھا تو بیاہ نہ کرتے"۔ ان کی طرف سے جو لکھتی ہیں وہ اس مضمون کا ہوتا ہے کہ "میں اتنی دُور آگیا ہوں کہ کیا کہوں۔ مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔ سچ ارملا! میں سولہوں آنہ تمھارا ہوں۔ میں چونر کو کچھ نہیں سمجھتا۔ تم میں بڑی بڑی چیزیں ہیں۔ چونر تو دکھانے کی چیز ہے۔ تجھے وہ چیزیں ملی ہیں جو تیری ہیں اور ہمیشہ تیری رہیں گی"۔ اسی قسم کے ان کے خط ہوا کرتے ہیں۔ کبھی لکھتی ہیں "تم کوئی کب سے ہوگئے؟"

"چپ رہو بھابھی! میں تو کہتی ہوں ایشور بھی ان شعلوں میں خاک ہو جائے۔ اِس درد کا بھی کہیں ٹھکانا ہے؟ اگر وہ پگلی نہ ہوتی تو کبھی کی جلکر خاک ہوگئی ہوتی"۔

"اِس کی دوا ہی ہمارے پاس کیا ہے؟ یہ درد تو اُن کی سانس کے ساتھ ساتھ جائے گا"۔

دونوں خیالات میں محو تھیں۔ ارملا آکر بولی "تم یہاں کیسے بیٹھی ہو؟ چلو تم لوگوں کو دکھاؤں۔ وہ آگئے۔ چلو بُلاتے ہیں۔ جھولنے کو کب سے تمھاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ بہت اچھا گانا گاتے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بھیجا ہے"۔

ارملا کی باتیں سُن کر دونوں رونے لگیں۔ ارملا چلی گئی۔

بملا: "اُف! برداشت کے باہر ہے۔ دیکھا نہیں جاتا۔ نہ معلوم کون سے پاپ کی یہ سزا ہے"۔

دونوں ارملا کے ساتھ ہولیں۔ ارملا ان دونوں کو دُور چھوڑ کر تصویر کے پیچھے مُنھ پر گھونگھٹ کرکے کھڑی ہوگئی۔ جس طرح کوئی شرمیلی دُولہن اپنے شوہر کے سامنے ہو۔

پاربتی: ارملا کا ہاتھ پکڑ کر "چلو ہمارے ساتھ چلو"۔

ارملا: "آپ کیا کہتی ہیں؟ پہلے انھیں تو کھلائیے"۔

بملا اِس منظر کی تاب نہ لاسکی، رُو کر بولی "میں جا رہی ہوں"۔

پاربتی: "میں کیسے جاؤں؟ اپنا کوئی نہیں۔ انھیں کو لئے روتی رہتی ہوں۔ یہ دیوی ہیں۔ مجھے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تمھارے بھائی صاحب ہیں نہیں۔ جو درد یہ دوسروں میں ڈال دیتی ہیں مجھے محسوس تک نہیں ہوتا۔ یعنی میں جمود کی صورت ہوں اور یہ محرک"۔

بملا: "سب پاگل بن جائیں تو کام ہی نہ چلے بھابھی"۔

ؔ شاعر

پاربتی:- "اس کے لئے بھی دل چاہئے۔ انھیں جنون میں جو امتیاز ہے، وہ مجھے ہوش میں بھی نصیب نہیں۔"

بملا:- "تو آپ بھی پگلی ہونے جارہی ہیں؟ جب آپ بھی پگلی ہو جائیں تو دونوں میں کوئی بھی زندہ نہ رہیگی۔"

پاربتی:- "میری ایسی قسمت کہاں۔"

بملا:- "اب میں چلی، کل میں پھر آؤں گی۔"

پاربتی اور ارملا کچھ فکر کرتی ہوئی خاموش ہوگئیں۔

پاربتی، بملا کو دیکھ کر بولی۔ "تم تو کل ہی آرہی تھیں۔ پر کتنے دن ہوئے یاد ہیں؟"

بملا:- "میں یہاں سے جانے کے بعد آج مشکل سے اٹھ پائی۔ ارملا مجھے بھولتی نہیں۔ اس بیچاری کے جیون میں رہ کیا گیا؟ شادی سے پہلے ہر وقت کتنی خوش رہتی تھی۔ جو پہلے رونے والوں کو ہنساتی تھی، وہی آج ہنسنے والوں کو رواتی ہے۔ میں جتنا ہی اس کے بارے میں سوچتی ہوں اتنی ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ دُنیا بھیانک شکل میں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ منانے لگتی ہوں کب اس دُنیا سے چھٹی ملے گی۔"

پاربتی:- "بھلا کوئی خود سے دُنیا چھوڑتا ہے۔ بہادر ہی دُنیا چھوڑ پاتے ہیں۔ ان کی شادی ہونے پر چار ہی مہینے ان کے پتی زندہ رہے۔"

بملا:- "قسمت سے کون پار پا سکتا ہے۔"

ان دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ارملا، پاربتی کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔ "چلو میرے کمرے میں تمھیں تماشا دکھاؤں۔" ارملا ہنستی تھی مگر یہ دونوں رو رہی تھیں۔ ارملا دونوں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھالے چلی۔

دونوں کو علیحدہ کھڑا کر کے ارملا تصویر کے سامنے بیٹھ کر بکنے لگتی ہے۔ "تمھیں کیا معلوم تمہارے ساتھ میں اپنی ساری آشائیں، ساری اُمیدیں لے کر زندہ ہوں۔ تم مجھ سے آج وعدہ کرو۔ مگر تمھارے وعدے کا کیا ٹھکانہ، تم نے ایک بار وعدہ کیا بھی تھا۔ مگر تم دھوکا دے بھی نہیں سکتے۔ پھر بھی کیا وعدہ فراموش ہو۔ تم ہنستے کیوں نہیں؟ تمھاری ایک ہنسی میں میں نہال ہو جاتی ہوں۔ تم ہنسو گے نہیں؟" ارملا جنون میں بک رہی تھی۔ دونوں سہیلیاں مجبور ہوئی جارہی تھیں۔

بملا:- "خود تو پگلی ہے، ہنستی ہے۔ اور میں روتی ہوں۔"

پاربتی:- "کہیں بھاگنے سے چھٹی ملے گی؟ جگہ چھوڑ دیگی۔ دل کیسے چھوڑیگا؟"

"بڑی مصیبت ہے۔"

"چلو باغ میں چلیں، شاید کچھ دل بہل جائے۔"

دونوں باغ میں نرم گھاس کے ایک تختہ پر بیٹھ گئیں۔ ارملا کی باتیں کرنے لگیں۔ اسی درمیان میں ایک نوجوان وارد ہوا۔ اس کی نگاہیں اس باغ سے آشنا ہی معلوم ہوتی تھیں۔ سامنے آتے ہی اُس نے انکسار سے نمستے کی۔ بملا اس نوجوان کو دیکھ کر سہم گئی۔ پاربتی کو نظر اُٹھانے کی تاب ہی نہ رہی۔

نوجوان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ دردآمیز لہجہ میں بولا:۔

"ارملا کہاں ہیں؟"

بملا۔ "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟ اور ارملا کو آپ کیا جانیں؟" پاربتی، بملا کے کان میں کہتی ہے:۔

"یہ تو جیسے بی بی کے دیور ہیں۔ ان کی شکل تصویر سے ملتی جلتی ہے۔"

نوجوان:۔ "میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

بملا:۔ "آپ آئے کہاں سے؟"

نوجوان:۔ یہ قصہ بہت طویل ہے۔ میری اُن کی شادی ہوئی تھی۔ انھیں کے لئے مجھے دوسرا جنم ملا ہے۔"

"اس کا کیا ثبوت ہے؟"

"اگر وہ پہچان لیں تو ہم ایک دوسرے کے ہیں ورنہ کوئی بات نہیں۔ میں تو جب تک جیتا رہونگا۔ انھیں کا رہونگا۔ انھیں کے سامنے میں پوری کہانی کہنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے نہیں پہچان رہی ہیں۔ لیکن میں پہچان رہا ہوں۔ آپ انھیں بُلوا دیجئے۔

بملا:۔ "آپ کبھی یہاں آئے تھے؟"

نوجوان:۔ "نہیں تو آیا کیسے؟"

بملا:۔ "ہمیں کیسے یقین ہو کہ آپ وہی ہیں؟" پاربتی بولی:۔ "تو اُن کے پتی آپ کیسے ہوسکتے ہیں؟ وہ تو کمسنی کی بیوہ ہیں۔"

نوجوان:۔ "آپ بالکل درست فرماتی ہیں۔ لیکن میں نے انھیں کیلئے دوسرا جنم لیا ہے۔ میں اُنکی پوجا کرونگا۔"

بملا:۔ "کیا آپ پچھلی باتیں بتا سکتے ہیں؟"

نوجوان:۔ سب یاد ہیں۔ پہلے میرا جنم شنکر گڈھ میں ہوا تھا۔ میں انھیں کے لئے آیا ہوں۔"

پاربتی اس نوجوان کو گھر لے گئی اور کئی عورتوں کے درمیان شناخت کے لئے پوچھا:۔

"اِس میں کون ارملا ہے؟"

نوجوان نے ارملا کے پیروں پر عقیدتمندانہ سر رکھنا چاہا۔ ارملا انتہائی محبت سے گلے لگا کر بولی۔ "تم تو میرے بیٹے ہو۔ (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) پتی یہ ہیں۔ میرے سہارے یہ ہیں۔ تم سے پھر ملونگی" ارملا تصویر کو گود میں لے کر سینے سے چمٹانا چاہتی تھی کہ دفعتاً چوکھٹا نیچے آرہا۔ اور چور چور ہوگیا۔ ارملا کا دل بھی معاً پاش پاش ہوگیا۔ سب کی زبان پر یہی ہے کہ ارملا کا دل تو تصویر سے پہلے ہی چور ہوچکا تھا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ جب تصویر نے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ تو ارملا بھی دنیا سے کوچ کر گئی۔ کیوں نہ کرتی۔ تصویر ہی تو اس کا سہارا تھی۔

نوجوان رو کر بولا "وہ تصویر اب میری پوجا کی چیز ہوگی" نوجوان ارملا کی تصویر اٹھا کر سینے سے لگاتا ہوا بولا:۔ "تمہاری پوجا اب میں کرونگا"

غزل

از سید ہمراز حسین قاسم نقوی

یہ ہوش ہے یا بیخودی ہوش نما ہے — اب تیری تمنا کو بھی دل بھول رہا ہے
ہر ذرّے میں گم وادیٔ ایمن کی فضا ہے — اب بھی جو نہ دیکھوں تو نگاہوں کی خطا ہے
اللہ! یہ کیا معجزۂ حسن ادا ہے — سنتا ہوں جس آواز کو تیری ہی صدا ہے
یہ بھی ہیں مرے جوشِ تمنا کے کرشمے — گم جیسے قفس ہی میں گلستاں کی فضا ہے
ہیں عند طلب کثرت جلوہ سے نگاہیں — دل تاب تجسس کو ابھی ڈھونڈھ رہا ہے
نظریں بھی جو اٹھتی ہیں تو شوخی کے سہارے — ہر رنگ میں ایک رنگ قیامت کا ملا ہے
نیرنگِ تحیّر ہے کہ ہے عجز کی معراج — سجدے میں ہے دل پھر بھی تجھے بھول رہا ہے
اللہ رے پابندیٔ آدابِ محبت — سجدے کو سمجھتا ہوں کہ تحقیرِ وفا ہے
بس ختم ہی ہوتی ہے محبت کی کہانی — آجاؤ کہ اب رشتۂ جاں ٹوٹ رہا ہے
دیوانے کی عالی نظری تم بھی تو دیکھو — دنیا سے الگ ہوکے تمھیں دیکھ رہا ہے
ممکن ہی نہیں تکملۂ عمر محبت — اکبار اگر موت بھی آجائے تو کیا ہے
لذت کشِ آلام محبت ہے مرا دل — یعنی غم الفت، غم الفت کی جزا ہے

احساس کی لذت بھی بری چیز ہے قاسم
اپنے کو بھی اب جیسے کوئی بھول گیا ہے

گورستان کی شام

(از شیخ محمد یوسف ظفر بی۔اے)

سکوت، شام، سیاہی، اُجاڑ، تنہائی — الم نواز شجر، جاں گداز رعنائی
خموش شہر خموشاں، زباں دراز سکوت — فروغ شام کا انجام شب نواز سکوت
تھی زندگی کی حقیقت فضا کے دامن میں — بھرا ہوا تھا دُھواں سا فضا کے دامن میں
درخت پیرہنِ ماتمی میں تھے ملبوس — ہر ایک سائے پہ طاری تھا عالم قابوس
سنکتی تھی جو ہوا کان بجنے لگتے تھے — کھڑکتے پتوں سے بادل گرجنے لگتے تھے
ہوا کی چاپ سے سینہ دھڑکنے لگتا تھا — سکوں میں خوف کا شعلہ بھڑکنے لگتا تھا
فضا میں گھورتی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں — خموشیوں میں صدائیں سنائی دیتی تھیں
جو زیر پا کوئی تنکا بھی ٹوٹ جاتا تھا — تو مجھ سے دامنِ تسکین چھوٹ جاتا تھا
پروں سے بوم خموشی کو توڑ جاتا تھا — تو کوئی مجھ کو پکڑ کر جھنجھوڑ جاتا تھا
لپک کے خار کا دامن کو کب پکڑنا تھا — کسی کا آہنی زنجیر میں جکڑنا تھا
فضا کا زمزمہ جھینگر جو گانے لگتے تھے — تو میرے تارِ نظر تھرتھرانے لگتے تھے
رگوں کے خون نے آنکھوں سے پھوٹنا چاہا — دلِ حزیں نے مصیبت سے چھوٹنا چاہا

یہاں میں آتا کوئی میری موت آئی تھی
مجھے تو شفقتِ مادر کی یاد لائی تھی

خیالاتِ منوّر

(منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی)

دیدار سے ارجمند کر لیں آنکھیں — اوپر دیکھا بلند کر لیں آنکھیں
کچھ ایسے مناظر نظر آئے مجھکو — دُنیا کی طرف سے بند کر لیں آنکھیں

کیوں جزوِ حیات زشت اعمالی ہے — روزِ روشن میں تیرہ افغالی ہے
تخلیق کی قوت ہے تجھی پر جب ختم — پھر کس نے گناہوں کی بنا ڈالی ہے

غلط فہمی

(از حضرت اُمید رضوی بریلوی)

اِک وفا دشمن کو مجبورِ وفا سمجھا تھا مَیں
حُسن کو اپنے لئے صرفِ ادا سمجھا تھا مَیں

ہوں پشیماں تم کو مجبورِ محبّت جانکر
ہائے کِس دل سے کہوں یہ تم کو کیا سمجھا تھا مَیں

یہ خبر کب تھی کہ جانِ ؔبے وفا ہو جاؤ گے
تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا مَیں

یاد ہے اب تک مجھے تیرا فریبِ التفات
مخلصانہ تیری ہر رنگیں ادا سمجھا تھا مَیں

تیری ہر اِک بات میں پنہاں تھی طنزِ کامیاب
تھا فریبِ مستقل جس کو وفا سمجھا تھا مَیں

دشمنِ جاں" تجھکو ساری آرزوئیں سونپکر
آرزوئے زیست جانِ مدعا سمجھا تھا مَیں

ہر تبسّم تھا تیرا میرے لئے وجہِ نشاط
ہر نظر کو تیری پیغامِ وفا سمجھا تھا مَیں

تیرا جورِ ناگوارا" بھی گوارا تھا مجھے
ہر جفا تیری" بعنوانِ وفا سمجھا تھا مَیں

وہ تری نمناک آنکھیں، وہ ترا ضبطِ فغاں
بیکسی ہائے محبت کا گِلہ سمجھا تھا مَیں

اشکِ پیہم میں نہاں تھے نغمہائے انبساط
سازِ عشرت تھا جسے غم کی نوا سمجھا تھا مَیں

تیرے چہرہ پر تھی وہ "تابانیِ ضبطِ شباب"
جس کو مہتابِ محبت کی ضیا سمجھا تھا مَیں

سونپ کر تجھکو سفینہ عشق کا بر دینِ عرش
بحرِ رنج و غم میں اپنا ناخدا سمجھا تھا مَیں

یہ غلط فہمی مجھے اب اشکِ خوں رُلوائیگی
تجھکو راحت آشنا غم آشنا سمجھا تھا مَیں

ہائے وہ ماضی کا خواب اور اُسکی یہ تعبیرِ حال"
تیرا ہر غم اِک غمِ بے انتہا سمجھا تھا مَیں

آج تک محجوب ہوں اپنے خیالِ خام پر
میری کج فہمی تھی تجھکو باوفا سمجھا تھا مَیں

یہ نہ پوچھ اے دشمنِ جانِ محبت یہ نہ پوچھ
کیا سمجھنا چاہئیے تھا اور کیا سمجھا تھا مَیں

قضا کی گھڑیاں

از کوثر چاند پوری

وہ اندھا تھا، اُسے دُنیا کی دلچسپ رنگینیوں یا رنگین دلچسپیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آسمان پر چمکنے والے چاند اور جگمگانے والے ستاروں کی روشن اور تابناک دُنیا کا نظارہ اُس کی بے نور آنکھوں نے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ لالہ و گل کی دلربا بہاروں اور پہاڑوں سے گرنیوالے آبشاروں کی دلفریب روانی سے ناآشنا تھا۔ حُسن و عشق کی شوخیوں نے اس کے دامنِ شباب کو آج تک کبھی جھٹکا نہ دیا تھا۔ اس کے جذبات سینہ میں یوں سو رہے تھے جیسے ایک بے جان چیز ہوتی ہے۔ حُسن کی نشتر زنی اور جراحت سامانی سے اس کا دِل محفوظ تھا۔ وہ سیاہی اور سفیدی میں بھی تمیز نہ کر سکتا تھا۔ اچھے اور بُرے کا صرف اِتنا احساس اُس نے کیا تھا کہ جو اُس کیساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتا اُسے وہ اچھا کہتا، اور جو اُسے ستاتا یا آزار پہونچاتا وہ اُسکی رائے میں بُرا ہوتا۔ چہرے کے نقش و نگار کی دلکشی اور خد و خال کی موزونیت کے اعتبار سے کسی کو اچھا یا بُرا کہنا اُسکے نزدیک بے معنی سی بات تھی۔ اُسکی وفادار اور اطاعت شعار بیوی سلوچنا بڑی دِلسوزی سے اُسکی خدمت کرتی، اسکا ہاتھ پکڑ کر جگہ جگہ لئے پھرتی۔ وہ پلنگ پر پڑا رہتا اور سلوچنا اُسکے سارے کام کر دیتی۔ قدرت نے اُسے آنکھوں کے بدلے میں سلوچنا دیدی تھی جو اُسکی تمام تکلیفوں کو دیکھتی اور محسوس کرتی تھی، وہ اسکی دُنیا تھی۔ اسکے محدود جسم میں اندھے کی ساری کائنات سو رہی تھی۔ وہ سلوچنا سے محبت کرتا تھا۔ نہایت گہری اور سچی محبت، ایسی پاک اور بے ریا محبت جو صرف اندھا ہی کر سکتا ہے۔ آنکھوں والا ایسی محبت کبھی نہیں کر سکتا۔ سلوچنا اسکی رفیقِ حیات تھی، وہ نہ ہوتی تو یہ معذور انسان ایک دِن بھی زندگی کی مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکتا، اُسے پانی کون پلاتا، گرم گرم روٹی کون دیتا اور ضرورت کے وقت اُس کا ہاتھ پکڑ کر شہر میں دور دور تک کون لئے پھرتا۔ پھر جب وہ اپنی معذوری، آلام اور افکار سے بھری ہوئی معذوری پر کبھی تنہائی میں آنسو بہانے بیٹھتا تو سلوچنا کے علاوہ کون تھا جو دردبھری آواز سے پوچھتا۔ "تم رنجیدہ کیوں ہو، تمہارا چہرہ اسقدر مغموم کیوں ہے، تمھیں کیا تکلیف ہے؟"

سلوچنا ہی تو تھی جو اُن کاموں کو نہایت خوشی سے کرتی تھی۔ وہ اپنے اندھے شوہر کی ہر خدمت کو فرض سمجھکر انجام دیتی تھی۔ چلتے چلتے اس کے ٹھوکر لگ جاتی تو سلوچنا بے چین ہو جاتی، اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی، وہ پریشان ہو کر پوچھتی۔ "کہیں تمھاری اُنگلیاں زخمی تو نہیں ہو گئیں، ہائے بڑی سخت ٹھوکر لگ گئی۔ افسوس میں

اُدھر دیکھ رہی تھی۔"

"نہیں سلوچنا، میرے چوٹ نہیں لگی۔" وہ ٹھنڈی اور گہری سانس لے کر جواب دیتا۔ پھر بھی سلوچنا وہیں زمین پر بیٹھ جاتی اور اُس کے پیر کو دیر تک ملتی رہتی۔ اُنگلیوں پر آہستہ آہستہ پھونکیں مارتی۔ آخر وہ خود ہی کہتا۔ "سلوچنا، بس اب رہنے دو۔" وہ اکثر سوچتا سلوچنا میری بیوی ہے۔ اگر بیوی کی پوجا ہو سکتی ہے، تو وہ اس کی ضرور مستحق ہے۔

ایک مرتبہ سلوچنا بیمار ہو گئی، چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی۔ چھ سات دن تک وہ بستر پر پڑی بیماری کی تکلیفوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ اس حالت میں بھی اُس نے اپنے اندھے شوہر کو فراموش نہیں کیا۔ اور بار بار آواز دے کر پوچھتی رہی "تمھیں پیاس تو نہیں لگی، تم نے کھانا بھی کھایا؟" وہ سلوچنا کے بہلانے کو جواب دیتا "سلوچنا میں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہے اور پانی تو اب بھی میرے پاس رکھا ہے۔" حالانکہ پیاس کے مارے اُس کی زبان میں کانٹے پڑے ہوتے اور بھوک سے پیٹ میں آگ لگی ہوتی، اُسے پانی اور روٹی دینے والا سلوچنا کے سوا اور تھا ہی کون؟ سلوچنا کی بیماری میں دوپہر کے وقت بھوک سے بیتاب ہو کر وہ باہر نکلا تاکہ دُکان سے کھانے کی کوئی چیز خرید لائے۔ لکڑی ٹیکتا ہوا بڑی مشکل سے وہ دُکان تک پہونچا۔ واپسی میں ایک کھمبے سے ٹکرا کر سڑک پر گر گیا۔ اُس کی کہنیوں کی کھال پختہ سڑک کی رگڑ سے چھل گئی اور خون بہنے لگا، اُسے سخت تکلیف ہوئی۔ مگر چند قہقہوں کے علاوہ ہمدردی کی کوئی آواز اُس کے کانوں میں نہ آئی۔ اس کی روح میں اس صدمہ سے ایک سوزش سی پیدا ہو گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ اُس کے کان سلوچنا کی نرم و نازک آواز کا انتظار کرنے لگے۔ آہ سلوچنا ہوتی تو اس موقعہ پر کس قدر ہمدردی کرتی، اُسے کتنا رنج ہوتا، میری کہنیوں سے خون بہتا ہوا دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتی اور میٹھی آواز میں پوچھتی "آہ تمہارے چوٹ لگ گئی، اُف تمھاری کہنیوں سے خون بہہ رہا ہے، افسوس میں اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھے معاف کرو۔"

مگر سلوچنا بیمار پڑی تھی۔ اب اُس سے ہمدردی کرنیوالا کون تھا۔ آس پاس بچے کھڑے ہنس رہے تھے انھیں اندھے کے گر جانے سے دلچسپی کا ایک سامان ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ اُس کی کہنیوں سے ٹپکنے والی سرخ بوندوں کی قیمت سے واقف نہ تھے۔ یہ تو سلوچنا ہی کے دیکھنے اور سمجھنے کی چیز تھی۔ اُسے پہلے ہی معلوم تھا سلوچنا ہی کے سہارے وہ آرام و اطمینان سے جی رہا ہے لیکن آج اُس کی اور تائید ہو گئی۔ اُس نے سمجھ لیا اُس کی زندگی کا ایک ایک قدم کیسا خطرناک ہے، — دُنیا سے آنکھوں والے بھی بمشکل دامن بچا کر نکل سکتے ہیں۔ پھر جو آنکھوں سے بھی محروم ہو، وہ کیونکر امن اور سلامتی کے راستہ پر چل سکتا ہے؟ اِسی لئے وہ سلوچنا سے محبت کرتا تھا۔ نہایت گہری اور سچی محبت!

سلوچنا کے متعلق لوگ اُس سے کہتے وہ بڑی بدصورت ہے۔ اُس کا رنگ نہایت سیاہ ہے۔ اُسے یہ باتیں بہت ناگوار گذرتیں۔ وہ کالے اور گورے رنگ میں فرق ہی نہ کر سکتا تھا۔ وہ اندھا تھا اور اُس کی محبت بھی اندھی تھی۔ سلوچنا کی بڑی سے بڑی برائی کا اُس پر اثر نہ ہوتا۔ وہ دل ہی دل میں کہتا سلوچنا وفادار اور شوہر پرست ہے اگر حسین نہیں ہے تو نہ سہی، لیکن عورت کا حسن اس کے علاوہ اور ہوتا ہی کیا ہے؟

آنکھ بنانے والے ڈاکٹر کے آنے کی منادی سن کر شفاخانہ میں اندھوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہزاروں موٹریں اور گاڑیاں میدان میں جمع ہو گئیں۔ سلوچنا بھی اپنے اندھے شوہر کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ وہاں پہونچ گئی۔ وہ بہت کمزور تھی۔ اس کی صورت پر زردی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کئی دن کی بیماری کے بعد ذرا سنبھلی تھی، دس پانچ قدم چلنا بھی اُس کے لئے دوبھر تھا، مگر وہ اُس کا شوہر تھا۔ سلوچنا کو کوئی ہستی اتنی عزیز اور محبوب نہ تھی۔ اُس کی بے بصری سے جتنی تکلیف سلوچنا کو تھی، خود اُسے بھی نہ تھی۔ اِس لئے نہیں کہ اُس کے سارے کام سلوچنا کو کرنے پڑتے تھے۔ بلکہ اِس لئے کہ اُس کی سفید اور بے نور آنکھیں سلوچنا کی چمکدار، سیاہ آنکھوں کے پیام کا جواب دینے سے معذور تھیں۔ سلوچنا اپنے اندھے شوہر کی آنکھوں کے خالی پیالوں میں محبت کا وہ سُرخ سیّال دیکھنا چاہتی تھی جو خود اُس کی آنکھوں سے ہر وقت چھلکتا رہتا تھا۔ سلوچنا کے لئے اس کے پیارے اور معصوم چہرے کا یہ نقص بہت تکلیف دہ تھا۔ عورت اپنے حسن کی تعریف سننے کی فطرۃً حریص ہے۔ اُس کے نزدیک قیمتی سے قیمتی چیز بھی اتنی دلکش نہیں ہو سکتی، جتنا یہ جملہ ہو سکتا ہے کہ "تم بڑی خوبصورت ہو، تمہارے شباب میں قیامت کی شوخی اور رعنائی ہے"۔ مگر ایسی باتیں وہی کر سکتا ہے جو یہ بھی سمجھتا ہو کہ "حسن کسے کہتے ہیں" اور خوبصورتی کیا ہوتی ہے، جو بدقسمت اِنسان چاند کی ضیا بیز روشنی کے دیکھنے سے بھی محروم ہو، وہ ان خصوصیات لطیف سے کیا بحث کر سکتا ہے، حسن کا تعلق حسِ بصر سے ہے، یہ نہیں تو پھر جمال و رعنائی کا طوفان بھی آدمی کو متاثر نہیں کر سکتا، کچھ اسی قسم کی توقعات تھیں، جو منادی کی صدا سنتے ہی سلوچنا کے چھوٹے سے دل میں قیامت برپا کر دینے پر تلی ہوئی تھیں اور وہ اپنی کمزوری و ناتوانی کے باوجود لڑکھڑاتی ہوئی حال سے ایک طویل راستہ کو طے کر کے چلی آئی تھی۔ جب سے اُس نے سنا تھا ڈاکٹر اندھوں کی آنکھیں بنانے میں بہت ماہر ہے اس کے ہاتھ سے پچاسی فی صدی اندھے اچھے ہو جاتے ہیں تو اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اُس نے رات بھر دُعائیں مانگی تھیں، کسی طرح اس کے شوہر کی آنکھوں میں بھی نور آ جائے اور اُسے بھی نظر آنے لگے، وہ بار بار اپنی اس آرزو کو دُہراتی رہی تھی، کاش اُسے نظر آنے لگے۔

ڈاکٹر کے سامنے پہلے وہی لوگ پیش ہوئے جو موٹروں وغیرہ میں بیٹھ کر آئے تھے جو غریب سڑکوں پر ہزاروں

ٹھوکریں کھانے کے بعد یہاں تک آئے وہ بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر نے اپنے مقررہ وقت پر کھانا کھالیا، اور جن کو خدا نے وسائل بخشے تھے وہ بھی کھا چکے۔ سلوچنا یوں ہی بھوکی بیٹھی ہوئی اُسے دلاسا دیتی رہی، اب تمھاری ہی باری آتی ہے، سارا ہجوم چھٹ گیا۔ گھبراؤ مت۔ ایسے موقعے روز روز نہیں آتے۔ بس آنکھیں بنوا کر ہی چلنا۔

"بھوک لگی ہے، سلوچنا مجھے کچھ کھلاؤ۔"

"اور جو ڈاکٹر تمہیں بلانے لگے؟"

"میں آپ ہی ٹٹولتا ہوا چلا جاؤں گا۔"

سلوچنا اُٹھی کہ بازار سے اُس کے لئے کھانے کی کوئی چیز لے آئے۔ جب کچھ دُور پہونچ جاتی تو اُس کے کانوں میں ایسی آواز آتی کہ اُس کے شوہر کا نام لے کر پکارا جا رہا ہے۔ وہ گھبرا کر آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کئی مرتبہ یہی ہوا۔ آخر اندھے نے ڈانٹ کر کہا۔ "سلوچنا تو پاگل ہوگئی ہے۔"

شام تک دونوں بیٹھے انتظار کرتے رہے دن چھپے سب اُٹھ کر چلنے لگے تو سلوچنا بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھی۔ اب اُس کے پیروں میں جان باقی نہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گرتی پڑتی رات کو وہ گھر پہونچی۔

رات بھر دونوں دُعائیں مانگتے رہے، خدا کرے کل آنکھیں بن جائیں۔ بہت سویرے جب سلوچنا اُٹھی، تو اُس کے سارے بدن میں درد ہو رہا تھا۔ لیکن جانا ضروری تھا۔ سب کاموں سے زیادہ ضروری۔ اپنی عارضی تکلیف کے مقابلہ میں اُسے شوہر کی مستقل تکلیف کا زیادہ خیال تھا۔ وہ جلدی جلدی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر شفاخانہ پہونچ گئی۔ گیارہ بجے کے قریب سلوچنا کے شوہر کی باری آئی۔ ڈاکٹر نے بڑے غور سے اُسکی آنکھوں کو، پھر سلوچنا کی صورت کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ "تم بڑی خوش نصیب ہو، یہ اچھا ہو جائے گا، اِسے ضرور نظر آنے لگیگا۔" اُسے میز پر لٹا دیا گیا۔ سلوچنا الگ کھڑی اُمید و بیم کے عالم کے آنسو بہاتی اور دُعائیں مانگتی رہی۔ ڈاکٹر اپنا کام کر چکا تو خوش ہو کر بولا۔ "آنکھیں بن گئیں" سلوچنا ڈاکٹر کے پیروں میں گر کر رونے لگی، سلوچنا کے آنسو ڈاکٹر کے جوتوں پر گرے۔ سلوچنا کے پاس اور تھا ہی کیا، جسے وہ اس خوشی میں ڈاکٹر کے قدموں پر ڈال دیتی۔ روزانہ صبح کو اُس کی آنکھوں سے پٹی کھل جاتی۔ اور آنکھوں کے سامنے اُنگلیاں ہلا کر پوچھا جاتا "بتاؤ کے انگلیاں ہیں؟" وہ جوشِ مسرت میں چیخ کر کہتا "چار" سلوچنا کا دل زور زور سے حرکت کرنے لگتا۔ "شکر ہے وہ اچھے ہو گئے، اب وہ مجھے دیکھنے لگیں گے" سلوچنا کی تمنائیں از سر نو زندہ ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی جوانی کے گذرے ہوئے لمحات کو، جو برسات کی چاندنی کی طرح گذر گئے تھے واپس بلا رہی تھی۔ اُس کے ہر بُنِ مو سے ہزاروں تمنائیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہی تھیں۔ اُس کی ازدواجی زندگی خدمتوں سے معمور تھی۔

اب خدمتوں کا صلہ مسرتوں سے ملنے والا تھا۔ وہ بہت خوش تھی گویا آج ہی اُس کی شادی ہو رہی ہے۔ پندرہ دن کے بعد اُس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی اور پہلی مرتبہ اُس نے سلوچنا کے شرگیں چہرے کو دیکھا، جو اس وقت تازہ کھلے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح متبسم تھا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ یہ اُس کی خوشی کا پہلا دن تھا۔ اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُسے ایسی ایسی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں جو کبھی اُس نے نہ دیکھی تھیں۔ دلچسپ اور پر رونق دُنیا، وسیع کائنات، چمکتا ہوا سُورج، ہرے ہرے درخت اور رنگین و معطر پھول، غرض وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ دُنیا کسقدر جاذب نظر اور پُرلطف جگہ ہے،

وہ سلوچنا کا بہت ممنون تھا۔ اس کی محبتوں اور خدمتوں کا بڑی احسانمندی کے ساتھ تذکرہ کرتا۔ جب وہ سلوچنا کا ذکر کرتا تو وہ ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ اُسے خیال ہوتا، ضرور آج وہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں، اور اُبھرے ہوئے رخساروں کی تعریف کرے گا، لیکن اس کی توقع ہمیشہ غلط ثابت ہوئی۔

وہ شاعر تھا۔ اندھے پن میں بھی شعر کہتا تھا۔ مگر انمیں یاس کی افسردگی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اب اُس کی دماغی قوتوں میں ایک عجیب انقلاب آیا، اُس کے افکار میں خاصی رسائی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ اب اُسکی نظموں میں کیف و سرور، اور جوش و انبساط، غرض سب کچھ ہوتا۔ وہ گانا بھی جانتا تھا۔ جب اپنی نظموں کو گا کر پڑھتا، تو سُننے والوں پر نشہ برسنے لگتا۔ رفتہ رفتہ اُس کی شہرت ہر طرف پھیل گئی، دولت اُس پر برسنے لگی۔ وہ غریب سے امیر اور مفلس سے دولتمند ہوگیا۔ اُسے گانے کی محفلوں میں بڑے بڑے معاوضوں پر بلایا جاتا۔ اُس نے اکثر عورتوں کے حُسن و جمال کی اپنی نظموں میں تعریفیں کی تھیں۔ سلوچنا کو اُمید تھی کہ وہ اُسکی تعریف میں بھی ضرور شعر کہیگا۔ جنمیں اُس کی آنکھوں اور اُس کے ہونٹوں کا خاص طور پر ذکر ہوگا۔ سلوچنا کی یہ امید پوری ہوئی، اُس نے بیوی کے عنوان پر ایک دلچسپ نظم کہی۔ مگر وہ سلوچنا کی توقعات کے مطابق نہ تھی۔ وہ اس کی آنکھوں اور لبوں کے ذکر سے خالی تھی۔ اول سے آخر تک وفاداری اور شوہر پرستی کا بیان تھا حالانکہ اور نظموں میں اُس نے عورتوں کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے اُن کی پلکوں، ابرؤں وغیرہ کی خصوصیات پر کافی زور بیان صرف کیا تھا سلوچنا نے بڑی تکلیف کے ساتھ اس دلشکن حقیقت کا احساس کیا کہ غالباً وہ حسین نہیں۔ اُس کے چہرے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جس کو وہ حقائق کے ذیل میں نظم کرتا۔

سلوچنا میں عورتوں کی سب خصوصیات موجود تھیں مگر وہ حسین نہ تھی اُسکے گہرے سیاہ رنگ، موٹے موٹے بدنما ہونٹوں اور ضرورت سے زیادہ اُبھرے ہوئے رخساروں کو دیکھکر آدمی آنکھیں بند کرلینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

کہتے ہیں شاعروں کے احساس میں آبگینہ سے زیادہ نزاکت اور نکہت سے زیادہ آوارگی ہوتی ہے۔ وہ بدصورتی کے زخم کو حد سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اور حُسن کی تلاش میں بھونرے کی طرح چمن کے سارے پھولوں کو جھانک آتے ہیں۔ اس نے بھی اس حقیقت کا اعادہ کیا۔ وہ سلوچنا سے دُور دُور رہنے لگا۔ اب اُس کی نگاہیں روشن تھیں، وہ اچھی اور بُری چیز میں تمیز کرسکتا تھا۔ حُسن پر تنقید و تبصرہ کرنے کی اہلیت بھی اُس میں موجود تھی، اور اُسے حاصل کرنے کی طاقت بھی۔

اُس کو گئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ سلوچنا پہلی اور دل شکن تنہائی سے گھبرا گئی۔ آخر تنگ آکر اُس نے تلاش شروع کی۔ لیکن سلوچنا کو جلد ہی تلاش و تجسس کا دروازہ بند کردینا پڑا۔ اس نے خط لکھکر سلوچنا سے اِستدعا کی تھی کہ وہ اُس روپئے کو، جو اس کے نام بھیجا جارہا ہے اپنی بہترین خدمتوں کا صلہ سمجھکر قبول کرلے اور اُسے فطرت کے ایک حسین شاہکار کو مقصدِ حیات بنانے کی اجازت دیدے۔ اُس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سلوچنا کو اس سے پہلے معلوم نہ تھا کہ اُسکی روشن آنکھیں اس کیلئے قضا کی کھڑکیاں ثابت ہونگی۔

توصیفِ "زمانہ"

از مسٹر جگل کشور ادیب

"عرصہ ہوا ہمارے دوست مسٹر جگل کشور صاحب ادیب نے ناچیز زمانہ اور اس کے کارکنوں کی تعریف و توصیف میں یہ قطعہ بھیجا تھا۔ اب اُنکے بار بار اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کررہے ہیں۔ جس کے لئے وہ ناظرین سے عذرخواہ ہیں"؟

لکھوں تیری تعریف کیا میں "زمانہ" — کہ دُنیا میں تو ایک شے ہے یگانہ
بہت سے رسائل نگاہوں سے گذرے — مگر سب سے ممتاز پایا "زمانہ"
مدیر اس کا عالم ہے، فاضل ہے یکتا — جو ہے واقفِ حال و قالِ زمانہ
ہے عملہ بھی اس کا رفیق و معاون — جو سہتا ہے تکلیف روز و شبانہ
ہیں روشن ورق اس کے مثلِ ثریا — مضامین بھی اسکے ہیں سب عالمانہ
ہیں الفاظ ایسے مرصع مکلّل — کہ جن کا اثر دل پہ ہے جاودانہ
محقق جو لکھتے ہیں مضمون اِس میں — بیان اُن کا ہے واقعی ناقدانہ
مضامین نثر اس کے سب بے بہا ہیں — فصاحت بلاغت سے پُر ہے "زمانہ"

ادیب اسکی شہرت زمانے میں پھیلے
"زمانہ" کو عظمت ملے جاودانہ

فریبِ دہر

(از پروفیسر سنت پرشاد۔ مدہوش ایم اے)

ہنس کھیلیں یہاں کی آفتیں اے مدہوش
جھیلی ہیں بڑی قباحتیں اے مدہوش!
چرچے یہ بلاکشی کے کرنے والے!
مت چھیڑ، وہی حکایتیں اے مدہوش

قطعہ

یہ سبز باغِ تمنا دِکھا دِکھا کے ہمیں
فریبِ دہر نے دھوکے دیئے بلا کے ہمیں

تغیرات پسندیٔ دورِ ہفت افلاک
رُلا دیا ہے اسی نے ہنسا ہنسا کے ہمیں

بنے ہوئے ہیں قضا و قدر کے شغل کی چیز
جہاں میں بھیجا تماشہ بنا بنا کے ہمیں

ہمیں تھا عزم تماشہ، ہمیں تماشہ بنے
مٹا دیا ہے کھلونا بنا بنا کے ہمیں

ہے دست گیرِ تمنا کو لغزشوں کا مذاق (ق)
ہزار بار اُٹھایا گرا گرا کے ہمیں

یہ کھینچ لاتی ہے، مجبور ہو کے آتے ہیں
ذلیل خوب کیا بار بار لا کے ہمیں

یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے تکلفات کا پاس
اُٹھا دیا ہے بھری بزم سے بٹھا کے ہمیں

اُٹھے تو جاتے ہیں پر کون مہتمم ہے یہاں
کہ شکوے کرنے ہیں آدابِ ناروا کے ہمیں

جو سخت گیری ہی یاں کے قیود ہیں مدہوش
تو توڑنے ہیں یہ پھندے کبھی قضا کے ہمیں

لہ یہ رباعی اور قطعہ ایڈیٹر "زمانہ" کے گذشتہ سال کے سانحات سے متاثر ہو کر موزوں ہوئے تھے۔

تنقید کتب

انڈین میوزک[1]

شاعری، مصوری اور موسیقی میں ہر قوم کا معیار جداگانہ ہے۔ بہت سی قوموں کے نزدیک موسیقی سرمایۂ نشاط ہے اور بہت سی قوموں کے خیال میں لوازمۂ عبادت ہے۔ پہلی قسم میں مغربی اور دوسری قسم میں مشرقی قومیں داخل ہیں اور انمیں بھی ہندوستان کو سب سے زیادہ خصوصیت حاصل ہے۔ جہاں موسیقی کو جزو مذہب اور ایک الہامی چیز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کا چوتھا وید یعنی سام وید پورا فن موسیقی کے اصولوں پر مشتمل ہے۔ بہرحال موسیقی کو خواہ سرمایہ نشاط سمجھئے یا لوازمہ عبادت، دونوں صورتوں میں یہ فن انسان کی ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ اسی کے ساتھ یہ فن سب سے زیادہ مشکل بھی ہے۔ کیونکہ اس میں گانیوالے کو ہوا میں گرہ باندھنا پڑتی ہے شاید اسی وجہ سے یہ فن ہندوستان میں ایک خاص طبقہ میں محدود ہو کر رہ گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب اِس کا عام شوق ہو رہا ہے۔ چنانچہ موسیقی کے کالج اور اسکول قائم ہوگئے ہیں جہاں اِسکی سائنٹفک طریقوں سے تعلیم دیجاتی ہے

اُردو اور ہندی میں فن موسیقی پر بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر ایسی تھیں جن سے مبتدی اور کم استعداد کے لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ میرس کالج کے شاگرد رشید مسٹر محمد محتشم نے یہ کتاب لکھ کر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں فن موسیقی کے اصولوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اصطلاحات فن کی بھی خوب وضاحت کر دی گئی ہے۔ ٹھاٹھ، راگ، راگنیاں، گانے، گانوں کی قسموں اور اُنکے خصوصیات سب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بہت سی نایاب چیزیں درج کر کے ان کے ادا کرنے کا طریقہ بھی بذریعہ علامات (Notation.) بتا دیا گیا ہے۔ جس کی بدولت مبتدی شخص بھی مشق کرے تو راگ راگنی کو عمدگی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ بہرحال گانے کے شوقینوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ اِس کا دیباچہ جو میرس کالج کے لائق پروفیسر آغا شمس الدین حیدر صاحب کا لکھا ہوا ہے، بہت فاضلانہ لکھا گیا ہے۔ فاضل پروفیسر صاحب نے فنِ موسیقی کی تاریخ، اس کی اہمیت اور ضرورت پر تبصرہ کرتے ہوئے، ہندوستان کے بعض مشہور موسیقی دانوں کی زندگی کے حالات اور بعض راگنیوں کی شانِ ایجاد

---

[1] ملنے کا پتہ:- میوزک پبلشنگ ہاؤس، ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی صاحبہ لکھنؤ۔

اور اُن کی وجہ تسمیہ بھی بیان کردی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ اور آرائش و زیبائش کے اعتبار سے بھی کتاب نہایت قابل قدر ہے۔ سرورق رنگین اور دلفریب ہے۔ انگریزی وضع کی خوبصورت جلد ہے۔ مصنف صاحب اور پروفیسروں کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ حجم بڑی تقطیع کے ۲۲۶ صفحات۔

فلسفۂ حُسن[1]

سائنسدانوں کے نزدیک تمام کائنات کا دار و مدار متضاد قوتوں کی کشمکش پر ہے۔ ہر چیز دوسری کو کھینچتی ہے اور ہر چیز دوسری سے دُور بھی بھاگتی ہے۔ اسے آپ چاہے جذبی و سلبی قوتوں (Positive & Negative Forces.) کی کشمکش کہئے یا حُسن و عشق کی کرشمہ کاریاں سمجھئے۔ دونوں باتیں دراصل ایک ہی ہیں۔ حُسن و عشق دونوں میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ دونوں اپنے اپنے فطری فرائض منصبی ادا کرتے رہتے ہیں۔ البتہ حُسن کے جذب و کشش کا معیار ہر قوم میں جداگانہ ہے۔ کوئی قوم سُرخ و سفید رنگ اور پتلے پتلے نازک ہونٹ پسند کرتی ہے اور کوئی قوم آبنوسی رنگ اور موٹے موٹے ہونٹوں کی دلدادہ ہے۔ منگولی قوموں میں چپٹی ناک اور چھوٹے پاؤں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ حُسن میں جذب و کشش کی طاقت بڑھانے کے لئے نمائش اور نمائش میں دلکشی پیدا کرنے کے لئے آرائش و زیبائش کی ضرورت ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ حُسن کا تعلق رنگ سے نہیں بلکہ تناسب اعضا سے بھی ہے۔ جتنا کسی کا جسم سڈول ہوگا۔ اتنا ہی وہ حسین تر سمجھا جائے گا۔ اس کتاب میں مہاشہ مست رام منیجر رسالہ "کرانتی" لاہور نے نمائش و افزائش حسن کے طریقے لکھے ہیں۔ جسمانی خوبصورتی پیدا کرنے کی ورزشیں بھی درج ہیں اور رنگ و روپ میں دلفریبی پیدا کرنے کے لئے نسخہ جات بھی ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصول بھی بتائے گئے ہیں اور کھانے پینے کے ڈھنگ بھی سمجھائے گئے ہیں۔ غرض سر سے پاؤں تک کوئی ایسی چیز باقی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کا اِس کتاب میں عُمدہ نسخہ موجود نہ ہو۔ کتاب دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے جگہ جگہ تصویریں اور نقشے بھی دیدئے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی معمولی، ضخامت تقریباً ڈیڑھ سو صفحات۔ جلد انگریزی۔

کیلے کا چھلکا[2]

پنجاب کے ایک مشہور جرنلسٹ ہیں جو "سندباد جہازی" کے نام سے روزنامہ "احسان" لاہور وغیرہ میں مزاحیہ مضامین لکھا کرتے ہیں۔ طبیعت بہت شوخ پائی ہے۔ یہ کتاب انھیں "سندباد جہازی" صاحب کے انیس[19] مختلف دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسمیں سے اکثر ترجمہ ہیں، چند "اپنائے" ہوئے اور چند طبعزاد ہیں۔ مگر سب افسانے دلچسپ ہیں۔ زبان بھی سلیس اور عام فہم اور طرز بیان نہایت دلچسپ ہے۔ تنہائی یا ریل کے سفر میں دل بہلانے کا یہ کتاب ایک عمدہ ذریعہ ہوسکتی ہے لکھائی چھپائی، کاغذ اور ظاہری زیبائش بھی بہت پسندیدہ ہے۔ کتاب مجلد ہے۔

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ ملنے کا پتہ:۔ ہیوٹی پبلشنگ ہاؤس لاہور۔ [2] حجم ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ ر۔ ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی پنجاب، لاہور۔

وداعِ راشد

یہ مضمون علامہ راشد الخیری مرحوم کی وفات پر اُن کے فرزند رشید مولانا رازق الخیری نے اپنے رسالہ "عصمت" دہلی بابت مارچ ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔ جسے اب کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ مولانا رازق کی زبان دہلی کی مستند زبان ہے۔ اور جس اسلوب بیان سے اُنھوں نے اپنے والد کی دائمی مفارقت کا یہ منظر کھینچا ہے وہ اُنھی کا حصہ ہے۔ پڑھنے والے کا دل بیحد متاثر ہوتا ہے۔ عقیدتمندان علامہ راشد الخیری اِس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ جو دفتر رسالہ "عصمت" دہلی سے مل سکتی ہے۔

لالہ رام نرائن لال کی کتابیں

الہ آباد کے لالہ رام نرائن لال بک سیلر و پبلشر کے مشہور کارخانہ نے ۱۹۳۹ء کی تازہ مطبوعات ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیجی ہیں۔ انمیں دو تو ڈکشنریاں ہیں۔ جنمیں ایک کا نام اسٹوڈنٹ پریکٹیکل ہندی انگریزی ڈکشنری (Student's Practical Hindi English Dictionary) اور دوسری کا "اسٹوڈنٹ ہینڈی ڈکشنری"۔ ہندی انگریزی ڈکشنری کا حجم ساڑھے تیرہ سو صفحات ہے پچھلے سال اسکا ساتواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جو اس کی ہر دلعزیزی کا ثبوت ہے۔ یہ ڈکشنری واقعی ہندی کے طالب علموں کے لئے بہت ہی مفید ہے۔ نئے ایڈیشن میں طالب علموں کی موجودہ ضروریات اور زبان کی نئی وسعت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ پہلے ایڈیشن سے اسمیں ایک سو اسی صفحات کا اضافہ کرکے تقریباً ڈھائی ہزار نئے الفاظ شامل کر لئے گئے ہیں۔ لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ یعنی اب بھی اسکی قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

Student's Handy Dictionary پاکٹ سائز کی مختصر قد و قامت کی چھوٹی سی انگریزی اُردو ڈکشنری ہے۔ جسمیں ۱۳۹۱ صفحات پر انگریزی الفاظ کے اُردو نستعلیق ٹائپ اور بہت سادہ و آسان زبان میں معنی درج کر دئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اپنے طرز کی یہ پہلی ڈکشنری ہے۔ جسمیں اُردو کا نستعلیق ٹائپ استعمال کیا گیا ہے۔ ہماری رائے میں ہر اُردو دان کو اس ڈکشنری کو جسکی قیمت صرف بارہ آنہ ہے اپنے پاس رکھنا چاہئے۔

مسٹر پیارے لال شاکر میرٹھی نے جدید ایجادات کے متعلق ایک مفید کتاب "ایجادات و انکشافات" کے نام سے لکھی ہے۔ جسمیں ٹائپ رائیٹر۔ گھڑی۔ موٹر کار۔ بائیسکل۔ گراموفون۔ ٹیلیفون۔ سلائی کی مشین وغیرہ وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات درج کر دی ہیں۔ اسکول کے لڑکے لڑکیوں کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

"بھگوت گیتا" کے بہت سے نثر و نظم کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ منشی میوا لال صاحب عاجز کا ترجمہ بھی جو "بھگوت گیتا منظوم" کے نام سے شائع ہوا ہے قابل قدر ہے۔ منشی صاحب صوبہ بہار کے بزرگ اور

بنگال کے پولیس آفسر تھے۔ ملازمت سے پنشن لینے کے بعد آپ نے اپنا وقت مذہبی کتابوں کے مطالعہ اور اُن کے ہندی اُردو ترجمے میں صرف کیا۔ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ :۔ لالہ رام نراین لال بُک سیلر الہ آباد۔

لالہ خوشحال چند کی کتابیں

ریاست حیدر آباد دکن میں آریہ ستیاگرہ کے سلسلے میں چھ ماہ کے اندر چودہ ہزار سے زائد آریہ سماجیوں نے جس جوش و خروش سے ہر قسم کی سختیاں جھیلیں۔ اُس کا حال اخبار بین اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن اس ستیاگرہ کا کیا مقصد تھا، کس طرح یہ شروع ہوا اور کیسے ختم کیا گیا۔ اس کے متعلق دلچسپ اور ضروری حالات ستیاگرہ کے تیسرے ڈکٹیٹر لالہ خوشحال چند صاحب مالک اخبار "ملاپ" لاہور و پریسیڈنٹ آریہ پرتی ندھی سبھا پنجاب و سندھ نے نہایت تفصیل کے ساتھ ایک چھوٹی سی کتاب میں قلمبند کر دئے ہیں۔ جو "جیل کی کہانی" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ لالہ خوشحال چند صاحب سچے ایشور بھگت ہیں اور راسخ الخیال آریہ لیڈر ہیں۔ آپ اس سے پہلے ۲ مرتبہ اپنے اخبار اور کانگریس ایجی ٹیشن کے سلسلے میں انگریزی جیل میں رہ چکے ہیں۔ اور آریہ ستیاگرہ کے سلسلے میں آپ کو ریاست حیدر آباد کے جیل خانہ کی زندگی کا بھی کافی تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں دیگر حالات کے علاوہ ریاستی جیلخانوں کی موجودہ حالت پر بھی بہت دلچسپ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور آریہ ستیاگرہ کے علاوہ مختلف رہنما مہاتما نراین سوامی جی۔ سری چاندکرن سارڈا وغیرہ کے حالات زندگی اور تجربات بھی درج ہیں۔ اور ان سب معززین کی عکسی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ جس سے کتاب کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ جن صاحبوں کو آریہ ستیاگرہ کے حالات جاننے اور ریاست حیدر آباد کے آریہ سماجیوں کی مشکلات معلوم کرنے کا اشتیاق ہو انھیں اس کتاب کو ضرور شروع سے آخر تک پڑھنا چاہئے۔ حجم ۱۹۲ صفحات۔ قیمت صرف ایک روپیہ

لالہ خوشحال چند جی دھارمک لیڈر ہیں۔ چنانچہ آپ نے ۲ قابل دید ہندی کتابیں "پیارا رشی" (۲۰۰ صفحات) اور "پربھو بھگتی" (۱۹۶ صفحات) بھی لکھی ہیں۔ "پیارا رشی" میں عام فہم زبان میں سوامی دیانند کی سوانحعمری کے سبق آموز واقعات اور دوسری خاص خاص باتیں نہایت قابلیت سے منتخب کر کے لکھی گئی ہیں۔

"پربھو بھگتی" میں جس کا دیباچہ مہاتما نارائن سوامی نے لکھا ہے۔ بھگتی کا طریقہ، من پر قابو پانے کے ذریعے اور سنسکار اور دھیان وغیرہ پر بہت مفید روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔ شائقین منیجر صاحب روزانہ "ملاپ" لاہور سے طلب فرمائیں۔

التماس

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے حلقہ اثر میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں؟ اگر آپ زمانہ کی ادبی خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنے علم دوست احباب سے اسکی خریداری کی سفارش کرنے میں کیوں پس و پیش کرتے ہیں؟ کیا اچھا ہو اگر آپ ہم کو انکے نام ہی سے مطلع فرمائیں، تاکہ ہم خود ہی اُن کی توجہ زمانہ کی طرف مبذول کریں۔

منیجر زمانہ

رفتار زمانہ

جنگ یوروپ

فنلینڈ | ساڑھے تین مہینہ کی ہولناک خونریزی کے بعد روس اور فنلینڈ کی لڑائی ختم ہوگئی۔ جنگ کیا۔ یہ شیر اور بکری کی لڑائی تھی۔ فنلینڈ کے بہادر سپاہی اپنی ہمت و شجاعت اور ایثار و جانبازی کے باوجود بھی اتنے دنوں تک روس کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکتے۔ اگر اس سال یوروپ میں اسقدر شدید جاڑا نہ پڑا ہوتا۔ اور امریکہ، فرانس اور برطانیہ انھیں ہوائی جہازوں سامانِ جنگ، رسد، روپیہ اور والنٹیروں سے مدد نہ پہونچاتے رہتے۔ ان حوصلہ مند و بہادر سپاہیوں نے اپنی بے پناہ وطن پرستی اور قابلِ تعریف بہادری سے روسیوں کے چھکّے چھڑا دئے اور جگہ جگہ انھیں ایسی شکستیں دیں جن کی وجہ سے روسی فوج کا بھرم دنیا سے اُٹھ گیا۔ اس ساڑھے تین مہینے کی جنگ میں فنوں نے تقریباً تین چار لاکھ روسیوں کو قتل و زخمی کیا۔ عام اندازہ کے مطابق روسی فوج کے تقریباً تین چار ہزار سپاہی روزانہ مارے گئے۔ لیکن آخر یہ نابرابر کی لڑائی کب تک جاری رہ سکتی تھی۔ جاڑا کم ہوتے ہی جب سے کھلا موسم شروع ہوا روسیوں کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں اور اس نے اپنی ٹڈی دل فوج منیرہیم لائن پر لاکر ڈالدی اور ہزاروں ہوائی جہازوں سے تقریباً روزانہ بمباری کرکے فنلینڈ کے اکثر شہروں، قصبوں اور دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس طرح رفتہ رفتہ روسیوں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ منیرہیم لائن کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ اور فنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ کہاں تک جمکر مقابلے کرتے۔ کہاں روس جسکی آبادی آٹھ نو کروڑ اور کہاں فنلینڈ جس کی آبادی زیادہ سے زیادہ صوبہ متحدہ کے ضلع گورکھپور کے برابر ہے۔ آخر وہی نتیجہ ہوا جو ایسی لڑائیوں کا ہوا کرتا ہے یعنی روس کی ٹڈی دل فوج کے سامنے فنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ ان کا حفاظتی خط ٹوٹ گیا۔ اور روسیوں نے خشکی پر شہر کو لوسٹو اور سمندر میں خلیج فنلینڈ کے اہم جزیروں پر قبضہ کرلیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچ گئی تو ۲۶ فروری ۱۹۴۰ء کو فرانس اور برطانیہ نے فنلینڈ سے کہا کہ تمہاری درخواست پر ہم سامانِ جنگ کے علاوہ باقاعدہ فوجوں سے بھی مدد دینے کو تیار ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے سویڈن کی گورنمنٹ سے بھی ٹرانسپورٹ کی سہولتیں دینے کی استدعا کی لیکن ۷ مارچ تک اتحادیوں کی تجویز کا فنلینڈ اور سویڈن، دونوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جس پر فرانس و برطانیہ تو خاموش ہوگئے اور فنلینڈ کی گورنمنٹ کو مجبور و معذور ہوکر حملہ آوروں کے آگے سر جھکانا پڑا۔

ناروے اور سویڈن کی بے حمیتی کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ روس اور جرمنی دونوں کی مخاصمت کی انھیں ہمت نہیں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ روس اور جرمنی نے ان دونوں ملکوں سے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا تھا کہ اگر

انھوں نے اپنے علاقہ سے فنلینڈ کو غیر ملکی امداد پہونچنے میں سہولیت دی۔ تو اُن کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ ناروے اور سویڈن اس دھمکی سے اسقدر ڈر گئے کہ فنلینڈ کو غیر ملکی امداد نہ پہونچ سکی۔ اور وایپوری کے محاذ پر فن لینڈ کو ایک معرکہ میں اسقدر زبردست شکست ہوئی کہ اُس کے ستّرہ ہزار آدمی میدان میں کھیت رہے۔ اس کے بعد فن فوج کی کمر ہمت بالکل ٹوٹ گئی۔ اور اُسے روس سے جس طرح ہوسکا صلح کرنا پڑی۔ فنلینڈ کا ڈیپوٹیشن ماسکو گیا۔ صلح کی گفتگو ہوئی اور مندرجہ ذیل شرطوں پر صلح ہوگئی اور اس طرح ۱۳ مارچ کو بارہ بجے دن کے وقت یہ لڑائی ختم ہوگئی۔

روس کے پہلے مطالبات یہ تھے:-

(۱) لینن گراڈ کے اتر کی طرف فنلینڈ کا دس ہزار مربع میل کے قریب جو علاقہ ہے وہ روس کو دیدیا جائے۔ جس کے عوض روس کاریلیا کا ستر ہزار مربع میل علاقہ اور تیس کروڑ روبل نقد دیگا۔

(۲) خلیج فنلینڈ کے جزیروں کا راستہ بند کردیا جائے۔

(۳) خلیج فنلینڈ کے دونوں ساحلوں پر توپیں چڑھانے کی اجازت دی جائے۔

(۴) روس سے تیس کروڑ روبل لےکر فنلینڈ اُسے بندرگاہ ہانگو اور اُس کے آس پاس کا علاقہ۔ بندرگاہ پلڈسکی اور اسکا علاقہ ایک بحری مستقر بنانے لئے تیس سال کے پٹہ پر دیدے۔

(۵) روس و فنلینڈ آپس معاہدہ کریں۔ جس کی رو سے دونوں میں سے کوئی نہ ایک دوسرے پر حملہ کرے اور نہ کوئی دوسری پارٹی کے خلاف کسی تیسرے ملک سے کوئی معاہدہ کریں۔ مگر اتنے دنوں کی بہادرانہ مزاحمت کے مقابلہ کے بعد ۱۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جن شرطوں پر فنلینڈ کو صلح کرنا پڑی۔ وہ ان ابتدائی شرطوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ ان شرائط کے مطابق فنلینڈ کو خاکنائے کاریلیا اور جھیل لاڈوگا کے گرد و نواح کا علاقہ مع وایپوری اور دوسرے شہروں کے روس کے حوالہ کرنے پڑے۔

(۲) خلیج فنلینڈ میں جن جزیروں پر روس نے قبضہ کرلیا ہے اُن پر آیندہ بھی روس ہی اپنا قبضہ قائم رکھے گا۔

(۳) جزیرہ نمائے ہانگو اور اس کے آس پاس کے جزیرے روس کو بیس ہزار پاونڈ سالانہ پر تیس سال کیلئے پٹہ پر مل جائیں گے۔

(۴) روس کو شمالی سمندر میں اپنا بحری مستقر قائم کرنے کا اختیار ہوگیا۔

(۵) فن لینڈ کو پندرہ جنگی جہازوں سے زیادہ رکھنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اور اُن میں بھی کسی کا وزن ننانوے ٹن سے زیادہ نہ ہوگا۔ فن لینڈ کو چار سو ٹن سے زیادہ وزن کے تجارتی جہاز رکھنے کا بھی اختیار نہ ہوگا۔

(۶) ۱۵ مارچ تک روسی فوجیں پٹسامو اور دوسرے علاقے خالی کردیں گی۔ مگر روس کو پٹسامو کے راستہ سے اپنا تجارتی مال ناروے، سویڈن بھیجنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور فنلینڈ کو روسی مال پر کوئی چونگی عائد کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔

(۷) لڑائی ختم ہوتے ہی دونوں ملک تجارتی معاہدہ کی بات چیت شروع کردیں گے۔

(۸) فن لینڈ روس کے خلاف کسی سلطنت سے سازباز یا معاہدہ نہ کریگا۔

اس معاہدہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ایک یہ ہے کہ روس نے پہلے جتنا علاقہ طلب کیا تھا فنلینڈ کو اب اس سے کہیں زیادہ دینا پڑا۔ درحقیقت یہ علاقہ فن لینڈ کے پورے رقبہ کا دسواں حصہ ہے۔ علاوہ بریں پہلے روس نے اس علاقہ کے عوض کچھ نقد روپیہ بھی دینا تجویز کیا تھا۔ مگر نئے معاہدہ میں اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ روس نے جو علاقہ فنلینڈ سے لے کر اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ اُسمیں "جمہوریہ کاریلیا" کے نام سے ایک روسی جمہوریت قائم کی جائے گی۔ جس کا صدر مقام واپُوری ہوگا۔ اور اس کے بڑے بڑے عہدے اہلِ فنلینڈ ہی کو دئے جائیں گے۔

عام طور پر روس و فنلینڈ میں صلح ہو جانا اتحادیوں کی سیاسی شکست سمجھی گئی ہے۔ جرمنی میں تو اس صلح کو بڑی اہمیت دی گئی اور عام طور پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور سرکاری حلقوں میں اسے جرمنی کی فتح عظیم قرار دیا گیا چنانچہ ایک نیم سرکاری جرمن اخبار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ صلح لندن اور پیرس کے لئے ایک اہم سیاسی شکست کے بمنزلہ ہے جرمنوں کے خیال بموجب برطانیہ جنگ کو یوروپ کے شمالی حصہ تک بڑھا کر جرمنی پر عقب سے حملہ کرانا چاہتا تھا۔ مگر اس صلح سے اُسے اس میں ناکامیابی ہوئی۔ جرمنوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اب روس، فنلینڈ کی جنگ سے فارغ ہو کر ان کو زیادہ موثر امداد دے سکیگا۔ یہ بھی عجب لُطف کی بات ہے کہ اب تک جرمن روس و فنلینڈ کی جنگ میں غیر جانبداری کے دعویدار تھے۔ اب روس کی کامیابی کے حصہ دار بن رہے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ روس نے پہلے مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ کی معرفت صلح کی شرائط بھیجنے کی کوشش کی تھی مگر مسٹر موصوف نے ان سخت شرطوں کو فن لینڈ تک پہونچانے سے انکار کر دیا۔

یہ الزام بھی غلط ہے کہ انگلستان و فرانس نے فنلینڈ سے مدد دینے کا وعدہ تو کر لیا۔ لیکن پھر اُسے ایفا نہیں کیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اتحادیوں نے تین ماہ کے اندر فنلینڈ کو ۴۵۵ ہوائی جہاز، ۹۱۶ توپیں، ۲۵ لاکھ گولے، پانچ ہزار مشین گنیں، ساڑھے چار لاکھ بم، چھ کروڑ کارتوس اور دوسرا سامانِ جنگ بمقدار کثیر فن لینڈ بھیجا۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ساز و سامان سے مسلح باقاعدہ فوجیں بھیجنے پر آمادگی ظاہر کی۔ گو ناروے اور سویڈن نے امدادی فوج کو راستہ دینے سے انکار کیا۔ اور فنلینڈ کو بھی اس کی درخواست کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بہرحال ہم اس چھوٹے ملک پر بھی کوئی الزام عائد نہیں کر سکتے ہیں اگر اُس نے "مرتا کیا نہ کرتا" کے اصول پر روس سے صلح کر لینے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ آخر یہ چھوٹا سا ملک ایسے عظیم الشان ملک اور ایسی زبردست حکومت سے کب تک لڑ سکتا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس چندروزہ جنگ میں فنلینڈ کی مٹھی بھر فوج نے روس کی ٹڈی دل سپاہ کے مقابلہ میں بہادری اور شجاعت کے جو شاندار کارنامے انجام دئے وہ یوروپ کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔

صلح کا نتیجہ اگر سب کچھ کہنے سُننے کے بعد اسمیں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جن شرطوں پر فنلینڈ کی صلح ہوئی ہے اُنکا اثر

بہت دُور تک پہونچے گا۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ فنلینڈ، سویڈن و ناروے اب روس کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکیں گے۔ دوسرے چونکہ خاکنائے کاریلیا اور جھیل لاڈوگا کے آس پاس کا علاقہ روس کے حوالہ کردینے سے سینرہیم لائن کی مضبوط حفاظتی لائن بھی فنلینڈ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اسلئے اب اُسے اپنی حفاظت کیلئے بڑی بھاری سپاہ رکھنی پڑے گی۔ جس کا بار فنلینڈ کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوگا۔

یہی حال سویڈن و ناروے کا بھی ہوگا۔ یا تو انھیں اپنی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کرنا پڑے گا۔ یا پھر اپنی جان بچانے کے لئے روس و جرمنی کی موافقت کرنا پڑے گی۔

اس صلحنامہ کے بعد اتحادی فوجیں جرمنی پر بھی فن لینڈ ہو کر کوئی حملہ نہیں کر سکتی ہیں اور جرمنی گویا ہر طرف سے محفوظ ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ روس، سویڈن اور ناروے سے بھی اُس کو ہر قسم کا سامان پہونچنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی اتحادی فوجوں کو بھی پچھمی مورچہ سے ہٹنے کی کوئی ضرورت نہ پڑے گی۔

بہرصورت روس اس صلح کے بعد بحیرہ بالٹک کے نصف شمالی حصہ کا مالک ہوگا اور اُس کو ایک نیا بحری مستقر قائم کرنے کے لئے جزیرہ نمائے ہانگو مل گیا ہے اسطرح شمالی یوروپ میں اب روس کی پوزیشن بہت مضبوط ہوگئی ہے پچھلی جنگ میں وہ یوروپ سے بالکل بیدخل ہوگیا تھا۔ مگر موجودہ لڑائی میں اُس نے اپنا گذشتہ اقتدار پھر از سر نو قائم کرلیا ہے

فن لینڈ کے بعد | فن لینڈ سے معاملہ طے کرنے کے بعد اب روس و جرمنی کیا کریں گے؟ اس سوال کا جواب بہت پیچیدہ اور غیر یقینی ہے۔ اور ہم اس کا جواب محض قرائن کی بُنیاد پر دے سکتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ قرائن کے لئے ضروری نہیں کہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوں۔ بہرحال اسوقت عام خیال یہی ہے کہ مخالف قوتیں اب رومانیہ اور یوروپ کے جنوب مشرقی حصہ پر فوراً متوجہ ہوں گی۔ رومانیہ بھی عرصہ سے اس خطرے کو محسوس کر رہا ہے۔ اسی لئے اُس نے اپنی حفاظت کی تمام تیاریاں پُوری طرح مکمل کرلی ہیں۔ لیکن رومانیہ فنلینڈ سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی اور اٹلی، رومانیہ پر روس کو حملہ نہ کرنے دیں گے کیونکہ موجودہ جنگ میں جرمنی کو رومانیہ سے جو مادی امداد مل رہی ہے وہ روسی حملہ ہونے کی صورت میں قطعی بند ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی محاذ پر جرمنی کی پوزیشن بڑی خراب ہو جائے گی۔ اس لئے جرمنی کا اسی میں فائدہ ہے کہ جس طرح ہوسکے وہ روس کو رومانیہ پر حملہ کرنے سے باز رکھے۔ چنانچہ تازہ خبروں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کا یہ مقصد حاصل ہوگیا ہے اور روس نے اس سے وعدہ کرلیا ہے کہ خواہ کچھ ہو لیکن روس رومانیہ پر حملہ آور نہ ہوگا۔ جرمنی کے وزیر خارجیہ ہر فان ربن ٹراپ نے روم جاکر موسولینی کو اس کا پُورا پُورا اطمینان بھی دلا دیا ہے کہ روس رومانیہ پر حملہ نہیں کریگا۔ اور اب جرمنی کی طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ روس و رومانیہ کے درمیان بھی ایک غیر جارحانہ معاہدہ ہو جائے۔

مشرق وسطیٰ | اس وقت مصر، فلسطین اور ولایت شرق اردن میں برطانیہ کی فوج اور شام میں فرانس کی فوجیں جمع ہیں۔

فرانس، برطانیہ و ٹرکی میں باہمی امداد کا معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔ جس کا ذکر زمانہ میں اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اب دارالحکومت ٹرکی سے یہ تازہ خبر معلوم ہوئی ہے کہ آجکل ترکی جنرل اسٹاف کے نائب سردار اعلیٰ جنرل عاصم گندوز، شہر حلب میں اتحادی جنرلوں سے بات چیت کر رہے ہیں کہ اگر روس کسی وقت ٹرکی پر حملہ کر بیٹھے یا کسی اور خاص وجہ سے ٹرکی کو لڑائی میں شامل ہونا پڑے تو از روئے معاہدہ فرانسیسی، برطانوی و ترکی فوجیں ایک دوسرے کی کیا مدد کریں گی اور اس باہمی اتفاق و اتحاد سے کیا فائدہ اُٹھایا جا سکیگا؟ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اس طرح کا صلاح و مشورہ ہو چکا ہے۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہو چکی ہے کہ گو ٹرکی حتی المقدور روس سے اُلجھنا نہیں چاہتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے اُس کو روس سے لڑنا پڑا تو اس جنگ کا محاذ کوہستان قفقاز کی سرحد ہوگا اور فرانس و برطانیہ کے جنگی جہازوں کو دردانیال و باسفورس سے گذر کر بحیرۂ اسود میں جانے دیا جائے گا۔ جہاں وہ روس کی بحری ناکہ بندی کر سکیں گی۔ اور ٹرکی و اتحادی فوجیں جارجیا[1] پر بھی حملہ کرینگی تاکہ شہر باکو[1] کے روسی پٹرول کے خزانوں پر قبضہ کیا جا سکے اور روس کا پٹرول جرمنی تک نہ پہونچنے پائے۔

اٹلی و جرمنی روس اور فن لینڈ کی صلح کے بعد جرمنی کے وزیر خارجہ ہر فان ربن ٹراپ روم گئے۔ اور وہاں اُنھوں نے موسولینی اور اُن کے وزیر خارجہ کاؤنٹ کیانو سے بات چیت کی۔ عام خیال یہ ہے کہ رومانیہ، بلقان اور روس کے بارہ میں بات چیت ہوئی لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب ہر فان ربن ٹراپ نے برلن جاکر رپورٹ کی تو خود ہٹلر نے موسولینی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا جو اٹلی و جرمنی کی سرحد پر درہ برینیر کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ اگرچہ اس ملاقات کا مفصل حال بھی واضح طور پر معلوم نہیں ہوا لیکن عام خیال یہ ہے کہ ہٹلر نے اس ملاقات میں موسولینی کو روس کے ساتھ غیر جارحانہ معاہدہ کرنے کے لئے ہموار کر لیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اٹلی، جرمنی و روس میں معاہدہ ہو جائے اور تینوں ملکر اتحادیوں کے خلاف کارروائیاں کر سکیں۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ اٹلی ایسا نہ کریگا۔ کیونکہ اگر اُس نے ایسا کیا۔ تو اُسے خواہ مخواہ اتحادیوں سے لڑنا پڑے گا۔

مغربی محاذ یا پچھمی مورچے کی جنگی سرگرمیوں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔ (۱) برّی (۲) بحری اور (۳) ہوائی۔ انمیں (۱) برّی لڑائی کا یہ حال ہے کہ فرانس و جرمنی کی سرحد پر فریقین کی فوجیں شروع جنگ سے ایک دوسرے کے سامنے قلعبند ہیں۔ پہلے تو فرانسیسی فوجوں نے پیشقدمی کر کے میجینو اور سیجفریڈ لائنوں کے درمیان تقریباً پانچ سو مربع میل پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں موسم کی خرابی، سیلاب اور دوسری مصلحتوں کے خیال سے جرمن علاقہ خالی کر کے فرانسیسی فوجیں اپنی جگہ پھر واپس آگئیں۔ اس کے بعد سردی اور برفباری کی وجہ سے فریقین کی سرگرمیاں بند ہو گئیں۔ البتہ کبھی کبھی فریقین کے دستے دشمن کی بعض چوکیوں پر چھاپے مار کر پسپا ہو جاتے تھے۔ مگر مارچ کے پہلے ہفتہ میں جب موسم کی شدت ذرا کم ہو گئی تو جرمن سیجفریڈ لائن کی ایک برطانوی چوکی پر حملہ کر کے مورچوں کے اندر گھس گئے

[1] گرجستان [1] بادکوبہ (Baku)

برطانوی فوج نے دست بدست مقابلہ کیا۔ اور دشمن کو پسپا کر کے اپنی چوکی پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ لیکن اس حملہ میں دو برطانوی سپاہی ضائع اور چودہ لاپتہ ہوئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے سوا کوئی قابل ذکر معرکہ ابھی تک نہیں ہوا البتہ دریائے موزیل اور سار کے محاذ پر یا کوہستان واسجیز کے محاذ پر فریقین ایک دوسرے پر چھاپے مارتے رہتے ہیں اور توپوں کے ذریعہ بھی سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ غیر جانبدار ملکوں کے نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی خبروں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلے دو مہینے میں جرمنوں نے مجیمی مورچے پر حملہ کی زبردست تیاریاں کی ہیں۔ اور عجب نہیں کہ اب جلد ہی انکا زبردست حملہ شروع ہو جائے۔ لیکن فرانس و برطانیہ اس کا پورے طور سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور ان دونوں ملکوں کے عوام بھی اپنی اپنی گورنمنٹوں پر زور ڈال رہے ہیں کہ اب خود اتحادیوں کی طرف سے جارحانہ پیشقدمی شروع ہونا چاہئے۔ اسی عام رائے کا نتیجہ ہے کہ فرانس کی وزارت تبدیل ہو گئی اور برطانوی وزارت میں بھی ردوبدل کی خبر ہے۔ گو ابھی تک اس خبر کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ لیکن جنگ شروع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ پارلیمنٹ میں فنلینڈ کے مباحثہ کے سلسلے میں وزیروں پر علانیہ نکتہ چینی کی گئی۔ عام خیال ہے کہ جلد یا دیر میں برطانیہ کی موجودہ جنگی کیبنٹ میں ضروری کاٹ چھانٹ ہوگی۔ کیونکہ اسوقت اس کیبنٹ میں بہت زیادہ ممبر ہیں۔ جس کی وجہ سے جنگ کے متعلق فیصلوں میں خواہ مخواہ تاخیر ہوتی ہے۔

(۲) بحری لڑائی کی رفتار پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ سرگرمی جرمنوں نے بحری معرکہ آرائیوں ہی میں دکھائی ہے اور آبدوز یعنی پن ڈبی کشتیوں، مقناطیسی سرنگوں اور ہوائی بمباریوں سے اتحادیوں اور غیر جانبدار سلطنتوں کے زیادہ سے زیادہ جہاز غرق کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سرگرمی کے باوجود بحری لڑائی میں بھی اتحادیوں کے مقابلہ میں خود جرمنی کا زیادہ نقصان ہوا ہے۔ آغاز جنگ پر برطانیہ کے دو کروڑ دس لاکھ ٹن وزنی جہاز سمندر میں چل رہے تھے۔ سات مہینے کی لڑائی میں جرمنی برطانیہ کے صرف ساڑھے چھ لاکھ ٹن وزنی جہاز ڈبو سکا ہے۔ لیکن اس عرصہ میں برطانیہ نے کچھ نئے جہاز بھی بنائے اور جرمنی کے کئی جہاز گرفتار کر لئے۔ چنانچہ برطانیہ کے بحری نقصان کی حد صرف ڈھائی لاکھ ٹن تک پہونچتی ہے۔ جرمنی نے برطانیہ کی ناکہ بندی کرنے اور اس کی بحری طاقت تباہ کرنیکا دعویٰ کیا تھا۔ لیکن اس حساب سے جرمنی کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے سالہا سال درکار ہیں۔

اس کے مقابلہ میں جرمنی کے بحری نقصانات کچھ کم نہیں ہوئے۔ کیونکہ ان جہازوں کے علاوہ جو اتحادیوں نے گرفتار کر لئے ہیں، کئی بڑے بڑے جہاز خود جرمنوں نے دشمن کے ہاتھ پڑنے کے اندیشہ سے ڈبو دئے ہیں۔ اس طرح جرمنی کا جو بحری نقصان ہوا، وہ برطانوی نقصانات سے کم نہیں ہے۔ جب جنگ شروع ہوئی تو جرمنی کے پاس ستر آبدوز کشتیاں تھیں جن میں سے پچاس کے قریب اتحادیوں نے سمندر کی تہ میں پہونچا دیں۔ اور یہ جرمنی پر ضرب کاری ہے۔ جرمنی کے باقی ماندہ جہاز یا تو خود جرمن بندرگاہوں میں بند پڑے ہیں یا اتحادی بیڑوں کے خوف سے غیر جانبدار ملکوں کی بندرگاہوں

میں قید ہیں۔ جہانتک جرمنی کے جنگی بیڑے کا تعلق ہے، ایک جنگی جہاز غرق ہو چکا ہے۔ دوسرے کو ناقابل تلافی صدمہ پہونچا ہے دو کروڑ ڈوب گئے ہیں اور ایک یا دو کروزروں کو صدمہ پہونچ چکا ہے۔ یہ نقصانات کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

(۴)۔ ہوائی معرکوں میں بھی جرمنی کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ نقصانات ہی اٹھانا پڑے اب تک جرمنی نے برطانیہ پر تقریباً ۸۰۰ سو ہوائی حملے کئے۔ جنہیں اُن کے پچیس ۲۵ فیصدی ہوائی جہاز کھیت رہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ جرمنی کے تقریباً دو ۲ ہزار ہوائی جہازوں نے ان حملوں میں حصہ لیا۔ جس میں سے پچاس ۵۰ تباہ ہو گئے۔ اور جرمنی کو ان حملوں میں ستر ۷۰ ہزار گیلن پٹرول خرچ کرنا پڑا۔ مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ فرانس پر جو حملے ہوئے انہیں جرمنی کو پندرہ ۱۵ لاکھ مارک کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اور نتیجہ بہت کم نکلا۔ اس عرصے میں اتحادیوں کے ہوائی جہاز بھی بیکار نہیں رہے۔ برطانوی طیاروں نے جرمنی اور پولینڈ کے تقریباً ہر مقام پر جا کر پرواز کی، اور اشتہار و بم گرائے۔ اور جرمنی کے اہم جنگی مقامات کے فوٹو بھی لئے۔ اسمیں اُن کو اسقدر کامیابی حاصل ہوئی کہ اب ایک اہم جنگی نقشہ تیار ہو گیا ہے۔ برطانوی طیاروں نے کئی مرتبہ جزیرہ ہیلی گولینڈ کے ہوائی و بحری مستقر پر بمباری کی، برلن پر اڑ کر دھمکی دی، دشمن کی آبدوز کشتیوں پر بم پھینکے اور غرق کیا۔ اور بحیرہ بالٹک پر پرواز کر کے تمام باتوں کی دیکھ بھال کی۔ ان اہم سرگرمیوں میں بہت کم برطانوی طیارے ضائع ہوئے اور جو ضائع بھی ہوئے اُن کی جگہ یا تو نئے جہاز بنائے گئے یا امریکہ سے خرید لئے گئے۔ برطانیہ کے پاس پٹرول کی بھی کمی نہیں۔

بہر حال گذشتہ چھ ۶ مہینے میں جتنی بھی بری، بحری اور ہوائی لڑائیاں ہوئیں۔ اُن میں جرمنی کا زیادہ نقصان ہوا، اور اتحادیوں کا کم۔

(ہندوستان)

کانگریسی وزارتوں کے استعفاء کے بعد اب تک وائسرائے ہند اور مہاتما گاندھی کے درمیان کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ہز ایکسلنسی لارڈ لنلتھگو، مسٹر جناح اور ملک کے دوسرے لیڈروں سے بھی تبادلۂ خیالات کر چکے ہیں۔ مہاتما جی کی آخری ملاقات فروری کے اول ہفتہ میں ہوئی۔ مگر اسمیں بھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ بمبئی میں لارڈ ممدوح کے اس اعلان سے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان میں جلد سے جلد قانون ویسٹ منسٹر کے ماتحت نوآبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری قائم کرنے کے لئے تیار ہے، مصالحت کی بہت کچھ اُمید بندھ گئی تھی لیکن مہاتما جی اور کانگریس، نوآبادیوں کے طرز کی حکومت خود اختیاری کے بجائے کامل آزادی کے خواستگار ہیں۔ آئندہ نظام حکومت ملک کی نمایندہ اسمبلی میں مرتب کرانا چاہتے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ قلیل تعداد والی جماعتوں اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے رہی ہے اور واقعی اسمیں کوئی شک نہیں کہ اسوقت یہ دونوں کانگریس سے بہت کچھ منحرف ہو رہے ہیں گو کانگریس قلیل تعداد والی جماعتوں کو بار بار اطمینان دلا چکی ہے اور نمایندہ اسمبلی میں بھی اُنکو جداگانہ حلقۂ انتخاب کے ذریعہ اپنے اپنے مجوزہ نمایندے منتخب کرنیکا حق دینے کا اعلان کر چکی ہے مگر مسٹر جناح اور اُنکے رفیق لیڈران مسلم لیگ کسی طرح راضی نہیں ہوتے اور علیحدہ قومیت کا راگ الاپ رہے ہیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی تجویز ہے کہ تمام مسئلے صوبوں کے منتخب شدہ ممبران اسمبلی کے فیصلہ پر چھوڑ دیئے جائیں جسکی ہز ہائینس آغا خان نے بھی تائید کی ہے۔ بہر حال اگر اصل معاملہ کے متعلق کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان کوئی خاطر خواہ سمجھوتہ ہو جائے تو نمایندہ اسمبلی کے متعلق سمجھوتہ ہونے میں شاید اتنی دقت نہ ہو۔ ہاں کانگریس کا یہ

مطالبہ بھی برطانیہ کے لئے دقت طلب ہے کہ ہندوستانی نمائندے جو آئین ملک کیلئے مرتب کریں اُسے بلاکم وکاست منظور کرلیا جائے مگر اس کیلئے بھی مصالحت کا راستہ نکل سکتا ہے۔ بشرطیکہ فریقین مصالحت کیلئے دل سے آمادہ ہوں۔ کانگریس کے سامنے سب سے بڑا اور سب سے اہم مسئلہ نام نہاد اقلیتوں کا ہے۔ اس کے طے ہونے میں لیڈران مسلم لیگ کے موجودہ رویہ سے غیر معمولی پیچیدگیاں ہوگئی ہیں۔ کانگریس کا خیال ہے کہ تمام مشکلات لیڈران نے محض اپنا اثر و اقتدار قائم و برقرار رکھنے کے لئے پیدا کر رکھی ہیں۔ اس خیال کی تائید اس بات سے ضرور ہوتی ہے کہ جب سے یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ عوام کے فائدہ کیلئے تو کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ البتہ دقت بیوقت ہر جگہ اور ہر موقعہ پر مذہب کے خطرے میں ہونیکی صدا اس زور و شور سے بلند کی جاتی ہے کہ عوام کی توجہ دوسرے اہم اور ضروری مسئلوں کی طرف منتقل ہی نہیں ہونے پاتی۔ کانگریس نے اپنی وزارتوں کے زمانہ میں اپنی طرف سے اقلیتوں کی دلجوئی میں کوئی کمی نہیں کی۔ پھر بھی چونکہ اُنکے دقت میں قابو یافتہ لیڈروں کے حوصلے پورے نہیں ہوسکے۔ اس لئے پریس و پلیٹ فارم دونوں سے زور و شور سے یہی پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ کانگریس اقلیتوں کو ہر طرح سے مٹا رہی ہے۔ حالانکہ مہاتما گاندھی اور دوسرے لیڈران کانگریس بار بار اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ جو آئین وہ ہندوستان کے لئے منظور کریں گے۔ اس کے لئے اقلیتوں کی رضامندی ایک لازمی بات ہوگی۔ انھوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقۂ انتخاب منظور کرلیا ہے اور جو معاملے اتفاق رائے سے طے نہ ہوسکیں۔ انھیں غیر جانبدار لوگوں کے فیصلہ پر چھوڑ دینے کی بھی رضامندی دیدی ہے۔ عام ممبران کانگریس بھی اس بارے میں اپنے لیڈران سے متفق ہیں۔ اس کا تازہ ثبوت اسی سے ملتا ہے کہ آیندہ سال کے لئے نامور مسلم لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس پریسیڈنٹ منتخب ہو لئے ہیں۔ مسٹر ایم۔ این۔ رائے نے اُن کے خلاف بہت کوشش کی لیکن انھیں ہندوستان بھر سے دو سو ووٹ بھی نہ ملے۔ اور مولانا آزاد ہی بڑی کثرت رائے سے منتخب ہوگئے۔ مولانا موصوف مذہبی حیثیت سے نہ صرف سچے اور راسخ الخیال مسلمان ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کے پرانے لیڈر اور ایک مشہور عالم دین اور مذہبی پیشوا بھی ہیں۔ اُنکی قابلیت، بے لوثی، معاملہ فہمی اور تجربہ کاری بھی مسلمہ ہے۔ کانگریس نے اس وقت آپ کو اپنا رہنما منتخب کرکے مسلمانوں کو اطمینان دلانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس کے اندرونی حلقہ میں آپکا جو اثر و اقتدار ہے اُسکے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی نہ کوئی حق تلفی ممکن ہے اور نہ انکے ساتھ کوئی ناانصافی ہی ہوسکتی ہے۔

اقلیتوں کے ایجی ٹیشن کے علاوہ کانگریس کے اندرونی اختلافات بھی باعث پریشانی ثابت ہوئے ہیں۔ سبھاش چندر صاحب بوس اور اُن کے نامور بھائی بابو سرت چندر بوس اب کانگریس کے موجودہ لیڈروں کے علانیہ بغاوت کر رہے ہیں۔ چنانچہ بنگال پراونشل کانگریس کمیٹی اُنھیں کے زیر اثر صدر کانگریس کے احکام و ہدایات کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو بار بار اس مسئلہ پر غور کرنا پڑا۔ صدر کانگریس بابو راجندر پرشاد نے ہر موقعہ پر دلجوئی و صلح کوشی سے کام لیا۔ لیکن سبھاش بابو کے ساتھی راہ راست سے برابر انحراف کرتے رہے۔ مگر اتنا غنیمت ہے کہ معدودے چند لوگوں اور بعض کانگریس کمیٹیوں کے علاوہ صوبہ بنگال کی زیادہ تر کانگریس کمیٹیاں ورکنگ کمیٹی کی ماتحتی میں حسب دستور سابق کام کر رہی ہیں۔ سبھاش بابو نے مہاتما جی کے خلاف غلط فہمیاں پھیلانے کیلئے ملک بھر کا دورہ کیا ہے۔ اور رام گڈھ کانگریس کے عین موقعہ پر ایک مخالفانہ کانفرنس منعقد کرنیکے انتظامات کئے ہیں۔ مگر مہاتما جی کے خلاف اُنکے کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ تاہم اسوقت سبھاش بابو اور اس قسم کے بعض دوسرے خود پسند و خود بین لیڈروں کی بدولت ملک میں منافقانہ تحریکوں کی سرسبزی کیلئے میدان پیدا ہو رہا ہے۔ غالباً اسی لئے مہاتما جی کو موجودہ فضا میں تشدد کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر کھچڑیاں پک رہی ہیں۔ باہمی رواداری میں صریح کمی آگئی ہے۔ خدمت عامہ کے بہانہ سے فوجی قسم کی تنظیم کی کوششیں جاری ہوگئی ہیں۔ خاکساروں کی تحریک کو شروع ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اس کے جواب میں "شکتی دل" "مہابیر دل" وغیرہ قائم کرنیکی فکریں ہو رہی ہیں۔ ہم ان فرقہ وارانہ تحریکوں کو ملک کے حق میں مضر سمجھتے ہیں اور خوش ہیں کہ سر سکندر حیات کی گورنمنٹ نے انکے خلاف کارروائی کرنیکا فیصلہ کیا ہے

زمانہ

جلد ۷۴ — اپریل ۱۹۴۰ء — نمبر ۴

آریہ سماج اور اسلام

از "حق پرست" — کافر کا [illegible]

یہ ایک نازک مضمون ہے، اس کی نزاکت نے اُن سنجیدہ طبقوں کو بھی جو فریقانہ حیثیت نہیں رکھتے اس درجہ سہما رکھا ہے کہ وہ اس پر اظہار خیالات درکنار غور کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر خاصہ لٹریچر موجود ہے، مگر اس کا سرچشمہ وہ ادارے ہیں جو مذہبی مناظروں، مباحثوں، مناقشوں اور مجادلوں میں مبتلا ہیں۔ سنجیدہ پبلک کے غور و خوض کے لئے کوئی ایسی چیز پیش نہیں ہوئی جس سے یہ ممکن ہو کہ اس مسئلہ کے متعلق تمام واقعات اور معاملات صحیح روشنی میں ظاہر ہو سکیں۔ اور اہل فکر و تدبّر کو ایسے تدابیر سوچنے کا موقع مل سکے جن سے ملک میں امن و امان، فلاح و بہبود اور مستقل ترقی کی صورتیں پیدا ہو سکیں۔ حیدرآباد دکن کے پچھلے آریہ ستیاگرہ نے جس سے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ملک بھر کی فضا متاثر ہوئی۔ اس قسم کی کوشش کی اشد ضرورت کا عام طور پر احساس کرا دیا ہے۔ راقم الحروف نے اسی احساس کے زیر اثر ملک کے سنجیدہ اور مآل اندیش بزرگوں کے غور و خوض کے لئے اس مسئلہ پر اظہار خیالات کی ناچیز کوشش کی ہے

اس مضمون پر اپنے خیالات کے اظہار سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دوں۔ جو مختصراً یہ ہے کہ انسان تو انسان ہر ذی روح کی تمام تر جد و جہد کی تہ میں دانستہ یا نادانستہ سُکھ حاصل کرنے کا قدرتی جذبہ کام کرتا ہے۔ اسی جذبہ کے زیر اثر وہ اُن

چیزوں اور معاملات کی جستجو میں رہتا ہے، جن سے اُس کے خیال کے مطابق اُسے راحت حاصل ہوسکتی اور اُن چیزوں اور معاملات سے گریز کرتا ہے جن کو وہ اپنی راحت کے راستہ میں حائل سمجھتا ہے۔

ہمیں یہاں انسان سے بحث ہے جس کو خداوند کریم نے سوچ بچار کا بھی مادہ دیا ہے۔ یعنی جہاں حیوانی زندگی میں زیادہ تر قدرتی رُجحانات[۵۱] کام کرتے ہیں، انسان عقل و تمیز سے بھی کام لیتا ہے۔ بدیں نتیجہ کہ اُس کی نظر وسیع اور دُور رس ہوتی ہے، اور وہ کسی فوری فائدہ کی خاطر عموماً کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس سے آئندہ اُس کے سُکھ میں کم و بیش مستقل طور پر ہرج واقع ہونے کا اندیشہ ہو مثلاً محنت نہ کرنا بجائے خود ایک فوری آرام ہے، لیکن چونکہ اس سے اُس کی روزی یا صحت پر ناموافق اثر پڑتا ہے جس سے اُس کی راحت میں سخت خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ آئندہ فاقہ یا خرابیِ صحت کی صعوبتوں سے محفوظ رہنے کے لئے محنت کی تکلیف گوارا کرتا ہے۔

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ عادت انسان کی زندگی پر بڑا زبردست اور اہم اثر رکھتی ہے۔ عادت اگر بُری ہو تو انسان کے طرۂ امتیاز عقل و تمیز تک پر پانی پھیر دیتی ہے۔ شراب۔ تمباکو وغیرہ کی بُرائیوں کو کون نہیں جانتا؛ لیکن بعض اوقات بڑے بڑے عقلمند اور باتمیز لوگ اِن بدعتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی انھیں سمجھاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"۔ یا "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"۔ یہ دوسرا قول کم و بیش ہر عادت پر صادق آتا ہے۔ عادت کی وجہ سے یہی چیزیں اُس کے فوری سُکھ کا ذریعہ بن گئی ہیں گو وہ سمجھتا ہے کہ بالآخر اس کا نتیجہ خراب ہے۔

لہذا مذہب جہاں انسان کی عقل کو سنوارتا ہے وہاں اُس کا بہت زیادہ زور عادتوں کو بنانے سنوارنے پر بھی ہوتا ہے اور اس کوشش میں اُس کی خاص توجہ چند بنیادی اصولوں پر ہوتی ہے جن کے بغیر انسانی زندگی آرام اور چین سے نہیں گذر سکتی۔ مثلاً سچائی جس کے بغیر آرام و سہولت کا کوئی باہمی بیوہار ممکن نہیں۔ اس کے خلاف جھوٹ بیوہار کو بند کرنے والا اور اس طرح انسانی ترقی اور آرام کے راستہ میں حائل ہوتا ہے۔ ایسا ہی اہم وہ اُصول ہے جو اس امر پر زور دیتا ہے کہ دوسروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے یا کم از کم اُن چیزوں یا اُن حرکتوں سے گریز ہو جن سے دوسروں کو تکلیف پہونچتی ہو۔ مذاہب کے بقیہ جتنے احکام ہیں انھیں دو اصولوں

[۵۱] Instincts.

کی تفصیل اور تفسیر تصور کئے جا سکتے ہیں۔

اب اس عالم وجود میں انواع و اقسام کی ان گنت کشش کی ایسی ایسی چیزیں موجود ہیں، کہ قدرتاً انسان کی توجہ کسی ایک مرکز پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ اور ان بے انتہا کششوں کے زیر اثر وہ ان باتوں کو بھی بھول جاتا ہے جو مذہب نے بنیادی طور پر اُس کو بتائی تھیں۔ لہذا انسان بہ حیثیت مجموعی اپنی خیر و عافیت اور فلاح و بہبود کے مدنظر اس امر کی اشد ضرورت کو محسوس کرتا ہے کہ ہر فرد بشر کی توجہ مذہب کے اِن اہم اُصولوں کی جانب مبذول ہوتی رہے۔ اس انتظام کا نام تبلیغ اور پرچار ہے۔ کہ بغیر اس کے آدمی اُن ضروری اور اہم باتوں کو بھول جاتا ہے۔ جن پر عامتہ خلایق کی (بشمولِ خود) بہتری اور بہبودی موقوف ہے۔

اِن اصولوں کی تلقین دنیا میں ہر جگہ ہوتی رہتی ہے، البتہ مقام اور ماحول کے زیر اثر اُس کی ظاہری صورت قدرتاً مختلف ہوتی ہے۔ مذاہب کی بیرونی صورت و شکل کی تشکیل میں تفصیلات اور فروعات شامل ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ مقام اور ماحول سے متعلق ہوتے ہیں۔

یہ مختلف مذاہب اپنے اپنے دَور میں اُس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ وہ انسان کے سُکھ اور آرام کا باعث ہوتے ہیں۔ سُکھ اور آرام کا تعلق نہ صرف انسان کی جسمانی ضروریات سے ہے بلکہ اُس کے دماغ اور روح سے بھی ہے۔ درحقیقت خالص جسمانی آرام اور راحت کوئی چیز ہی نہیں۔ جس کا دماغ اور روح سے تعلق نہ ہو۔ بہرحال مذہب اُس وقت تک مقبول اور منظور یعنی زندہ رہتا ہے جب تک کہ وہ انسان کے جسمانی سکھ اور دماغی اور روحانی ترقی و نشو و نما اور تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور جب وہ اس کے برخلاف انسان کی تکلیف اضمحلال اور پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ تو وہ مذہب قالب ناکارہ کی طرح رفتہ رفتہ فنا ہو جاتا ہے۔ اِس خرابی کے پیدا ہونے کا خاص سبب اُس کے اِن اہم بنیادی اُصولوں کے پرچار کی کمی ہوتا ہے۔ یا ایسے باتوں کا پرچار ہوتا ہے جو مذہب کے نام پر اِن اصولوں کے خلاف ہوں۔

یہاں پر مجھکو مذاہب کی ماہیت اور اُن کے فلسفہ وغیرہ پر کوئی گہری نظر ڈالنا اور اُن سے تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں۔ اِس لئے میں نے نہ توحید سے بحث کی اور نہ شرک سے۔ نہ الحاد سے اور نہ دہریت سے۔ مَیں نے مذہب کے متعلق صرف ایک عام خیال جو ہر ایک کے دل میں دانستہ یا دانستہ موجود ہے پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں توحید کی انتہائی باریکیوں کی گتھیوں کو سُلجھانے والا فلسفہ بھی اُس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس سے انسان کے آرام و آسایش کی صورتیں

نہ بنتی ہوں جس کے ضامن صرف وہ دو اصول ہیں جن کا میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔

اِن ابتدائی اور تفہیمی کلمات کے بعد میں اصل مضمون پر آتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ بہت سیدھی سادی باتیں ہیں جن کو سبھی سمجھتے ہیں اور جن سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔

اِس وقت ہمارے پیش نظر دو مذاہب یا دو مذاہب کے نام لیوا ہیں۔ جو رات دن اپنے اپنے مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش بلکہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یعنی **ہندو اور مسلمان** میں پہلے اسلام کے متعلق کچھ عرض کرونگا۔

حضرت محمدؐ کے ظہور سے پیشتر سرزمین عرب کی جو تباہ اور برباد حالت تھی۔ وہاں کی جہالت خانہ جنگی۔ خونریزی اور سیکڑوں رسوم قبیحہ اور تاریک طریقے جن سے زندگی محض عذاب ہی عذاب تھی اور سکھ چین مفقود تھا۔ ترقی کی راہیں مسدود اور روحانی نشو و نما ناممکن ہوگیا تھا۔ ان سب کی تفصیل عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔ آں حضرتؐ نے ان مبتلائے مصائب کو زندگی کا ایک نیا تخیّل دیا۔ ایک نہایت عالیشان اور خوبصورت تصور جس نے انھیں تنگی اور پستی سے اُبھارا۔ نظر کو پھیلاؤ اور دل کو وسعت دی۔ نفاق و انتشار کو اتحاد اور تنظیم میں بدل دیا ان سب کی جڑ یعنی خیالات کی تنگی کی اصلاح توحید کے آبِ حیات سے کی جس سے آناً فاناً عرب کی بنجر زمین گلزار بن گئی۔ جہاں جہنم کے جھونکے چلتے تھے وہ اب رشک رضوان ہوگیا۔ ترقی کی شاہراہیں کُھل گئیں۔ قوتیں جو آپس میں متصادم ہورہی تھیں متحد ہوگئیں اور متحد بھی انفرادی نشو و نما کے ساتھ۔ قدرتاً سرزمین عرب اس متحدہ زبردست قوت کے لئے تنگ ہوگئی اور اس کا عرب سے باہر نکلنا لازمی تھا۔

چنانچہ باہر یہ قوت اُسی اصلاحی پیغام کے ساتھ نکلی۔ لیکن جن طریقوں سے عربستان میں اصلاحیں ممکن ہوئیں۔ عربستان سے باہر وہ صورت ہر جگہ ممکن نہ تھی۔ اسلام کی عربستان میں جدوجہد کے ابتدائی مرحلوں بلکہ تقریباً آخری مرحلوں تک اسلام کے معنی عموماً حق و انصاف اور ایک بہتر اور برتر راستہ کے لئے ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہوجانے کے تھے۔ جب تمام جاہلانہ رسوم رفع ہو گئے اور زندگی کے وہ طور و طریقے رائج ہوئے جو عربستان میں ایک بہتر تہذیب اور امن و امان کے حامل ثابت ہوئے۔ تو قوت کا پیدا ہونا اور خود عربوں میں اس کا احساس پیدا ہوجانا لازمی تھا۔ لہٰذا عربستان سے باہر اسلام کا پیغام لے جانیوالوں میں باستثنائے چند اِس قوت کا نشہ قدرتی تھا۔ غرض باہر کے کام میں یہ ایک جدید عنصر تھا اس کے علاوہ ایک اور ناموافق عنصر تھا جو عربستان کی اندرونی جدوجہد میں شامل نہ تھا۔ وہ یہ کہ

عربستان میں بہ حیثیت نسل یا قوم زیادہ تر ایک ہی لوگ آباد تھے۔ لہٰذا وہاں اسلامی سرگرمیوں کے دوران میں قومی امتیازات موجود نہ تھے۔ لیکن باہر قومی اختلافات کا عنصر بھی شامل ہوگیا جس کی وجہ سے عرب کے باہر کی سرگرمیوں میں مسلمانوں کی اسپرٹ وہ نہ رہ سکی جو عرب کے اندر تھی۔ یعنی ان میں عموماً وہ انکسار ممکن نہ تھا جو مصلحوں کے لئے لازمی ہے۔ دوسری طرف غیر ممالک میں منجملہ اور چیزوں کے غیر قومیت کا خیال خود اس پیغام کے قبول کرنے میں حائل ہوا جس کا قدرتی نتیجہ جنگ و جدل تھا۔ جو ظاہر ہے کہ اپنی اسپرٹ میں اُس جنگ و جدل سے مختلف تھا جو سرزمین عرب میں تبلیغ اسلام کے دوران میں وقوع پذیر ہوئے۔ عرب میں مسلمانوں کو لڑائیاں زیادہ تر اپنی حفاظت میں لڑنی پڑیں۔ باہر صورت اس کے برعکس تھی۔

اس کے باوجود باہر بھی اسلام یعنی اس نئے اصلاحی طریقہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن موثر کامیابی صرف اُن لوگوں میں حاصل ہوئی جن میں ~~کوئی مذہبی سلسلہ عملاً باقی نہ تھا جیسے ترک۔ یا جہاں مذہب اصلی~~ معنی میں قریب قریب فنا ہو چکا تھا ~~جیسے مصر وغیرہ میں یا جہاں مذہب نہایت درجہ بوسیدہ اور پژمردگی~~ کی حالت میں تھا جیسے ایران وغیرہ میں۔ لیکن جہاں مذہبی سلسلے ابھی کافی زندہ تھے وہاں کامیابی اُس درجہ آسان اور موثر ثابت نہ ہوئی جیسے یورپ۔ ہندوستان اور چین وغیرہ میں۔ یورپ میں تو گو ابتدائی زمانہ میں اسلامی فتوحات نہایت تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے حتیٰ کہ تقریباً نصف یورپ اسلامی قلمرو میں شامل ہوگیا۔ تاہم تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا ردِّ عمل شروع ہوا اور خوابیدہ عیسائیت ان اسلامی فتوحات کے خلاف جاگی۔ اور اس کے لئے نہایت موثر آواز وہ ثابت ہوئی جو فلسطین سے اُٹھی تھی کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی زاد بوم پر اور اُس جگہ جہاں خدا کے بیٹے کے آخری آثار محفوظ ہیں دشمنوں کا قبضہ ہے۔ چنانچہ کل عیسائی یورپ جنگ صلیبی پر آمادہ ہوگیا۔ اور گو ایک عرصہ دراز کے آپس کے بغض و عناد اور جنگ و جدل کے باعث ان صلیبی جنگوں میں عیسائی قوتوں کو اسلام کے مقابلہ میں کوئی فوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی تاہم ان صلیبی جنگوں نے بیداری کی بہت گہری بنیاد ڈال دی۔ اور اصلاح و اتحاد و ترقی کے ایسے مستحکم سلسلے قائم ہوگئے کہ آخر کار عیسائی ممالک میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ ان عیسائی ممالک کی جو ملکی ترقیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں کے مسلمان پھر عیسائی بنے۔ اور ٹرکی کی مسلم حکومت کا دائرہ گھٹتا گھٹتا وہ رہ گیا جو اب ہے۔

مجھے یہاں تواریخ کی تفصیلی ورق گردانی مقصود نہیں بلکہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ یورپ میں جو صورت پیدا ہوئی اُس کے کیا اسباب تھے۔ میں دو لفظوں میں یہ عرض کروں گا کہ عیسائیوں نے اُن قبیح رسم و رواج کو چھوڑا جو انسان کے لئے آزار کا باعث بن رہے تھے۔ اور صدق دلی و خلوص سے

حضرت مسیح کے اُس پیغام کی جانب توجہ کی اور اُس پر جوش اور سرگرمی سے پابندی شروع کردی جو خدمت خلق پر زور دیتا اور سچائی و انکسار اور بہتر عادات واطوار کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس طرح یورپ کے عیسائی انسان کے سُکھ اور آرام کا ذریعہ بننے لگے۔ اس کے برعکس جو مسلمان عرب سے باہر نکلے تو نکلتے نکلتے قوت کا نشہ اُن کے سر پر سوار ہو چلا تھا۔ بعد کی فتوحات نے اُس کو اور بھی گہرا رنگ دیا۔ ان فتوحات نے عیش و عشرت کے سامان بھی فراہم کئے اس کے علاوہ دنیا کے سب مذاہب میں اپنے دین کی برتری اور دنیا کے سب پیغمبروں پر اپنے پیغمبر کی فضیلت پر ایمان جو عربستان کے اندر اصلاحوں میں کامیابی کے لئے حیرت انگیز ذریعہ ثابت ہوا تھا اب باہر دوسری قوموں کے مقابلہ میں تکبر و غرور کے پیدا کرنے کا سبب ہوا۔ اس میں شک نہیں اس تکبر و غرور کو تحلیل کرنے اور اس کا سدِ باب کرنے کے لئے خدائے وحدہٗ لاشریک پر وہ جیتا جاگتا اور لاثانی ایمان تھا جس کی نظیر دنیا کی تواریخ میں بہت کم ملتی ہے اور جس کی بدولت ہر فتح اور برتری کو اُس سے منسوب کیا جاتا تھا اور ہر کامیابی اور سُرخروئی پر اُس کی جناب میں سجدہ کیا جاتا اور ایک طرح اپنی قوت اور اپنی قوت سے حاصل کی ہوئی ہر عظمت اور برتری کو ہندو اصطلاح میں اُس کے اَرپن کیا جاتا تھا۔ مگر فتوحات اور عظمتیں پے درپے خفیف عرصہ میں اس کثرت سے نصیب ہوئیں کہ انسان کے چھوٹے دل کیلئے بالآخر یہ بہت زیادہ ثابت ہوئیں، اور ایمان اور نفس کی لگاتار دیوا ئسر سنگرام میں انسان کا چھوٹا دل زیادہ عرصہ تک اس کا متحمل نہ ہوسکا، اور اُس بلندی اور عظمت کو قائم نہ رکھ سکا جس نے حضرت علی کو ایک غدار اور مکار پر غلبہ پانے کے بعد عین سزا (قتل) کے وقت اپنے غلبہ ہی سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا تھا۔ اس بنا پر کہ اُس کے تھوک دینے نے اب اُس لاثانی بزرگ ہستی کے معاملۂ سبیل اللہ میں اُن کے نفس کو شریک کر دیا تھا۔

غرضیکہ یہ اونچے جذبات اور خیالات دنیاوی فتح اور جاہ و حشمت کے زبردست بہاؤ میں رفتہ رفتہ بہ گئے، اور عرب سے باہر مسلمانوں کے وہ طریقے ہونے لگے جو لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ثابت ہوئے ادھر عیسائیوں نے جن کی حالت اسلامی حملوں سے پیشتر نہایت درجہ گندہ اور نامعقول ہوگئی تھی، اب اپنی اصلاح اور اپنے مذہب کے بنیادی اُصولوں کی پابندی سے اپنے آپ کو انسان کے لئے نسبتاً زیادہ سُکھ اور آرام کا ذریعہ بنانا شروع کیا۔ آدمی تو متلاشیِ سُکھ کا ہے لہٰذا قدرتی تھا کہ عیسائیت کو پھر فروغ ہوا اور عیسائی قوتوں کو ترقی نصیب ہوتی۔ ترقی بھی وہ ترقی کہ معلوم تواریخ میں شاید ہی کسی اور مذہب کے پیرووں کو ایسی ترقی نصیب ہوئی ہو۔

مَیں تہ دل سے چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ اہالیِ اسلام کے لوپ سے اب سابقہ واقعات کو

گہری نظر سے دیکھیں اور خدائے برتر و بالا پر اپنے لاثانی اعتقاد و ایمان کو اس حقیقت کے سمجھنے میں ممد و معاون بنائیں کہ قوموں کی بلندی و پستی میں اُس کے خالص انصاف کا ہاتھ کام کرتا ہے۔ اور اِن مفروضوں سے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش نہ کریں کہ اغیار نے اُن پر جو غلبہ پایا اُس کی تہ میں جھوٹ مکر و فریب اور بے ایمانی کی باتیں تھیں اور خوبیاں اس کا سبب نہ تھیں۔

یورپ کے اِس واقعہ کو میں نے یہاں محض تفہیمی طور پر لیا ہے تاکہ آئندہ کے معروضات زیادہ واضح ہو سکیں۔ مجھ کو بحث صرف ہندوستان سے ہے۔

ہندوستان اپنی جگہ ایک برّ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے جس کو قدرت نے اپنے زبردست ہاتھوں سے دنیا کے دوسرے حصّوں سے علیحدہ بھی کر رکھا ہے اور مستغنی بھی۔ علیحدگی کے لئے تین طرف بحر ذخّار اور چوتھی جانب دنیا کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ کیا کچھ کم ہے۔ استغنا کے لئے دنیا کی کونسی چیز ہے جو یہاں ناپید ہو اسی لئے اس ملک کو دنیا کا خلاصہ کہا گیا ہے۔ سرد ترین مقامات جہاں برف باری تک ہوتی ہے، اور گرم ترین جہاں دوزخی آگ برستی ہے، یہ اور ان کے درمیانی ہر قسم کے موقعے یہاں موجود ہیں۔ انتہائی بارش کے مقام اور بنجر ریگستانی بحر ذخّار سے وسیع خطّے، وہ کہ جہاں پانی دیکھنے تک کو نصیب نہیں ہوتا۔ کشمیر سا فردوس بر روئے زمیں، کٹھن سے کٹھن پہاڑی علاقے، آب حیات سا پانی بہانے والی ندیاں، بہترین آبشار، ہر نوع کے پھل پھول اور درخت۔ ہر قسم کے جانور، درند، چرند و پرند اور ہر قسم کے جمادات، غرض فضائی مناظر دنیا میں کوئی ایسے نہیں جو یہاں نہ ملتے ہوں۔ اور جانداروں میں کوئی نوع ایسی نہیں جو یہاں ناپید ہو۔ قدرتی خصوصیات کی طرح انسانی دماغ بھی ہر ندرت کے یہاں ہوئے اور ہیں، جنھوں نے انسانی زندگی کے مسئلہ کو ہر ممکن نقطۂ نظر سے دیکھا اور ہر پہلو سے اُس کے حل کی کوشش کی۔ یہاں ابتدائے آفرینش میں کلام الٰہی کا ویدوں کی صورت میں ظہور پر اعتقاد رکھنے والے ہیں تو دوسری طرف جینی وغیرہ بھی ہیں جو سرے سے ویدوں کو مانتے ہی نہیں اور نہ خدا کے قائل ہیں۔ خود ویدوں پر اعتقاد رکھنے والوں نے مختلف فلسفے پیدا کئے جو مختلف راستوں سے اُس ایک منزل مقصود تک پہونچانے والے ہیں۔ مہاتما بدھ بھی یہاں ہوئے جنھوں نے نہ ویدوں سے تعلق رکھا اور نہ جین فلسفہ سے، نہ خدا کے ہست و نیست سے بحث کی۔ محض اصول زندگی سمجھایا کہ اُس کی پیروی ہو۔ وہ لوگ بھی ہوئے جو وام مارگ کہلاتے ہیں یعنی اُلٹے راستے والے۔ چارواک بھی ہوئے جو نرے دہریہ تھے اور "کھاؤ پیو اور خوش رہو" کی تلقین کرتے تھے۔ ویشنو جو گوشت خوری سے پرہیز کرتے ہیں، اور شاکت جن کے یہاں حیوانوں کی قربانی مذہبی رسوم کا ایک خاص جزو ہے۔

پُوجا میں کائنات کی کوئی چیز نہ چھوٹی، تو دوسری طرف وحدت الوجود پر اس گہرائی اور تجسس سے غور کیا گیا کہ انسانی دماغ غالباً اُن باریکیوں اور بلندیوں سے کبھی سبقت نہ لے جا سکا۔ غرض ان بعد المشرقین کا فرق رکھنے والے خیالات اور اعتقادات کے پیرو تمام ایک ہی قومیت کے نام یعنی آریہ نام سے پکارے جاتے تھے جو بعد میں ہندو نام میں مبدل ہوگیا۔ یہ یگانگت صرف نام ہی کی نہ تھی بلکہ آپس میں یگانگت کے راہ و رسم بھی تھے۔ پابندی انسان کے خیالات اور اعتقادات پر نہ تھی جن کی ترقی اور نشو و نما کا نہایت معقول طریقہ پر انتظام و اہتمام کیا گیا۔ پابندی تھی صرف طریق زندگی پر کہ انسان بہرحال اس طرح رہے کہ دوسرے کی تکلیف اور آزار کا باعث نہ بنے اور نہ کسی کی ترقی کے راستے میں حایل ہو۔ یہ طریقہ کیا تھا اُس کی وضاحت ایک مستقل مضمون چاہتی ہے جسے کسی اور موقع کے لئے چھوڑتا ہوں۔ یہاں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ سماج کا وہ طبقہ جو سماج پر اثرانداز ہوتا اور اُس کو قابو میں رکھتا ہے (اس کا موروثیت سے پہلے کوئی تعلق نہ تھا جیسا ہر زندہ متمدن اور مہذب مُلک کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے) روشن خیال تھا۔ جو عوام کی ہر قسم کی ترقی اور نشو و نما میں آج کل کی طرح حارج نہیں بلکہ مُمد و معاون ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ صحیح نقطۂ نظر کی تفہیم و توضیح کا ایک ایسا بہتر اور ~~مربوط~~ سلسلہ قائم کیا گیا تھا کہ اعتقادات اور خیالات کی وجہ سے عوام میں آپس میں غلط فہمی اور بدمزگی کے پیدا ہونے کا بہت کم امکان تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا اس انتظام کی وضاحت ایک مستقل مضمون چاہتی ہے مگر میں یہاں اشارۃً یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ اُس عجیب و غریب انتظام کے سلسلہ کو آشرم دھرم کہتے ہیں جس کا اس وقت صرف نام ہی نام باقی ہے حقیقی آثار بالکل زائل ہو چکے ہیں۔ خیر آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان گنت اعتقادات کے لوگ ایک ہی نام "ہندو" سے پکارے جاتے ہیں، گو اعتقادات میں اختلاف کی وجہ سے لازمی طور پر طرز زندگی میں بھی کچھ نہ کچھ اختلافات ضرور ہیں۔ اور تعلیم و تربیت کے صحیح سلسلوں کے قائم نہ رہنے سے آپس کی وہ خوش سلوکیاں اور رواداریاں باقی نہیں ہیں۔ پھر بھی ان سب کے طرز زندگی میں ایک قسم کی عجیب یکسانیت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ جس کی ٹھیک ٹھیک صراحت مشکل ہے۔ لیکن جو خود بخود محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا مطمح نظر ان اختلافات کے باوجود ایک ہے۔ اور اُن کا میلانِ خیال ایک خاص رَو رکھتا ہے۔

مادّی اسباب کی اس گونا گونی اور فراوانی نے دماغی ندرت وحدت کی اس ہمہ گیری اور روحانی پرواز کی ان بلندیوں نے ایک عرصہ دراز تک دلوں میں ایسی وسعتیں، ایسے حوصلے اور ایسی اُمنگیں پیدا کیں کہ اُنھوں نے کائنات کو اپنا کُٹمب (قبیلہ) سمجھا، اور جن جن مادّی اور روحانی

نعمتوں سے خود فیضیاب تھے اُن سے دنیا بھر کو فیضیاب کرنے کی فکر و کوشش میں سرگرم و سرگرداں رہتے۔
آج بھی دنیا کے مختلف حصّوں میں ہزاروں سال پہلے کے جو آثار برآمد ہو رہے ہیں اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی زمانہ میں اُسی تہذیب و تمدّن کے فیض و برکت سے مستفید تھے جس سے ہندوستان متمتع تھا۔ یونان اور روم کے ذہنی تخیّل، اعتقادات کی رَو، اور عباداتی طریقوں کی یہاں سے مشابہت، اُن ملکوں میں مُردوں کو جلانے کا رواج اور دوسرے طریقے ثابت کرتے ہیں کہ یہاں کے لوگ قدرت کی اُن زبردست بندشوں کے باوجود وہاں ضرور پہونچے تھے۔ اِس ضمن میں یہ سوال ضرور اُٹھایا گیا ہے کہ یونان اور روم ہندوستان کی تہذیب و تمدّن سے مستفیض ہوئے تھے یا ہندوستان نے اُن ملکوں کی تہذیب و تمدن سے فیض اُٹھایا تھا۔ مگر یہ سوال میرے مضمون سے غیر متعلق ہے۔ اس لئے کہ مجھکو سردست اِس سے بحث نہیں کہ کس نے کس سے فیض اُٹھایا۔ میرا مقصد صرف یہ دکھلانا ہے کہ یہاں کے لوگ ہندوستان کی چار دیواری میں محبوس نہیں رہے بلکہ دنیا کی وسعتوں کو ناپتے رہے یعنی وسعت کے آبحیات اور حرکت کی برکت سے اپنی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندہ، ہر پہلو سے خوبصورت اور ہر طریقہ سے فیض و برکت کا باعث بنا رکھا تھا۔ اور ان میں وسعت کی پاکیزگی تھی، تنگی کی غلاظت نہیں۔
لیکن رفتہ رفتہ طبیعتوں میں تعلّی پیدا ہوئی کہ ہمارا ملک نہ صرف دنیا کا ایک مکمل نمونہ ہے بلکہ بقیہ دنیا سے ہر طرح بہتر و برتر ہے۔ دنیا میں کہاں ہمالیہ جیسے سربفلک پہاڑ، کہاں گنگا جمنا جیسی آب حیات بہانے والی ندیاں، یہاں کا سا علم و فضل کہاں تہذیب کہاں تمدن کہاں؟ کہ ہم باہر پریشان و سرگردان مارے مارے پھریں۔ پھر غرور نے جو تنگ نظری اور تنگ دلی کا لازمی نتیجہ ہے سروں میں یہ سودا بھرنا شروع کر دیا کہ دوسرے ملکوں کے باشندے وحشی اور ذلیل ہیں، ان سے میل جول عذاب اور اپنے آپ کو اُن کی برائیوں اور ناپاکیوں سے آلودہ کرنا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کی تگ و دَو بند ہوئی، باہر جانا پہلے تو وہ غیر ضروری سمجھنے لگے، رفتہ رفتہ اس کو گناہ سمجھ بیٹھے اور ممنوع قرار دے دیا۔ ممنوع کیا قرار دیا اپنی قسمت ہی پر تالا لگا لیا، اپنے نشو و نما و عروج کے خاتمہ اور اپنے زوال اور پستی کا پروانہ لکھا۔ ان نا سعید جذبات اور خیالات کے زیر اثر وہ اس زبردست حقیقت کو بھی بھول گئے کہ پاکیزگی وسعت اور حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور تنگی اور ٹھہراؤ غلاظت اور موت کا عین سبب ہوتا ہے
اب رخ جو تنگی کی جانب ہوا تو ملاحظہ ہو کہ ہم گندگی کی کن انتہاؤں کو پہونچ گئے۔ پہلے تو بھارت کھنڈ سے باہر جانے کی مناعت ہوئی، پھر اُس سکڑن نے رفتہ رفتہ اپنے اپنے صوبوں، ضلعوں، شہروں اور گاؤں تک محدود کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کئی بولیوں میں بٹ گئی، دور بیں بزرگوں نے اس یقینی موت

کے راستہ کو بند کرنے کے لئے تیرتھ یاترا کے طریقے رائج کئے، چار دھام (جگن ناتھ۔ دوارکا ناتھ۔ رام ناتھ اور بدری ناتھ) کا تیرتھ مہاپن قرار دیا۔ یہ کس قدر معنی خیز ہے کہ یہ چار دھام پورب۔ پچھم۔ اتر۔ دکھن میں واقع ہیں۔ اور اس تیرتھ یاترا کو پاون (یعنی پاک کرنے والا) قرار دیا ہے خیر پہلے غیر ملکوں کے لوگ ملیچھ تھے، رفتہ رفتہ آپس ہی میں اونچ نیچ کا خیال پیدا ہوگیا اور اَن گنت ذات برادریاں بن گئیں جن کا زندگی کے تقریباً تمام اہم مراسم میں آپس کا بیوہار بند ہوگیا۔ اب ایک دوسرے کے ساتھ نہ کھاتے ہیں اور نہ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ نیکی بیوہار بڑھانے میں نہ رہی بلکہ اس میں آگئی کہ کون کس قدر سب سے پرہیز کرتا ہے، جو کھان پان میں الگ تھلگ، اُٹھنے بیٹھنے میں الگ تھلگ، چلنے پھرنے میں الگ تھلگ اور انتہا یہ کہ اپنی بیوی اور بچوں سے بھی کھانے پینے وغیرہ میں جو پرہیز کرے وہ نہایت مذہبی اور نیک آدمی سمجھا جانے لگا۔

یہ ایک ظاہر حقیقت ہے کہ تہذیب کا تعلق آپس کے ربط وضبط اور خلا ملا سے ہے۔ اس کے امکانات جس قدر بڑھیں گے اُسی قدر تہذیب میں اضافہ ہوگا۔ اسی لئے سنسکرت میں تہذیب کو سبھیتا کہتے ہیں۔ جس کا سبھا یعنی مجلس یا سوسائٹی یا دوسرے الفاظ میں میل جول سے تعلق ہے۔ جن لوگوں میں آپس کا میل جول کم ہوتا جائے اور بیوہار میں علحدگی بڑھتی جائے اُن کی سبھیتا یعنی تہذیب قدرتاً گھٹے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو عام طور پر اُن لوگوں کے مقابلے میں جن میں میل جول اور ربط و ضبط کی صورتیں اچھی قائم ہیں تہذیب کے لحاظ سے آج پست نظر آتے ہیں

اس میلان اور رجحان کا یہ نتیجہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دلوں کی وسعت جاتی رہی اور تنگ دلی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ نفسی نفسی کی نوبت آگئی اور ہر ایک کو اپنے اپنے سوائے کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ہمدردی کچھ رہ گئی تو اپنی اپنی ٹولی یا برادری کے تنگ دایرے کی حد تک۔ ورنہ پرائی آگ میں کودنے والا بیوقوف سمجھا جانے لگا۔ غور و فکر جس کا میدانِ عمل لامحدود ہے اب صرف اپنے سُکھ، اپنے آرام، اپنے نفع، اور اپنے لطف کی گندہ چار دیواری میں سڑنے لگی۔ دھرم راجیہ اور رام راجیہ کی جگہ راجیہ اور سامراجیہ نے لے لی۔ رفتہ رفتہ یہ راجیہ رجواڑوں میں بٹ گئے، جن کے والیوں کا مطمح نظر زیادہ تر ذاتی عیش و آرام اور شان و شوکت ہوتا تھا۔ قانون انسانیت کا محافظ نہیں، صرف قوت و اقتدار والوں کی قوت و اقتدار کو بنائے رکھنے کی ترکیب تھی۔ دھرم کرم کے بھی ٹھیکے ہو گئے، اس طرح کہ خواہ بیٹے نے باپ کی لیاقت و اہلیت پیدا کی ہو یا نہ کی ہو اُس کے منصب پر سرفرازی اُس کا حق سمجھا جانے لگا۔ اِس مورو ثیت کی بدعت کا یہ اثر ہوا کہ پجاریوں تک کے دل میں رفتہ رفتہ پوجا کا سچا بھاؤ قایم نہ رہا اور یہ کام بھی محض اُن کے دنیوی سُکھ چین اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ دھرم و کرم کے اصلی معنی مٹ گئے

دوسروں کے سکھ اور بھلائی میں اپنی بھلائی کی سمجھ جاتی رہی، اس کی جگہ اپنی یا اپنی ٹولی کی فرضی بھلائی کی خاطر بے دریغ ایک دوسرے کے دُکھ اور آزار کا باعث بننے لگے۔ اِس مُہلک رَو نے زندگی کی ہر روش ہر شعبہ اور ہر ادارہ میں کیا کیا اُدھم مچائے اور ظلم ڈھائے اُس کی تفصیل ضخیم جلدیں چاہتی ہے حاصل کلام یہ کہ یہاں انسانیت سخت پریشان تھی لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ اِس لئے کہ تنگ نظری اور تنگ دلی کے یہ گناہ مذہب کے نام پر جائز قرار پا گئے تھے، یہاں انسان کی مصیبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

ہم اِس پستی اور زوال کی حالت میں تھے جب کہ ہندوستان پر اسلام کا حملہ ہوا۔ پیروانِ اسلام زندگی کا ایک نیا تخیل ــــــ نہایت شاندار اور خوبصورت ــــــ نظروں میں وسعت اور دلوں میں اُمنگ لئے ہوئے پیروانِ اسلام ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔ تواریخی حقیقتیں اپنے ثبوت کے لئے مستند واقعات کی تفصیل چاہتی ہیں جس کے بغیر لوگ ان حقیقتوں کو تسلیم کرنے پر لوگ آمادہ نہیں ہو سکتے مگر اِس مضمون میں ایسی تفصیل کا امکان نہیں، اِس لئے میں یہاں صرف اُس اعتقاد سے اپیل کر سکتا ہوں جو خدا کو منصفِ حقیقی مانتا ہے۔ اگر خدا منصف ہے تو اسلام کے ہاتھ میں ہندوستان کی عنانِ حکومت کا آ جانا کچھ معنی رکھتا ہے۔ مَیں نے اپنے لڑکپن میں کسی پُرانے اُردو رسالہ میں ایک قصّہ پڑھا تھا جس کو میں یہاں دُہرانا چاہتا ہوں، اس لئے کہ اُس سے میرے خیال اور مطمعِ نظر کی وضاحت ہوگی۔ مَیں اس قصّہ کو تفصیل میں نہ سہی مگر اصلاً میں صحیح سمجھتا ہوں۔ قصّہ جیسا کچھ میرے ذہن نشین رہ گیا ہے یہ ہے:-

بابر کی فتوحات مکمل ہو چکی تھیں اور اب وہ مصروفِ سلطنت آرائی تھا۔ اُس کی حکومت کے اس ابتدائی دَور کی بات ہے کہ ایک پُراسرار نوجوان اُس کے محل کے چاروں طرف شب و روز گشت لگایا کرتا تھا۔ چست و تنومند، آنکھوں میں ارادہ، چہرہ پر رعب، شکیل و جمیل، اس نوجوان کی شکل و شباہت کسی اونچے خاندان کا پتہ دیتی تھی، اور بات تھی بھی یہی۔ یہ ایک راجکمار تھا، جس کے والد معہ اپنے راج کے بابر کے فتوحات کے شکار ہوئے تھے۔ اب اُن کی ریاست پر بابر کا تسلّط تھا۔ راجکمار کے پاس اب نہ دولت تھی نہ حکومت۔ سینہ میں انتقام کی دہکتی آگ کو بجھانے کے لئے تنہا تن بہ تقدیر نکل کھڑا ہوا تھا، اور اب محل کے اطراف شب و روز اس گھات میں گشت لگا رہا تھا کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور اپنے والد کے خون کا بدلہ چکائے۔

in essence

ایک روز صبح کا وقت تھا، لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے، راستے رواں ہو چکے تھے محل کے سامنے کی سڑک پر صفائی ہو رہی تھی۔ ایک بھنگن اپنے دودھ پیتے بچے کو سینہ سے لگائے سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک کچھ شور وغل سا اُٹھا اور سڑک پر بھگدڑ مچ گئی۔ ایک مست ہاتھی چھوٹ گیا تھا اور لوگ اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ راجپوت نوجوان یہ تماشہ استقلال و سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھی قریب آن پہونچا۔ بیچاری بھنگن گھبرا کر بھاگی تو بچہ گود سے گر پڑا۔ اُس کے مُنہ سے ماں کی ایک درد بھری چیخ نکل گئی "ہائے میرا بچہ، میں لٹ گئی۔ کوئی میرے بچہ کو بچا لے"۔ مگر اِس آواز کو سنتا کون، ہر ایک کو اپنی اپنی جان کی پڑی تھی۔ مگر دو نے سُنی، ایک یہ نوجوان راجکمار تھا جس کے چہرہ پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے اور جس کے قریب یہ بچہ گرا تھا، دوسرا کوئی شخص محل کے اندر تھا۔ راجکمار ایک قدم بڑھا، بھنگن کو آس بندھی کہ میرا لخت جگر بچ جائیگا لیکن یکایک راجکمار پس و پیش میں پڑ گیا۔ کہ بھنگن کے بچے کو کیسے چھوؤں؟ ہاتھی اب بالکل قریب تھا اُس کے اور بچے کے درمیان مشکل سے تین چار قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بچہ کی یقینی موت سامنے تھی۔ دفعتاً محل کے بالائی حصہ سے کوئی شہ زور جوان ہاتھ میں ایک زبردست گُرز لئے ہوئے ایسے اچوک نشانہ سے کودا کہ جسم کے پورے وزن کے ساتھ گُرز اُس ہاتھی کی پیشانی پر پڑا۔ اور وہ چنگھاڑتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور اُس بہادر نے فوراً بھنگن کے بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور محل میں چل دیا۔

راجپوت نوجوان کی، حیرت اور پشیمانی کی کوئی انتہا نہ تھی، وہ بچے کے قریب کھڑا تھا اور اُس کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی کہ بچے کو بچا لیتا لیکن مجاور اس بہادر نے ایک ادنی بھنگن کے بچے کو بچانے کے لئے صاف اپنی جان کو جوکھم میں ڈال دیا۔ ذرہ سی چُوک سے اُس کی جان کے لالے پڑ گئے ہوتے۔ راجپوت کی آتما میں ایک تلاطم سا برپا ہو گیا۔ اُس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ بڑے دل والا بہادر کون تھا؟ اور جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ خود شہنشاہ بابر تھا تو اُس کا دلی تلاطم انتہا کو پہونچ گیا ——— وہ بابر کے حضور میں پیش ہوا اور اُس نے وہ خنجر جو بابر کے خون کے لئے چھپا رکھا تھا اُس کے سامنے رکھ دیا کہ اُس سے اب خود اُس کا کام تمام کیا جائے۔ بابر نے حیرانی سے دریافت کیا کہ عزیز! ہم تمھارا مطلب نہیں سمجھے۔ تو اس نیک نہاد راجپوت نے کہا کہ میرا خاندان آپ کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا، اس لئے میں جوشِ انتقام میں یہاں آیا تھا کہ اُس مبارک ہستی کو ختم کر دوں جس کو بھنگی کا بچہ بھی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالے بغیر آسانی سے اس خدمت کو انجام دے سکتا تھا لیکن مجھ سے یہ کام نہ ہو سکا۔ اور اب میں اپنے کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا

کہ زندہ رہوں، لہٰذا اُسی خنجر سے مجھ گنہگار کو ختم فرمائیے جس کے ذریعہ میں دنیا کو اس بیش بہا ہستی کے فیض وبرکت سے محروم کرنا چاہتا تھا۔

بابر نے اس نوجوان کو سینے سے لگایا اور کہا کہ اگر ہماری یہ بات تمھیں اس قدر پسند آئی ہے تو جاؤ تمھاری ریاست تمھیں مبارک۔ اب تم بھی یہی وطیرہ اختیار کرو اور اپنی رعایا کو خواہ وہ کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو عزیز رکھو اور اُس کی حفاظت اور سود وبہبود میں کوشاں رہو۔

بابر نے جس خاندان کی بنیاد ڈالی اُس کی لاثانی عظمت ترقی ونشوونما کی تہ میں اُس کی اور اُس کی اولاد کی حقیقی نیکیاں تھیں (فرضی نہیں) جو رعایا کے سُکھ چین کا باعث تھیں بابر نے اپنے لخت جگر جانشین کے نام جو وصیت کی اس کا خیال فرمائیے کہ منجملہ اور نیک ہدایتوں کے اُس نے رعایا کو عزیز رکھنے رعایا کی خوشحالی اور بہبودی میں کوشاں رہنے اور عوام کے تالیف قلوب کا یہاں تک خیال رکھنے کی تاکید کی کہ گئو کشی تک کو منع کیا ہے۔ یہ ممانعت محض نمایشی اور پروپاگنڈہ کی خاطر نہیں تھی جیسا ان دنوں بعض مقامات کی صورت ہے۔ پھر ہمایوں نیک خصال کی نیکیوں کا خیال فرمائیے جس نے ایسے نازک موقع پر بھی جبکہ وہ شیرشاہ سوری جیسے قابل ہوشیار اور خطرناک دشمن سے برسرپیکار تھا، اپنے مستقبل کو اِک دم نظرانداز کرکے ایک ہندو مہارانی کی راکھی پہونچنے پر اُس کو بہن مان لیا اور اُسے ایک مسلم فرمانروا کے دستِ تعدی سے بچانے کی کوشش میں اپنی سلطنت ہی کھودی اور پندرہ ۱۵ سال کی دشت نوردی مول لی۔ لیکن خداوند کریم کی یہ بھی آزمایش تھی جس میں ہمایوں سرخرو رہا۔ اور نہ صرف سلطنت نے پھر اُس کے قدم چُومے بلکہ اُس کے لخت جگر نے وہ عروج وعظمت حاصل کی جو اُس دَور کے کسی شہنشاہ کو میسّر نہ ہوئی۔ یہاں مَیں اکبر کی خوبیوں اور نیکیوں کا تذکرہ نہ کرونگا، اس لئے کہ اس دَور کے ہندی مسلمانوں میں اُس کے خلاف کافی جذبات اُبھارے گئے ہیں۔ اور میرا مطمح نظر بحث ومباحثہ یا حجتیں پیدا کرنا نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف جذباتِ لطیف سے اپیل کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ہم سب حاکمِ حقیقی کے اُس قانون کو سمجھیں جس کی بنا پر اُس کو منصفِ حقیقی اور رب العالمین تسلیم کیا گیا ہے۔ یعنی جہاں مسلم اور غیرمسلم کا سوال نہیں ہے صرف خلوص اور اعمال پر نظر ہے۔ اِن بادشاہوں کے زمانہ میں بھی آج کل کی طرح ان لوگوں کی کمی نہ تھی جو سلوک اور برتاؤ میں مسلم اور غیرمسلم کے فرق وامتیاز پر زور دیتے تھے، اور اس کو نہایت ضروری سمجھتے تھے مسلمانوں میں اُن کی کافی تعداد تھی۔ حقیقت یہ ہے جیسا کہ میں نے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں کہا ہے، مسلمان جو عرب سے باہر نکلے تو عموماً فخرومباہات کے جذبات کے ساتھ نکلے۔ لیکن ان بادشاہوں کے (میرا مطلب خاندان مغلیہ سے پہلے کے حملہ آوروں سے نہیں ہے) زبردست قوت واقتدار کے

سامنے اُن کی کچھ نہ چلی اور حکومت قدرتاً بدامنی اور بے چینی سے محفوظ رہی۔ آہ! ہم کب اس حقیقت کو محسوس کریں گے کہ اِن نیک بندگانِ عالی کی فتوحات اور اُن کی حکومت واقتدار کے استحکام میں اُن کی قوتِ بازو کا ہاتھ اتنا نہ تھا جتنا اُن کی نیکیوں کا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر تواریخ کو صحیح نظر سے دیکھا جائے تو قوموں کے عروج وزوال بلندی وپستی میں یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ نہ صرف قوت کے حصول ہی کے لئے پہلے نیکی کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے قیام واستحکام کے لئے بھی نیکی کی ضرورت ہے اور اس قوت سے حاصل شدہ اقتدار وحکومت کو برقرار رکھنے کے لئے بھی نیکی ہی کی ضرورت ہے۔ اس نیکی کی بیشی کمی ہی پر قوموں کے عروج وزوال کا انحصار ہے۔ نیکی سے میری مراد حقیقی نیکیوں سے ہے سچائی سے ہمدردی سے حق سے انصاف سے، نہ کہ اُن فرضی اور مصنوعی نیکیوں سے جو مذہبوں کے نام پر جاری ہوئی ہیں مثلاً پوجا، پاٹھ، روزہ نماز وغیرہ۔ مَیں ان کو فروعی باتیں سمجھتا ہوں اور ان کی قیمت ضابطہ اور قاعدہ سے زیادہ تصوّر نہیں کرتا اور ہر صاحب فکر جانتا ہے کہ صحیح اسپرٹ کے بغیر قاعدہ اور ضابطہ کیسا کچھ گناہ اور ظلم ہو سکتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کا زوال میرے خیال میں جہانگیر کی حکومت کے خاتمہ سے کچھ پہلے شروع ہوا۔ اور گو یہیں سے سلطنت کی بیرونی شان وشوکت بڑھی، لیکن اندرونی استحکام بھی یہیں سے کھوکھلا ہونے لگا۔ اسلامی فخر وامتیاز والا وہ عنصر جو غیرمسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا روادار نہ تھا اب زور پکڑنے لگا۔ رفتہ رفتہ جور وتعدّی اور ظلم وستم اس انتہا کو پہونچ گیا کہ خلق اللہ تڑپ گئی۔ اور خداوندِ کریم کے دربار میں فریاد کرنے لگی۔ بڑے بڑے سنت مہاتما پیدا ہوئے۔ ہندوؤں کی آپس کی لاپروائیاں دُور ہونے لگیں، مُحبّتیں بڑھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مظالم بھی بڑھے ــــــ نانک جیسے اللہ والے سنت کے پیرووں کو مجبوراً فوجی تنظیم کرنا پڑی دکن میں ایک دھارمک جاگرتی یعنی مذہبی بیداری پیدا ہوئی۔ سنت اور مہاتما پیدا ہوئے اور بالآخر ان سنتوں کا پیغام گورو رام داس کے ذریعہ سیواجی کو پہونچا، اور پنجاب کی طرح دکن میں بھی فوجی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جن کی بدولت رفتہ رفتہ پنجاب میں سکھوں کی اور بقیہ ہندوستان کے کثیر حصّہ پر مرہٹوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

معاملہ جیساکہ یہ راقم سمجھتا ہے یہ ہے کہ اسلام کے نیک ہدایات کی پابندی سے جو قوت پیدا ہوئی اُس نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سچّائی، ہمدردی، رواداری وغیرہ نیکیاں ہوا اور پانی کی طرح اپنی صحت اور حیات بخش قوت کے لئے آزادی اور وسعت چاہتی ہیں

——— اِن پر جہاں بندشیں عائد ہوئیں کہ اُن کی قوت خود بخود سلب ہونے لگی۔ یہ ممکن نہیں کہ آدمی کہیں سچا رہے اور کہیں جھوٹا۔ وہ غیروں کے ساتھ جھوٹ کو روا سمجھ کر جھوٹ کی عادت ڈالتا ہے، جو رفتہ رفتہ اُس پر اس قدر حاوی و ساری ہو جاتی ہے کہ اپنوں کے ساتھ بھی وہی صورت ہو جاتی ہے۔ اِس طرح قوموں کے شیرازے بکھر جاتے ہیں تنظیم جاتی رہتی ہے اور زوال شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں بلکہ ایک عرصۂ دراز تک یہ اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔ مگر وقت لا انتہا اور غیر محیط ہے ـــ ہماری غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم اُس کو اپنے ناچیز پیمانوں سے ناپنے لگتے ہیں اور اسی کی بنا پر توقعات باندھتے ہیں۔ غرض تفخر و امتیاز کے چاہنے والے "شیدایانِ اسلام" نے جو دراصل نیکیوں کو محدود کرنے پر تُلے ہوئے تھے؟ اب حکومت پر اپنا اثر اس قدر جما لیا کہ حکومت رفتہ رفتہ ان کی پابند ہو گئی اور غیر مسلم اُن نیکیوں سے محروم ہونے لگے جو صرف مسلمانوں کے لئے رَوا سمجھی گئیں۔ احترام اب صرف مسجدوں کا رہ گیا، مندروں کا نہیں، ماں بہنیں مسلمانوں کی تھیں ہندوؤں کی نہیں، بزرگ مسلمان ہو سکتے تھے ہندو نہیں۔ اور اگر غیر مسلموں میں کہیں کوئی بزرگی کے آثار پیدا ہوئے تو اُس کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجھکو پچھلے دُکھڑے رونا نہیں ہے۔ صرف تاریخ کی روشنی میں یہ دکھلانا مقصود ہے کہ خداوند کریم کا اٹل قانون کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ محض ہندوؤں کے دُکھڑے رونا نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کی نیکیوں اور عظمت کا سوگ منانا بھی ہے۔ اِن کرتوتوں کا پھل اچھا کیونکر ہو سکتا تھا، ساری عظمت اور شان و شوکت خاک میں مِل گئی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اتنے زبردست سبق کے باوجود آج بھی اُن باتوں کے اختیار کرنے کی کوشش نہیں ہے جنھوں نے عظمتیں دلائی تھیں، بلکہ اُس دَور کی بیہودگیوں کو اختیار کرنے کی سرگرم کوششیں کی جا رہی ہیں جن سے اِن د ہاڑوں کو پہونچ چکے ہیں۔ بہر حال جیسا ہندوؤں نے تنگ دلی اور تنگ نظری کو مذہبی صورت دے کر اُن کو جائز قرار دے دیا تھا آج مسلمان بھی وہی کر رہے ہیں ـــــــ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں نے آپس میں تفرقے پیدا کر لئے تھے مسلمان قومی (مذہب کی بنا پر نسل یا ملک کی بنا پر نہیں) تمیز چاہتے ہیں مگر ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوؤں نے بھی پہلے صرف قومی اور مُلکی تمیز دلوں میں پیدا کی تھی جس نے اُنھیں یہاں تک پہونچا دیا۔

خیر خوابیدہ ہندو مسلمانوں کے پہلے تصادم پر یہ سمجھے کہ یہ صرف جسمانی اور فوجی تنظیم کی زور آزمائی ہے۔ چنانچہ وہ اس کو صرف (Physical significance) دیتے رہے۔ اس سے زیادہ

اس کو کوئی وقعت نہ دی۔ حالانکہ مسلمانوں کے کلچرل رجحانات ہر قدم پر صاف صاف ظاہر تھے۔ مگر وہ ان بنیادی باتوں کو نہ سمجھ سکے جن کی وجہ سے مسلمان ایسی زبردست قوت بن گئے۔ وہ پرتھوی راج۔ رانا سانگا اور رانا پرتاپ کے گیت تو گاتے رہے لیکن یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ان بہادروں کی جانبازی کے باوجود ہندو پامال ہوتے رہے، وہ اس حقیقت کو بھی نہ سمجھ سکے کہ محمد غوری، بابر اور اکبر وغیرہ کے بعد اُن کے کام کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے والے پیدا ہوئے۔ لیکن پرتھوی راج کے بعد پرتھوی راج جیسا لیڈر، سانگا کے بعد سانگا، پرتاپ کے بعد پرتاپ کیوں نہیں پیدا ہوئے۔ بعد میں سنتوں کی بانی میں اِس حقیقت کی کچھ سمجھ آئی جو مہاکوی سورداس نے اپنے لافانی دوہے میں بتائی ہے ؂

جات پات پوچھے نہیں کوی

ہر کو بھجے سو ہر کا ہوی

اب چوڑھے چمار بھی سنت ہو سکتے تھے۔ اور بڑی ذات والے بھی ٹکارام شودر، ریداس چمار اور کبیر داس جلاہے کی عزت و احترام کرنا عین سعادت سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ قوت تھا۔ ہمایوں نے ایک راجپوت مہارانی کو بہن سمجھا، لیکن اُس کی اولاد میں تنگدل مسلمانوں کے زیر اثر وہ لوگ پیدا ہوئے جو معزز ہندو خاندانوں کی بہو بیٹیوں کو اپنے حرم میں داخل کر کے اُن کی عزت ریزی پر آمادہ ہو گئے دوسری جانب سیواجی نے اپنے مخالفوں سے بھی کہلالیا کہ اُنھوں نے مسلم خاتونوں مسلم پرستش گاہوں مسلم کتاب اور مسلم بزرگوں کی بھی حرمت و عزت کی۔ اُنھوں نے اپنی عزت و عظمت اس میں نہیں سمجھی کہ دوسروں کی اس طرح دل آزاری کیجائے۔ ان سنتوں اور مہاتماؤں کے اُپدیش اور چھترپتی مہاراجہ سیواجی کے اعلیٰ کیرکٹر کا یہ اثر ہوا کہ ترقی کے ان حقیقی اصولوں کے ماتحت قوم کی قوت بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ اُس نے ایک سلطنت کی صورت اختیار کر لی جس کا دائرۂ اثر سابقہ مغلیہ حکومت سے کسی طرح کم نہ تھا۔

مگر یہ اثر زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہا، پھر وہی تنگ خیالیاں پیدا ہو گئیں، پھر نیچ اونچ کے بھاؤ جو در اصل پوری طرح زائل نہ ہونے پائے تھے اُبھر آئے اور ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ مسلمانوں کی حالت تو ابتر ہو ہی چکی تھی۔ اس لیے میدان اب ایک تیسری قوم کے لئے صاف تھا۔ جس میں حقیقی نیکیاں ہندو و مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ موجود تھیں۔ یہ لوگ سات سمندر پار سے آئے تھے، دنیا کی وسعتوں کو ناپے ہوئے تھے، نظریں دوربیں تھیں اور دلوں میں وسعت تھی، خدا نے حکومت اُن کے حوالہ کی۔ اس قصہ سے آپ بخوبی واقف ہیں، سردست اِس سے

بحث نہیں ہے۔

بحث یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کی کیا صورت تھی؟ ہندو تو پھر اُسی تنگی کی غلاظت میں مبتلا ہونے لگے اور مسلمانوں نے بھی اُسی سلسلہ کو سنبھالا جو مغلیہ حکومت کے آخری دَور کی تخریبی سرگرمیوں کا ایک خاص جُز تھا۔ اس طرح آپس میں برابر تصادم جاری رہا۔

یوں تو ہر قوم کے عروج و اقبال کے زمانہ میں اُس کا کلچر، اُس کی تہذیب، اُس کا تمدن اُن مقامات میں خود بخود مقبول ہونے لگتا ہے جہاں جہاں وہ جاتی ہے، لیکن اسلام کی اس خصوص میں خاص توجہ رہی ہے، کیونکہ اس کا خصوصی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں بقیہ مذاہب اور اُس کی تہذیب و تمدن کے مقابلہ میں بقیہ تمام تہذیبیں لچر اور بیہودہ ہیں، جن کو فنا کرنا اور اسلام اور اُس کی تہذیب و تمدن کی تبلیغ کرنا عین فرض ہے۔ یہ بات دوسرے مذاہب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے لیکن اس خصوص میں اسلام کو جو شدت حاصل ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ تھی کہ گو ہندو تنگ نظر ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اُن کے طریقے خود اُن کے لئے مضرت رساں اور تکلیف دہ ہو گئے تھے، تاہم جن عدیم المثال بلندیوں کو اُن کے اسلاف پہونچ چکے تھے اُن کے اثرات سے وہ ابھی تک قطعی محروم نہیں ہوئے تھے۔ ہندو بزرگوں نے حقیقت کا ایک رنگ میں نہیں مختلف رنگوں میں درشن کیا تھا، جس پر اُن کے مختلف درشن شاستر یعنی فلسفے مبنی تھے۔ توحید سے وہ ناواقف نہ تھے بلکہ اُس کے بہترین اور باریک ترین رموز کو پہونچ چکے تھے۔ فنون و ادب میں بھی وہ لاثانی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کی سنسکرت جیسی سائنٹیفک حروف تہجی والی اور اعلیٰ ترین ادبی معراج کو پہونچی ہوئی زبان، ریاضی میں اُن کی فتوحات کہ دس کا تخیل ہی اُن کا ہے جس پر آج دنیا بھر کی ریاضی کی بنیاد قایم ہے۔ اُن کی موسیقی جس کے سامنے آج بھی دنیا سر تسلیم خم کرنے کو آمادہ ہے، اُن کا نجوم جس کو دنیا ٹھیک طرح سمجھ بھی نہیں سکتی تھی۔ غرض ان عظیم الشان آثار کی موجودگی میں اُن کا اسلام کو قبول کرنا مشکل تھا، لیکن اُن کی تنگ دلی اور تنگ نظری نے اِن بلندیوں اور باریکیوں کو فراخ دلی اور وسیع النظری سے دیکھنے نہ دیا۔ وہ ان پر صرف فخر کر کر کے رہ گئے، اپنے طور و طریق اور آپس کے بیوہار میں ان اعلیٰ فلسفوں اور علوم و فنون کی روح کو جگہ نہ لینے دی۔ نتیجہ یہ کہ گو اسلام کے مقابلہ میں کلچرل نقطۂ نظر سے بھی ہندو دھرم وقتاً فوقتاً کھڑا ہوا، خصوصاً بھگتی مارگ کے سلسلوں میں جس کی ایک صورت سکھ ازم (Sikhism) تھی اور دوسری وشنو ازم تھی، جن میں مساوات پر زور دیا گیا ہے

تاہم چونکہ یہ مساوات زیادہ تر ذہنی تھی جس کا زندگی کے عملی، حقیقی اور اہم کاروبار سے کوئی تعلق نہ تھا لہذا ہندو گو مسلمانوں سے اپنا سیاسی اقتدار واپس لینے میں کامیاب ہوئے تاہم اُن کی تبلیغی سرگرمیوں سے جو حکومت کے ہاتھ سے جانے کے بعد بھی بدستور جاری ہیں، ہندو ہمیشہ مات رہے۔

ہندو Genius جس کے رات دن یعنی خواب و بیداری صدیوں کی مدت رکھتے ہیں، اب انگڑائی لیتی لیتی یہ محسوس کرنے لگی کہ کچھ بات ہے جس کو ہم صاف صاف نہیں دیکھ پاتے دن بدن تنگ تر ہوتے ہوئے جن حدود کی غلاظتوں اور زلالتوں میں ہندو مبتلا ہوگئے تھے۔ اس کا ایک اثر یہ تھا کہ علم وفضل بھی ان کے معین طبقوں تک محدود ہوکر رہ گیا اور مذہب سے تعلق رکھنے والے فلسفہ کی معلومات بھی صرف ایک طبقہ یعنی برہمنوں تک محدود ہوگئی۔ چنانچہ عوام اپنے اعتقادات اور اُن کی پیروی میں بالکل اندھے اور لاعلم ہوگئے۔ اور جب مسلمان اور بعد میں عیسائی وغیرہ اُن پر دلائل اور براہین سے حملے کرنے لگے تو وہ بیوقوفوں کی طرح صرف صورت دیکھا کئے اور ان میں سے وہ جو کچھ سمجھ بوجھ کا دعویٰ رکھتے تھے ان براہین و دلائل سے قائل ہوگئے۔ پنڈت منڈلی کے لئے ان اعتراضات کا جواب بہت آسان تھا۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ اُن کو اس کی پروا بھی نہ تھی کہ اطراف میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُن میں سے بعض محض دماغی تعیّش کے لئے علمی اور فلسفیانہ بحث مباحثوں کے لئے تیار رہتے، مگر اس سے بڑھکر انھیں ان بحث مباحثوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اِس طرح ہندو قوم کی آتما بے چین تھی، اپنے میں پھیلے ہوئے خیالات کا بے تکاپن، مروجہ ناقابل فہم قبیح مراسم، مذہب کے نام پر جاری شدہ تکلیف دہ رسوم اور اُس پر غیروں کے یہ حملے! بیزار ہو ہوکر لوگوں نے مذہب بدلا، مگر اُن کے عظیم الشان ماضی کے دیا دھرم کے خوبصورت آثار، رشتہ داریوں میں اعلیٰ معیار اور انفرادی زندگی کی عجیب لاثانی خوبصورتی اُنھیں پھر اپنی قدیم قومیت کی طرف مائل کرتی تھی۔ مگر دن بدن بڑھتی ہوئی حدبندی کی رَو نے ہرجگہ بندشیں عاید کر رکھی تھیں۔ اس مضحکہ خیز خیال کا کہ آدمی دھرم چھوڑ سکتا ہے مگر پھر اُسے اختیار نہیں کر سکتا اس قدر زور ہوا کہ الامان! ہندو قوم کی آتما میں جو تلاطم بپا ہوگیا اُس کی کوئی انتہا نہ تھی یہ تلاطم بالآخر راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی جی کے ظہور میں منتج ہوا۔

اِن بزرگوں نے جہاں ایک طرف قوم کو اس کی اندرونی خرابیوں اور گندگیوں سے آگاہ کیا وہاں دوسری طرف مخالف قوتوں کا مقابلہ بھی کیا۔ راجہ رام موہن رائے کے پیش نظر زیادہ تر عیسائی قوتیں تھیں

جن سے اُن کے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مباحثے رہے۔ اسلام وغیرہ کی طرف انھوں نے چنداں توجہ نہیں کی اور نہ اُن قوتوں کا کوئی خاص محاسبہ ضروری سمجھا جو اندرونی خرابی کا باعث تھیں۔ لیکن سوامی دیانند سرسوتی جی نے حتی الامکان کوئی تفصیل نہ چھوڑی۔ سب سے پہلے اُنھوں نے اپنوں کی خبر لی۔ تنگ نظری اور دائرہ بندی کے مہلک نتائج کو قرار واقعی طریقہ پر دکھلایا۔ ذات پات کی خطرناک بیہودگیوں سے آگاہ کیا۔ علم کو جو جہالت کے تیرہ و تار قفس میں محبوس ہو گیا تھا آزاد کیا اور اُس کی برکتوں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کو فیضیاب کیا۔ اس کی صحیح روشنی میں ہم نے اُن خرابیوں کو صاف صاف دیکھا جو قومی زندگی کا آزار بن گئی تھیں۔ سوامی دیانند ہی کی بدولت وید شاستر روز روشن میں آئے اور اپنے صحیح خدو خال میں ظاہر ہوئے۔ اُنھوں نے ان کے ذریعہ اپنوں اور پرایوں کو دکھلایا کہ ہمارا روپ دراصل وہ نہیں ہے جو مدتوں کی تاریکی اور غفلت نے بنا رکھا تھا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں صحیح ترین اور اعلیٰ ترین تعلیم دی تھی جس سے ہم اجاگرے منحرف ہو گئے تھے۔ ورنہ بزرگوں نے ایسی ایسی حقیقتوں اور رموز کا انکشاف کیا تھا جن کی آج بھی دنیا محتاج ہے۔

ہمیشہ کی طرح اب بھی ہندو قوم نے وقت اور حالات کی ضروریات کے مناسب شخصیتیں اور ادارے پیدا کئے۔ سوامی دیانند اور آریہ سماج دونوں کی اسکو اس مصیبت کے وقت اشد ضرورت تھی۔ سوامی جی نے آریہ سماج کے ذریعہ جو جارحانہ اور جبری اسپرٹ پیدا کی (جس کے لئے آج وہ وقت بے وقت بے انتہا مطعون کئے جاتے ہیں) وہ اِس پست اور ذہنی و دماغی طور پر مار کھائی ہوئی قوم کو اپنی ہستی کی اہمیت اور خودداری کے احساس کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں ہاتھ پیر مارنے کے قابل بنانے کے لئے ضروری تھی۔ اب تک جن براہین و دلائل سے لوگ پست اور پسپا کئے جا رہے تھے وہ بے اثر ہو گئے بلکہ اُلٹا پانسا ہی پلٹ گیا۔ اور آریہ سماج نے بھی مخالف قوتوں پر اُسی طرح کے وار شروع کر دیے جن سے مخالف قوتیں زچ ہو گئیں اور آریہ سماج کے خلاف یہ شور برپا کرنے لگیں کہ یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جو آپس کے اتحاد و اتفاق میں خلل انداز ہے اور اسی کی وجہ سے شر و فساد پیا ہوتے ہیں۔ یہ شور و شر دراصل اُس طویل جنگی سلسلہ میں ایک پُرفن بیڑا ہے جو ہندوستان کی کلچرل اور مذہبی فتح کے لئے صدیوں سے جاری ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آریہ سماج نے محض وہی کیا جو خود مسلمان کرتے چلے آ رہے ہیں، اور وہ بھی محض مدافعانہ حیثیت سے اپنی قومی ہستی کو معدوم ہونے سے بچانے کے لئے۔

اِس وقت مسلمان بھائیوں میں آریہ سماج کے خلاف جو زبردست لہر نظر آ رہی ہے وہ اِسی

پروپاگنڈے کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آریہ سماجیوں میں بہت منہ پھٹ بولنے اور لکھنے والے پیدا ہوئے۔ لیکن جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں یہ مسلمانوں ہی کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ نہ ہندوؤں پر ایسے حملے کئے جاتے اور نہ آریہ سماجی ایسے جواب دیتے۔ گو میں مانتا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق اور مصلحت دونوں کا یہی تقاضا ہے کہ گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے اور آریہ سماجی بزرگ جس قدر جلد اپنے پرچار کے طریقوں پر نظرِ ثانی کر کے اُس کو ایک ارفع و اعلیٰ سطح پر لے آئیں اُسی قدر اُن کے اور عام طور پر ہندو قوم کے حق میں نیک اور مفید ہو گا۔ اس بارے میں انھیں عیسائیوں سے سبق لینا چاہیئے جنھوں نے مباحثوں اور مجادلوں کے میدان کو چھوڑ کر بلا تفریق مذہب و ملّت خلق اللہ کی خدمت کا ایسا مبارک طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ کل تک جو ہندو مسلمان اُن کے مخالف تھے آج اُن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اور لطف یہ کہ اس سے اُن کی تبلیغ گھٹی نہیں بلکہ تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ آج آریہ سماجی بھی اُن کی وہ مخالفت نہیں کرتے جو کسی زمانہ میں کیا کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ عیسائیوں نے یہاں بھی وہی ایک صحیح طریقہ اختیار کیا جو کامیابی اور مستحکم ترقی کا یقینی ضامن ہے۔ یعنی تکلیف دینا یا دل آزاری کرنا نہیں بلکہ انسان کو ہر ممکن طریقہ سے سکھ پہونچانا اور اس کی ترقی و بہبودی میں کوشاں ہونا۔ اُنھوں نے نہایت عقلمندی سے ان تمام طریقوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور کرتے جاتے ہیں جن سے لوگوں کو دُکھ پہونچ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں ان میں بھی نقص ہیں مگر اس وقت مجھے اُن سے بحث نہیں ہے۔ میں تو صرف اُس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمیں امن اور ترقی کے راستہ پر لے جا سکتا ہے۔

مجھکو حیدر آباد کی آریہ ستیاگرہ میں بھی کچھ کچھ یورپ کی صلیبی لڑائیوں کی مشابہت نظر آتی ہے۔ البتہ یہ محاربہ نہ تھا ستیاگرہ یعنی پُرامن جہاد تھا جس طرح عیسائیوں کو اُس وقت مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی آریہ سماجیوں کی بھی اس وقت قریب قریب وہی صورت ہوئی اس کا سبب جیسے یورپ میں عیسائی قوتوں کی باہمی تنگدلی، عداوتیں اور خود غرضیاں تھیں ویسے ہی یہاں بھی آریہ سماج کی مختلف پارٹیوں کی آپس کی رقابتیں اور چند سربرآوردہ لوگوں کی تنگدلانہ خود غرضیاں ہیں جو آریہ سماج کے کام میں وسعت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اور نئے خون کو داخل کرنا نہیں چاہتے۔ کہ مبادا اس سے اُن کی شخصیتیں دب جائیں اور اُن کا ذاتی دائرۂ اثر و اقتدار باقی نہ رہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سارودیشک سبھا جیسا نامور ادارہ بھی ایک ٹھٹھرا ہوا ادارہ ہے۔ جہاں لوگوں نے اپنے ٹھیکے جما رکھے ہیں۔ ان کی تنگ نظر چھوٹی سمجھ اور بٹی بکھری قوتوں کا نتیجہ ہے کہ اِن میں

پروپگینڈا اور پرچار کو ٹھیک طرح پر آرگنائز کرنے کا نہ مادّہ ہے اور نہ سلیقہ۔ درحقیقت آریہ سماج کے مشن کو صحیح طور پر سمجھنے والے اور محض اس مشن کی کامیابی کے لئے کام کرنے والے اس قدر کم ہیں کہ ان کا نہ ہونے میں شمار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں آریہ ستیاگرہ کو خاطرخواہ کامیابی حاصل ہو سکی لیکن اس ستیاگرہ نے ہندو قوم کو عام طور پر بیدار ضرور کر دیا اور انھیں یہ محسوس کرا دیا کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو انکی حفاظت اور سلامتی کے لئے ضروری ہے۔

یہاں یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ اسلام کا مطمح نظر دراصل مذہبی اور کلچرل فتح ہے۔ سیاسی اور معاشی فتوحات محض اس اصلی مقصد کی امداد اور معاونت کے لئے تھے۔ چنانچہ جب سیاسی قوت جاتی رہی تب بھی مذہبی اور کلچرل فتوحات کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔ انگریزوں کے متعلق اکثر طنزاً کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو ہندوستانیوں ہی کی مدد سے فتح کیا لیکن اس سے زیادہ حقیقی یہ واقعہ ہے جس کی طرف ہماری نظر کم جاتی ہے کہ اسلام کی فتوحات میں ہندوؤں کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ ہندو راجپوتوں کی امداد و اعانت تو تواریخی شہادت رکھتی ہے، اس امداد میں وہ یہی سمجھتے رہے کہ ان فتوحات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کے متعلق ہندوؤں نے ہمیشہ یہ غلطی کی مگر اس غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر اُن بندگان عالی کی رواداریاں تھیں جن کا ذکر خیر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ مگر اس سے بھی زیادہ زبردست اور تکلیف دہ اور حیرت انگیز وہ طریقہ ہے جس سے اسلام اپنے حلقہ بگوشوں کو اپنوں اور اپنے اسلاف سے اس درجہ منحرف کر دیتا ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہی اپنوں کی تخریب اور اپنے اسلاف کے نام کو مٹانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ آج ہندی مسلمانوں میں ظاہر ہے کہ کم سے کم نوّے فیصدی تو ضرور ایسے ہیں جو ہندوؤں ہی کے گوشت و پوست ہیں لیکن انھیں ہندوؤں سے اس درجہ مغائرت و نفرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم کہتے ہیں اور انھیں آریہ اور ہندو نام سے بھی نفرت ہے۔ کبھی یہ ہندی بھائی ترکوں اور ایرانیوں کی طرح اپنے اسلاف اور قومی خصوصیتوں کو بھی یاد کریں گے یا نہیں۔ اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے بھائیوں پر جو زیادتیاں ہوئیں اُن پر کبھی پشیمان ہونگے یا نہیں۔ اس کا خدائے برتر و بالا ہی کو بہتر علم ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ صورت پیدا ہوئی تو یقیناً ہمارے بھائی آریہ سماج کے مشن کو احسان مندی اور شکر گذاری سے دیکھیں گے۔

بہرحال ہندوستان میں صدیوں سے اسلام اور ہندو دھرم کی مذہبی اور تہذیبی جدوجہد جاری رہی ہے اس دوران میں مسلمان برسرِ حکومت بھی رہے اور اُن کا دائرۂ اثر تقریباً تمام ہندوستان پر رہا، بعد میں یہ حکومت اور اقتدار جاتا بھی رہا۔ ہندوؤں کو خداوندکریم نے موقع دیا تھا مگر وہ پھر غفلتوں میں

مبتلا ہو گئے۔ اِس طرح رفتہ رفتہ دونوں قعرِ مذلّت میں گرے، اور اقتدار و حکومت ایک تیسری قوم کے ہاتھ سونپی گئی۔ مگر اسلام اور ہندو دھرم کی پُرانی جدوجہد ہنوز جاری ہے۔ مسلمان جب ابتدا میں باہر نکلے تھے تو اُن کے پیشِ نظر ایک مشن تھا جس پر اُن کا خلوص اور صداقت سے اعتقاد تھا کہ دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ خلوص اور اعتقاد کئی قدرتی اور دوسرے اسباب سے اِس دَور میں اور آئندہ (کم از کم ایک عرصۂ دراز تک) ممکن نہیں۔ اُن کی مختلف جدوجہد میں خواہ اور چیزیں بھی شامل رہی ہوں لیکن یہ جذبہ سب پر حاوی تھا اور اس مشن میں انھیں جو کامیابی یہاں یا کہیں اور حاصل ہوئی وہ صرف حقیقی نیکیوں کا نتیجہ تھی۔ حیوانی قوت اور جنگ و جدل کا نہیں۔ پھر نظریں تنگ ہو گئیں، نیکیاں پیشِ نظر نہ رہیں، شان و شوکت اور قوت و اقتدار کا سودا سر میں سمایا، خدائے برتر و بالاتر اعلیٰ مرتبہ سے ہٹا دیا۔ آج بھی اگر دلوں کو گہرائی سے ٹٹول کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ در اصل وہ اصلی مشن اس قدر پیشِ نظر نہیں ہے جس قدر کہ تفخّر و امتیاز اور سلطنت و حکومت اور اپنی شان جمانے کی فکریں دلوں کو مشتعل کر رہی ہیں۔ تبلیغ کی سرگرمی اب اُس خالص اعتقاد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اِس کے ذریعہ پلّہ بھاری رہیگا، قوت حاصل ہوگی، شان بڑھے گی اور غیروں کے مقابلہ میں حاکموں کی حیثیت حاصل ہوگی۔ پہلے دَور کی جدوجہد میں دنیوی اغراض شامل نہ تھے مگر اب دنیائے دنی کی فکریں اور ادنیٰ اغراض شامل ہو گئے ہیں۔ قدرتاً عمل بھی سیدھا یعنی انصاف اور رواداری کا نہیں رہا لہٰذا غیر مسلم پریشان ہیں۔ جس کا ایک ضمنی نتیجہ حیدرآباد کا ستیاگرہ تھا جس کی عام ہندوؤں نے پوری پوری تائید کی۔

ادھر ہندو قوم اب بیدار ہو رہی ہے اور اپنے لاثانی ورثہ کو جو مدتوں سے تیرہ و تارتہ خانوں میں بند تھا پا رہی ہے، لیکن مدتوں کی ندیدگی کے باعث اُن کا قدم صحیح راہِ عمل سے بار بار متزلزل ہو جاتا ہے اور وہ بہکنے بھٹکنے لگتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی اُن کی نظروں سے اُوجھل ہو ہو جاتی ہے کہ اصلی ترقی اور اصلی فتح حقیقی نیکیوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کو یہاں پر جو کچھ ترقی اور عروج نصیب ہوا وہ محض بزورِ شمشیر تھا جو سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر شمشیر درمیان میں نہ آتی تو غالباً ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ موجودہ سے کہیں زیادہ ہو چکی ہوتی، ٹھیک اُسی طرح جس طرح چین اور جاپان بُدھ مذہب کے پیرو ہو گئے۔ اور آئندہ اُس کی کامیابی کے نسبتاً بہت زیادہ امکانات ہوتے۔ اس لئے کہ لوگ اسے خوف اور نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے دیکھتے۔ بہر حال جبر و زیادتی نے جو نفرت اور غصہ کا جذبہ پیدا کیا اُس نے اسلام کے صحیح نظر والے نیک بزرگوں کے کام میں در اصل

روڑے اٹکا ؤ نے۔ آج بھی جو تلاطم برپا ہے اُس سے گویا دنیا کی قوتوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام میں ایسے مہیب ممکنات مضمر ہیں جو امن عالم کے لئے خطرناک ہیں۔ اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں انھیں دور اندیش بزرگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ویدک پرارتھناؤں میں کچھ منتر آتے ہیں جن سے اس مسئلہ پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ منتر ابھئے دان کے لئے یعنی بے خوفی کے لئے ہیں۔

अभयं नः करत्यन्तरिक्षम-
भयं द्यावापृथिवी इहमे ।
अभयं पश्चादभ[illegible]दु-
त्तरादधरादभयं नो अस्तु ॥

अथ० १६-१५-५

अभयं मित्राद भयममित्राद -
भयं ज्ञाताद[illegible] पुरो यः ।
अभयं नक्तम[illegible] नः
सर्वा आशा मम मित्रं भवन्तु॥

अथ० १६-१५-६

(ترجمہ) " ارض و سما ، شرق و غرب ، شمال و جنوب ہماری بیخوفی کا باعث ہوں ، دوست اور دشمن ، واقف و ناواقف ، دن اور رات ہماری بیخوفی کا باعث ہوں ، اطراف و جوانب کی ہر چیز ہماری **دوست ہو**"

یعنی بے خوفی اور امن و شانتی حاصل کرنے کے لئے یہ نسخہ بتلایا گیا ہے کہ یہ صرف سب کی دوستی اور محبت سے میسّر ہو سکتی ہے جو ظاہر ہے کہ حسن سلوک ، رواداری اور بعض صورتوں میں اپنے مفاد اور آرام تک کی قربانی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

لہذا ہندو اور مسلمان ہر دو کی حقیقی فلاح و بہبود اس میں مضمر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے نیکیوں میں مقابلہ کریں نہ کہ تخریبی اور تباہ کن سرگرمیوں میں یہ نیکیاں خود آپ کی تبلیغ کریں گی۔ میرا ایمان ہے کہ بالآخر وہی قوم یا اُس خیال اور تہذیب کے پیرو زندہ رہیں گے جو نیکیوں پر ایمان رکھتے ہیں یعنی اُن طریقوں پر جن سے انسان کو سکھ اور چین پہونچے نہ کہ اُن طریقوں پر جو اپنے پڑوسی کی تکلیف اضمحلال اور پریشانی کا باعث ہوں۔ اور جو مذہب کے نام پر پروپاگنڈہ کی خاطر جھوٹ سے بھی دریغ نہ کریں

اور اپنی مرضی اور اپنے طریقے چلانے کے لئے حق و انصاف سے منحرف ہو جائیں اور دوسروں کو ہر قسم کا آزار پہونچائیں۔ ایسے لوگ دراصل اپنے لئے موت کا پروانہ لکھا رہے ہیں محض آرگنائزیشن محض فوجی یا جسمانی قوت کی تنظیم دراصل کوئی چیز نہیں۔ دنیا کی تواریخ شاہد ہے کہ بڑی بڑی منظم اور زبردست سلطنتیں اُن لوگوں کے ہاتھوں فنا ہوئیں جو غریب و لاچار و پامال تھے۔ جن کی ظاہری حالت قابل رحم تھی۔ اور جو ہر طرح ذلیل و خوار مگر مظلوم تھے۔ اِسی لئے یہ ارشاد ہوا ہے۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

تلسی آہ غریب کی کبھو نہ خالی جائے الی قوت اور ج‌سانس سونہ لوہ بھسم ہو جائے

اور قوت

نذرِ حقیر

صبح کا وقت تھا، پہاڑی کے سرد پہلو سے ٹکراتا دریائے جمن خاموشی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے گوروجی اپنے بھگتوں کو دھرم اپدیش دے رہے تھے فضا امرت برسا رہی تھی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ دریا بھی اسی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ گوروجی بھی اُسی طرح اپدیش دے رہے تھے۔

گوروجی کا دولتمند چیلا رگھوناتھ بھی آیا، اُس نے گوروجی کو پرنام کرتے ہوئے کہا "میں شری مہاراج کی سیوا میں یہ نذرِ حقیر لایا ہوں، قبول فرمائیں۔" یہ کہہ کر اُس نے گوروجی کے نزدیک دو بیش بہا طلائی کڑے رکھ دیئے۔ سورج کی کرنیں پڑتے ہی کڑے جگمگا اٹھے۔ رگھوناتھ کے چہرے سے غرور جھلکنے لگا۔

گوروجی نے اُپدیش دیتے دیتے ایک کڑے کو انگلی میں ڈال کر گھمانا شروع کیا۔ کڑا انگلی سے نکلکر دریا میں جا پڑا گرنے کی ذراسی آواز ہوئی، پھر فضا ساکن ہو گئی۔

رگھوناتھ دریا میں گھس کر کڑا تلاش کرنے لگا صبح سے شام ہو گئی مگر کڑا نہ ملا۔ رگھوناتھ واپس آیا۔ اُس کے تمام کپڑے پانی میں تربتر ہو گئے تھے، بدن تکان سے چُور اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔

اُس نے گوروجی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر عاجزی سے دریافت کیا "اگر مہاراج مجھے یہ بتانے کی کرپا کریں کہ کڑا کس طرف اور کہاں گرا تو میں اُسے پھر تلاش کروں، ممکن ہے مل جائے۔"

گوروجی نے دوسرے کڑے کو پانی میں پھینکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "وہاں"

دریا میں پھر ذراسی آواز ہوئی، اور تمام فضا پھر اسی طرح خاموش ہو گئی۔

(ٹیگور) (ترجمہ۔ ڈی۔ پی۔ بٹناگر گستہ)

لکھنؤ کا ایک یادگار مشاعرہ

از حضرت وصل بلگرامی

لکھنؤ میں ہمیشہ سے شعر و شاعری کا چرچا جس قدر رہا۔ شاید ہی اور کہیں اس کی مثال مل سکے۔ جس قدر مشاعرے یہاں ہوئے اور جس شان سے ہوئے، غالباً کہیں اس کی نظیر نہ پائی جا سکے۔ لکھنؤ اُردو زبان کی ٹکسال رہا ہے۔ دہلی سے زبان آئی۔ یہاں بنی سنوری۔ شاہانِ اودھ نے اس کی بڑی قدر کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی زبان کی ٹکسال قائم ہو گئی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ زبان کے لحاظ سے یہ ترقی کرتا رہا' بڑے بڑے ادیب' بڑے بڑے شاعر اس نے پیدا کئے۔ اب نہ وہ لکھنؤ ہے نہ زبان کے قدردان ہیں' نہ اس کے حامی۔ لیکن پھر بھی اِس گئے گذرے زمانہ میں مشاعرے اس کی یادگار باقی ہیں۔ شاعری ابھی اگلی داستان کو دُہراتی ہے۔ یہاں اب بھی شعرا کی متعدد انجمنیں قائم ہیں۔ نشستیں ہوتی ہیں' محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور دلکش نغموں سے گلستانِ سُخن گونج اُٹھتا ہے۔ سُننے والے شایقین اور نقاد داد دیتے ہیں اور شعرا کی ہمتیں بڑھاتے ہیں۔

ابھی چند سال گذرے کہ انجمن بہارِ ادب لکھنؤ کا ایک ایسا سالانہ مشاعرہ ہوا جس کا منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے، جس کا کیف اب بھی دل میں باقی ہے۔ جس کے شعر آج بھی کانوں کو سُنائی دے رہے ہیں گو اس کے بعد اور بھی مشاعرے ہوئے۔ خاص کر اسی انجمن کا آخری سالانہ مشاعرہ بارہ دری قیصر باغ میں ایسا ہوا جو مدتوں یاد رہے گا۔ مجمع کی تعداد کا پُوچھنا ہی کیا۔ کیا بارہ دری کا ہال' کیا بغلی دالان' کیا بالاخانہ' بلکہ بارہ دری کے باہر بھی سامعین ہی سامعین نظر آتے تھے۔ بڑی شان' بڑے کروفر' بڑے انتظام کا مشاعرہ تھا۔ اور ہر لحاظ سے بہترین مشاعرہ تھا۔ لیکن جس مشاعرہ کا اس وقت میں ذکر کر رہا ہوں، وہ بالکل قدیم وضع کا مشاعرہ تھا قدیم طرز کی نشست تھی۔ نشست کے لحاظ سے غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ شمع سامنے آتی تھی اور شاعر اپنا کلام سُناتا تھا۔ یہ مشاعرہ جناب مرزا بہادر مرزا محمد عباس علی خاں صاحب جگر مرحوم رئیسِ اعظم لکھنؤ کے امام باڑہ میں منعقد ہوا تھا۔ جو وسعت کے لحاظ سے کافی وسیع تھا۔ وسطِ شہر میں تھا۔ بلکہ شہر کے اُس حصہ میں تھا۔ جہاں ادبا، اور شعرا ہمیشہ سے رہتے چلے آئے تھے۔

۱۷ جنوری ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ سردی کا زمانہ' رات کا وقت' مجمع ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ صحن میں

شامیانہ نصب تھا۔ وہ بھی کافی نہ ہو سکا۔ بہرحال نشست قائم کی گئی اور ٹھیک آٹھ بجے شب کے اسکا افتتاح کیا گیا۔ سب سے پہلے شمس العلما جناب مولانا سبط حسن صاحب مرحوم نے ایک نہایت فاضلانہ تقریر فرمائی جو شعر و شاعری کے متعلق تھی جس نے محفل کے رنگ کو دوبالا کر دیا۔ اس کے بعد ہی ٹھیک نو بجے جناب بہارؔ مرحوم سکرٹری مشاعرہ کی غیر طرح غزل سے مشاعرہ شروع ہوا۔ طرح کا مصرع تو اسوقت یاد نہیں، لیکن صفیؔ کے ایک مصرع سے آپ کو طرح کا اندازہ ہو جائے گا۔ مصرع ہے:۔

رنگِ رُخ بدلا کیا گردش میں جب تک جام تھا "جام" قافیہ اور "تھا" ردیف

مشاعرے نے شروع سے ترقی کرنا شروع کی۔ ہر شاعر کی غزل چمک رہی تھی۔ داد ملتی جاتی تھی اور وہ مست و بیخود ہو کر اپنا کلام سنا رہا تھا۔ ہر طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی صدائیں آ رہی تھیں۔ بیان نہیں ہو سکتا کہ کیسا منظر تھا۔ لکھنؤ کے قریب قریب کے تمام اساتذہ موجود ہے۔ باہر سے بھی جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائلؔ دہلوی، جناب دلؔ شاہجہانپوری، جناب ضامنؔ الہ آبادی، جناب جگرؔ بسوانی اور کئی نامور اساتذہ تشریف لائے تھے۔ آہ انمیں وہ ہستیاں بھی ہیں جن کو آج ہم مرحوم کہہ رہے ہیں۔ جناب عزیزؔ، جناب بلیغؔ، جناب بہارؔ، جناب ظریفؔ، جناب ناصریؔ، جناب رواںؔ، جناب دانشؔ، جناب وصیؔ کاکوروی، جناب باسطؔ، جناب برقؔ دوائی جناب احسن مرزا صاحب شررؔ، جناب شفیقؔ، جناب رشیدؔ، جناب فناؔ۔ جناب شہیرؔ مچھلی شہری یادگار جناب منیرؔ شکوہ آبادی، جناب چکبستؔ، یہ سب اس مشاعرے میں رونق افروز تھے۔ شہر کے رئیس، شہر کے معزز اصحاب یونیورسٹی کے پروفیسر، طلبا۔ ہر طرح کے اصحاب اسمیں شریک تھے۔ مشاعرہ تھا کہ آسمان پر پہونچ رہا تھا۔ کیا پڑھنے والا اور کیا سننے والا، ہر ایک پر ایک محویت طاری تھی۔ اس کو صرف شعر سنائی دیتا تھا شعر پڑھا گیا اور وہ اس کی لذت اس کے کیف اس کے سرور میں کھو گیا۔ پھر اس کو کسی شے کی خبر نہیں تھی۔

تقریر آٹھ بجے سے اور مشاعرہ نو بجے سے شروع ہوتا ہے اور بجز چار کے دَور کے برابر اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے دو بجے دن کو۔ اس پر بھی ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ ابھی یہ بند نہ ہو سہ

دَور چلے دَور چلے ساقیا اور چلے اور چلے ساقیا

کس کا کھانا، کس کا سونا، کس کی بھوک اور کس کی نیند۔ ایسی شراب پلائی گئی تھی کہ بجز شعر سننے اور اس سے لطف اٹھانے کے اور کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔

اچھا آئیے ہم آپ کو بھی اس مشاعرے کے چیدہ چیدہ اشعار سنائیں۔ آپ کو بھی اس سے لطف اٹھانیکا موقع دیں۔ لیکن کس طرح، یہ نہیں کہ تمام غزلیں سنا جائیں۔ ہر شاعر کا کلام پڑھیں۔ ہر شعر آپ تک پہونچائیں۔ نہیں صرف چند چھنے ہوئے شعر، وہ بھی ایک قافیہ کے، اچھا "آرام" کا قافیہ لیجئے اور جناب بہارؔ مرحوم کا شعر سنئے سہ

کیا خبر احساسِ دل کم ہو گیا تھا یا سوا درد سے تکلیف تھی تکلیف سے آرام تھا

جناب ضامن فرماتے ہیں ؎

پوچھتے کیا ہو حقیقت ہم سے دردِ عشق کی ایسی اک تکلیف تھی جس پر فدا آرام تھا

جناب سراج کا شعر ہے ؎

کٹتی ہیں انگڑائیاں لے لے کے راتیں ہجر کی نیند بن کر اڑ گیا قسمت میں جو آرام تھا

جناب تدبیر کا شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

کوندتی ہے آئے دن بجلی نشیمن پر قدیر قید میں یہ روز کے دھڑکے نہ تھے آرام تھا

جناب محشر ارشاد فرماتے ہیں ؎

اب یہ حالت ہے ذرا سی بات کی اور رو دئے وہ زمانہ اور تھا جب دل کو کچھ آرام تھا

جناب صفی کا مقطع اسی قافیہ میں ہے ؎

کیا خبر تھی انقلابِ دہر کی ہم کو صفی قبر کا گوشہ بظاہر گوشۂ آرام تھا

جناب آسی کا مقطع بھی ملاحظہ ہو ؎

دشمنِ راحت ہے آسی میرا احساس خرد مجکو دردِ بے حسی میں ہر جگہ آرام تھا

یہ سات شعر میں نے آرام کے قافیے کے آپ کو سنائے۔ اِس قافیہ میں اور بھی شعر ہیں مگر آپ اُن پر غور فرماکر نتیجہ نکالئے۔ ہر شاعر نے اپنے مذاق، اپنے خیال، اپنی طبیعت کے مطابق مضمون کو ادا کیا ہے۔ اب پسند کرنا اور انتخاب یہ مشاعرے میں سامعین کے متعلق تھا۔ اب دوسرا قافیہ لیجئے اور رشید مرحوم کا ایک شعر "نام" کے قافیئے میں سُنئے ؎

اہلِ ظاہر نے بھلا دیں اصطلاحیں عشق کی ہوشیاری اصل میں دیوانگی کا نام تھا

جناب منظر کا شعر ہے ؎

اہلِ محشر دیکھ لوں قاتل کو تو پہچان لوں بھولی بھولی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام تھا

جناب آسی فرماتے ہیں ؎

آپ کیوں گھبرا رہے ہیں بازپرسِ حشر میں کیا زمانے بھر میں قاتل آپ ہی کا نام تھا

جناب وصی لکھنوی ؎ شعلہ افشاں ہے دلِ بیتاب یا رب خیر ہو جو زبانِ برق پر آیا یہ کس کا نام تھا

جناب امین ؎ ہے خزاں کے دور میں بھی اُنکی ایسی ہی بہار یہ مرے اوراقِ دل پر نقش کس کا نام تھا

جناب سراج ؎ یاد پڑتا ہے کہ اک دیکھا تھا خوابِ خوشگوار کیا کہیں کس عہد کا عہدِ جوانی نام تھا

جناب شہرہ ؎ میں جدھر گذرا اُدھر کے راستے رُک رُک گئے　　کچھ عجب انداز سے لب پر تمھارا نام تھا

جناب عزیز مرحوم فرماتے ہیں ؎

اور کس کو منتخب کرتی نگاہِ انتخاب　　یا ہمارا نام تھا وہ یا تمھارا نام تھا

"نام" کے قافیے کے بھی میں نے آپ کو سات شعر سنا دیئے اور آپ کو مشاعرے کا سماں دکھا دیا۔ اب چاہے آپ داد دیجئے یا نہ دیجئے۔

اب "کام" کے قافیہ کے چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

جناب دل شاہجہانپوری کا شعر ہے ؎

اسکی ہمت اب اگر پامال کرڈالے کوئی　　خاک ہوجانا محبت میں ہمارا کام تھا

جناب ناصری کا شعر ہے ؎

کون لایا مجکو یارب جلوہ گاہ ناز تک　　ساتھ تو قسمت تھی میری یا دلِ ناکام تھا

جناب جگر بسوانی ؎ کیوں جلانے کیلئے تکلیف فرماتے حضور　　اپنے دل کی آگ میں جلنا ہمارا کام تھا

جناب دل مرحوم ؎ آفریں اُسکو کہ جس نے زندگی کی نذر دی　　ورنہ خالی جان دیدینا بھی کوئی کام تھا

جناب سلیم کا مطلع ہے ؎

گو اجازت عام تھی جلوہ بھی اُسکا عام تھا　　پھر بھی نظارہ تھا جس کا کام اُسکا کام تھا

جناب عزیز مرحوم ؎ برق کے پردے میں اوجھل ہوگیا آنکھوں سے تو　　مُنھ چھپا کے جانیوالے مجکو تجھ سے کام تھا

جناب احسن مرزا شرر مرحوم ؎

زندگی کے مختلف جلوؤں کا منظر عام تھا　　منتخب کرنا کسی کو اہلِ دل کا کام تھا

جناب شوکت تھانوی کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

عشق ہی آغاز تھا اور عشق ہی انجام تھا　　عشق سے خلقت تھی میری عشق ہی سے کام تھا

اس قافیے میں بھی سات آٹھ شعر آپ سن چکے۔ ہر شعر کا رنگ جدا ہے اور ہر شعر کا طرز الگ ہے۔ ہر شعر اپنے میں ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ اب صرف ایک قافیہ اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ "انجام" کے قافیہ میں چند شعر سنئے ؎

جناب بہار مرحوم کا شعر ہے ؎

شامِ غم کے بعد تھی صبح قیامت لازمی　　عشق کے آغاز کا سمجھا ہوا انجام تھا

جناب جگر بسوانی ؎ دہر میں روتے ہوئے آئے، گئے ہنستے ہوئے　　ابتدا ہستی کی وہ تھی اور یہ انجام تھا

جناب شاکر کانپوری ؎ مرنیوالے موت کے آنیسے پہلے مر چکے　　عشق کا آغاز کب شرمندۂ انجام تھا

جناب باسط مرحوم ~ کس مزے کی نیند تھی قربان خوابِ مرگ کے　　بند تھیں آنکھیں مگر پیشِ نظر انجام تھا

جناب صفیؔ ~ جان جائے اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو　　ایک ناکام محبت کا یہی انجام تھا

جناب عزیزؔ مرحوم ~ میری مُشتِ خاک بھی ہے خود تباہی کا پیام　　عشق کے آغاز کا یارب یہی انجام تھا

جناب منظرؔ ~ ہجر میں دو کروٹوں نے کر دیا قصّہ تمام　　دردِ دل آغاز تھا دردِ جگر انجام تھا

جناب محشرؔ ~ لائی تھی تقدیر دنیا میں فنا کے واسطے　　میری اک اک سانس کا آغاز ہی انجام تھا

غالباً اِس وقت آپ مشاعرے میں ہوں گے اور آخری شعر جناب محشرؔ کا سُن رہے ہوں گے لیکن آپ نے باہر کے دو اُستادوں کا کلام نہیں سُنا۔ مشاعرے کا قاعدہ ہے کہ باہر والے شعرا آخر میں پڑھوائے جاتے ہیں، بالخصوص اساتذہ۔ اِس لئے میں بھی آپ کو اسی قاعدے کے مطابق جناب سائلؔ دہلوی اور جناب شہیرؔ مچھلی شہری کے اشعار بھی انھیں قافیوں میں سُنانا چاہتا ہوں۔ اچھا سُنئے، جناب سائلؔ "آرام" کے قافیے میں فرماتے ہیں ~

کر دیا بیتاب تم نے کھینچ کر پہلو سے تیر　　دل میں پیوستہ تھا جبتک چین تھا آرام تھا

جناب شہیرؔ فرماتے ہیں ~

پاتے تھے مرقد میں لطفِ ہمکناری و وصال　　اے اجل ہم کو فشارِ قبر میں آرام تھا

جناب سائلؔ کا شعر "نام" کے قافیے میں ملاحظہ ہو ~

جان میں کس پر فدا کرتا بجز تیرے بتا　　مستحق اس کا تھا یا تو یا خدا کا نام تھا

جناب شہیرؔ کا شعر ہے ~

جوہرِ حُسنِ عقیدت دِل کے ٹکڑوں سے کھلے　　ان جواہر ریزوں پر نقش آپ ہی کا نام تھا

"کام" کے قافیے میں جناب سائلؔ فرماتے ہیں ~

ہو گیا دلدادہ تیرا اندرِ مرگ بے اصول　　اک ادا پر جان دے دینا اسی کا کام تھا

جناب شہیرؔ مرحوم ~

ہو گئی تھیں جمع دُنیا بھر کی آکر حسرتیں　　اک جہانِ آرزو میرا دلِ ناکام تھا

اب "انجام" کا قافیہ ملاحظہ فرمائیے۔ جناب سائلؔ کا ارشاد ہے ~

رات کتنی تھی تڑپ کر دیکھئے کٹ گئی　　میری شامِ آرزو کا بس یہی انجام تھا

جناب شہیرؔ فرماتے ہیں ~

صبح کو اک مُشت خاکستر تھی فرشِ خواب پر　　رات کے سوزِ غمِ فرقت کا یہ انجام تھا

اب آخری قافیہ اور سُن لیجئے یعنی پیغام۔ جناب سائلؔ اس قافیہ میں یوں فرماتے ہیں ؎

جان انداز طلب پر ہوگئی تن سے جُدا ✗ یاد فرمانا تمھارا موت کا پیغام تھا

اسی قافیے میں جناب شہیرؔ کا ارشاد ہے ؎

جس کا کٹنا غیر ممکن جس کا سُننا ناگزیر وہ اجل کا وقت تھا وہ موت کا پیغام تھا

اب قریب قریب تمام مشاعرے کا لُطف آپ نے اُٹھا لیا۔ اب اس کو ختم ہونے دیجئے۔ افسوس چکبستؔ کے کلام سے مشاعرہ مستفیض نہ ہوسکا۔
لیجئے بعد شکریہ صدر مشاعرہ ختم کیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور دُنیا کے دوسرے ملک

ملک	ایکڑ	ملک	ایکڑ
برطانوی ہند	۶۲۰۷۲۵۰۰۰	یوروپ	۲۴۰۰۰۰۰۰۰
جزائر برطانیہ	۷۷۱۵۲۰۰۰	ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۹۰۳۲۶۹۰۰۰
آسٹریلیا	۲۲۹۷۰۸۲۰۰۰	جرمنی	۱۳۳۵۹۴۰۰۰
فرانس	۱۳۰۸۵۴۰۰۰	چین	۲۵۰۲۷۲۸۰۰۰
جاپان	۱۶۶۸۷۲۰۰۰	ہندوستان	۱۱۰۶۲۹۱۹۰۰۰

ہندوستان دُنیا کا ۱/۵ حصہ ہے۔ ہندوستان تمام یوروپ کے برابر ہے (روس کو چھوڑ کر)

ہندوستان امریکہ سے ۲ گنا بڑا ہے۔ ہند جاپان سے ۱۵ گنا بڑا ہے۔

ہند فرانس سے ۸ گنا بڑا ہے۔ ہند برطانیہ سے ۱۵ گنا بڑا ہے۔

صرف مدراس اور میسور ملکر جاپان کے برابر ہیں۔ صرف بمبئی اسپین اور پرتگال کے برابر ہے۔

ہندوستان میں ۶۷۷ ریاستیں ہیں۔

ہندوستان میں سات لاکھ دیہات ہیں۔ بہت زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی ہے

ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے صرف ۳۱ شہر ہیں۔

ایک مربع میل میں ۱۷۷ انسان بستے ہیں۔

غنچۂ پژمردہ

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی شاہجہانپوری)

آہ، یہ خاکِ چمن پر غنچۂ پژمردہ ہے — یا کسی ناکامِ الفت کا دلِ افسردہ ہے
کوئی داغِ آرزوئے بلبلِ دلگیر ہے — یا کسی حسرت زدہ کا کوکبِ تقدیر ہے
آہ نکلی ہے اسیروں کے دلِ ناشاد سے — اُڑکے آئی ہے چمن میں خانۂ صیّاد سے
دہر کی ناکامیوں کا یہ لبِ گفتار ہے — دامنِ گلشن پہ اشکِ نرگسِ بیمار ہے
اب کہاں گلزار میں وہ کیفِ صہبائے بہار — توڑ ڈالی ہے خزاں نے آج مینائے بہار
ملکِ عشرت میں سفیرِ رنجِ فردا ہے کوئی — اہلِ گلشن کے لئے پیغام لایا ہے کوئی
شمعِ کشتہ ہے مزارِ عاشقِ ناشاد کی — اِک نشانی ہے چمن میں ہستیِ برباد کی

حُسن کا جلوہ دکھا کر نرگسِ بیمار کو
آخری تسلیم کرتا ہے کوئی گلزار کو

اے چراغِ خانۂ اُمید و جانِ آرزو — تیرے دم سے تھا شگفتہ بوستانِ آرزو
نالہ کش ہیں تیرے غم میں خوشنوایانِ چمن — تیرا ماتم کر رہے ہیں سرو و ریحانِ چمن
میں بھی تیرے واسطے گریاں چمن زاروں میں ہوں — لالہ و گُل کی طرح تیرے عزاداروں میں ہوں

تیرا مُرجھانا مجھے اے راحتِ قلبِ حزیں
صورتِ داغِ عزیزاں ہے مصیبت آفریں

تیری رنگینی چمن میں جنتِ نظارہ تھی — تیرے کوچے میں کبھی بادِ صبا آوارہ تھی
شاخِ گلبن کو تری ہستی پہ کیا کیا ناز تھے — کس قدر دلچسپ تیرے حُسن کے انداز تھے
غم زدائے خاطرِ محزوں ترا دیدار تھا — تو چمن میں چارہ سازِ نرگسِ بیمار تھا
حیف ابھی گلشن میں عنبر بیز تیری بُو نہ تھی — مُسکراہٹ میں ادائے خندۂ دلجو نہ تھی
دیدۂ تر کیا کرے آنسو بہا کر رہ گیا — پھُول تو ہنسنے لگے تو مُسکرا کر رہ گیا

ایک دن برباد ہوگا جو یہاں آباد ہے برق کی چشمک بہارِ گلشن ایجاد ہے
دہر میں پھولوں کا بھی انجام ہونا ہے یہی عندلیبوں کو مگر گلشن میں رونا ہے یہی

"پھول تو کھِل کر بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھِلے مُرجھا گئے" (ذوقؔ)

کاش تو بھی فصلِ گل میں خندہ زن ہوتا کبھی پھول بن کر نازشِ رنگِ چمن ہوتا کبھی
اہلِ گلشن دیکھتے جلوے تری رعنائی کے کچھ دنوں تو بھی مزے لیتا چمن آرائی کے
جگمگاتا حُسن سے تیرے جو ایوانِ بہار باغباں کہتے تجھے شمعِ شبستانِ بہار
دیکھ کر شبنم ریاضِ دہر میں خنداں تجھے رونمائی میں عطا کرتی دُرِ غلطاں تجھے
تو بھی اِک آئینہ ہوتا بھر لیلائے بہار تیرے ساغر میں نظر آتا تماشائے بہار

حُسن میں تیرے نہاں ہوتی صفائے روئے دوست
عارفوں کو تیرے پیراہن سے آتی بوئے دوست

آہ۔ یہ ارماں بھی گویا اِک خیالِ خام تھا پھول ہونا تیرے حق میں باعثِ آلام تھا
جورِ گلچیں سے گلِ خنداں گریباں چاک ہیں وائے ناکامی چمن میں رہ کے بھی غمناک ہیں
پھول میں سُرخی نہ سمجھو بادۂ گلنار کی خونچکاں ہے پیرہن کاوش سے نوکِ خار کی
خار بھی گلشن میں ہیں جرصر بھی ہے گلچیں بھی ہے یوں ترا پژمردہ ہونا موجبِ تسکیں بھی ہے

شکوہ سنجِ گردشِ دوراں گلِ شاداب ہو
تو چمن میں بسترِ خاکی پہ محوِ خواب ہو

پیام آسودگی

کل صبح صحنِ باغ میں اِک شاعرِ صبور کہتا تھا یوں کہ سینۂ ظلمت ہے گنجِ نُور
مرہم کا اہتمام ہے ہر زخم کی خلش درماں کا سازوبرگ ہے ہر درد کا وفور
ہر آہ دل خراش ہے ہمرشتۂ نشاط ہر اشک لالہ رنگ ہے سرمایۂ سرور
ہر خار زار بیم ہے پیغمبرِ اُمید ہر وادیِ سیاہ ہے پروردگارِ طُور

بیداد زندگی سے اگر دردمند ہے
آسودہ رہ کہ داد ملے گی تجھے ضرور

چکبست

ہندوستان کی اقتصادی ترقی اور اسکی ضرورت

از مسٹر حلیم سیلمی ایم۔اے،ایل۔ایل بی

برطانوی عہدِ حکومت میں مالی انتظام اور مالی لوٹ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہوگئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے سیاسی عروج کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو مالی عروج بھی حاصل ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی حکومت کی بنیاد بھی مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی۔ مگر یہ حالت غدر سے پہلے بہت نمایاں تھی۔ غدر کے بعد اس لوٹ نے ایک ایسی صورت اختیار کرلی جو بظاہر تو خوشگوار تھی۔ لیکن درحقیقت پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضر تھی غدر کے بعد "ناقابل بادشاہوں" کی سلطنتوں کو برطانیہ کے زیر سایہ پناہ لینے کا سلسلہ قریب قریب ختم ہوچکا تھا۔ اس لئے برطانیہ کو فائدہ پہونچانے کے لئے آئے دن نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے۔ اور ہندوستان کے ذرائع پیداوار میں ترقی دینے کے بہانہ سے کئی خاص باتیں ہوئیں۔ مثلاً (۱) ریلوں کی تعمیر ہوئی (۲) کپاس کی پیداوار میں ترقی (۳) برطانوی کمپنیوں کو سہولتیں دے کر اُن کے سرمایہ سے ہندوستان میں کاروباری کارخانے قائم ہوئے (۴) ملک میں انگریزوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کام پر لگایا گیا۔ اور ہندوستانیوں کو حکومت میں کم سے کم دخل دیا گیا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی شور مچایا گیا کہ یہ انتہائی غریب ملک ہے اور اس کے ذرائع پیداوار بڑھانے اور صنعتی ترقی دینے کے لئے بیرونی سرمایہ کی سخت ضرورت ظاہر کی گئی۔ چنانچہ اسی بہانہ سے حکومت نے انگریزی کمپنیوں کو ہندوستان میں خاص سہولتیں مہیا کیں۔ جس سے ہندوستانی صنعتیں اور ہندوستانی تجارت تباہ و برباد ہوگئی۔

ریل کی تعمیر۔ ریل کی تعمیر کے سلسلہ میں ہندوستان والوں کے ساتھ بڑی بے انصافی اور بیدردی سے کام لیا گیا۔ ہندوستان کی تمام ریلیں بیرونی سرمایہ سے "تحفظ اور سود" کے وعدہ پر بنائی گئیں حالانکہ بیرونی سرمایہ کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں ان شرائط پر کافی روپیہ قرض مل سکتا تھا۔

سر آرتھر کاٹن اور دوسرے نامور انجنیروں کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں قیمتی ریلوں کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی بلکہ آمد و رفت کے لئے پختہ سڑکوں اور نہروں سے آسانی سے

کام لیا جاسکتا تھا۔ یہاں کی ریلوں وغیرہ پر روپیہ لگانا کتنا فائدہ بخش تھا۔ اس کے ثبوت کے لئے دارالعوام برطانیہ میں مسٹر سوفنٹ کے بیان کا دُہرا دینا کافی ہے جو ۱۲ اگست ۱۸۹۰ء میں ہوا تھا۔ اور جس کے مطابق ہندوستان میں ایک شلنگ۔ بیرونی سرمایہ پر آٹھ پنس منافع کا اوسط بتایا گیا تھا۔ ریل بنانے کی تہ میں سب سے بڑا خیال یہ پیش نظر تھا کہ ملک کے ذرائع آمد و رفت کو ترقی دے کر ہندوستان کی بیرونی تجارت کو فروغ دیا جائے اور انگلستان میں سستا گیہوں پہونچایا جائے۔ اس کے علاوہ انگریزی مصنوعات بھی آسانی کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ جائیں۔ اِس سے ہندوستان کی ملکی صنعت و حرفت کا تو بالکل خاتمہ ہی ہوگیا۔ البتہ ریلوں کی تعمیر سے انگلستان کو بہت زیادہ نفع پہونچا۔ ہندوستان کو بھی کچھ فائدہ ہوا۔ مگر نقصان کے مقابلہ میں فائدہ پاسنگ برابر بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ملک پر قرضہ کا بار بڑھنے کے علاوہ یہاں کی صنعتوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اس کے علاوہ ریلوں کی تعمیر میں بعض دیگر سیاسی مقاصد بھی پوشیدہ تھے۔

کپاس کی پیداوار انگریزی پارچہ بافی کی ترقی اور برطانیہ کے بنے ہوئے کپڑوں کی نکاسی کا واحد بازار ہندوستان ہے۔ حالانکہ کسی زمانہ میں یوروپ کی منڈیاں ہندوستانی کپڑوں سے پٹی پڑی تھیں۔ مگر اب کپاس پیدا کرنے والے صوبوں پر برطانیہ کو اقتدار حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں مسٹر کوبن نے مانچسٹر سے ایک اشتہار شائع کیا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ "سندھ اور پنجاب ہندوستان کی جان ہیں کیونکہ یہاں کی کپاس دُنیا بھر کے لئے کافی ہوسکتی ہے، کاش یہ برطانیہ کے قبضہ میں ہوتے۔"
یہ اشتہار لارڈ اسٹینلے کے نام سے معنون کیا گیا تھا جو اُس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے "بورڈ آف کنٹرول" کے صدر تھے اور بعد میں وزیر ہند مقرر کئے گئے۔ کچھ دنوں بعد سندھ اور پنجاب میں بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ اشتہار ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا گیا تھا۔ "یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہم لنکا شائر کی صنعتوں کے لئے مشرق میں بازار پیدا کریں اور اگر ہم ایسا کرسکیں گے تو یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ کیونکہ ہندوستان، امریکہ کے مقابلہ میں زیادہ اور سستی کپاس پیدا کرسکتا ہے۔ اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ ہندوستان میں کپاس کی کاشت کو اِس قدر ترقی دی جائے گی کہ ہم نہ صرف مشرق ہی میں انگلستان کے کپڑے بھیج سکیں۔ بلکہ امریکہ بھی ہمارا محتاج ہوجائے۔ اِس لئے ہمیں اِس مقابلہ میں حتی المقدور عجلت سے کام لینا چاہئے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم لوگ ہاتھ لگائیں اور کامیابی حاصل نہ ہو۔" اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے دس لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے ہندوستان میں کپاس کی پیداوار اور اسکی فروخت کو فروغ دینے کی غرض سے ایک کمپنی قائم کی۔

اس کے علاوہ ایک دوسری انجمن کپاس بھی موجود تھی جس کے صدر مسٹر چیتھم ممبر پارلیمنٹ تھے۔

جنھوں نے مسٹر اسمتھ کو ۱۸۵۹ء میں ایک خط میں لکھا تھا:۔

"ہم اس لئے امریکہ جاتے ہیں کہ وہاں ہم کو کپاس ارزاں ملتی ہے مشینیں بھی جیسی چاہیں وہاں بنا سکتے ہیں۔ مگر کپاس کی پیداوار بڑھانے کا مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اس لئے ہر ممکن کوشش ضروری ہے۔ بہرحال ہمارا خاص مقصد یہی ہے کہ چاہے جس جگہ سے ممکن ہو۔ ہم کپاس حاصل کریں۔ ہماری سمجھ میں ہندوستان کے سوا کوئی دوسرا ملک نظر نہیں آتا۔ جو امریکہ کا مقابلہ کر سکتے اس لئے تمہاری انجمن کا فرض ہونا چاہئے کہ اپنی تمام کوشش صرف ہندوستان پر صرف کرے"

یہ خط میرے خیال میں یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ انگلستان کے نزدیک ہندوستان کے کپاس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان نہ صرف کپاس کا وسادر تھا بلکہ انگلستان کے بنے ہوئے کپڑوں کی کھپت کی بھی گنجائش ہندوستان ہی میں ممکن تھی۔ انگلستان والے جتنا روپیہ ہندوستانی کپاس خریدنے میں ہندوستان کو دیتے تھے اُس کا دگنا بلکہ آٹھ گنا مع سود در سود ہندوستان میں کپڑے فروخت کر کے لے جاتے تھے۔

برطانی سرمایہ داروں کو سہولتیں جب سے ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہوا ہے یوروپینوں کو ہندوستانیوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہوئی۔ دراصل ہندوستان میں انگریز اپنے آپ کو خدا کے محبوب بندے سمجھنے لگے اور ہندوستان کی ہر چیز سے نفع حاصل کرنے لگے۔ اس پر لطف یہ کہ ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرنے لگے۔ چنانچہ نیل کے کام میں ہزاروں لاکھوں آدمی لگ گئے لیکن اس سلسلہ میں کاشتکاروں اور مزدوروں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے گئے وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ چاء کے کاروبار نے بھی ہندوستان میں خوب ترقی کی۔ مگر چاء کے باغوں میں کام کرنیوالے مزدوروں کی حالت بھی بیان کے قابل نہیں۔

انگریزوں کی کھپت انگریزی راج قائم ہونے کے بعد ہندوستان میں تعلیم یافتہ انگریزوں کی لامحدود کھپت کا دروازہ کھل گیا۔ ہندوستان میں ایک انگریز تعلیم یافتہ شخص کو جو اُجرت ملتی ہے وہ اُسے دُنیا کے کسی دوسرے ملک میں نصیب نہیں ہو سکتی

غرض ہندوستان میں انگریز پہلے پہل تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہاں کے بادشاہوں نے انھیں آنکھوں پر جگہ دی۔ اس کے بعد انھوں نے سیاسی وقار حاصل کیا۔ اور پھر حکومت اور بعد میں شہنشاہیت کے بھی مالک ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود ابتک تجارت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اب ہندوستانیوں کی بھی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اور انکو بھی ملکی ترقی کا راستہ معلوم ہو گیا ہے۔ مگر جس ہمت و استقلال اور اولوالعزمی سے انھیں اس راستہ پر چلنا چاہئے اُس پر وہ چل نہیں رہے ہیں۔ حالانکہ پچھلی جنگ نے اور اُس کے بعد اس جنگ نے ملک کی صنعتی و تجارتی ترقی کے بالکل غیر معمولی موقعے پیش کئے ہیں۔ کاش ہم ان موقعوں سے پورا فائدہ اُٹھاسکیں تاکہ ملک کا افلاس تھوڑا بہت تو دور ہو سکے۔[1]

[1] اس مضمون میں میجر باسو کے ایک انگریزی آرٹیکل سے مدد لی گئی ہے۔ (حلیم سلیمی)

راہِ عمل

(از حضرت محمود اسرائیلی)

صاحبِ ہوش بھی دیوانے ہوئے جاتے ہیں
ہموطن ہو کے وہ بیگانے ہوئے جاتے ہیں
بلبلیں سوگ میں بیٹھی ہیں چہکتی ہی نہیں
منھ پھُلائے ہوئے کلیاں ہیں مہکتی ہی نہیں
جتنے گلزار ہیں ویرانے ہوئے جاتے ہیں!!!

بلبلیں روٹھ کے گلشن سے کدھر جائیں گی؛
بے وطن ہو کے رہیں گی وہ جدھر جائیں گی؛
دشت میں جا کے بسیں تو وہ نہ راس آئیگا
ہمنوا کون وہاں ہوگا جو پاس آئے گا؛
بس یہی ہوگا کہ گھُٹ گھُٹ کے وہ مر جائیں گی!!!

کیوں نہ گلزار میں پھر چہچے بلبل کے رہیں
کیوں نہ دلدادہ نواسنجِ چمن گل کے رہیں؛
گُل تو گُل، سبزۂ گلشن بھی نہ بیگانہ رہے
لبِ سوسن پہ رواداری کا افسانہ رہے
سب جوانانِ چمن چین سے مِل جُل کے رہیں

"دل"

(حضرت جوش ملیح آبادی)

پہلو میں مرے دیدۂ پرنم ہے کہ دل
معبود یہ مقیاسِ تپِ غم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کچھ تو بال پڑ جاتا ہے
یہ شیشۂ ناموسِ دو عالم ہے کہ دل

ظلمت کی رونمائی کو کچھ نور چاہیئے
رونے کو بھی تو خاطرِ مسرور چاہیئے

نور جہاں کی شاعری

از سید رضا قاسم مختار، پلامؤں (بہار)

گر از دل من روشنی نور بر آید ہر ذرہ تجلّی دہ صد طور بر آید

شاہی محل میں پرورش اور سلیقہ مند و ذی فہم ماں کی تربیت و نگہداشت کے باعث نور جہاں نے اپنی کمسنی ہی میں اتنی تعلیم حاصل کرلی تھی جو دوسری لڑکیوں کو عام طور پر نصیب نہیں ہوتی۔ اُسکے بعد ایک معمر شخص مرزا ہادی نامی اس کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے۔ جن سے اُس نے فارسی کی درسی کتابوں کے علاوہ عربی میں بھی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اور تیر اندازی، شہسواری، تفنگ بازی و دیگر فنون سپہگری اپنے باپ بھائی سے اور ہندوانہ مذاق کے ہنر ہندو رانیوں سے سیکھ لئے تھے۔ یہاں تک کہ دس سال کی عمر ہی میں اُس کی تہذیب، سلیقہ، قابلیت اور سگھڑاپا کا شاہی محل میں چرچا ہوگیا تھا۔ اور شروع ہی سے اُس کا ایک خاص رسوخ و وقار قائم ہوگیا تھا۔

حُسنِ اتفاق سے نور جہاں کو بچپن ہی سے ایسے اُستادوں سے تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ جو اُس زمانہ کے زبردست شاعر تھے۔ چنانچہ گو اُس نے کسی اُستاد سے فنِ شاعری حاصل نہیں کیا۔ لیکن اُن کے فیضِ صحبت سے اُسے شعر فہمی نیز شعر گوئی میں کافی مہارت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ نور جہاں نے اپنے شوہر علی قلی خان معروف بہ شیر افگن کے قتل پر اُس کا ایک مرثیہ لکھا تھا۔ مگر اب اُس مرثیہ کا ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہے۔

نور جہاں کی شاعرانہ ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کی ہمعصر خواتین بھی بہت خوشگو اور پُرگو شاعرہ تھیں۔ اُن کے ساتھ رہ کر ناممکن تھا کہ نور جہاں کا یہ شوق ترقی نہ کرتا۔ مثلاً نور جہاں کے زمانہ میں جہانگیر کی ایک منکوحہ بی بی فتار النسار بیگم نامی تھی۔ جس کے دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

ہنگام سحر دلبر من جلوہ گر آمد صد فتنۂ خوابیدۂ محشر بسر آمد

مکن تکرار ہر دم اسے نفس درس محبت را مدہ در ہر دو عالم تشنۂ صہبائے غیرت را

جہانگیر ہی کے حرم میں ایک اور بیگم حیات النسار نامی بھی تھیں۔ جن کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

چہ سازم طوفِ دیر و کعبہ و بُت خانہ و مسجد — بگردِ چشم و ابرویت دلم ہر لحظہ میگردد

بیا زاہد کہ جامِ بادۂ گلگوں بگردانم — مرو در کعبہ کانجا نیست جز خونِ جگر خوردن

مرزا عبدالرحیم خانخاں کی ایک لڑکی جاناں بیگم نامی تھی جو شاعرہ ہونے کے علاوہ بڑی عابدہ و زاہدہ بھی تھی، چنانچہ ایک شعر جو اُس کی طرف منسوب ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

عاشق ز خلقِ عشقِ تو پنہاں چساں کند — پیداست از دو چشم ترش خون گریستن

بیرم خاں کی زوجہ سلیمہ بیگم کو بھی شاعری سے خاص مذاق تھا۔ اُس کا ایک شعر یہ ہے ؎

کاکلت را گر ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام — مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

حبیب اللہ ترک کی زوجہ فصیحہ خانم بھی اُسی زمانہ کی ایک خاتون ہیں۔ اُن کی یہ رُباعی بہت مشہور ہے ؎

روزے کہ بخوانِ وصل مہماں گشتم — شرمندہ از انتظارِ مہماں گشتم

زاں چشمۂ حیواں کہ کشیدم آبے — از زندگیٔ خویش پشیماں گشتم

نورجہاں کا کوئی دیوان مطبوعہ یا غیر مطبوعہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن بعض اشعار جو اُس کے نام سے منسوب ہیں اکثر مُصنفین و مُورخین نے اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں جن سے اُس کی شاعرانہ قابلیت پر ایک گونہ روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ انھیں میں سے بعض اشعار ذیل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

ہنگامِ سحر دلبرِ من جلوہ گر آمد — جاں بر لبم از قالبِ فرسودہ بر آمد

غافل منشیں اے دلِ غفلت اثرِ من — برخیز کہ ہنگامِ تقضائے بسر آمد

دل بصورت نہ دہم ناشدہ سیرت معلوم — بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم

زاہدا ہولِ قیامت مفگن در دلِ من — ہولِ ہجراں گذرا ندیم و قیامت معلوم

برقعِ بُرخ افگندہ برد باز بہ باغش — تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

ز شرم آب شدم کاب را شکستے نیست — بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

ہنوز آں طفل خندیدن نہ داند — نگہ دزدیدن و دیدن نہ داند

عشقش چناں گداخت تنم را کہ آب شد — گردے کہ ماند سرمۂ چشمِ حباب شد

شرارم شعلہ ام داغم کبابم جلوۂ طورم — طپید نہائے برقم اضطرابِ نبضِ رنجورم

نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم — بلے از مردمِ بے دست و پا دیگر چہ می آید

گرہ ز کار چو نکشادہ بے قراری ما — مگر چہ سود دلا از فغان و زاری ما

گذشت وقتِ خزاں موسمِ بہار آمد — ہزار نخلِ خزاں گشتہ ام ببار آمد

سلک مروارید برفرق سرش دانی کہ چیست | تشنگان شوق را جز زیست از آب حیات
نیست فوارہ کہ بینی بہ سر آب رواں | آب از گرمیٔ ایں فصل برآوردہ زباں
لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی | دہاں بر چہرہ زخمے بود بہ شد
ستارہ نیست بدیں طول سر برآوردہ | فلک بہ شاطری شاہ پر برآوردہ
کشادہ غنچہ اگر از نسیم گلزار است | کلید قفل دل ما تبسم یار است
تہ زلف خالش بلائے نہان است | مترس از بلائے کہ شب درمیان است
ایں خانہ برانداز کہ در خانۂ زین است | معمار تمنائے من خاک نشین است
دقیقہ ہائے معانیش در سواد حروف | چو در سیاہی شب روشنی پروین است
عشق را اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع | ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
نورجہاں گرچہ بصورت زن است | لیک بمرداں زن شیر افگن است

قبل کی سطروں میں نورجہاں کے زمانہ کی محل کی بعض خوشگو شاعرہ عورتوں کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے مگر نورجہاں کی فکر بلیغ اور خداداد ذہن رسا نے معاصر عورتوں میں سے کسی کی قابلیت کا چراغ اپنے مقابلے میں روشن ہونے نہ دیا۔ اسی سبب سے جہانگیر اُس کا ایسا عاشق اور دیوانہ تھا کہ شاہی فرمانوں کی پیشانی پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی جاتی تھی:۔

"بحکم علیہ عالیہ مہد علیا نورجہاں بادشاہ"

اور سکہ رائج الوقت میں بھی اُس کا نام شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے ساتھ مسکوک ہونے لگا تھا اور یہ عبارت کندہ ہونے لگی تھی ؎

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور | بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

نورجہاں اپنے وقت میں بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی میں بھی بہت مشہور تھی۔ اِس سلسلے میں بہت سے لطیفے مشہور خاص و عام ہیں۔ مثلاً

ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہوا۔ اور عید کا چاند نکلا تو شہنشاہ جہانگیر نے چاند دیکھکر نورجہاں سے کہا۔ ع

ہلال عید براوج فلک ہویدا شد

نورجہاں نے فوراً مندرجہ ذیل مصرعہ برجستہ جواب میں کہا۔ ع

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ایک دفعہ بادشاہ باغ کی سیر میں مصروف تھا۔ نورجہاں بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اسی اثنار میں

چار عورتیں محل شاہی کے جھروکے پر کھڑی نظر آئیں۔ بادشاہ نے اُن عورتوں کو دیکھ کر کہا۔ ع

ہر چار عناصر گرامی ہستند

نور جہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع :-

شہہ جان ہمہ ہمہ ز شہہ سرمستند

کہہ کر شعر کو مکمل کر دیا۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہانگیر سفید حریر کی قبا زیب تن کئے تھا جسمیں لعل یمانی کے بوتام لگے ہوئے تھے نور جہاں نے دیکھتے ہی مندرجہ ذیل شعر موزوں کر دیا ؎

ترا نہ تکمۂ لعل است در قبائے حریر شد است قطرۂ خون منت گریباں گیر

ان چند مثالوں سے نہ صرف نور جہاں کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

آخر میں ارباب فکر و تحقیق سے استدعا ہے کہ جس طرح اکثر قدما کے کلام تحقیق و کوشش سے ڈھونڈھ کر نکالے گئے ہیں۔ اگر اُسی طرح نور جہاں کے کلام کی فراہمی میں بھی کوشش و تحقیق سے کام لیا جائے تو اس خوشگو اور خوش فہم ملکہ کی شاعری کے جواہر پارے بھی جو ہنوز لامعلوم ہیں منظر عام پر آجائیں۔

(از حضرت رہبر بی۔ اے لاہور)

دل نہیں دل! یہ ماجرا کیا ہے؟ محشر ایسا بپا ہوا کیا ہے؟
باتوں باتوں میں روٹھ جاتے ہیں میرے اللہ انھیں ہوا کیا ہے؟
خیر ناراضگی سہی مجھ سے یہ تو کہہ دو میری خطا کیا ہے؟
چھوڑو عہد گذشتہ کی باتیں ایسی باتوں میں اب دھرا کیا ہے؟
دل لگی تھی جو، سوز دل ہے اب ابتدا کیا تھی، انتہا کیا ہے؟
عشق نے حسن کی بنا ڈالی گر عقیدت نہ ہو خدا کیا ہے؟

ایک احساس ہی تو ہے رہبر
ورنہ اچھا ہے کیا بُرا کیا ہے؟

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے)

کوہ آبو کی ایک چوٹی پر — جس کے دامن میں تھے بسے دیہات
ایک دن چڑھ گیا اکیلے میں — آمنے سامنے تھے جب دن رات

تھا وہ اُٹھتی بہار کا موسم[1] — حُسنِ فطرت کا ایک ریلا تھا
کوئی میرا مخل نہیں تھا وہاں — مختصر یہ کہ میں اکیلا تھا

کُرۂ ارض تھا مرا اسٹول — اور آنکھوں میں تھی بسیط فضا
گویا پہنائے کائنات میں واں — میں اکیلا ہی ذاتِ واحد تھا

میری آنکھوں سے اُڑ کے میری نگاہ — جا رہی تھی اُفق کے بھی اُس پار
ایسے عالم کو جس کی سرحد کے — وہم میں بھی نہ آسکیں آثار

دیکھ کر یہ سکوتِ لاہوتی — کیا بتاؤں ہوا مرا کیا حال
دونوں آنکھیں تھیں محوِ روحِ خموش — میں تھا اور ایک شاعرانہ خیال

کہ مری سانس روح کو لے کر — ہو فضائے بسیط میں تحلیل
اور توحید کی بہم پہونچے — اس طرح سے مجھے نئی تاویل

ناگہاں بول اُٹھا یہ دل کا طبیب — ہے یہ تمثیل بھی کوئی تمثیل
عقل سے دور اور یقیں سے قریب — دیکھ پہنائے عالمِ تخئیل

اس سے بڑھ کر بھی ایک عالم ہے — جو بہت دُور ہے خرد سے بھی
پہلے زینے سے مل گئیں جس کے — آخری سیڑھیاں محبت کی

یعنی جس طرح یہ فضائے بسیط — رہے بہت دُور اِن نگاہوں سے
یونہی دنیائے کیف بھی شاید — ہے بہت دُور، سرد آہوں سے

---

[1] راجپوتانہ میں موسم گرما کا مستقر

ہولی

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

پھاگن آیا ہولی آئی ہولی نے اک دھوم مچائی
ہولی آئی رنگ برنگی ہولی کھیلیں ساتھی سنگی
ہولی کا چرچا ہے گھر گھر ہولی چڑھی ہے سب کے سر پہ
ہولی کی ہے شان نرالی اودی، نیلی، پیلی، کالی
رنگے ہوئے آنگن اور در ہیں ہولی کے چھینٹوں سے تر ہیں
ایک نے رنگ بھری پچکاری رہ چلتی کے مکھ پر ماری
بھیگ گئی ساری اور چولی برا نہ مانو یہ ہے ہولی
ہولی کے انداز نئے ہیں ہر سندری کے ناز نئے ہیں
ایک نے کی کچھ ہاتھا پائی لپٹ جھپٹ پی کو آگے آئی
ایک کے سر سے سرکی ساری ایک خوشی سے ہے متواری
لو ہاتھوں کے کنگن چھوٹے لو مالا کے منکے ٹوٹے
کوئی کوئی برہا کی ماری چھپ کر بیٹھی ہے بیچاری
وہ اپنا من مار چکی ہے جیون بازی ہار چکی ہے
ہولی نے کیا رنگ کھلائے آپس میں سب یار ملائے
ایک نے منہ سے جام لگایا ایک نے ہاتھ آگے پھیلایا
ایک بنا پی کر مستانہ ایک نشے میں ہے دیوانہ
ایک ابھی تک گھوٹ رہا ہے ایک زمیں پر لوٹ رہا ہے
ہولی کی رنگت ہے نیاری ہولی کی رت پیاری پیاری
برے نہیں ہولی کے چھینٹے ساری اور چولی کے چھینٹے

ہولی کھیلو، ہولی گاؤ
ہولی کی تم موج اڑاؤ

جنگ عظیم کے بعد کا جرمنی

از مسٹر تارا شنکر ناشاد ایم۔ اے ایل ٹی

بائیس۲۲ سال ہوئے کہ قسمت کی نارسائی یا اقوام عالم کی متحدہ مخالفت کی بدولت چار۴ سال کی بے پناہ جنگ وجدل کے بعد ۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو شہنشاہ ولیم دوم کو مع اپنے ولیعہد کے جرمنی سے فرار ہوکر ہالینڈ میں پناہ گزین ہونا پڑا تھا۔ اسی دن جرمن سلطنت کا بکھرا ہوا شیرازہ ایک عرصہ کے لئے بالکل ہی منتشر ہوگیا۔

جنوری ۱۹۱۹ء میں جو انتخابات ہوئے اُن سے یہی ظاہر ہوا کہ اہل جرمنی شخصی حکومت سے عاجز ہوگئے ہیں چنانچہ ۶ فروری کو ویمار ریپبلک نے فریڈریک ایبرٹ[1] کو سات سال کے لئے جرمن ریشاغ کا پہلا صدر چنا۔ ایبرٹ نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ مارشل فان ہینڈن برگ[2] کی جنگ عظیم سے واپس شدہ فوج کو برخاست کرنا تھا۔ چنانچہ گو اس فوج کے بہت سے سپاہیوں نے اپنی پرانی طرزِ رہائش اختیار کرلی۔ پھر بھی ہزاروں آدمی بالکل بیکار ہوگئے کیونکہ جرمنی کے تمام کارخانے بند ہوچکے تھے۔ مال کی برآمد قطعاً مسدود ہوگئی تھی۔ اور ملک میں بیکاری اور مفلسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اور برطانیہ کی بحری ناکہ بندی ابھی جاری تھی۔ اس لئے جرمنوں کو خورد و نوش کا سامان بھی بہم نہ پہونچتا تھا۔

غرض پچھلی جنگ کے بعد جرمنی کی حالت ہر طرح سے قابل رحم ہوگئی تھی۔ دن دھاڑے رہزنی، لوٹ مار کا بازار گرم رہتا تھا۔ ملٹری افسروں کو بھی لوگ اُن کی موٹروں سے شارع عام پر گھسیٹ کر لوٹ لیتے تھے۔ آخر ویمار گورنمنٹ کو اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے پولیس کو توپوں اور بندوقوں کے ذریعہ امن قائم رکھنے کا حکم دینا پڑا۔ دن رات بندوقوں کی فائرنگ سے کانوں پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہوگئی تھی۔

ایسی صورت میں سب سے بڑی آفت بینکوں پر آتی ہے۔ جنگ سے قبل جرمنی میں سونے کے سکّوں کا رواج تھا برٹش ساورن کی طرح وہاں بھی جرمن مارک چلتا تھا۔ جس پر قیصر جرمنی کی تصویر بنی رہتی تھی۔ چونکہ یہ سکّے زیوروں کے سونے کی شکل میں آسانی سے تبدیل کئے جاسکتے تھے اور لڑائی کے دنوں میں باہر سے سامان خریدنے کے لئے سونے چاندی کے سکّوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے برٹش اور جرمن حکومتوں نے بینکوں سے سونا اور چاندی لیکر اُنکی جگہ کاغذ کے نوٹ جاری کئے تھے۔ جن پر لکھا رہتا تھا کہ گورنمنٹ کے کسی آفس میں وہ قیمت جو نوٹ پر لکھی ہوئی ہے،

---

[1] Frederick Ebert
[2] Marshal Von Hindenberg.

عند المطلب نوٹ لے جانے والے کو مل جائے گی۔ مگر جنگ کے بعد برٹش نوٹوں کی ساکھ تو برابر بنی رہی لیکن جرمن نوٹوں کی قیمت بالکل ہی گر گئی۔ کیونکہ خود جرمن گورنمنٹ کی ساکھ شکست کے بعد باقی نہیں رہی۔ اس طرح جرمن نوٹ کوڑیوں کے مول بکنے لگے۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۲۳ء کو ایک ڈالر (امریکن سکّہ جس کی قیمت دو روپیہ یا پانچ شلنگ کے قریب ہوتی ہے اور جو پہلے پانچ مارک کے برابر سمجھا جاتا تھا) ۲۵ کھرب مارکس سے بدلا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جرمنی میں اب کوئی سکّہ رائج نہ تھا۔ دکانداروں نے مال کی خرید و فروخت چیزوں کے باہمی تبادلہ سے شروع کی یعنی مکھن والا اپنا مکھن دیکر روٹی والے سے روٹی لیتا تھا۔ مگر اسوقت دقت یہ تھی کہ مثلاً ایک پیانو والے کو روٹی لینا ہے لیکن روٹی والے کو پیانو کی ضرورت نہیں۔ اس لئے بہت سے لوگوں کو سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ ادھر کرایہ پر سواری چلانے والوں کو (جیسے بس اور موٹر والے وغیرہ) مجبوراً مارکس لینا پڑتے تھے مگر وہ ان کی قیمت سمجھتے تھے اس لئے خوب کس کر چارج کرتے تھے۔

جن لوگوں کی رقمیں بینک میں جمع تھیں۔ اُن کا سارا اندوختہ گویا سوخت ہوگیا۔ غرض جنگ عظیم کے اثرات بد سے جرمنی کا کوئی متنفس سوا جنکرس (زمینداروں کے جنکی زمین کی قیمتیں وہی رہ گئی تھیں) اور قرضداروں کے جو اپنا قرضہ بہ آسانی کوئی چھوٹی موٹی چیز دیکر ادا کرسکتے تھے، نہ بچ سکا۔ ۱۹۲۴ء میں ایک بس والے نے ۶۵ے مارکس جو اُس پر واجب الادا تھے، ایک ٹکٹ سفر کے لئے دیکر ادا کئے تھے۔

ایسی متزلزل حالت کب تک برداشت کیجاسکتی تھی۔ اس لئے ویمار گورنمنٹ کو ختم کردینے کیلئے بہت سی خفیہ پارٹیاں کام کرنے لگیں۔ چنانچہ کیمونسٹ فرقہ نے ۲۲-۱۹۲۱ء میں روہر اور تھرنجیہ میں بغاوت کی اور ۱۹۲۳ء میں میونخ میں ہر اڈولف ہٹلر نے پہلی بار اپنی باوامی نیشلسٹ سوشلسٹ پارٹی کے ذریعہ جرمن گورنمنٹ کو برباد کرکے خود عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہی۔ جرمن گورنمنٹ کی مصیبتوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اِس مختصر مضمون میں اُسے واضح طور پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہر نوع اندرونی پریشانیوں کا تھوڑا بہت تذکرہ آپ سُن چکے ہیں۔ اب بیرونی پریشانیاں ملاحظہ فرمائیے۔

درسائی کا صلحنامہ ہار جیت کا صلحنامہ تھا۔ ۲۸ر جون ۱۹۱۹ء کو جرمن گورنمنٹ نے اپنی شکست تسلیم کرکے اس صلحنامے پر دستخط کئے۔ لیکن گو لڑائی بند ہوگئی تھی۔ پھر بھی سرحدوں پر انگریزی، فرانسیسی اور بلجین فوجیں ڈیرا ڈالے تھیں کیونکہ جرمنی ابھی لڑائی کا کل ہرجہ ادا نہ کرسکا تھا۔

۱۹۲۴ء میں امریکن جنرل ڈیواس کی صدارت میں متحدہ طاقتوں نے یہ طے کیا کہ جرمنی کو سونا قرض دیا جائے تاکہ وہ اپنا سکّہ جاری کرسکے چنانچہ رٹن مارک کی جگہ ریشتاغ مارک ملنے لگا جسکی قیمت جنگ کے پہلے والے مارک کے برابر تھی ۱۹۲۵ء میں ایبرٹ کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کی جگہ بوڑھا مارشل فان ہنڈن برگ صدر منتخب ہوا۔ اس کے

Thurmgia. Ruhr.

وقت سے جرمنی نے دوبارہ ترقی کرنا شروع کی۔ یہاں پر ہر ہٹلر کا مختصر تذکرہ بھی بے موقع نہ ہوگا۔ کیونکہ جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی ترقی ہٹلر کی ترقی کے مترادف ہے

۱۹۲۰ء میں ہٹلر اُن سات ادمیوں میں ایک تھا جنھوں نے دیمار گورنمنٹ کو الٹ دینے کی سازش کی تھی ۱۹۲۱ء میں وہ پبلک میں تقریریں کرنے لگا۔ لیکن اُس کے لکچروں میں اکثر ہلڑ مچ جایا کرتا تھا۔ اسلئے اُس نے والنٹیروں کی ایک مختصر مگر منظم فوج تیار کی جس کا نام اُس نے اسٹارم ٹروپ رکھا۔ یہی فوجی دستہ اُس کے جلسوں میں امن قائم رکھتا تھا۔ ۹ نومبر ۱۹۲۳ء کو اُس نے دوبارہ میونخ میں بغاوت کی۔ لیکن اس کا کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا۔ پولیس نے اُس کی فوج پر گولیاں چلائیں اور آخرش اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل جاکر اُس نے اپنی عجیب وغریب کتاب "میری جدوجہد"[۱] لکھی۔ جو یوروپ کی آٹھ مختلف زبانوں میں تین لاکھ کی تعداد میں شائع ہوئی اور جس سے ہٹلر کو پانچ لاکھ ساٹھ ہزار پونڈ کا نفع ہوا۔

۱۹۲۴ء میں جرمن مزدور پارٹی کا نام نازی پارٹی پڑ گیا۔ اور اس پارٹی کا نصب العین "جرمنی جرمنوں کیلئے ہے" قرار دیا گیا۔ اور اُس نے اپنے پچیس[۲] بنیادی اصول قائم کئے۔ جن کا مقصد درسائی اور سنیٹ جرمین[۳] کے صلحناموں کی منسوخی، جرمن نوآبادیات کی واپسی، جرمنی سے یہودیوں کا اخراج، سُود پر پابندی، رومی قانونوں کی جگہ جرمن قانون کا نفاذ، اخبارات کو بنانا اور اسی قسم کی دوسری باتیں تھیں۔ ۱۹۳۲ء تک ہٹلر کی اس پارٹی میں تقریباً سوا نو لاکھ ممبر ہو گئے۔ جس کے بعد اُس نے جرمنی کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے کوشش شروع کی۔

مارچ ۱۹۳۲ء کے انتخاب میں جب ہنڈن برگ جیت گیا تو ہٹلر کے ووٹ اس سے کچھ ہی کم تھے لیکن اسوقت ہنڈن برگ نے ایک معمولی لینس کارپورل کو چانسلر کا بڑا عہدہ دینا مناسب نہ سمجھا لیکن اگلے سال یعنی ۱۹۳۳ء میں ہٹلر ریشتاغ کا چانسلر بن ہی گیا۔ اسی سال ریشں کی عمارت میں آگ لگ گئی۔ اس لئے جب اوپرا ہاؤس میں ریشتاغ بیٹھی۔ تو ہٹلر کو ۲۸۸ ممبروں کی حمایت حاصل تھی۔ چنانچہ ہر ہٹلر نے اُس سے خوب فائدہ اُٹھایا اور جرمنی کی تمام دوسری سیاسی پارٹیوں کو کامیابی کے ساتھ دبا دیا۔

۱۹۳۴ء میں نازی پارٹی کے اندر خود اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس لئے خود ہٹلر نے اپنی پارٹی کی صفائی[۴] شروع کی۔ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو قریب دو سو جرمنوں کو انھیں کی گھروں میں قتل کر دیا گیا۔ ان مظلوموں میں چند ہستیاں جنرل روہم جیسے موثر افسران کی بھی شامل تھیں۔

۱۹۳۵ء میں فان ہنڈن برگ لقمہ اجل ہوگیا جسکے بعد ہر ہٹلر کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہا۔ اور وہ آسانی سے جرمنی کا پریسیڈنٹ منتخب ہوگیا۔ اُس نے کسی دوسرے کو چانسلر نہ مقرر کر کے خود ہی چانسلر اور پریسیڈنٹ

---

[۴] Purge [۳] St. Germain [۱] Mein Kampf [۲] Storm Troop

دونوں کا لقب اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی نازی پارٹی کو اسقدر مضبوط بنا لیا کہ چند ہی دنوں میں یہ پارٹی جرمنی بھر میں چھا گئی۔ اِس پارٹی کی چند سربرآوردہ ہستیاں فیلڈ مارشل گورنگ، گوبلس، ہملر وغیرہ ہیں۔ جنیں سے ہر ایک حب الوطنی اور جانبازی کی آپ اپنی مثال ہے۔ یہ سب ہٹلر کی کورانہ تقلید اور ہر حکم کی تائید، ہر اشارہ کی تعمیل اپنا قومی و ملکی فرض سمجھتے ہیں۔ ہر ہٹلر معمولی گفتگو میں ہکلاتا ہے لیکن ریڈیو پر براڈ کاسٹ کرتے وقت اُس کی آواز بڑی ہیجان انگیز اور بیحد موثر ہو جاتی ہے۔ اسوقت اُس کے وفاداروں میں جرمنی کے تمام نوجوان شامل ہیں۔ وہ یہودیوں کا جانی دشمن ہے اور اُن پر طرح طرح کے ظلم و ستم کئے ہیں۔ مگر جرمنوں کو اُسکی یہ کارروائی بہت پسند ہوئی۔ گو اور تمام دُنیا اس کے مظالم سنکر کانپ اٹھی۔ اسکی خاص وجہ یہ ہے کہ جب مارک کی قیمت بالکل گھٹ گئی تھی تو یہودیوں نے بے شمار دولت ہونے اور جرمنوں کو سخت تکلیف میں دیکھنے کے باوجود غیر ملکی لوگوں کی طرح جرمن مارک لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اِس لئے جرمنوں کا خیال ہو گیا ہے کہ ان کی بربادی کے سب سے بڑی باعث یہودی ہی ہیں۔ اِسی لئے ہٹلر نے یہودیوں کو جرمنی سے خارج کر دیا ہے۔ دُنیا کے تمام لوگ یونیفارم[1] پسند کرتے ہیں، چنانچہ ہٹلر نے بھی اپنی پارٹی کو ایک خاص قسم کی چمکدار پوشاک دے رکھی ہے اور وہ خود بھی یہی پوشاک پہنتا ہے، نازی پارٹی کے متعلق معلومات بہم پہونچانا اور عام لوگوں میں اس کی بابت جوش قائم رکھنا ڈاکٹر گوبلس کے سپرد ہے۔ اُس نے عام باشندوں کو ریڈیو کے سستے سٹ دے رکھے ہیں۔ اور انھیں مشینوں کے ذریعہ ہٹلر اپنی زہریلی تقریریں نشر کیا کرتا ہے۔

نازی گورنمنٹ اپنے یہاں کے بچوں کو تعلیم بھی نئے ڈھنگ پر دیتی ہے۔ انھیں شروع ہی سے یہ سکھلایا جاتا ہے کہ جرمن قوم کے مقابلے میں دُنیا کی تمام دوسری قومیں ہیچ اور بزدل ہیں۔ یو۔ پی کانگریس گورنمنٹ کے سکریٹری مسٹر جین جب جرمنی سے واپس آرہے تھے تو ایک جگہ انھیں چند جرمن لڑکیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا، تو اُن سے لڑکیوں نے کہا: "برطانیہ اب بوڑھا ہو گیا۔ اس میں دم باقی نہیں ہے۔ روس جسیم مگر کمزور اور پولے ہیں، اٹلی اور فرانس بھی جرمنی کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔ پھر بتلائیے ہمارا مقابلہ کون کرے گا؟"

ڈاکٹر گوبلس نے بھی اِس بات کو کئی بار عام جلسوں میں دُہرایا ہے کہ ضبط اور طاقت، دو ہی چیزوں کی بدولت دُنیا میں ترقی ہو سکتی ہے اور جرمنی کے پاس اِس وقت یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

غیر ملکی معاملات میں ہر ہٹلر "پان جرمن اسٹیٹ" کا قائل ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ دُنیا کے تمام ملک جہاں جہاں جرمن آباد ہیں، جرمن ریشاغ کے ماتحت ہو جائیں۔ ایسا کرنے میں اُسے ایک نہیں بیسیوں عہدنامے توڑنے کی ضرورت پڑی۔ مگر اس کو اسمیں کوئی تکلف یا تکلیف نہیں ہوئی۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں میں اُس نے جرمنی کی ہوائی طاقت میں اضافہ کا اعلان کیا، اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ رائن لینڈ، آسٹریا، چیکوسلاویکیا اور میمل لیکر جب پولینڈ میں ڈینزگ پر حملہ کیا تو جنگ چھڑ گئی۔ اب دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟

[1] uniform.

رفتارِ زمانہ

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس بڑے جوش و خروش سے ہوئے۔ کانگریس کا ۵۳ واں اجلاس امسال رام گڑھ میں ہوا جہاں اس موقعہ کیلئے ایک نیا قصبہ آباد کر دیا گیا تھا ۔۔۔ سبجکٹ کمیٹی وغیرہ کے اجلاس تو خیر و خوبی سے ہو گئے مگر کھلے اجلاس کے وقت بے موقع بارش نے سارے انتظامات درہم و برہم کر دیے۔ تاہم لیڈران وحامیانِ کانگریس نے جس ہمت و استقلال سے اس ناگہانی زحمت کا مقابلہ کیا وہ ہمارے لئے بہت حوصلہ افزا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پریسیڈنٹ کانگریس اور بابو راجیندر پرشاد صدر استقبالیہ کمیٹی کی تقریریں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ ان کی چھپی ہوئی کاپیاں تقسیم کر دی گئیں۔ بابو راجیندر پرشاد کی تقریر بڑی عالمانہ تھی جس میں اُنھوں نے بہار کی پچھلی تاریخ سے یہ بات بخوبی ثابت کر دی کہ ہزارہا سال پہلے بھی ہندوستان خصوصاً بہار میں جمہوری اصولوں پر حکومت ہوتی تھی۔ مولانا آزاد کی تقریر آزادی اور قوم پرستی کا ایک روح پرور پیغام ہے۔ اس تقریر میں اُنھوں نے تین باتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:۔

(۱) ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات (۲) ہندوستانیوں کا اپنے لئے آئین حکومت بنانے کا حق۔

(۳) قلیل تعداد والی جماعتوں کی حیثیت اور اُن کے حقوق کی حفاظت۔

ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے موجودہ جنگ کے متعلق کانگریسی نقطۂ خیال کی توضیح کر کے کہا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے برطانیہ کے روایتی امپیریلزم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا ہے، اور متعدد بیانات اور بحث و مباحثہ کے بعد برٹش گورنمنٹ نے صرف یہی اعلان کیا ہے کہ وہ جنگ کے بعد جلد ہندوستان کو برطانوی نوآبادیوں کا درجہ دینا چاہتی ہے۔ مولانا آزاد اس کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو ہمیشہ اپنا محتاج رکھنا چاہتا ہے اور اُسے اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق دینے کو تیار نہیں ہے۔ اُن کی رائے میں برطانیہ کی جو پالیسی ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۹ء میں تھی اسمیں موجودہ جنگ کی وجہ سے کوئی ردوبدل نہیں ہوا ہے۔ اسی لئے انھوں نے کانگریس کو جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے کی صلاح نہیں دی ہے۔ بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ملک کا راستہ دوسری طرف ہے۔ انھوں نے کانگریسی وزارتوں کی کنارہ کشی کی تائید کی اور کہا کہ گو کانگریس ہر وقت باعزت سمجھوتہ کے لئے تیار ہے لیکن وہ اپنا قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ نوآبادیوں کو جو حکومت خود اختیاری ملی ہے، اگر وہی بجنسہ ہندوستان کو دے دی جائے

تو شاید یہاں کے حالات کے کچھ زیادہ موافق ثابت نہ ہو، دوسرے آجکل چھوٹے چھوٹے ملک اپنی آزادی کے لئے جانیں قربان کررہے ہیں، اور برطانیہ نے بھی اُن کی آزادی برقرار رکھنے کے لئے ایک زبردست جنگ برپا کر رکھی ہے ایسی صورت میں اگر ہندوستان کے قوم پرست اپنے قدیم و وسیع ملک کے لئے نوآبادیوں سے کچھ زیادہ درجہ طلب کریں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اور برطانیہ کے لئے بھی اس مطالبہ کو بالکل رد کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن یہ کہنا بھی بہت درست نہیں ہے کہ اگر واقعی ہندوستان کو نوآبادیوں کا درجہ مل جائے تو اس کی حیثیت وہی بنی رہیگی جو ۱۹۱۹ء کی اصلاحی اسکیم میں تھی۔ اگر واقعی ہندوستان کو زمانہ قریب میں یہ درجہ حاصل ہو جائے اور انگلستان اپنے وعدے پر ایمانداری سے قائم رہے تو ملک کا ایک کثیر حصہ مطمئن ہو جائیگا لیکن مصیبت یہ ہے کہ سرکار برطانیہ ایسے معاملات میں تاخیر اور تعویق کو اس قدر دخل دیتی ہے اور بعد میں خود اپنے وعدوں کے الفاظ کی اتنی موشگافی کرتی ہے کہ لوگوں کے حوصلے پست اور دل شکست ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں ہندوستان کو اتنی دفعہ مایوسیوں سے سامنا ہو چکا ہے کہ اب عام طور پر لوگوں کے دلوں میں وعدوں کی کچھ زیادہ وقعت باقی نہیں رہی۔ خصوصاً جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ کے زمانہ میں بھی ہندوستانیوں کو فوجی تربیت دینے کا کوئی خاص انتظام تجویز نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ آئندہ کوئی ایسا قدم اُٹھایا جانے والا ہے جس سے یہ اُمید کی جائے کہ کبھی ہندوستانی خود اپنے ملک کی حفاظت کر سکیں گے۔ ہندوستانی آج بھی فوج کے اعلیٰ عہدوں سے بیدخل ہی ہیں۔ یہاں تک کہ اس بارے میں جو اصلاحیں برسوں ہوئے خود انگریز افسروں نے تجویز کی تھیں اُن پر بھی ابتک کوئی عملدرآمد نہیں ہوا ہے۔ انھیں باتوں سے کانگریس کو برطانیہ سے اس قدر بدظنی ہے اور اس بدظنی میں ملک کا کثیر حصہ کانگریس کے ساتھ ہے۔

مولانا آزاد کی صدارتی تقریر کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے قلیل تعداد والی جماعتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے مسئلہ سے بحث کی ہے۔ ہم اس حصہ کو تمام و کمال اس نمبر میں کسی دوسری جگہ درج کررہے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے ناظرین اسے غور سے پڑھیں گے۔ ہماری رائے میں مولانا آزاد نے جس خوش اسلوبی سے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے اس سے انھوں نے ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

کانگریس میں صرف ایک ریزولیوشن پاس ہوا اور وہ بھی بارش کی وجہ سے عجلت میں پاس ہوا۔ مگر سبجکٹ کمیٹی میں اس پر بہت مفصل بحث ہوئی۔ اس ریزولیوشن میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، جس میں بعض اُصولی حیثیت سے بالکل درست ہیں اور بعض کے متعلق بہت کچھ بحث و مباحثہ کی گنجائش ہے جس کے لئے دراصل ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے

اس ریزولیوشن میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ کانگریس ہندوستان کو غیر ملکی غلبہ سے آزاد کرانا چاہتی ہے اور اُس نے صوبوں سے اپنی وزارتوں کو واپس بلالیا ہے۔ اس لئے قدرتاً اس کا دوسرا قدم سول نافرمانی ہوگا چنانچہ حسب موقعہ وضرورت بلاپس وپیش اس کے متعلق قدم اُٹھایا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس ریزولیشن میں مہاتما گاندھی کے اِس اعلان کا ذکر کیا گیا ہے جس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ سول نافرمانی شروع کرنے کی اس وقت ذمہ داری لے سکتے ہیں جب انھیں اس بات کا اطمینان ہوجائے کہ لوگ تعمیری پروگرام کی طرف پورے انہماک کے ساتھ متوجہ ہیں اور ڈسپلن کے عادی ہوگئے ہیں۔ اس ریزولیوشن میں سب سے زیادہ قابل اطمینان بات یہی ہے کہ سول نافرمانی یا کوئی اور کارروائی جو ہوگی وہ مہاتما گاندھی کی رائے سے کی جائیگی۔ امید ہے کہ مہاتماجی بہت سوچ سمجھکر قدم اُٹھائیں گے۔ اور انگلستان وہندوستان کے درمیان مصالحت کرانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ کانگریس کے بعد صاحب وزیر ہند اور مہاتما گاندھی کے کئی بیانات ہوچکے ہیں، اُن سے بھی یہی ترشح ہوتا ہے کہ مہاتماجی آئندہ کارروائی کے متعلق فیصلہ کرنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہتے ہیں اور گو لارڈ زٹلینیڈ شاہی رعب وداب کو مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں تاہم اُن کی ہر نئی تقریر پہلے کی تقریر سے بہتر ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ آخری تقریر میں اُنھوں نے کانگریس کے مجوزہ نمایندہ اسمبلی کو ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے یہ ضرور کہا ہے کہ گو انگلستان بوجوہ ہندوستان کے مسئلہ سے اپنے تئیں بالکل علیحدہ نہیں کرسکتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خواہ مخواہ اپنی من مانی تجویزیں ہندوستان سے منوانے پر تلا ہوا ہے۔ بلکہ جو فیصلہ ہوگا وہ زبردستی نہیں بلکہ باہمی گفتگو اور سمجھوتہ سے ہوگا۔ ہماری رائے میں برٹش گورنمنٹ کو ابھی اور جھکنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالت نہ انگلستان کے شایانِ شان ہے اور نہ ہندوستان ہی کے لئے باعث فخر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ کو ایک طرف مہاتما گاندھی۔ مولانا آزاد۔ سیر کبت راجگوپال آچاریہ۔ سردار پٹیل۔ پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور دوسری طرف سر آغا خاں، سرسکندر حیات خاں اور مسٹر فضل الحق کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہیئے، اور جس طرح سے بھی ہوسکے اس مسئلہ کو باہمی مصالحت کے اُصول پر طے کرلینا چاہیئے۔ مسٹر ستیہ مورتی، سر رادھاکشن اور بہت سے دوسرے محبان وطن کی بھی یہی رائے ہے۔

مارچ کے تیسرے ہفتہ میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی مسٹر جناح کی صدارت میں بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ مسلم لیگی لیڈروں نے خوب دھواں دھار تقریریں کیں، جس میں اس مرتبہ اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ ہندوستان میں ایک قوم آباد نہیں ہے بلکہ ہندو مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں، اس لئے ان دونوں میں کبھی میل نہیں ہوسکتا ہے۔ مسٹر جناح کی تقریر میں بھی شروع سے آخر تک اسی بات پر زور دیا گیا کہ چونکہ ملک

میں دو قومیں آباد ہیں اس لئے امن اور عافیت اسی میں ہے کہ ملک کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں، ایک میں مسلمانوں کا اقتدار رہے اور دوسرے پر ہندوؤں کا قبضہ ہو۔

اس اجلاس کا سب سے اہم ریزولیوشن بھی یہی پاس ہوا کہ پاکستان کے نام سے ملک کا ایک حصہ جس میں مسلمان کثرت سے آباد ہیں باقی ہندوستان سے علٰحدہ کر کے مسلمانوں کو دیدیا جائے۔ مسلم لیگ نے یہ بھی دعوی کیا ہے کہ ملک کے تمام مسلمانوں کا یہی مطالبہ ہے اور مسلمان اُس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک اُن کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو جائے۔ گو اس اسکیم کی تفصیلات ابھی طے نہیں ہوئی ہیں اور اس کے حامی بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس اسکیم کا عملدرآمد کس طرح ہو گا، لیکن اس کی تائید میں عجیب و غریب دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کئی سال سے ہم اس کا ذکر سُن رہے ہیں اور حیدرآباد میں ایک پروفیسر صاحب نے چند سال ہوئے اس کے متعلق ایک مفصل اسکیم بھی پیش کی تھی لیکن اس سال سے پہلے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ اب بھی اس کے حامی صاف طور پر نہیں بتلاتے کہ اس اسکیم سے اُن کی کیا مراد ہے۔ لیکن ۱۹۔ اپریل کو اسکی تائید میں مختلف مقامات میں عام جلسے منعقد کرانے کی کوشش ہوئی۔ یہ جلسے کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے اور اس اسکیم کی عام طور پر سخت مخالفت کی گئی ہے۔ اکثر مقتدر مسلمان لیڈروں نے بھی اسے ناپسند کیا ہے۔ اور بعض اصحاب اسکی وجہ سے مسلم لیگ سے بھی کنارہ کش ہو گئے ہیں لیکن اسکے برعکس بعض لیڈران لیگ نے دھمکی سے بھی کام لیا ہے اور بڑے زور شور سے یہ کہا ہے کہ وہ اس اسکیم کو منوا کر دم لیں گے۔ بعض لوگ اس اسکیم کو تفرقہ پرداز انگریز مدبّروں سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر اصل بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچتا ہے یا نقصان۔ مسٹر جناح نے اسکی تائید میں ریاست بلقان کی مثال دی ہے لیکن وہاں جب ٹکڑے کئے گئے تو آبادیوں کی بھی تقسیم ہوئی یونانیوں اور دوسرے باشندوں کو ترکی سے زبردستی نکال دیا گیا، اسی طرح ترکی سے بلغاریہ اور سرویہ کے لوگ جبراً نکال دیے گئے۔ بقول مسٹر رفیع احمد صاحب مسٹر جناح نے دوسری مثال سیلون کی دی ہے۔ لیکن آج سیلون میں ہندوستانیوں کی بہت بُری حالت ہے۔ اس اسکیم کے ماتحت بھی اگر پاکستانی علاقے کے باشندوں کو دوسرے صوبوں نے غیر ملکی قرار دے دیا تو پھر اُن کی کیا حالت ہو گی؟ نہ انھیں ملازمتیں ملیں گی اور نہ شہری حقوق حاصل ہونگے۔ خود پنجاب میں بھی خالص اسلامی حکومت کس طرح قائم ہو سکتی ہے؟ کیونکہ مسٹر جناح نے سکھوں کو اطمینان دلایا ہے کہ اُنھیں وہی حقوق دیے جائیں گے جو مسلمانوں کو غیر اسلامی صوبوں میں حاصل ہیں۔ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی چودہ فیصدی آبادی کو بیس فیصدی حقوق دیے گئے ہیں۔ اگر پنجاب میں بھی سکھوں کے ساتھ یہی رعایت کیگئی تو مسلمانوں کو کہاں سے اکثریت حاصل ہو سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب اور اُن کے ساتھیوں نے اس اسکیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ اور بنگال کے وزیر اعظم مسٹر فضل الحق نے بھی اپنے صوبے میں جا کر اس کا کوئی چرچا نہیں کیا۔ بلکہ وہاں اُنھوں نے ایک ہندو مسلم

کانفرنس منعقد کر کے باہمی سمجھوتے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حال میں کلکتہ کارپوریشن کے انتخاب میئر کے متعلق بنگال مسلم لیگ اور سبھاش بابو کی پارٹی میں مصالحت ہو گئی ہے

یہ منطق بھی کچھ درست نہیں ہے کہ اگر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو مسلم اقلیت کے صوبوں کے تمام حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اس کے متعلق ہم اپنی رائے لکھنے کے باوجود معزز معاصر "البشیر" اٹاوہ کے ایڈیٹر خان بہادر مولوی بشیر الدین احمد صاحب کے خیالات درج ذیل کرتے ہیں۔ ممدوح اپنے اخبار "البشیر" بابت اپریل ۱۹۴۰ء میں لکھتے ہیں:۔

"ہم اس خیال کو نہایت ذلیل اور شرمناک خیال کرتے ہیں کہ یو۔ پی، سی پی، بہار وغیرہ کے مسلمانوں پر جو مظالم ہوں اُن کا انتقام بنگال اور پنجاب کے کمزور ہندوؤں سے لیا جائے۔ اگر مسلم لیگ کے دعوے کو صحیح مان لیا جائے جیسا کہ وہ کہتی ہے کہ کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں پر زبردست مظالم کئے ہیں تو باوجود اس زبردست دعوے کے جو آنریبل مولوی فضل الحق صاحب نے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں بہانگِ دہل کیا تھا کہ اگر کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں پر مظالم کئے تو میں اس کا بدلہ بنگال کے ہندوؤں سے لونگا۔ سب کو معلوم ہے کہ آنریبل مولوی فضل الحق صاحب نے سوائے اس کے کچھ نہ کیا کہ ایک طویل فہرستِ مظالم شائع فرما دی۔ ہمارے خیال میں اِن مظالم کا بدلا اگر ان میں اصلیت بھی ہوتی بنگال کے ہندوؤں سے لیا جاتا تو یہ نہایت نامناسب ذلیل اور اخلاق سے گری ہوئی بات تھی۔ اسلام نے کبھی اپنی کمزور رعایا پر دوسری جگہ کے مظلوم مسلمانوں کے انتقام کی اجازت نہیں دی۔ اور ہماری غیرت اسکو ایک لمحہ کیلئے بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اگر ہندو اکثریت ہم پر ظلم کرے تو اسکا بدلہ پنجاب اور بنگال کے بے قصور ہندوؤں سے لیا جائے۔ ہم شکر گذار ہونگے اگر مسلم لیگ اقلیت کے صوبوں میں ہم مسلمانوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دے۔ ہم میں خود اعتمادی ہے اور خدا کا بھروسہ...... ہم ان لوگوں کو مسلمان نہیں سمجھتے جو اکثریت سے خوف کھاتے ہیں، جو خدا کا بھروسہ چھوڑ کر انسانوں سے تحفظات مانگتے ہیں۔"

آخر میں مولانا موصوف لکھتے ہیں کہ کوئی سمجھدار مسلمان مسلم لیگ کی اس اسکیم کو شیخ چلی کے منصوبے سے زیادہ باوقعت خیال نہیں کر سکتا ہے۔

سمجھدار مسلمانوں کی ایک بااثر جماعت اس تجویز کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ دہلی میں اِسی مہینہ کے آخر میں آزاد کانفرنس کے نام سے خان بہادر اللہ بخش صاحب کی صدارت میں ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔

جنگ یوروپ

پچھلے نمبر میں ہم نے جنگ یورپ کے پہلے چھ مہینوں کے واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ اس کے بعد ہٹلر نے

ایک نئے محاذ پر زور آزمائی کی ہے یعنی اُس نے اس ماہ کے شروع میں دفعتاً ڈنمارک اور ناروے پر چڑھائی کر دی۔ اس حملہ کی ظاہری وجہ تو یہ بتلائی گئی ہے کہ اتحادیوں نے غیر جانبدار ملکوں کے سمندروں میں سرنگیں بچھا کر ان پر اقتدار حاصل کرنا چاہا اسلئے جرمنی کو فوج کشی کر کے اس رقبہ پر اپنا اثر جمانے کی ضرورت پیش آئی۔ مگر اصل وجہ یہ ہے کہ سویڈن میں نہایت اعلیٰ درجہ کا لوہا پیدا ہوتا ہے۔ شہر کرونہ کی کانوں سے تمام لوہا ریل کے ذریعہ بندرگاہ ناروک میں لایا جاتا تھا اور یہاں سے جرمن جہاز اسے بھر کر ناروے کے ساحلی اور محفوظ سمندری گلیارے سے ہوتے ہوئے اسکو جرمنی پہونچاتے تھے۔ اسکے علاوہ ناروے کے مغربی ساحل پر ایسے بہت سے مقامات ہیں جو خفیہ بندرگاہوں کا کام دے سکتے ہیں اور ان میں جرمن آبدوز کشتیاں چھپکر برطانوی جہازوں پر حملے کر سکتی ہیں۔ ان کے تدارک کیلئے اتحادیوں نے ناروے اور ڈنمارک کے ساحل پر مناسب مقامات دیکھکر اپنے جنگی جہاز تعینات کر دیئے اور بحری سرنگیں بچھا کر جرمن جہازوں کا راستہ روک دیا۔ ہٹلر پہلے ہی ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا اب اسکو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور اُس نے راتوں رات فوج کشی کر کے ۹۔ اپریل کو ڈنمارک اور ناروے میں چھاپہ مارا اور ڈنمارک پر پورا اور ناروے کے مشہور مقامات اوسلو۔ اسٹاونجر۔ ٹرانڈھم۔ کرسچین۔ سینڈ اور ناروِیک پر قبضہ کر کے اعلان کر دیا کہ جرمنی نے ان ملکوں کو اتحادیوں کی دستبرد سے بچانے کیلئے عارضی طور پر اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ غریب ڈنمارک نے خون خرابہ سے بچنے کیلئے مجبوراً جرمنی کی سرپرستی قبول کر لی، مگر ناروے نے اس زبردستی کو خوشی سے منظور کرنا پسند نہیں کیا چنانچہ اب وہ جرمنی سے جنگ کر رہا ہے۔ ناروے کا بادشاہ اور اُسکی گورنمنٹ ملک کے اندرونی اور محفوظ علاقے میں چلے گئے ہیں اور جرمنوں سے لڑ رہے ہیں۔ اتحادیوں نے جرمنی کے نئے تشدد کا فوراً جواب دیا۔ چنانچہ ایک لاکھ کے قریب اتحادی فوج جو فنلینڈ کی مدد کیلئے درست کیگئی تھی ناروے روانہ کر دی گئی، برطانوی بیڑہ بھی چڑھ دوڑا اور اسکیگرریک اور کٹیگیٹ میں جرمن جہازوں کی صفوں کو توڑتا ہوا اوسلو کی کھاڑی تک جا پہونچا، بلکہ اس سے بھی آگے بحیرۂ بالٹک میں بندرگاہ کیل تک پہونچکر بحیرۂ بالٹک میں بھی سرنگیں بچھا دیں اور ناروِیک میں دو تین حملے کر کے تمام جرمن جہازوں کا صفایا کر دیا۔ غرض ایک ہفتہ کے اندر مختلف بحری معرکوں میں جرمنی کے کئی درجن جنگی اور دوسرے جہاز سمندر کی تہ میں پہونچا دیے گئے۔ اندازہ یہ ہے کہ ان بحری معرکوں میں جرمنی کی بحری طاقت کا کم سے کم دسواں حصہ تو فی الفور غارت کر دیا گیا ہے۔ ناروے کے نصف درجن سے زیادہ مقامات میں اتحادی فوجیں اُتاری جا چکی ہیں اور اب یہ ناروے کی فوجوں کے ساتھ ملکر دشمن کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ ناروِیک کی بندرگاہ فتح کر لیگئی ہے گو جرمن اب بھی اُسے واپس لینے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں، اور مختلف مقامات پر بھی پیش قدمی ہوئی۔ مثلاً مقام نامسوس پر انگریزی و جرمن فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور تھوڑے ہی معرکہ کے بعد جرمن فوج پسپا ہو گئی۔ ٹرانڈھم پر بھی برطانوی اور ناروِیجین فوجیں حملہ آور ہوئیں اور متعدد ہوائی حملے بھی کئے گئے اور دشمن کے درجنوں ہوائی جہاز تباہ کر دئے گئے۔ اتحادیوں کی کوشش ہے کہ جرمنی کی جتنی فوج ناروے پہونچ گئی ہے اُسے جرمنی سے منقطع کر دیا جائے۔ سمندر کی طرف سے تو برطانیہ نے راستہ بند ہی کر رکھا ہے البتہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ مدد پہونچائی جا رہی ہے لیکن ان سے بھاری توپیں نہیں بھیجی جا سکتیں۔ بہر حال اس وقت خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے اور گو اس وقت نہیں کہا جا سکتا کہ آخری نتیجہ کیا ہوگا لیکن جو خبریں موصول ہو رہی ہیں ان سے تو یہی یقین ہوتا ہے کہ جرمن فوجیں بالآخر ناروے میں ایک ایک کر کے

زمانہ

جلد ۷۴ — مئی ۱۹۴۰ء — نمبر ۵

میرا نظریۂ شاعری

از رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

"حال میں ایڈیٹر "زمانہ" اور رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری سے اُن کی شاعری کے متعلق خط و کتابت ہوئی تھی، راقم الحروف نے فراق صاحب کی شاعری کی داد دیتے ہوئے اُردو شاعری اور اُس کے بعض پہلوؤں پر کچھ اظہار خیالات کیا تھا جس کے جواب میں فراق صاحب نے اپنی شاعری کی توضیح و تشریح میں ایک مفصل خط لکھا۔ چونکہ حسنِ اتفاق سے مکرمی فراق اپنی شاعرانہ تخئیل کی وضاحت کرتے ہوئے شاعری کے متعلق بڑی گہری باتیں بھی بیان کر گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی اہم مسائلِ زندگی کے متعلق قدیم ہندوستانی تصورات اور آرین نقطۂ خیال کا بھی دلاویز و دلنشین پیرائے میں ذکر آ گیا ہے اس لئے ہم اس مراسلے کا وہ حصہ جو خالص عالمانہ ہے اور بڑے بڑے ادبی نکات پر روشنی ڈالتا ہے مدیہ ناظرین زمانہ کرتے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ اس جسارت کے لئے ہم کو ہمارے دوست فراق صاحب معاف فرمائیں گے، اور ہماری طرح ہمارے احباب بھی اس عالمانہ بحث سے لطف اندوز ہونگے۔" (ا۔ ز۔ م)

زندگی میں آدمی کامیاب ہو یا ناکامیاب، شعور انسانی کے لئے غالباً شاعری ہی ایک چیز ہے جو مستقل اور حقیقی طور پر تشفی بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ شاعری سے میری مراد حیات اور کائنات کا ہیئاً فرازیا یا المیاتی تجربہ عمل و رد عمل۔ دکھ سکھ اور دوسرے احساسات اور تجربات ہیں جو حیات تہذیب کیلئے کچے مال کی حیثیت

ـــــــــــ

لے Raw Material.

رکھتے ہیں۔ جب یہ سب جمالیاتی احساس ہی بدل چکتے ہیں تو پھر ارتقاء حیات کے لئے اسی جمالیاتی احساس سے عمل ورک اور جذبات کے نئے محرکات پیدا ہوتے ہیں اور یوں شاعری تہذیب کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ اور پھر تہذیب کا ہر نیا دَور شاعری کے ارتقاء کے عناصر اور محرکات فراہم کرتا ہے۔ اس طرح شاعری اور تہذیب اور ارتقاء سب باہم لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

اس نظریہ سے اُس اصول کے لئے ضرور دقت پیدا ہو جاتی ہے جس کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ شاعری زمان و مکان سے ماوری ہے۔ اور وہ ایک عالمگیر اور دائمی چیز ہے۔ لیکن زندگی اور شاعری میں جس نظم و نسق کے سلسلہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے کہ ماضی کا وجود حال میں یا مستقبل میں مٹ جاتا ہے ایسا نہیں، بلکہ ماضی کے جاندار عناصر حال اور مستقبل میں جذب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہر دَور کی حقیقی وجدانی شاعری میں اس دَور کے منازل حیات کی شدید چمک اور کشش ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری میں مستقل طور پر ایک معصوم دوشیزگی اور ایک سدا بہار کیفیت قائم رہتی ہے۔ اس لئے آئندہ دوروں میں ہم گذشتہ دَوروں کی حقیقی شاعری سے لُطف اندوز اور متاثر تو ہو سکتے ہیں لیکن اگلے دَور کی شاعری پچھلے دَور کی شاعری نہیں بن سکتی۔ اسی سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہر دَور ایک ہی معنی میں نیا دَور نہیں ہوتا۔ یعنی ہر نیا دور حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ دور نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ کارآمد عناصر ہر نئے دَور کے بڑے شعرا اگلے دور کے لئے ضرور فراہم کر دیتے ہیں مثلاً میرے یہاں ولی اور سراج دکنی کے دَور سے لے کر میر اور اُن کے معاصرین غالب اور اُن کے معاصرین مصحفی جراُت، ناسخ آتش اور اُن کے معاصرین امیر و داغ اور اُن کے معاصرین اور داغ کے بعد سے اقبال تک کی شاعری کے عناصر میرے انفرادی رنگ میں اسی طرح سموئے ہوئے ملیں گے جس طرح کسی آدمی کی انفرادی شخصیت اور کردار میں اُس کے آبا و اجداد کی شخصیتوں کے عناصر ملے جُلے ہوتے ہیں۔ حسرت کے انفرادی رنگ میں بھی قدما کا رنگ خاصکر مصحفی جراُت اور مومن کے رنگ جھلک رہے ہیں۔ اصغر کے یہاں اُردو کے شعرا نہیں بلکہ حافظ اور مولانا روم کا رنگ ملتا ہے۔ فانی کی زبان کم سے کم مجھے عزیز لکھنوی اور بعض دوسرے شعرائے لکھنؤ کی زبان و بیان کا نیا پر تو معلوم ہوتی ہے۔ ~~ہمارے یہاں تو صرف اُردو کے شعرا نہیں بلکہ ہندو ادب اور کلچر، مسلم ادب اور کلچر اور مغربی ادب اور کلچر سب مل جُل کر کارفرما ہیں اس طرح روایات اور سبھاؤ کی کڑیاں ملی جلی رہتی ہیں~~ اُردو شاعری یعنی اُس کا وہ حصہ جو حقیقی شاعری ہے اور محض نقالی اور قافیہ پیمائی نہیں ہے صرف زبان و بیان کے لحاظ سے نہیں بلکہ جذبات احساسات اور وجدان کے لحاظ سے ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ حالی کا یہ شعر:۔

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل		اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

ایک نئے احساس، ایک نئے زاویۂ نگاہ ایک نئے مرکزِ وجدان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ شعر میرؔ اور غالبؔ کی نقالی نہیں ہے اور نہ مومنؔ کی تقلید ہے۔ اُردو شاعری میں آوازِ بازگشت کا پہچان لینا نسبتاً آسان رہا ہے بمقابلہ نئی آوازوں کے پہچاننے کے، مگر اس میں دونوں قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔

بہر حال جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے میں نے اپنی زندگی کی ان داخلی اور خارجی آزمائشوں کا جو کم از کم میرے لئے استخوان سوز اور صبر آزما ثابت ہوئیں وجدانی شعور حاصل کرنا چاہا۔ ہر شخص کے لئے پرانی آزمائشیں نئی آزمائشیں بن جاتی ہیں۔ ہر شخص کے لئے جگ بیتی ایک نئے انداز سے آپ بیتی بن جاتی ہے اور ایک انفرادیت نرالاپن اور اچھوتا پن حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن شاعر کی انفرادیت کی رگیں تمام انسانوں کی شخصیت میں خوابیدہ ہیں۔ ہر شخص محض ایک فردِ واحد نہیں ہے بلکہ ماضی، حال اور مستقبل کی کل انسانیت عالمِ خواب میں ہر شخص کے اندر جی رہی ہے۔ تصوف ہر طرف ہے لیکن:-

قطرے میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہیئے
بات کہنے کی نہیں ہے یہ جدا کیا کہیئے		(آسی غازیپوری)

اس لئے میرے جن اشعار میں گویا آپ کے دل کا بھی چور نکلا وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ میں اور آپ دو افراد ہوتے ہوئے بھی دو نہیں بلکہ ایک ہی فرد ہیں۔ جب کارلائل نے یہ لکھا تھا کہ شاعر انہیں تجربات کا ترجمان ہے جو سب کے تجربات ہوتے ہیں لیکن جسے ہر شخص اپنے لئے واضح نہیں کر سکتا تو کارلائل کا یہی مطلب تھا جو میں نے بیان کیا ہے۔ نئے پن کے لئے بھی پرانے پن کی ضرورت ہوتی ہے۔ انفرادیت کے لئے بھی انسانیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وحدت ہی کے آغوش میں کثرت پلتی ہے اور اس طرح وحدت کثرت سے زیادہ وسیع اور بڑی چیز ہے۔ اگر ہر شخص کا دکھ درد اس کے جذبات اور تجربات باہم اور بنیادی طور پر یکساں اور ہم آہنگ نہ ہوں تو ایک دوسرے کی شاعری سمجھنا برطرف ایک دوسرے کی بات سمجھنا ناممکن ہو جائے۔ شاعری تو اس لئے ہوتی ہی نہیں کہ شاعر اپنے مخاطب کو اپنا دکھ درد سنائے بلکہ اپنے دکھ درد کے پردے میں یا اس کے بہانے سے مخاطب کا بلکہ انسان کا دکھ درد سنائے۔ لیکن ہر شاعر اسے نئی آواز اور نئی لرزشوں کے ساتھ سُناتا ہے اور اس طرح ہر شاعر کی آواز کے ذریعہ دنیا اپنے نئے پُرانے دکھ درد، سکھ اور خوشی، راحت اور بے چینی کو ایک نئی آواز اور ایک نئے انداز میں سنتی ہے اور یہ نئی آواز اور نیا انداز دنیا کے کان اور دل میں گویا اب تک سو رہے تھے۔ البتہ ہر شاعر کے تجربات اور حسیات میں مساوی وسعت اور تنوع نہیں ہوتے۔ ہر شاعر کی دوربین اور خوردبین طاقت مساوی نہیں ہوتی

میرے رجحان نے میرے اور میرے مخاطبوں کے شعور کی اس رگ کو اکسانا چاہا ہے جو عشق، حسن، زندگی کائنات کے کچھ خاص لمحات، مشاہدات اور باہم متضاد اور متصادم پہلوؤں کو خیر و برکت کے ایک مرکز پر ملتے ہوئے دیکھتی ہے یعنی میری شاعری تلخ اور صبر آزما تجربوں اور افتادوں کو اس طرح دیکھنا اور منقوش کرنا چاہتی ہے کہ یہ تجربے اور افتادیں حیاتِ محض سے ہم آہنگ نظر آنے لگیں اور نغمۂ غم نغمۂ حیات بن جائے کیونکہ میرے نزدیک غم جب تک نشاط کا رنگ نہ حاصل کر لے اور جب تک خوشی کی آنکھوں میں آنسو نہ آ جائیں غم اور خوشی دونوں اپنے اصلی رنگ روپ سے محروم ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک شاعری کا مقصد فطری جذبات اور احساسات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی مقصد ان جذبات اور احساسات کو کچھ اور بنا دینا ہے۔

جذبات اور احساسات مناظر اور واقعات، عمل اور کوشش یہ سب حیات محض کے نہ صرف لباس اور زیور ہیں بلکہ اس کی غذا بھی ہیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں اس لئے ہیں کہ حیات کی دیوی کے حسن کو نمایاں کریں، اس حسن کو جو ماورائی بھی ہے اور ہر شے میں جاری و ساری اور ہر شئے میں منعکس بھی ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہ سب تصوّف کی باتیں ہیں، مگر مجھے یہ لفظ (تصوف) پسند نہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ تر تصوف کی شاعری یا تو حقیقت کی ماورائیت پر زور دیتی رہی ہے اور اسی طرح ایک خشک چیز بن گئی ہے یا پھر چند فقروں کو اصول بنا کر دُہرانے اور مجاز و حقیقت جلوہ اور پردہ لالہ و گل ساقی و پیمانہ کو خشک تمثیلیں (symbols) بنا دینے تک محدود رہتی ہے۔ دنیا سے وہ محبت اور ہم آہنگی جو وطن سے یا آغوشِ مادر سے ہونی چاہیئے۔ تصوفانہ شاعری میں نہیں ملتی۔ بلکہ اکثر اوقات صوفی شعرا کے لب و لہجے سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ واقعی اہل درد ہیں۔

مجھے عموماً تصوف میں ایک قسم کی بے تعلقی اور بے لوثی کی جو ناپسندیدہ صفت بظاہر ملتی رہی ہے۔ اور انسانیت کی جس دُکھی ہوئی رگ کی چمکار اور تھرتھری کا فقدان عموماً تصوف میں نظر آتا ہے اس نے مجھ میں تصوف سے ایک چڑھ سی پیدا کر دی ہے۔ دراصل سوال تصوف اور حقیقت اور مجاز کا نہیں ہے بلکہ آریت اور عبرانیت (Aryanism اور Hebraism.) یا میتھیو آرنلڈ کے الفاظ میں (Hellenism, & Hebraism.) کا سوال ہے۔ ایرانی شاعری میں تصوف کے ساتھ ساتھ رچی ہوئی اور مہذب مجاز پرستی ضرور موجود ہے اور اقبال کو یہی عجمیت بُری لگتی ہے کیونکہ اقبال فلسفی ہوتے ہوئے بھی کائنات کو نہ اپنا گھر سمجھ سکے اور نہ کائنات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ خودی کے فلسفے نے ان کے اندر کائنات کے لئے توہین کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے لیکن ایران کی شاعری ایسی

مجاز پرستی اگر ہمیشہ نہیں تو بارہا ایک رنگین اور لطیف اور مہذب اور بلند عیش پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی رابندر ناتھ ٹیگور کے یہاں جو نرمی اور معصومی ہے تلسی داس اور سور داس اور میرا بائی اور کالی داس کی شاعری نے اسی دنیا کے رسوں کو جو آب حیات بنا دیا ہے جو معجزہ خیز سادگی آریہ کلچر اور مزاج میں سب سے کائنات کو قبول کرنے کا بلکہ زمین و آسمان سے اپنی وحدت اور ہم آہنگی کا جو جذبہ اس شاعری میں ہے وہ ایرانی شاعری میں نہیں ہے۔ مجھے ہندو شاعری ایسی چیز معلوم ہوتی ہے جیسے تیز بخار میں جیسے بہن یا ماں جلتی ہوئی جبیں پر اپنے ٹھنڈے ہاتھ رکھدے، فارسی زبان میں لفظ "دیوی" کا ترجمہ ہی ناممکن ہے۔ وہاں تو عورت کا تخیل ساقی یا معشوق کا ہے۔ ماں اور بہن اور بیٹی اور ہندو روایات کے مطابق بیوی کا تصور بھی وہاں نہیں ہے۔ پھر ایرانی شاعری اپنی زبردست خوبیوں کے باوجود بھی ایک مہذب حساس اور مفکر کی دعوت نظر ہے کیونکر آگے بڑھتی۔ چکبست نے رامائن کا سین لکھکر ثابت کر دیا کہ ماں اور بیوی فارسی اور لکھنؤ کی زبان کی روایات میں محض فصاحت اور بلاغت اور زبان و بندش کی چستی کے نذر ہو کر رہ گئی ہیں۔ ماں اور بیوی درکنار ہندی شاعری کے معشوق کی نرمی معصومیت اور پاکیزگی بھی چکبست سیتا اور کوشلیا کو نہیں دے سکے۔

عبرانیت اور عبرانیت سے بنیادی طور پر متاثر ذہنیت کے لئے اس دنیا کے متعلق مہذب معقول میں وطنیت اور یگانگت پیدا ہونا محال ہے۔ اسلام میں رہبانیت کو ضرور برا بتایا گیا ہے اور کامیابی سے اس کا مقابلہ کیا گیا ہے لیکن "ترک دنیا" نہ کرنا اور دنیا کو اپناتے ہوئے اپنے میں وہ سپردگی پیدا کرنا کہ دنیا ہمیں اپنا لے، دو مختلف چیزیں ہیں

ہندو کلچر اور مزاج کی جس خصوصیت کا میں نے ذکر کیا ہے اسی خصوصیت کو میں شروع ہی سے اپنی غزل میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ خصوصیت آواز کی ایک خاص تھرتھری سے ایک خاص نرمی سے پیدا ہوتی ہے کہاں تک میں اس میں کامیاب ہوا ہوں اسے آپ لوگ جانیں۔ دنیا سے بے تعلقی یا دنیا سے ایک مجبوری محبت یا دنیا سے محض لذت اندوز ہونے کے جذبات کا میں دشمن رہا ہوں۔ یوں تو کائنات سے کسی قدر ہم آہنگی کے بغیر شاعری مشکل ہے۔ لیکن یہ ہم آہنگی محض شاعرانہ چیز یا اتفاقی بات نہ ہونا چاہئیے۔ بلکہ اس ہم آہنگی کو شاعر اور شاعری کی سانس ہونا چاہیئے بہت پرانی تہذیب کو دنیا سے ہم آہنگی کا۔ اور دنیا کی نرمی اور دوشیزگی کا احساس ہوتا ہے یہ احساسات ان کے بس کی چیز نہیں جن کی انتہائی رسائی یہ ہو کہ "بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے" یا جو مہر و ماہ و مشتری سے ہم عنان ہونے کو باعث فخر سمجھتے ہوں۔

یہ دعوی بلند آہنگ شاعری ضرور ہیں اور ان میں ایک حد تک علمیت بھی ہے۔ لیکن اس شاعری کی جڑیں ایک آسمانی خدا کے تصور میں ہیں۔ مادر گیتی کی کوکھ میں نہیں، وہ کوکھ جو بیک وقت مادی اور روحانی ہے آریہ کلچر اس دوئی (Dualism) کا دشمن ہے۔

ہاں میری غزلیں طویل ہوتی ہیں اور فنی لحاظ سے یہ بات مستحسن نہیں۔ لیکن میں فن برتنے کے لئے غزل نہیں کہتا۔ ہر غزل کی زمین میرے لئے ان تمام وجدانی کیفیات اور محرکات کی جولانگاہ بن جاتی ہے جو میری زندگی کے عناصر ہیں۔ اور جو اس بحر اور ان قافیوں اور ردیفوں میں سے سرجوش کی طرح چھلک آتے ہیں۔ میری شاعری کو صنف غزل سے بیک وقت ہم آہنگی بھی ہے اور طوالت کے لحاظ سے بغاوت بھی۔ لیکن غزل کے علاوہ شاید میں نظموں میں اپنی زندگی اور اپنے وجدان کی حقیقی ترجمانی اتنی اچھی طرح نہ کر سکوں۔

اِنسان

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔اے)

آفت میں فرہ اور فردوں میں آفت آزارِ تمنا ہے دلوں میں آفت
جائے گا نہ، گو جان نکل جائے گی جگ میں یہ خلش، یُگوں میں آفت

زہرابۂ ہستی کی ہر موج جو لہرائی رم کرتا اِدھر آیا یہ تشنہ تمنائی
دیتی ہے فریب اس کو ہر چیز کی رعنائی انسان ہے سرگرداں، آوارہ و سودائی
کچھ خاک بسر اور کچھ دیوانہ و صحرائی دنیا میں تماشہ ہے دنیا کا تماشائی
آفات کی ہر سو ہے گھنگھور گھٹا چھائی پُرہول تصادم میں تہذیب ہے ٹکرائی
ہر موج زمانے کی پیغام فنا لائی گردابِ ہلاکت میں کشتی جہاں آئی
تدبیر پریشاں ہے، تقدیر ہے شرمائی معذور مسیحا ہیں، نالاں ہے مسیحائی
انساں سگ دنیا ہے، دنیا کا تمنائی دارُوئے نجات اس کو آتی ہے، نہ راس آئی
رہوارِ تمنا ہے گرتا ہے پھر اُٹھتا ہے صحرائے تناسخ ہے اور بادیہ پیمائی

مدہوش ہے شرمندہ کھوئی ہوئی عظمت پر
مسجودِ ملک کی یہ ناصیہ فرسائی

نوائے فراق

(از پروفیسر فراق گورکھپوری۔ ایم۔ اے۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد)

نہ جانے اشک سے آنکھوں میں کیوں ہیں آئے ہوئے
گذر گیا ہے زمانہ تجھے بھلائے ہوئے

کسی سے بات بہر حال وہ بنائے ہوئے
کچھ آزمائے ہوئے کچھ فریب کھائے ہوئے

کسی کی شوخیِ پنہاں میں یہ نکھار نہ تھا
فسردہ دل بھی ہیں کچھ آج رنگ لائے ہوئے

جنھیں ہے ناز بہت اپنے ظرف پر ساقی
تری نگاہ ہے انداز اُن کے پائے ہوئے

جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اُکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

یہ نرم نرم ہوائیں ہیں کس کے دامن کی
چراغ دیر و حرم بھی ہیں جھلملائے ہوئے

ہے ختم زندہ دلی اہلِ ضبط پر تیرے
کہاں کے درد دلوں میں ہیں یہ دبائے ہوئے

یہ حسرتیں ہیں کہ مایوسیاں کہ یاد تری
کچھ ابر سے دلِ افسردہ پر ہیں چھائے ہوئے

تپاں تپاں سے ہیں کچھ آج رنگ و بو والے
یہ کس کے سوزِ نہاں کی ہیں آنچ کھائے ہوئے

وہی ہیں رونقِ ہستی وہی ہیں جانِ نشاط
اُداس بیٹھے ہیں جو تیری لو لگائے ہوئے

وہ جامِ صاف میں زہرابۂ بقا ساقی
وہ ہوش اُڑے ہوئے وہ ہاتھ تھرتھرائے ہوئے

قتیلِ چشمِ تغافل سکوں شناس بھی ہیں
تری نگاہِ کرم کی تہیں ہیں پائے ہوئے

نہ رہزنوں سے رُکے راستے محبت کے
وہ قافلے نظر آئے گئے لٹائے ہوئے

اب اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں اُن کی
غم آشنا ہوئے اپنے ہوئے پرائے ہوئے

یہ اضطراب سا کیا ہے، کہ مدتیں گذریں
تجھے بھلائے ہوئے تیری یاد آئے ہوئے

خراب اور نہ کر اب خراب حالوں کو
ہماری خاک سے دامن ذرا بچائے ہوئے

بھری نگاہِ کرم کی شکایت اور اُس سے
جسے زمانہ ہوا درد بھی اُٹھائے ہوئے

خبر کسے ہے تبسم کی جب کوئی گذرا
نظر بچائے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے

جو کھوئے کھوئے سے ہیں منزلِ محبت میں
وہ حسن کا بھی ہیں کم کم سراغ پائے ہوئے

جو امتحانِ محبت سے دور ہیں کوسوں
اُنھیں بھی ہے کوئی در پردہ آزمائے ہوئے ×

دعا کریں نہ وہی صبر و ضبطِ عشق جو ہیں
ہزار بار مصیبت میں کام آئے ہوئے
دلِ حزیں، تری مایوسیاں قیامت ہیں
سکوت تازہ ہے صد پیچ و تاب کھائے ہوئے
نہ جانے کیا یہ فسردہ دلوں کو سوجھی ہے
کہ چار سمت ہیں اک آگ سی لگائے ہوئے
ملے اُنھیں سے یہ اعجازِ قرب و دوری کو
نظر سے دور نظر میں ہیں جو سمائے ہوئے
نگاہِ اہلِ محبت اُٹھی کسی جانب
غم و نشاطِ زمانہ کے بھید پائے ہوئے
زمانہ بھول گیا بس وہی نہیں بھولے
گذر گئی جنھیں اک عمر یاد آئے ہوئے
خبر یہ ہے کہ سرِ حشر بھی نہیں چُوکے
تری نگاہِ کرم کے فریب کھائے ہوئے
سمجھ کے کچھ دلِ غم آشنا جو ڈوب گئے
وہی تھے تیری نگاہوں سے پار پائے ہوئے
بہت لطیف اشارے ہیں دورِ حاضر کے
کچھ آج دُہلِ سکوں بھی ہیں تلملائے ہوئے
نثار کرنے کو تجھ پر کہاں سے لائیں خوشی
یہی ہیں کچھ غمِ پنہاں بچے بچائے ہوئے
وہی ہیں محو تبسم آج تک زمانے کی
وہی فسانۂ غم ہیں سُنے سُنائے ہوئے
مقدّروں کے بدلنے سے تجھکو کیا لیکن
یہ کام کس نے بگاڑے بنے بنائے ہوئے
یہ شادکامِ محبت، یہ رازدانِ نشاط
یہ لوگ اپنے لہو میں ہیں کیوں نہائے ہوئے
پھر آج اے نگہِ یاس چھیڑ ان آنکھوں کو
کہ مدتیں جنھیں گذری ہیں مسکرائے ہوئے
ہوا نہ جن کی کبھی پا سکیں حیات و ممات
دلوں میں ایسے بھی کچھ درد ہیں سمائے ہوئے

فراق تو ہی مسافر ہے تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

۲

تمھیں میں دل کی جہاں کوئی واردات ہوئی
حیاتِ تازہ سے لبریز کائنات ہوئی
چراغِ شامِ غریباں بھی جھلملا کے بجھے
مسافروں کو نئی منزلوں میں رات ہوئی
تمھیں نے باعثِ غم بارہا کیا دریافت
کہا تو روٹھ گئے، یہ بھی کوئی بات ہوئی
شریک رسمِ محبت ہے رسمِ دنیا بھی
نگاہِ لطف بھی صرفِ تکلفات ہوئی
تھک کے ہو گئے خود اپنی منزلِ مقصود
ہماری گمرہی بڑھ کر رہِ نجات ہوئی
حیات رازِ سکوں پا گئی، اجل ٹھہری
اجل میں لرزشِ پنہاں ہوئی حیات ہوئی
شبِ فراق میں اُٹھے حجابِ یاس و اُمید
تمام عمر میں بس ایک ہی تو رات ہوئی

بقائے پیام لبوں کا، فنا فسونِ نظر — فسانۂ دو جہاں اُس کی ایک بات ہوئی
تھی ایک کاوشِ بے نام دل میں فطرت کے — سوا ہوئی تو وہی آدمی کی ذات ہوئی
مظاہرات پھر اپنے میں ڈوب کر اُبھرے — بڑے کرشمے ہوئے ہیں تو رات رات ہوئی
یہاں سلامتیِ جاں کو موت کہتے ہیں — حیاتِ خضر محبت میں بے ثبات ہوئی
دیارِ دل میں یہ پرچھائیاں نہیں پڑتیں — حریمِ عشق میں دن ہی ہوا نہ رات ہوئی
جہانیوں پہ درِ خلد کھل کے بند ہوئے — نہ جب نجات ہوئی تھی نہ اب نجات ہوئی
ہزار رنگِ غمِ جاوداں نے بھی بدلے — ابد کی شام بھی وقفِ تغیرات ہوئی
بہت دنوں ہیں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی
کہاں یہ رنگ پشیمانیوں سے پیدا تھا — ادائے جور بھی رشکِ صد التفات ہوئی
ہر اک کی پرسشِ خاطر ہر اک کا پاسِ ملال — نگاہِ لطف تری صرفِ رسمیات ہوئی
ہزار دیدۂ انجم کھلے، مگر تجھ سے — نظر ملی تو کہیں زندگی کی رات ہوئی

فراق کو کبھی اتنا خموش دیکھا تھا
ضرور اے نگہِ ناز کوئی بات ہوئی

افکارِ جگر

(از حضرت جگر مرادآبادی)

اللہ رے یہ گلشنِ ایجاد کا عالم — جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم
اُف رنگِ رخِ بانیِ بیداد کا عالم — جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم
کیا جانیے کیا ہے مری معراجِ مقامی — عالم تو ہے صرف اک مری اُفتاد کا عالم
منصور تو سر دے کے سُبک ہو گیا لیکن — جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم
اربابِ چمن سے نہیں، پوچھو یہ چمن سے — کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم
آتی نہیں پھر دل سے دھڑکنے کی بھی آواز — کیا جانیے کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم

میں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت
تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم

تلسیؔ داس کے چند اخلاقی دوہے

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

پیغمبر اسلام کا مقولہ ہے کہ انسان کے جسم میں ایک ایسا پارۂ گوشت ہے جس کے سدھر جانے پر آدمی کی ہر بات سدھر جاتی ہے اور وہ دل ہے۔ اسی بنا پر فارسی زبان کے کسی شاعر نے کہا ہے کہ ع

"دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش"

ترجمہ ع "اپنا گرو تو مَن ہے اور ہم اُس کے چیلے"

لیکن ہمارے دیس کے شاعر نے اس کی تشریح اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ کر دی ہے ؎

مَن راجہ اور منتری نیناں

مل کے دوؤ چلا ویں سیناں (رامائن)

گویا علم اخلاق کا بنیادی پہلو یہیں سے ملتا ہے۔ دل اور آنکھیں ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہیں جیسے بادشاہ اور وزیر یا گورنر اور اُس کے منسٹرز

یہ تو ایک تمثیل ہوئی جو فنِ شعر نے پیش کی۔ اس کی تشریح مذہبی سائنس میں موجود ہے۔ وہ سائنس اہل اسلام میں تصوف اور ہندوؤں میں بھگتی کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کی عام شہرت شاعروں اور ادیبوں کے ذریعہ سے ہوئی۔ اُردو زبان میں میرؔ۔ میر دردؔ۔ آسیؔ اور اقبالؔ، ہندی میں تلسی داس۔ کبیرؔ اور سورداس کے علاوہ اُردو زبان سے زیادہ شاعر ہوئے ہیں جن کے دوہے گاؤں گاؤں میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

باباتلسی داس کے اخلاقی دوہے پڑھنے کے بعد یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شاعری دراصل پاک دل لوگوں کی عقل کا گیت ہے۔ یہ دوہے تین چار سو برس پہلے کی باتیں ہیں۔ اتنے عرصہ تک مستقل رہنے کے بعد

---

[1] گوسائیں تلسی داس ذات کے برہمن تھے۔ عہد اکبری میں ضلع باندہ کے ایک گاؤں راجہ پور میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے والد اتنے غریب تھے کہ آپ کی پیدائش پر انھیں چھوڑ دیا۔ کسی سادھو نے انھیں پالا۔ اس طرح کچھ عرصہ تک وہ بندیلکھنڈ میں رہے بعد ازاں بنارس گئے وہاں قیام پذیر ہو کر رامائن لکھی۔ ابو الفضل نے لکھا ہے کہ آپ کا انتقال ۱۰۳۳ھ ہجری میں ۹۱ سال کی عمر میں ہوا۔ آپ کے قدر دانوں میں عبدالرحیم خان خاناں کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ (مقبول)

عام اشعار کی طرح گھس پس کر ان کو فنا ہو جانا چاہیئے تھا کیونکہ عرصہ دراز تک کی دہرائی ہوئی بات جب تک ضرب المثل نہ ہو جائے سامعہ اُس کو قبول کرنے میں تکلف کرنے لگتا ہے، وہ نگاہوں سے گر جاتی ہے لیکن ان دوہوں کی آن بان اُسی طرح قائم ہے اور اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک الفاظ کے معانی اپنی اصلیت پر قائم اور حقیقی مفہوم کو ظاہر کرتے رہیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ جس مذہب میں کسی نہ کسی پہلو سے تصوف یا بھگتی کی آمیزش نہ ہو اُس میں کوئی رس نہیں رہتا۔ اس کی مثال ریگستان سے دی جا سکتی ہے، کیونکہ بے رس مذہب میں ریاض اور تپسیا کے بعد صفر ہے دل کو مردہ کرنے کا سامان زیادہ ہے، دل دکھانے اور پھر اس کو منانے کا کوئی پہلو نہیں، کیونکہ محبت کا عنصر ہی معدوم ہو جاتا ہے۔ سو اس لفظ "تصوف" کے معانی بھی اوپر ذکر کئے ہوئے مخالف مفہوم کی زد میں آ گئے، اور اب تصوف کاہلی، آرام طلبی، مکاری اور ٹھگی کا ایک بہانہ ہو کر رہ گیا۔ اب نہ تو "من راجہ" ہے نہ "نیناں منتری" خواہشاتِ نفسانی کی "سینا" یا فوج کو تربیت کون دے اور اس مایا کے سمندر میں کون زندگی کے جہاز کی ناخدائی کرے۔ اب تو پہلے زمانے سے کہیں زیادہ "شب تاریک" ہے، "بیم موج" کا کیا ٹھکانا پہلے سے کہیں بڑھکر بھیانک اور ہولناک گرداب حائل ہے "سبکسارانِ ساحل" ہی نہ رہے کہ ان پر رشک کیا جائے۔ اور اگر ہوں تو اُن کی شناخت نا ممکن ہے۔

اِس تمہید کے بعد آج ہمیں گوسائیں تلسی داس کے اخلاقی دوہوں سے کچھ ادب سیکھنا ہے۔ یہاں ہم صرف معدودے چند دوہے جو اخلاقیات سے متعلق ہیں اور جو زباں زد عام ہیں وہی لکھیں گے تاکہ اُن کی ادبی، اخلاقی، نفسیاتی اور تعلیمی خوبیوں کو دیکھیں کہ آیا بدستور قائم ہیں یا نہیں۔ اور اگر کسی کے دل کو یہ لگ جائیں اور دل پر اثر کر کے اس کے کردار کو بھی قابو میں کریں تو یہ اُن کی انتہائی مقبولیت ہوگی۔ محض ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِن دوہوں کی ملیح چٹکیاں، تمثیل و استعارہ سے مزین ترکیبیں اور دل فریب تاویلیں ابھی تک ویسی ہی اچھی معلوم ہوتی ہیں جیسی دو تین سو سال پیشتر رہی ہونگی۔ اس پر لطف یہ کہ کوئی دوہا ترنم موسیقی سے جو شعر کی جان ہے خالی نہیں صحبت کے اثرات پر پانی کے قطرے کی تمثیل دیکر وہ لکھتے ہیں:-

سیپی مکھ مکتا بھیو کدلی بھیو کپور
آہِ مکھ پڑ سو بکھ بھیو یہ سنگت دستور

(مکتا۔ موتی، کدلی۔ کیلا، آہ۔ سانپ، بکھ۔ بِس۔ زہر)

सीपी मुख मुक्ता भयो कदली भयो कपूर
अहि मुख पड़ो सो बिष भयो यह संगत दस्तूर

(ترجمہ) سیپ میں موتی بنا کافور کیلے میں ہوا
سانپ کے منہ میں پڑا تو سمِ قاتل ہو گیا

معرفتِ حق کی تلقین اولیائے کرام کا مشن رہی ہے۔ تلسی داس اس موضوع پر اس طرح لکھتے ہیں ؎

اَرَب کھَرَب لوں لکشمی، اُدے اَست لوں راج
تلسی ہری کی بھگتی بن یہ آوے کہہ کاج

(لکشمی = دولت۔ اُدے = مشرق، است = مغرب)

अरब खरब लौं लक्ष्मी उदै अस्त लौं राज
तुलसी हरी की भक्ती बिन यह आवे केहि काज

یعنی ارب کھرب کی تعداد تک دولت ہو یا مشرق سے مغرب تک کی حکومت، معرفتِ حق کے بغیر کس کام کی۔ اس دوہے کا مفہوم اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے بخوبی مل جاتا ہے ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو پھر اس سے کیا خوشی ہو کوئی جنٹ کوئی جج ہے

شکایت کا پہلو لے کر معرفتِ حق کے حصول کی راہ اس طرح بتائی جاتی ہے :-

پربھوتا کو سب کوؤ چہے پربھو کو چہے نہ کوئے
جو تلسی پربھو کو چہے تُرَت پربھوتا ہوئے

(پربھوتا = بڑائی۔ پربھو = خدا، تُرَت = فوراً)

प्रभुता को सब कोऊ चहे प्रभु को चहे न कोये
जो तुलसी प्रभु को चहे तुर्त प्रभुता होये

(ترجمہ) سب بڑائی چاہتے ہیں اُس بڑے کو چھوڑ کر
اُس بڑے کو چاہیئے دم میں بڑائی لیجئے

اس بڑائی کے حصول کا پہلا زینہ بھگتی یوگ میں تواضع ہے ؎

تلسی کہت پُکار کے سنو سکل دے کان
ہیم دان گج دان تے بڑو دان سنمان

(سکل = سب لوگ۔ ہیم = سونا) (گج = ہاتھی، سنمان = تواضع)

तुलसी कहत पुकार के सुनो सकल दे कान
हेम दान गजदान ते बड़ो दान सनमान

(ترجمہ)　کان دے کر سب سُنیں تُلسی کہیں ڈنکے کی چوٹ
نیل و زر کی بخششوں سے بھی تواضع بڑھ کے ہے

تلسی داس تواضع کا دستور اساسی اِس دوہے میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

تلسی جا سنسار میں بھانت بھانت کے لوگ
ہلیئے ملیئے پریم سے ندی ناؤ سنجوگ

तुलसी या संसार में भांत भांत के लोग
हिलये मिलये प्रेम से नदी नाव संजोग ॥

(ترجمہ)　ہر طرح کے لوگ اِس عالم میں رہتے ہیں بہم
زندگی کی ناؤ مِل مِل کر لگاؤ پار تم

اور ذیل کے دوہے میں آپ نے علم اخلاق کے دریا کو گویا کوزے میں بھرا ہے ؎

گیان غریبی ہر بھجن کومل بچن آدوکھ
تلسی کبھوں نہ چھاڑیئے چھما شیل سنتوکھ

ज्ञान ग़रीबी हर भजन कोमल बचन अदोष
तुलशी कबहू न छाड़िये छमा शील सन्तोष

(ترجمہ)　ہے نہیں ثروت میں جو ہے اس غریبی میں مزا
چھوڑنا ہرگز نہ دیکھو تم کبھی حلم و حیا
پاسداری اور اطاعت ہے خدا کا راستا
ہو سکے تو ہے جہاں تک درگذر کرنا خطا!

مہربانی، شفقت، پاسداری، مرحمت، کرم وغیرہ سب کا مفہوم مشہور ہندی لفظ "دَیا" میں آجاتا ہے، اس لئے اخلاق کے اِس پہلو پر آپ نے بہت زور دیا ہے اور لکھا ہے کہ ؎

دَیا دھرم کو مُول ہے نرک مُول ابھمان
تلسی دَیا نہ چھوڑیئے جب لگ گھٹ میں پران

(مول = جڑ، اصل، نرک = دوزخ، ابھمان = کبر، غرور، جب لگ = جب تک، گھٹ = تن)

दया धर्म को मूल है नर्क मूल अभिमान
तुलसी दया न छोड़िये जब लग घट में प्रान ॥

(ترجمہ) اصل دیں کرم و عنایت، کبر ہے دوزخ کی جڑ
جب تلک ہے دم میں دم دامن تواضع کا پکڑ

اِسی طرح کے صدہا دوہے لکھے جا سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف چند دوہے اور لکھتے ہیں:-

(اخلاق سے متعلق) (۱) تلسی جگ میں آئے کے کریجے دو کام
دیوے کو ٹکڑا بھلو لیوے کو ہری نام

(۲) مدُھر بچن سے جائے مِٹ اُوتّم جن ابھمان
تنِک سیت جل سے مِٹے جیسے دُودھ اُوپھان

(نرم گفتاری سے گھمنڈ کا سر بھی جھک جاتا ہے، جیسے ذرا سے پانی کے چھینٹے سے دُودھ کا اُبال دب جاتا ہے)

(۳) کچھو کہہ نیچ نہ چھیڑیے بھلو نہ وا کو سنگ
پاتھر ڈارے کیچ میں اُچھل بگاڑے انگ

(کمینے سے کچھ کہہ کے مخاطب نہ ہو اس کا ساتھ ٹھیک نہیں۔ کیچڑ میں پتھر ڈالوگے تو چھینٹیں جسم پر پڑکر جسم کو خراب کرینگی)

(۴) تن سُکھائے پنجر کرے دھرے رین دن دھیان
تلسی مٹے نہ باسنا بنا بچارے گیان

(سماج سے متعلق) (۵) جاہی تے کچھو پایئے کریئے تا کی آس
ریتے سرور پر گئے کیسے بوجھے پیاس

(جس سے کچھ ملنے کی اُمید ہو اُسی کی آس لگانا چاہیئے، سوکھے تالاب پر جانے سے پیاس کیسے بجھے گی)

(۶) بھلے بُرے سب ایک سے جو لوں بولت ناہ
جان پڑت ہے کاگ پِک (کوئل) رُت بسنت کے ماہ

(جب تک بولتے نہیں بھلے بُرے سب ایک طرح کے ہیں، بہار کے موسم میں معلوم ہوجاتا ہے کہ کون کوّا ہے کون کوئل)

(۷) نُدیا اترو ناؤ سے کال کرو سو آج
جو جاکو سوارتھ کرے سو تاکو مہراج

یہ چند دوہے مشتے نمونہ از خروارے اس لئے لکھے گئے ہیں کہ بھگتی اور تصوّف کا ذکر جو روز بروز مُردہ ہوتا جاتا ہے اِسی بہانے ہو جائے۔ تصوّر درکنار اب تو مذہب کا نام بھی سامعہ کو گراں بار ہونے لگا ہے۔ لیکن لامذہب تہذیب نے جو ڈھونگ رچایا تھا (مثلاً روس میں) اب اُس کی بھی قلعی کھُل رہی ہے۔ مذہب کے

حقیقی مفہوم سے متعلق شکوک تو ہر زمانے میں رہے ہیں۔ عرفی نے اس کا شکوہ کیا، حافظ نے شکوک ظاہر کیے بعضوں نے اس کو "رو افسانہ" سے تعبیر کیا، بابا تلسی داس نے بھی اسی قسم کی شکایت کی ہے ؎

اپنے اپنے مَنَن کی سبھوں نے لینی مان
ستیہ دھرم دو بدھارہی پڑی نہ کا ہو جان

یعنی:۔ (ترجمہ) اپنے اپنے مَن کی سب نے مان لی
سب نے آخر گمراہی کی ٹھان لی
سب رہے دھوکے میں سیدھی راہ کے
پر نہ یہ سمجھے کہ سب گمراہ تھے!

مگر اب اِس قسم کی شکایت ایک پرانی بات ہوگئی۔

مگر اس پستیِ اخلاق کے باوجود اخلاق کی تعلیم اب بھی بڑے زور شور سے جاری ہے۔ Ethics وغیرہ پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے گئے "تھیاسوفی" کی طرح نہیں معلوم کتنے "آرڈر" قائم ہوئے مگر بنی نوع انسان کی حالت بد سے بدتر ہی ہوتی گئی۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک "دل" کی اصلاح نہیں ہوگی آدمی کتنا ہی کیوں نہ پڑھ جائے جاہل ہی رہے گا۔ مصنف رامائن نے بھی نہایت بے تکلفی سے یہی کہا ہے ؎

کام، کرودھ، مَد، لوبھ کی جب لگ مَن میں کھان
تب لگ پنڈت مُورکھ ہے تلسی ایک سمان

یعنی جب تک دل نفسانی خواہشات بغض، طمع، لالچ اور نشہ بازی وغیرہ کی کھان یا معدن بنا ہوا ہے عالم اور جاہل میں کوئی فرق نہیں۔

اِس اخلاقی پہلو کے علاوہ اِن دوہوں کے لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی ہندوستان کے اس بڑے شاعر کے کلام کی طرف رجوع ہوں اور رامائن کو بت پرستوں کی کتاب سمجھ کے پسِ پشت نہ ڈال دیں، اس میں ان کے مطلب کی بہت سی باتیں ہیں۔ اس کے پڑھنے سے مثنویاتِ میر حسن اور دوسرے اخلاقی افسانوں کا لطف آتا ہے، اور ہندوؤں کی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، جن کو معلوم کر کے ہم ایک حد تک ان کی چھوت چھات مٹانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے بہت سی ایسی اخلاقی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ جن کو معلوم کر کے ہم اپنے مذہب کو اور مضبوطی سے سمجھ سکتے ہیں۔ بابا تلسی داس کی ہندی نہایت عام فہم ہے۔ اور بعض بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن اپنی زبان لکھ رہے ہیں۔ رامائن کی ہندی وہ ہندی نہیں جس کی ملک

ملک میں آج کل ترویج ہو رہی ہے۔ رامائن میں اس قسم کے زبان کی بو باس بھی نہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ایک ضمنی مقابلہ کیا جاتا ہے۔ میر حسن کا ایک شعر ہے ؎

نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پانی سے لاگ
بھری اُس کے دل میں محبت کی آگ

اسی مفہوم سے ملتا ہوا رامائن کا ایک شعر یہ ہے جو ٹھیٹھ رامائنی زبان ہے ؎

یہ دُکھ داہ دَہے نِت چھاتی
بھُوک نہ باسر نیند نہ راتی

اِس شعر میں صرف داہ (آگ) اور اس کا فعل "دہے" یعنی "جلے" غیر مانوس ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے الفاظ ہیں روزمرہ بولے جاتے ہیں، دوسرے مصرعہ میں لفظ "باسر" البتہ پُر تکلف ہے، باسر (دن) وہی ہے جسے اہلِ قریہ "باسی" یا ناشتہ کا وقت کہتے ہیں۔ اس طرح میر صاحب کے شعر کو اُلٹ دیا جائے تو خاص ترجمہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ؎

بھری اس کے دل میں محبت کی آگ
نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پانی سے لاگ

اس طرح اکثر الفاظ جو ہم روزمرہ بولتے ہیں رامائن میں کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں نظر آئیں گے جو ایک خاص کیفیت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہونگے۔

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش
جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار
جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے فرار

آہ اُمیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی

اگر آتی ہے نسیمِ چمن طور کبھی!
سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مری تارِ حیات
جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتارِ حیات

نغمۂ یاس سے دھیمی سی صدا اُٹھتی ہے
اشک کے قافلے کو بانگِ درا اُٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
مری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

محمد اقبال (مرحوم)

رباعیاتِ جوشؔ

(۱)

خاتم سے علیحدہ نگیں ہوتی ہے
روتی ہوئی چشمِ سرمگیں ہوتی ہے
جھونکوں میں یہ آہٹ کسی کی ہیں آوازیں
یہ کون ہے کیا تم ہو؟ نہیں ہوتی ہے

(۲)

اے دردِ نہاں دوچند ہو جائیں ہم
اے موجِ الم اور بلند ہو جائیں ہم
ہاں اے حرکت اے جوش سے کر دل کی حرکت
عبرت ہو اگر تو بند ہو جائیں ہم

(۳)

آلامِ جہاں کا منھ اُتر جاتا ہے
ہر غم سے کلنک سے گھبراتا ہے
لیکن جب سے کہ سینے میں غمِ عشق اے جوش
وہ نشہ سے کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے

(۴)

نشہ میں بھی آہِ سرد بھرتا ہوں میں
لمحاتِ حیات میں بھی مرتا ہوں میں
اس بات کی تو گواہ رہنا اے مے
ہر گھونٹ پر ان کو یاد کرتا ہوں میں

جوشؔ

ٹیگور کا فلسفۂ موت

(از مسٹر نکہت انصاری بدایونی)

چونکہ خوابِ زندگی کی لازمی تعبیر موت ہے اس لئے ہر ذی حیات اپنے اوقات فکر کا تھوڑا بہت حصہ موت کی ماہیت معلوم کرنے میں ضرور صرف کرتا ہے۔ جو لوگ اس مسئلہ کا سطحی طریقہ پر مطالعہ کرتے ہیں انھیں موت ایک بھیانک چیز معلوم ہوتی ہے جس کے خیال ہی سے دل و دماغ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ان سرسری نظر سے دیکھنے والوں سے قطع نظر کرتے ہوئے آج ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ٹیگور کے نزدیک موت کا فلسفہ کیا ہے۔

موت کی تلخی کو خوشگوار بنانے میں انسان کی سب سے زیادہ مدد مذہب نے کی ہے، جس کے بعد دوسرا درجہ شاعری کو دیا جا سکتا ہے۔ ٹیگور نے ہمارے سامنے ہندوستان کے قدیم دانشمندوں کے فلسفے کو شاعری کے رنگین لباس میں کچھ اس صورت سے پیش کیا ہے کہ مذہب اور شاعری کے درمیان کی خلیج ایک بڑی حد تک پٹ گئی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں موت کا بھی غائر مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے ہمیں بتایا ہے کہ موت کا کس طرح مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اور واقعہ تو یہ ہے کہ انھوں نے مرگ و حیات کے اسرار کی ہیئت سی بدل دی۔ چنانچہ ان کے نزدیک موت کوئی دہشت ناک چیز نہیں ہے بلکہ حقیقت کے تلاش کی نہ بجھنے والی تشنگی نے انھیں موت میں بھی امرت کا پتہ دیا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اُن کو موت کا ایسی دلیری سے مقابلہ کرنا چاہیئے کہ اس کے چہرے پر تبسم کے آثار نمایاں ہوں ٹیگور کے نزدیک موت اور زندگی ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"جسے تم زندگی سمجھتے ہو اُسی کا دوسرا نام موت ہے۔ موت کوئی اجنبی چیز نہیں ہے۔ اس لئے جب یہ آئے تو اس سے خوشی سے بغلگیر ہو جاؤ اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دو۔"

ٹیگور موت کو ایک عظیم الشان شئے سمجھتے ہیں۔ موت ان کی نگاہ میں محبوب مطلوب کے مانند ہے جس کی آمد کا شوق و اضطراب کے ساتھ انتظار کرنا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں:-

"موت! تو میرے لئے کرشن کی طرح ہے!"

اُن کے خیال میں جامِ حیات میں اگر موت کی شیرینی کی آمیزش نہ ہوتی تو زندگی میں تلخی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ اسی لئے ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے:۔

"تم نے میری زندگی میں موت کی شیرینی حل کر دی۔"

ٹیگور اپنے اوپر موت کی اتنی ہی تواضع فرض سمجھتے ہیں جتنی ایک عزیز مہمان کی اور یہی سبق وہ دوسروں کو پڑھاتے ہیں:۔

"جس دن موت تمہارے دروازے پر دستک دیگی تو تم اُس کو کیا پیش کروگے؟ میں تو اُس کے سامنے اپنی زندگی کا لبریز جام رکھدوں گا، میں اُسے خالی ہاتھ کبھی نہ جانے دونگا۔"......"

ٹیگور کی رائے میں موت کا انتظار ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے، اور شادی کی طرح موت بھی ایک متبرک رسم کی ادائیگی کا موقعہ ہے۔ موت کو مخاطب کرکے وہ کہتے ہیں،

"موت! اے آخری ایفائے حیات!! آ اور مجھ سے سرگوشی کر،
میں تیرے لئے شب و روز بیدار رہا ہوں، تیرے ہی لئے زندگی کے تمام عیش و غم برداشت کئے ہیں۔ پھول جمع کرکے میں نے دولھا کے لئے ہار تیار کرلیا ہے۔ شادی کے بعد دولھن اپنا دیس چھوڑ دیتی ہے، اور رات کی تنہائی میں اپنے پتی سے ملتی ہے۔"

موت کے وقت وہ اپنے احباب کو رنج و ماتم اور گریہ وزاری کرنے کے بجائے خیرباد کہنے کی ہدایت کرتے ہیں:۔

"میرے دوستو! میری جدائی کے وقت مجھے خیرباد کہو! پَو پھٹنے سے آسمان دمک اٹھا اور میرا رستہ خوبصورت ہوگیا........"

ٹیگور موت کو ایک قابلِ قدر چیز قرار دیتے ہیں:۔

"موت میرے لئے اجنبی نہیں ہے، میں اسے ہمیشہ سے جانتا ہوں، اور جس طرح میں اس زندگی سے محبت کرتا ہوں اُسی طرح مجھے یقین ہے میں موت سے بھی محبت کرونگا۔"

ٹیگور موت کے بعد زندگی کا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ موت زندگی کے ڈرامے کا آخری منظر نہیں ہے، اسی وجہ سے وہ اس سے بخوشی دوچار ہونا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ اسے زندگی کے راستے میں ایک ضروری واقعہ تصور کرتے ہیں جو زندگی میں دائمی طور پر خلل انداز نہیں ہوتا۔ ان کا قول ہے کہ:۔

"ہمیں جان دی گئی اور ہم جان دے کر زندگی حاصل کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں:۔

" زندگی کے رتھ کا کلس موت ہے۔"

موت زندگی کی شیرازہ بندی کرتی ہے، اور جب یہ اوراقِ پریشاں یکجا ہو جاتے ہیں تو ہم پر بہت سے راز جو زندگی میں سمجھ میں نہیں آتے عیاں ہو جاتے ہیں۔

" میری روزانہ زندگی میں جو جو چیزیں مہمل، شکستہ اور غیر مرتب تھیں، موت نے ان سے اپنا گلدستہ مرتب کر لیا اور اس کے معنی پہنا دیئے۔"

ٹیگور نے غور و فکر کرتے کرتے بہت سی چیزوں میں ایک لازوال حقیقت کا سراغ پا لیا ہے، اسی لئے انھیں زندگی سے غیر ضروری لگاؤ نہیں ہے اور نہ وہ موت سے خائف ہیں، کیونکہ وہ اُس کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں:-

" میں نے دنیا کی روشنی سے محبت کی، اسی لئے میں زندگی کو عزیز رکھتا ہوں، تاہم مجھے اس کا بھی پورا احساس اور تصور ہے کہ مجھے مرنا ہے۔"

وہ زندگی کی محبت میں اتنے نہیں کھو گئے کہ اپنی موت کے خیال کو فراموش کر دیں۔ مختصر الفاظ میں ٹیگور نے ہمیں زندگی اور موت دونوں کے اُصول بتائے۔ ان کا فلسفیانہ انداز مطالعہ کرکے شاعرانہ طریقے سے ہمارے روبرو پیش کیا۔ وہ موت کی ہمہ گیری کے لحاظ سے موت کو ایک بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اور اُسے جادۂ زندگی کا رہنما سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

" بادل نے مجھ سے کہا، میں غائب ہو جاتا ہوں، رات بولی، میں مطلعِ آتشیں میں غروب ہو جاتی ہوں، زندگی نے کہا میں عالمِ عنفوان میں طعمۂ اجل ہو جاتی ہوں، زمین بولی، میری روشنی تمھارے خیالات کو ہر لحظہ بیدار کرتی ہے۔

محبت نے کہا، دن گذرتے جاتے ہیں مگر مجھے تمھارا انتظار ہے۔

موت بولی، میں ہی سمندر میں تمھاری زندگی کی کشتی کو کھیتی ہوں۔"

یارانِ عدم

اے صبا اِک دن چلی جا سوئے یارانِ عدم — تجھکو تو معلوم ہو گی کوئے یارانِ عدم

کام کب آئے گی اے ظالم تری اٹھکھیلیاں — لا کبھی ہم کو سونگھا دے بوئے یارانِ عدم

دیکھ جا کر اے صبا آخر وہ کیا کرنے لگے — کیا وہاں دل لگ گیا حوروں کا دم بھرنے لگے

دیکھنا جا کر وہاں شاید تماشا ہو کوئی — یا کوئی میلہ ہو یا حوروں کا جلسہ ہو کوئی

مرنیوالے کیوں چلے جاتے ہیں دنیا چھوڑ کر — کیا خبر شاید کہ زیرِ خاک دنیا ہو کوئی

تاج محل دیکھکر

(افکار تازہ خاں صاحب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی)

تاج! اے روشن گرِ آفاق اطرافِ جہاں
پتھروں میں ہیں ترے کس روح کی چنگاریاں
اے تری تعمیر وجہِ نازشِ ہندوستاں
اے کہ تجھ پر فخر کرتے ہیں زمین و آسماں

نورِ مہر و ماہ تیرے حُسن کی تنویر ہے
اے کہ تو شاہ جہاں کے خواب کی تعبیر ہے

تجھ میں پوشیدہ ہیں حُسن و عاشقی کے ولولے
کھنچتے ہیں دل ترے مینارِ عالی دُور سے
حبذا! موت اُس کی جس کو مقبرہ ایسا ملے
زندگی سو مرتبہ قربان ایسی موت کے

ہاں زمیں پر خلد کا رنگین نظارہ ہے تو
آسماں پر مہر و مہ کی آنکھ کا تارہ ہے تو

سو رہی ہے تجھ میں وہ ہندوستاں کی نازنیں
جس کا ثانی آج تک اِس دہر نے دیکھا نہیں
تیرے سنگ و خشت میں ساری ہی روح یاسمیں
تیرے در پر عالمِ امکاں جُھکاتا ہے جبیں

اہلِ فن کی رنگ آمیزی کا اک جادو ہے تو
دیدۂ شاعر کا یا ٹپکا ہوا آنسو ہے تو

سرزمینِ آگرہ گلزارِ جنت تجھ سے ہے
زندہ عہدِ مغلیہ کا حسنِ صنعت تجھ سے ہے
دورِ اسلامی کی باقی شان و شوکت تجھ سے ہے
تجھ سے ہے ہندوستاں تابانِ عزت تجھ سے ہے

ہندو و مسلم کو وجہِ ناز ہے تیرا وجود
ساری تعمیرات میں ممتاز ہے تیرا وجود

یادگارِ الفتِ شاہِ جہانی تو ہے تو
دہر میں سچی محبت کی نشانی تو ہے تو
عشقِ باہم کی بدولت جاودانی تو ہے تو
سچ تو یہ ہے لازمانی، لامکانی تو ہے تو

اے مجسّم سر سے پا تک صورتِ مہر و وفا
تجھ سے باقی ہے جہاں میں عزتِ مہر و وفا

رو کش گلزار جنت ہیں ترے نقش و نگار — تیرے در پر تو خزاں بھی آ کے بنتی ہے بہار
کتنے گلشن ہیں تری ہر پنکھڑی میں بیقرار — اے گلستانِ محبت کی انوکھی یادگار
اے حسینہ مولدِ ماہر میں تیرا راج ہے
تیرا ہر ذرہ سر صنعت گری کا تاج ہے

بہن سے

(سانٹ)

(از منشی شانتی سروپ کیف)

اِس مقدس نام میں ہے کس قدر پاکیزگی — دیوتا بھی اِس کے گُن گاتے ہوئے تھکتے نہیں
اے بہن! درگا کہوں تجھ کو کہ سیتا لکشمی — تیرے پاؤں چُومتی رہتی ہے تاروں کی جبیں

بھائیوں کے واسطے اِک سایۂ رحمت ہے تو — تجھ سا کوئی بھی نہیں، دیکھا ہے مَیں نے کُل جہاں
اے بہن! ٹوٹے ہوئے دل کی مری راحت ہے تو — اے بہن! تیرے سوا ہے کون میرا ہمزباں

آرزو یہ ہے کہ مَیں ہر دم تری سیوا کروں — اے بہن! جس طرح بھی ہو مَیں ترا بھائی بنوں
تیرے چرنوں میں رہوں مَیں اور تری پُوجا کروں — تجھ سے اپنے اضطرابِ دل کا افسانہ کہوں
فخرِ اہلِ خانداں ہے تو بہت ممتاز ہے
تجھ پہ اِس نادار بھائی کو خصوصاً ناز ہے

رُباعی

داغِ غم و اندوہ کو دھو لیتا ہوں — تکیئے کو مَیں رو رو کے بھگو لیتا ہوں
جب آنکھوں سے بہہ جاتا ہے دریائے سرشک — جی ہلکا سا ہو جاتا ہے سو لیتا ہوں

پُرانی قلمی تحریریں

از حضرت وصل بلگرامی

جس وقت ہم پُرانی قلمی تحریروں یا پُرانے قلمی نسخوں کی بابت چھان بین کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمکو سوچنا چاہئے کہ سب سے پہلے کیا اور کس طرح لکھا گیا؟ اگر ہم لکھنے کی ابتدا پر غور کریں تو اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ لکھنے کی ایجاد اس لئے ہوئی ہوگی کہ ایک بات کو بالکل اُسی طرح وقت یا جگہ کی قید دُور کرکے قائم رکھا جا سکے۔ یعنی اگر لکھنؤ میں ہیں اور کوئی دوسرا شخص سہارنپور میں ہو۔ تو ایک دوسرے کو اپنی بات کس طرح پہونچائے؟ یا اگر ایک شخص جو اپنے مرنے کے بعد دوسری نسلوں کو اپنی باتیں بتانا چاہے تو کیسے بتائے؟ یا اگر کوئی شخص کسی بات کو یاد کرنا چاہئے تو کس طرح یاد کرے؟

لیکن ہمارا وہی سوال ابتک باقی رہتا ہے کہ سب سے پہلے کیا اور کس طرح لکھا گیا ہوگا؟ پہلے سوال کی بابت تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ دوسرے سوال کی بابت قیاس آرائیاں کر سکتے ہیں۔ جس طرح گفتگو کا آغاز اشاروں سے ہوا اُسی طرح تحریر کی ابتدا بھی اشاروں سے ہوئی تھی۔ رچرڈسن تحریر کی ابتدا کے متعلق ایک بڑی دلچسپ بات کہتا ہے کہ دُنیا کی سب سے پہلی کتاب اُس کا حافظہ تھا یعنی جب اُس نے ایک بات کو بہت دنوں کے لئے محفوظ رکھا ہوگا۔ آجکل جو اُس کے متعلق چھان بین کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا تصویروں سے ہوئی۔ حالانکہ ہماری بعض قدیم یادگاریں اس نظریہ کی مخالفت کرتی ہیں۔ تصویروں کے بعد انھیں عام تصویروں کو مختصر کرکے لکھا جانے لگا۔ اس بارہ میں سب سے بڑا ثبوت جو ہم کو ملتا ہے وہ علم نجوم میں بارہ برجوں کی تصویریں ہیں تحریر کا دوسرا درجہ Ideographs ہے جبکہ خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے جنمیں سے بہت سے اب تک باقی ہیں مثلاً تیر اور ہاتھ کے نشانات سے یہ کہا جاتا ہے کہ ادھر جاؤ۔

اس کے بعد تیسرا درجہ فونوگرام کا ہے جبکہ تصویروں اور خیالات کو آوازوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ چوتھا درجہ وہ تھا جب انھیں فونوگرام کو آسان کرکے ارکان بنائے گئے اور آخری درجہ وہ تھا۔ جب انھیں ارکان کی مدد سے الفاظ بنے جیسا کہ اب تک ہو رہا ہے۔

Syllables. ارکان Phonogram. فونوگرام

اب تک ہم جس نتیجے پر پہونچے ہیں وہ یہ ہے کہ لکھنے کی ابتدا، افریقہ میں ہاتھوں پر تصویریں بنانے سے شروع ہوئی۔ اور اس کے بعد قدیم مصری تصویروں سے ارکان کی امداد لے کر مصری اور سیمیٹک[1] لوگوں نے بائیس[2] حرفوں کا ابجد[2] تیار کیا جس کو صوتی ابجد[3] کہا جاتا ہے۔ یونانیوں نے اسی ابجد کو لے کر تھوڑی سی تبدیلی سے اپنا ابجد تیار کیا۔ اس کے بعد مغربی ممالک میں دوسرے ابجد یعنی حروف تہجی بنے۔ فارسی طرز تحریر اسی صوتی ابجد کی انتہائی ترقی ہے۔ چین اور جاپان کی تحریر اب تک بہت کچھ قدیم زمانہ کی یاد دلاتی ہے۔ مسٹر ایونس (Evans.) نے اپنی کتابوں[4] میں بڑی بڑی معلومات پیش کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لکھنے کی یادگاریں اسوقت تک کی موجود ہیں، جن کی تاریخ بھی ہم نہیں جانتے۔

اس قسم کی سب سے قدیم تحریری تصویریں جو ہم کو ملتی ہیں وہ کوہستان پیرینیز[5] کے غاروں کی Palimpsests. چٹانوں میں ملتی ہیں۔ یہ نشانات متمدن زمانہ کی تحریری تصویروں کے مقابلے میں ہمارے حروف سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ان پتھروں پر کیا تحریر ہے؟ اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن باوجود اس کے کہ ہم اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اگر یہ تحریریں نہیں ہیں تو پھر اور کیا ہیں۔ اُس زمانہ کا ایک پتھر فرانس کے عجائب خانہ[6] میں ملتا ہے۔ جسمیں X, H, S, I, V, m. بالکل صاف پڑھے جاتے ہیں۔

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں دُنیا کے مختلف عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ ان کا ذکر کہاں تک کیا جائے بہرحال یقینی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہی قدیم نشانات ہمارے موجودہ ابجد کا پہلا زینہ ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص نے انھیں کو دیکھکر موجودہ ابجد تیار کیا ہو اور مشرق کی تصویری تحریروں کے بجائے یہ نشانات بنائے گئے ہوں۔

اُس کے بعد تاریخ کا وہ عہد آتا ہے۔ جس کی بابت ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں لکھنا شروع ہوا ہوگا۔ برٹش میوزیم میں میسوپوٹامیا کی Balau. یادگاروں میں ایک تصویر ہے۔ جس میں آدمیوں کی تصویروں کے علاوہ اور مختلف قسم کے نشانات بھی ہیں۔

۱۹۲۴ء میں میسوپوٹامیا کے شہر کش[7] میں جو کھدائی ہوئی تھی اُس کی کچھ یادگاریں پیرس میں موجود ہیں۔ یہ تحریر تصویروں والی یا Ideograph. نہیں ہے، بلکہ سیدھی سادی لکیروں میں بنائی گئی ہے۔ اس کی شکل بہت کچھ Phonoetic. کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک اور یادگار ہے جس کو چکنی مٹی میں سینگ یا قلم کی قسم کی کسی دوسری چیز کو چبھا کر لکھا گیا ہے۔ اسمیں دُنیا کی پیدائش کی وہ کہانی لکھی ہے جو اہل

---

[1] Semetic. [2] Alphabet. [3] Phonetical
[4] European diffusion of primitive Scripta minorita Pictography.
[5] Pyrenaeon [6] Lamadeleine. [7] Kish.

بابل میں مشہور ہے۔ اس سے ارتقاء کا بہت کچھ پتا ملتا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک اور کتبہ موجود ہے جو Behistun inscription کے نام سے موسوم ہے۔

یہ دارائے اعظم کے کارناموں کا ریکارڈ ہے۔ اور نامعلوم زبانوں کی معلومات میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے۔ اسکی بابت ۱۶۲۱ء میں پہلی معلومات جو Pietro della Valla نے کی تھی یہ تھی کہ یہ طرز تحریر نامعلوم ہے اور معلوم نہیں کہ یہ کونسی زبان میں لکھا گیا ہے ۱۸۴۲ء میں ہنری راولنسن[1] نے اس کو پڑھ کر لوگوں کی آنکھیں کھولدیں اس نے ثابت کیا ہے کہ یہ زبان قدیم فارسی ہے۔ اس کے پڑھنے میں ژند سے بہت کچھ مدد ملی۔

ابھی تک ہم نے جن تحریروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ پتھر یا مٹی پر ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں بڑی مشکل پیش کرتی ہیں۔ اس آسانی کے لئے لوگوں نے ہلکی چیزیں اپنی تحریروں کے لئے استعمال کیں۔ یہیں سے کتاب لکھے جانے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہم کو پھر مصر میں واپس ہونا پڑے گا۔ مصریوں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے درختوں کی چھالوں پر لکھنا شروع کیا خوش قسمتی سے ان کو ایک نہایت موٹی اور ہلکی چھال والا درخت Papyrus. مل گیا۔ اور اسی وقت روشنائی اپنی پہلی شکل میں استعمال کی گئی اور غالباً اسی Papyrus سے ہمارا لفظ Paper. (یعنی کاغذ) بھی وجود میں آیا ہو۔

یہ کتابیں آجکل کی طرح نہ ہوتی تھیں بلکہ ایک بڑی لمبی چھال کو لپیٹ کر کتاب بنتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم چٹائی کو لپیٹ کر کونے میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کو ایک چھوٹی سی لپٹی ہوئی چٹائی سمجھئے۔ اس کے بعد کاغذ کی مختلف صورتیں بنیں اور پھر کتابیں بھی اچھی سے اچھی بنتی گئیں۔

جس طرح دُنیا کی مختلف ایجادیں مذہب کی رہین منت ہیں۔ اسی طرح لکھنا اور کتاب بھی ہے۔ یہ لکھنے میں ہمیں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہئے کہ سب سے پہلی تحریریں اور سب سے پہلی کتابیں مذہبی تھیں مصر کی ایکسپلوریشن سوسائٹی[2] کے پاس انجیل کا ایک نسخہ ہے جو یونانی زبان میں Papyrus. پر لکھا ہوا ہے۔ ایک نسخہ پاپائے اعظم کی لائبریری میں چوتھی صدی کا ہے۔ یہ بھی یونانی زبان میں Papyrus پر لکھا ہوا اسی شکل کا ہے جو پہلی کتاب کی شکل تھی۔ انجیل کے Papyrus. پر لکھے ہوئے نسخے کلیرنڈن پریس، برٹش میوزیم اور کیمبرج یونیورسٹی میں ہیں۔ انمیں پہلا نسخہ چوتھی صدی کا ہے اور دوسرے نسخے چوتھی اور پانچویں صدی کے بتائے جاتے ہیں۔ کچھ نسخے انجیل کے عبرانی زبان میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ انمیں سب سے زیادہ اہم Massoratic Text ہیں جو ۹۱۶ء کے کہے جاتے ہیں۔ اسفار موسیٰ کے نسخے بھی برٹش میوزیم اور کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں جو عبرانی زبان میں ہیں۔ چوتھی صدی سے پہلے کی کوئی انجیل ہم کو نہیں ملتی کیونکہ اس سے پہلے سلطنتیں عیسائی نہیں تھیں

[2] Egyptian Exploration Society.
[1] Henry Rawlinson.

چوتھی صدی میں سلطنت روم عیسائی ہوگئی۔ چوتھی صدی کے نسخوں کے کچھ ٹکڑے کہیں کہیں ملتے ہیں۔ جو تمام شمالی مصر سے
سے دریافت ہوئے ہیں۔ چوتھی صدی سے لے کر چھاپے خانہ کی ایجاد تک تقریباً چار ہزار انجیل کے نسخوں
کی بابت علم ہو چکا ہے۔ انمیں سے زیادہ تر گیارہ صدی سے چودہ صدی تک ہیں۔

سلطنت کے عیسائی ہوجانے کے بعد اس امر میں کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ایک نسخے میں لاکھوں روپیہ
صرف ہوجاتے تھے۔ اسی طرح قرآن شریف کے بڑے بڑے قیمتی نسخے آج بھی اکثر جگہ موجود ہیں۔ بڑے بڑے
کتبخانوں کے علاوہ مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کے اُس کتبخانہ میں جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
کے سپرد کر دیا ہے۔ میں نے قرآن مجید کے ایسے ایسے مطلا و مذہب نسخے دیکھے ہیں۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے
انمیں وہ وہ صنعتیں اور دستکاریاں کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے۔ نہ معلوم کتنے قسم کے خطوط
میں لکھے گئے ہیں۔ کس کس قسم کی قیمتی روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ جواہرات حل کئے گئے ہیں۔ نہ جانے کس طرح
اور کس قدر سونا چڑھایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت اس کی عظمت اور اس کی بقا کا خیال جو
مسلمانوں نے کیا ہے شاید ہی کسی قوم نے کیا ہو۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے ہاتھ سے قرآن شریف لکھنا اپنے لئے
باعث برکت اور سبب نجات سمجھا۔ آج بھی بہت سے مسلمان بادشاہوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے
نسخے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے اب بھی نظر آتے ہیں۔

ہم نے یہ اُس وقت تک کا ذکر کیا ہے جب تک چھاپے کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور ہمارے خیال میں تحریری
نسخوں کا قدیم زمانہ اسی زمانہ کو کہنا چاہیئے۔ ورنہ یوں تو ہر قلمی تحریر کو تحریری نسخہ کہا جاسکتا ہے۔ اور تقریباً ہر زمانہ کے
قلمی اور نادر الوجود نسخے اب ہندوستان کے عربی، فارسی اور اُردو کُتب خانوں میں موجود ہیں جو ایک تاریخی حیثیت
رکھتے ہیں۔ رام پور میں ریاست کا کتبخانہ، پٹنہ میں خدا بخش خاں کی لائبریری۔ لالہ سری رام مؤلف خمخانۂ جاوید کا جمع کردہ
نادر کتابوں کا مجموعہ یہ سب قابل دید ہیں۔ حیدرآباد میں نواب سالار جنگ بہادر کا کُتب خانہ بہت مشہور ہے۔
انمیں نادر قلمی نسخے ایسے ایسے موجود ہیں جو ہر حیثیت سے قدیم مسودات کہلانے کے مستحق ہیں۔

ان جواہرات کو دیکھکر اپنی بے بضاعتی کے باوجود میری طبیعت میں ایک جوش پیدا ہوا۔ اور قدیم و نایاب
قلمی تحریروں کے جمع کرنے کا شوق بڑھا۔ چنانچہ ایک زمانہ وہ آیا کہ میں نے بھی اپنی بے بضاعتی کے باوجود پُرانی
کتابوں اور اگلے بزرگوں اور قدیم ادیبوں کی تحریریں جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ میں یہ کہنے میں نہایت فخر محسوس
کرتا ہوں کہ اس امر میں میں اپنی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہوا۔ اور میرے پاس بھی کچھ جواہر پارے جمع ہوگئے
کہ جن کا تعلق دیکھنے سے ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے مقدس مکتوبات میں سے ایک گرامی مکتوب کا بلاک مجھے خوش قسمتی سے حاصل ہو گیا۔

جس پر مہر مبارک بھی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے اصل کاغذ کو کہیں کہیں سے کیڑوں نے کھالیا ہے۔ لیکن مہر مبارک محفوظ ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ کے عکس تحریر اور حضرت حقی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے علاوہ اور بہت سے بزرگانِ دین کی تحریریں اور عکس تحریر مجھے دستیاب ہوگئے۔ رند کے ہاتھ کا لکھا ہوا تجر کا دیوان جس پر ناسخ کی اصلاح ہے میرے ناچیز سرمایہ میں ہے۔

جب اس شوق نے جنوں کی صورت اختیار کرنا چاہی تو میں نے جدت کی زنجیروں سے اس کو پابند کر دیا۔ وہ اس طرح سے کہ جب میں نے ۱۹۲۵ء میں اپنا ادبی رسالہ مُرقع جاری کیا، تو بجائے اِدھر اُدھر کی تصویروں کے دوسری ادبی چیزوں سے اس کی دلچسپی اور اہمیت میں اضافہ کیا۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مشہور ادبار و شعراء کے مضامین کے ساتھ ساتھ اُن کے عکس تحریر کو رسالہ میں شامل کیا اور جن قدیم شعراء کی تحریریں مل سکیں یا جو میرے پاس تھیں اُن کے عکس سے رسالہ کو زینت دی۔ یہ طریقہ ادبی حلقوں میں اِسقدر مقبول ہوا، کہ اب مجھے اپنی بے مائگی کا احساس جاتا رہا۔ اس سلسلے میں جو طریقے میں نے اختیار کئے اور جو جو دقتیں مجکو پیش آئیں، وہ طویل داستان ہے۔ جس کے تذکرہ کے لئے بھی ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے مختصر یہ کہ سیکڑوں مشہور شعراء اور ادبار کی تحریروں کا عکس اور اُن کی اصل تحریریں میرے پاس جمع ہوگئیں۔ جنہیں خصوصاً قابلِ ذکر یہ ہیں۔

غالب۔ حالی۔ آزاد۔ نواب مشتاق حسین۔ قدر بلگرامی۔ علامہ سید علی بلگرامی۔ اسیر۔ تجر۔ شبلی نعمانی۔ اوج۔ جاوید۔ عارف۔ فصاحت۔ انجم۔ محسن کاکوری۔ مولوی عبدالحلیم شرر۔ داغ۔ امیر مینائی۔ ریاض۔ جلال۔ شوق قدوائی۔ مولوی امداد امام اثر۔ حکیم محمد علی خاں ناولسٹ۔ شوق نیموی۔ مولانا آسی غازی پوری۔ اقبال۔ چکبست اور دیگر شعراء و ادبار۔

جی تو یہی چاہتا ہے کہ دل کھول کر ان جواہر پاروں کا تذکرہ کروں۔ لیکن اسوقت نہ اسکا موقعہ ہے اور نہ گنجائش لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جس طرح پُرانی تحریروں، پُرانی کتابوں، پُرانے فوٹو اور پُرانی یادگاروں کی قدر آج یورپ اور تمام دُنیا نے کی۔ ایک دن وہ آئیگا جبکہ میرے اس ناچیز سرمایہ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ جواہر آپ کو کہیں دستیاب نہیں ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ ملیں لیکن یہ موتی آپ کو بکھرے ہوئے ملیں گے۔ لُطف یہ ہے کہ یہ ادبی گوہر آپ کو ایک جگہ منظم اور منسلک ملیں اور آپ کہہ اُٹھیں ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں   اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

یہ ہے پُرانی چیزوں، پُرانی تحریروں، پُرانے نسخوں اور قدیم خصوصیت رکھنے والی چیزوں کی عظمت۔ ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں، اور اتنی قیمت ہے کہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

نظمِ اتحاد

(مصنفہ سید انور حسین آرزو لکھنوی)

بتکدہ و حرم سے آج تھوڑی سی خاک لائیں گے / پھر یہ بزمِ اتحاد جام و سبو بنائیں گے

ساقی و پیر میکدہ اور کہاں سے آئیں گے / بزم سے شیخ و برہمن بچ کے نہ جانے پائیں گے

جو شبِ تیرۂ نفاق ڈالے ہوئے ہے تفرقہ / بیٹھیں گے روشنی میں سب شمع وہ اک جلائیں گے

صلح میں ہوں کہ جنگ میں ہونگے سب ایک رنگ میں / نشہ ہے جس کا عین ہوش آج وہ مے پلائیں گے

رہنا تو ہے اسی جگہ بسنا تو ایک گھر میں ہے / جائینگے بھاگ کر کہاں آگ اگر لگائیں گے

صبر سے ہو کہ جبر سے، ہو وہ غرض کسی طرح / دیں گے جو دوسروں کو دکھ خود ہی وہ سکھ نہ پائیں گے

دھار گلے پہ تیغ کی اس پہ یہ باہمی کشش / کام تمام ہو گا جلد گردن اگر ہلائیں گے

کھو دیا پاس ہی سے کچھ غیظ میں جب ابل پڑے / صاحبِ ظرف ہیں اگر جوش میں اب نہ آئیں گے

لاکھ بدی کرے کوئی، لاکھ برا کہے کوئی / ہاں لے یہ دل سے کہہ تو دو اب یقین لائیں گے

صبر و تحمل، آرزو، بیخ کن نفاق ہیں / اب انھیں جوہروں کی ہم تم کو چمک دکھائیں گے

طرزِ عمل وہ چاہیے، جو ہو پسند و دلپذیر / جن کی روش جدا ہے آج، راہ پہ وہ بھی آئیں گے

گو کہ جواب ہے یہی، منھ پہ مگر نہ آنے پائے / چھیڑیں گے ہم بھی پھر ضرور آپ اگر ستائیں گے

ہو اگر اشتعالِ طبع کہہ کے یہ خاک ڈالیے / سر نہ اٹھانے پائے گا شعلہ کو یوں دبائیں گے

میل نہ تیوروں پہ ہو جب یہ سخن زباں پر آئے / روٹھنے والے روٹھ جا پھر تجھے ہم منائیں گے

ذبح کرے گا پھر وہ کیا جس سے یہ ہنس کے کہہ دیا / لیجیے جب آؤ گے چھری تم کو گلے لگائیں گے

جادہ پہ اپنے کچھ دنوں یوں ہی رہے جو مستقل / بھٹکے ہوئے بھی دیکھنا راہ پہ آتے جائیں گے

اوج و وقار کا سبب ہو گی یہی فروتنی / جن سے ملیں گے جھک کے آپ خود بھی وہ جھکتے جائیں گے

پھر جو رہے ہیں آج تک خوگرِ نخوت و غرور / ہو گی یہ کل انھیں کو ضد ناز ہمیں اٹھائیں گے

صورتِ عکس آئینہ ہوں گے جو دل اثر پذیر / ہنس کے کبھی ہنسائیں گے رو کے کبھی رلائیں گے

یکجہتی کے جوش میں جب نہ رہے گا اختلاف / ہاتھ یہ دونوں ملکے پھر بوجھ ہر اک اٹھائیں گے

ہیں جو گھر جدا جدا ان کی ہے آدھی آبرو / ہونگے جب ایک رشتہ میں قدر سے دیکھے جائیں گے

اپنا کلام آرزو ختم بس اس مثل پہ ہے / جیسا درخت بوئیں گے ویسا ہی پھل بھی پائیں گے

اثر اور اُن کی شاعری

از پنڈت امرناتھ جھا، وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

خان بہادر میرزا جعفر علی خاں اثر بی۔اے، ایم۔بی۔ای سول سروس کے ایک ممتاز رکن ہیں اور ڈسٹرکٹ افسر کے ذمہ دار عہدے پر مامور ہیں۔ اُن کی معلومات وسیع ہے۔ انگریزی ادب سے کماحقہ واقف ہیں اور عام یورپین شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اہم انتظامی فرائض کی مصروفیت کے باوجود مسائل حیات و فلسفہ انسانیت سے اُن کی دلچسپی قائم ہے۔ انھیں نہ صرف قدیم و جدید ادب پر عبور ہے بلکہ اُردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ ہمعصر ناقدانِ ادب میں اُن کا پایہ بہت بلند ہے۔ اُن کے مضامین پختہ تجربہ کے شاہد ہیں۔ ذوقِ سلیم اُن کا رہنما ہے۔ اور فرقہ وارانہ تنگ نظری و عصبیت سے آزادی ہر قدم پر نمایاں ہے۔ اُنکی دقت نظر بغیر خطا کئے ہوئے کھرے کھوٹے میں فرق دکھا دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ مستقل خوبیاں کیا ہیں اور نمائشی کیا ہیں۔ اُنکی نثر میں عام فہم ہونیکے باوصف بانکپن ہوتا ہے۔ گویا ایک خوش بیان بلا تصنع فصاحت کے دریا بہا رہا ہے۔ اُس میں فارسی اور انگریزی کے نقش و نگار تو ہوتے ہیں لیکن کٹھ ملاؤں کی علمیت کے بیجا اظہار سے پاک ہوتی ہے۔ جس وقت وہ اپنے خود دارانہ سکوت کو خیرباد کہدیتے ہیں اور چند بے تکلف دوستوں کی صحبت ہوتی ہے تو اُنکی تقریر سحر حلال بن جاتی ہے۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ مگر جو کچھ کہتے ہیں سُننے کے قابل ہوتا ہے کیونکہ طویل اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس خیال کا اظہار کرتے ہیں اُن کی ذاتی رائے ہوتی ہے۔ محض سُنی سنائی باتوں کا اعادہ نہیں ہوتا۔

انداز بیان کی انفرادیت

اُردو میں عمدہ تنقید کا قحط ہے اور اثر کے تنقیدی مضامین اُن کی یاد کو تا دیر تازہ رکھیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ امر یقینی ہے کہ اپنے دَور کے نامور شاعروں میں اُن کا شمار ہوگا۔ اُنھوں نے غزل، رباعی، نظم، مرثیہ سبھی کچھ کہا ہے۔ ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ ڈانٹے (Dante) کو اُردو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور جملہ اصنافِ سخن میں اُن کو غیر معمولی کامیابی ہوئی ہے۔ چند عمدہ طویل نظمیں بھی کہی ہیں۔ اُن کے اسلوب بیان میں انوکھاپن ہے اور کسی خاص اسکول کے اندھے مقلد نہیں ہیں۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ کے روایات میں ہوش سنبھالا تاہم اُنکے

عہ یہ مضمون 'لیڈر' (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ مصنف کی منظوری سے اسکا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔

کلام میں میر اور دہلی کے دیگر شعرا سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ دہلی کی سادگیٔ ادا لکھنؤ کی سجی ہوئی زبان سے ملکر سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے، دہلی اور لکھنؤ اسکولوں میں جو کچھ بہتر سے بہتر ہے اثر کا کلام اُس کا مجموعہ ہے اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ اثر کا محبوب شاعر میر دہلوی ہے۔ دراصل میر، غالب اور آتش وہ تین[۳] اُستاد ہیں جن کے کلام سے وہ شدت کے ساتھ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

حالاتِ زندگی

مرزا جعفر علی خاں جولائی ۱۸۸۵ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں جوبلی ہائی اسکول سے (اب انٹرمیڈیٹ کالج ہے) انٹرنس پاس کیا۔ کیننگ کالج میں داخل ہوئے، جہاں ڈاکٹر وہائٹ کے روایات اُس وقت تک مایۂ ناز بنے ہوئے تھے، ۱۹۰۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ۱۹۰۹ء میں یو۔پی سول سروس میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے اور اب اس ملازمت کے سینئر افسر اور ڈپٹی کمشنر ہیں منتظمانہ فرائض کی مشغولیت، ضلع کا دورہ، فوجداری مقدمات کا فیصلہ، ناخوشگوار تاہم ناگزیر احکام نافذ کرنا، بندوبستی کام، وکلار کی غیر مختتم لفاظی وموشگافی کی سماعت، جھگڑے، بکھیڑے، حقوق کاشتکار و زمیندار کا خلفشار، شاطرانہ چالیں، اس ماحول میں بھی مرزا جعفر علی خاں نے شاہد شعر کی پرستاری نہیں چھوڑی اور آخر کار اِس حد درجہ بدگمان مگر غضب کی دلکش، طرار اور متلون مزاج معشوقہ پر فاتحانہ قابض ہوئے۔ شاعری سے اُن کا لگاؤ فرصت کے لمحوں میں دل بہلانے کا مجہول مشغلہ نہیں ہے۔ اُنھوں نے اِسے ایک صناع کی حیثیت سے برتا ہے، دوسری مسرتوں کو ٹھکرا کر محنت شاقہ برداشت کی ہے، اِس فن کے دیگر اساتذہ کا مکمل مطالعہ کیا ہے اور اُن کا علم قاموس کی طرح ہمہ گیر ہے۔ اُنھوں نے بڑی سرگرمی اور عرق ریزی سے فن شاعری کی تحصیل کی ہے اور ایک صناع کی طرح اپنے ساز و سامان کے استعمال پر ناز ہے۔ خوشنما جملوں کی تخلیق، تجربہ کا شوق، بحور و اوزان کے انتخاب میں احتیاط و سلیقہ، وہ کاوش جو شاعری کو دل پذیر بنا دیتی ہے، ان امور سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ نادر صناعی کے مالک ہیں۔ گیاکوپون ڈی ٹاڈی (Giacopone di Todi) کی حسین محبوبہ کی طرح اُن کی شاعری بھی حسین ہے۔ اس کی پیشانی پر شباب کی رعنائی ستارے کی طرح چمک رہی ہے اور اُسکا ملبوس زرق برق ہے اور خود نور کا بُقعہ ہے، لطف یہ ہے کہ اسی کے ساتھ ساتھ متانت خیال اور نفاستِ مزاج اس حد کی ہے کہ میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) کی رُوح خوش ہوجائے۔

اثر ابھی زیادہ مُسن نہیں ہیں اور ایک معقول مدت معینہ سرگرمی اور شاعرانہ تفکر کی اُن کے سامنے ہے، ایسی صورت میں اُن کی شاعری کی پوری قدر و قیمت معین کرنا دشوار ہے کیونکہ ابھی اتمام کو نہیں پہونچی[۱]۔

---

[۱] "بہاران" اثر کا دوسرا دیوان اُس وقت تک شائع نہیں ہوا تھا۔

سادگی اور صفائی

میں کہہ چکا ہوں کہ میرؔ اُردو کے بلند مرتبت شاعروں میں ہے اور یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اثرؔ نے میرؔ سے اتنا بعد زمانی ہونے پر بھی زبان اور بیان میں وہی سادگی اور صفائی پیدا کی ہے جو میرؔ کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ دیکھکر بھی خوشی ہوتی ہے کہ اثرؔ ہندی الفاظ کے استعمال سے نہیں جھجکتے، مثلاً مدبھری آنکھیں، روگ، پاپی، رتناری، اُداسی، امرت، دھیان، میل، جوگی، جٹا، آسن، رسیا، یہ ایک مبارک فال ہے اور دل چاہتا ہے کہ اُردو کے دوسرے شاعر اُن کی پیروی کریں۔ اُن کے اندازِ بیان کی سلاست، اُن کا سادہ راستبازانہ اور سہل اسلوبِ ادا بھی داد کا مستحق ہے۔ یہ صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ طرزِ ادا کا سہل اور دلکش ہونا اُستادی کی دلیل ہے۔ الفاظ کی گرج، بھدّا پن اور گنجلک اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ شاعر مبتدی ہے اور زبان پر عبور نہیں رکھتا ؎

دِل عشق کی مے سے چھک رہا ہے	اک پھول ہے جو مہک رہا ہے
آنکھیں کب کی برس چکی ہیں	کوندا اب تک لپک رہا ہے
اب آئے بہار یا نہ آئے	آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

کس نے وحشی اثرؔ کو چھیڑا
دیوار سے سر ٹپک رہا ہے

نہ سنانا تھا جس کو آج اسکو	ماجرائے الم سُنا بیٹھے

دھیان کس سے لگا ہوا ہے اثرؔ
سوچتے رہتے ہو یہ کیا بیٹھے؟

کوئی دِل پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ گیا	ہاتھ اب دل سے اٹھاؤں کس طرح
بھولنے والے سے کوئی پوچھتا	میں تجھے دِل سے بھلاؤں کس طرح

میرے کہنے میں نہیں ہے دِل اثرؔ
اُس کو سمجھاؤں بجھاؤں کس طرح

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا	پھر اُن کی طرف اک نظر دیکھ لینا
وہ میرا نہ کہنے میں کہہ جانا سب کچھ	وہ اُن کا اچانک ادھر دیکھ لینا

اثرؔ عرضِ حال اُن سے بے سوچے سمجھے
کہا تھا کہ پہلے نظر دیکھ لینا

جب سنایا ہیں سنا تم نے کہ گویا نہ سُنا پھر غلط کیا ہے کبھی حال ہمارا نہ سُنا

فطرت کی مصوری

فطرت کا بیان اور منظر کی نقاشی متعدد اُردو شاعروں کے کلام میں موجود ہے لیکن اس قسم کی شاعری غزل میں نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن میں دکھائی ہے۔ غزل کے متعلق بجا طور پر خیال ہے کہ اس کو عاشقانہ مضامین کیلئے مخصوص ہونا چاہئے۔ لیکن فارسی نیز اُردو نے اس قدر نشانیاں اور تمثالیں فطرت سے مستعار لی ہیں کہ اصول کی خلاف ورزی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر غزل میں بھی مناظر فطرت کی مصوری ہو۔ ستاروں کا صبر وثبات، پروانے کی وفا شعاری، طائرِ خوشنوا کی آواز میں چوٹ کھائے ہوئے دل کی جھنکار، بجلی کی ستم پروری، بادِ بہار کی ولولہ خیزی، یہ اور اسی قبیل کے دیگر مظاہرِ قدرت عشقیہ شاعری میں عام ہیں اور متواتر لائے جاتے ہیں، لیکن انھیں بسا اوقات صرف مثال کے طور پر استعمال کرکے دوسرا نتیجہ مترتب کیا جاتا ہے، خود فطرت کے ساتھ محبت اور گرمجوشی، خود فطرت سے بحیثیت فطرت مانوس اور اس کے مشاہدے سے مسرور ہونا، ان باتوں کا اُردو غزل میں فقدان ہے۔ اثرؔ نے کامیاب فطرت نگاری کی ہے اور غزل میں۔ لفظوں میں کسی فطری منظر کی خوبصورت مصوری بار بار ہمارے دامنِ دل کو کھینچتی ہے، کتنی ہی مثالیں رسکن کے "رقت انگیز مغالطہ" (Pathetic Fallacy.) کی بھی ملتی ہیں ؎

بھری برسات اور یہ گھُپ اندھیرا اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے
سہاگن رات کا ڈھلتا ہے کاجل مرا اک اک رُواں تھرّا رہا ہے

وہ جو نہ آئے، بادل چھائے گرجے برسے کھُل بھی گئے
اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو

سن کے پیامِ صبح کا غنچے لرز لرز گئے جب ہو یہ حال نازکی ہاتھ کوئی لگائے کیوں
یہ ابر تیرہ اور یہ سماں لالہ زار کا لَو دے رہا ہے حُسن عروسِ بہار کا
شاہدِ صبح نے ہنس کر جو ذرا دیکھ لیا کوہ و صحرا پہ پھٹا پڑتا ہے جوبن کیسا
پھولوں سے لچک رہی ہیں شاخیں خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن
رقصاں ہے نسیم رگِ گل پر شبنم میں ہے گھنگھروں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے مستی میں چھوا صبا نے دامن
وہ پھول اوس میں ڈوبے ہوئے وہ صبحِ بہار کہ جیسے جام میں صہبائے ناب ہوتی ہے
نویدِ وصلِ جاناں سے نہیں کچھ کم نشاط افزا سحر کا لے کے انگڑائی اثرؔ بیدار ہو جانا

بھنور میں ناؤ، ساحل دور، اندھیری رات تنہائی
وہ سناٹا ہوا کا، وہ تھپیڑا موج طوفاں کا

نسیم صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی
نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے

دو رباعیاں بھی سن لیجئے ؎

پردے میں کلی کے مسکراتی آئی
آغوش میں گل کے لہلہاتی آئی

انگڑائیاں لیتی ہوئی جاگی ہر شاخ
"البیلی بہار" گنگناتی آئی

جب ڈیرے بہار کے پڑے ہوتے ہیں
غنچے بھی نمود پر اڑے ہوتے ہیں

یوں پھوٹتی ہے نیلی پھریری کونپل
سب جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

اعلیٰ تشبیہیں

تخیل پر بحث کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اثر کی تشبیہوں کی خوبیوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے ؎

حسرتیں دل سے یوں چلیں جیسے
غول اُداس نقیروں کا جائے

حسرت عرض تمنا میں جو لذت ہے نہ پوچھ
ساز میں اتنے بھرے نغمے کہ ناموش ہوا

یہ شوق دید میں آنکھوں کا رنگ ہے جیسے
اچانک آئینے میں آفتاب دیکھ لیا

مست آنکھوں پہ گھنی پلکوں کا سایہ یوں تھا
کہ ہو میخانے پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی

جیسے نغمے میں نیا کوئی ایجاد کرے
اُف وہ آواز جو تھی نیند میں بھرائی ہوئی

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گذر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی

موج بادۂ رنگیں ہے اسقدر کہاں رنگیں
اُس کے لعل لب دیکھو جب وہ مسکراتا ہو

ان لبوں پر جھلک تبسم کی
جیسے نکہت میں جان پڑ جائے

تشبیہات کی تازگی، ندرت اور برمحل صرف قابل دید ہے۔

تخیلی عناصر

"میں گانا چاہتا ہوں، مگر کیا گاؤں؟" انیسویں صدی کی آخری "بلبل دہلی" کے ایک شاعر نے پوچھا۔
"گذشتہ عہد کے نغمے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں، مرنے والے تان اڑا گئے تھے کہ زندہ دنیا کس گت پر ناچتی ہے، نسبت خواب اور تمنائیں، قوس قزح کی چمک دمک، موسیقی کا نکھار، دسترس سے باہر ایک شے سے وابستگی، دنیا کا مرجھانا، کنارۂ آسمان کی پرسکون نورانیت، گلاب کی پنکھڑیاں، ترتانی شراب کی چھوٹی چھوٹی نہریں، نقاب پوش اضمحلال، مترنم پرُدانی، راستی، کیا ان سب کے گیت آتش نفس اور منچلے مغنی نہیں گا چکے ؟"
ایک ذی اثر طبقۂ مفکرین ہے جس کا خیال ہے کہ ایک ایسی چیز کا بھی وجود ہے جس کو "ترقی پسند" کہتے ہیں۔

"ادبِ جدید" کا ہمیں علم ہے، ہر زمانے میں طرزِ نو سے اُس کی تخلیق ہوتی ہے اور ہر دور اپنے سے ماسبق دور کو "رجعت پسند" کہتا آیا ہے، مگر "ترقی پسند" ادب کا تو یہ مفہوم متعین کیا جاتا ہے کہ ادب کو سیاسیات وسعاشیات کے ایک خاص مارکہ کے پروپیگنڈا کا آلہ بنایا جائے۔ اگر ادب میں ترقی کا منشا انداز بیان میں جدت آفرینی ہے، نئے سُروں اور سنگیتوں کی تلاش یا ایجاد ہے، نئے ادبیانہ تناسبات ولزومات کا دریافت کرنا ہے تو البتہ اس فقرے کے کچھ معنی اور اسمیں کچھ معقولیت ہو سکتی ہے ورنہ مہمل ہے۔ موضوعات ادب نئے نہیں ہو سکتے، زیادہ سے زیادہ اہمیت کا مرکز ثقل بدل جائے گا۔ یا احساس قدر وقیمت میں تغیر رونما ہوگا یا نقطۂ نظر مختلف ہو جائے گا۔ ترقی پر بھروسا استعداد عمل وحرکت کا اعتبار، بھوک، گندگی اور چیتھڑوں کی قصیدہ خوانی یہ بھی تو نئی باتیں نہیں ہیں۔ مکروبیت کی پوجا بھی نئی نہیں، تعطل اور ناکامی کا احساس جن کے برتے پر عہد حاضر فلسفے میں جدید ابواب اضافہ کر دیا گیا ہے وہ بھی نئے نہیں۔ بیتاب تمنائیں، جدوجہد، دعوت عمل، ہمت وجرأت، ناقابل اطمینان وارزاں عمومی نظام اشیا سے دل برداشتگی۔ کوئی عہد ایسا نہیں گذرا ہے۔ جب ادیبوں نے ان کی طرف توجہ نہ کی ہو جس بات میں تغیر ہوا ہے اور جو ہر ملک میں ناگزیر ہے۔ جہاں انفرادیت کو کچلا نہیں جاتا اور جہاں رائے، نظریہ اور طبائع کو حکومت ایک خاص ڈھرے پر نہیں لگاتی۔ وہ خود صنّاع یا ادیب کا نقطۂ نظر ہے، خود اُس کا فلسفہ ہے۔ برٹن (Burton) نے افسردگی کی چیر پھاڑ کی۔ ایچ۔ جی۔ ویلس (H. G. Wells.) نے محرومی کی تشریح کی۔ یہ صرف نمایشے ہیں درانحالیکہ صنّاع من حیث المجموع اپنی آزادی کو محفوظ رکھتا ہے۔ جیکی (Jacques.) انیٹونیو (Antonio.) ہیملٹ (Hamlet.) افسردگی کے مُرقع ہیں مگر افسردگی شیکسپیر کی خلاقی معروضیت کا آغاز یا انجام تو نہیں صنّاع کے فکر میں کتنے ہی مُثل ہوتے ہیں۔

جذبے کی سچائی

اثر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ایسے اشعار جاذب توجہ ہوتے ہیں جنھیں اُنھوں نے شراب اور رند کے مقبول عام مضامین نظم کئے ہیں جستہ جستہ ایسے شعر بھی ملتے ہیں۔ جنمیں اُن کے معتقدات شعر کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ایسے اشعار ہیں۔ جنمیں زندگی، مسائل زندگی اور مقصد زندگی سے بحث ہے۔ اُن کی تنقیہ شاعری کا جو آخری نقش مرتسم ہوتا ہے اُس میں ہم آہنگی اور یکتائی ہے۔ اُن کے فلسفہ کی طرف عنقریب توجہ کی جائے گی۔

شاعر ہے تو اس طرح تماشائی ہو　　فطرت ترے انداز کی شیدائی ہو
آیات واشارات کا مرکز ہو دل　　ہر شے میں نظر نظر میں گویائی ہو

اور یہ مقطع ہے ؎

جام خالی کو چھلکتے کبھی دیکھا ہے اثر　　شعر میں جوش کہاں دل میں اگر جوش نہیں

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ سچائی اور جذبے کی صداقت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں نمائش اور تصنّع کو دخل نہیں ہے۔ صرف شاندار الفاظ شاعری نہیں کہلاتے۔ روح کے ہلکورے بھی موجود ہونا چاہئے، سچائی سے بیساختگی پیدا ہوتی ہے۔ شاعر پر جو کیفیت کسی خاص وقت میں طاری ہے وہ مُسرت یا وجد کی ہو یا الم اور پژمردگی کی۔ آپ فوراً اعتراف کریں گے کہ اس کی تہ میں صداقت ہے، صرف اُن کا دماغ ہی نغمہ سنج نہیں ہے بلکہ کرسٹینا روزیٹی (Christina Rosetti) کی طرح اُنکا دل بھی طائر زمزمہ پرداز ہے، وہ کہتی ہے:۔

"میں نے اپنی پوری حیات معاشقہ اُس سے وابستہ کردی ہے اور محبت کی تمام اُمیدیں اور وسوسے محبت کی تمام ایذائیں، تمام راحتیں، محبت کا ہر وقفہ جو فرداً فرداً ماہ و سال کی طرح طولانی ہے اور کاٹے نہیں کٹتا اُس کے سپرد کردیا ہے۔"

آرٹ میں ایسی مکمل محویت اور آرٹ سے اپنی زندگی کو اسقدر متحد کردینا اثر کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

واعظ اور شاعر

واعظ پیشگوئی کرتا ہے کہ پھولوں کے سہرے پیشانی پر مُرجھا جائیں گے اور وعدہ کرتا ہے کہ ستاروں کے اُدھر ایک ایسا مستقر ہے جہاں سدا بہار پھول کھلتے ہیں، پھر یوم الحساب کا نقشہ کھینچتا ہے جہاں گناہگاروں کی چیخیں کانوں کے پردے پھاڑیں گی اور آنکھیں منتقم حقیقی کو غضبناک دیکھیں گی۔ مگر عاشق واعظ کی پروا نہیں کرتا، شراب کا ایک قدح خوف اور پچھتاوے کو نذر نسیاں کردیتا ہے اور جنت کے خوابہائے نوشیں سے بہتر ہے۔ گناہگار اور مقدس مآب دونوں خدا کے بندے ہیں اور موت دونوں کو برابر کردے گی۔ گناہ بھی صرف اِسی دُنیا کے اندر اور اسی کی پیداوار ہے ؎

جاتے کہاں خدائی کے باہر گناہگار — تیری زمیں نہ تھی کہ ترا آسماں نہ تھا
زاہد، زاہد، عیش جنت معلوم — کیا مجکو نہیں رنگ طبیعت معلوم
لطف مے و شاہد سے جو بے بہرہ ہو — منہ اُس کو لگائیں جو ہیں حضرت معلوم

اس دُنیا کی مُسرتوں کو ترک کرنے والوں نے دوسری دُنیا (عقبیٰ) کی خوشیوں سے لو لگائی اور دُور کی سُہانی صداؤں کے لئے گوش بر آواز ہیں جب خوش دلی و انبساط، سُورج کی کرنوں اور نغموں کی اسقدر افراط ہے تو کیسی ناشکری ہوگی اگر ان سب کو ٹھکرا دیا جائے۔ اور ایک خشک، بدرنگ اور کیف و وجدان سے خالی اخلاقی تلقین کو اختیار دیا جائے کہ فطرت کی کھلی علمی کتاب کے نقوش کو حرف غلط کی طرح محو کردے اور صرف گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھٹ گھٹ کے مرنے دے!

ہمیں محروم ہیں اک جام سے اللہ اللہ — دور پر دور تری بزم میں چلتے دیکھا

شب کی بیداریاں ارے توبہ　　چھپ کے میخواریاں ارے توبہ

دور اُس نرگس خماری کا　　اپنی سرشاریاں ارے توبہ

تیرے ہونٹوں کا تبسم، تری آنکھوں کا خمار　　ان کو بھی ساقی شریکِ جام ہونا چاہئے

کچھ نام پر اُن کے بھی ہے آج لٹا ساقی　　اک جام کی حسرت میں جو اُٹھ گئے دُنیا سے

ایسی توبہ سے تو میخواری رہنا تھا اثر　　دل پر اک ہاتھ ہے اک ہاتھ میں ساغر ٹوٹا

اُس پہ بھی چھا رہی ہے مستی سی　　میکدے کو جو راہ جاتی ہے

آمادہ نہیں دل مرا توبہ شکنی پر　　ساقی ابھی ذکرِ مئے گلفام کئے جا

لاکھ نیت کی مگر واعظ اسے کیا کیجئے　　جب خیال توبہ آیا، سامنے جام آگیا

ہونے دو اگر وا درِ میخانہ ہوا ہے　　ساقی کا تصور ہی مئے ہوشربا ہے

مجھے تو ہوش نہیں تو ہی کچھ بتا ساقی　　کرشمۂ نگہِ مست ہے کہ پیمانہ

نہ لڑکھڑائے قدم حکم ہے یہ ساقی کا
شراب شوق سے لبریز دیکھے پیمانہ

اثر کی عشقیہ شاعری

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تمنا اور سعیٔ حصول ادب میں کوئی نئی الاپ نہیں لیکن اُردو شاعری میں بالعموم اور غزل میں بالخصوص قسمت کا رونا ہے، فنادگی ہے، بے بسی ہے، رونا پیٹنا اور اس کے بعد صبر کرکے بیٹھ رہنا، چپکے چپکے بڑبڑانا یا خاموشی کے ساتھ ایذا برداشت کرنا، اگر شور ہے تو مایوسی کا، قیامت کے دن بھی انصاف کی اُمید نہیں، ہمت کی تو یہ آس باندھی کہ معشوق لحد پر آئے گا، سسکنا بلکنا، گلہ شکوہ، خوشی معدوم، خرمی مفقود، زندہ دلی افسانہ، نوشتۂ تقدیر اٹل، یہی بہت ہے کہ معشوق نے رحم کی نظر سے دیکھ لیا، یا اس بے وفا سے ہلکی سی پشیمانی یا قدرے استعجاب کا اظہار ہوا، جس کے لئے جوانی، دولت، حتیٰ کہ ہوش و حواس بھی تج دئے۔ یہ نقوش ہیں جو بالعموم غزل کے مطالعہ سے قائم ہوتے ہیں۔ بے شک کہیں کہیں معمولی تغیرات بھی ملتے ہیں، تمسخرانہ طنز، خدا کے عدل کی دھمکی، یا رقیب کامیاب پر حملہ لیکن مجموعی حیثیت سے صحت، عزم اور پامردی، بمنزلہ نہ ہونے کے ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ نقادوں کی سخت مساعی کے باوجود اس عشقیہ شاعری کا معیار بلند نہ ہو سکا۔ اسمیں نفس پرستی ہے وہ محبت جسکی ستائش مابعد طبعیات کے ماہرین نے کی ہے شاذ ہی نظر آتی ہے۔ ایسی شاعری کا بیشتر حصہ راستی سے دُور اور سطحی ہونے کے الزام سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن اثر کی شاعری میں محبت ذہنی (Intellectual) بلکہ بسا اوقات روحانی ہے، اُس کے ساتھ ساتھ انسانیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی۔ اس محبت میں

خواہش ہے مگر نفس پرورانہ تسکین کی جگہ صرف تمنا ہے، مقصد براری تباہی کا پیش خیمہ ہے، عاشق و معشوق میں ہمیشہ ایک پردہ ایک حجاب حائل رہیگا۔

حیا شیوۂ حسن، ادب شرطِ الفت — ملے بھی تو آپس میں پردا رہے گا
منزلِ قرب میں پہونچ کر بھی — کچھ سکوت اور کچھ حجاب رہا
ہوس سجدہ میں جو کچھ ہے کہاں سجدہ میں — دور پھرتا ہوں ترے در سے ترے در کیلئے
بے وفا ٹوٹے ہوئے دل کو مرے نام نہ رکھ — حسن ہے دل کیلئے عیب ہے ساغر کیلئے
عشق میں ناکام رہنا عشق کی معراج ہے — محنتِ برباد سے شہرت ہوئی فرہاد کی
نکہتِ آوارہ ہو جایا نسیم بے دیار — وہ کہاں منزل میں جو کچھ حسرتِ منزل میں ہے
حاصلِ زیست ہے کہ حاصلِ زیست — دوست کی راہ میں لٹا بیٹھے
ہے عشق جنھیں، دل کا وہ کہنا نہیں کرتے — مرجائیں، مگر عرضِ تمنا نہیں کرتے
تمنا ہے قیامت تک یونہیں پردا چلا جائے — مزے لوٹے ہیں ایسے حسرتِ دیدار کے دل نے

اثر کا نظریہ اُس سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جس کو پیٹر (Pater.) افلاطون کی فطانت کا ترکیب دیا ہوا نسخہ کہتا ہے، وہ خاص شرط جو افلاطونی مزاج قائم کرنے کیلئے ضروری ہے اور جسے وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

"عاشق رفتہ رفتہ نادیدہ کا عاشق ہوگیا ہے تاہم چونکہ عاشق ہے لہذا یہ کہنا چاہیئے کہ نہ دیکھنے پر بھی دیکھتا ہے اور اپنے حواسِ ظاہری کی نہایت احتیاط سے پرداخت کرتا ہے، اپنی آنکھوں کی، کانوں کی قدرتی طاقتوں اور مکسوبہ لطافتوں کی، ان نعمتوں کی جو نفسانی عشق کی تربیت میں معین ہیں اور انھیں کو بلند کرکے ذہنی اور روحانی تصورات میں تحلیل کردیتا ہے، وہاں بھی اس کی سماعت اور بینائی اسی طرح کام دیتی اور مجردات ذہنی کو دنیوی لباس سے آراستہ کرتی اور اس طرح ایک غیر آباد دنیا کو دلکش رنگوں اور رعنا مجسموں سے معمور کردیتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذہن کا واسطہ دراصل جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی مورتوں سے ہے۔ اس (خیالی) دنیا کے لوگ ہمدردانہ طریقہ سے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ انہیں وہی دلآویزی یا تباین ہوتا ہے جو ہماری گوشت و پوست و آب و رنگ کی دنیا میں ہے، وہی کشش ہے جو سچی انسانی دوستی یا محبت میں ہوتی ہے۔"

عشق ساقی، عشق مطرب، عشق مستی عشق ہے — عشق ہی پیمانہ میخوار ہونا چاہیئے
دل مجھے سمجھائے تھا دل کو میں بہلائے تھا — ناگہاں ہوا آئی جانب گلستاں سے
کوئی تو شفق سمجھا کوئی گردِ رنگ آلود — دورا اثر بہار آتی گذری اہل زنداں سے

آگاہ نہیں عشق کے آغاز سے کوئی ❊ کیا راز ہے واقف نہیں اس راز سے کوئی
دزدیدہ نگہ، لب پہ ہنسی آنکھوں میں شوخی ❊ پھر دیکھ لے مجکو اُسی انداز سے کوئی
مجکو جواب صاف نہ دے التماس کا ❊ آباد رہنے دے چمن امید و یاس کا
ہوا تو حشر کے دن اُن کا سامنا لیکن ❊ ہجوم عام میں کیا عرض مدعا کرتے
پوچھنے والے تو نے پوچھا لطف و کرم احسان کیا ❊ لب پر آئے حرف تمنا عشق کے یہ آداب نہیں
اہل دل سے پوچھو اثر لذت ہے کیا ناکامی میں ❊ ہاتھ اُٹھا بیٹھے مطلب سے مطلب گو نایاب نہیں
نہ گھبراؤ اسیرو پھر چمن میں آشیاں ہوگا ❊ گل اپنے باغ اپنا اور اپنا باغباں ہوگا
تاثیر درد دل میں یارب کہاں کی بھر دی ❊ اُس نے بھی آج آخر چپکے سے آہ کر دی
مذاق عشق ہو کامل تو صورت شبنم ❊ کنار گل میں رہے اور پاکباز رہے
اپنی وفا نہ اُن کی جفاؤں کا ہوش تھا ❊ کیا دن تھے جبکہ دل میں محبت کا جوش تھا
وہی اُن سے کہہ رہا ہوں کہ جو اُن کا مدعا ہے ❊ نہیں مثل دل زباں پر بھی اب اختیار اپنا
بیٹھا ہوں رہگذر میں لئے جنس عاشقی ✕ اس سے غرض نہیں کہ خریدار کون ہے
ہجر میں راحت سی راحت ہے نصیب ❊ درد دل میں لب پر اُن کا نام ہے
میں آگ میں اپنی جلتا ہوں میں آپ ہی اپنا شیدا ہوں ❊ پروانے اپنے ہوش میں رہ تو مجکو عشق سکھاتا ہے
کون اثر کی نظر میں سمائے ✕ دیکھی ہیں اُس نے تمہاری آنکھیں
کچھ بھی نہ نظر آئے یوں محو تماشا ہو ❊ پھر دیکھ اثر تجکو کیا کیا نظر آتا ہے
میں کیا سناؤں درد محبت کا ماجرا ❊ حد ہوگئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی
کبھی سن لے کر دلکش داستاں ہے ❊ زباں میری ہے اور تیرا بیاں ہے
حال پوچھا تھا تو اس طرح نہ پوچھا ہوتا ❊ رہ گئی عرض تمنا کی تمنا مجکو
یہیں سب کو ہر پھر کے آنا پڑے گا ❊ محبت کا مرکز بنانا پڑے گا
اُن کو سمجھاتا ہے آتے ہیں جو سمجھانے کو ❊ کون دیوانہ کہے گا ترے دیوانے کو
میں تسلّی سے تری باز آیا ❊ صبر کچھ اور چلا جاتا ہے
وصل حاصل نہیں تو ممکن ہے ❊ جو بھی دن ہے وہ عید کا دن ہے

اثر کا فلسفۂ حیات

اثر کے یہاں متعدد اشعار ہیں جنمیں زندگی کے دیگر اہم مسائل کا تجزیہ ہے اور ایسی رائے زنی ہے جو

اُن کے مضبوط عقیدۂ رجائیت کا آئینہ ہے۔ اُن کے مطابق زندگی عمل ہے، تنوع ہے، آگے بڑھنا ہے۔ اُن کے اظہارِ خیال کا طریقہ حکیمانہ یا بلا استادانہ نہیں ہے بلکہ ایسے الفاظ میں بیان ہوا ہے جو تناسب کے ساتھ نشاط انگیز ہیں۔ وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ اُن کے ایک ایک لفظ اور جملے میں زور اور سحر کارانہ دلکشی ہوتی ہے مجھے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے فلسفے کی آخری تحلیل فرقۂ سی رینی (Cyrenaic) کے مماثل ہے۔ جس کا بانی ارس تپوس (Aristipus) ہے اور جس کے اقوال کا خلاصہ فیریر (Ferrier) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"انسانیت کا صحیح رزمیہ، وہ رزمیہ جس کا ارتقا ابتدائے دورِ زمانہ سے ہوتا رہا ہے اور انتہا تک ہوتا رہیگا، وہ رزمیہ جو روزانہ کل بنی نوع انسان کے دلوں سے اُبلا کرتا ہے۔ انھوں بعض اوقات، شادمانی کے ترانوں میں مگر بیشتر دھڑکتے دل کی فریاد میں، آنسوؤں اور برباد شدہ امیدوں میں، یہ سب کیا ہے اگر جنت کی تلاش نہیں ہے؟ اس "رنگ برنگی" تانے بانے میں، اس بساطِ شطرنج اور اُس کی چالوں میں قسمتِ انسانی بھی اُلجھ کر رہ گئی ہے اور اس کو کھیل کھیلنا ہے۔ زندگی کے جلو میں زندگی، موت کے بعد زندگی غیر مختتم مہمات ایک چشمہ ہے کہ بہہ رہا ہے، کبھی صرف تقاطر ہے اور کبھی کف در دہاں سیلاب، تاہم ایک جوش ہے، حرکت ہے، نمو ہے، اقدام ہے۔ ناچیز سے ناچیز ذرہ شرابِ زندگی سے چھلک رہا ہے۔"

کون کہتا ہے کہ موت انجام ہونا چاہئے — زندگی کا زندگی پیغام ہونا چاہئے

کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں یہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، زندگی کی مرمریں چٹان سے تراش لئے گئے ہیں ؎

خود لپٹتی رہی دُنیا اُس سے — جس کو دُنیا سے کوئی کام نہ تھا

پوچھئے کس سے کہ منزل دُور یا نزدیک ہے — کارواں ملتا ہے میر کارواں ملتا نہیں

رات اندھیری سخت منزل راستہ دور و دراز — اے مرے اللہ! تھوڑی روشنی میرے لئے

بہت دیر و حرم کی خاک اُڑائی — اب اپنا ہی پرستش خانہ بن جا

ہر اک منزل کو ٹھکراتا ہوا چل — پیامِ ہمتِ مردانہ بن جا

سحر ہونے کو آئی جاگ اب بھی خواب غفلت سے — رہیگا منتظر تیرا امیر کارواں کب تک

ہم کنارِ بحر ہو کر موجِ طوفاں تیز ہو — پستِ ہمت کے لئے آغوشِ ساحل چاہئے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم بود و نبود — نہ تھا تو کیا تھا آخر اور ہوں تو کیا ہوں میں

فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں — کچھ دیکھ لیا اس دُنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا

گذرا ہوا زمانہ خارج ہے زندگی سے
کیوں یاد کر رہا ہے گذرا ہوا زمانہ

دل میں ہمت ہے اگر چھوڑ دے ساحل کا خیال
شورِ امواج میں نغمہ ہے شناور کیلئے

تمام نشہ تھا اب سر بسر خمار ہوں میں
خزاں نہ مجھکو سمجھ حاصلِ بہار ہوں میں

کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا حسرتِ دل برقرار
موج ہے، گرداب ہے کیا غم اگر ساحل نہیں

زمانے کو اک رنگ پر کس نے دیکھا
بدلتا رہا ہے بدلتا رہے گا

خون کے آنسو جو نہ رلائے
ایسی کوئی امید نہ ہوگی

شل نہ ہو پائے طلب ٹوٹے نہ ہمت اے دل
اور دو گام! صدا دیتی ہے منزل مجکو

ناخدا نے جب سنایا مژدۂ ساحل مجھے
بڑھ کے ہمت نے کہا آغوشِ طوفاں چاہیئے

کچھ نہیں ہوں مگر بقولِ اثر
تیرے ہونیکی اک دلیل ہوں میں

تعبیر حرف و صوت کوئی کس طرح کرے
عالم تمام اک سخنِ ناتمام ہے

کچھ شعر اور جن سے اثر کے تفلسف کا خاکہ پیش نظر ہو جائے گا ۔

یہ جہاں رنگ و بو تھا سرِ شام کا ستارا
کبھی ان بلندیوں پر تھا ہمارا آشیانہ

صورتِ موج ہو سرگرم سفر
ساحل آجائے تو کترا کے گذر

اک ناتمام نغمہ تھا پردے میں ساز کے
رنگیں نگاہیوں نے تری دل بنا دیا

جہاں کی ہر اک شے ہے فانی مگر
بنانے میں کیا کیا تکلف کیا

مستانہ وہ شوریدگیٔ عشق نے طے کی
جس راہ میں ہے لرزہ براندام قضا بھی

گرداب صفت پائے طلب کو رہے گردش
دامن نہ ہو آلودہ یہاں گردِ سفر سے

حجاباتِ تعین درمیاں سے اٹھتے جاتے ہیں
عدم پر چھوٹ پڑتی ہے شعاعِ زندگانی کی

شکستِ رنگِ ہستی سے نمایاں رنگِ ہستی ہے
فنا تعلیم ہے درسِ حیاتِ جاودانی کی

ہستی اور نیستی کے درمیان کوئی تقسیمی خط نہیں ہے، ظاہری صورتوں کو ہٹا دو حقیقت بے نقاب ہو جائیگی، جو ہر نمایاں ہو جائیں گے۔ صورتیں متعدد ہیں، حقیقت ایک ہے، فنا یعنی ایسی زندگی جس میں نفسانیت و خود غرضی کا لگاؤ نہیں، جو بے لوث ہے اور جو تکلیفیں برداشت کرنے یا عارضی خواہشوں اور آرزوں پر فتحیاب ہونے سے حاصل ہوتی ہے یہی حیاتِ جاوید حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

ڈبلو ایچ ڈیوس (W. H. Davis) ایک تازہ نظم میں کہتا ہے :-

"جب مجھے ایسی بیش بہا نعمتیں ملی ہیں، پینے کو پائپ، محبت کی شیریں آواز، گرم دن اور

خنک رات، ایسے دیدۂ و دل جو دُنیا کے خوابوں سے حسین تر خواب دیکھنے کے آرزومند ہیں، ایسی کنجیوں کی تلاش ہے جو کسی شخص کو نہیں ملتیں کہ زندگی و موت کے قفل کھولدے، جب اس قدر سامانِ تماشا موجود ہے تو کیا میں اپنی سانسیں ضائع کرتا ہوں؟ اس کے علاوہ شاعری کا عطیہ ہے، تازگی، جوانی، پھول، اور تبسم، نسیم شمال کی طرح آتے ہیں۔"

اثر کے لئے بھی اگر صبح دعدوں سے لبریز ہے تو شام ملکوتی نغمے سناتی ہے۔

نیرنگِ جذبات

از حضرت محوی صدیقی لکھنوی

(مشاعرۂ مدراس کی صدارتی غزل)

عجب نیرنگِ قدرت ہے جہاں عہدِ شباب آیا
تمنا ہم عناں آئی، تعشق ہم رکاب آیا

اُدھر لب پر ہنسی آئی، نگاہوں میں حجاب آیا
اِدھر رگ رگ میں دوڑی زندگی یعنی شباب آیا

جہاں وہ مسکرائے کھل گئیں کلیاں اُمید و نکی
پڑی ہر زندگی پر اوس جب اُنکو عتاب آیا

کہاں آنکھوں کو تابِ جلوہ کس کے ہوش رہتے ہیں
بُرا کیا ہے اگر وہ جانِ محفل بے نقاب آیا

دلوں سے یاسِ رخصت، تابِ رخصت، کیفِ غم رخصت
وہ جانِ حُسن، جانِ آرزو، جانِ شباب آیا

اسی کو زندگی کہتے ہیں کیا اے چارہ سازِ غم
نہ سُکھ پایا کبھی دل نے نہ چشمِ تر میں خواب آیا

ہمیں بھی تو بتا کچھ اے ادائے حُسن جانانہ!
شکن ماتھے پہ، بل ابرو پہ ہے یہ کیوں عتاب آیا

فلک پر اپنے نالے بھی گئے، دل کی دعائیں بھی
نہ کوئی مستجاب آئی، نہ کوئی کامیاب آیا

سکوں کو کر دیا برہم، دلوں کو کر دیا بیدم
کوئی طوفانِ حُسن و ناز آیا یا شباب آیا

یہ کس نے دل جلوں پر مسکرا کے پھول برسائے
کہ ہر باغِ تمنا پر بہار آئی شباب آیا

ملی کچھ ایسی راحت حشر تک آغوشِ تربت میں
نہ تڑپا پھر جگر محوی نہ دل کو اضطراب آیا

سیّارہ مرّیخ

از مسٹر محمد اسحٰق ایم۔اے ڈھاکہ

اس وقت سیارہ مریخ دُنیا سے بہت قریب ہو رہا ہے ۱۹۲۴ء سے ادھر وہ دُنیا سے اتنا قریب نہیں ہوا تھا۔ اور ۱۹۵۶ء سے پہلے وہ پھر دُنیا سے اتنا قریب نہ ہوگا۔ اب وہ اپنی تیزی رفتار کے ساتھ رفتہ رفتہ دُنیا سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگست ۱۹۳۹ء کے خاتمے پر یہ ہماری دُنیا سے چار کروڑ تیس لاکھ میل (۴۳۰۰۰۰۰۰) دُور ہو گیا۔ مریخ کے اس سال کا ظہور شمالی نصف الارض کے معاینہ کرنے والوں کے لئے چنداں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگا۔ کیونکہ مریخ خطِ استوا سے بہت دُور جنوب کی طرف واقع ہے۔ مثلاً گرین وچ کے اُفق پر اُسکی انتہائی بلندی صرف بارہ (۱۲) ڈگری ہے۔ اس لئے رات کے وقت صرف تھوڑی دیر کے لئے اُس کا معاینہ ممکن ہوگا۔ اور وہ بھی صرف دُنیا کی کثیف فضا (Atmosphere.) سے گذر کر۔

شمالی نصف الارض کے ستارہ شناسوں کے لئے بدقسمتی کی بات ہے کہ جب کبھی بھی مریخ دُنیا سے قریب ہو کر گذرتا ہے تو وہ خطِ استوا سے ہمیشہ جنوب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لئے دُنیا کے اس خطے کا معاینہ کرنے والوں کے لئے حالات چنداں موافق نہیں ہوتے۔ البتہ یہ اس لئے ہے کہ دُنیا اور مریخ کے مدار (Orbits) اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ اُن کے درمیان کی کمترین دُوری خطِ استوا سے بہت دُور جنوب کی طرف ہے۔ شمالی نصف الارض کے معاینہ کرنے والوں کے لئے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں حالات بہت موافق ہوں گے۔ اگرچہ اس وقت بھی مریخ ابُعد دُنیا سے تقریباً تین کروڑ نوے لاکھ میل (۳۹۰۰۰۰۰۰) ہوگا۔ اُس وقت مریخ خطِ استوا کے چند ڈگری شمال کی طرف ہوگا۔ انھیں وجوہات کی بنا پر ڈاکٹر سلیفر (Dr. Slipher.) امریکہ کے رصدگاہ لاول (Lowell Observatory) کے ڈائرکٹر کو مریخ کے جدید معاینہ کے لئے جنوبی آفریقہ میں بمقام بلوم فاؤنٹین (Bloemfontein.) جانا پڑا۔

تاہم مریخ کے اس معاینہ سے کسی حیرت انگیز انکشاف کی اُمید نہیں کی جاسکتی کیونکہ مریخ کے بہت سے اسرار اسوقت تک ہم پر منکشف ہو چکے ہیں۔ البتہ اس کی ساخت کی سطحی تبدیلیوں کا تفصیلی مطالعہ، موافق فضائی حالات میں بڑے پیمانہ کی دوربینوں کے ذریعہ جزئی تفصیلات کا معاینہ، سطح کے مختلف نقطوں کی حرارت

کی تعیین اور مریخ کی فضائی تحلیل کے قطعی اور قابلِ قبول بیانات آہستہ آہستہ ہمارے لئے اِس سے زیادہ صحیح اور متعین خاکہ پیش کریں گے جو اب تک ہم کو دستیاب نہیں ہوئے تھے۔

سطحی تغیرات | نظامِ شمسی کے تمام سیاروں میں مریخ ایک عجیب وغریب سیارہ ہے۔ کیونکہ یہی تنہا سیارہ ہے جسکی فضا سے گذر کر ہم اس کی سطح کا معائینہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ زہرہ، مُشتری، زحل، یوری نس اور نیپچون کے بھی فضا ہیں لیکن اُن کے فضا ہمیشہ ابر سے ڈھکے رہتے ہیں۔ اِس لئے اُن کے سطح ہماری نظروں سے بالکل اوٹ میں رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم چاند اور عطارد کے سطح کو دیکھ تو سکتے ہیں، لیکن اُن کی کوئی فضا نہیں ہے کیونکہ وہ مُردہ ہو چکے ہیں اِس لئے اُن کے سطح پر کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

مریخ میں دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کی سطحی تغیرات کا معائینہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ گرمیوں کی آمد آمد سے اس کے قطبین کے چوٹیوں پر کی برف کے پگھلنے اور جاڑے کی آمد آمد پر برف کے جمنے کی کیفیت کو ہم متوسط پیمانے کی دُوربینوں کے ذریعہ معاینہ کر سکتے ہیں۔ گرمیوں میں منجمد برف کے پگھلنے کی رفتار سے ہم چوٹیوں پر کی منجمد برف کی دبازت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ سُورج کی گرمی کی جو مقدار مریخ تک پہونچتی رہتی ہے ہمیں معلوم ہے۔ مریخ کی چوٹیوں کی منجمد برف کی دبازت صرف چند انچ منجمد برف کے برابر ہوگی۔ اس لئے مریخ کی چوٹیوں کی برف کی دبازت ہماری دُنیا کے قطبین کی برف کی چوٹیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ نسبتاً ایک بنجر اور خشک دُنیا ہے۔ مریخ پر سمندر ناپید ہیں۔ اور اس کی سطح کا بیشتر حصہ بے آب وگیاہ میدان ہے۔ انھیں بنجر ریگستانی علاقوں کے سبب مریخ ہماری نظروں کو کبود (زرد) رنگ کا معلوم ہوتا ہے۔

ان کبود رنگ کے صحرائی علاقوں کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں تاریک حصے بھی نظر آتے ہیں، جو دُور دُور تک بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان حصوں میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان تغیرات کے خاطر خواہ تفصیلی معاینہ کے لئے بڑے پیمانہ کی دوربینوں، موافق فضائی حالات اور حدِّ بصارت کی ضرورت ہے اس صورت میں مریخ کا بہت نزدیک ہوتے ہوئے بھی ہم صرف موٹے موٹے تغیرات اور حالات کے معائینہ کی اُمید کر سکتے ہیں۔ تاہم مختلف حصوں میں موسم کے مطابق رنگوں میں تبدیلی کا پیدا ہونا ایک طے شدہ امر ہے موسم بہار کا شوخ سبز رنگ، موسم گرما کے پختہ سبز رنگ سے بدل جاتا ہے اور بعد ازاں رفتہ رفتہ موسم خزاں کے مختلف رنگوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ تغیرات موسم کی پے در پے تبدیلیوں اور اقسام نباتات کے پیدا ہونے اور مر جانے کے سبب رونما ہوتے ہیں۔

یہ اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ مریخ کے ہوائی کرہ (Atmosphere) کی تحلیل غیر مکمل ہے۔ لیکن

ابتک ہم کو ٹھیک ٹھیک یہ نہیں معلوم ہوا کہ مریخ کی فضا میں آکسیجن (Oxygen.) اور کاربن ڈائی آکسائڈ (Carbondioxide) کس قدر مقدار میں شامل ہے۔ اس کی بھی اُمید نہیں کہ ہم اس بات کا ثبوت بہم پہونچا سکیں کہ آیا مریخ پر حیات حیوانی کا وجود بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لیکن اس ہوائی کرہ (فضا) کی تحلیل کے معلوم ہو جانے پر ہم اس بارہ میں کسی قدر صحیح قیاس اور اندازہ لگا سکیں گے۔ لیکن جب یہ بات ہم کو قطعی طور معلوم ہوگئی کہ نباتات کا وجود مریخ میں بدرجہ اتم موجود ہے تو پھر حیوانات کے وجود کے امکانات پر شک و شبہ کی گنجائش بہت کم رہجاتی ہے۔ کیونکہ حیات حیوانی اور حیاتِ نباتی کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے مگر حیاتِ نباتی اور عدم حیات کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہے۔

نغماتِ محبّت

از حضرت اعجاز اسلام آبادی

(۱)

مرے خیال کی دنیا بسا رہا ہے کوئی — عجب ترانۂ الفت سُنا رہا ہے کوئی
شرابِ حُسن کے ساغر پلا پلا کے مجھے — خمارِ عشق میں بیخود بنا رہا ہے کوئی
شباب و شعر کی رنگین وادیوں کی قسم — مجھے بہار کا نغمہ سُنا رہا ہے کوئی

سُرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ہوائیں ہیں
فضا کو مستِ ترنّم بنا رہا ہے کوئی

(۲)

تصوّرات کی محفل سجائے جاتے ہیں — تخیّلات کی دنیا بسائے جاتے ہیں
مئے محبتِ رنگین کے کرشمے ہیں — خمارِ عشق میں سب کچھ بھلائے جاتے ہیں
فسانۂ غمِ ہستی نہ مختصر ہوگا — فریبِ زندگی ہم یونہی کھائے جاتے ہیں
ستم ظریف نے سُنکر صدائے آہ، کہا — یہ بزمِ ناز ہے یاں دل جلائے جاتے ہیں
مری محبتِ ناکام کے فسانے ہیں — جو جسم و روح پہ غم بنکے چھائے جاتے ہیں
او کارزارِ محبت میں کُودنے والے! — دیارِ عشق میں دل آزمائے جاتے ہیں

مرا شباب فسردہ ہے سازِ آہ و فغاں
غموں کے ساز پہ اعجاز گائے جاتے ہیں

مُصوّر کا انعام

از مسٹر درباری لال شمیم

چنتا پور کے دیہاتی کہتے، وہ ایک مورت کی پوجا کرتا ہے۔ جب وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے اپنے خیالات میں کھو جاتا ہے۔ تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ جہاں کہیں عورتیں مِلکر بیٹھتیں یہی ذکر چھیڑ دیتیں۔ کوئی کہتی وہ تصویر رادھے کی ہے۔ مصور نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے۔ وہ رادھے کا بڑا اُپاسک ہے۔ دوسری کہتی، تمھیں کیا معلوم وہ تصویر رادھے کی ہے یا کسی اور من موہنی کی۔ ہم نے تو کسی کو آج تک ایشور سے بھی اتنا پریم کرتے نہیں دیکھا۔

بعض پڑھے لکھے آدمیوں کی آنکھ میں بھی یہ بات کھٹکتی تھی۔

قصہ من گھڑت ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کے لئے گاؤں کے عینی گواہ موجود تھے۔ ایک دن رنجنی کسی کام کی وجہ سے مصور کے گھر گئی۔ بظاہر گھر میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ لیکن دروازہ اندر سے کیوں بند تھا۔

رنجنی نے ایک نیم وا کھڑکی سے اندر کی طرف جھانکا۔ دُور سے اُس نے دیکھا۔ تصویر کا ایک پہلو نظر آتا تھا۔ مصور اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے دوزانو بیٹھا تھا۔ اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر کر اُس کی گاڑھے کی قمیص میں سما رہے تھے۔ ایسے ہی جیسے بارش کی اُن چند موٹی موٹی بُوندوں کو جو اچانک دھوپ میں ہی برس پڑیں خشک زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ یہ خبر آناً فاناً آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ کئی ایک کو شوق پیدا ہوا جو وقتاً فوقتاً جا کر اس سارے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے۔ لیکن مصور اپنی دُھن میں محو تھا۔ اُس کو کسی کے آنے جانے کی خبر نہ ہوتی تھی نہ ہوئی۔

رمیش نے کہا "بھائی اجیت پھول گڑھ کی سالانہ نمائش ہے۔ مہاراجہ صاحب اپنے ہاتھ سے انعام تقسیم کریں گے۔ مُلک بھر میں تمھاری مصوری کی دھوم ہے۔ تم کون کونسی تصویریں لے چلو گے؟"

اجیت نے لاپرواہی سے کہا "ایک تو وہی کسان کی، جو خوبصورت بیلوں والے ہل کو جوت رہا ہے۔ سُورج سر پر پہونچ چکا ہے اور گرمی کے مارے سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہے۔ لیکن جب وہ اپنی

بیوی کو سر پر روٹی رکھے ہوئے آتے دیکھتا ہے تو اُس کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے اور اپنی تمام کلفت کو بھول جاتا ہے۔ اور دوسری وہ جس میں ایک شہزادے نے ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا ہے۔ جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی ہوئی ایک حسین و جمیل، بھولی بھالی دوشیزہ کو دیکھتا ہے۔ ٹھٹک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ آگے بڑھکر ہرنی کا شکار کرے یا وہیں ٹھہر کر خود کسی کا شکار ہو جائے۔"

"لیکن کیا وہ تصویر نہیں لے جاؤ گے۔ جس کی تم پوجا کیا کرتے ہو؟" رمیش نے پوچھا۔

اجیت کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ اُس نے آج تک یہ تصویر کسی کو نہیں دکھائی تھی۔ رمیش کو اسکا علم کس طرح ہوا؟ ساتھ ہی وہ تمام نظارہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ جسے شاید ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اُس نے دیکھا ایک البسرا رتھ میں بیٹھی ہوئی ہے اور کنکھیوں کے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ وہ چلا گیا۔ لیکن کیسے۔ یہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا۔ شاید حسینہ کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی طاقت تھی، جو اُسے اپنی طرف کھینچ لے گئی۔

پھر اُس نے دیکھا، دو شفقی ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ایک مترنم آواز پیدا ہوئی۔ جیسے رات کی خاموش تاریکیوں میں کوئی آبشار دور سے گرتا ہوا سنائی دے۔ اُس نے سنا کوئی کہہ رہا تھا۔

"تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

اُس نے کہا وہ ایک مصور ہے اور واپس اپنے گھر چنتاپور جا رہا ہے۔"

"لیکن شہر میں کیسے آنا ہوا تمھارا؟"

"میں چاہتا تھا کہ میری رسائی کسی طرح مہاراج تک ہو جاتی اور میں مصور کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا جاتا۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"مہاراج کے اہلکاروں نے مجھے روک دیا اور رشوت طلب کی جو میرے پاس موجود نہیں تھی۔"

"تصویر اچھی بنا لیتے ہو؟"

"ہاں!" اُسے یاد آیا کہ اس کے سوا وہ کوئی لفظ نہیں کہہ سکا تھا۔

اور شاید اس کے ساتھ ہی حسینہ نے اپنے گلے سے ایک قیمتی ہار اُتار کر اُسے دیا تھا اور اپنی تصویر بنوانے کو کہا تھا۔ لیکن کب اور کس دن اس کا کوئی وعدہ نہ تھا۔

ایک سال گذر گیا۔ لیکن نہ کوئی تصویر بنوانے آیا اور نہ ہار واپس لینے۔

یہاں پہونچکر رمیش کی آواز نے اُس کے تخیلات کی دنیا میں ایک تلاطم پیدا کر دیا۔

"تم کس خیال میں کھو گئے ہو؟"

"کچھ نہیں، میں وہ تصویر بھی لے چلونگا"۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھر اپنے خیالات میں محو ہوگیا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں سوچ رہا تھا "میں وہ تصویر بھی ساتھ لے چلونگا۔ شاید وہ مہ جبین نمائش دیکھنے آئے اور اپنی تصویر بنوانے کو کہے تو میں یہ تصویر اُس کو پیش کردوں اور ساتھ ہی وہ ہار بھی، جسے میں نے اپنے اخراجات کے لئے استعمال نہیں کیا"۔ یکایک وہ کسی فوری خیال کے زیر اثر بڑبڑا اٹھا:-

"تو رمیش تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کسی تصویر کی پوجا کرتا ہوں؟"

"میں ہی کیا تمام دُنیا جانتی ہے"۔

مصّور کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ شاید وہ اُس کے جمال میں اتنا ہی کھوجاتا ہوگا کہ اُسے دُنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی ہوگی۔ اور اس طرح ممکن ہے۔ پہلے اُسے کسی ایک نے دیکھ لیا ہو اور پھر . . . .

۳

مہاراج نے تمام انعام تقسیم کرنے کے بعد اجنبیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہاری تصویر اس قابل نہیں کہ تمھیں معمولی انعام دیا جاوے۔ تم ہمارے ساتھ محل میں چلو۔ ایک گرانقدر انعام کے علاوہ تمھیں خلعت شاہی سے سرفراز کیا جائے گا"۔

دوسرے دن راجہ نے مصور کو اپنے تخلئے میں طلب کیا۔ مصّور نے مہاراج کو جھک کر پرنام کیا۔ اور باادب ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

کمرے کے درمیان میں ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ "دوسری طرف شاید مستورات ہونگی"، مصّور نے خیال کیا۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟" راجہ نے پوچھا۔

"ایک دیوی کی"۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"مہاراج یہ تو میں نہیں جانتا"۔

"تم نے اس کی تصویر کہاں بنائی؟"

"مہاراج"۔ مصّور نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دن میں شہر سے واپس اپنے گاؤں چنتا پور جا رہا تھا۔ رستے میں ایک رتھ . . . . ."

مصّور نے مشکل سے ابھی رتھ کا لفظ ادا کیا ہوگا کہ پردے کے پیچھے پازیب کی جھنکار پیدا ہوئی۔ اور اُس کے ساتھ ہی راجہ کی نشستگاہ کے پیچھے سے جہاں راجہ نہیں دیکھ سکتا تھا، لیکن وہ جگہ مصّور کے بالکل بالمقابل تھی، پردے میں سے ایک منوّر چہرہ ظاہر ہوا۔ ایک لمحہ کے لئے مصّور کی آنکھوں میں چکا چوند ہوئی۔

اس کے بعد اُس نے دیکھا۔ وہی آنکھیں۔ وہی خد و خال، وہی تابناک چہرہ۔ جو ایک سال پہلے اُس نے ایک سڑک کے کنارے رتھ میں دیکھا تھا۔ اُس دن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ آج حزن و ملال۔ مصور کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُس کی نیم وا نرگسی آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی تھیں۔ کیا تم میری لاج نہیں بچاؤ گے؟

ایک سیکنڈ کے عرصے کے اندر اندر یہ تمام کچھ ہو گیا۔ مصور خاموش تھا۔

راجہ نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا۔ رتھ میں تم نے کیا دیکھا؟"

مصور کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے زمین گھوم رہی ہے اور آسمان چکر میں ہے۔

راجہ کے الفاظ اُس کے کانوں تک پہونچنے سے پہلے ہی ہوا میں گم ہو چکے تھے۔

راجہ غصہ سے کہنے لگا "کیا تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے یا بہرے ہو گئے ہو۔ بولتے کیوں نہیں؟"

مصور اب بھی خاموش تھا۔

راجہ غصہ میں سر سے پاؤں تک تھرا اُٹھا۔ بادشاہوں کا غصہ دریا کی طغیانی کی طرح ہے جو کنارے کے ہرے بھرے کھیتوں اور آبادیوں کو بلا سوچے سمجھے بہا کر لے جاتی ہے۔

کڑک کر بولا "او رذیل کتے۔ راجہ کی عزت پر ہاتھ ڈال کر، راجکماری کی تصویر بنا کر مجھے رسوا کر کے تو اپنے اس جرم کی سزا کو خاموشی سے ٹالنا چاہتا ہے۔"

"مہاراج میں بالکل بے قصور ہوں"۔ مصور کے آخری الفاظ تھے۔

"چنڈال"

راجہ کی تلوار میان سے باہر آ چکی تھی۔ وہ انتقام کے جوش میں مصور کی طرف جھپٹا۔

پردے کے پیچھے پھر ایک دفعہ پازیب کی جھنکار ہوئی۔ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ راجکماری شیاما، راجہ اور مصور کے درمیان تھی۔

تلوار کا وار چل چکا تھا۔ اور دوسرے لمحہ میں راجکماری کا سر فرش کے قالین کو رنگین بنا رہا تھا۔ راجہ کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

مصور نے ایک دردناک چیخ ماری اور راجکماری کی خون آلود نعش پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

تنقید کُتب

حیاتِ جاوید[1]

شمس العلماء خواجہ حالی کا نام نامی اُردو کی ادبی دنیا میں خاص عقیدت و ارادت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ نہ صرف جدید اُردو شاعری کے بانیوں میں ہیں بلکہ اُردو نثر نویسی خصوصاً سوانح نگاری کے خاص علمبردار ہیں۔ آپ کی نثر صاف، سادہ اور زور دار ہوتی ہے اور وہ اسلوب بیان پر مطلب کو قربان نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے انکی عبارت بہت سُلجھی ہوئی اور شُستہ ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ زور بیان اور استدلال سے بھی مالا مال ہوتی ہے۔ غرض آپ کی تصانیف اُردو لٹریچر کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ آپ کی خاص تصنیف سر سید احمد خان بہادر کی سوانحعمری ہے جو عرصہ ہوا "حیاتِ جاوید" کے نام سے شائع ہوئی تھی مگر ایک مدت سے بازار میں دستیاب نہ ہوتی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی کوشش اور اہتمام سے حال ہی میں اُس کا ایک تازہ ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ جس کی کتابت، طباعت اور کاغذ سبھی پسندیدہ ہے۔ اسمیں سر سید اور مولانا حالی کی دو بڑے سائز کی عکسی تصویریں بھی درج ہیں اور آخر میں چند ضمیمے بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ جن سے سر سید کے خاندان اور اُن کی تصانیف وغیرہ کے متعلق مفصل حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اصل کتاب پر ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مفصل تنقید چھپ چکی تھی۔ اب جبکہ یہ سوانحعمری اُردو ادب کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے، اُس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں ہے کہ مولانا حالی نے اس کتاب میں بڑی بالغ نظری اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے کہیں دیانتداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اپنے ممدوح کے حالات لکھنے میں اُنھوں نے نقادی کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ کیونکہ جہاں اُنھوں نے سر سید کی خدمات اور قربانیاں بیان کی ہیں وہاں ان کی کمزوریاں بھی لکھدی ہیں۔ حالانکہ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اسمیں اس قسم کی واقعہ نگاری اور تنقید کا رواج عام نہ تھا۔ اُس پر موجودہ دَور کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس کتاب میں خواجہ صاحب نے سر سید کی دوستی کا حق ادا کیا ہے اور اُن کی عیب پوشی کی ہے۔ مگر ہماری رائے میں جن لوگوں کی یہ رائے ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ انھیں باتوں کو مختلف نقطۂ خیال سے دیکھتے ہیں۔ ہم اس کو بھی طرفداری یا عیب پوشی نہیں کہہ سکتے بلکہ صرف نقطہ خیال کا فرق کہیں گے۔ بہرحال "حیاتِ جاوید" سر سید کی مفصل اور بہترین سوانحعمری ہے

[1] ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اُردو، دہلی۔

جسے ہر اُردو داں کو پڑھنا اور ہر قدر دانِ ادب کو خریدنا چاہیئے۔

تاریخ ادبیات ایران[1]

یہ پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات در عہد جدید ۱۵۰۰ء لغایت ۱۹۲۴ء"[2] کا اُردو ترجمہ ہے، جسے سید وہاج الدین احمد کنتوری جامعہ عثمانیہ حیدر آباد نے نہایت محنت اور خوبی کے ساتھ اُردو کا جامہ پہنایا ہے، اور اصلی کتاب اگرچہ ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ پروفیسر براؤن کی مشہور کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کا چوتھا اور آخری حصہ ہے۔ اس کا پہلا حصہ "تاریخ ادبیات ایران از عہد قدیم لغایت فردوسیؒ" کے نام سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے بعد ۱۹۰۶ء میں اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا۔ جسمیں تیرہویں صدی) کے وسط سے لیکر مغلوں کے حملہ تک ادبیات ایران کی تاریخ درج تھی۔ اس کے پورے چودہ سال بعد کتاب کا تیسرا حصہ شائع ہوا۔ جسمیں پروفیسر براؤن نے عہد تاتاریہ کے فارسی لٹریچر کی تاریخ لکھی تھی۔ اسکے بعد یہ چوتھا حصہ شائع ہوا۔ بہرحال ایران کی ادبی تاریخ پر انگریزی زبان میں اِس سے زیادہ جامع و مانع کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ مولانا شبلیؒ کو شعر العجم لکھنے کا خیال پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات سے پیدا ہوا تھا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ادبیات ایران کا جو حصہ ہمارے پیشِ نظر ہے اُسکی تکمیل میں شعر العجم سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

پروفیسر براؤن کی اِس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں چار ضمنی باب ہیں۔ جنمیں چار سو برس کی تاریخ ایران پر اجمالی طور سے بحث کیگئی ہے۔ دوسرے حصہ میں گذشتہ چار صدی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسرے حصہ میں گذشتہ چار سو برس کی ایرانی نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جسمیں مصنفین کے کلام نمونے اور تحریر کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔

پروفیسر براؤن کی پوری کتاب میں قدیم زمانہ سے لیکر ۱۹۲۴ء تک تمام مشہور اور قابل ذکر شعرائے ایران کا تذکرہ ہے اور اُن کے کلام کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ اِس لحاظ سے اسے فارسی شاعروں کا ایک مکمل تذکرہ کہا جاسکتا ہے، لیکن دوسرے تذکروں سے اسمیں یہ خاص فرق ہے کہ اسمیں تاریخ ایران کے مختلف دور قائم کرکے فارسی ادب کی تدریجی ترقی پر بھی بحث کی گئی ہے اور چونکہ ہر دور کی تاریخ لکھتے وقت شروع میں اس دور کے تاریخی حالات بھی مختصراً درج کردئے گئے ہیں۔ اِس لئے اس شاعری کے بارہ میں یہ بات صاف طور سے ظاہر ہوجاتی ہے کہ کون سے شاعر نے کس سیاسی ماحول میں زندگی بسر کی اور اس ماحول کا اس کی شاعری پر کیا اثر پڑا۔ غرض کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے اور سید وہاج الدین احمد صاحب نے اِس کا ترجمہ بھی بہت عمدہ کیا ہے۔ قدر دانانِ لٹریچر کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ سب عمدہ، ضخامت ۶۸۸ صفحات۔

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

[2] A History of the Persian Literature in Modern Times (A D 1500-1924)

ہندو ادیب[1]

اِس کتاب میں حضرت ناظر کاکوری نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو تنہا مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ اسکی بُنیاد ہندو مسلمانوں کے باہمی ارتباط یا میل جول پر قائم ہوئی تھی۔ اس لئے یہی زبان ہندوستان کی "راشٹر بھاشا" یعنی ملکی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اس خالص ہندستانی زبان کی بیخکنی کرنا ملک و قوم کے بہترین مفاد کو ضرر پہونچانا ہے۔ فاضل مُصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں اور اس بات کو ہر طرح سے ثابت کیا گیا ہے کہ اُردو زبان ہندوا ور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے اور جو حق اِس زبان پر مسلمانوں کو حاصل ہے وہی حق ہندوؤں کو بھی حاصل ہے۔ اُردو زبان کو ترقی دینے میں ہندوا ور مسلمانوں دونوں کی بہترین کوششیں شامل رہی ہیں۔ اور ان کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اسی سلسلہ میں فاضل مُصنف نے دو سو ستر ہ زندہ و مردہ ایسے ہندو اہل قلم کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے اُردو لٹریچر کے خزانہ کو مالا مال کیا۔ شعرار کے کلام کا کسی قدر نمونہ بھی درج کر دیا ہے۔

دراصل اِس دلچسپ کتاب کا سنگ بُنیاد ایک ادبی مقالہ ہے جو فاضل مُصنف نے ۱۹۳۴ء میں گوالیار کی ایک ادبی مجلس میں پڑھا تھا۔ اب بعض احباب کی درخواست پر آپ نے اُس مضمون میں مزید اضافہ اور چند مفید اور ضروری ضمیمے شامل کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ مُصنف صاحب نے ہندو ادیبوں کی تصنیفات کی فہرست بھی دیدی ہے اور ہندو مالکان پریس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے جنھوں نے اُردو کی کتابیں شائع کیں اور کر رہے ہیں۔ کتاب میں ہندوستان کا ایک نقشہ بھی ہے۔ جس میں وہ مقامات دکھائے گئے ہیں جہاں اُردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ غرض حامیانِ اُردو کے لئے یہ کتاب بہت مُفید و دلچسپ ہے۔
لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ حجم ۲۵۶ صفحات

دیہاتی گیت[2]

ڈاکٹر اعظم کریوی، اُردو کی دُنیا میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں وہ دیہاتی زندگی کے بہترین مصوّر ہیں۔ اور اُن کے افسانے زیادہ تر دیہات سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو دیہات کے نفسیات کے مطالعہ میں منشی پریم چند کی طرح خاص مہارت حاصل ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ایسے بہت سے دلچسپ گیت جمع کر دئے ہیں جو دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً دیہاتی گیت، ساون کے گیت، چکّی کے گیت، شادی کے گیت، کولھو کے گیت وغیرہ اور لُطف یہ ہے کہ ہر گیت کو دیہاتی زبان میں درج کر کے پھر سلیس اُردو میں اُسکی تشریح بھی کر دی ہے جس سے لُطف دو بالا ہو گیا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط۔ ضخامت پانچ جزو۔

---

[1] ملنے کا پتہ:- انوار بک ڈپو لکھنؤ۔ [2] قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- عصمت بک ڈپو۔ دہلی۔

پسِ پردہ[1]

یہ چھوٹی سی کتاب ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ صاحب کے سات مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جنمیں سے بعض ہندی افسانوں کا ترجمہ ہیں اور بعض طبعزاد قصے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے منشی پریم چند مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور پہلی تصنیف کے لحاظ سے ہم اُن کی کوشش کو قابل داد سمجھتے ہیں۔ عبارت کی رَو میں کہیں کہیں فلسفیانہ اشارے بھی کر جاتے ہیں جو برمحل، پر لطف اور اخلاق آموز ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بقول ایک نقاد کے افسانے پڑھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اسی قسم کے افسانے پہلے بھی گوش گذار ہو چکے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اچھا۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۸ صفحات۔ قیمت بارہ آنے (۱۲/)

سوشلزم[2]

مشہور سوشلسٹ کارل مارکس کے شاگرد رشید بلکہ خلیفہ فریڈرک اینگلز نے ایک رسالہ "سوشلزم" پر لکھ کر اس کی خصوصیتیں بیان کی تھیں۔ جرمن زبان سے اس رسالہ کا ترجمہ مسٹر ایڈورڈ ڈ ایولنگ نے انگریزی میں اور اب انگریزی زبان سے ایک انقلاب پسندانہ ذہنیت کے نوجوان نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم صاحب خود کو صرف "باری" لکھتے ہیں۔ اس کتاب سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مترجم سوشلزم کے دلدادہ اور انگریزی و اُردو دونوں سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ اس چار جزو کے رسالہ کا نفس مطلب تو سوشلزم ہی ہے لیکن جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے وہ عام فہم نہیں ہے نمونہ کے طور پر اس کتاب کی صرف چار سطریں ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔ جس سے ناظرین اس کے طرز بیان کے متعلق خود ہی اندازہ لگا لیں:۔

> "ازمنۂ وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام جس تناسب سے بورژوی صورت اختیار کر رہا ہے اسی تناسب سے اُجرتی مزدور پرولتاریہ کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اگرچہ بورژدہ نے اشرافیہ سے اپنے زمانہ کے محنت کش طبقہ کے مفاد کیلئے جنگ کی، تاہم ہر بڑی بورژوا تحریک میں اس جماعت کے آزادانہ اعلان ہوتے رہے۔"

لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے چار جز۔ قیمت چھ آنے

سرمایہ داری[3]

یہ کتاب اسلامیہ کالج لاہور کے ایک طالب علم مسٹر عبداللہ ملک کا ایک "سوشلسٹانہ" کارنامہ ہے۔ جسمیں انہوں نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کی حالت کا موازنہ کیا ہے۔ یہ کتاب کیسی ہے؛ اس کا جواب مصنف کے دوست کامریڈ شورش کاشمیری کی زبان سے سن لیجئے جو لکھتے ہیں کہ:۔

> رفیق عبداللہ ملک کی یہ تصنیف بھی حسنِ سادہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سادہ حسن کی بڑی تمنا مزدور کو

---

[1] ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ ملیہ لکھنؤ۔ [2] و [3] دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اُردو لاہور۔

اونچا کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے ان "ڈھوروں" کو جنھیں مزدور کہا جاتا ہے۔ جہاد و فکر کی اس راہ پر لگاتا ہے جہاں انقلاب بڑی مدت سے پیشوائی کے لئے بیتاب کھڑا ہے اور آزادی کی محبوبہ اپنے محبوب عاشق کی راہ تک رہی ہے"۔

خود حضرت مصنف نے اپنی اس کتاب کا مقصد "پیش لفظ" کے آخری پیراگراف میں "سرمایہ دارانہ نظام کی تباہی اور مزدوروں کی آمریت" کا قیام بتایا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ ضخامت ۱۰۶ صفحے۔ قیمت چھ آنے۔

ہمارے سالنامے

سالنامہ "ادبی دُنیا" لاہور سنہ ۱۹۴۰ء

بعض انگریزی پرچوں کی تقلید میں اُردو کے اکثر رسالے اپنے اپنے سالنامے شائع کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ہمعصر "ادبی دنیا" لاہور نے جو اُردو کا قابل قدر رسالہ ہے اور جسمیں عموماً اچھے اچھے نظم و نثر کے مضامین چھپتے رہتے ہیں سنہ حال کا جو سالنامہ شائع کیا ہے۔ اُسمیں مختلف سربرآوردہ اہل قلم کے ترشّحِ قلم کرانبہا یہ مضامین نظم و نثر درج ہیں۔ اِنمیں بعض تحقیقی و تاریخی مضامین، مثلاً ڈاکٹر محی الدین صاحب زور کا تاریخی مضمون "محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں میلاد النبیؐ"۔ یا حضرت تسکین عابدی کا مضمون "محلات جانعالم اور اُن کی شاعری" جسمیں واجد علی شاہ کی کئی بیگمات کا تذکرہ و نمونہ کلام دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کے اعتراضات کی تردید بھی کی گئی ہے، جو واجد علی شاہ کو ایک ناقابل حکمران سمجھتے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین میں ظہیر الدین احمد صاحب کا مضمون "نظیر اکبر آبادی" اور حضرت ابومسلم صدیقی کا مضمون "حالی حیات جاوید کی روشنی میں" محنت سے لکھے گئے ہیں جناب ناکارہ حیدر آبادی کا ڈرامہ "شوہر کی بھوک ہڑتال" بھی دلچسپ ہے۔ حصہ نظم میں جو بلحاظ تعداد مضامین نثر سے دگنا ہے۔ بہت سے مشہور اور خوشگوار شعرا کا کلام درج ہے۔ فانی بدایونی، ماہر القادری، روش صدیقی اور ساغر نظامی کی غزلیں قابل قدر ہیں۔ ہمیں اسکی خوبیوں کا اعتراف مگر اسکے سائز کی شکایت ہے۔ قیمت سوا روپیہ

سالنامہ عالمگیر لاہور سنہ ۱۹۴۰ء

ہمعصر عالمگیر لاہور نے بھی سنہ ۱۹۴۰ء کا سالنامہ بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اسمیں بھی متعدد رنگین و سادہ تصویریں اور پانچ درجن سے زیادہ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضامین نثر میں پروفیسر سید حامد حسن قادری کا "آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ"۔ مولوی بشیر احمد صاحب کا "روزمرہ و محاورہ" قابل قدر مضامین ہیں۔ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی کا ڈرامہ "بی اماں" بھی بہت دلچسپ ہے۔ حضرت شفق عماد پوری کی نظم "دوشیزۂ خراماں" ایک قابل قدر نظم ہے۔ حضرت اختر بریلوی کی نظم "بوندوں کا تار" بھی خوب ہے۔ غزلیں

میں استاد جلیل، ماہر القادری، جگر مراد آبادی، دل شاہجہانپوری، روش صدیقی، نوح ناروی وغیرہ کی غزلیں قابلِ دید ہیں۔ غرض یہ سالنامہ ہر طرح سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت ۱۲؍

سالنامہ "مست قلندر" لاہور سنہ ۱۹۴۲ء

جہاں تک مضامین نظم و نثر کی رنگینی اور رنگینی میں تنوع کا تعلق ہے، یہ ۱۴۰ صفحات کا سالنامہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ چھوٹے سے حجم میں باسٹھ دلچسپ مضامین نظم و نثر کو سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیکر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ کئی رنگین تصویریں بھی ہیں جو عموماً فلم اسٹاروں کی ہیں۔ مضامین نظم و نثر میں ہر قسم سے ادبی ذوق کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نظموں میں حضرت ماہر القادری کی "پنگھٹ کی شام" خوب ہے۔

فلم اسٹاروں کی تصویروں کے علاوہ اس نمبر میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو انسان کی ادنیٰ خواہشات کو ہیجان میں لانے والے ہیں۔ ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ "مست قلندر" لاہور۔

"نگار" لکھنؤ

معزز معصر نگار کا جنوری نمبر ہمیشہ خاص اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ نئے سال کا پہلا پرچہ نظیر اکبرآبادی کی یادگار میں نکالا گیا ہے اور اس کے تمام مضامین نظیر اکبرآبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیاز صاحب نے خود بھی ایک قابل قدر مضمون لکھا ہے۔ حضرت مجنوں گورکھپوری اور حضرت مخمور اکبرآبادی کے مضامین بھی خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ نظیر اکبرآبادی صحیح معنوں میں شاعر اور ایک پُرگو شاعر تھے۔ الفاظ کا جسقدر زبردست خزانہ اُن کے قبضہ میں تھا اتنا شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوا ہو، اس کے علاوہ نظیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نئے نئے الفاظ بڑی خوبی سے نظم کر کے رائج کر دیتے تھے۔ لیکن بعض نقادانِ سخن نے نظیر اکبرآبادی کو ایک مبتذل گو اور ادنیٰ درجہ کا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس کے برعکس قدردانانِ نظیر ان کو ہندوستان کا شکسپیر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو فلسفہ و حکمت شکسپیر میں ہے، وہ تو خیر نظیر اکبرآبادی میں نہیں ہے لیکن نظیر کی پرگوئی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسمیں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستانی زبان کے وہ بہترین شاعر ہیں۔ عوام کی روزمرہ دلچسپی کی چیزیں ہی نظیر کی شاعری کی جان ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مضمون کو بھی اُنھوں نے اِس خوبی اور کامیابی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا عش عش کرتا ہے اور اُس کے دل پر اُنکی شاعری کا نقش مستقل حیثیت سے ثبت ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں وطنی جذبات کا پورا حق اگر کسی اُردو شاعر نے ادا کیا ہے تو وہ نظیر ہیں۔ بہرحال یہ سالنامہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اسمیں نظیر کی بہت سی ایسی غزلیں اور نظمیں بھی شائع کی گئی ہیں جو پہلے کہیں چھپی نہ تھیں۔ نظیر اکبرآبادی کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے۔ لیکن ہم کو اس کے صحیح ہونے میں بہت کچھ شک ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ شایقین مینجر نگار لکھنؤ سے طلب فرمائیں۔

"میں یاد تمھاری کرتا ہوں"

(از کیلاش ورما شایق ہنگامی، بی۔ اے)

جب سناٹا چھا جاتا ہے اور رات اندھیری ہوتی ہے — جب مدہوشی کے زانو پر خلقت سر رکھکر سوتی ہے
جب کالے کالے بادل گھر کر دنیا پر چھا جاتے ہیں — اور اپنے خوش کن نغموں سے پیغام عیش سناتے ہیں
جب کالی گھٹا میں کوند کوند کر برق تبسم کرتی ہے — یا سیندور سے لیلی شب کی مانگ کو قدرت بھرتی ہے

تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب سرد ہوائیں چلتی ہیں اور باد صبا اٹھلاتی ہے — جب پھولوں کی دلکش بو سے معمور فضا ہو جاتی ہے
جب چڑیاں اڑتی پھرتی ہیں جب کوئل شور مچاتی ہے — جب پتی پتی ہل ہل کر افسانۂ عشق سناتی ہے
جب ندی نالے بڑھتے ہیں پر کیف صدائیں آتی ہیں — جب ننھی ننھی کلیاں کھلکر گیت رسیلے گاتی ہیں

تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب نور کا تڑکا ہوتا ہے، جب صبح گلابی ہوتی ہے — گلہائے چمن کا شبنم سے جب باد صبا منہ دھوتی ہے
دن بھر کی منزل طے کر کے جب مہر کہیں سو جاتا ہے — اور اپنی حد سے آگے بڑھکر سرخی میں کھو جاتا ہے
یا چاند روپہلی پوشش میں جب بام فلک پر آتا ہے — جب ننھے ننھے تاروں کا اک حلقہ سا بن جاتا ہے

تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

"پی" کہکے پپیہا ظالم جب مہجوروں کو تڑپاتا ہے — جب برہ کی ماری دکھیوں کے سینے میں آگ لگاتا ہے
جب بلبل ہجر میں مضطر ہو کر خون کے آنسو روتے ہیں — جب شمع کی گود میں سر رکھکر پروانے بیخود ہوتے ہیں
جب دل کو صدمے ہوتے ہیں جب جان پہ رنج گذرتے ہیں — جب بیچینی کے عالم میں دل کے جذبات ابھرتے ہیں

تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب مجمع سا لگ جاتا ہے کچھ چنچل شوخ حسینوں کا — جب جلوہ خود کھنچ آتا ہے آنکھوں میں ماہ جبینوں کا
جب ہوش ٹھکانے ہوتے ہیں کچھ صبر و سکوں ملجاتا ہو — جب ان کے بندش دامن سے دل کا غنچہ کھل جاتا ہے
جب جلوہ دکھاتا ہے کوئی ساقی بنکر میخانے میں — جب مست نگاہیں بھرتی ہیں گلگوں صہبا پیمانے میں

تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

صدموں پہ صدمے پڑتے ہیں جب دکھ کا غلبہ ہوتا ہے — جب ضیق میں جاں آجاتی ہے دل خون کے آنسو روتا ہے

جب جینے سے اُکتا تا ہوں اور موت کی خواہش کرتا ہوں جب اپنے دل کے ساغر میں خود زہر فنا کا بھرتا ہوں
جب رنج و مصائب میں گھر کر میرے دن رات گذرتے ہیں بادل طوفانی اُٹھ اُٹھ کر جب خون کی بارش کرتے ہیں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

جب اشکِ ندامت ٹپک ٹپک کر داغِ معاصی دھوتے ہیں جب دل کے ذرّے ذرّے میں پاکیزہ جذبے ہوتے ہیں
جب حسرت خود منھ تکتی ہے دل کی معصوم اُمنگوں کا کچھ نامعلوم اُمنگوں کا یا کچھ معلوم اُمنگوں کا
آہنگ سازِ ازل سے جب مسرور مرا دل ہوتا ہے خود میری عبودیت کا نغمہ جب زیبست کا حاصل ہوتا ہے
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

خورشید جب اپنے جلووں کا نیرنگ دکھا کر جاتا ہے جب خونِ شفق کی لالی سے دامانِ فلک بھر جاتا ہے
جب جوش کے عالم میں یا دل پر وحشت سی طاری ہوتی ہے جب دنیا پر میں ہنستا ہوں اور دنیا مجھ پر روتی ہے
جب عشق کی منزل سے بڑھکر میں خود میں گُم ہو جاتا ہوں جب اِس دنیا میں رہ کر بھی اُس دنیا میں کھو جاتا ہوں
تم یاد مجھے آجاتے ہو میں یاد تمھاری کرتا ہوں

"رات"

ایک سانٹ

(از مسٹر رہبر بی۔اے)

ختم ہے دن، آگیا وقتِ غروبِ آفتاب
لوٹ کر آئے پرندے آشیانوں میں تمام
جگمگائیں گے ستارے آسمانوں میں تمام
آبشارِ نور کا چشمہ بنے گا ماہتاب
ساقیِ مغرب نے کھولا ہے شفق کا میکدا
پی کے مے مدہوش ہوتی جارہی ہے کائنات
کیف آور نیند سوتی جارہی ہے کائنات
ایک مستی کی ردا سی بن گئی ساکن ہوا
سحر افزا خامشی ہے پتّہ تک ہلتا نہیں
لُٹ گیا محشر کدہ فطرت کے رنگیں جام پر
اور کوئل بھی ہوئی خاموش شاخِ آم پر
مضطرب دل کو مرے لیکن سکوں ملتا نہیں
اکتسابِ غم کا منظر بن گئی ہے کائنات
رفتہ رفتہ چھا رہی ہے، اُف یہ تنہائی کی رات

اسکینڈنیویا

یوروپ کے انتہائی شمال مغرب میں ایک بہت بڑا جزیرہ نما شمال سے جنوب کی طرف اور دوسرا اُسکے عین دکھن میں جنوب سے شمال کی طرف بحیرۂ بالٹک اور بحیرۂ شمالی کے درمیان واقع ہیں۔ ان دونوں کو اسکینڈنیویا کہتے ہیں۔ بڑے جزیرہ نما میں فنلینڈ، سویڈن اور ناروے ہیں۔ اور چھوٹے جزیرہ نما میں صرف ڈنمارک کا ملک ہے۔ ڈنمارک جرمنی سے ملا ہوا ہے۔ لیکن جرمنی اور بڑے جزیرہ نما کے درمیان سمندر کی دو[2] آبنائیں ہیں جنمیں ایک کا نام کیٹے گیٹ[1] ہے جو شمالاً جنوباً ڈنمارک اور سویڈن کے درمیان واقع ہے۔ دوسری آبنائے اسکیگریک[2] کہلاتی ہے جو ڈنمارک اور ناروے کے درمیان شرقاً غرباً حد فاصل ہے۔

ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کے جغرافیائی، طبعی اور سیاسی حالات مختصراً درج ذیل ہیں:۔

ڈنمارک

ڈنمارک ایک جزیرہ نما ملک ہے جو جرمنی کا ہمسایہ اور اُس کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کا شمالی حصہ جٹلینڈ بھی اپنی قدرتی ساخت کے لحاظ سے ایک جزیرہ نما ہے۔ ڈنمارک ایک میدانی ملک ہے اور تین طرف بحیرۂ شمالی، اسکیگریک، کیٹاگیٹ اور بحیرۂ بالٹک سے گھرا ہوا ہے۔ بحیرۂ بالٹک میں بہت سے جزیرے ہیں۔ جن میں سب سے بڑا زیلینڈ[3] ہے۔ بحرِ اٹلانٹک میں جزائر فارو اور یوروپ کا سب سے بڑا جزیرہ آئسلینڈ ڈنمارک کے قبضہ میں ہیں۔ اور جزیرہ گرین لینڈ میں ڈنمارک نے اپنی نوآبادی قائم کر رکھی ہے۔ ڈنمارک کا رقبہ تقریباً تینتالیس ۴۳ ہزار مربع کیلومیٹر اور آبادی ۳۲ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ نظام حکومت آئینی بادشاہی ہے یعنی بادشاہ ملک پر پارلیمنٹ کی مدد سے حکومت کرتا ہے۔ موجودہ بادشاہ کا نام کرسچین[4] ہے جو ۱۹۱۲ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ سب سے بڑا شہر کوپن ہیگن[5] ہے جو پایہ تخت بھی ہے۔ اس کی آبادی آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔

ڈنمارک کے باشندے زیادہ تر کاشتکاری، جانوروں کی پرورش اور ماہی گیری کا کام کرتے ہیں۔ صنعت وحرفت کے لحاظ سے ڈنمارک کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ زیادہ تر جَو، جئی (Oats) اور گھٹیا قسم

---

[1] Kattegat. [2] Skagerrak. [3] Zealand. [4] Christian. [5] Copenhagen.

کا گیہوں (Rye) پیدا ہوتا ہے۔ گوشت اور انڈے مرغی بہت کثرت سے دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔
ڈنمارک کی تجارت زیادہ تر جرمنی، سویڈن، ناروے، برطانیہ اور امریکہ سے ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ڈنمارک سے ایک لاکھ ستر ہزار ٹن (ٹن۔ تقریباً ۲۸ من) .Bacon یعنی نمکین اور خشک سور کا گوشت، ایک لاکھ بیس ہزار ٹن مکھن اور ایک ارب، چودہ کروڑ، دس لاکھ انڈے برطانیہ میں آئے تھے۔ امن کی حالت میں ڈنمارک میں چودہ ہزار فوج ہر وقت تیار رہتی ہے۔ فوجی خدمت جبریہ ہے۔ رنگروٹوں کا نام سترہ ۱۷ برس کی عمر میں درج ہوتا ہے۔ جنھیں انیس ۱۹ اور پچیس ۲۵ سال کی عمر میں دو ۲ مرتبہ فوج میں شامل ہو کر کام سیکھنا پڑتا ہے۔ چھ ہزار آٹھ سو رنگروٹ ہر سال بھرتی کئے جاتے ہیں۔ جنگ کے وقت ایک لاکھ فوج میدان میں لائی جا سکتی ہے۔ ڈنمارک کے بحری بیڑے میں دو ۲ آہن پوش جہاز ہیں۔ جنمیں سے ایک پر دو توپیں ۹½ انچ دہانہ کی اور چار توپیں چھ چھ انچ دہانہ کی چڑھی ہوئی ہیں۔ دوسرے جہاز پر ۵.۹ انچ دہانہ کی دس ۱۰ توپیں ہیں۔ ان کے علاوہ ڈنمارک کے بیڑے میں بائیس ۲۲ تارپیڈو کشتیاں، تین سرنگ دور کرنیوالے جہاز، بارہ آبدوز کشتیاں اور پانچ گشت کرنیوالے جہاز ہیں، جو ماہی گیر جہازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ساحلی مقامات میں بہت سے قلعے ہیں اور سمندر کے کنارہ موقع بموقع توپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ بحری بیڑے کے رنگروٹ ۳۶۵ دن تربیت حاصل کرتے ہیں اور ۱۳۲ دن عملی طور پر ڈیفنس کا کام سیکھتے ہیں۔ بحری سپاہ کی تعداد معمولاً دو ہزار ہے جو ضرورت کے وقت چار ہزار ہو سکتی ہے۔ ہوائی بیڑے میں ۳۵ طیارے ہیں۔
سنہ ۱۹۳۹-۳۸ء میں ڈنمارک کا فوجی بجٹ تین کروڑ نوے ۹۰ لاکھ کرونر تھا۔ انگریزی سکہ میں ایک کرونر ایک شلنگ ۱ اور ڈیڑھ پنس کے برابر ہوتا ہے۔ جسے ہندوستانی سکہ میں بارہ آنے سمجھنا چاہئے۔

ناروے

یوروپ کے انتہائی شمال مغرب میں شمالاً جنوباً ہزار بارہ سو میل لمبا ایک عظیم الشان جزیرہ نما ہے جس کا مشرقی حصہ سویڈن اور مغربی حصہ ناروے کہلاتا ہے۔ جرمنی ناروے اور سویڈن، دونوں پر حملہ کر چکا ہے۔ ناروے ایک کم آباد، بنجر اور کوہستانی ملک ہے۔ صرف تھوڑا سا جنوب مغربی حصہ میدانی ہے۔ تمام ملک جنگلوں سے پٹا پڑا ہے۔ مشرق کے سوا تمام ملک سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ کوہستانی ہونیکی وجہ سے آمد و رفت کے ذرائع بہت کم ہیں۔ آبادی بہت کم اور بکھری ہوئی ہے۔ جہاں انگلستان میں آبادی کا اوسط سات سو ۷۰۰ آدمی فی مربع میل ہے وہاں ناروے کی آبادی کا اوسط بائیس آدمی فی مربع میل ہے۔ باشندوں کی بہت کم تعداد جنوب مشرقی حصہ میں کاشتکار ہے، ورنہ آبادی کا زیادہ حصہ جنگل کاٹنے، جہاز رانی اور ماہی گیری پر بسر کرتا ہے۔ ناروے کا شمالی اور وسطی حصہ لوہے اور دوسری قسم کی کانوں سے مالا مال ہے۔ جنگلوں میں

ایک خاص قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جو کاغذ بنانے میں کام آتی ہے۔ اور بہت سے درختوں کی لکڑی سے بھی کاغذ بنتا ہے۔ جس کے بہت سے بڑے بڑے کارخانے جنوب مشرق میں ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ناروے میں کاغذ بہت زیادہ اور سستا ہوتا ہے۔ چشموں سے جو پہاڑی ہیں اور تیز بہتے ہیں، بجلی پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ناروے کی بہت بڑی آبادی کا ماہی گیری پیشہ ہے اس لئے وہاں وہیل مچھلی کا تیل اور چربی بھی بکثرت ہوتی ہے۔ جس کے بہت بڑے ذخیرے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ سامان جنگ بنانے میں ان چیزوں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ اور درحقیقت لوہے کی کانوں اور تیل اور چربی کے ذخیروں پر قبضہ کرنے کے لئے ہی جرمنی نے ناروے پر قبضہ کیا ہے۔ چونکہ کوہستانی ہونے کی وجہ سے ناروے میں ریلیں اور سڑکیں بہت کم ہیں۔ اس لئے باربرداری اور آمد و رفت زیادہ تر سمندر کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ جہاز رانی پر بسر اوقات کرتا ہے۔ صرف ایک ریلوے لائن قابل ذکر ہے جو پایہ تخت اوسلو اور بندرگاہ برجن کے درمیان واقع ہے۔

ناروے میں بڑے بڑے شہر بھی کم ہیں۔ سب سے بڑا شہر اوسلو ہے جو دارالحکومت ہے۔ اس کے بعد ٹرانڈھیم، برجن، اسٹاونجر، کرسچن سینڈ اور نارورک کا نمبر آتا ہے۔ انھیں مقامات پر جرمنی کی حملہ آور فوجیں اُتاری گئی تھیں۔ ناروے کا نظام حکومت آئینی بادشاہی ہے۔ بادشاہ کا نام ہاکون[1] ہے جو درحقیقت ڈنمارک کے ایک شہزادے ہیں اور جنھیں ۱۹۰۵ء میں ناروے کے تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ موجودہ بادشاہ کا لقب ہاکو ہفتم[2] ہے۔ جو پارلیمنٹ کی مدد سے حکومت کرتے ہیں۔ ناروے کی فوج امن کے زمانہ میں ساڑھے بارہ ہزار سپاہیوں، ۱۱۳۵ بڑے افسروں اور ۷۶۵ چھوٹے افسروں پر مشتمل ہے۔ فوجی خدمت جبریہ ہے۔ بحری بیڑے میں چار جنگی جہاز، پانچ تباہ کن جہاز، سترہ تارپیڈو کشتیاں، نو آبدوز کشتیاں اور چھ سلح کروزر ہیں جو ماہی گیر جہازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پچھتر بحری افسر ہیں۔ ہوائی بیڑے میں پچاس طیارے ہیں۔ ناروے کا کل رقبہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ۹۶۴ مربع میل ہے۔ اور اتنے بڑے رقبہ میں کل اٹھائیس لاکھ، چودہ ہزار ۱۴۹ آبادی ہے۔

سویڈن

سویڈن، ناروے کے مشرق اور فنلینڈ کے مغرب میں واقع ہے۔ ڈنمارک اور جنوبی سویڈن کے درمیان صرف دس میل کا سمندر واقع ہے۔ اگر جرمنی کا شمالی ناروے پر پورے طور سے قبضہ ہوگیا ہوتا تو سویڈن چاروں طرف سے محصور ہوجاتا۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوسکا۔ اس لئے سویڈن کو جرمنی سے اتنا خطرہ نہیں باقی رہ گیا۔ اور سویڈن کی امداد و حفاظت کے لئے برطانوی فوجیں شمالی ناروے سے گذر کر سویڈن تک پہنچ سکتی ہیں۔ سویڈن کا رقبہ پونے دو لاکھ مربع میل کے قریب اور آبادی تقریباً ۶۵ لاکھ ہے۔ اسٹاک ہوم

[1] Haakon. [2] Hako VII.

دارالحکومت ہے۔ ۱۸۱۴ء میں ناروے بھی سویڈن کے ماتحت کر دیا گیا تھا۔ مگر اہلِ ناروے اپنی آزادی حاصل کرنے کی برابر کوشش کرتے رہے اور ۱۹۰۵ء میں انھوں نے خود اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اور یورپ کی دوسری سلطنتوں نے بھی ناروے کی خود مختاری تسلیم کر لی۔ سویڈن کے موجودہ بادشاہ شاہ گستاف پنجم ہیں جو ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں تخت نشین ہوئے۔

سویڈن میں تمام دُنیا کے ملکوں سے زیادہ کچا لوہا پیدا ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ سویڈن ہر سال تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کچا لوہا غیر ممالک کو بھیجتا ہے۔ جس میں سے ۸۰ یا ۹۰ لاکھ ٹن صرف جرمنی لے لیتا ہے۔ چونکہ جنگ چھڑنے کے بعد ناکہ بندی کی وجہ سے جرمنی کو کسی اور ملک سے لوہا نہیں مل سکتا۔ اس لئے جرمنی کی نظروں میں سویڈن کی قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ سویڈن کے کچے لوہے کا نصف ناروے کی بندرگاہ ناروک سے جرمنی کو جایا کرتا تھا۔ مگر چونکہ اب برطانوی فوجیں ناروک تک پہونچ گئی ہیں اور ناروے کے ساحل پر برطانیہ کے بحری جہاز چکر لگا رہے ہیں۔ اس لئے اُس طرف سے اب جرمنی کے لئے لوہا نہیں آسکتا۔ سویڈن کی ایک بندرگاہ لولی سے بھی لوہا غیر ممالک کو جاسکتا ہے مگر یہ بندرگاہ سال کے پانچ مہینوں میں برف سے بالکل منجمد رہتا ہے۔ اِس لئے تقریباً نصف سال تک وہ بیکار رہتا ہے۔ لیکن جرمنی اگر سویڈن پر حملہ کردے تو اس کا پورا امکان ہے کہ جس طرح گذشتہ جنگ عظیم میں رومانیہ پر جب حملہ ہوا تو اُس نے اپنے تیل کے چشموں کو برباد کر دیا تھا، اُسی طرح سویڈن بھی اپنی لوہے کی کانوں کو حملہ کی صورت میں برباد کر دیگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی کچے لوہے سے قطعاً محروم ہو جائیگا۔ سویڈن میں غلّہ کی پیداوار بھی کافی ہوتی ہے۔ اُسے بیس ہزار ٹن گیہوں تو ضرور باہر سے منگوانا پڑتا ہے ورنہ دوسری اجناس ملک کی ضرورت کے لئے کافی ہیں۔ اور انکے علاوہ دوسری معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ سویڈن ۲۰ کروڑ پونڈ کی قیمت کی لکڑی اور کاغذ بھی غیر ممالک کو بھیجتا ہے۔ وسطی سویڈن میں کئی اور کارخانے ہیں۔ جنمیں تقریباً ڈیڑھ کروڑ پونڈ کی مشینیں تیار ہوا کرتی ہیں۔ سویڈن میں کوئلہ کی البتہ کمی ہے اور وہ ۶۰ لاکھ ٹن کوئلہ برطانیہ سے منگواتا رہتا ہے۔

سویڈن ایک نہایت صلح کل ملک ہے اور تقریباً سوا سو برس سے اُس نے کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا ہے۔ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کی بھی اُس نے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ البتہ آجکل اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ تربیت یافتہ فوج تیار ہے جو اسکی مستقل فوج سے جدا گئی ہے۔ کچھ ہوائی جہاز بھی ہیں۔ بحری بیڑے میں گیارہ ساحلی تحفظ کے جنگی جہاز، ایک مسلح کروزر، ۲۷ تارپیڈو کشتیاں اور تقریباً بیس آبدوز ہیں۔ ان جہازوں کے علاوہ سویڈن کے پاس تجارتی جہازوں کی کافی تعداد ہے۔

رفتار زمانہ

جنگ یوروپ

ناروے پر جرمن حملہ ہونیکے بعد اگرچہ اتحادیوں نے حتی المقدور ناروے کو مدد پہونچائی۔ اور اپنی فوجیں ناروے، کے چھ سات مقامات پر اُتار بھی دیں۔ لیکن جرمنی نے اس زور سے حملہ کیا کہ کوئی اندازہ کام نہ آیا اور ناروے بچانے کی تمام کوششیں بیکار گئیں بات یہ ہے کہ دشمن نے ناروے کے اہم مقامات پر پہلے ہی قبضہ کرلیا تھا۔ دوسرے اُس نے لوگوں کی غداری سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اُس کی ہوائی فوج بہت بے پناہ ثابت ہوئی۔ اتحادیوں کو اپنی طیارہ شکن توپیں پہونچانے کا موقعہ نہیں ملا اور گو انھوں نے حتی الوسع مقابلہ کرکے جرمنی کو نقصان پہونچایا۔ اور جہاں تک اُس کی بحری قوت کا تعلق ہے، اتحادیوں نے جرمنی کو بہت اہم نقصان پہونچادیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ امدادی مہم ناکام رہی اور اتحادی فوجوں کو چندر روز بعد ٹرانڈھیم، نامسوس وغیرہ مقامات خالی کرکے واپس آنا پڑا۔ اب بھی اتحادیوں کے کچھ فوجی دستے نارویک اور اُس کے شمالی علاقہ میں دشمن کو پریشان کررہے ہیں اور انگریزی بیڑے نے گولہ باری کرکے شہر نارویک کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے۔ مگر دشمن کو ابھی تک ناروے، کے کسی محاذ سے ہٹایا نہیں جاسکا۔ اس مہم کی ناکامی کا برطانیہ و فرانس کی رائے عامہ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں مسٹر چیمبرلین اور اُن کی گورنمنٹ پر خوب لے دے ہوئی۔ اور گو اُن پر کوئی ملامتی ریزولیوشن پاس نہیں ہوا۔ لیکن خود اُن کی پارٹی کے کثیر التعداد لوگوں نے اُن کے حق میں ووٹ نہیں دئے اور ملک کی عام رائے کا یہ مطالبہ ہوا، کہ مسٹر چیمبرلین اب کسی دوسرے وزیر اعظم کیلئے جگہ خالی کریں؛ ادھر انگلستان کے ملکی اخبارات نے قریب قریب یک زبان ہوکر پارٹی گورنمنٹ کے بجائے قومی گورنمنٹ قائم ہونیکی ضرورت ظاہر کی۔ اُدھر مزدور جماعت اور لبرل پارٹی کے لیڈروں نے مسٹر چیمبرلین کی ماتحتی میں کام کرنا پسند نہ کیا۔ اس لئے مسٹر موصوف نے اپنا استعفاء داخل کردیا۔ اور بادشاہ سلامت نے مسٹر چرچل کو وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی۔ چنانچہ اب مسٹر چرچل وزیر اعظم اور مسٹر ایڈن وزیر جنگ ہیں اور مخالف جماعت کے لیڈران مسٹر اٹیلی، مسٹر گرین ووڈ، سر آرچیبولڈ سنکلیر وغیرہ تمام اصحاب نے مختلف محکموں کا انتظام اپنے سر لیا ہے۔ جنگی مجلس شوریٰ بھی از سر نو ترتیب دی گئی ہے۔ مسٹر چیمبرلین بہ حیثیت پریسیڈنٹ کونسل وزارت میں شامل ہیں۔ لیکن اب برطانوی گورنمنٹ صحیح معنوں میں قومی گورنمنٹ ہوگئی ہے۔ مسٹر چرچل نے کنسرویٹو پارٹی کی لیڈری بھی اسی خیال سے قبول نہیں کی اور اس عہدہ پر مسٹر چیمبرلین ہی کو رہنے دیا۔ کیونکہ وہ قومی گورنمنٹ کے سب سے بڑے رکن ہوتے کی حیثیت سے پارٹی لیڈر نہیں بننا چاہتے - دارالعوام میں بھی انھوں نے اپنا ڈپٹی لیڈر مسٹر اٹیلی کو

مقرر کیا ہے جو مزدور پارٹی کے لیڈر ہیں۔ اسی طرح فرانس کی گورنمنٹ میں بھی ردوبدل ہوا اور اب فرانس اور برطانیہ دونوں کی گورنمنٹیں پہلے سے کہیں زیادہ زوردار ہوگئی ہیں۔ مگر اس دوران میں جب فرانس و برطانیہ میں حکومتوں میں ردوبدل ہو رہا تھا۔ ہٹلر دوسری تیاریاں کر رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے فرانس و برطانیہ کی نئی حکومتوں کو سوچ بچار کرنے کی ذرا بھی مہلت نہ دی اور ناروے و ڈنمارک پر حملہ کرنیکے ٹھیک ایک مہینہ بعد یعنی ۱۰ رمئی کو ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ پر بھی اچانک حملہ کر دیا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ اتحادی ہالینڈ و بلجیم کے راستہ سے جرمنی کے علاقہ رُوہر پر حملہ کرنیکا قصد کر رہے تھے۔ ہٹلر نے ہالینڈ اور بلجیم کی حکومتوں پر یہ بھی الزام لگایا ہے کہ گو یہ سلطنتیں بظاہر غیر جانبدار تھیں لیکن دل سے اتحادیوں کی مدد کر رہی تھیں۔ مگر ان بہانہ بازیوں پر اہلِ جرمنی کے سوا اور کون یقین کر سکتا ہے ؟ فرانس اور برطانیہ نے اپنے حدِ امکان بھر اُن ملکوں کی غیر جانبداری کا لحاظ رکھا، اور بلجیم، ہالینڈ وغیرہ نے بھی آخر تک صلح جوئی کے خیال سے اتحادیوں سے کوئی مدد نہیں لی اور نہ اُن سے کسی قسم کا کوئی ایسا معاملہ کیا جس سے جرمنی کو اُن سے جائز بدظنی ہو سکتی۔ بہرحال جرمنی کے اس عذرِ لنگ سے لوگ بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ ناروے پر حملہ کرنے کی ذمہ داری بھی ہٹلر نے اتحادیوں پر ڈالی تھی۔ حالانکہ یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ نارویجین سمندر میں سُرنگیں بچھانے سے کہیں پہلے جرمنی نے ناروے پر حملہ کرنے کے انتظامات کر لئے تھے۔

بہرحال ہالینڈ و بلجیم پر جرمنوں کے حملہ کی خبر آتے ہی اتحادیوں نے اُن کو مدد دینے کا اعلان کر دیا۔ اور جسقدر ہو سکا مدد بھی دی۔ مگر ہالینڈ پر جرمن حملہ اِسقدر اچانک، اسقدر شدید اور عجیب و غریب طریقے سے ہوا کہ ہالینڈ والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہالینڈ و بلجیم پر حملہ کرنے میں جرمنوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے تو چھوٹے چھوٹے دریاؤں میں ربڑ کی کشتیاں چلا کر اپنی فوجیں اہم مقامات پر اُتار دیں۔ اس کے بعد بیشمار فولادی ٹینکوں سے حملہ کیا، اور ہوائی جہازوں سے بے پناہ بمباری کی کہ ہالینڈ کو دم لینے کا بھی موقعہ نہ ملا۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ ہالینڈ میں جرمن فوج کے "پانچویں کالم" نے حملہ آوروں کو بہت بڑی مدد دی۔ "پانچویں کالم" سے مراد وہ جرمن ہیں جو ایک کثیر تعداد میں پہلے سے ہالینڈ میں آباد ہو گئے۔ اور وہ باشندگان ہالینڈ ہیں جو لالچ یا دھوکہ کی وجہ سے خفیہ طور پر جرمنی سے مل گئے تھے۔ ہالینڈ کے تمام اہم مقامات پر ہوائی جہازوں سے بھی چھتریوں کے ذریعہ فوجی سپاہی کثیر تعداد میں اُتارے گئے۔ اور پانچویں کالم نے اُن سپاہیوں کو بھی ہر طرح کی مدد دی۔ انھیں لوگوں کی مدد سے جرمن سپاہیوں نے دریاؤں کے پلوں، بجلی گھروں، ریڈیو اسٹیشنوں، ٹیلیفون اور تار گھروں پر قبضہ کر لیا۔ اور ہالینڈ کی جو فوج جرمن حملہ آوروں سے لڑ رہی تھی اُس پر اُن لوگوں نے عقب سے حملہ کر دیا۔ اِس طرح ہالینڈ کی فوجیں دوہری مُصیبت میں پھنس گئیں۔ پھر بھی وہ دو تین دن تک دشمن کا مقابلہ کرتی رہیں، اُس کے بعد مقابلے کی تاب نہ لا سکیں۔ کہتے ہیں کہ ہالینڈ کی فوج کے قریب ایک لاکھ سپاہی ہلاک ہو گئے اور بڑے بڑے شہر مسلسل گولہ باری سے برباد کر دیے گئے۔ چنانچہ شہر راٹرڈم کی ایک ثلث آبادی یعنی ایک لاکھ آدمی گولہ باری کے شکار ہو گئے۔ دشمن فوج کا ریلا آتا ہی رہا۔ اور دوسری طرف سے مدد نہ پہونچ سکی۔ آخر ان دل شکن حالات سے

مجبور ہو کر ہالینڈ کے کمانڈر انچیف نے ملک کو مزید تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے اپنی فوج کو ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ ہالینڈ کی ملکہ ولہیمینہ اور اُن کی شہزادی جولیانہ مع اپنی دونوں خورد سال لڑکیوں کے انگلستان آکر پناہ گزین ہوئی ہیں۔ وزارے سلطنت بھی چلے آئے ہیں۔ ہالینڈ کے دوسرے جزیروں نے بھی ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ اِس طرح زیلینڈ کے سوا جہاں تھوڑی بہت لڑائی جاری ہے۔ تمام ہالینڈ پر دشمن کا قبضہ ہوگیا ہے۔ ہالینڈ کا بحری بیڑہ البتہ بچا ہے۔ اور وہ اسوقت اتحادیوں کے ساتھ ہے۔

اب بلجیم کا حال سنئے:۔ جرمنوں نے ماسٹرتخت اور ہاسیلٹ کی طرف سے بلجیم پر بھی حملہ کیا اور اپنی مسلح کاردوں اور نیچے اُڑنیوالے ہوائی جہازوں سے بمباری کرکے اور مشین گنیں چلاکر تھوڑی سی مزاحمت کے بعد ان دونوں شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد دشمن کا مقابلہ لیج اور نامور کے قلعوں پر کیا گیا۔ مگر یہ قلعے بھی یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے۔ اور شہر بردسلز پر بھی جو بلجیم کا پایہ تخت ہے جرمنوں کا قبضہ ہوگیا۔ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ اور اُنکے وزیر اوسٹینڈ کو چلے گئے ہیں، جو انگلینڈ کے سامنے رودبار انگلستان پر ایک بندرگاہ ہے۔ یہاں کئی جگہ بلجیم کی فوجوں نے فرانس و برطانیہ کی کمک سے دشمن کی مزاحمت کی۔ مگر جرمن ہوائی جہازوں کی مسلسل بمباری اور موٹر سوار فوجوں کے لگاتار حملوں کی وجہ سے بلجیم کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ پایہ تخت بردسیلز کے علاوہ مشہور قلعبند شہر اینٹورپ پر بھی دشمن کا قبضہ ہوگیا اور اتحادی فوجیں نئے مورچوں کی طرف ترتیب کے ساتھ اپنی مرضی سے ہٹ گئی ہیں۔ اسوقت اس محاذ کی حالت بہت تشویش انگیز ہے گو اتحادی فوجیں جگہ جگہ دشمن کا مقابلہ کررہی ہیں اور کہیں کہیں اُن کی پیشقدمی کو روک بھی دیتی ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ ان ابتدائی فتوحات نے جرمنی کے حوصلوں کو اور بڑھادیا ہے چنانچہ اب وہ ہر طرف جلد سے جلد اور سخت سے سخت حملے کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اُس کی انتہائی کوشش ہے کہ جس طرح سے ہوسکے وہ فرانس اور انگلستان کو پورے طور سے نیچا دکھائے۔ حالانکہ خدا چاہے گا تو بالآخر اسکو نیچا دیکھنا ہوگا مگر اس وقت تو اُس نے فرانس پر بھی لکسمبرگ کی طرف سے حملہ کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چھوٹا سا ملک جرمن حملہ کو کیسے روک سکتا تھا۔ یہاں کی فرمانروا جو گرانڈ ڈچز کہلاتی ہیں پیرس چلی گئیں۔ اور جرمن فوج لکسمبرگ کے علاقہ سے گذر کر آگے بڑھتی چلی گئیں۔ اُن کی مزاحمت کی گئی مگر اسمیں اتحادیوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ چنانچہ جرمن فوجیں فرانس کی مشہور میجینو لائن کے بڑھے ہوئے حصہ کو توڑ کر سیڈان کے جنوب کی طرف فرانسیسی علاقہ میں کئی میل تک بڑھ گئیں۔ اتحادی پوری طاقت سے مقابلہ کررہے ہیں۔ مگر جرمنی کے نئے طریقوں اور جدید ترکیبوں کا توڑ ہونے میں کچھ دیر ہونا ضروری ہے، اتحادیوں نے جنگِ عظیم کے بعد قیام امن اور صلح جوئی کی دھن میں فوجی تنظیم یا اسلحہ بندی پر چنداں توجہ نہ دی مگر جرمنی نے اس کے برعکس اپنے ملک کی تمام طاقت اور دولت خفیہ طور پر جنگی تیاریوں میں صرف کردی۔ چنانچہ بیس سال کی زبردست تیاریوں کا نتیجہ اسوقت دیکھنے میں آرہا ہے۔ لیکن خواہ کچھ ہی ہو اور کتنا ہی عرصہ کیوں نہ لگے۔ اتحادیوں نے

اب اپنی پوری طاقت سے جرمن جبر و تشدد کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس وقت فرانس میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں دشمن کی پیشقدمی کی رفتار رک گئی ہے۔ اور فرانس کے کئی مقامات جن پر جرمن فوج نے قبضہ کر رکھا تھا۔ پھر دشمن سے واپس لے لئے گئے ہیں۔ لیکن اس وقت ہٹلر فرانس سے بھی زیادہ انگلستان پر حملہ کرنے کی فکر کر رہا ہے۔ چنانچہ اب وہ بلجیم اور فرانس کی فوجوں میں رخنہ کر کے فرانس کے ساحلی مقامات قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دو ایک اہم مقامات پر اس کا قبضہ ہو گیا ہے۔ فرانس کے نئے سپہ سالار مارشل ویگان ہوئے ہیں، جو مرحوم مارشل فوش کے دستِ راست تھے اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آج تک کسی لڑائی میں انھیں شکست کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے۔ مارشل موصوف فرانس کے مختلف محاذوں کا دورہ کر چکے ہیں اور عنقریب ہی جوابی کارروائی کرنیوالے ہیں۔ جس سے امید ہے کہ بڑھتے ہوئے جرمن حملے بھاری نقصان کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہوں گے۔

بہرنوع اس وقت تک جنگی ڈرامہ کے تین ایکٹ ختم ہو چکے ہیں۔ پہلے ایکٹ کا تعلق پولینڈ سے تھا۔ دوسرے کا ڈنمارک اور ناروے سے، تیسرے کا ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ سے۔ چوتھا ایکٹ اب شروع ہوا ہے۔ اس کے سین فرانس میں ہیں اور یہی ایکٹ اس ڈرامہ کا آخری ایکٹ ہوگا۔ ہٹلر ڈیڑھ مہینوں میں اس کو ختم کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ زیادہ دنوں تک اس کا زور و شور قائم نہیں رہ سکتا۔ اس وقت اسے جدید آلاتِ حرب اور ہوائی جہازوں میں فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ لیکن ان کے لئے ہزار ہا ٹن پٹرول وغیرہ کی ضرورت ہے۔ جس کا ذخیرہ کسی حالت میں لامتناہی نہیں ہو سکتا۔ اور اتحادی اپنے ہوائی حملوں سے اس ذخیرہ کو کافی نقصان پہونچا رہے ہیں۔ جرمنی کے بحری بیڑہ کو بھی بہت زیادہ نقصان پہونچ چکا ہے۔ غرض اتحادی اب اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اور ہٹلرزم کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن ایثار پر آمادہ ہیں۔ ابھی ان کی طاقت اور دولت دونوں کا ذخیرہ بہت کچھ محفوظ ہے۔ ان کے ذرائع بھی وسیع ہیں۔ اور دنیا کے بہت سے ملکوں کی ہمدردی ان کے شاملِ حال ہے۔ گو اس وقت سلطنت انگریزی کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ لیکن نئی وزارت میں فولادی دل والے لوگ ہیں اور ان کے ارادے بھی فولادی ہیں۔ وہ آزادی اور جمہوریت کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک ٹپکانے کو مستعد ہیں۔ اس لئے ہٹلر کا حوصلہ پورا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس کی یہ امید کہ ڈیڑھ مہینہ میں جنگ کی آگ بجھ جائے پوری نہیں ہو سکتی۔ جنگ یقیناً طول کھینچے گی۔ اور یہی طوالت بالآخر جرمنی کی شکست کا باعث ہوگی۔

۲۴ جون

معذرت:- ہم کو افسوس ہے کہ پچھلے نمبر میں حق پرست صاحب کے مضمون اور بعض دیگر مضامین کی کتابت میں اہم غلطیاں رہ گئیں۔

شکایت:- ہمعصر تیج دہلی اور بعض دوسرے معاصرین زمانہ کے اکثر مضامین بلا حوالہ نقل کرتے رہتے ہیں۔ ہم کو افسوس ہے کہ اس طرح بعض لوگوں کو زمانہ کے اور بعض مضامین کے متعلق غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے معاصرین کرام سے استدعا...

زمانہ

جلد ۷۴ — جون ۱۹۴۰ء — نمبر ۶

میرؔ کا کلام

(از مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

خدائے سخن حضرت میر تقی میرؔ کا کلیات اتنا غلط چھپا ہے کہ کسی صفحہ کو اول سے آخر تک صحیح پڑھنا بہت مشکل ہے۔ اگرچہ قلمی نسخے ملک میں موجود ہیں مگر میں ابتک کسی قلمی نسخہ سے مستفیض نہ ہوسکا۔ بوقت مطالعہ اسی مروجہ نسخے کے مطبوعہ غلط اشعار کو صحیح پڑھنے کی اکثر بقدر امکان کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہ تصحیح میں نے اور کسی نسخے کو سامنے رکھکر نہیں کی ہے بلکہ محض اپنے ذوق کی رہنمائی سے حضرت میرؔ کے انداز سخن کو ملحوظ رکھکر کی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ کتابت کی غلطیوں نے میرؔ کے کلام کو کتنا مسخ کردیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروزِ حمل ۔۔۔ رنگِ گل جھلکے ہے ہر بات میں ہے گی اوجل

(ہوکر)

جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر ۔۔۔ لالہ رو کشِ گل سے ہیں بھرے دشت و جبل

(لالہ و نرگس و گل)

پنجۂ خور کو زر اندود کیا اونی جیسے ۔۔۔ مرتعش باندھے ہیں اکثر شعرا بعضے شل

(اون نے)

ایک اِک تو ہی ہوا عالم اسرار ازل ۔۔۔ ایک سو جان سے عاشق ہے ترا حسنِ عمل

(اے کہ)

وہ نخستین خرد اے عالم آسر در الہ ۔۔۔ مانتے جس کو گئے دہر کے کامل اکمل

(وہ نخستینِ خرد۔ عالم اسرار الٰہ)

(نوٹ) نخستین خرد یعنی عقل اول عبارت ہے جبریل سے مگر یہاں حضرت علی سے مراد ہے۔

سارے رند اوباش جہاں کے مجھ سے سجود میں کہتے ہیں ۔ بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا مجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی ۔ کوسوں سب کے اوڑ گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام ۔ کوچے کے اوس کے باشندوں نے جو ہیں سے سلام کیا

صبح چمن میں اوس کو کہیں تکلیف ہوا تے تھے ۔ رخ سے گل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

(نوٹ) تکلیف ہوا یعنی ہوا ترغیب دے کر اُسے چمن میں لے آئی تھی۔

کام ہو رہے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت ہے ۔ استغنا کی چوگنی اون نے جوں جوں میں ابرام کیا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر ۔ تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

خواب غفلت میں ہیں یاں شب کو عبث جاگا میر ۔ بے خبر دیکھا انھیں میں جنھیں آگاہ سنا

دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہمنشیں ۔ اب عیش روز وصل کا ہے جن میں بھولا خواب سا

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو ۔ آبدیدہ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

اُس سیم بدن کو تھی کب تاب و تعب اتنی ۔ وہ چاندنی میں شب کو ہوتا تو پگھل جاتا

مارا گیا تب گزرا بوسے ترے لب کے ۔ کیا میر بھی لڑکا تھا باتوں میں بہل جاتا

شہر دل ایک مدت اُجڑا ایسا غموں میں ۔ آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا

آنکھوں میں یار میرا ادھر دیکھتا نہیں ۔ مرتا ہوں میں تو ہائے ریدے فرقہ نگاہ کا

(نوٹ) صرفہ بمعنی تکلف۔ تجمل۔ تنگی چستی۔ اب تک لکھنؤ کے روزمرہ میں داخل ہے۔ صرف کرنا یعنی خرچ کرنا۔ برخلاف اس کے صرفہ کرنا کے معنی ہیں خرچ میں تنگی و چستی کرنا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھنے میں بھی صرفہ کرتا ہے۔

تمام زلف کے کوچے ہیں یار پیچ اُس کے ۔ تجھی کو آوے دلا چلنا ایسی راہوں کا

اسے جو خوبی سے لائے (تھے) بچھے قیامت میں ۔ تو صرف گوش کیا کن نے دادخواہوں کا

جو مرتبہ کُل کو حاصل کرے ہے آخر — یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا
جز

تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری — یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا
گر

آئی نظر جو گور سلیماں کی ایک روز — کوچے پہ اوس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
نوحہ

گئے جوں شمع اوس مجلس میں جتنے — سبھوں پر حال روشن ہے ہمارا
کتنی جلتے

ندے زنجیر کی غل ہیں ندے جیر کے غزالوں کے — مرے دیوان میں ٹک ہے رہا معمور ویرانہ
ندوے زنجیر کے غل ہیں ندوے جیر کے — مرے دیوان ہی میں ٹک

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا وش — واں چادرِ مہتاب ہے لکڑی کا سا جالا
درش — مکڑی

ہیں تیرے آئینہ کی تمثال ہم نہ پوچھو — اِس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا
تیرہ آئینہ

پڑتا نہ تھا بھروسا عہدِ وفائے گُل پر — مرغِ چمن نہ سمجھا۔ مَیں تو ہزار رویا
کرتا نہ تھا

تھی مصلحت کی رُک کر ہجراں میں جان دیجے — دل کھول کر نہ غم میں مَیں ایک بار رویا
کہ

اِک خنجرِ عشق اس کا اسباب صد الم تھا — کل میر سے بہت میں ہو کر دو چار رویا
دردِ عشق

گو نہ چلانا مژہ تیرہ نگاہ — اپنے جگر سے تو گزر کر گیا
گو نہ چلا تا مژہ تیر نگاہ

ایسی پیت بے مہر سے ملتا ہے کوئی — دل میر کو بھاری تھا جو پتھر سے لگایا
ایسے بہت بے مہر سے ملتا بھی ہے کوئی؟

مشکل بہت ہی ہم سا پتھر کوئی ہاتھ آنا — یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا
پھر

صد گلستاں نہ یک بال تھی اوسکی جیب تک — طایرِ جان قفسِ تن کا گرفتار نہ تھا
صد گلستاں تہِ یک بال تھے اس کے جیب تک

دھوپ میں جلتی ہیں غریب الوطنی کی لاشیں — تیرے کوچہ میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
جلتی رہیں بے وطنوں کی

جی تو ایسے گئے صدقے کئے تجھ پر لیکن — حیف یہ ہے کہ تنک تو بھی پشیماں نہ ہوا
کئی

آدمیں کب کے کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئے — کون یہ اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا
آہ میں کب کی کہ — نہ ہوئی — کون سا

برق مت خوشی کی اور اپنی بیان کر صحبت — شکر کریہ کہ مرا وہاں دلِ سوزاں نہ ہوا
خورشہ کی — واں

یادش بخیر دشت میں مانند عنکبوت (تھا) ×
دامن کے اپنے تار جو خاروں پہ بن گیا
تن

کہاں آتے میر مجھکو تجھ سے خودنما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا
یہ حسنِ اتفاق

طراوت تھی چمن میں سرو کو یا اشک کم سے
سرو کو گیا اشک قمری سے
اودھر آنکھیں منديں اوسکی کہ ایدھر آب جو ٹوٹا

(نوٹ) آب جو ٹوٹا - یعنی نہر کا پانی خشک ہو گیا۔

ترے اِس خاک اڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت
کلیجہ ریگ صحرا کا بھی دس دس جھلکتا تھا
دس دس گز تھلکتا تھا

(نوٹ) ریگ کا کلیجہ تھلکتا تھا یعنی دھنس جاتا تھا۔

دل کی شکستگی نے ڈرائی کھا ہیں
ڈرائے رکھا ہیں
واں چین جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کا
کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

رہی یہ عشق کی نیرنگ سازی غیر کو اون نے
رہے
جلایا بات کہتے واں مجھے مرنے کو فرمایا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلو ہوں میں
کھیلوں ہوں میں
دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا
دل چلانا

(نوٹ) دل چلانا - کسی مشکل کام کی جرأت کر بیٹھنا۔

کس شام سے اٹھا تھا مرے دل میں درد سا
سو ہو چلا ہوں پیشتر از صبح سرد سا

تھی آگ اوس کی تیغ کی ہم کو سو عشق نے
کچھ لاگ سے
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

سب شور یا دامن کے لئے سر میں مر گئے
سب شور ما و من کے
یاروں کے اس فسانے نے آخر سلا دیا
کو

گزرا کسی جہان میں خوشی سے تمام روز
کسے
کس کی گئی زمانے میں بے غم تمام شب
کٹی

تو ہو اور دنیا ہو ساقی میں ہوں اور مستی مدام
بربطِ صہبا نکالی اوڑ چلے رنگِ شراب
پر بطِ صہبا نکالے

گیا ہوا رنگ رفتہ کیا قاصد ہو جس کو خط دیا
یا ہو رنگ رفتہ یا قاصد ہوا جس کو خط دیا
خیر جوابِ صاف اوس سے کب کوئی لایا جواب

پلکوں پہ بھی پارۂ جگر رات
تھے
ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات

دن وصل کا یوں گھٹا کہے تو
کٹا
کاٹی ہے جدائی کی مگر رات

(۳) زلفوں میں منہ چھپا کے پوچھا
اب ہوئے گی میر کس قدر رات

ہر نقش قدم پہ ترے سر نیچے ہیں عاشق
ٹک سیر تو کر آج تو بازارِ محبت

بیکار مزہ عشق میں تو رونے سے ہر گز
یہ گریہ ہی ہے آبِ رخ کارِ محبت

مجھ سا ہی ہو مجنوں سے یہ کب بانی ہے غافل
ہر گز نہیں اے میر سزاوارِ محبت

مجھ سا ہی ہو مجنوں بھی یہ کب مانے ہے غافل

پینتیس۳۵ سال پہلے

علامۂ اقبال مرحوم نے "ابر" پر ایک دلآویز نظم زمانہ جون ۱۹۰۵ء میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمائی تھی آج اُس کے چند اشعار بطور یادگار ہدیۂ ناظرینِ زمانہ ہیں:-

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن[1] کا

نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر

پیامِ عیش و طرب آسمان سے آیا
ثبوتِ حلّتِ مے لامکان سے آیا

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب مے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گل میں گُہر ٹانکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اُٹھے
زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اُٹھے

نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ
اسی کے ہجر میں گویا اداس تھا سبزہ

ہوا کی نم سے ہوئی نرم سرو کی ٹہنی
جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جھک گئی ٹہنی

ہلا رہی ہے سرِ شاخِ گل کو موجِ ہوا
بنا ہے باغ میں بلبل کے واسطے جھولا

نشیمنوں سے نکل کر پرند گاتے ہیں
ہوا میں کھیلتے پھرتے ہیں چہچہاتے ہیں

اُتر کے آ گئے وادی میں ابر کے ٹکڑے
وہ یا ہوا سے پریشاں ہیں روئی کے گالے

مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا
جو دیکھتا ہوں خرامِ سکوں نما اُن کا

کھڑے ہیں محفلِ قدرت کو دیکھنے والے
کسان کھیتوں سے اٹھ اٹھ کے جھونپڑوں کو چلے

جفا کشی کا خضر کہیئے اِن کسانوں کو
یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو

---

[1] ایبٹ آباد میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔

پُرانا باغ

شاعرِ اعظم جوش ملیح آبادی

آم کا باغ جو ہے پیشِ نظر
یہ مرے باپ نے لگا یا تھا
یاد ہے خوب یاد ہے کہ یہاں
ایک روز اُن کے ساتھ آیا تھا
باغ کے پاسباں نے بھر سلام
ہاتھ اُٹھایا تھا، سر جھکایا تھا
کس قدر دلنواز شاخیں تھیں
کس قدر دل فریب سایا تھا
پتے پتے پہ نوجوانی تھی
ذرّے ذرّے پہ رنگ چھایا تھا
خستہ چڑیوں کے چہچہانے سے
شام کا وقت گنگنایا تھا
میرے اِک بار مُسکرانے سے
باغ سَو بار مُسکرایا تھا
دل پر ابتک خراش باقی ہے
دو گھڑی کو وہ لُطف آیا تھا

اور آیا ہوں مَیں جو آج یہاں
باغ ہنستا نہ مُسکراتا ہے
کل تو گاتا تھا گنگناتا تھا
اب نہ گاتا نہ گنگناتا ہے
ذرّہ ذرّہ مری طرف صد حیف
آنکھ بیگانہ وار اُٹھاتا ہے
باغ کب کا بُھلا چکا ہے جو دَور
اس لئے مجکو یاد آتا ہے
یادِ ماضی، ارے معاذ اللہ
دل تڑپتا ہے، بیٹھ جاتا ہے
آہ بیتے دنوں کی یاد کا درد
زندگی کو لہو رُلاتا ہے
صرف اِک بار مُسکرا دینا
دل پہ سَو بجلیاں گراتا ہے
کیا کہوں کس قدر مرے دل کو
نوعِ انساں پہ رحم آتا ہے

جانتا ہے، فریب ہے ہستی
پھر بھی ناداں فریب کھاتا ہے

مضارع فارسی کا مزید مطالعہ

از مسٹر سلیم جعفر

"قانونِ ابدال و مطالعۂ افعال فارسی" میں مضارع سے بحث کرتے ہوئے ہم نے اس مسلمہ نظریہ کی مخالفت کی تھی کہ ماضی سے مضارع بنتا ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ فارسی میں اکثر دو دو مصدروں کے صیغے ملا کر "صرف" پوری کی گئی ہے (دیکھو صفحہ ۲۳-۲۴ زمانہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۰ء) اس کے بعد ہم نے مضارع فارسی سے مستقل بحث کی جرأت کی جو "زمانہ" بابت ماہ اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ پچھلے مضمون کی اشاعت کے بعد سے مضارع برابر زیر غور رہا۔ نیتجہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

تحقیقات اور صفوۃ المصادر دونوں شاہد ہیں کہ فارسی نے ایک ہی مادّہ سے دَن اور تَن دونوں لاحقات لگا کر مصدر بنائے ہیں۔ اور مادّہ کے حرفِ آخر کو قانون ابدال یا مبادلۂ حروف کے مطابق بدلا ہے اب چند مثالوں پر غور کیجیے:۔

(۱) آراستن۔ آرائیدن + آسودن۔ آسائیدن + آشفتن۔ آشوبیدن + افروختن۔ افروزیدن +

(۲) باختن۔ بازیدن + بالیستن۔ بائیدن + بستن۔ بندن + بودن۔ باشیدن +

(۳) پالودن۔ پالائیدن + پختن۔ پزیدن + پنداشتن۔ پنداریدن + پیوستن۔ پیوندن +

(۴) تاختن۔ تازیدن + تافتن۔ تابیدن +

(۵) جستن۔ جہیدن + جُستن۔ جوئیدن +

(۶) خاستن۔ خیزیدن + خفتن۔ خسپیدن + خواستن۔ خواہیدن +

(۷) دانستن۔ دانیدن + دوختن۔ دوزیدن +

(۸) ربودن۔ ربائیدن + رفتن۔ رویدن + رُفتن۔ روبیدن + ریختن۔ ریزیدن +

(۹) زدودن۔ زدائیدن +

(۱۰) ساختن۔ سازیدن + سپوختن۔ سپوزیدن + ستودن۔ ستائیدن + ریختن۔ ریزیدن +

(۱۱) شستن۔ شوئیدن + شتافتن۔ شتابیدن + شمردن۔ شماریدن + شناختن۔ شناسیدن +

(۱۲) فرسودن - فرسائیدن ، فروختن - فروشیدن ، فرلفتن - فریبیدن ،

(۱۳) کاشتن - کاریدن ، کوفتن ، کوبیدن ،

(۱۴) گداختن - گدازیدن ، گزاشتن - گزاردن - گزشتن - گزیدن - گفتن - گوئیدن ،

(۱۵) نگاشتن - نگاریدن ، نمودن - نمائیدن ، نواختن - نوازیدن ، نگریستن - نگریدن - نوشتن - نولیستن -

(۱۶) یافتن - یابیدن ،

مذکورہ بالا مصدروں میں سے ہر دو مصدروں کا جن سے "صرف" بنائی گئی ہے ایک ہی مادہ نہیں ہے ، کہیں کہیں مادوں میں فرق ہے مگر اس سے اس دعوے پر حرف نہیں آتا کہ "صرف" دو مصدروں کے صیغوں کا مجموعہ ہے۔ اِن مصدروں کے مادے دیکھنے ہوں تو مضمون "فارسی مصدروں کے مادے" جو "زمانہ" بابت ماہ جولائی ۱۹۳۲ء میں چھپ چکا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ فارسی میں مصدر کیونکر بنے ہیں۔ اس سے "سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت" میں بحث کی جا چکی ہے۔ جو "زمانہ" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۳ء میں چھپا ہے۔

ہمارے قواعد نویس کہتے ہیں کہ حرف ماقبل آخر ماضی "شرف آموزی سخن" یا "شرفم از سخن وے" کے حرفوں میں سے کسی نہ کسی سے بدلتا ہے۔ ذیل میں ایک نقشہ ایک مقتدر قواعد نویس کی تصنیف سے نقل کیا جاتا ہے۔ اس نقشہ کے آخر میں ہم ایک خانہ بڑھاتے ہیں، جس سے یہ دکھانا مدِنظر ہے کہ اس مصنف نے جن مصدروں سے مضارع بنایا ہے اُن سے نہیں بلکہ ہمارے بتائے ہوئے مصدروں سے بنایا گیا ہے۔ اور حرف ماقبل آخر ماضی نہیں بدلا۔

حرفِ ماضی	کس سے بدلے گا	صیغۂ ماضی	صیغہ مضارع	مصدر
خ	ز	افروخت - سوخت	افروزد - سوزد	افروزیدن - سوزیدن
	س	شناخت	شناسد	شناسیدن
	ش	فروخت	فروشد	فروشیدن
ش	ر	کاشت - گماشت	کارد - گمارد	کاریدن - گماریدن
	ر اور د	گشت	گردد	گردیدن
	س اور ی	نوشت	نویسد	نویستن
	ل	ہشت	ہلد	ہلیدن
ف	ب	کوفت	کوبد	کوبیدن
	ی مع قلب مکانی	گرفت	گیرد	

حرف ماضی	کس سے بدلے گا	صیغۂ ماضی	صیغۂ مضارع	مصدر
	و اور پ	رُفت	روبد	روبیدن
	و	رَفت	رود	رَویدن
	و- اور- ی	گفت	گوید	گوئیدن
	س- اور- پ	خفت	خسپد	خسپیدن
و	ا- اور- ی	فرمود	فرمائد	فرمائیدن
	ا- اور- ش	بود	باشد	باشیدن
ا	ہ	داد	دہد	...
ر	ن	کرد	کند	...
م	ے	آمد	آید	آئیدن
س	ہ	رست	رہد	رہیدن
	د- اور- ی	شست	شوید	شوئیدن
	ی	آراست	آراید	آرائیدن
	ن	شکست	شکند	...
	ن- اور- د	بست- پیوست	بندد- پیوندد	بندن- پیوندن
	ز	برخاست	برخیزد	برخیزیدن
	ل	گسست	گسلد	گسلیدن
ز	زیادتی نون	زد	زند	... ...

اِس نقشہ کے آخری خانہ میں جو مصدر لکھے گئے ہیں اُن سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اگر ماضی ہی کو مضارع کا ماخذ مانا جائے تو بھی حرف ماقبل آخر ماضی نہیں بدلتا، اور جو نظریہ آج تک مانا جارہا ہے وہ صحیح نہیں۔ مضارع کے متعلق عام طالب علموں کو اگر کچھ یاد رکھنا چاہیئے تو یہ کہ صرف بارہ مضارع خلاف قانون بنتے ہیں جو یہ ہیں:-

مصدر:- آفریدن چیدن دادن دیدن زدن شدن شکستن کردن گرفتن گزیدن مردن نشستن
مضارع:- آفریند چنید دہد بیند زند شود شکند کند گیرد گزیند میرد نشیند

یہ تحقیقات اُن اصولوں پر بھی اثر انداز ہے جو ہم نے اِس سے پہلے قائم کئے تھے۔ اصول نمبر (۲) میں

ہم نے لکھا تھا کہ :-

"تن کے پہلے جن مصدروں میں تس یا بیس ہوگا اُن کا س بھی تن کے ساتھ گر جائے گا"۔

یہ اصول اب صرف دو مروجہ مصدروں زیستن اور شایستن ہی پر عاید ہوتا ہے۔ ہمارا اُصول نمبر (۱۴) تھا

"دن گرانے کے بعد جن مصدروں کا مجموعہ حروف و معروف پر ختم ہوتا ہے۔ د لگانے سے پہلے اُن کا و الف اور ی سے بدل جاتا ہے"۔

چونکہ ایسے تمام مصدروں کے جواب میں ایک ایک مصدر موجود ہے (مثلاً افزودن۔ افزائیدن + آسودن۔ آسائیدن +) اس لیے اس قاعدہ کی ضرورت نہ رہی اور یہ قاعدہ نجم یعنی :-

"جن مصدروں میں ئیدن آتا ہے، اُن کا یہ حصہ گرا کر مضارع کی د سے پہلے ی مفتوح بڑھائی جاتی ہے۔ مثلاً سائیدن سے ساید +"

کے تحت میں آگیا۔ اِس تحقیقات کے اس اثر سے انکار نہیں لیکن پھر بھی یہ کہنا حقیقت سے بعید نہیں کہ اگر اس کو نظرانداز کر دیا جائے تو جو اُصول پہلے قائم کئے گئے تھے اور جن کی تعداد اب کم ہوگئی وہ بحال خود قایم رہیں گے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قانونِ مبادلہ حروف بالکل خارج از بحث ہوگیا۔ کیونکہ آموختن کو غیر منصرف اور اس کے ساتھ کے مصدر آموزیدن کو منصرف ماننے سے اس کے تسلیم کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ خ مضارع میں ز سے بدل گئی۔ یا شناختن و فروختن کی خ س یا ش سے بدلے کیونکہ دونوں کے جواب میں ان کے ہم معنی مصدر شناسیدن و فروشیدن موجود ہیں۔ یہی حال اور مصدروں کا ہے مثلاً کوفتن۔ کوبیدن + رُفتن۔ روبیدن +

غرض یہ کہ مضارع جو اب تک بھُول بھلیاں بنا ہوا تھا وہ اصل میں بھول بھلیاں نہیں ہے۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے صرف غور و فکر کی ضرورت تھی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم اس وقت طالب علم کو اشتقاق کی پیچیدہ راہوں میں لے جا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ ورنہ وہ قانونِ مبادلہ حروف کے چکر سے نہ نکل سکے گا۔ مثلاً ہم کہہ سکتے تھے کہ رُستن کا مادہ رَہ ہے جو زند میں رہ د ہ ہوا۔ تن لگا کر مصدر بنایا تو قاعدہ عام فارسی کے مطابق یہ د ہ۔ س سے بدل گیا۔ مگر جب دن لگا کر مصدر بنایا تو د ہ ی سے بدل گیا اور روئیدن بن گیا۔ شاید اس ہ کے د ہ اور پھر اس کی س یا ی سے بدلنے کی سند مانگی جائے۔ ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن مضمون خواہ مخواہ طویل ہو جائے گا۔ اس لئے ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ شُستن اور شوئیدن دونوں کا مادہ شُدنہ ہے +

میری دنیا

(از پنڈت آنند نرائن مُلّا، ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

(۱)

بزمِ جہاں میں تیرے قابل نہ بن سکونگا
افسردہ دل ہوں زیبِ محفل نہ بن سکونگا

تیرے چراغِ محفل، دل ہیں جلے ہوؤں کے
نغموں کا زیروبم ہے تاروں پہ آنسوؤں کے

اک عارضی نمایش روحِ نظام تیری
رنگینیِ تصنّع جانِ کلام تیری

جو تشنگی بجھائے تجھ میں وہ شے نہیں ہے
ساغر تو خوش نما ہے ساغر میں مے نہیں ہے

میری نظر میں تو ہے اِک مصریوں کا مُردہ
ظاہر ترا شگفتہ، باطن ترا فسردہ

دھوکا نہ کھاؤں گا میں ظاہر کے چہچہوں سے
نالے چھپا رہی ہے تو اپنے قہقہوں سے

چہروں پہ جن کے جھوٹی سرخی سی ہے خوشی کی
نیلیں ہیں اُن کے دل میں ضربات زندگی کی

شعلوں میں زندگی کے اخلاق جل گئے ہیں
دنیائے دوستی کے سکّے بدل گئے ہیں

بازارِ حسن میں ہے اس عشق کا زمانہ
آتا ہے صرف جس کو اپنی دُکاں سجانا

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں تیرے صنم کدوں میں

لاشوں پہ ہے بنائے ایوانِ کامیابی
چونے کی جا لہو ہے اینٹیں ہیں ہڈیوں کی

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھکو اونچی عمارتوں سے

سینچی ہوئی لہو سے سب تیری کیاریاں ہیں
مسروقہ دولتوں پر سرمایہ داریاں ہیں

چنگل میں پڑ گیا جو اُس کو مسل ہی ڈالا
زیرِ قدم جو آیا کچ سے کچل ہی ڈالا

انسان اُتر رہا ہے رسمِ درندگی پر
تہذیب آ گئی ہے حدِ برہنگی پر

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر جینا اگر یہی ہے

(۲)

اِک بار دَورِ گردوں ایسا نظام بھی ہو
جس میں ہر ایک میکش صہبا بہ جام بھی ہو

مظلوم کا کلیجہ تیرِ ستم نہ ڈھونڈے
ایوانِ شادمانی بنیادِ غم نہ ڈھونڈے

اِک آرزوے باطل فکرِ سکوں نہ ٹھہرے
اُلفت فقط مذاقِ اہلِ جنوں نہ ٹھہرے

تصویرِ نامرادی نقشِ جبیں نہ نکلے
راحت، دلِ حزیں کا خوابِ حسیں نہ نکلے

کھوئے تکلفوں میں اُلجھی نہ گفتگو ہو
دل کی کھری زباں میں اظہار آرزو ہو

انسان غاصبانہ راہوں سے ہٹ چکا ہو
پیشانیِ بشر کا تیور پلٹ چکا ہو

برفِ خرد میں جل کر دلِ سُن نہ ہو گئے ہوں
آنکھوں میں آنسوؤں کے سوتے نہ جم چکے ہوں

غیروں کے درد پر بھی دل میں ذرا کسک ہو
خونِ سفید میں کچھ سرخی کی بھی جھلک ہو

انسانیت کا پودا ٹھٹھرے نہ حبس ہوا میں
دل کا بھی سانس لینا ممکن ہو حبس ہوا میں

الیسی زمیں بھی کوئی یا زیرِ آسماں ہے
میرے خیال بتلا دُنیا مری کہاں ہے؟

غزل

(از مولوی نذیر حسین صاحب صدیقی)

تمھاری یاد دلوں کو ہلائے دیتی ہے
سکوتِ ساز کو نغمہ بنائے دیتی ہے

جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں چھپائے دیتی ہے
نظر دکھانے کو سب کچھ دکھائے دیتی ہے

زباں نے رازِ محبت کو راز رکھا تھا
نگاہِ شوق فسانہ بنائے دیتی ہے

فریبِ چشمِ حقیقت نگر معاذ اللہ
مری نگاہ سے مجھکو چھپائے دیتی ہے

یہی ادائے محبت تو زندگی ہے جنوںؔ
جو زندگی کو محبت بنائے دیتی ہے

حضرت اکبر الہ آبادی اور اُنکے ملازمین

از خان بہادر سید عشرت حسین

آج میں اپنے والد حضرت اکبر مرحوم الہ آبادی کے ملازمین کا کچھ حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ گھروں میں دستور ہے بہت ملازم آئے اور چلے گئے۔ مجھے اب سب کے نام بھی یاد نہیں۔ بہتیرے ایسے ہوں گے، جن کے نام میں نے سُنے تک نہیں۔ بعض ایسے وفادار نکلے کہ مرکر گھر سے نکلے۔ بعض ایسے بے اعتبار تھے جن کو نکالنا پڑا۔ اچھے بُرے سلیقہ شعار، بدتمیز سبھی سے سابقہ پڑا۔

سب سے پہلا نام قدرت کا ذہن میں آتا ہے۔ میں نے قدرت کو دیکھا نہیں۔ مگر اُس کے حالات اپنے والد مرحوم کی زبانی سُنے ہیں۔ سارگذار آدمی تھا۔ لیکن اُس کے دو واقعے سُنئے۔ میرے والد مرحوم کی عمر سولہ، سترہ سال کی رہی ہوگی۔ عادت تھی کہ رات کو دیر تک پڑھا کرتے تھے۔ جب زیادہ دیر ہو جاتی تھی، تو میرے دادا صاحب مرحوم کسی ملازم کو بھیج دیتے تھے کہ کہو اب سو رہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ قدرت کو اسی کام سے میرے دادا صاحب مرحوم نے بھیجا۔ قدرت نے آکر دیکھا کہ والد صاحب مرحوم سو رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ جاکر دادا صاحب سے یہ اطلاع کر دے اُس نے میرے والد کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور کہا "میاں۔ میاں —— میاں کہتے ہیں کہ اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب سو رہئے"۔ میرے والد نے ڈانٹا۔ تو اُلٹا جاکر دادا صاحب سے شکایت کی کہ میاں تو خفا ہوتے ہیں۔

الہ آباد میں جمنا کا ریل کا پل بنتا تھا۔ میرے والد عارضی ملازم ہوگئے۔ اسوقت انکی عمر اٹھارہ۔ انیس سال کی ہوگی۔ مرزا پور سے کشتیوں پر پتھر آتے تھے۔ والد کا فرض تھا کہ دن بھر وہاں حاضر رہیں اور ایک ایک پتھر جو آئے اُس کی ناپ لکھیں۔ دن بھر کشتی پر رہنا پڑتا تھا۔ گھر سے جو محلہ چک میں تھا اور پل سے تخمیناً دو میل کا فاصلہ تھا۔ دوپہر کو ایک ملازم کھانا لاتا تھا۔ قدرت دن بھر کشتی پر ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن والد کھانا کھا رہے تھے۔ قدرت نے سامنے آکر کہا کہ "میاں میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں"۔ والد نے کہا اِسکی کیا ضرورت ہے۔ لیکن قدرت نے اصرار کیا۔ چنانچہ دوسرا دن دعوت کے لئے مقرر ہوا۔ مگر والد نے گھر سے کھانا آنے کو نہ روکا۔ اس خیال سے کہ قدرت کی خاطر بھی ہو جائے گی اور دونوں کھانے ملاکر کھالیں گے۔

اب دوسرے دن قدرت نے دسترخوان بچھایا۔ اور اُبلی ماش کی دال اور موٹی روٹیاں والد کے سامنے رکھ دیں، اور دوڑ کر ایک پیسہ کا گھی ایک پتے پر لے آیا اور وہ بھی سامنے رکھ دیا۔ والد نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے، دیدہ و دانستہ کچھ دیر کی کہ گھر سے بھی کھانا آ جائے۔ چنانچہ کھانا آیا اور قدرت نے حسبِ معمول لے لیا۔ لیکن اب وہ کھانا قدرت دسترخوان پر نہیں لگاتا۔ والد نے مانگا تو اُس نے کہا کہ نہیں میاں، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے، آج تو میں نے آپکی دعوت کی ہے۔ والد نے کہا کہ ارے بھئی، دونوں کھانے کھاؤنگا۔ لیکن قدرت نے کہا کہ نہیں صاحب یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ قدرت کشتی میں ایک طرف بیٹھ گیا اور گھر کا کھانا کھولا اور خود اُسے کھانے لگا۔ اُسمیں پراٹھے، کباب اور ایسی ہی چیزیں تھیں اور والد کو ماش کی دال اور موٹی روٹیوں پر رکھا۔

میں نے اپنے والد سے کبھی نہ پوچھا کہ قدرت کب تک ملازم رہا اور بالآخر اُس کا کیا حشر ہوا۔

بعض ملازم عجیب عقل کے تھے۔ والد وکالت کرتے تھے۔ کچھ دوستوں کی آمد تھی۔ صاف چاندنی کا فرش بچھایا گیا تھا۔ زمین پر نشست تھی۔ ملازم حقہ بھر کر لایا۔ اور ویسے ہی فرش پر رکھنے جاتا تھا کہ والد نے روکا۔ اور کہا کہ تم دیکھتے نہیں کہ حقے کا پیندا میلا ہے؟ فوراً ملازم نے اپنے ہاتھ سے پیندا پوچھا اور حقہ فرش پر رکھ دیا۔ اور وہیں اپنا ہاتھ بھی فرش پر رگڑ دیا۔

میرے ہوش سنبھالنے کے بعد بھی ملازمین بدلتے رہے۔ کس کس کا ذکر کروں؟ صرف نام گنانا مقصود نہیں۔ لیکن بعض ضرور مستحق ہیں کہ اُن کا تذکرہ کیا جائے۔ بندھو، مرکر گھر سے نکلا۔ اُس کا سارا خاندان خدمت کے لئے حاضر رہتا تھا۔ معتمد، ضرورت پڑ جائے تو سب کام کر سکتا تھا۔ کھانا پکانا۔ کھانا کھلانا۔ چیزوں کی حفاظت۔ چنانچہ والد فرماتے ہیں ؎

آپ سے ملنے جو میں اے مہرباں آیا نہیں ۔۔۔ یہ سبب ہے گھر سے اب تک کوچوان آیا نہیں

گو کچہری مجھکو لے جاتا ہے بندھو ایک وقت ۔۔۔ لیکن اُس کو ہانک لینا بے تکان آیا نہیں

ڈالچند۔ ہندو ملازم۔ لڑکپن سے نوکر ہوا اور یہ بھی مرکر گھر سے نکلا۔ بندھو کی طرح ہر کام کے لئے مستعد انگریزی کھانے بھی کچھ پکا لیتا تھا۔ نہایت سلیقہ شعار۔ بندھو کا لقب خانساماں کا اور ڈالچند کا لقب بیرا کا۔ جب میں انگلستان سے واپسی پر ملازم ہوا تو ڈالچند کو میں نے لے لیا۔ لیکن وہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد بیمار ہو کر الہ آباد چلا آیا اور وہیں مرگیا۔ بندھو اور ڈالچند خالی از عیوب نہ تھے۔ لیکن تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے دونوں قابلِ تعریف تھے۔

سبحان باورچی۔ رہتا تھا اور پھر چلا جاتا تھا۔ اور پھر چلا آتا تھا۔ مچھلی خوب پکاتا تھا۔

گھورن باورچی۔ نہایت ہوشیار۔ بہت دن ملازم رہا۔ کھانا نہایت تیزی کے ساتھ پکاتا تھا۔ میرے

والد کی صحت کی خرابی کی وجہ سے کھانے کے اوقات معین نہ تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ کھانے کے لئے بہت جلدی کی جاتی تھی۔ دردسر کی وجہ سے فاقے ہوتے تھے۔ لیکن گھورن باورچی تازہ پکا ہوا کھانا فوراً حاضر کردیتا تھا۔ اور متعدد اقسام کا کھانا۔ ایک شعر میں گھورن کا نام آیا ہے گو مفہوم کچھ اور ہے ؎

کیا خوب یہ کہہ گئے ہیں بھائی گھورن — دُنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

کالے خاں جو شین، قاف نہایت صحیح بولتا تھا اور صرف اسی بنیاد پر کچھ دن ملازم رہا۔

منشی عظمت علی جنھوں نے نہایت رفاقت سے اُس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا کام کیا۔ جس وقت میرے والد آنکھوں سے معذور رہتے تھے۔ میجر منیارڈ نے دسمبر ۱۹۰۹ء میں کلکتہ میں اُن کی ایک آنکھ کا آپریشن نہایت کامیابی سے کیا۔

اِس بیان میں عورتیں جو ہمارے یہاں مُلازم تھیں اُن کا کچھ حال بھی ضروری ہے۔ رحیمن اور نیدہا۔ رحیمن بالآخر اِسقدر بوڑھی اور کمزور ہوگئی کہ اُس کو پنشن دیدی گئی۔ نیدہا ہمارے گھر سے مرکر نکلی۔ میری والدہ کے انتقال کے بعد اور پھر میرے بھائی ہاشم مرحوم کے بعد نیدہا ہی کے ذمہ میرے والد کی بڑی خدمت تھی۔ رحیمن اور نیدہا دونوں کا نام کلیات میں موجود ہے ؎

رحیمن پکاری کہ نیدہا بوا — عجب جانور ہے یہ کاکا توا
بتاؤ ذرا عقل ہے میری گم — کدھر اِسکا سر ہے کدھر اِسکی دم

اقوالِ زرّین

مستقل مزاج اور ارادہ کا پکّا آدمی ہر جگہ راستہ نکال سکتا ہے۔

آسودگی میں تنگی کے لئے۔ صحت میں بیماری کے لئے اور جوانی میں بڑھاپے کے لئے کچھ بچاؤ۔

ایک لمحہ کی غلطی ساری عمر کے لئے افسوس کا باعث ہوتی ہے۔

عقلمند آدمی اپنے آپ کو اس طرح حالات کے مطابق بنالیتا ہے۔ جس طرح پانی جس برتن میں ڈالا جائے اسی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

جواہر میں بغیر گھسنے کے آب وتاب پیدا نہیں ہوتی، اسی طرح آدمی بھی بغیر تکلیف اُٹھائے کامل نہیں ہوتا۔

جو لوگ کبھی خادم نہیں ہوسکتے۔ مخدوم نہیں بن سکتے۔

تلاشِ مسرت

از منظور حسین خاں صاحب مظفر ایم۔ اے

اے مسرت! کس گلستاں کا گلِ رعنا ہے تو
کونسی ہے بزمِ عشرت جس کا پیمانہ ہے تو

کون خوش قسمت ہے جس کی شمع کاشانہ ہے تو
میری دنیا سے سبب کیا ہے کہ بیگانہ ہے تو

آرزوئے دید میں تا زیست سرگرداں رہا
عمر بھر ہمشکلِ نقشِ پا عجب حیراں رہا

ہوش آیا بھی تو تیری جستجو میں محو تھا
کوئی لمحہ فکر کا ضائع نہیں مجھ سے ہوا

نام تیرا لے کے جس نے اک اشارا کر دیا
انتہائے آرزو میں رخ اسی جانب پھرا

کشتی ہستی بہ طوفانِ بلا انداختم
از پے دیدارِ تو جور و جفا برداشتم

زہد میں پنہاں ہے زاہد نے کہا تیرا وصال
کان میں آئی مؤذن کی صدائے خوش مقال

ہو گیا سو جان سے اک دم میں شیدائے بلال
مسجدوں میں ڈھونڈھتا پھرتا رہا تیرا جمال

وائے ناکامی عجب منظر نظر آیا مجھے
زاہدِ نافہم نے منزل سے بہکایا مجھے

زاہدوں کا ماحصل نظارۂ حور و قصور
اور وہ بھی کس جگہ صد حیف اس عالم سے دور

بحرِ ذخارِ خودی کو کر رہے تھے وہ عبور
میں نے دیکھا آنکھ سے سب تھے مئے غفلت سے چور

منظرِ بے کیف وہ دیکھا کہ جی گھبرا گیا
جا رہا تھا کس طرف کو اور کدھر میں آگیا

دفعتہً دل نے کہا یہ ہے جہالت کا شعار
طبقۂ ذی علم کو ہوگا صریحاً اس سے عار

چل رہی ہوگی مسرت کی ہوائے فرح بار
اس گلستاں کا ہر اک گل ہوگا مستِ صد بہار

لے کے میزانِ منشعب میں ہو گیا وقفِ کتاب
بھلا سمجھا گیا تھا یوں مسرت کا حساب

رنگ مذہب کا چڑھے گا جبکہ تجھ پر بے حساب ذوقِ راحت بخش سے ہوجائیگا توفیض یاب
یہ جنونِ علم ہی تجھکو کرے گا کامیاب وقت جاتا ہے عمل پیرا ہو تو اِس پر شتاب
تیری سیرابی کا ساماں سب مہیا ہے یہاں
تشنۂ آب مسرت! دیکھ دریا ہے رواں

الغرض درسِ نظامی کی طرف مائل ہوا خوب محنت سے پڑھا، عالِم ہوا، فاضل ہوا
دیکھتا کیا ہوں نئے خنجر سے مَیں بسمل ہوا یا الٰہی میرے پڑھنے کا یہ کیا حاصل ہوا؟
ہر نظر خواہاں ہے آؤں جُبّہ و دستار میں
خودستائی کی جھلک ہو میری ہر گفتار میں

پیکرِ حرص وطمع ہو میری ہستی کا وجود سر سے لیکر پاؤں تک چھایا ہوا اِک رنگِ جمود
گرد اپنے کھینچ لوں کوتاہ بینی کے حدود عقلِ انسانی نہ ہو غوطہ زنِ بحرِ نمود
دل یہ بولا اب ذرا ہمت بڑھانا چاہیئے
درحقیقت شمعِ بزم آرا جلانا چاہیئے

دَیر سے آئی برہمن کی صدائے پُرسکوں ہوگئی جوشِ طلب میں آرزوئے دل فزوں
ایک مدت تک رہا میں اسکی صحبت میں زبوں رفتہ رفتہ کھُل گیا مجھ پر وہ سب رازِ دروں
وہ بھی پی کر بادۂ نخوت اثر بدمست ہے
مطمحِ کیف و مسرت اس کا کتنا پست ہے

ناامیدی کے بھنور میں غوطہ زن تھا ناگہاں دیکھتا کیا ہوں کہ ہے آراستہ بزمِ جہاں
دہر کا ہر فرد ہے پہنے حریر و پرنیاں سُرخ چہروں سے نمایاں ہیں مسرت کے نشاں
زینتِ پیکر کو وہ سمجھے ہیں اِک جزوِ خوشی
میرے نصب العین سے یہ بات ہے بالکل گری

مادہ کی زیب و زینت اے دل آخر تا کجا ہے یہی خواہش تو سب بےسود ہے لکھا پڑھا
لطف آئے گا نظر ہر قید سے جب ہو رہا اپنے ہاتھوں سے جلادے جا کے مندر میں دیا
کھو دیا ہے اِس تعین نے مسرت کا جمال
وائے برما، قابلِ صد گریہ ہے اپنا یہ حال

میری کوشش ہے یہی ہر قید سے آزاد ہوں اے مسرت! تا کہ تیری دید سے دل شاد ہوں

کوچۂ شعر و سخن میں عشق کی روداد ہوں بے نیازِ دیر و مسجد مضطرِ برباد ہوں
سازِ دل را در شبِ تنہا بروں می آورم
یا نواہائے مسرت را بروں می آدرم

تشریح وفا

(از حضرت محشر لکھنوی)

کہہ گئے ہیں سچے دل سے اہلِ ایمانِ وفا
جان جائے ہاتھ سے چھوٹے نہ دامانِ وفا

درسِ حسن و عشق کے اسرار خود ہی کھل گئے
گھر سے مجنوں جب چلا سوئے دبستانِ وفا

اور ہی کچھ ہو گئی پھولوں کی رنگت اور شمیم
کھنچ کے بلبل آئی جب سوئے گلستانِ وفا

اہلِ محفل مرحبا کہنے پہ آمادہ ہوئے
شمع پر جلنے سے پروانہ ہوا جانِ وفا

آج تک آتی ہے زخمِ کوہ کن سے یہ صدا
حشر تک باقی رہے گا سر پہ احسانِ وفا

مشقِ جذبِ باطنی میں ہو گیا اُس کو کمال
بن گیا تقدیر سے جو دل نگہبانِ وفا

کلمہ گو ہو یا کہ دُنیا میں کوئی زُنار بند
سعیِ باطن سے جگا دے نامِ ایمانِ وفا

کربلائے عشق میں ہنستے رہے اور جان دی
گزرے ہیں دنیا میں کیا کیا مرتبہ دانِ وفا

رات دن اُٹھیں جہاں میں کالی کالی آندھیاں
بجھ نہیں سکتی مگر شمعِ شبستانِ وفا

لامکاں تک آنِ واحد میں رسائی ہو گئی
اللہ اللہ کیا بتاؤں حدِ امکانِ وفا

ہر نفس ہے وادیِ ایمن کا منظر سامنے
جلتی ہے شمعِ محبت زیرِ دامانِ وفا

سیکڑوں بندوں نے اپنی ہستیاں کر دیں فدا
نامکمل پر بھی دیکھا سازو سامانِ وفا

کامیاب اُس کو کیا اہلِ جنونِ عشق نے
جس کسی کا ہاتھ آیا تا گریبانِ وفا

جنت اُس کے واسطے ہے اور وہ جنت کیلئے
چشمِ دل سے جس نے کی سیر گلستانِ وفا

خضر و عیسیٰ سے الگ ہیں اُنکی ہستی کے اصول
زندۂ جاوید رہتے ہیں شہیدانِ وفا

دورِ حاضر میں یونہیں مٹتی ہے تصویرِ نفاق
عشق کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلمانِ وفا

چھوڑی ذوقِ بے نیازی میں متاعِ کائنات
اِن فقیروں کو کہیں کیونکر نہ سلطانِ وفا

نام چمکے گا خدائی میں مثالِ مہر و ماہ
تا قیامت مٹ نہیں سکتے محبانِ وفا

زندگی بھر اہلِ باطن کو رہی یہ احتیاط
نفسِ امارہ نہ لُوٹے سازو سامانِ وفا

دیکھکر عاشق کا دل محشر فرشتوں میں ہے غل
مرحبا صد مرحبا اے مردِ میدانِ وفا

صبر و شکیب کی لوٹ

(مضطر خیرآبادی مرحوم کے قطعہ پر بیخود بدایونی مرحوم کی تضمین)

از پروفیسر حامد حسن صاحب قادری، آگرہ

حضرت بیخود بدایونی کی ایک تضمین "ہوش و خرد کی دُکان" کے عنوان سے ناظرینِ "زمانہ" ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ دوسری تضمین بھی پیش کروں گا۔ وہ اب حاضر ہے۔

اِس نظم کی تصنیف و اشاعت کو پچاس برس سے اوپر ہو گئے۔ میرے پاس بھی اٹھائیس برس سے رکھی ہے، ممکن ہے یہ قطعہ و خمسہ مضطر یا بیخود کے کلیات میں چھپا ہو۔ مجھے علم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ جو دیباچہ اور تقریظیں ہیں وہ بھی بجائے خود یادگار چیزیں ہیں۔ اب اس نظم و نثر کا اسلوب بدل گیا ہے۔ یہ چیزیں پرانی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو"۔ لیکن نظم و نثر کے تغیرات الگ الگ نوع کے ہوئے ہیں۔ دیباچہ و تقریظ کا تو یہ انداز جو بیخود و اسیر کی نثر میں ہے، قطعاً بدل گیا ہے۔ اب نہ یہ تخیل باقی ہے نہ یہ تحریر۔ بلکہ تقریظ جو چیز کبھی تھی اب بالکل اُٹھ گئی ہے۔ اب نثر و نظم کی کسی تصنیف پر مُصنف کی فقط مدح سرائی نہیں کی جاتی جو تقریظ کے لُغوی معنی ہیں (ستودن زندہ را) بلکہ عیب و ہنر سب پر نظر ڈالی جاتی ہے اور نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ ہونا ہی چاہئے تھا۔ بہتر ہوا۔ لیکن اس قطعہ و تضمین کے طرز میں ایسی مکمل تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ صرف یہ فسانوی تخیل اور تمثیلی رنگ بدل گیا ہے یعنی اب دُزدیدہ نظر اور غمزہ و ادا کو افراد واردات بنا کر ان کے مکالموں سے نظم تیار نہیں کی جاتی باقی یہ مضمون و موضوع، جذبات، محاکات، واردات، اس سے زیادہ تفصیل و عریانی کے ساتھ عصرِ حاضر کی نظموں میں موجود ہیں۔ "پنہارن" اور "پجارن" کے وہ وہ حُلیے بیان کئے جاتے ہیں کہ ان قطعوں اور خمسوں سے منزلوں آگے ہیں، اس کے وجوہ و اسباب سے بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہ تضمین پیش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے بیخود بدایونی کا دیباچہ ہے۔ اس کی نقل دلچسپی سے خالی نہیں۔

دیباچہ، از حضرت بیخود صاحب مخمس

دل نہیں مال، تو اِس کا تمھیں لالچ کیوں تھا ۔۔۔ تم نہیں چور، تو دزدیدہ نگاہی کیسی

متاعِ صبر و شکیب، نقدِ جان و دل، خلعتِ ہوش و حواس کے چوروں یعنی پردگیانِ پردہ نرگسِ دزدیدہ نگاہی

مدت سے مشہور ہے اور قدیم سے یہی دستور ہے کہ نیچی نیچی نگاہوں میں مال کو تاکتے اور مالداروں کو بھانپتے رہتے ہیں تاکہ جب موقع ملے تو جو کچھ ہتے چڑھے اُس کو لے لوا چنپت[1] بنیں۔ چنانچہ استاذی و استاذ الانام مالکِ ملکِ سخن گستری جناب نواب مرزا خان صاحب (داغؔ) دہلوی مدظلہ نے شعر مندرجہ عنوان میں بھی انھیں خدا ناترسوں کو اسی ادائے غارتگری کی صورت دکھائی ہے۔ مگر یہ ڈھٹائی اور عیاری کبھی دیکھی نہ سُنی کہ چوری کریں اور ساہوکار بنیں۔ دشمن ہوں اور دوستی کا دم بھریں، ولنعم ماقیل ؎

کرتے ہیں جور و جفا، مہر و وفا کہتے ہیں　　یہ بھی کیا لوگ ہیں، کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

ناظرین باتمکین، اس اجمال کی تفصیل اور اس کنایہ کی تصریح یہ ہے کہ میرے پیارے دوست بلکہ میرے عزیز کرم گستر مولوی محمد افتخار حسین صاحب مضطرؔ، جو بیداری پیہم سے تنگ آکر اک چشم زدن کے لئے غافل ہوگئے تو دزدِ دزدیدہ نظر نے ایسا چھاپہ مارا کہ کچھ بھی باقی نہ چھوڑا، اور پھر یہ قیامت کہ جب مال و متاع نقد و جنس سب کچھ اپنے قبضہ میں کرلیا تو خود ہی چونکا دیا۔ تاکہ خود بدولت پر گمان بھی نہ ہو۔ ہائے ؎

بچے نہ سیم و زر ان سے، نہ جان و دل چھوٹے　　کچھ اور خاک نہیں جانتے مگر لینا

اس ہوشربا سانحے اور تاب شکن واقعے سے مضطرؔ پر جو اضطراب طاری ہوا، تو اور کچھ تو نہ کرسکے۔ مگر اپنا دل بہلانے اور دوسروں کو غفلت سے بچانے کے لئے اس خانہ خرابی کا سارا دُکھڑا ایک قطعہ میں نظم کردیا۔ اور اس کی ایک نقل اپنی خاص عنایت اور دلی محبت سے بیخودؔ آشفتہ حال کے پاس بھی بھیجدی۔

بیخودؔ پر اُس کو دیکھ کر جو گذری، اُس کو بیخودؔ کے سوا کون جانتا اور جان سکتا ہے، مگر اتنا تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ وہ صدائے پُر درد سُنتے ہی اُس کے زخم ہرے ہوگئے۔ باوجود اس کے کہ افکار و آلام، غموم و ہموم کی بدولت وہ بیچارہ کُنج گمنامی میں منھ چھپائے کام و دہان کو "زخمے بود دوختہ شد"[2] کا مصداق بنائے پڑا تھا۔ اور بیخودی کی خودداری سے بدل چکا تھا، چیخ اٹھا، اور اظہار ہمدردی میں کچھ آپ بیتی سُنانے کو آمادہ ہوگیا۔ مگر پردہ داری نے آنکھ دکھائی، اور ضبط قلق نے صدائے دور باش سُنائی، افسردہ دلی نے گردن دبائی اور عدیم الفرصتی نے للکار بتائی۔ ناچار وہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن ناسور ہوا ہو کر بغیر تراوش کئے نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جب اس روک ٹوک کے سبب سے اور کچھ بن نہ آئی تو اسی زیبا قطعہ پر تضمین کی ٹھہرائی۔ بارے غنیمت ہے کہ وہ ارادہ پورا اور مخمس ختم ہوگیا۔ اور اس پریشان اور بے نمک تحریر کے ساتھ نذر احباب کیا جاتا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

---

[1] صحیح املا چپت ہے، قدیم لوگ عربی املا کی پیروی میں منبر و منبج کی طرح چنپت اور تمبا کو لکھتے ہیں۔
[2] فارسی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ؎
لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی　　دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

وما توفیقی الا باللہ واستغفر اللہ العلی العظیم ونصلی ونسلم علی نبیہ الکریم۔

اس دیباچے کے بعد یہ تخمیس درج ہے:۔

تخمیس بیخود بدایونی

وارداتِ دلِ بیخودؔ کا ہو کیا تخمینہ ایک مُدت سے غم و درد کا گھر ہے سینہ
پر وہ قصّے تو پُرانے ہوئے اور دیرینہ اک نیا حال سناؤں کہ شبِ دوشینہ
میں جو لیٹا پئے آرام بچھا کر بستر

ایک انبوہ کیا آ کے غم و حسرت نے کہیں وحشت کے ہجوم اور کہیں حسرت کے پرے
دل جو گھبرا گیا آخر یونہیں تکتے تکتے پُتلیاں خواب سے بولیں ارے چل ہو دے
نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار کے در

آنکھ لگ جانے سے کچھ کچھ ہوئی دل کو تسکیں بعد مدت کے ملی لذتِ خوابِ شیریں
مگر آرام جو پانا مری قسمت میں نہیں دیکھتا کیا ہوں کہ اک شوخ ادا پردہ نشیں
فتنہ خو، خانہ برانداز جہاں، عربدہ گر

نرگسیں آنکھیں وہ بے مثل، دہن غنچہ مثال لعل لب لالۂ گلزار سے بھی بڑھ کر لال
سنبل تر سے دل آویز تر اس زلف کے بال چمپئی رنگ، چھریرا سا بدن، پھول سے گال
سروِ بستاں سے کہیں قامت موزوں بہتر

دھانی پوشاک پہ زیور کی غضب تیاری پہنچیاں ساعدِ سیمیں میں مرصع کاری
بدّھیاں دوش پہ ڈالے ہوئے بھاری بھاری بالیاں کانوں میں پہنے ہوئے پیاری پیاری
بجلیاں دونوں چمکتی ہوئی رخساروں پر

وہ چمکتی ہوئی مُجگنی کے نگینے روشن جس کے خود حلقہ بگوشوں میں رہے دُرِ عدن
چوڑیاں پہنچوں میں، بازو پہ مرصع جوشن مانگ صندل سے بھری ماتھے پہ ٹیکے کی پھبن
ڈھل کے آیا ہوا ابرو پہ جڑاؤ جھومر

حُسن والوں میں فقط نام کی شہرت کے لئے چشمِ سفاک کو خوں ریزی پہ آمادہ کئے
دم دئے، قول دئے، ہمت و انعام دئے پلٹنیں غمزہ و انداز کی ہمراہ لئے
ساتھ چالاکی و شوخی و ادا کا لشکر

ہاتھ میں تیغ ادا، خنجرِ کیں زیر بغل قتل و غارت کی تمنا میں نہ آرام نہ کل
مُنھ چھپانے کیلئے چہرے پہ ڈالے آنچل چلی آتی ہے دبے پاؤں اُتارے چھاگل
دیکھتی جاتی ہے مڑ مڑ کے اِدھر اور اُدھر

دل میں یہ وہم کہیں دیکھ نہ پائے کوئی اور شوخی کا تقاضا یہ کہ چلئے تو سہی
الغرض دیکھ جو لی نیند میں غفلت میری آتے آتے مرے بالیں کے قریب آ پہنچی
اور کہا ہنس کے کہاں اے مری دزدیدہ نظر

تو نے دیکھا کہ محبت کا تو اُس کو دعوا اور یوں چین سے آرام میں آکر سونا
ایسے رسوا کنِ الفت کا نہ ہونا اچھا کام کر کام کہ موقع ہے یہی شیخوں کا
اس کے سینے میں کسی طرح سے کر اپنا گذر

پر خبردار کہ یہ کام ہے ہشیاری کا کہیں ایسا نہ ہو جاگ اُٹھے یہ سونے والا
اور ہاں جاکے، تجھے میری قسم بہر خدا شوق و حسرت نظر آجائیں تو دے ان کو سزا
پھر جو کچھ مال ہو وہ لوٹ لے بےخوف و خطر

تجھکو چالاکی و طرّاری کا جو دعوا ہے آج یہ کام بن آئے تو وہ سب سچّا ہے
ورنہ ہم تو یہ کہیں گے کہ غلط جھوٹا ہے سُن کے یہ بات، نظر بولی کہ مشکل کیا ہے
کھولے دیتی ہوں مَیں چھاتی کے کواڑوں کو مگر

یہ بڑا کام ہے، بہتر ہے جو ہوں ایک سے دو ہاتھ میں اُس کا بٹاؤں وہ مدد دے مجھ کو
مصلحت یہ ہے کہ اِتنا مرا کہنا مانو غمزہ و ناز و ادا کو مرے ہمراہ کرو
کہ میں سامان اٹھادوں تو وہ لے لیں باہر

ورنہ یہ کام فقط مجھ سے نہ ہوگا پورا میرے دو ہاتھ ہیں دو پاؤں، کرونگی کیا کیا
کیونکہ اندوہ و غم و حسرت و ارماں کے سوا آپ جانیں یہ بھرا گھر ہے، سبھی کچھ ہوگا
میں اکیلی اسے لاؤں گی یہاں تک کیونکر

پر مرے ساتھ جو آئے وہ یہ سُن کر آئے کہ جو شے لائے، دبے پاؤں اُٹھا کر لائے
تاکہ مطلق نہ کوئی پاؤں کی آہٹ پائے اور سوا اس کے، جو کچھ نیکی بدی ہو جائے
تو میں چلتی ہوئی تلوار بنوں اور وہ سپر

آنے دیں کوئی نہ ہرگز مرے تن پر صدما جس سے ہو تم کو قلق اور میں پاؤں ایذا
بچ رہے پھر کوئی سامان تو میرا ذمّا سُن کے یہ بات وہ کہنے لگی اچھا اچھا
اور دیا حکم کہ سب جائیں نظر جائے جدھر

سُن کے یہ حکم نظر بولی کہ اے ماہ لقا چوری کرنے کو مناسب نہیں جانا سب کا
اِس لئے ساتھ رہے میرے فقط اک غمزا اُس کے مُنھ سے یہ نکلنا تھا کہ بس دوڑ پڑا
باندھ کر غمزۂ بیباک حمایت پہ کمر

سچ تو یہ ہے کہ بُری چیز ہے قسمت کا بگاڑ یک بیک ٹوٹ پڑا مجھ پہ مُصیبت کا پہاڑ
بسکہ در پر کوئی حاجب تھا نہ کچھ روک نہ آڑ نگہ شوخ نے کھولے مرے سینے کے کواڑ
اور گئی غمزۂ سفاک کو لے کر اندر

پڑ گیا لوٹ میں گھر صبر و شکیبائی کا کوئی اسباب نہ چھوڑا دلِ شیدائی کا
یعنی دونوں کو جو موقع ملا تنہائی کا پہلے سامان لیا تاب و توانائی کا
اور پھر ہوش کے صندوق لئے بارِ دگر

درہم داغ جو ہاتھ آئے کمر میں باندھے پارچے وحشت و سودا کے بغل میں دابے
نقد ضبط و خرد و تاب کے لے کر توڑے دوش پر راحت و آرام کے بستے رکھے
صبر و تسکین و تحمل کا لیا سب زیور

جبکہ اِس مال کے لینے سے فراغت پائی شوق و حسرت کے سبب آ گئی شامت دل کی
اب ذرا قدرت حق دیکھئے اے شان تری لینے دینے میں اِس اسباب کے آہٹ جو ہوئی
نیند سے چونک پڑی حسرت وصلِ دلبر

اُٹھ کے ہر سمت نظر کی تو صفائی دیکھی یعنی گھر بھر میں کوئی چیز نہ پائی باقی
خوف سے، رنج سے، وحشت سے وہ گھبرا جو گئی پہرہ والے کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر بولی
کون اُٹھا کہ ابھی دور ہے ہنگام سحر

اور جو اُٹھا بھی تو کھٹ کھٹ یہ لگا رکھی ہے کیا اس پہ طرّہ کہ نہیں کوئی دکھائی دیتا
ہیں! یہ اندھیر ہے کیا، سوز جگر شمع تو لا جب تلک وہ یہ کہے، غمزہ و انداز و ادا
باندھ کر پوٹ میں سب مال روانہ ہوئے گھر

بسکہ چالاک ہر اک ان میں تھا چیدہ چیدہ لیکے مال آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوئے پوشیدہ
مگر اللہ ری ڈھٹائی تری اُف رے دیدہ پھر وہی ظالمِ اظلم نظرِ دز دیدہ
لیکے چٹکی یہ پکاری کہ ارے او مضطر

حیف اتنی تری غفلت، یہ تری بے خبری ہم یہاں آگئے اور تونے نہ کروٹ بدلی
اُٹھ تو او نیند کے ماتے، تری قسمت پھوٹی دیکھ تو گھر میں ترے چوروں نے چوری کرلی
ایسا غافل کوئی سوتا ہے، ذرا غور تو کر

تیرے ہمسایوں میں سُنکر ترے گھر کا کھٹکا جس کو کچھ بھی تری اُلفت تھی وہ دوڑا آیا
پر کریں کیا کہ چلا کھوج نہ کچھ مال بلا سُن کے یہ بات اٹھائیں تو یہ میں نے دیکھا
کہ حقیقت میں مجھے لوٹ گئے غارت گر

زیست کا لطف تھا جن سے وہی سامان نہ رہے جن پہ نازاں تھا یں اسباب وہ باقی نہ بچے
آخرش صبر و تحمل کے جدا ہونے سے اپنی بے جرمی پر آنسو نکل آئے میرے
اس کی بے رحمی پر آنکھوں سے بہا خونِ جگر

سانحے جو نہ سُنے تھے وہ سب آنکھوں دیکھے کسی دشمن پہ بھی یارب یہ مصیبت نہ پڑے
بیخودِ خستہ بس اب اس کے سوا کیا کہئے یہ مثل ہوگئی صادق کہ ارے او بندے
کر تو ڈر، ورنہ خدا کے غضب و قہر سے ڈر

تضمین کے بعد دو تقریظیں اور ایک قطعۂ تاریخ ہے، یہ بھی اپنے رنگ کی خوب ہیں۔ یادگار کی غرض سے اُن کو بھی نقل کرتا ہوں۔ تقریظ نگاروں کا تعارف میرے پہلے مضمون میں ہو چکا ہے۔

تقریظ از لطائف طبع جناب حکیم سید محمد حسن صاحب حسنؔ سلمہ اللہ تعالے خلف الرشید و تلمیذ جناب حکیم سید منور علی خاں صاحب مرحوم دہلوی ارشد تلامذہ حضرت مومنؔ مغفور (مقیم الور)

دُزدِ نظر ہے درپئے غارت گری حسنؔ سینتو، سنبھالو مال، اُٹھو، جاگتے رہو
نقدِ حواس و ہوش کے پیچھے پڑے ہیں چور اس کو بچاؤ، آپ بچو، جاگتے رہو

خدا بچائے، تصورِ زلفِ سیاہ کی کالی گھٹائیں گھری چلی آتی ہیں۔ شبِ غم کا وہ اندھیرا گھپ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ ایسی ہولناک تاریکی میں نالہ و افغاں کا نکلتے دم بند ہوتا ہے۔ اثرِ آہ بیکار بیٹھا ہے کہ گھٹا ٹوپ میں نکل کر جاؤں تو کہاں جاؤں۔ ڈر کے مارے پُتلیاں آنکھوں کے پٹ بھیڑے بیٹھی ہیں۔ کالی بلاؤں کا نرغہ ہے،

کلیجا کانپتا ہے، دل دھڑکتا ہے۔ جان پر بن رہی ہے، مال متاع کے لالے پڑے ہیں، چاروں طرف اندھیری چھائی ہے، چوروں کی بن آئی ہے۔ اک کہرام مچ رہا ہے، ایک تہلکہ برپا ہے۔ کوئی چیختا ہے کہ مار لیا، کوئی پیٹتا ہے کہ لوٹ لیا۔ کہیں واویلا کا غل ہے، کہیں وامصیبتا کا شور ہے، کوئی رو رہا ہے کہ ہائے ایسا صفایا کر گئے کہ خلال کو تنکا تک باقی نہ چھوڑا، کوئی ٹٹول کر تک دھک رہ گیا کہ سوائے اللہ کے نام کے گھر میں خاک نہیں۔ کہیں چولیں اتری ہوئی ہیں، کہیں قفل ٹوٹے پڑے ہیں۔ کہیں کونبٹ دی ہوئی ہے، کہیں تختے اکھڑے ہوئے ہیں۔ الغیاث ہے کہ کلیجا پھٹا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر دزدِ دزدیدہ نظر نے وہ قیامت ڈھائی ہے کہ الحفیظ! کسی کے ہوش و حواس لے بھاگا، کسی کی تاب و تواں لے اڑا، کہیں صبر و شکیب پر جا چھاپا مارا، کسی کی عقل خرد انٹی میں دبائے، کسی کے دل و دین چرائے، کسی کے ننگ و ناموس کو اڑان گھائی بتائے، کہیں شرم و حیا پر ہتا مارا، کہیں عزت و آبرو کو بغل میں داب کر چھو ہوا۔

چنانچہ گنجینہ دار نقود معانی، سلک جواہر شیوا بیانی، دُرجِ دُرر فصاحت و بلاغت، مخزن متاع طلاقت و لشافت، دارالضرب درہم داغ جگر مولوی محمد افتخار حسین مضطر پر جو واردات گذری، خدا نہ دکھائے، غریب اسی چور کے ہاتھوں سب دھرا ڈھکا گنوا بیٹھے۔ ناچار کچھ اپنی دل لگی، کچھ دوسروں کی عبرت، کچھ یادگار زمانہ، کچھ مشغلہ احباب کی خاطر اس وقوعہ کو ایک قطعہ میں نظم کر دکھایا ہے۔ جس کو پڑھ کر شعرائے خوش مذاق آسودہ دل خوش ہوتے ہیں اور شیرین زبانی، شستہ بیانی، برجستگی محاورات، خوبی بندش، حسن تسلسل کی داد دیتے ہیں اور شوریدہ طبعاں دردمند دیکھ کر کڑھتے ہیں، رو دیتے ہیں۔ جیسے کہ ناظم قلمرو سخندانی، صدر آرائے ایوان ادا فہمی و خوش بیانی، نشۂ بادۂ حسن و عشق میں بے سُدھ بُدھ، مولانا محمد عبدالحئی بیخود نے اس کا مخمس نہیں کیا، قطعہ پر مصرعے نہیں لگائے، بلکہ مصرعوں کے رومال سے چشم قطعہ کے آنسو پونچھے ہیں یا قطعہ کے گلدان میں گلہائے رنگارنگ مصاریع کا گلدستۂ نظر فریب بنا کر اہل معاملہ کا دکھ بٹایا ہے، جی بہلایا ہے۔ واہ کیا کہنا کیا زبان ہے، کیا بیان ہے۔ کیا دلاویز ترکیبیں ہیں۔ کیا دست و گریباں مضامین ہیں۔ ماشاء اللہ و علیکما عین اللہ

ہاں، خوب یاد آیا۔ اگر کوئی پوچھے کہ حسنِ حُسن پرست آوارہ معاش پر اس شورش کدہ میں کیا گذری تو اس سے کہدو کہ بھائی اُس مفلس قلاش، معدوم البضاعت، بے سروساماں کا کیا پوچھنا۔ اُس کو کس کا ڈر اور کس کا کھٹکا، اپنی نیند سونا اور اپنی نیند اٹھنا ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا	نے غم دزد نے غم کالا

اور جو پتے کی پوچھتے ہو تو یوں سہی ؎

لہ اس کا املا بھی دری چنبیت کا سا ہے۔ کوں یا کوہل صحیح املا ہونا چاہئے۔ سیندھ اور نقب کو کہتے ہیں۔

نہ لُٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بیخبر سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

تقریظ و تاریخ بطرز جدید از نتائج فکر بلند مولوی علی احمد خانصاحب اسیرؔ مالک مطبع نسیم سحر بدایوں۔

دز دیدہ نگاہی کا ایک شور ہے عالم میں بیخودؔ ہے کوئی بیدل مضطرؔ ہے کوئی غم میں

اُدھر تو اس عسس درد نما دزد، دزدیدہ نگاہ نے وہ آفت ڈھائی کہ الاماں۔ نہ زہد و پارسائی کا خیال نہ رندی و آزادی کا ملال۔ جسے پایا لوٹ لیا جو ہتّے چڑھا جامہ تلاشی لی اور چھوڑ دیا۔ مضطرؔ کی دردمندانہ تحریر اسی کی چھپی ہوئی کارروائیوں کا ایک پورا روزنامچہ ہے اور بیخودؔ کی مستغیثانہ تقریر اسی کی پوشیدہ دست درازیوں کا ایک سچا کارنامہ۔ اور اِدھر انھیں شوخ طبع، سادہ کار، نازک خیالی کے خم آشام بادہ خوار بیخودؔ و مضطرؔ نے اسی دزدیدہ نظر کی فریاد و الغیاث کے پردہ ہی پردہ میں بادۂ سخن کی بھری ہوئی دکان پر دہ کہ ؎

نہ پیمانہ باقی نہ اب جام باقی فقط ایک اللہ کا نام باقی

جُرعہ جُرعہ کو ڈھونڈھ ڈالا، قطرہ قطرہ کو ٹٹول لیا۔ نہ کہیں دست ساقی میں ساغر و مینا ہیں، نہ مینا و ساغر میں شراب کا چڑھاؤ اتار، نہ شراب میں نشہ ہے نہ نشہ میں دوراں سری و اعضا شکنی کے لطف کا خمار۔ ایں اسیرؔ دیوانے پھر تو کس اُمید پر تکیہ لگائے درمیکدہ پر ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑا ہے اور یہ بھی سہی کہ اگر بچا کچا کوئی باسی تازی چھینٹا مل بھی گیا تو کیا۔ باایں ناداری یوسف کی خریداری، یہ بھی کوئی بات ہے۔ ارے تیرا مُنھ اور تاریخ گوئی کا ارادہ، اس دیبا اور حریر کی گلدوز رنگین قبا کے ساتھ ٹاٹ کی پیوندکاری پر آمادہ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ور پھر بھی اگر تجھے انگلی کاٹ نگہ ناز کے شہیدوں میں ملنا ہی منظور ہے تو لے ان ڈَڈ گرے پڑے پھولوں کو جوانی ودروی کے بیساختہ لباس کی بہاریں اٹھے ہوئے جوبن اور اپکتے ہوئے کوپلوں کی طرح اسوقت پردہ دری پر مجبور ہیں، گل ہائے معانی کی مہک کے سرمست حضرت حسنؔ حُسن پرست کی تقریظ کے مرصع نگار ہار کیساتھ لپیٹ کر بیخودؔ و مضطرؔ کی داستان درد کے حسب حال اہل دل کی محفل کی نذر کردے۔ وھو ھذا ولله درّہٗ

اک اشارت میں جگر بھی پامال بلبے دزدیدہ نظر کی یہ چال
۱۳۰۷ھ ۱۳۰۷ھ

وَلَہٗ

ساقی وہ شراب ارغوانی ہو جس سے شفق بھی پانی پانی
سورج سے جو اک نظر ملائے سرسوں آنکھوں میں پھول جائے۔

دکھلائے جو اپنی شانِ جبروت — مینا ابھی سر بسر ہو یاقوت

شیشے سے جو اپنے منھ کو دکھلائے — طوطی سرِ خاب بن کے اڑ جائے

کیسا نشہ کہاں کی مستی — کیجئے سیر سخن پرستی

کس درجہ مے سخن ہے پُر جوش — بےخود بنکر کرے ہے مدہوش

دعویٰ ہے جنھیں سخنوری کا — اور حوصلہ شعر و شاعری کا

میدانِ سخن میں آج وہ آئیں — ہم ان کو بھی سبز باغ دکھلائیں

مستی میں ہر اک شمار بھولا

"وہ باغِ مراد آج پھولا"

۱۳۰۷ھ

"کچھ بھی نہیں"

از پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق

شوق الفت کا نتیجہ سر بسر کچھ بھی نہیں — مبتدائے عشق وہ جس کی خبر کچھ بھی نہیں

اضطرابِ عشق سے جاتا رہا وہ ذوقِ دید — پردہ اٹھنا تھا اٹھا، پیشِ نظر کچھ بھی نہیں

سوچتے ہیں کیا دعا مانگیں کہ ہے وقتِ سحر — رات بھر روتے کٹی لیکن اثر کچھ بھی نہیں

برہمی بزم بھی تھی اک تماشائے خیال — شمع کے خاموش ہوتے ہی سحر کچھ بھی نہیں

خاک و باد و آب و آتش سب فنا ہونیکو ہیں — جز خمیرِ آب و گل قدرِ بشر کچھ بھی نہیں

چھوڑ کر آئے ہیں ہم مے خانہ و دیر و حرم — جس طرف لیکر چلا رہبر اُدھر کچھ بھی نہیں

یہ اداسی کس لئے اے ہمصفیرانِ قفس — آج تو ہنس بول لو کل کی خبر کچھ بھی نہیں

عشق کی نیرنگیوں نے آہ رسوا کر دیا — سوزِ دل، سوزِ نہاں، سوزِ جگر کچھ بھی نہیں

بےخودوں کی ایک حالت میں گذر جاتی ہے شوق

کیا دیارِ عشق میں شام و سحر کچھ بھی نہیں

بھاگیرتھی گنگا

(از منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی، بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

جنبش میں کہکشاں ہے سیّال آسماں ہے
نورِ رُخِ بتاں ہے شمشیر درمیاں ہے
گنگا رواں دواں ہے
اِک بحرِ بیکراں ہے

جن و ملک تھے پیاسے نکلی ہمالیا سے
شیو کی کھلی جٹا سے اُڑنے لگی ہوا سے
ملنے چلی پیا سے
سرچشمۂ بقا سے

دُھن سیر کی سمائی پربت تھے رائی کائی
گلشن کی بُو نہ بھائی بن ٹھن کے بن میں آئی
گرد آب نے نہ پائی
اللہ رے پارسائی

تھا جوش کس بلا کا پردہ اُٹھا حیا کا
آنچل اُڑا صبا کا تر ہے جگر فضا کا
بدلا جو رُخ ہوا کا
اُڑنے لگی پتّا کا

مستانہ وار آئی بے یار و غار آئی
وادی کے پار آئی مثلِ بہار آئی
جب ہردوار آئی
کتنوں کو تار آئی

گنگا تری روانی موجِ مئے جوانی
جنت کی تو ہے رانی کوثر ہے پانی پانی
دنیا کی خاک چھانی
دیکھا نہ تیرا ثانی

نورِ ازل دواں ہے ابرِ کرم رواں ہے
اک حورِ ناتواں ہے اک نازنیں جواں ہے
فردوس کا نشاں ہے
رفعت میں آسماں ہے

قدسی نواز تو ہے وہ پاکباز تو ہے
فطرت کا ساز تو ہے محفل طراز تو ہے
تصویرِ ناز تو ہے
کیا بے نیاز تو ہے

تو شمعِ انجمن ہے پروانۂ وطن ہے
زینت دہِ چمن ہے معبودِ مرد وزن ہے
گل چہرہ گلبدن ہے
سیماب پیرہن ہے

امرت کی دھار ہے تو گل در کنار ہے تو
اشکِ نگار ہے تو جانِ بہار ہے تو
چنچل ہزار ہے تو
دل کا قرار ہے تو

تو جنتِ نظر ہے راحت دہِ جگر ہے
تسکینِ بحر و بر ہے سیلاب سربسر ہے
محرومِ بال و پر ہے
پرواز کن مگر ہے

موجِ شرابِ عرفاں سیلابِ نورِ ایماں

کفارہ بخشِ عصیاں   آئینہ دار یزداں
لاکھوں کے دل کا ارماں
ہر درد کا ہے درماں

مستی شراب کی ہے   شوخی شباب کی ہے
نکہت گلاب کی ہے   صورت سحاب کی ہے
چادر حجاب کی ہے
ضَو آفتاب کی ہے

عظمت تری عیاں ہے   جوہر ترا نہاں ہے
عصمت کی پاسباں ہے   ہندوستاں کی جاں ہے
ثانی ترا کہاں ہے
سارے جہاں کی ماں ہے

رتبہ سوا ہما سے   پوچھو ہمالیا سے
پربت کی ہر گپھا سے   نٹ راج سے اُما سے
چلتی ہوئی ہوا سے
اُڑتی ہوئی گھٹا سے

چاندی اُبل رہی ہے   ہر موج اچھل رہی ہے
سانچے میں ڈھل رہی ہے   صورت نکل رہی ہے
کیا کیا مچل رہی ہے
کروٹ بدل رہی ہے

وہ آ رہا ہے پانی   لہرا رہا ہے پانی
بل کھا رہا ہے پانی   گرما رہا ہے پانی
گھن لا رہا ہے پانی
برسا رہا ہے پانی

بیتاب پر کرم کر   تسکینِ دل بہم کر
وا بابِ کیف و کم کر   لبریزِ مئے قلم کر
درمانِ درد و غم کر   مسحورِ پیچ و خم کر

سلطان مریم بیگم

از جناب شیخ تصدق حسین صاحب لکھنوی بی اے، آیل ایل بی

سلطان مریم بیگم ڈاکٹر شارٹ بالیوز بغداد کی بیٹی، قوم کی ارمنی اور مذہب عیسوی کی پیرو تھیں۔ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے تیسرے سال ۱۸۱۷ء میں اُن کی ماں اُن کو کانپور سے لے کر لکھنؤ آئیں اور گومتی کے اُس پار محلہ حیدر آباد میں ایک کرایہ کا مکان لے کر فرد کش ہوئیں۔ غازی الدین حیدر اُس طرف ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ پورے ایک سال انگریزی پوشاک زیب تن کئے سڑک پر کھڑی ہو کر جناب عالی کو سلام کرتی رہیں۔ اُن کی ماں چاہتی تھیں کہ نواب کو اپنی شمع رو لڑکی کا پروانہ بنا کر مال و دولت حاصل کریں۔ جس سے زندگی عیش و فراغت سے بسر ہو۔ مگر نواب عرصہ تک ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر تیر تدبیر نشانہ پر پہونچا۔ ایک روز اِس گل رعنا کی بوئے اُلفت نواب کے دماغ میں سما گئی۔ اُسی روز نصف شب گذرنے کے بعد میر کلو خواص کو مع میانہ اور مشعلچی بھیج کر بلوا لیا۔ اُن کی والدہ میر کلو سے کہنے لگیں کہ ہم نا اُمید ہو کر کانپور واپس جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ صرف اخراجات کے منتظر تھے۔ المختصر مس شارٹ خوب بن سنور کر نواب کی دولت سرا "فرح بخش" کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ جناب عالی نے بعد اشتیاق دیکھکر فرمایا کہ میز پر سے ایک پٹاری تین لاکھ روپیہ کے مرصع زیورات کی لے جاؤ اور اُنھیں پہنکر ہمارے پاس آؤ۔ چنانچہ جب جناب عالی سے شرف ملازمت حاصل کر چکیں تو اُنھوں نے پانچ ہزار روپیہ دے کر رخصت کیا۔ بقول مرزا کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ اسوقت اُن کی ماں کی حالت بیان سے باہر تھی۔ فرطِ مسرت سے جامہ میں نہ سماتی تھیں۔ صحن میں سجدۂ شکر بجا لاتی تھیں۔

کئی روز کے بعد پھر بوقتِ شب طلب فرمایا اور دوسرا بکس زیور و جواہر کا، دو ہزار روپے۔ ایک ہزار اشرفی اور تین گٹھریاں ہر قسم کے کپڑوں کی مرحمت کیں۔ پھر کئی روز کے بعد بلا کر حضرت عباسؑ کی حاضری اپنے ہاتھ سے کھلائی اور مذہب اسلام کی تلقین کی۔ اُنھوں نے بظاہر بخوشی خاطر کلمۂ طیبہ پڑھا۔ پھر فرمایا ہم نے تمھیں بیگم کیا۔ اُنھوں نے نذر پیش کی۔ بعد قبول اسلام اُن کا نام سلطان مریم بیگم رکھا۔ اِس کے بعد ایک روز ان کو جڑاؤ چوڑیاں مالیتی ایک لاکھ روپیہ جنمیں ہیرے کے سفید و گلابی نگینے جڑے تھے اور ایک نتھ

ایک لاکھ روپیہ قیمت کی مرحمت فرمائی اور پانچہزار روپیہ درماہہ مقرر کر کے بارہ دری کے قریب محلسرا قیام کیلئے عنایت کی۔ سکھپال سواری کو دیا۔ اہتمام ڈیوڑھی اور فراہمی اسباب ضروری کے لئے ظفر الدولہ کپتان فتح علیخاں کو مقرر کیا۔ بعد قیام بادشاہت ۱۸۲۵ء میں جب شاہ غازی الدین حیدر نے سرکار کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ بطور قرض موید دے کر دس ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ اپنی دوسری انگریز شہزادی بیگم نواب مبارک محل کا مقرر کیا۔ تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ سلطان مریم بیگم کا بھی مقرر کر دیا۔ اور دیگر کل لوازمات میں یہ بیگم نواب مبارک محل کی ہم پلہ اور ہمسر کر دی گئیں۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۵ء میں انتقال کیا۔

سید کمال الدین حیدر ناقل ہیں کہ بعد انتقال حضرت خلد مکاں (شاہ غازی الدین حیدر) ایک حکیم کا انکے یہاں بڑا اختیار کلی تھا۔ جس طرح حکیم بندہ مہدی خان مبارک محل میں تھے۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بیس برس بعد سلطان مریم بیگم کھانسی اور تپ دق میں مبتلا ہوئیں۔ جب مرض میں شدت ہوئی۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے، صرف چھلکنے کی دیر ہے تو بہ نظر احتیاط ایک وصیت نامہ تحریر کر کے رزیڈنٹ اودھ کے پاس بھیجدیا کہ میری ماں نے طمع زر میں مجھ کو ایک مسلمان کے دامن سے وابستہ کر دیا تھا۔ اُس وقت بدرجہ مجبوری میں نے اوپری دل سے اسلام قبول کر لیا تھا مگر تہ دل سے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہی اور ہنوز قدیمی طریق بہ صدق دل سے قائم ہوں۔ چنانچہ میرے انتقال کے بعد میری تجہیز و تکفین عیسائی مذہب کے مطابق ہو۔ اور ایک ثلث تنخواہ میری وصیت کے موافق میرے بھائی جوزف شارٹ کے نام جاری ہو۔

وصیت نامہ تحریر کرنے کے بعد امام باڑہ آغا باقر خان کے قریب حسن علی کپتان کے مکان میں جاکر بکرایہ رہیں اور دو برس کی طویل علالت کے بعد ۷ اپریل ۱۸۴۹ء کو جانعالم واجد علی شاہ کے عہد میں بوقت نو بجے شب انتقال کیا۔ بموجب وصیت کوٹھی روشن الدولہ کے سامنے رومن کیتھولک کے گورستان میں دفن کی گئیں۔ مدفن کے اوپر ایک گول گنبد تعمیر کیا گیا جو اب تک موجود ہے۔ بعد رحلت حسب الحکم شاہی مجد الدولہ نے ... کر کے پہرے بٹھائے۔ جب صدر سے جواب رپورٹ رزیڈنٹ آیا تو انکا متروکہ جوزف شارٹ اُن کے بھائی کو ملا۔ گو اس بارے میں منجانب سرکار شاہی خداوندان ایسٹ انڈیا کمپنی کو پھر تحریر کیا گیا کہ بصورت موجودہ پوری تنخواہ کربلائے معلی بھیجی جائے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

سلطان مریم بیگم کے بھائی جوزف شارٹ کی ذریات ابتک وثیقہ پا رہی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ خاص لکھنؤ میں مقیم ہیں کچھ لوگ باہر ریلوے وغیرہ میں ملازم ہیں مگر سب کے سب اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم ہیں۔

جوزف شارٹ اگرچہ مذہباً عیسائی تھے مگر لباس مثل مسلمانوں کے ہندوستانی وضع کا استعمال کرتے تھے۔ بزمانہ غدر سرکش فوج نے اُن کا گھر بھی لوٹ لیا۔ جس پر جان کے اندیشہ سے وہ شہر میں چھپ گئے۔ پھر محلہ دولت گنج میں حسن علی خاں تھانہ دار کے مکان میں جاکر مقیم ہوئے۔ وہاں سے نواب امیرالدولہ حیدر بیگ خاں کے پوتے مرزا محمد تقی خاں اُن کو اپنے مکان میں منصور نگر لے گئے۔ اِسی مکان میں رائٹن صاحب عیسائی بھی پوشیدہ طریقہ پر سکونت پذیر تھے۔ رائٹن صاحب کے بڑے لڑکے محمد عسکری نے ایک روز جوزف شارٹ سے کچھ طلب کیا۔ جب گوہر مقصود حاصل نہ ہوا تو حسام الدولہ یوسف خاں کلکٹر عہدِ برجیس کے پاس جاکر کچا چٹھا بیان کردیا کہ ہمارے محلہ میں انگریز روپوش ہیں۔ اُن کو یقین واثق تھا کہ میرے باپ سعی سفارش سے ضرور بری ہوجائیں گے۔ یوسف خاں نے اپنے بھائی ناصرالدولہ علی محمد خاں عرف ممّا خاں جرنیل فوج سے تذکرہ کیا۔ اس پر بول پلٹن کے تلنگے محمد عسکری کے ہمراہ آئے۔ سب کی مشکیں باندھ کر براہ چوک مجمع عام سے دردولت پر لے گئے۔ جب یہ کل اسیران بلا حضرت محل والدہ مرزا برجیس قدر کے روبرو جاکر صف بستہ کھڑے ہوئے تو تلنگوں نے چاہا کہ سب کو گولی سے اڑادیں۔ مگر مفتاح الدولہ نے سفارش کہ اِس گروہ میں سلطان مریم بیگم کے حقیقی بھائی جوزف شارٹ بھی ہیں۔ حاکم وقت کسی رئیس و شریف کو تہ تیغ نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کی عزت و حرمت کی نگہداشت کرتا ہے پھر عرض کیا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور ہمیشہ سے ان کا لباس و طرز معاشرت مثل اہل اسلام کے رہا ہے۔ اس کے بعد اُن کی اہلیہ کا ہاتھ بات بناکر پکڑ کے جنابعالیہ کے روبرو لے گئے کہ ملاحظہ فرمائیے ان کا لباس مثل ہندوستانیوں کے ہے یا نہیں؟ مابعد ان کا ہاتھ بغرض دستگیری جنابعالیہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ اُنھوں نے فرمایا' ان لوگوں کی مُشکیں کھولدو، صرف حراست میں رکھو۔ اور داروغہ میر واجد علی کے سپرد کردو۔ میر واجد علی نے اُن کو ایک کرایہ کے مکان میں لے جاکر رکھ دیا اور ان لوگوں کی حفاظت جان کے لئے یہ مشہور کردیا کہ جوزف شارٹ کے داماد جوزف جوہانس بندوق کی ٹوپی بنانا جانتے ہیں اور اور اس کی تدبیر یہ کی کہ اپنے پاس سے کئی سو ٹوپیاں سرکار میں پیش کردیا کرتے تھے کہ یہ اُن کی بنائی ہوئی ہیں ان سبھوں نے بھی مصلحت وقت سمجھکر مسلمانوں کی ایسی وضع قطع بنائی۔ داڑھیاں بڑھالیں۔ لمبے مشائخی کرتے پہن لئے۔ سر پر بادامی عمامے باندھے اور ہاتھ میں زیتون کے بڑے دانوں کی تسبیح لئے رہتے تھے۔ اس صورت سے خدا خدا کرکے بلوائیوں سے جان بچی۔

اہلِ دنیا اور شاعر

از مولوی فضل اللہ صاحب بسملؔ

عالم رواں دواں ہے، حالاتِ ظاہری پر — اُفتاد جو بھی آئے، دنیائے شاعری پر
یہ خوگرِ تکلف، دلدادۂ نمائش — اُن کی بناوٹوں میں، رخشندگی و تابش
یہ جانتے ہیں اعلیٰ خود کو، بزعمِ باطل — قدرت نے گو کہ سمجھا سو پستیوں کے قابل
ظاہر پہ مٹنے والے، باطن پہ ہنسنے والے — دنیا کے دلدلوں میں، ہر لحظہ پھنسنے والے
یہ جانتے نہیں ہیں، شاعر کی پاک ہستی — دھوکے میں ڈالتی ہے شاید ادائے مستی!

اے رنگ و بو کے شیدا، فانی پہ مرنے والے — سو سو نگارستوں میں رہکر نکھرنے والے
شاعر کے اور تیرے، عالم جدا جدا ہیں — مقصد جدا جدا ہیں، اور غم جدا جدا ہیں
مقصود تیری دنیا، محبوب تیرے پیسے — آتش بجاں، تپیدہ، شاعر نوائے نے سے
تجھکو ہوس کے پھندے، بیتاب کر رہے ہیں — اُس کو کسی کے جلوے، سیماب کر رہے ہیں
تیری نگاہِ کم بیں، ہے رنگ و بو پہ شیدا — اُس کی نظر میں گل سے، کچھ اور ہے ہویدا
شاعر کا ذرہ ذرہ، محبوبیوں کی منزل — تیرا وجود غافل! مجبوریوں کی منزل
اُس کو تلاشِ حسنِ دلبر، کہیں بھی پائے — ناز و ادا کا بسمل، مظہر کہیں بھی پائے

اک رقصِ سرمدی ہے، بسمل بنا ہوا ہے
جو حسن ہو، جہاں ہو، قاتل بنا ہوا ہے

رُباعی

واعظ! ترے فلسفے سے ہوں میں حیراں — منطق ہے تری نئی، نیا طرزِ بیاں
انسان کے واسطے ہے مذہب۔ لیکن — تو کہتا ہے مذہب کیلئے ہے انساں

اقبالؔ

دیوان بحر کا ایک خاص قلمی نسخہ

از حضرت وصل بلگرامی

شیخ امداد علی بحر کا قدیم وطن فیض آباد تھا۔ خود کہتے ہیں ؎

پوچھنا ہی ہے عبث حال خرابیٔ وطن　　بحر ہی جب نہ رہے کیا فیض آباد رہے

لیکن شروع ہی سے یہ لکھنؤ میں آکر رہنے لگے۔ یہاں تک کہ لکھنؤ ان کا وطن ہوگیا اور یہ لکھنؤ کے ہوگئے۔ یہیں کی آب و ہوا میں انھوں نے پرورش پائی، یہیں تعلیم و تربیت ہوئی اور یہیں صاحب کمال کہلائے۔ یہیں ۱۲۹۵ھ ہجری میں جب اپنی عمر کے چھہتر سال ختم کر رہے تھے سپرد خاک ہوئے۔

شروع ہی سے اُن کو شاعری کا شوق تھا۔ صحت زبان اور الفاظ و لغت کی جانچ کی طرف اُن کی طبیعت ہمیشہ سے مائل تھی۔ محاورات کی جانچ اُن کا صحیح استعمال انکی فطرت میں شامل تھا۔ اُن کا دیوان زبان کا مخزن، محاورات کا دریا اور صحت الفاظ کی کسوٹی ہے۔ بحر ناسخ کے اُن مخصوص شاگردوں میں تھے جن پر ناسخ کو خود ناز تھا۔ فن شاعری میں کامل اُستاد تھے، زبان نہایت مستند تھی، محاورات کے استعمال میں جواب نہ رکھتے تھے۔

عروض میں کامل عبور تھا، مگر آواز میں رعشہ تھا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

اے بحر فی الحقیقت کامل ہوا پنے فن میں　　آواز میں ہے رعشہ لغزش نہیں سخن میں

باوجود اِن کمالات کے ہمیشہ پریشانی میں بسر ہوئی۔ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی بیٹی اشرف النساء بیگم افسر ہوتا جن کو چھوٹی شہزادی کا خطاب تھا، اُن کو کچھ وظیفہ دیتی تھیں۔ انھیں کی ڈیوڑھی پر پھاٹک کے بغل میں ایک کمرہ مل گیا تھا۔ اُسی میں اُن کا قیام تھا۔ پھٹی پرانی چٹائی تھی اور اُس باکمال ہستی کی نشست، یاران طریقت جمع ہوتے تھے اور اسی حالت میں طالب فن آتے۔ زانوئے ادب تہ کرتے اور اُسی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھنا اپنی عزت سمجھتے اور فیض حاصل کر کے چلے جاتے۔ یہاں امیر، غریب سب برابر تھے۔ نہ معلوم کہاں کہاں سے لوگ آتے تھے اور اِن کی صحبت اُن کے لئے ایک نعمت تھی۔ اُن کی بیوی توپ دروازہ کے قریب ایک کچے مکان میں رہتی تھیں۔ یہ دن بھر تو ڈیوڑھی پر انھیں مشغلوں میں بسر کرتے، اور شام کو توپ دروازہ والے مکان میں چلے جاتے تھے۔ آخر وقت میں یعنی مرنے سے دس سال پہلے نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور نے انکی

قدردانی کی، رام پور بلالیا اور اچھی تنخواہ ملنے لگی لیکن اُن کو لکھنؤ کی یاد ستانے لگی، بے چین ہوکر رام پور کے ایک مشاعرہ کی طرحی غزل کے مطلع میں کہہ گئے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو ہر ایک گھر خانۂ شادی ہے، ہر کوچہ ہے عشرت کا

اس کی خبر نواب صاحب کو ہوئی، انھوں نے مجبور ہوکر اُن کو رخصت کر دیا۔ انھوں نے بہت کچھ کہا، مگر جمع نہیں کیا۔ نواب سید محمد خاں رند نے اُن کے کلام کو جمع کیا۔ جن میں سے ایک دیوان طبع ہوکر "ریاض البحر" کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ اُس کی نسبت خود بحر کہتے ہیں ؎

جامع اس دفتر کے ہیں سید محمد خان رند اِس سراپا لطف کا یہ بحر پر احسان ہے

لیکن اُس کا مسودہ اتفاق سے میرے ہاتھ آگیا۔ اسمیں زیادہ تر وہی غزلیں ہیں جو "ریاض البحر" میں شائع ہوچکی ہیں اور چند ایسی بھی ہیں، جو نہیں چھپی ہیں اور مطبوعہ دیوان میں کچھ کلام ایسا بھی ہے جو اسمیں نہیں ہے جو اوراق مرتب دیوان کی شکل میں میرے پاس ہیں۔ اُن میں بہت سی خصوصیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ رند کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ دوسرے کہا جاتا ہے کہ یہ وہ اوراق ہیں، جن پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس پر ناسخ کے قلم کی اصلاح ہے۔ اسمیں ترمیم یا اصلاح یا نظر ثانی اس طرح کی گئی کہ بعض جگہ اصل شعر پر چیپی لگاکر اس پر ترمیم ہے، بعض جگہ (ن) لکھ کر حاشیہ پر ترمیم کی گئی ہے، بعض جگہ اصل ہیں اُسی جگہ جن لفظوں کو بدلنا ہے اُن کو کاٹ کر دوسرے لفظ لکھ دیئے گئے ہیں، بعض جگہ شعر کو بالکل بدل دیا ہے، بعض جگہ کسی مطلع یا شعر کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور بعض جگہ پورا شعر کاٹ دیا گیا ہے۔ بہرحال ناسخ کی اصلاح ہو یا خود بحر کی ترمیم و اضافہ، اُس سے خیالات کے تغیر و تبدل، الفاظ کے ردّ و بدل اور طبیعت کے انقلاب کا پتہ چلتا ہے، اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کہیں صحت زبان، صحت الفاظ، صحت محاورات، اس ترمیم کا باعث ہوئی ہے اور کہیں خود شاعر کی طبیعت نے اُس کو بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ اُسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ بحر کا شعر ہے ؎

ہے اشک آنکھ میں یا سیپ میں ہے دریا بند سیاہی آنکھ میں ہے یا تہِ حباب گھٹا

اس کے دوسرے مصرع میں "تہ حباب" کا لفظ نکال کر "میانِ آب" رکھا گیا، اب اُس کو پڑھئے اور غور کیجئے، تو آپ کو خود پتہ چلے گا کہ اب یہ شعر کچھ سے کچھ ہوگیا۔ دوسرا شعر ہے ؎

بے اعتنائی خوب نہیں اک نہ ایک روز سُن لینا کوئی چاہنے والا بہل گیا

اسمیں پہلا مصرع یوں بدل دیا گیا ہے۔ "بیہودہ بات آپ نہ مُنھ سے نکالئے" اور جو پہلے مصرع میں کمزوری اور مجہول تھا۔ وہ دور کر دیا گیا ہے۔

ایک جگہ ہجر کہتے ہیں ؎

میرے گلشن کے پھول شعلے ہیں میری ہر آہ شعلہ بار درخت

اسمیں پہلا مصرع یوں بنایا گیا ہے "میرے گلزار میں ہیں شعلے پھول" اب دوسرا مصرع اس مصرع میں ایسا ضم ہوگیا ہے جس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اور شعر ہے ؎

سیاہ بختی مری آسماں پہ روشن ہے برنگ ماہ میرے گھر میں ہے گہن میں چراغ

اس کے پہلے مصرع میں سیاہ بختی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جسمیں بختی کی (ے) تقطیع سے گر گئی ہے اس کو دور کرنے اور مصرع کو زیادہ بلند کرنیکے لئے اس طرح بدل دیا ہے" محاصرہ یہ کیا ہے سیاہ روزی نے"۔ اسی غزل میں ایک شعر ہے ؎

فروغ غیر سے ٹھنڈا ہے یاں جگر کس کا ہمارے داغ سے جلتا ہے انجمن میں چراغ

اس کا بھی پہلا مصرع اس طرح بدل دیا گیا ہے اور اب شعر کچھ سے کچھ ہوگیا ہے۔ بدلا ہوا مصرع ملاحظہ ہو۔ "ہر ایک بزم کی ہے روشنی فسانۂ عشق" اب اس مصرع کے ساتھ دوسرا مصرع بھی پڑھئے یعنی ؎

ہر ایک بزم کی ہے روشنی فسانۂ عشق ہمارے داغ سے جلتا ہے انجمن میں چراغ

آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس تبدیلی نے کیا لطف پیدا کردیا ہے۔ اسی طرح تمام دیوان ایسے ہی ردوبدل اور مزید اضافوں سے ایک نادر ولاجواب نسخہ ہوگیا ہے۔ اگر ان اوراق سے تمام ترمیمیں، اضافے اور خاص خاص تغیر وتبدل کا حصہ علیحدہ جمع کرکے اُن پر مکمل تبصرہ کیا جائے تو یہ ایک علیحدہ نادر مجموعہ ہو جائیگا جس سے فنِ زبان، تحقیق اور معلومات کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

سُنا ہے اُن کا ایک غیر مطبوعہ دیوان بھی کہیں ہے۔ دیوان کے علاوہ ہجر نے ایک رسالہ فن عروض میں لکھا ہے جو اب تک کہیں چھپا ہوا نظر نہیں پڑا۔ مگر اُس کا قلمی نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ سُنتے ہیں ہجر نے ایک لغت بھی لکھا تھا۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہیں[1]

"کوئی"

خیال وخواب کی دُنیا بسا رہا ہے کوئی تصورات کے پردے میں آرہا ہے کوئی

نگاہیں نیچی کئے مسکرا رہا ہے کوئی سکونِ دل کو مرے آزما رہا ہے کوئی

مدد خدائے محبت! جفا کی پھونکوں سے وفا کی کانپتی شمع بجھا رہا ہے کوئی

کہاں وہ پیار کی باتیں کہاں وہ نظرِ کرم میں جانتا ہوں کہ مجھکو بنا رہا ہے کوئی

کسی کے حُسن سے بھرلوں نگاہ کا دامن نقاب اُلٹے ہوئے مسکرا رہا ہے کوئی

منیب

---

[1] بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب ریڈیو اسٹیشن لکھنوٴ

مذہبی رواداری قومیت کی جان ہے

(از مسٹر ولتستہ پرشاد فدا بی - اے - لاہور)

فدا! تاریخ کے اوراق سے یہ بات روشن ہے
تعصب اِس جہاں میں زندگی کا سخت دشمن ہے

خدا کے نام پر لڑتے رہے ہیں لوگ آپس میں
عداوت کی روا رکھتے رہے ہیں ہر طرف رسمیں

رواداری کو لیکن وہ اگر پیشِ نظر رکھتے
محبت سے وہ اپنے بھائی کے قدموں پہ سر رکھتے

اُسے نرمی سے کہتے ایک ہی خالق کے بندے ہیں
بہر صورت ہمارے ایک ہی سے کام دھندے ہیں

یقیناً ہم میں یکساں اپنے خالق کی محبت ہے
ہمارے دیدہ و دل پر مسلّط اُسکی شوکت ہے

اِسی رشتے سے ہم اک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں
خوشی کی بات ہے شیدائے ذاتِ کبریائی ہیں

تم اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہو تو بھی پیارے ہو
طریقوں میں جُدا ہونے پہ بھی آنکھوں کے تارے ہو

خدا کے نام پر لڑنا موا حد کو نہیں زیبا
اُلجھ پڑنا کسی سے نام مذہب پر نہیں اچھا

رواداری اگر اس طرح سے باہم روا رکھتے
اگر ملحوظ سینوں میں وہ کچھ خوفِ خدا رکھتے

جھلک تاریخِ عالم سے نہ آتی خوں فشانی کی
طرح کچھ اور ہی ہوتی مذاہب کی کہانی کی

ہماری زندگی سے وہ تاثّر رونما ہوتے
مسلّط جس سے سب قوموں پہ انوارِ خدا ہوتے

کبھی سرسبز ہو سکتی نہ ہٹلر ازم ہٹلر کی
خدائی میں اُڑا سکتا نہ خود سر کوئی بے پر کی

رواداری پہ مائل طور دنیا کے نظر آتے
نہ انسانوں کی ہیئت سے کبھی انسان گھبراتے

نہیں بکھرے ہوئے بیروں کا کچھ اس وقت بھی بگڑا
ہمارے ملک کا کوئی سکھا دے درس الفت کا

رواداری کی پیدا ہو اگر بھارت میں ذہنیت
ہو محکم آن واحد میں یہاں بُنیادِ قومیّت

کبھی پیدا محبت ہو اگر اللہ والوں میں
نحوست پھر کبھی آنے نہ پائے خستہ حالوں میں

ہمارے ملک کی دو دن میں کایا ہی پلٹ جائے
ظہورِ صبح ہو اور رات کی ظلمت پلٹ جائے

تلاش اور یاس

(از منشی بھیروں پرشاد صاحب قابل)

تلاش

گرما کا دل سوز موسم عالمِ نزع میں ایک بخیل دولتمند کی طرح مایوسانہ دم توڑ رہا ہے۔
آسمان کی نیلگوں سطح پر ابر کے سیاہی مائل بھورے بھورے ٹکڑے موہوم امیدوں کی صورت اِدھر ادھر منڈلاتے پھرتے ہیں۔
لُو کے تیز و تُند جھونکے اب مائل دِل سوزی و دلگدازی نہیں، بلکہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کبھی کبھی ہیر اپھیری کرتیں اور اپنے مشتاقوں کے کان میں کچھ اُمید افزا منتر پھونک جاتی ہیں، دن ختم ہو گیا شام کی ضعیفہ اپنی پر درد آہوں کا عصا ٹیکتی نیچی نظروں چپ چاپ چلی آرہی ہے۔ دریا کے کنارے درختوں کے جھرمٹ میں پُروا ہوا "سائیں سائیں" کر رہی ہے۔ تھم تھم کے برسنے والی بوندوں سے بڑ اور پیپل کے درختوں کے جھلسے ہوئے پتّوں میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی اور آناً فاناً ایک نظر نہ آنے والی بین کی دلکش آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بادل کا تجربہ کار کھاوجی اپنی غیر مسلسل پرزوں کا چوتالہ بجاتا اور بجلی کی حسین و جمیل رقاصہ کچھ عجیب انداز سے تھرک تھرک کر ناچتی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے رخ انور کا نقاب سرکا دیتی ہے۔ بس اسی وقت نیچر کی اس سنجیدہ محفل سماع میں ایک تھرتھراتی ہوئی آواز داخل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ایک نامعلوم مضراب کی ستم زا حرکت نے دل پر درد کے خاموش تاروں کو دفعتہً چھیڑ دیا۔
ہوا کی سنسناہٹ، پتّوں کی سرسراہٹ، بادل کی گرج بجلی کی کڑاک چمک، بین کی تان اور دل کی آہ و فغاں میں یہ دلفگار صدا کچھ اس طرح یکایک گونجنے لگی کہ گویا ان میں سے ہر ایک زبانِ حال سے "پی کہاں پی کہاں" کا پُر درد مرثیہ پڑھ رہا ہے۔
کمبخت پپیہے! آہ نادان پرندے! تجھے اتنا بھی خیال نہیں کہ تیری اس دل خراش رٹ سے کسی دردمند دل پر کیا کچھ گذر جائے گی۔

(یاس)

ناخوش گوار خواب دل اور اُس کی طاقتوں پر اپنا تسلّط جمانے کی فکریں کر رہا ہے۔ خیالات کی بے سرو سامان جمعیت (فوج) تاریکی میں ادھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے۔ بحرِ بے پایانِ محبت میں ایک عجیب طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ کشتی صبر کا بادبان پرِ ماہی کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

بس اسی وقت ایک سُراب نما وجود جس کی اُمیدوں کے ہاتھ ہمیشہ کے لئے خالی ہو چکے ہیں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختہ سے چمٹا ہوا اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

"جیسے موسم اپنے ساتھ خوش نما پھول لاتے اور سورج کی حرارت انھیں بستر خاک پر سُلادیتی ہے، جیسے ہونہار نوجوان نئی نئی اُمیدوں کے ساتھ سوسائٹی میں داخل ہوتے اور گھڑی کی آواز اُن کی چھوٹی چھوٹی زندگیوں کو عجیب و غریب ارمانوں کی چادر میں لپیٹ کر دفن کر دیتی ہے۔ یہی حال میری خوشیوں کا ہے، جنھیں طوفانی ہوا کے ایک ہی تھپیڑے نے آن کی آن میں تتر بتر کر دیا۔ اے یاس! اے وہ جس کو مَیں نے اپنے دل کے آستانہ ہی پر بارہا کھیل ڈالنے کا قصد کیا تھا، بس تو ہی میری ایک ازلی ابدی رفیق نکلی۔ ہاں اب مَیں تجھے یہ سمجھ کر اپنی چھاتی سے لگائے رہونگا کہ میری حقیقی بہبودی تیرے ہی ید قدرت میں ہے، تو نیم کا شربت ہے جس کی تلخی میں شیرینی ملی ہوئی ہے۔ تو موت کے دیوتا کی پوجارن ہے، جو اُمید و بیم کے مزخرفات کا لمحہ بھر میں خاتمہ کر دیتا ہے۔ آہ میں نے آج اس ناخوشگوار راگ کی حقیقت کو سمجھا، جو مختلف تان پلٹوں کے ساتھ تو مجھے سُنایا کرتی تھی۔ ہاں بیشک آج میں تسلیم کرتا ہوں کہ غم و اندوہ کے نشہ میں مست و بیخود ہونا، کامیابی اور خوش حالی کے غرور میں فخر کے ساتھ اکڑنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور پتنگ (پروانہ) کی طرح عشق کی آگ میں خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی ختم کر دینا پپیہے کے فضول شور و شیون سے بدرجہ اولی و برتر"

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

عورت

(ایک مختصر ڈرامہ)

از مسٹر محمد اکرام حسین

افراد

(۱) رادھا :- ایک نوجوان دیہاتی عورت (۲) رادھا کی ماں

(۳) ارجن :- کپڑے کے مل کا مالک (۴) مینیجر

(۵) چپراسی (۶) رشید :- ایک مزدور

زمانہ ——— "یہی انقلاب پسند"

(منظر اوّل)

[جاڑوں کی ایک شام - ابر چھایا ہوا ہے - تیز ہوائیں چل رہی ہیں - گاؤں کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں ایک بڑھیا پھٹا ہوا لحاف لپیٹے بیٹھی ہے - اُس کا رُخ جھونپڑی کے دروازے کی طرف ہے - بڑھیا کے برابر ایک چھوٹا سا بچہ پھٹے ہوئے کمبل میں لپٹا سو رہا ہے - ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے - دُور سے چوپال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے گانے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی ہیں - یکایک بجلی کی چمک کے ساتھ بادل گرجتے ہیں - بڑھیا گھبرا کر پاس لیٹے ہوئے بچہ کو تھپکتی ہے -]

بڑھیا :- (تھپکتے ہوئے، کچھ سوچ کر) جانے کہاں چلی گئی؟ اسے تو مینھ بوندی کا بھی ڈر نہیں -

(زور کی بارش شروع ہو جاتی ہے - اور پھر بادل گرجتے ہیں -)

بڑھیا :- بھرن پڑنے لگی -

(رادھا آتی ہے)

بڑھیا :- (آہٹ پاکر) کون؟

رادھا :- میں ہوں، اماں!

ماں :- رادھا؟

رادھا :- ہاں، اماں!

ماں :- بھیگی تو نہیں؟

رادھا :- نا، اماں!

رادھا :- نا، اماں! (ماں کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے)

ماں :- آ، لحاف میں آجا۔

(لحاف میں سکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

رادھا :- ماں، آج دو دن ہو گئے۔ ماں :- ہاں بیٹی!

رادھا :- کیا بالا کو روٹی نہیں ملے گی؟ ماں :- ملے گی! ایشور پر بھروسہ رکھو۔

رادھا :- ایشور پر؟ ماں :- ہاں، وہ بڑا دیالو ہے۔

رادھا :- کیا دیالو ہے؟ بھیا کو مار ڈالا۔ تمھیں اندھا کر دیا۔ میری نوکری لے لی۔ کیا یہی اُس کی دیا ہے؟
ہم غریب ہیں، ہمیں ایسی دیا کی ضرورت نہیں۔ جو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے اور ہمیں اندھا کر دے۔"

ماں :- "ایسا نہ کہو بیٹی۔"

رادھا :- "اماں، جب آگ سے کسی کا پاؤں جل جائے، تو وہ اُسے بُرا ہی کہیگا۔"

ماں :- اور اگر پاؤں آپ ہی جل جائے تو ......"

رادھا :- (بات کاٹ کر) ایسا کوئی نہیں کرے گا۔"

ماں :- "تو ایشور بھی ایسا نہیں کرتا۔"

رادھا :- "چھوڑو ایسے ایشور کو، میرا دل بار بار ایشور کا نام سُننے کو نہیں چاہتا۔"

ماں :- کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟ ہر کا نام سُننے کو تمھارا دل نہیں چاہتا۔ بُرا کہہ رہی ہو۔ سنو...... (گاتی ہے) ع

میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی

رادھا :- (سُرخ ہو کر، زور سے) "چپ رہو اماں! میں ایسے گردھر گوپال، ایسے ایشور کا نام سُننا نہیں چاہتی جو غریبوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیتا ہے جو انھیں بھوکا دیکھ خوش ہو۔ جو اُنکے تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں سے بھی نہ پسیجے۔"

ماں :- نارائن! نارائن!!

(خاموشی)

ماں :- "اب تک کہاں تھی؟

رادھا :- "کام کے لئے ماری ماری پھر رہی تھی۔" ماں :- "کیا ہوا؟"

رادھا :- "جو ہونا تھا۔" ماں :- "کیا؟"

رادھا :- "گاؤں والوں کی پھٹکاریں سُنی اور گھر لوٹ آئی۔"

ماں :- (نرمی سے) "چنتا نہ کرو بیٹی۔"

رادھا :- "چنتا کیسی؟ تمھارے ایشور نے غریبوں کو اسی لئے تو بنایا ہے!"

ماں :- "کوئی کام نہیں ملا؟" رادھا :- "کہہ تو دیا۔"

ماں :- "اب کیا ہوگا؟"

رادھا :- کل شہر جاؤں گی۔ شاید کوئی کام مل جائے"!

ماں :- "شہر؟ اتنی دُور!"

رادھا :- "ہاں، کیا ہوا؟ (بچہ کی طرف اشارہ کرکے) آخر اسے کچھ تو ملنا چاہیے۔ آج دو دن ہو گئے"

ماں :- "ہاں، ٹھیک ہے۔"

رادھا :- (غصہ میں) ایشور کی دنیا میں کچھ بھی ٹھیک نہیں! کیا ٹھیک ہے؟ (آہستہ سے) کچھ بھی نہیں۔

[پردہ گرتا ہے]

(منظر دوم)

[منیجر کا کمرہ - مل اپنے پورے زور کے ساتھ چل رہا ہے۔ مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ برابر آ رہی ہے۔ منیجر اپنی میز پر بیٹھا کام میں مشغول ہے۔ ایک طرف ٹیلیفون اور سامنے کاغذات کا پلندہ رکھا ہوا ہے۔ منیجر ایک کاغذ دیکھتا اور رکھ دیتا ہے۔ دوسرا اٹھاتا ہے، دیکھتا ہے اور رکھ دیتا ہے۔ میز کی دراز سے کپڑوں کے چند نقشے (Design.) نکال کر میز پر رکھتا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ کام بند کرکے ٹیلیفون کا آلہ اٹھاتا ہے۔]

منیجر :- (آلہ کان سے لگاکر) ہاں .... ہوں ... ... ہاں، ہاں ... ... (جواب دیتا ہے)

"کل تک آپ کے پاس پہونچ جائے گا۔"

[پھر نقشے (Design.) اٹھاکر دیکھتا ہے۔ ارجن چھڑی ہلاتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ منیجر آہٹ سنکر فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ارجن برابر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ منیجر کھڑا رہتا ہے]

ارجن :- "بیٹھ جایئے۔"

[منیجر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ارجن، منیجر کے ہاتھ سے نقشے (Design.) لے کر دیکھتا ہے، تیسرا نقشہ (Design.) دیکھ کر کچھ سوچتا ہے۔]

ارجن :- "یہ کس نے بنایا ہے؟"

منیجر :- "نئے نقشہ نویس (Designer.) نے۔"

ارجن :- "جسے مَیں نے بھیجا تھا؟"

منیجر :- "جی ہاں!"

ارجن :- "آدمی ہوشیار معلوم ہوتا ہے!"

منیجر :- "جی! نقشے (Design.) سے تو یہی پتہ چلتا ہے!"

[ڈیزاین دیکھ کر میز پر رکھ دیتا ہے۔]

ارجن :- (چھڑی سے کھیلتے ہوئے) مل میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ؟"
مینجر :- "کوئی نہیں ۔"
ارجن :- "سب کام ٹھیک ہو رہا ہے ؟" مینجر :- "جی ! ہاں ——— ٹھیک ہو رہا ہے"
ارجن :- "ذرا لیٹے دیئے رہا کرو۔ سپرنٹنڈنٹ کہاں ہے ؟"
مینجر :- "غالباً مل ہی میں ہوں گے ۔" (ہوں گا)

[چپراسی اندر آتا ہے]

چپراسی :- "ایک لڑکی اندر آنا چاہتی ہے ۔" ارجن :- "آنے دو ۔"

[چپراسی جاتا ہے ۔ لڑکی اندر آ کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے]

ارجن :- (دیکھ کر) "کیا چاہتی ہو ؟" رادھا :- "کام !"
ارجن :- "مشین پر کام کر لو گی ؟" رادھا :- "کر لوں گی !"
ارجن :- "کبھی پہلے بھی کیا ہے ؟" رادھا :- "کیا تو ہے !"
ارجن :- "تم کہاں ؟" رادھا :- "لالہ رگھوناتھ داس کے مل میں ۔"
ارجن :- "اب وہاں کام نہیں کرتی ؟" رادھا :- "نہیں !"
ارجن :- "کیوں ؟" رادھا :- "نکال دیا ۔"
ارجن :- "کیوں ؟"
رادھا :- "دو چار دن کام پر جانے میں دیر ہو گئی تھی ۔"
ارجن :- "ہوں ——— ، (مینجر سے) کوئی جگہ خالی ہے ؟"
مینجر :- "لوم نمبر چار خالی ہے ۔" ارجن :- "اسی پر لگا دو ۔"
مینجر :- "لوم پر ؟" ارجن :- (لڑکی سے) "کر لے گی ؟"
رادھا :- "یہی کام کرتی تھی ۔" ارجن :- "پھر لے جاؤ ۔"
مینجر :- "بہت اچھا !" رادھا :- "کیا ملے گا ؟"
ارجن :- "جو ملتا ہے ۔" (مینجر سے) "مزدوری آج ہی سے لگے گی ۔"

[مینجر اٹھتا ہے اور لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر مل میں جاتا ہے]

ارجن :- (گنگناتے ہوئے) ع "رنگینیاں سمٹ کر انسان ہو گئی ۔۔۔ ہیں !"

[چھڑی کو دیکھتا ہے ۔ اور کچھ سوچنے لگتا ہے ۔ (پردہ گرتا ہے)]

منظر سوم

[مل۔ تین بجے ہیں۔ تمام مزدور کام میں مصروف ہیں۔ مشینوں کے پرزے، بیتاب دلوں اور مزدوروں کی ادھ کھلی تمناؤں کی طرح، تیزی سے پہلو بدل رہے ہیں۔ کمرے میں نمی اور دھوئیں کی وجہ سے تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ بجلی کی روشنی سے کام کے قابل اُجالا ہو گیا ہے۔ چوکیدار مزدوروں کی دیکھ بھال کے لئے ٹہل رہے ہیں۔ کوئی منچلا کسی عورت کے پاس رُک کر مذاق کر رہا ہے۔ کوئی مزدور تھک کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا ہے۔ کوئی کام کرتا جاتا ہے اور برابر کے ساتھی سے باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خاموش سر جھکائے کام کر رہا ہے۔ ایکدم کئی آوازیں "مالک! مالک!!" کام اور تیزی سے ہونے لگتا ہے۔ چوکیدار اپنی پگڑیاں اور پیٹیاں سنبھالکر مستعدی سے گھومنے لگتے ہیں۔]

ارجن :۔ "رشید سوت تو بُرا نہیں ملتا؟"

رشید :۔ "نہیں سرکار!"

[سوال جواب کرتا ہوا، لوم نمبر چار کے پاس آتا ہے۔ سب مزدور نظر بچا بچا کر اُدھر دیکھتے ہیں۔]

ارجن :۔ (رادھا سے) "کام مشکل تو نہیں ہے؟"

رادھا :۔ "ہے بھی تو کیا؟ کرنا ہی جو ہے!"

ارجن :۔ "کوئی اور تکلیف تو نہیں؟"

رادھا :۔ "ویسے تو سب آپ کی کرپا ہے۔ مگر مزدوری ذرا ......"

ارجن :۔ "کم ہے۔ کیوں یہی کہتی ہے نا؟"

رادھا :۔ "جی!" ارجن :۔ "کیوں؟"

رادھا :۔ یہاں سے گاؤں جانا پڑتا ہے۔ اندھی ماں بھی ہے اور ایک چھوٹی بہن۔۔"

ارجن :۔ "دیکھا جائے گا۔ آج شام کو چھٹی کے بعد مجھ سے مل لینا۔"

رادھا :۔ "کہاں؟" ارجن :۔ "منیجر کے کمرہ میں!"

[ارجن گھومتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ مشینوں کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ چھٹی کی سیٹی بجتی ہے۔ مشینوں کے بند ہونے کی آوازیں آتی ہیں اور مزدور، بندوق کی گولی کی طرح، تیزی سے باہر نکل جاتے ہیں۔]

رادھا :۔ (منیجر کے کمرہ پر آکے) "چق اُٹھا کر اندر آسکتی ہوں؟" ارجن :۔ "چلی آؤ!"

[منیجر اُٹھ کر باہر چلا جاتا ہے]

رادھا :- "میں آگئی" ([illegible]) ارجن :- "ٹھہرو!"

[کاغذات رکھتا ہے]

ارجن :- "تم گاؤں میں رہتی ہو؟" رادھا :- "جی!"

ارجن :- "کتنی دور ہے وہ گاؤں؟" رادھا :- "چار میل"

ارجن :- "پیدل جاتی ہو؟" رادھا :- "ہمارے لئے سواری کہاں!"

ارجن :- "تھک جاتی ہوگی؟" رادھا :- "جی، بہت!"

ارجن :- "یہاں کیوں نہیں آجاتی؟" رادھا :- "شہر میں؟"

ارجن :- "ہاں!" رادھا :- "کرایہ نہیں دے سکتی"

ارجن :- "ہمارے مل کے کوارٹروں میں آجاؤ" رادھا :- "کرایہ زیادہ ہوگا؟"

ارجن :- "بالکل نہیں!" رادھا :- "سچ؟"

ارجن :- "ہاں!" رادھا :- "میں آسکتی ہوں!"

ارجن :- "آجاؤ!" رادھا :- (سوچکر) "کل اتوار ہے"

ارجن :- "ہاں!" رادھا :- "بس کل ہی آجاؤں گی!"

ارجن :- "کرایہ کی بابت کسی سے کچھ مت کہنا۔ اوروں سے کرایہ لیا جاتا ہے"

رادھا :- "مجھ سے کیوں نہیں لیتے آپ؟" ارجن :- "تم غریب ہو"

رادھا :- "کیا اور نہیں؟" ارجن :- "اور تمہارے جیسے غریب نہیں!"

رادھا :- "کیوں؟" ارجن :- "تمھیں دیکھ کر ترس آتا ہے"

[جانا چاہتی ہے]

ارجن :- "کل یہاں آجانا۔ نمبر باون خالی ہے" رادھا :- (رک کر) "بہت اچھا"

ارجن :- "دیر ہو رہی ہے تمھیں؟" رادھا :- "جی ہاں۔ نمستے!"

[جانا چاہتی ہے]

ارجن :- "پیدل جاؤ گی؟" رادھا :- "ہاں!"

ارجن :- "سواری کرا دوں؟" رادھا :- "ایسی کیا ضرورت ہے"

ارجن :- (سوچ کر) "اچھا میرے ساتھ چلو"

رادھا :- "کیا کریں گے آپ ۔۔۔۔"

ارجن :- "تمھیں دیر ہو گئی ہے - موٹر میں پہونچا دوں - چلو!"

[دونوں جاتے ہیں - (پردہ گرتا ہے)]

منظر چہارم

[گاؤں کی ایک بوسیدہ جھونپڑی میں ایک بڑھیا پھٹا ہوا لحاف لپیٹے بیٹھی ہے - اُس کا رُخ جھونپڑی کے دروازہ کی طرف ہے - بڑھیا کے برابر ایک چھوٹی بچّی آنکھیں مَل مَل کر رو رہی ہے، دُور سے چوپال میں بیٹھے ہوئے گاؤں والوں کے ہنسنے اور گانے کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی ہیں]

بچّی :- "بھوک لگی ہے" بڑھیا :- "چپ رہو بیٹی"

بڑھیا :- (لٹا کر تھپکتے ہوئے) سو رہو - رادھا شہر گئی ہے - تمہارے لئے روٹی لیکر آتی ہوگی - سو جاؤ بیٹی - سو جاؤ!"

[تھپک تھپک کر سُلا دیتی ہے]

بڑھیا :- "ابھی تک نہیں آئی"

[موٹر جھونپڑی کے سامنے رُکتی ہے - رادھا اُتر کر باہر آتی ہے - اُس کی چال میں سُستی ہے - بال بکھر کر اُس کے نرم گالوں پر لوٹ رہے ہیں - ارجن، رادھا کو ایک ٹوکری دیتا ہے - جسمیں پھل اور بسکٹ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں - رادھا ٹوکری لے لیتی ہے]

رادھا (جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے) "نمستے!"

ارجن :- (آہستہ سے) "نمستے!"

[موٹر چلتی ہے اور دُور نکل جاتی ہے - رادھا جھونپڑی میں آتی ہے]

بڑھیا :- (آہٹ پاکر) کون؟" رادھا :- "میں ہوں اَماں!"

ماں :- "رادھا؟" رادھا :- "ہاں اماں!"

ماں :- "تو آگئی - آ، میرے پاس آ"

[رادھا ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے، وہ ٹٹول ٹٹول کر رادھا کو دیکھتی ہے]

ماں :- "تو آگئی - مَیں تو بڑی دیر سے راہ تک رہی تھی - آ میرے پاس آ - دیکھ تیری بہن رو رو کر بھوکی ہی سو گئی"

رادھا :- "میں تو اُس کے لئے پھل اور بسکٹ لائی ہوں"

ماں :- "کہاں سے لے آئی؟" رادھا :- "مالک نے دلائے - بڑے دیالو ہیں وہ!"

ماں :- "کہاں ہیں؟"

[ٹوکری سامنے لاکر دکھاتی ہے]

ماں :- "اتنے بہت سے!" رادھا :- "پھر امیر بھی تو ہیں"

ماں :- (دیکھ کر) "نوکری تو مل گئی ہوگی؟"

رادھا :- "ہاں!" ماں :- "ہے ایشور!"

رادھا :- "پھر وہی ایشور۔ جس نے نوکری دی اُسے پکارو"

ماں :- "اُسی کو تو پکار رہی ہوں" رادھا :- "پکار رہی ہو؟"

(خاموشی)

ماں :- "مگر شہر تو بڑی دور ہے" رادھا :- "ہاں!"

ماں :- "تو جائے گی کیسے؟" رادھا :- "رہنے کا انتظام ہوگیا ہے"

ماں :- "کہاں؟" رادھا :- "مل کے کوارٹروں میں"

ماں :- "مگر کیا گاؤں چھوڑا جائے؟" رادھا :- "زندہ رہنے کے لئے!"

ماں :- "یہاں بھی تو زندہ ہی ہیں"

رادھا :- "کیا یہی زندگی ہے؟ شہر چلو تو معلوم ہو......"

ماں :- "مگر میں گاؤں کے ہرے ہرے کھیت، جیسا سنتی ہوں، کیسے چھوڑ دوں۔ کیا شہر میں بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کے سُریلے راگ سنائی دیں گے؟ کیا ندی کے کنارے بیٹھ کر دیہاتی چڑیوں کے گیت سن سکوں گی؟"

رادھا :- "اس سے بہت زیادہ ماں، بہت زیادہ! وہاں تم بڑی بڑی مشینوں کے گیت سنو گی۔ قیمتی موٹروں کے راگ۔ پھول اور پھلوں سے مہکتے ہوئے باغ!"

ماں :- "کچھ نہیں!"

رادھا :- "سب کچھ! اماں تمھیں چلنا ہوگا۔ ہمیں زندہ رہنا ہے"

ماں :- (روتے ہوئے) "چلوں گی" رادھا :- "کل؟"

ماں :- "ہاں کل۔ جھونپڑی کس پر چھوڑی جائیگی؟" رادھا :- "ہماری ہے ہی کب!"

ماں :- (روتے ہوئے) "تو کل ہم گاؤں چھوڑ رہے ہیں ـــــ شہر کے لئے!"

رادھا :- "ہاں، اماں!" (پردہ گرتا ہے)

منظر پنجم

(منیجر کا کمرہ۔ مل اپنی پوری رونق کیساتھ چل رہا ہے۔ منیجر اپنے کمرہ میں بیٹھا کام کررہا ہے۔ ارجن

آتا ہے۔ منیجر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ارجن برابر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔]

ارجن:۔ (منیجر سے) "بیٹھ جائیے!"

[منیجر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔]

ارجن:۔ (چھڑی سے کھیلتے ہوئے) "مل میں تو کوئی گڑبڑ نہیں؟"

منیجر:۔ "ویسے تو کوئی نہیں۔ مگر۔۔۔"
ارجن:۔ "مگر کیا؟"

منیجر:۔ "رادھا کی بڑی شکایتیں آرہی ہیں"
ارجن:۔ "کیا؟"

منیجر:۔ "چال چلن کے بارہ میں"
ارجن:۔ "کیسی؟"

منیجر:۔ "اچھا نہیں ہے"
ارجن:۔ "کیسے؟"

منیجر:۔ "یہی کہ اس کے کوارٹر میں ہر وقت مزدوروں کا جماؤ رہتا ہے اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے"

ارجن:۔ "کیا یہ سچ ہے؟"
منیجر:۔ "جی ہاں!"

ارجن:۔ "رادھا کو بلاؤ!"
منیجر:۔ (پکارتا ہے) "چپراسی"

(چپراسی آتا ہے)

منیجر:۔ "رادھا کو حاضر کرو!"
[جاتا ہے]

ارجن:۔ "منیجر! تم نے ان باتوں کی خوب تحقیق کر لی ہے؟"

منیجر:۔ "خوب!"

رادھا:۔ (چق اٹھاکر) "میں آسکتی ہوں؟"
ارجن:۔ "چلی آؤ!"

[منیجر اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے]

رادھا:۔ (بن کر) "میں آگئی"

ارجن:۔ "ہوں۔ (غصہ میں) رادھا! تمہیں پتہ ہے تم کس قدر بدنام ہو رہی ہو؟ تمہیں شرم آنا چاہئیے۔ اپنی صورت دیکھو اور اپنی حرکتوں پر غور کرو"

رادھا:۔ (ہنس کر) "مشین اور شرم! عورت، سماج کی نظروں میں ایک بے جان مشین یا کھلونا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ مشین سے تیل دے کر کام لیا جاتا ہے، اور عورت سے پھل اور بسکٹ دے کر۔ سیٹھ صاحب! ہم اور آپ ایک ہی لہروں پر بہہ رہے ہیں"

[رادھا کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ ارجن سکتہ کے عالم میں رادھا کی طرف دیکھتا ہے]
(پردہ گرتا ہے)

دربار اودھ اور کایستھ

از حضرت خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی

وہ ملک بہت خوش نصیب ہے۔ جس میں ملکی لوگ حکومت کرتے ہوں، اور جس کی رعایا اور بادشاہ ایک ہی طبقۂ ارض کے ہوں۔

اکبر بادشاہ کے زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے دفاتر سرکاری کو بطرز جدید مرتب کیا۔ تمام ممالک محروسہ کی پیمائش کی سنہ فصلی جاری کیا، صوبجات کی حدیں قائم کیں، اپنے دفتر میں صوبہ متحدہ کا نام اختر نگر رکھا۔ اُسوقت سے لوگ اس صوبہ کو اختر نگر ہی کہنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل کو اس خدمت کے صلہ میں وزارت حاصل ہوئی۔ جس طرح اکبر بادشاہ حقوق شناس و قدردان تھا۔ اسی طرح اودھ کے بادشاہ بھی حسن خدمت کی بہت قدردانی کرتے تھے۔ شاہان اودھ کے دربار میں اکثر بڑے بڑے عہدہ پر لائق ہندو ممتاز تھے خصوصاً محکمۂ دارالانشار اور دفتر محاسبی میں ہمیشہ کائستھ ممتاز رہے۔ لکھنؤ میں یہ بات آج تک مشہور ہے کہ علم سیاق کائستھوں سے بڑھکر کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ بعض کائستھ تو ایسے ممتاز تھے کہ بادشاہ کے پہلو میں بیٹھتے۔ جس وقت اودھ کا دربار فیض آباد میں تھا۔ نواب مرزا محمد مقیم ابوالمنصور خاں صفدر جنگ بہادر کے عہد حکومت میں بھی راجہ لچھمی نراین اور مہا نراین ایک ایک لاکھ روپیہ کے جاگیردار، دربار شاہی میں متمکن امارت نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں کائستھ ہیں۔ اور دفتر بیت الانشار کے میرمنشی لالہ بھکاری داس سکسینہ بھی کائستھ ہیں۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کے دربار عالی میں ایک غیر ملکی صورت بھی نظر آتی ہے یعنی کمپنی کی طرف سے ایک ریزیڈنٹ محض اپنے قومی حقوق کی حفاظت کی غرض سے حاضر ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا بھی لباس وہی ہے، جو شاہی دربار کا لباس ہے۔ دربار سے باہر یہ اپنی پوشاک پہنتا ہے۔

دیوان راجہ صورت سنگھ ہیں اور منشی راجہ بشن سنگھ،

نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ میں اودھ کا دارالسلطنت لکھنؤ قرار پایا۔ اُن کے دربار میں دیوان راجہ صورت سنگھ، راجہ ٹکیت رائے، منشی راجہ جھنڈن لال، بخشی جھاؤلال ناتھ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔

مہاراجہ ٹکیت رائے نے بہت جلد ترقی کی۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ "ٹکی" سے "ٹکیتا" ہوئے اور ٹکیتا سے

"مہاراج"۔ یعنی بچپنے میں لوگ "ٹکی" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب ذرا جوان ہوئے تو لوگ "ٹکیتا" کہنے لگے۔ پھر دربار میں پہونچے تو مہاراج ہو گئے۔

مشہور تھا کہ مہاراجہ ٹکیت رائے نے اپنا وہ لباس جو شاہی توسل سے پہلے پہنتے تھے ایک صندوقچے میں بحفاظت رکھ چھوڑا تھا۔ اور وہ ہر روز دربار آنے سے پہلے اسے ملاحظہ کر لیا کرتے تھے۔ بیحد فیاض تھے ٹکیت گنج لکھنؤ میں انھیں نے آباد کیا۔ اور اکثر شہروں میں مسجدیں، کنوئیں، مدرسے رفاہ عام کیواسطے تیار کئے۔ لکھنؤ میں سیتلا دیوی کے متصل ایک بہت بڑا تالاب بنوایا۔ جس پر اب تک آٹھوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اس تالاب کے کنارہ ایک طرف زنانہ گھاٹ کی عمارت مع چوکی سنگی و دالان کے بہت پختہ بنی ہوئی تھی، دوسری طرف مردانہ گھاٹ تھا۔ اور ایک طرف مویشیوں کے آرام کے لئے چرہی بنی ہوئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ تالاب اب بند کر دیا گیا۔

ان فیاضیوں کی بدولت مہاراجہ ٹکیت رائے کے ذمہ کئی لاکھ روپیہ شاہی غبن نکلا۔ تو مہاراجہ نے بادشاہ سے عرض کیا کہ جو کچھ خزانہ سرکاری سے روپیہ جائز اور ناجائز طریقے سے میں نے حاصل کیا، سب رفاہ عام میں خرچ کر دیا۔ مسجدیں بنوائیں، تالاب بنوائے، گنج قائم کئے، بازار ترتیب دیئے، مدرسے کھلوائے، کنوئیں کھدوائے۔ ان کاموں سے حضور کی رعایا کو فائدہ پہونچا اور حضور کا نام ہوا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ٹکیت رائے اپنے گھر سے کچھ نہیں لایا۔ یہ چوری بھی حضور کی نیک نامی کا باعث ہوئی۔ اب حضور کو اختیار ہے معاف کیجئے یا سزا دیجئے۔

آصف الدولہ خود مخیر تھا۔ عفو تقصیر کا بہانہ ڈھونڈھتا تھا۔ فرمایا بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا ہم نے معاف کیا۔ مہاراجہ جھاؤلال نے اس حساب کی جانچ کی تھی اور مہینوں کی عرق ریزی کے بعد غلطیاں برآمد کی تھیں بادشاہ کی اس درگذر پر اپنی بوٹیاں دانتوں سے کاٹنے لگے اور کہنے لگے جب ایسی ہی سخاوت ہے تو حساب لینا کیا ضرور تھا۔ مگر ٹکیت رائے کی فیاضیوں کا اُن پر بھی اثر ہوا۔ چنانچہ آخر وقت خود بھی جھاؤلال کا پل بنوایا، جھاؤلال کا بازار قائم کیا۔ جن کی بدولت مہاراجہ جھاؤلال کا نام بھی آج تک قائم ہے۔

مہاراجہ بھوکاری داس کائستھ تھے۔ چندے بیت الانشاء کے منشی رہے۔ پھر خاص نواب ابو المنصور خاں کے دربار میں داخل ہوئے اور مہاراجہ کا خطاب حاصل کیا۔ ان کے بعد انکے فرزند مہاراجہ بشن سنگھ بھی اس عہدے پر ممتاز ہوئے۔ کسی خطا پر جاگیر ضبط ہو گئی، خطاب لے لیا گیا۔ منشی خانہ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر اُن کی اولاد میں سے راجہ بھولاناتھ سر رشتہ تحریر بیت الانشاء مقرر ہوئے۔ آخری شاہ اودھ کے ساتھ اُن کا فرزند دولت رام بعد زوال سلطنت بھی کلکتہ میں بیت الانشاء کا منشی رہا۔ وزیر علی خاں کے دربار میں بخشی خوشحال رائے بخشی فوج تھے۔

نواب سعادت علی خاں کے دربار میں مرزا قتیل، میر انشاء اللہ خاں انشاء وغیرہ باریاب تھے، اور

ہندؤں میں مہاراجہ جگیت رائے، منشی ٹھاکر رام، راجہ بھولا ناتھ بخشی بلاس رائے، لالہ مجلس رائے، دفتر محاسبی میں معتمد متعین تھے۔
ابو النصر قطب الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نوشیروان زماں نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانہ میں بھی کائستھوں کا بہت عروج تھا۔ مہاراجہ بالکرشن دیوان تھے۔ لالہ پرچند بخشی فوج تھے۔
راجہ رتن سنگھ خلف رائے بالکرام اپنے خسر مہاراجہ دیاکرشن کی وساطت سے شاہی دربار میں داخل ہوئے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں دستور العمل ملک اودھ کا بندوبست امانی کے لئے مرتب کیا۔ اُس کے بعد نصیر الدین حیدر کے اتالیق مقرر ہوئے۔ آخر میں بیت الانشار کے میر منشی ہو گئے۔ اور فخر الدولہ بیر الملک منشی الملوک کا خطاب حاصل کیا۔ اُن کا خاندان لکھنؤ میں اب تک عزت و آبرو سے بسر کرتا ہے
لالہ امام بخش کے فرزند کنور آفتاب رائے، اُن کے فرزند کنور کاشی پرشاد وزیر گنج میں سکونت پذیر ہیں
غرض اودھ میں عہد شاہی سے برابر ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کی طرح ساتھ رہا۔ اور دربار شاہی میں کائستھ صاحبان ہمیشہ ممتاز عہدوں پر مامور رہے۔

کایستھ شعرا کا مجموعہ کلام[1]

جناب من۔ تسلیم،
میں نے سابق اور موجودہ زمانہ کے کایستھ شعرار کے کلام (بزبان اُردو ہندی یا ہندستانی) اکٹھے کر کے انکا مجموعہ شائع کرانے کا ارادہ کیا ہے۔ اِس لئے آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ:۔
(۱) اپنے یا دیگر شعرار کے کلام جو آپ کے پاس ہوں مع مفصل حالات و فوٹو شاعر موصوف کے میرے پاس ارسال فرمادیں۔
(۲) اگر کلام مطبوعہ ہے تو ایک جلد مع حالات شاعر وغیرہ قیمتاً ارسال فرمادیں یا اگر ضرورت ہو تبادلے میں ایک کاپی "وعظ جنگ" یعنی بھگوت گیتا اُردو منظوم جس کو اِس کمترین نے مولانا فیضی کے فارسی ترجمہ سے ترجمہ کیا ہے لے سکتے ہیں۔
(۳) اگر جناب کے پاس اپنا یا کسی اور صاحب کا غیر مطبوعہ کلام موجود ہو۔ جسکی اصل کاپی دینا منظور نہ ہو، تو اسکی نقل کرا کر ارسال فرمادیں یا اصل کو رعایتاً میرے پاس بھجوا دیں۔ میں نقل کرنیکے بعد اصل کو جلد سے جلد واپس کر دوں گا۔
(۴) اگر آپ کے شہر یا قصبہ میں کایستھ سبھا ہو تو براہ کرم اس کی توجہ اس عریضہ کی طرف دلادیں۔
(۵) اپنے قصبہ یا دیگر مقامات کے ایسے انتخاب برادری کے اسمائے گرامی کی ایک فہرست معہ پتہ ارسال فرمادیں۔ جن سے اس کام میں امداد مِل سکنے کی توقع ہو تو میں براہ راست اُن کی خدمت میں عرض کرسکوں۔
خاکسار سری برج اندر کنوار بھٹناگر پنشنر سپرنٹنڈنٹ، دفتر اکونٹنٹ جنرل پنجاب
سندر نواس، شام گلی، کرشن نگر۔ لاہور

---

[1] ہمارے پاس یہ خط بغرض اشاعت موصول ہوا ہے۔

تنقید کتب

کائستھ اُردو سبھا کی مطبوعات[1]

اُردو زبان کو فروغ دینے میں ہندوؤں میں کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں نے جس قدر حصّہ لیا ہے۔ اتنا کسی دوسری برادری نے نہیں لیا۔ مگر اُن میں سے اکثر قابل قابل انشار پرداز اور شاعر بھی عام کس مپرسی کا شکار ہوئے۔ چنانچہ انہیں سے بہت سے ادیب اور شعراء ایسے ہیں جو اپنے زمانہ میں تو بہت مشہور ہوئے۔ لیکن اُن کے بعد نہ اُن کا نام ہی باقی رہا اور نہ اُن کے کلام کا کہیں پتہ ملتا ہے۔ اس لئے ہم کو یہ سُن کر دلی خوشی ہوئی کہ دہلی میں کائستھ اُردو سبھا کے نام سے ایک انجمن اس مقصد سے قائم ہوئی ہے کہ ان قابل مصنفوں اور شاعروں کے کلام کی اشاعت کا انتظام کرے، جنھوں نے اُردو ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اور جن کا کلام ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن قابل قدر ہستیوں کی یاد ہی لوگوں کے دلوں میں یاد ہی تازہ رہے گی، بلکہ اُردو زبان کا سرمایہ بھی بڑھ جائیگا۔ اس سبھا نے دہلی کے بعض نامور کائستھ شعراء کے مجموعہ کلام شائع کئے ہیں۔ انہیں **کلام رونق** اور **کلام مشتاق** خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سبھا نے **نغمہ قصیر** اور **کلام عاصی** کے نام سے دو اور مجموعے بھی شائع کئے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں ان سب کا مختصر ذکر درج ہے۔

رونق صاحب کا پورا نام منشی پیارے لال صاحب رونق دہلوی ہے۔ جن کی دلپذیر نظموں کا ایک بیش بہا مجموعہ **کلام رونق** کے نام سے شائع ہوا ہے۔ آپ اپنے وقت میں اُردو کے ایک مشہور شاعر تھے۔ آغاز شباب سے لیکر پیرانہ سالی تک آپ نے شعر و شاعری کا مشغلہ جاری رکھا۔ دہلی اور بیرونجات کے سیکڑوں شاعروں میں شریک ہوئے حضرت راسخ دہلوی سے تلمذ تھا۔ آپ کی ایڈیٹری میں کئی سال تک دہلی سے "کمال" نامی شعر و سخن کا ایک گلدستہ بھی نکلتا رہا۔ آپ کی غزلیات کا ایک دیوان "رونق سخن" کے نام سے آپ کی زندگی میں بھی شائع ہوا۔ مگر اب وہ بہت کمیاب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اب کائستھ اُردو سبھا دہلی نے آپ کی مختلف نظموں کا ایک مجموعہ کلام رونق کے نام سے شائع کیا ہے۔ ہم شکرگذار ہیں کہ کائستھ اُردو سبھا نے توجہ کر کے اُن جواہر پاروں کو تلف ہونے سے بچا لیا۔ اس مجموعے میں اُنیس قومی، سترہ مذہبی، بارہ موسمی، بارہ متفرق عنوانوں پر نظمیں اور متعدد قطعات تاریخ ہیں۔

---

[1] کائستھ اُردو سبھا دہلی کی سب کتابیں اسکار و نیشن بک ڈپو، نئی سڑک دہلی سے ملیں گی

حضرت رونق ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر تھے۔ طبیعت کسی موضوع پر بند نہ تھی۔ حُسنِ اخلاق و باہمی رواداری کا مجسمہ تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ جہاں آپ نے سری رامچندر جی، کرشن جی، گورو گوبند، شری مہابیر، سوامی دیانند سرسوتی اور سوامی شردھانند کی شان میں نظمیں لکھیں، وہاں آپ نے حضرت محمدؐ کی شان میں بھی متعدد نعتیں کہی ہیں۔ اس مجموعہ میں حضرت رونق کی غزلوں کا بھی انتخاب درج ہے۔ کتابت، طباعت، کاغذ معمولی۔ حجم ۱۶۰ صفحات

کلامِ مشتاق

کلامِ مشتاق کے نام سے کائستھ اردو سبھا کے زیر اہتمام مسٹر بھگوت سروپ دہلوی ایم اے، ایم۔او۔ایل لکچرار ہندو کالج دہلی نے منشی بہاری لال صاحب مشتاق دہلوی مرحوم کا کلام منتخب کرکے شائع کیا ہے۔

مشتاق صاحب پُرانی وضع کے بزرگ تھے۔ پہلے مرزا غالب سے اصلاح لی۔ بعدہٗ خواجہ الطاف حسین حالی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ بہت دنوں تک دہلی کے ایک ہفتہ وار اخبار "اکمل الاخبار" اہتمام و ایڈیٹری کرتے رہے۔ پہلے پہلے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ ضائع ہوگیا تھا۔ بعد میں کچھ یادداشت اور کچھ پُرانے مسودات سے کسی قدر کلام فراہم کیا۔ جس کا نام خریطۂ جواہر رکھا گیا۔ خوش اخلاق، روادار اور بے تعصب آدمی تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

ہم ہیں ہندو تم مسلماں دونوں باہم ایک ہیں جس طرح اعداد جمنا[۹۴] اور زمزم[۹۴] ایک ہیں

آپ بہت کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے، برجستہ شعر کہتے تھے۔ اس مجموعہ میں مرحوم کی بہت سی اُردو اور تین فارسی غزلوں کا انتخاب بھی درج ہے۔ آٹھ منظوم پہیلیاں، ایک مثنوی فتوحِ امید، رسم قرارداد کے خلاف ایک مسدس، ایک سہرا اور دو تین رباعیاں بھی شامل ہیں۔ آپ کی بعض نظمیں مشہور رسالہ "مخزن" کی ابتدائی جلدوں میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ رسمی۔ حجم چار جزو۔ قیمت چھ آنے۔

نغمۂ قصیر

یہ منشی گوری شنکر قصیر دہلوی کی نفیس ٹھمریوں، بھجنوں، ہوریوں، ملاروں اور دادروں وغیرہ کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جسے مسٹر منموہن لال ماتھر ایم۔اے دہلوی پروفیسر ہندو سبھا کالج امرتسر نے مرتب کیا اور کائستھ اُردو سبھا دہلی نے شائع کیا۔ جن حضرات کو گانے بجانے سے دلچسپی ہے، اُن کے لئے عمدہ چیز ہے۔ حضرت مصنف کا فوٹو بھی شامل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ رسمی۔ ضخامت ۱۶۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ

کلامِ عاصی

یہ حضرت غالب و ذوق کے ہمعصر اور شاہ نصیر کے مایۂ ناز شاگرد منشی گھنشیام لال عاصی دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے مسٹر منموہن لال ماتھر دہلوی ایم۔اے، پروفیسر ہندو سبھا کالج امرتسر نے مرتب کیا اور کائستھ اُردو سبھا

دہلی نے شائع کیا۔ اِس دیوان کے پڑھنے سے سَوبرس پہلے کی اُردو شاعری کا لطف آتا ہے جبکہ دوغزلے اور سہ غزلے کہہ کر قافیہ پیمائی کے میدان میں خوش خرامیاں دکھانے کا شوق تھا۔ ثقیل قافیوں اور مشکل ردیفوں پر طبع آزمائی کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ مثلاً "مگس کی تیلیاں"۔ "چرس کی تیلیاں"۔ "فلک کے نیچے زمین کے اوپر"۔ وغیرہ وغیرہ ہمعصروں پر چوٹیں بھی ہوتی تھیں، تعلّیاں بھی کی جاتی تھیں۔ اور مضمون آفرینی بھی کی جاتی تھی۔ صنائع بدائع سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ دیوان اِس قسم کی رنگین لطافتوں کا ایک دلاویز مجموعہ ہے۔ بعض غزلوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربی فارسی لُغات سے ٹٹول ٹٹول کر قافئے باندھے گئے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی ضخامت ۲۷۴ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

مراسلات

محترمی۔ تسلیم۔ زمانہ بابت اپریل ۱۹۴۰ء میں "نورجہاں کی شاعری" کے متعلق جناب سید رضا قاسم مختار کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جسمیں اُنھوں نے ذیل کے اشعار کو نورجہاں کی طرف منسوب کیا ہے ؎

۱۔ برقع برُخ افگندہ برو ناز بہ باغش — تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

۲۔ زشرم آب شدم کاب را شکستے نیست — بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

۳۔ لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہاں بر چہرہ زخمے بود بہ شد

۴۔ عشق را اوّل و آخر ہمہ ذوق است وسماع — ایں شرابیست کہ ہم پختہ وہم خام خوش است

لیکن فارسی کے تذکروں میں یہ شعر دوسرے مشہور شاعروں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

جہاں تک مجھے خیال ہے ؎ "برقع برُخ افگندہ...... الخ" والا شعر مُلّا صیدی کا ہے۔ تذکروں میں اِس شعر سے متعلق ایک واقعہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک مُغل شاہزادی باغ کو جارہی تھی۔ اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ کوئی مرد باہر نہ نکلے۔ شاہزادی برقع پہنے ہوئے تھی۔ مُلّا صیدی نے یہ شعر پڑھا۔ شاہزادی نے اُسے بہت سا انعام دیا۔ مگر اُسے شہر بدر کر دیا۔

دوسرا شعر "زشرم آب شد...... الخ" طالب کلیم کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نورجہاں کلیم کی شاعری کی قائل نہ تھی۔ کلیم نے جب یہ شعر پڑھا۔ تو نورجہاں نے معترضانہ لہجہ میں کہا۔ "یخ بست پس شکست"۔

تیسرا اور چوتھا شعر طالب آملی کا ہے۔ جہانتک خیال ہوتا ہے خود جہانگیر نے طالب آملی کے منتخب اشعار میں ان اشعار کو درج کیا ہے۔ میں اِس وقت تلہر میں ہوں، لکھنؤ میں نہیں۔ ورنہ تذکروں کے حوالے بھی لکھ دیتا۔ یہاں کوئی کتاب پاس نہیں ہے بہتر ہوگا کہ لائق مضمون نگار ان ماخذوں کا ذکر فرمادیں۔ جن سے اُن کو یہ پتہ چلا ہے کہ یہ اشعار نورجہان کے ہیں۔ اِس سے مسافر تحقیق کو آگے کی منزلیں طے کرنے کا موقع ملیگا۔

سید اختر علی تلہری

لکسمبرگ۔ بلجیم۔ ہالینڈ

لکسمبرگ، بلجیم اور ہالینڈ، جن کو ہٹلر نے بہ یک وقت حملہ کرکے پامال کر دیا ہے، یوروپ کے تین چھوٹے چھوٹے خود مختار ملک ہیں۔ جنھیں مجموعی حیثیت سے "نشیبی ممالک" کہا جاتا ہے۔

لکسمبرگ

لکسمبرگ ان تینوں ممالک میں سب سے چھوٹا ہے۔ وہ جرمنی، فرانس اور بلجیم کے درمیان واقع ہے۔ اور اُس کا رقبہ نوسو ننانوے (۹۹۹) مربع میل اور آبادی تین لاکھ ہے۔ لکسمبرگ پہلے حکومت جرمنی میں شامل تھا مگر ۱۸۶۸ء میں اُس سے علیحدہ ہوگیا۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے پھر اُس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جنگ عظیم کے اختتام پر معاہدۂ وارسائی کی رُو سے اُسے پھر خود مختار علاقہ تسلیم کر لیا گیا۔

لکسمبرگ کی بیس (۲۰) فیصدی آبادی اور حکمران خاندان کے افراد فرانسیسی زبان بولتے ہیں مگر اسّی (۸۰) فیصدی آبادی کی زبان جرمن ہے۔ گرانڈ ڈچز شارلاٹ جو ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئی تھیں لکسمبرگ کی ملکہ ہیں اور اُن کا شمار یوروپ کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جب جرمنی نے لکسمبرگ کے راستہ سے بلجیم پر حملہ کرنا چاہا تو لکسمبرگ کی نوجوان ملکہ میری ایڈیلیڈ نے (جو موجودہ ملکہ کی بڑی بہن تھیں) احتجاج کیا۔ مگر بعد کو جرمنی کی طاقت کے سامنے انھیں سر جھکانا پڑا۔ اور پھر انھوں نے قیصر جرمنی کے ساتھ کھانا بھی کھایا اور جرمن افواج کی فتحمندی کے لئے دُعا بھی کی۔ لکسمبرگ کے باشندوں کو اپنی ملکہ کا یہ طرزِ عمل ناگوار گذرا اور ۱۹۱۹ء میں انھیں اپنی چھوٹی بہن کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔

لکسمبرگ کا علاقہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور لوہے کی کانوں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سالانہ چالیس (۴۰) لاکھ ٹن کچا لوہا پیدا ہوتا ہے اور بیس (۲۰) لاکھ ٹن اسٹیل۔ لکسمبرگ کی فوج صرف پانچ سو (۵۰۰) ہے۔ اس کا قلعہ البتہ یوروپ کے بہت پُرانے اور مضبوط ترین اور مشہور ترین قلعوں میں ہے۔

بلجیم

بلجیم، ہالینڈ کے جنوب، فرانس کے شمال مشرق اور جرمنی کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ انگلستان اور

ے Low Countries.

اور بلجیم کے درمیان صرف ایک پتلا سا سمندر حائل ہے۔ جسے رود بار انگلستان کہتے ہیں۔ بلجیم کا رقبہ تقریباً ساڑھے بارہ ہزار مربع میل اور آبادی اسّی لاکھ ہے۔ برسلز پایۂ تخت ہے۔ موجودہ بادشاہ کا نام لیوپولڈ ثالث ہے جو ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ بلجیم کا مغربی حصہ "فلینڈرس" کہلاتا ہے جس کی آبادی کل ملک کی آبادی کے نصف سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہ علاقہ پہلے ہالینڈ میں شامل تھا۔ لیکن ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں جب بلجیم کی حکومت قائم ہوئی تو اسے بلجیم میں شامل کر دیا گیا۔ اس علاقہ کے باشندوں کی زبان اور ہالینڈ کی زبان ایک ہی ہے۔ صرف لہجہ کا فرق ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اور اہل ہالینڈ کو ایک قوم کہتے ہیں اور عرصہ سے خود اختیاری کے بھی طالب ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ مطالبہ ابھی تک پورا نہیں ہو سکا ہے مگر حکومت بلجیم نے انھیں بہت کچھ مخصوص رعایتیں دے رکھی ہیں۔ جنگ عظیم میں باشندگان فلینڈرس کی اکثریت نے فرانس کا ساتھ دیا تھا۔ مگر ایک طبقہ جرمنی کے بھی موافق تھا۔ جرمنی نے اہل فلینڈرس سے ہمیشہ اظہار ہمدردی کیا ہے اور کچھ عرصہ سے وہاں نازیوں کے پروپیگنڈا نے بہت شدت اختیار کر لی ہے۔

جرمنی کے لئے جنگی نقطۂ نگاہ سے بلجیم خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے مغربی ساحل پر آبدوزوں اور ہوائی جہازوں کے مرکز قائم کر کے انگلستان پر آسانی سے حملہ ہو سکتا ہے اور جنوب سے فرانس کی سدّ سکندری میجنو لائن کو توڑے بغیر فرانس پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے جنگ عظیم میں بھی جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ میں بھی بلجیم کو ابتدا ہی سے جرمنی سے خطرہ تھا۔ اور حفظ ماتقدم کے خیال سے اس نے ہر طرح سے اپنی فوجی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ اس وقت بلجیم چھ لاکھ مسلح اور منظم فوج میدان جنگ میں اتار سکتا ہے۔ اس نے اپنے مشرقی ساحل پر قلعہ بندی بھی کی ہے۔ جسے "ڈیویز لائن" کہا جاتا ہے۔ یہ قلعہ بندی میجنو لائن کی طرح تو مضبوط نہیں مگر پھر بھی اس کی مدد سے جرمن فوجوں کی پیشقدمی کو اس وقت تک روکا جا سکتا ہے جب تک برطانوی اور فرانسیسی فوجیں بلجیم کی حفاظت کے لئے وہاں تک پہونچ نہ جائیں۔ بلجیم کے پاس بحری بیڑہ بالکل نہیں ہے۔ اور ہوائی جہاز بھی بہت کم ہیں۔

افریقہ میں بلجیم کی ایک نو آبادی بھی ہے۔ جس کا نام "بلجین کانگو" ہے۔ اس کا رقبہ نو لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے اور آبادی ایک کروڑ ہے اس نو آبادی میں کافی معدنیات پائی جاتی ہیں مثلاً تانبہ، سونا، موتی، ریڈیم وغیرہ۔ مشرقی افریقہ میں روانڈا ارنڈی نامی ایک علاقہ پر بھی بلجیم کا انتداب قائم ہے۔

ہالینڈ

ہالینڈ، بلجیم کے شمال اور جرمنی کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ساڑھے بارہ ہزار ہے اور زرعی پیداوار بہت کافی ہے۔ آبادی تقریباً ۸۰ لاکھ ہے اور پایۂ تخت ایمسٹرڈیم ہے۔ ملکہ ولہیمنہ ہالینڈ کی حکمراں ہیں۔

وہ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئی تھیں اور ۱۸۹۰ء میں تخت نشین ہوئیں۔ ہالینڈ میں ایک نازی جماعت بھی ہے جس کے لیڈر نے ہالینڈ پر حملہ ہونے سے قبل یہ اعلان کیا تھا کہ اگر جرمنی نے ہالینڈ پر حملہ کیا تو نازی جماعت غیر جانبدار رہیگی ہالینڈ کی پارلیمنٹ میں جس کے سو ممبر ہوتے ہیں چار ممبر نازی جماعت کے بھی ہیں۔ جرمنی کے نازی ہمیشہ سے چاہتے رہے ہیں کہ ہالینڈ جرمنی میں پورے طور سے شامل ہو جائے۔

جنگی نقطۂ نگاہ سے ہالینڈ کی بھی تقریباً وہی اہمیت ہے جو بلجیم کی ہے اور ہالینڈ کے مغربی ساحل پر بھی ہوائی جہازوں اور آبدوزوں کے مرکز بنا کر انگلستان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ ہالینڈ بھی ابتدا سے فوجی تیاریاں کرتا رہا ہے اور اس وقت اُس کے پاس چھ لاکھ منظم فوج ہے۔ ہالینڈ نے اپنے دریاؤں کے پشتے باندھ رکھے ہیں۔ جنھیں جنگ کے چھڑنے کی صورت میں کھول دینے سے ملک کا بہت بڑا علاقہ سیلاب زدہ ہو سکتا ہے۔

جزائر شرق الہند

جزائر شرق الہند (East Indies) پر ہالینڈ ہی کا قبضہ ہے اور یہ جزائر نہ صرف ہالینڈ کیلئے بہت مفید ہیں بلکہ اپنی پیداوار اور جائے وقوع کی وجہ سے کئی بڑی بڑی سلطنتوں کا مفاد ان سے وابستہ ہے۔

یہ جزائر ہندوستان کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ تعداد میں وہ بیس ہزار کے قریب ہیں اور تین ہزار میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑے اور مشہور سماٹرا، جاوا، ڈچ بورنیو اور ڈچ گائنا ہیں۔ ان جزائر کی آبادی تقریباً ساٹھ کروڑ ہے جس میں مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت ہے۔ ملکہ ہالینڈ کی طرف سے ایک ڈچ گورنر جنرل ان جزائر پر حکومت کرتا ہے۔ اور اُسے کافی اختیارات حاصل ہیں۔ ان جزائر کی حفاظت کے لئے چالیس ہزار آدمیوں کی فوج بھی ہے۔ بحری اور فضائی بیڑہ البتہ بہت مختصر ہے۔ زرعی پیداوار اور معدنیات کے لحاظ سے یہ جزائر نہایت ہی قیمتی ہیں۔ تیل کے کنوئیں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور تقریباً چھ کروڑ تیل کے پیپے ہر سال مختلف ممالک کو جاتے ہیں۔ پندرہ لاکھ ٹن کے قریب ہر سال کوئلہ نکلتا ہے اور تیس ہزار ٹن قلعی، سونے اور چاندی کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں اور اُن کانوں سے ہر سال ۴۰ لاکھ روپیہ کی قیمت کا سونا اور سولہ لاکھ روپیہ کی چاندی نکلتی ہے۔

دُنیا میں جس قدر ربر پیدا ہوتا ہے اُس کا ایک تہائی اِن جزائر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح ۹۵ فی صدی کونین کی چھال یہیں ملتی ہے۔ شکر بیس لاکھ ٹن سالانہ تیار ہوتی ہے۔ قہوہ ایک لاکھ ٹن، تمباکو ۳۷ ہزار ٹن۔ سیاہ مرچ تقریباً تیس ہزار ٹن اور ناریل کی سوکھی گری چار لاکھ ٹن۔ مویشی بھی لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے بھی یہ جزائر بہت اہم ہیں۔ اُن کے شمال مشرق میں ہندوستان، شمال میں فرانسیسی "انڈو چائنا"۔ جزائر فلپائن (امریکن مقبوضات) جاپان اور جنوب میں آسٹریلیا (برطانوی نوآبادی)

واقع ہیں۔ اگر کوئی دوسرا ملک مثلاً جاپان اُن جزائر پر قبضہ کرکے وہاں فضائی اور بحری مستقر بنالے تو نہ صرف اُن کی بیش قیمت پیداوار اور معدنیات اُس کے ہاتھ میں آجائیں گی بلکہ ہندوستان، فرانسیسی انڈوچائنا، جزائر فلپائن اور آسٹریلیا کو بھی سخت خطرات لاحق ہوجائیں گے۔

ان جزائر کی یہ جنگی اور اقتصادی اہمیت ہی ہے جس کی وجہ سے جنگ چھڑنے کے ہی ان پر جاپان کی للچائی نگاہیں پڑنے لگیں اور اُس نے اعلان بھی کردیا کہ اگر ہالینڈ پر حملہ ہوگیا تو جزائر شرق الہند کی آزادی نہیں قائم رہ سکتی امریکہ جانتا ہے کہ ان جزائر پر اگر جاپان کا قبضہ ہوگیا تو نہ صرف جزائر فلپائن خطرہ میں پڑجائیں گے بلکہ ان جزائر سے جو سامان امریکہ آتا ہے وہ جاپان کو چلا جائے گا۔ اِس لئے امریکن وزیر خارجہ نے بھی جاپان کے جواب میں یہ الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگر جزائر شرق الہند پر کسی دوسری طاقت نے ہاتھ اُٹھایا تو بحرالکاہل کا امن خطرہ میں پڑجائے گا اور امریکہ ان جزائر کی حفاظت کرے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی امریکہ کا ایک بحری بیڑہ بھی جزائر ہانولولو بھیج دیا گیا ہے۔ جس سے جاپان کچھ مرعوب ہوکر خاموش ہوگیا ہے۔

برطانیہ اور فرانس کو اس خطرہ کا پہلے ہی سے احساس ہے۔ چنانچہ سنگاپور میں برطانیہ کے زبردست ترین اور مضبوط ترین بحری اور ہوائی مستقر بنے ہوئے ہیں جو جزائر شرق الہند پر حملہ ہونے کی صورت میں نہ صرف برطانوی مقبوضات کی اچھی طرح حفاظت کرسکتے ہیں بلکہ حملہ آور ملک کا بھی کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔
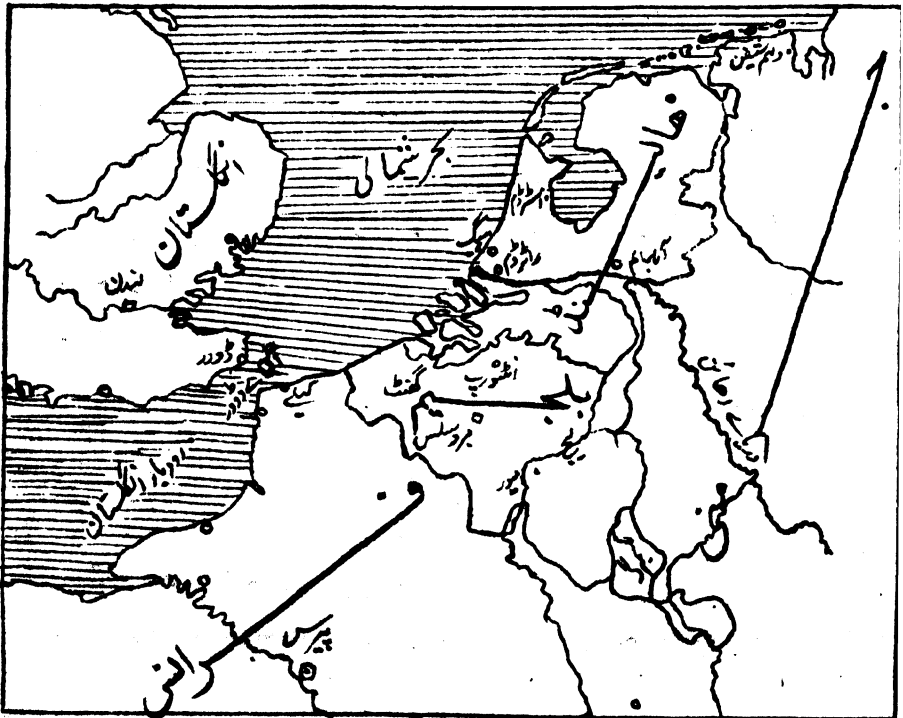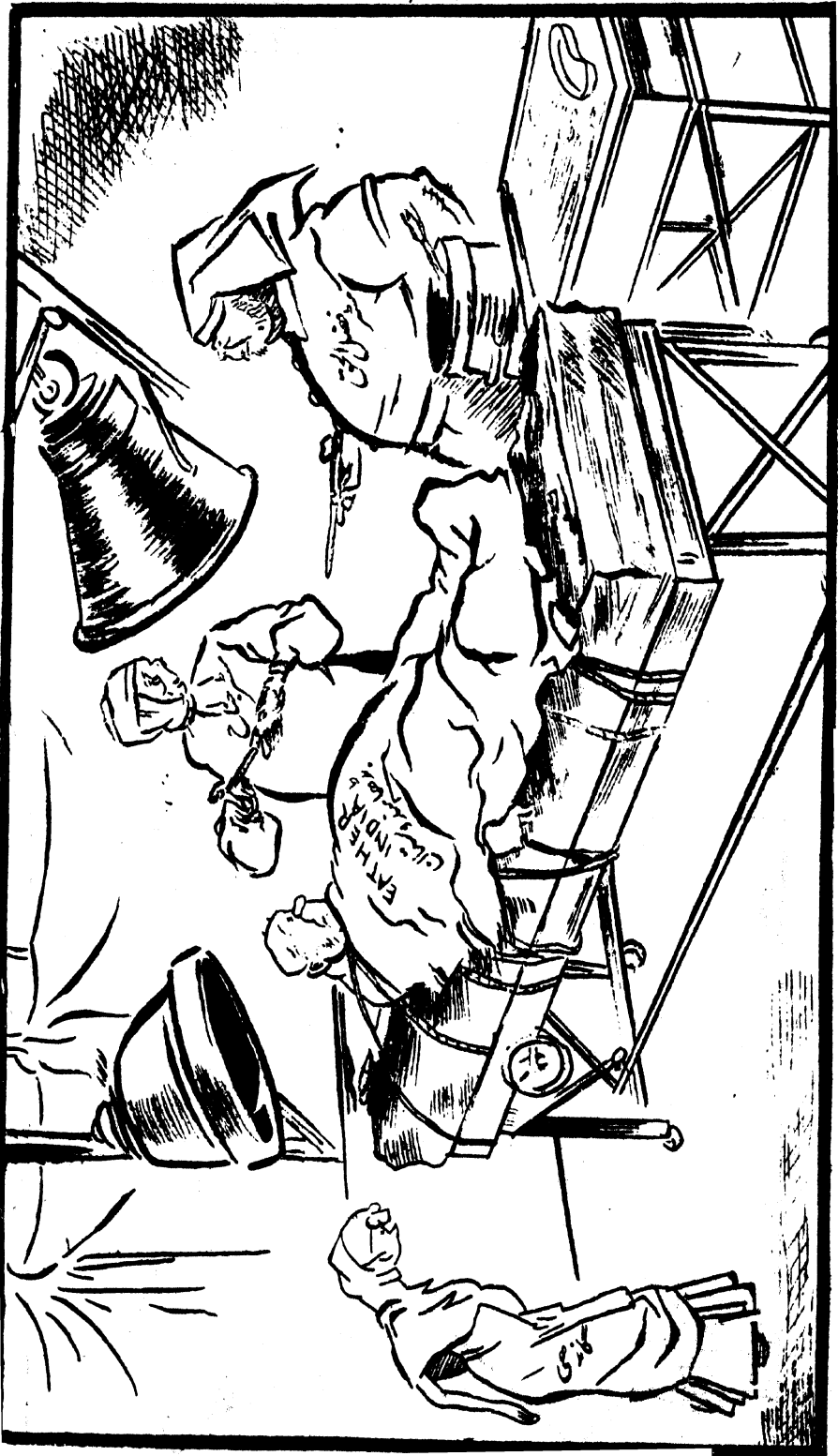
رفتار زمانہ

جنگی ڈرامے کا چوتھا باب جو فرانس میں شروع ہوا تھا خلاف توقع صرف پانچ ہفتوں میں ختم ہو گیا۔ فرانس اس سے زیادہ جرمن فوجی مشین کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جیسا کہ اب معلوم ہوا جنرل ویگان بھی جن کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں قائم کی گئی تھیں فوجی سرداروں کی ابتدائی غلطیوں اور ملکی مدبروں کی سالہاسال کی غفلتوں کا کوئی علاج نہ کر سکے۔ کہتے ہیں کہ فرانس کی لڑائی فلینڈرس ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ جنرل گملین نے جس انداز سے لڑائی شروع کی وہ بہت غلط ثابت ہوا اور فرانس کے پاس سامانِ جنگ اور جدید آلات بھی بہت کم تھے۔ ہزاروں ہوائی جہازوں اور فولادی موٹروں کے علاوہ جرمنی نے بیس لکھ سپاہیوں سے فرانس پر حملہ کیا۔ فولادی ٹینکوں کے مسلسل حملوں، لاتعداد مشین گنوں کی متواتر آتشباریوں کے بعد جرمنی کی بیشمار تازہ دم فوجوں نے فرانس کی سپاہ کا ایسا صفایا کر دیا کہ آخرکار ان میں مقابلہ کی تاب ہی باقی نہ رہی موسیو رینو جس انتظام اور سرگرمی سے لڑائی جاری رکھنا چاہتے تھے اسمیں دوسرے وزیروں نے اُن کا ساتھ نہ دیا اور جنرلوں کے ردوبدل کے متعلق بھی اُن کی تجویزیں منظور نہ ہوئیں۔ بہرحال وسط جون سے پہلے ہی فرانسیسی جنرل ہمت ہار بیٹھے۔ موسیو رینو کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا اور اُن کی جگہ پرانے مارشل پٹیان وزیر اعظم فرانس مقرر ہوئے جنھوں نے پچھلی لڑائی میں وردون پر جرمنوں کو شکست دی تھی۔ مگر اب قسمت کا پانسہ پلٹ چکا تھا جرمنوں کے برق دم حملوں کے سامنے اس مرتبہ اُن کی ہمت نے بالکل جواب دے دیا۔ نئی وزارت میں سب فوجی جنرل ہی جنرل تھے جو پہلے ہی سے ہمت ہار چکے تھے۔ غرض مارشل پٹیان نے جنگ کو فوری طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کر کے سپاہیانہ انداز سے جرمنی کو صلح کا پیغام بھیج دیا۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ فرانس کی گورنمنٹ برطانیہ سے اس بات کا مصمم وعدہ کر چکی تھی کہ کسی صورت میں بھی وہ برطانیہ سے علیحدہ ہو کر جرمنی سے صلح نہ کریگی۔ چنانچہ فرانسیسی وزرا نے حکومت برطانیہ سے اس وعدہ سے گلوخلاصی کی درخواست کی۔ مسٹر چرچل خود فرانس گئے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ فرانس نے لڑائی ختم کرنے کا قطعی تہیہ کر لیا ہے تو انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ صلح کا پیغام بھیجنے سے پہلے فرانس اپنے بحری بیڑہ کو انگلستان کے حوالہ کردے تاکہ جرمنی اُسے انگلستان کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ مگر وزرائے فرانس کچھ اس درجہ حواس باختہ ہو گئے تھے کہ اُن کو جرمنی کی من مانی شرائط قبول کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ اُنھوں اپنے حلیف برطانیہ کو ہٹلر سے لڑنے کے لئے بالکل اکیلا چھوڑ دیا۔ مگر یہ بات برطانیہ کے لئے ہمیشہ فخر کی رہے گی کہ مسٹر چرچل نے برطانیہ کی طرف سے

فرانس کی امداد کے لئے ایسی زبردست پیشکش کی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں شائد ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔ مسٹر چرچل نے فرانس اور برطانیہ دونوں کے لئے ایک مشترکہ و متحدہ حکومت قائم کرکے دونوں سلطنتوں کے مشترکہ ذرائع سے جنگ جاری رکھنے کی تجویز پیش کی اور فرانس کے تمام نقصانات پورے کرنے کی ذمہ داری بھی لے لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر مارشل پیتاں جنگ ختم کرنے کا تہیہ کرچکے تھے، اُنھوں نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔ اور جرمنی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے ہی میں اپنی گورنمنٹ اور اپنے ملک کی عافیت دیکھی۔ فرانسیسی سپاہ کی بہادری ضرب المثل ہے اہلِ فرانس دُنیا میں تہذیب و آزادی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ اِس لڑائی میں بھی فرانسیسیوں نے دادِ شجاعت دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن اُن کے سردار اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ جنھیں جرمنی کے نئے ہتھیاروں اور نئی تدبیروں کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میجنو لائن پر اُنھوں نے فضول اِس قدر روپیہ اور محنت صرف کی۔ پہلے کی طرح اِس دفعہ جرمنی نے بلجیم ہی سے فرانس پر حملہ کیا۔ اور اس سرحد پر دشمن کی مدافعت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اِدھر جنرل گملین اور اُن کے مشیروں سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ بلجیم کے ہتھیار ڈالنے کے بعد فرانسیسی فوج کو پیچھے ہٹا کر خود فرانس میں جرمنوں کے مقابلہ کا کوئی خیال نہ کیا گیا۔ اور جرمنی نے فرانسیسی سپاہ کو دم لینے کی مہلت نہ دی۔ فرانس کے تھکے ہوئے سپاہیوں کو کوئی کمک نہ پہنچی۔ اور جرمنی پے در پے تازہ دم فوجیں بھیجتا رہا۔ برطانیہ بھی فوج کے دس ڈویزن سے زیادہ فرانس نہ بھیج سکا۔ کیونکہ بلجیم میں جو سامان جنگ رہ گیا۔ اُس کی کمی پورا کرنے میں کئی ہفتے لگ گئے اور امداد کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ جرمنی نے بیس[2] لاکھ سے زائد فوج سے حملہ کیا تھا۔ اور جب جرمنی کا پلہ بھاری دیکھا تو اٹلی نے بھی فرانس اور انگلستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابھی تک اٹلی انگلستان کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکا بلکہ اُلٹے برطانیہ کی فوج نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے لیکن فرانس کے لئے اٹلی کا جنگ میں شامل ہونا اور بھی مضر ثابت ہوا۔

بہرحال فرانس اِس وقت جرمنی اور اٹلی دونوں کا دستِ نگر ہوگیا ہے۔ جن شرائط پر عارضی صلح ہوئی ہے اُن کو دیکھتے ہوئے فرانس کی آزادی کا نام لینا ہی فضول ہے۔ فی الحال فرانس کے دو تہائی سے زیادہ حصہ پر جرمنی کا قبضہ رہے گا۔ اس کی تمام فوج سے ہتھیار رکھوا لئے گئے ہیں۔ اس کے قلعے، بندرگاہیں صنعتی اور جنگی کارخانے سب پر جرمنوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ جرمنی نے فرانس کے بحری بیڑے کو اپنے قبضے میں لے لینے کی شرط بھی کی ہے۔ حالانکہ اُس کے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اس بیڑے کو برطانیہ کے خلاف استعمال نہ کیا جائیگا۔ لیکن بحری سُرنگوں کو صاف کرنے میں اُن سے مدد لینے کی اجازت لے لی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ فرانسیسی بیڑہ ہٹلر کے ہاتھ آگیا تو اُسے برطانیہ کے خلاف اس کو استعمال کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ یوں بھی دُنیا جانتی ہے کہ ہٹلر ضرورت کے وقت کسی بات کا پابند نہیں ہے۔ فرانسیسی بیڑہ کے متعلق اسوقت تک

صحت کے ساتھ کسی کو خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ لیکن فرانس کے بہت سے غیور معززین اور محب وطن لوگوں نے اُن ذلیل شرطوں کی علانیہ مخالفت کی ہے اور جنرل ڈی گالے ایک مشہور جرنیل نے لندن میں ایک قومی کمیٹی قائم کر کے آزاد خیال فرانسیسوں سے جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کی اپیل کی ہے۔ اکثر بیرونی مقبوضات فرانس نے بھی اس اپیل کی تائید کی ہے۔ مارشل پیتان نے ان مقبوضات کے گورنر جنرلوں کو معطل کر کے اُن کی جگہ دوسرے گورنر جنرل نامزد کئے ہیں۔ اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان کارروائیوں کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اور جنرل ڈی گالے کی کوششیں کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں۔ اور فرانسیسی مقبوضات کس حد تک لڑائی جاری رکھ سکتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ سلطنت برطانیہ آخر دم تک جرمنی کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کر چکی ہے مسٹر چرچل نے مکرر سہ کرر اعلان کیا ہے کہ خواہ کچھ ہو جرمنی کے تشدد کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے گا' اور ہوا' سمندر' اور زمین سب پر انتہائی ہمت و استقلال کے ساتھ جرمنی کا مقابلہ کیا جائے گا۔ جرمنی بھی خوب جانتا ہے کہ اصلی لڑائی باقی ہے اور جب تک برطانیہ کے دم میں دم ہے اس کا یہ خواب کہ جرمن قوم تمام دُنیا پر حاوی ہو کر رہے پُورا نہ ہوسکیگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت برطانیہ ہٹلر سے لڑنے کو اکیلا رہ گیا ہے اور اس کے لئے خطرہ بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ اِدھر بحیرہ روم میں اُس کیلئے غیر معمولی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُدھر فرانس کا تمام ساحل دشمن کے ہاتھ آگیا ہے۔ مگر وہ اکیلا سب طرف انتظام کر رہا ہے۔ اس وقت انگلستان کی حالت ایک قلعہ کی ہو گئی ہے جس کی حفاظت کے لئے پندرہ لاکھ مسلح فوج تیار ہے اور لاکھوں رضاکار سپاہی اس کے علاوہ ہیں۔ ہوائی فوج بھی اب بہت بڑی ترقی کر چکی ہے اور روائل ایرفورس (R.A.F.) کے ہوائی جہاز جرمنی کے اہم فوجی مقامات پر دن دہاڑے حملے کر رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ فرانس کے شمالی کنارہ کی طرف جنیوا سے لیکر ٹورس (TOURS.) تک اور شمال مغرب کی جانب ٹورس کی جنوب مغرب لائن سے اسپین کی سرحد تک کل علاقہ دشمن کے قبضہ میں ہے مگر برطانیہ کے ساتھ بھی اس کی وسیع سلطنت کی مجموعی قوت اور امریکہ کی ہمدردی ہے۔ برطانیہ نے ہندوستان کو پورے طور پر منظم کیا ہوتا تو آج ہٹلر کے مقابلے کیلئے اکیلا ہندوستان ہی کافی تھا۔ مگر گورنمنٹ ہند جنگ شروع ہونے کے پُورے ۹ مہینے بعد اپنے خواب غفلت سے بیدار ہوئی ہے اور مشکل سے تین سو جوانوں کو ہوائی جہاز رانی کی تربیت دینے اور فوج میں ایک لاکھ سپاہیوں کا اضافہ کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ کہتے ہیں مزید اضافہ کے لئے مزید سامان جنگ کی ضرورت ہے۔ جس کی تیاری کیلئے اب ذرا سرگرمی سے انتظامات ہو رہے ہیں۔ چنانچہ چار ہزار ہندوستانی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے کی فکر ہو رہی ہے اور انگریزوں سے بھی جبری خدمت لینے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ پارلیمنٹ نے ایک خاص ایکٹ پاس کر کے وائسرائے ہند کو غیر معمولی اختیارات دیدیے ہیں۔ لارڈ لنلتھگو نے شہری پہرہ دار بھرتی کرنے کی

اپیل کی ہے۔ جگہ جگہ جنگ کی امدادی کمیٹیاں قائم ہو رہی ہیں اور لوگوں سے مالی امداد کی درخواست کیجارہی ہے مگر یہ سب تدبیریں پورے طور پر اُسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب یہاں کی سیاسی گتھی سلجھ جائے۔

کانگریس نے اپنے آخری اجلاس میں جو اِس ماہ واردھا میں ہوا' ملک کی اندرونی حفاظت کی خاطر مہاتما گاندھی کی عدم تشدد کی پالسی سے آزادی حاصل کرلی ہے۔

وائسرائے نے ایک بار پھر مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح سے شملہ میں ملاقات کی ہے۔ اِن ملاقاتوں میں کیا بات چیت ہوئی عنقریب سب کو معلوم ہو جائے گی۔ مگر اس وقت ضرورت ہے کہ وائسرائے ہندوستانی رہنماؤں پر اپنے اعتمادِ کامل کا ثبوت دیں اور ملک کی حفاظت کا کام بالکل اُن کے ہاتھوں میں دیدیں۔ مرکز سے لیکر صوبجات تک میں قومی حکومتیں قائم ہوں اور تمام ہندوستان یک دل و یک جان ہو کر ہٹلر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائے۔

انگلستان چھوٹے ملکوں کی آزادی کا علمبردار ہے۔ مگر اس کی نیک نیتی کا اصلی ثبوت اگر کہیں مل سکتا تو ہندوستان ہی میں مل سکتا ہے۔ ہماری دلی تمنا اور دعا ہے کہ اسوقت برطانیہ اپنے روایتی بخل سے کام نہ لے بلکہ جس طرح ہو سکے ہندوستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے دے اور اُس کی اخلاقی اور امداد سے پورا فائدہ اُٹھائے۔

۳۰ جون

وطن

از لطیف انور گلانوری

ہندوستاں ہمارا خلد بریں ہے گویا — فطرت کی دلکشی کا حاصل یہیں ہے گویا
گنگ و جمن کی موجیں چھلکا رہی ہیں امرت — تشنہ لبوں سے کوثر بالکل قریں ہے گویا
ویرانۂ وطن میں آزاد پھر رہا ہوں — پھولوں کی تازگی سے دل خوش نہیں ہے گویا
جس سے چمک نہ اٹھیں خاکِ وطن کے ذرّے — وہ داغِ سجدہ ننگِ لوحِ جبیں ہے گویا
کھلنے لگی ہے مجھ پر اب درد کی حقیقت — ہر نغمہ سازِ دل کا جاں آفریں ہے گویا
چھالوں میں کوئی کانٹا کھٹکے تو مسکراؤں — منزل قریب تر ہے مجھ کو یقین ہے گویا

جس کو فلک ہمیشہ جھک جھک کے چومتا ہے
انور! مرے وطن کی وہ سرزمیں ہے گویا

The ZAMANA, JULY 1940. Regd. No. A 147

مرتبہ:۔ دیانراین نگم، بی۔ اے،

جلد ۷۵	جولائی سنہ ۱۹۴۰ء	نمبر ۱

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ عہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

ممالک غیر سے ۶ روپیہ ۱۲ آنے

نمونہ سات آنہ

فہرست مضامین زمانہ جلد ۷۵ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۴۰ء

تصاویر:- بلار (رنگین) حضرت آرزو لکھنوی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد مرحوم کشمیر کا ایک منظر (مہاراجہ شاد کی مصوری کا ایک نمونہ) عکس قطعہ قلمی مہاراجہ شاد مرحوم)

حصۂ نثر

ب

ب

حصۂ نظم

راجہ نول رائے وفا

از جناب سید رفیق مارہروی

زبان اپنی ہے خواہ یہ کہیئے کہ ہندوؤں کا کلام "خالی از فصاحت ہے" یا یہ کہ ہندوؤں کو اُردو لکھنا نہیں آتی لیکن واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ بہ اعتبار اُردو شاعری مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو اساتذہ کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اِس کی وجہ؟

منشی دیبی پرشاد اپنے تذکرے[1] میں یوں رقمطراز ہیں:-

"اتنا ضرور ہے کہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہماری قوم میں عُمدہ شاعروں کی تعداد کم ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ پچاس برس اول ہماری قوم کے لوگ معاش کی ضرورت سے اُردو کی بہ نسبت فارسی کو زیادہ پسند کرتے تھے اور اب انگریزی بہت پسند کرتے ہیں۔ پس اُردو کی شاعری جس قدر ان پچاس برسوں میں ہم لوگوں کے اندر مروج ہوئی گو کافی نہ تھی پر اسقدر تو ضرور تھی کہ پچاس برس اول جو مسلمانوں کا خیال ہندوؤں کی اُردو شاعری اور زبان دانی کی نسبت تھا وہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یا تو ایک دن وہ تھا کہ انشاء اللہ خاں نے اپنی کتاب میں ہندوؤں کے کلام کو خالی از فصاحت لکھا۔ ایک دن ایسا آیا کہ مرزا غالب جیسے اُستاد مسلم الثبوت نے پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کو بلاغت کہا......"

یہ تحریر ۱۸۸۵ء کی ہے۔ پچاس برس اگر پیچھے ہٹا جائے تو اُس زمانہ کے متعلق منشی دیبی پرشاد کا یہ قول ہے کہ "ہندوؤں کا اُردو کی نسبت فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا" اُس زمانہ سے اگر پچاس سال اور گھٹائے جائیں تو گویا منشی جی مذکور کے بیان کے مطابق ہندو شعراء کی تعداد نہ ہونے کے برابر ملیگی۔ یہ بیان دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب مذکور کی معلومات محدود تھیں۔ واقعات گواہ ہیں کہ اُردو زبان نے جس روز جنم لیا اُس کا سنگ بنیاد رکھنے میں ہندو برابر کے شریک تھے، اُردو کے نام لیواؤں میں ہندوؤں کو ہمیشہ اکثریت حاصل رہی اور یہ اکثریت اُردو کی جان پر صدہا قاتلانہ حملوں کے باوجود کسی نہ کسی صورت اب تک برقرار ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ ایسی حالت میں اُردو شاعری میں ہندو اساتذہ کی تعداد کم کیوں ہے؟

---

[1] تذکرہ شعراء ہنود جلد دوم صفحہ ۲

واضح ہو کہ ہندوؤں نے شاعری کو کبھی اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ وہ ہمہ تن اس کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوئے تمام دُنیا کے جھگڑوں اور ٹنٹوں کے ساتھ ذوقِ شعر بھی اُن کا ایک مشغلہ رہا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ باعتبار اُردو شعر و شاعری ہندو قوم ہمیشہ غیر مستقل مزاج رہی، ملک میں فارسی شاعری کا رواج ہوا' ہندو پیش پیش رہے۔ سرزمین کشمیر سے ایسے ایسے فارسی شعرا نمودار ہوئے کہ ہندوستان' ایران نظر آنے لگا۔ فارسی کو ہٹا کر اُردو نے قدم جمائے تو ہندوؤں نے جہاں اُس کی تربیت و تنظیم میں زبردست حصہ لیا' وہیں فارسی سے منھ موڑ کر اُردو شاعری میں بھی کمال دکھائے۔ انگریزی حکومت نے اپنی زبان کو رواج دیا تو ہندو ادھر جھک پڑے' اور اب جبکہ بعض برادرانِ ملک ہندی پرچار میں مصروف ہیں۔ اِس قوم کا بڑا حصہ اپنی بنائی ہوئی ملکی زبان اُردو سے منھ موڑ کر ادھر متوجہ ہو گیا ہے۔ ہندو قوم کی اِس غیر مستقل مزاجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر زمانہ میں اُردو زبان کے صاحبِ کمال شاعر تو پیدا ہوئے لیکن اُن کی توجہات علم و زبان کے مختلف شعبوں پر تقسیم رہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہرت نے اُنکو نہیں اپنایا اور وہ قعرِ گمنامی میں پڑ گئے۔ زمانہ کا یہ ہمیشہ دستور رہا ہے کہ جس شخص نے خود شہرت نہیں چاہی، اُسکو زمانہ بھی بھول گیا۔ اس عام اصول کے پیشِ نظر معمولی شعرا کے ساتھ اگر بعض اساتذہ بھی قعرِ گمنامی میں پڑ گئے تو پھر اب یہ الزام کس کے سر ڈالا جائے۔ اِس بحث کو یہیں ختم کر کے اب دیکھنا یہ ہے کہ منشی دیبی پرشاد کے مقرر کئے ہوئے زمانہ میں جب کہ اُن کے قول کے مطابق ہندو شعرا کا تمام تر رجحان فارسی زبان کی طرف تھا۔ اس قوم میں اُردو زبان کے بھی شاعر گذرے ہیں یا نہیں۔ اس خیال کی تائید میں بہت کچھ مسالہ تذکروں میں ملتا ہے۔ اُس زمانہ میں نہ صرف یہ کہ معمولی اُردو شعرا کی تعداد کافی تھی۔ بلکہ متعدد ہندو اہلِ قلم اُستادانہ شان میں نظر آتے ہیں۔ فرداً فرداً ذکر تو پھر کسی صحبت میں ملاحظہ کیجئے گا۔ اس وقت صرف ایک شاعر سے متعارف کرتا ہوں۔

۱۷۱۲ء میں اورنگ زیب کا فرزند معظم شاہ (بہادر شاہ اوّل) فوت ہوا۔ اُس کے لڑکے فرخ سیر نے عظیم آباد میں ایک سیدزادے کی حوصلہ افزائی سے تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ خاں کی کمک پر دہلی کا رُخ کیا جہاں دارا سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس کو شکست دیکر فرخ سیر تختِ دہلی پر فائز ہوا۔ مغل حکومت متزلزل ہونا شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اس خاندان کی علمی سرپرستیاں بدستور تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ فرخ سیر کے درباری شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل، نعمت خاں عالی، علامہ عبدالجلیل بلگرامی اور فائی جیسے مسلمان علما و فضلا کیساتھ متعدد ہندو صاحبانِ کمال بھی موجود رہتے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ کے شعرا میں بھوشن اور چنتامنی کو اس وقت بھی دربار میں بدستورِ سابق عزت حاصل تھی اور وہ فرخ سیر کی علم نوازیوں سے مالامال رہا کرتے تھے۔[1] بادشاہ کی شادی راجہ اجیت سنگھ کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ تمام علما نے متفق ہو کر اظہارِ شادمانی کیا۔

---

[1] کبتا کومدی جلد اول صفحہ ۳۶۰ یا ہسٹری آف ہندی لٹریچر از ایف۔ ای۔ کی صفحہ ۴۶

علامہ جلیل بلگرامی تو اس مبارک تقریب اور جدید ہندو مسلم رشتے سے اتنے خوش ہوئے کہ ایک مثنوی تصنیف کر ڈالی، بادشاہ کے حضور پیش کی۔ مثنوی فارسی میں ہے لیکن جس طرح دو ہندی قوموں میں رشتہ جڑا تھا اسی طرح علامہ نے فارسی زبان میں ہندی زبان کے نگینے بھی جیسیاں کر دئے تھے۔ ٹھیک اسی زمانۂ اخوت و مساوات میں چکوا خاندان کا ایک سپوت اٹاوہ کی سرزمین سے اٹھا' نام نول رائے' ذات کا سکسینہ کائستھ، باپ دادا اٹاوہ کے موروثی قانون گو تھے۔ نول رائے کا ابتدائی زمانہ راجہ رتن چند کے پاس گذرا۔ راجہ رتن چند ذات کے بنئے تھے۔ سید عبداللہ خاں صوبہ دار الہ آباد کے یہاں بہ طور دیوان فائز تھے۔ سید عبداللہ نے جب "بادشاہ گر" کی حیثیت پائی، تو رتن چند بھی راجہ کہلائے اور پھر جو عروج پایا اُس کا حال تواریخ میں دیکھئے[1]۔ نول رائے نے انھیں کے ذریعہ عروج پایا۔ اپنی خوش لیاقتی کی بنا پر درجۂ امارت تک پہونچے اور یہ بھی راجہ کہلائے۔

احمد شاہ کے عہد حکومت (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) میں جب عبدالمنصور خاں صفدر جنگ کو اودھ اور الہ آباد کی صوبہ داری مرحمت ہوئی۔ راجہ نول رائے اُن کی نیابت میں دونوں صوبوں کی حکومت پر سرفراز ہوئے، درجۂ امارت کے حصول کے بعد راجہ نے بعض لوگوں پر مظالم بھی کئے جن کی داستانیں تذکروں میں دیکھ کر محتاط لوگ اب بھی جھرجھری لے لیا کرتے ہیں لیکن منصف اور آزاد خیال افراد سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ ان روایات کے ساتھ ہی صفدر جنگ کی اُن نوازشات کا حال بھی کتابوں میں ملتا ہے جو اُس نے ہمہ وقت راجہ پر مبذول رکھیں۔ راجہ جہاں ایک بہادر سپہ سالار تھا' وہاں بے بدل شاعر بھی تھا' سیاسی و ملکی واقعات و حالات سے مجبور ہو کر اگر اُس نے کسی پر مظالم روا رکھے تو اس سے اس کے علمی و ادبی درجے پر حرف نہیں آسکتا' ایک منصف مزاج مسلمان تذکرہ نویس راجہ کے متعلق کیا خوب لکھتا ہے:-

"مقبولِ خاطر اربابِ صفا لالہ نول رائے متخلص بہ وفا خوانیست نوخاستہ بہ جمیع صفات آراستہ و پیراستہ جدتِ ذہن وجودتِ فہم اصابت رائے و لطافتِ مزاج بہ مرتبۂ اتم دارد"

یہ الفاظ ہیں محمد قیام الدین قائم کے جو تذکرۂ "مخزن نکات" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں لکھا گیا تھا راجہ کا درجہ شاعری میں اساتذہ کے مدارج سے متوسل ہے وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر کرتے تھے، ہر دو زبان کے دیوان ان کی یادگار ہیں۔ اُن کے بقیہ حالاتِ زندگی سُننے سے پہلے اُن کے کچھ اُردو اشعار سے لطف اندوز ہولیجئے[2]

ہوتے تو دل، شیخ گرفتار ہو گیا   اب پھر نکلنا زلف سے دشوار ہو گیا

---

[1] امرائے ہنود صفحہ ۲۴۴، [2] یہ اشعار مختلف تذکروں سے لئے گئے ہیں۔ ایک دوسرے تذکرے سے مقابلہ بھی کر لیا ہے بایں ہمہ بعض اشعار میں فرق محسوس ہوتا ہے، میں نے اس فرق کو بجنسہٖ رہنے دیا ہے۔

دینا تو دل نہ آپ کو مقصود تھا ولیک جب مل گئی یہ آنکھ میں ناچار ہو گیا
سمجھے صفائے شست تری چشم کا وہی جس کے جگر سے تیر نگہ پار ہو گیا
ایسے مزاج بھی کہیں دیکھے ہیں اے وفا کیا بات تھی جو رات وہ بیزار ہو گیا

عارض پہ تمھارے یہ پسینا ہیرے کا ہے لعل پر نگینا
غم میں بھی اگر رہا سلامت پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

ہے جلوہ گر وہ ہم میں پر آلودگی سے دور جس طرح عکس آب میں ہو ماہتاب کا

اُس کو منظوریاں سے جانا تھا گریہ میرا فقط بہانا تھا
دل نہ کرنا تھا اس طرح سے خراب عاقبت وہ ترا ٹھکانا تھا

راضی وہ ہو کے رات سہج میں بچل گیا عنقا پھنسا تھا دام میں لیکن نکل گیا
اتنا نہ تنگ ہو مرے رہنے سے یاں کہ میں یہ ہی نہ شوخ گر نہ گیا آج کل گیا

شعلہ زن ہے ہمیشہ داغ اپنا مجھ نہیں جانتا چراغ اپنا
یاں تک از خویش رفتہ ہوں کہ مدام آپ کرتا ہوں میں سراغ اپنا

اپنی غرض کو ہم بھی سبھی کچھ سہیں گے لیک ہوتی ہے گالیوں سے تمھاری زباں خراب

ہووے گا دل سے محو غم یار کب تلک کیوں ہمنشیں یہ جائے گا آزار کب تلک

بس کہ اپنے انقلاب بخت سے ڈرتے ہیں ہم بستر گل پر بھی لرزاں ہی قدم رکھتے ہیں ہم
کل کا وعدہ گر کیا بھی اُن سے اے محرم تو کیا یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

بیچے ہے یک نگاہ پہ دل کے تئیں وفا لینا ہو گر تمھیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

اپنے ہی چشم کے تئیں تاب نظر نہیں ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں
حسن عمل پہ اپنے نہ پھول اسقدر کہ شیخ واں کے معاملے سے کسی کو خبر نہیں

ساتھ تجھ سے کے اگر مہر و وفا کی ہم نے عفو کر عفو کہ اے شوخ خطا کی ہم نے
عقدہ پر عقدہ کئے چرخ نے مضبوط اگر اک گرہ رشتۂ مقصود سے وا کی ہم نے
ڈر ہے اُسوقت کا ظالم کہ لہو مل منہ سے جس گھڑی رو بہ فلک ہو کے دعا کی ہم نے
درد نے دل کی سر موئے تفاوت نہ کیا اپنی سی کتنی ہی دار و دوا کی ہم نے

دُکھ نہ دے اسقدر وفا کے تئیں عاقبت وہ بھی جان رکھتا ہے

دل تو کہے ہے جی میں گرفتار کیجئے یعنی کسی صنم کے تئیں پیار کیجئے

گر مانگتا ہے جی کے تئیں دیجئے وفا | کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجئے
ہر دم سرد جو دل ہو نہ سکے گرم فغاں | شغل تھوڑا بھی بھلا ہوئے ہے بیکاری سے
کوچۂ عشق کی ہے راہ خطرناک وفا | جو قدم یاں تو رکھے یار تو ہشیاری سے
کس گل تازہ نے اس باغ میں کی جلوہ گری | ہم زر داغ سے جس کے نہ خریدار ہوئے
جوں اشک نہ پھر اُٹھا زمیں سے | یارب میں گرا ہوں کس نظر سے
آنے کا مرے وہ سن کے چرچا | نکلا نہ تمام روز گھر سے

منشی دیبی پرشاد نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ راجہ نول رائے وفا نے اُردو فارسی کے دو دیوان یادگار چھوڑے تھے، افسوس مجھے راجہ کے دواوین دیکھنے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی، بہرحال اُن کا جسقدر کلام نظر سے گذرا، بیتاب اور تڑپائے بغیر نہ رکھ سکا، میری ذاتی عقیدت اگر کوئی معنی رکھ سکتی ہے تو کہنے دیجئے کہ راجہ نول رائے اپنے وقت کا اُستاد تھا۔ اس کا کلام اس کے ہمعصر شعرار سے ملا لیجئے۔ اسے بہت بلند پائینگے۔ یہ وہ رنگ ہے جو آپ کو صرف میر کے یہاں مل سکتا ہے اور بس۔

راجہ کا ذکر بحیثیت، شاعر تمام قدیم تذکروں میں ملتا ہے اور نہایت اچھے الفاظ اُس کے حق میں استعمال ہوئے ہیں لیکن کلام کا انتخاب "مخزن نکات" کے علاوہ تمام تذکروں میں دو دو تین تین شعروں سے زیادہ نہیں، بہرحال جس قدر بھی سا مختلف کتابوں سے مل سکتا ہے اُس کو سامنے رکھکر وفا کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس رسالہ زمانہ کا دامن، ادب ہمیشہ اختصار کا خواہاں نظر آتا ہے۔ اسلئے اس بے بدل شاعر اور بے نظیر سپہ سالار کی زندگی کے آخری زمانہ سے متعلق بعض ضروری باتیں عرض کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

سلطنت مغلیہ کے تنزل کے زمانہ میں صوبہ الہ آباد اور اودھ کے قرب وجوار میں پٹھانوں کا بڑا زور تھا۔ اُن کی دو زبردست ریاستیں روہیلکھنڈ اور فرخ آباد میں تھیں اور ان کا اقتدار صفدر جنگ کے لئے خدشہ کا باعث تھا، وہ ہمیشہ اُن کی بربادی کے منصوبے کیا کرتا تھا۔ روہیلکھنڈ کے نواب علی محمد خاں کے زمانہ تک کوئی صورت کامیابی کی نہ ہوئی۔ اس کے فوت ہوتے ہی صفدر جنگ کو موقع مل گیا۔ اُس نے اور راجہ نول رائے نے جوڑ توڑ کر کے مرحوم نواب کے بیٹے سعد اللہ خاں کو فرخ آباد کے نواب قائم خاں سے بھڑا دیا۔ اس جنگ میں قائم خاں مارا گیا۔ صفدر جنگ فوراً اُس کے ملک پر نول رائے کو لے چڑھ دوڑا بیوی بچوں کو گرفتار کیا اور ریاست پر قابض ہو گیا۔ محمد خاں کی زوجہ (بی بی صاحبہ) راجہ نول رائے کے سپرد ہوئیں، قنوج لیجا کر موتی محل میں اُن کو نظر بند کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد نواب محمد خاں بنگش کے ایک وفادار و نمک حلال صاحب رائے کائستھ نے جوڑ توڑ لگا کر بی بی صاحبہ کو راجہ کی قید سے رہا کرا دیا۔ پٹھانوں میں جو انتقام پہلے سے ہی موجزن تھا،

بی بی صاحبہ کے آزاد ہوتے ہی سب متفق ہوئے' احمد خاں کی سرکردگی میں (۱۱۶۳ھ) فرخ آباد سے پٹھان راجہ نول رائے کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے' ادھر قنوج سے راجہ بھی روانہ ہوئے۔ خداگنج کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ صفدر جنگ کو جب اطلاع ہوئی اُس نے راجہ کو لکھا کہ روانہ ہوتا ہوں میرے آنے تک جنگ شروع نہ ہو' راجہ یہ خبر پاکر مطمئن ہوئے' پڑاؤ کے اردگرد خندقیں کھدوائیں اور صفدر جنگ کا انتظار کرنے لگے' پٹھانوں نے موقع کو غنیمت جانا اور ۹ رمضان ۱۱۶۳ھ کی شب کو یکایک راجہ کی فوج پر حملہ کردیا۔ اس جنگ میں سادات بارہہ نے حقِ نمک ادا کردیا' ایسا لڑے کہ پٹھانوں کے چھکّے چھڑا دئے۔ پٹھان بھی جان پر کھیل کر آئے تھے۔ ایسا رن پڑا کہ راجہ نول رائے کی تمام تدابیر بیکار گئیں۔ پٹھانوں کو فتح ہوئی اور راجہ عین لڑائی میں ایک پٹھان کی گولی کا نشانہ بنے'

نواب احمد خاں فتحیاب ہوکر فرخ آباد واپس ہوئے' راجہ نول رائے جیسے بہادر سپہ سالار کو زیر کیا تھا' خوب شہرت ہوئی' جشن کے موقع پر موضع عطائی پور پرگنہ قائم گنج کے ایک بھاٹ مسمی بھبوتی نے انعام کی خواہش میں ایک نظم کہہ کر نواب کی خدمت میں گذاری۔ ایک مستقل موضع انعام میں عطا ہوا۔ بھبوتی کی نظم آپ بھی ملاحظہ کیجئے' نواب کی خوشامد میں راجہ کو کن الفاظ سے یاد کرتا ہے ؎

عجب وہ صاحبِ قدرت ہے جس نے جگ سنبھارا ہے　　خدا ہی پاک مولا ہے وہی پروردگارا ہے

کھڑا باندھا کمر کس کر غنیم اوپر لئے لشکر　　لگے اُس کے عجب چکّر غروری کا خمارا ہے

نول سے مرد غازی کو نہ پوچھی بات پاجی کو　　نول سے مرد غازی کو پہنچ گولی سے مارا ہے

نول ہووے مکھ موڑا کہیں ہاتھی کہیں گھوڑا　　قبائل بھی کہیں چھوڑا نہ سر جہرا سنبھارا ہے

چلیں توپیں دھڑادھڑ سے رہکلے بھی پڑاپڑ سے　　شترنالیں پڑاپڑ سے تہور کا پہاڑا ہے

چلیں تیریں سناسن سے چلیں گولی سنامن سے　　کٹیں مکّر جھناجھن سے بڑی تلوار دھارا ہے

بھبوتی نام ہے میرا' عطائی پور میں ڈیرا
یہی ہے منّو کا کھیڑا' تلے گنگا کنارا ہے

راجہ نول رائے کی شکست پر جہاں ایک خوشامدی بھاٹ نے یہ گیت تصنیف کیا' وہاں راجہ کی اعلیٰ سپاہیانہ مرتبت اور علمی و ادبی قابلیت سے متاثر ہوکر ایک مسلمان اہلِ قلم نے تاریخ وفات نکالی اور نہایت بے تعصبی سے نول رائے کو مذہبی شہید کا رتبہ دے کر حورانِ بہشت سے ہمکنار کردیا۔ ملاحظہ ہو ؎

رواں کرد خواہ یلاں جنگجو　　ادا کرد حقِ نمک موبمو

زریزداں رسیدند حور و ملک　　بیارو بردا اے نول سرخرد

۱۱۶۳ھ

ادبِ لطیف

از چودھری فدا محمد صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو

آجکل ہم ایک نئی صنفِ سخن سے آشنا ہو رہے ہیں جسے عرفِ عام میں "ادبِ لطیف" کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت ٹیگور کے بلند تخیلات کا پرتو ہے جس نے اُردو علم و ادب پر اپنا اثر دکھانا شروع کیا ہے۔ ٹیگور کے علاوہ اس ضمن میں مغربی ممالک کی ادبیات کے بعض تراجم بھی قابلِ قدر رہنمائی کا باعث ہوئے ہیں۔

ابھی تک یہ صنفِ سخن بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ کیونکہ ابھی ہمارے اہلِ قلم حضرات اس طرز کو اپنے تخیلات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں پُورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ چنانچہ اکثر غیر ملکی خیالات ہی کو اپنی زبان میں ادا کرنے کی کوشش پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو بہت فائدہ مند نہیں ہے۔ درحقیقت "ادبِ لطیف" اظہارِ جذبات کا ایک بہترین اسلوبِ بیان ہے۔ اس لئے صرف غیر ملکی افکار اور جذبات کا ترجمہ کر دینے سے انمیں طبعزاد جذبات کی ندرت و حلاوت پیدا نہیں ہو سکتی اور یہ طریقہ علم و ادب کے فروغ کے لئے کچھ زیادہ ممد و معاون نہیں ہو سکتا ہے۔

ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات صرف ملکی فضاؤں میں پرورش پاتے ہیں۔ اسلئے اظہارِ جذبات کے لئے اپنے ماحول سے جس قدر قریب تر موضوعات کو منتخب کیا جائے گا۔ ان کے لکھنے میں اتنی ہی آسانی اور سہولت ہوگی۔ اور ان میں اتنی کشش ہوگی کہ وہ ہماری توجہ اپنی طرف منعطف کر سکیں۔

کبھی کبھی غیر ملکی تراجم بھی ہمارے احساسات کی نشو و نما کے لئے کافی مسالہ پیش کر دیتے ہیں۔ مگر محض تراجم پر اکتفا کرنا کسی صورت میں قابلِ اطمینان نہیں ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے ترجموں کی بہتات نے "ادبِ لطیف" کی اصلی صورت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ بعض ترجمے تو اسقدر روکھے اور پھیکے غیر مانوس ہوتے ہیں کہ اُن کا پورا مفہوم واضح ہی نہیں ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے پنجاب کا "ادبِ لطیف" بعض اہل الرائے اصحاب کی نظروں میں ایک میکانکی چیز ہے۔ چنانچہ ادیبوں نے اُس پر پھبتیاں اُڑانی شروع کر دی ہیں۔ کیونکہ وہ اس طرز کو معیوب اور ادبی ترقیوں کے لئے ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

اس لئے میں تمام اہلِ قلم احباب کی خدمت میں پھر عرض کروں گا کہ تراجم صرف ایسے غیر ملکی مضامین کے

رکئے جائیں، جنمیں خیالات کی ندرت کے علاوہ ہمارے جذبات کو پھلنے اور پھولنے کی ایک نئی راہ مل سکے۔ ورنہ اس تضیعِ اوقات سے پرہیز ہی بہتر ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی اصلی زبان میں تو قابلِ قدر ہوتی ہیں۔ لیکن ترجمہ میں اُن کا اصلی لطف باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ میری رائے میں تو ہمیں عوام کو اپنے تخیلات سے مرعوب کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔ میں نے "ادبِ لطیف" کے بہت سے ایسے نمونے دیکھے ہیں جو خود قابلِ توجہ نہ تھے لیکن مترجم صاحب نے اُن کے اختتام پر ترجمہ از بنگالی، انگریزی، فرانسیسی وغیرہ لکھ کر ناظرین پر اپنی علمی وسعت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے اصحاب عموماً معترضین کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ ان میں "شئے لطیف" کی کمی ہے اور وہ ایسے بلند خیالات کو سمجھنے کے اہل ہی نہیں۔

درحقیقت مروجہ طرز کا "ادبِ لطیف" نثر کی کوئی خاص قسم نہیں ہے بلکہ یہ ایک شاعرانہ طرزِ بیان ہے جسمیں قافیہ ردیف کے قیود سے آزاد ہو کر اہلِ قلم کو اپنے ماحول کے قریب تر رہ کر اپنے جذبات کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے۔ شعر درحقیقت اپنے شاعر کے دلی جذبات کو خوبصورت الفاظ کے جامے میں پیش کرتا ہے۔ لیکن اسلاف کی عائد کردہ پابندیوں کی وجہ سے اشعار میں جذبات کی صحیح ترجمانی نسبتاً مشکل ہوتی ہے اس میں وزن کی ترتیب کے بعد ہمیں قافیہ کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور پھر اُسے ردیف کے ساتھ ملانے کے لئے دماغ کو ایک طرح کی اُلجھن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اتنی پابندیوں کے ساتھ محدود الفاظ کے دائرہ میں بہترین خیالات کا قلمبند کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ کیونکہ کسی اچھوتے خیال کو پوری طرح قافیہ اور ردیف کی پابندیوں کے ساتھ اپنی اصلی صورت میں پیش کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم کوئی نئی راہ نکالیں۔ جس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہ ہو۔ یہی "ادبِ لطیف" اور شاعری کی جان ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں اظہارِ تخیل کے لئے ہمیں بے حد اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ہم ان بندھنوں سے آزاد ہو کر اپنا خیال سادہ الفاظ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں پیش کریں تو ہم اس کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح خامہ فرسائی کر سکتے ہیں۔ اس نوع میں اتنی وسعت ہے کہ ہم ہر موضوع پر تھوڑا بہت لکھ سکتے ہیں اور بالخصوص اس کے لئے وہ موضوع بہتر ہیں جن پر اظہارِ خیال کے لئے انسانی جذبات و احساسات کے نازک ترین جزئیات سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً عشق و محبت، تصوف، حُبِ وطن اور مناظرِ قدرت پر شرح و بسط کے ساتھ خیال آرائی کی جا سکتی ہے۔ اور ہم ایک خیال کو پیش کر کے اسمیں ہر طرح جدت پیدا کر کے صنفِ شاعری کے لئے نئی راہیں کھول سکتے ہیں۔

کسی موضوع یا تخیل کو ہم اس وقت تک "ادبِ لطیف" کا نام نہیں دے سکتے جب تک اسے پڑھنے کے بعد ہمارا دماغ اس کیف سے متاثر نہ ہو جو ایک نئے اور اچھوتے خیال کے پڑھنے سے ہمارے دل و دماغ پر

طاری ہو جاتا ہے۔ جس مضمون میں تخیل کی فراوانی نہ ہو اس کا اس صنف میں شمار ایک غلطی ہے۔ شاعری کی طرح اس پر ہر کس و ناکس قلم نہیں اُٹھا سکتا۔ بلکہ وہی اس راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے جس کے دل و دماغ کو مبدار فیاض نے لطیف احساسات سے آشنا کیا ہو۔ ممکن ہے کہ ایک صاحب علم اپنے علوم اور وسعت الفاظ کی بنا پر چند شعر موزوں کر دے حالانکہ وہ جذبات کی دُنیا سے نا آشنا ہے۔ مگر اس صنف سخن میں ایسے ماہرین زبان ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ اس کی بُنیاد سراسر جذبات پر قائم ہے اور ان کا نقدان اس طرز پر قلم اُٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

ادب لطیف میں وسعت تخیل کے ساتھ اس کے اظہار کے وسائل کی طرف ہمارا دماغ منتقل ہو گا۔ اس کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ صنف سُخن کی جان سادگی الفاظ ہے۔ اس صنف میں ثقیل الفاظ کی بہتات تو درکنار ایک ایسا لفظ بھی اسے اپنے معراج سے گرا دیتا ہے۔ فی الحقیقت فطری جذبات کو لکھتے وقت ہمیں فطرت کے سب سے زیادہ محبوب کرشمے یعنی "سادگی" کا ہی مرہون منت ہونا چاہئیے۔ اس کے ساتھ کسی خیال کو ہم جسقدر الفاظ میں چاہیں ادا کر سکتے ہیں۔ مگر اختصار اس نوع سُخن کی خاص صفت ہے۔ البتہ ہم طویل لمبے مضامین بھی لکھ سکتے ہیں مگر اس کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ شروع سے آخر تک قلم نئے تخیلات کے شگوفے کھلاتا رہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے لئے جو الفاظ تلاش کئے جائیں، اُنمیں ہم آہنگی اور یکسانیت ہو۔

مسافر

اُس کا چہرہ گرد آلود تھا۔
سفر کی کوفت سے اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
اُس کا لباس غلیظ اور بوسیدہ تھا۔
اُس نے مجھے جھک کر سلام کیا
مَیں نے جذبات تفاخر کے ماتحت کہا "کیا چاہتے ہو؟"
"میں مسافر ہوں"
"برسوں سے یونہی راستہ طے کئے جاتا ہوں"
"راہ میں ملنے والے آدمی کو سلام کرنا میری عادت ثانیہ بن چکی ہے"
"مجھے کچھ نہیں چاہئیے"
یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔
مَیں متحیر، خاموش، کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
یہ مسافر مجھ سے زیادہ شریف ہے۔
جو اپنی منزل کی طرف بڑھے جاتا ہے۔
جو اپنی راہ کی صعوبات اور آفات سے نہیں گھبراتا اور
جو لوگوں کو بے لوث سلام کرتا ہے۔
آہ نمایش اور نمود نے
ہمیں حقیقت سے کس قدر بعید کر دیا ہے۔
ہم سب سفر حیات میں مصروف ہیں۔
مگر منزل سے غافل شرافت سے عاری اور انسانیت
سے محروم۔
دُور افق مغرب میں سُورج غروب ہو رہا تھا۔
مگر مسافر کا سایہ آگے ہی آگے بڑھتا نظر آتا تھا۔
خدا جانے وہ اپنی منزل پر پہونچا یا نہیں۔
مگر اُس نے میرے غرور کو شکست ضرور دی۔

کسی کی یاد

(از حضرت بسملؔ شمس آبادی)

نمودِ صبح جب دلکش حسین منظر دکھاتی ہے
جہاں میں رقص کرتی جب شعاعِ مہر آتی ہے
چمن میں عندلیبِ خوش بیاں نغمے سناتی ہے
صبا پھولوں کو شاخِ سبز پر جھولا جھلاتی ہے
نسیمِ صبح جب خوابیدہ کلیوں کو جگاتی ہے
مجھے کیا جانے کیوں اُس دم تمھاری یاد آتی ہے

شفق کی سرخیاں جس وقت چھا جاتی ہیں دُنیا پر
شعاعِ آخریں کا عکس جب پڑتا ہے دریا پر
غضب کا رنگ ہوتا ہے عروسِ شامِ صحرا پر
کمالِ حسن ہوتا ہے فلک کے روئے زیبا پر
سیاہی شام کی جب دل کی گھبراہٹ بڑھاتی ہے
مجھے کیا جانے کیوں اُس دم تمھاری یاد آتی ہے

رُبابِ کائناتِ ہوش جب خاموش ہوتا ہے
شبابِ ظلمتِ شب، میکدہ بردوش ہوتا ہے
زمانہ نیند کا مارا ہوا بیہوش ہوتا ہے
جہاں کا ذرّہ ذرّہ خواب میں مدہوش ہوتا ہے
شبِ تاریک جب تاروں کی ضو سے جگمگاتی ہے
مجھے کیا جانے کیوں اُس دم تمھاری یاد آتی ہے

دیوان حافظؒ کا ایک بولتا ہوا نسخہ

از حضرت وصل بلگرامی

آپ کو آج ہم دیوان حافظؒ کے ایک خاص نسخے کا حال سُنانا چاہتے ہیں۔ یہ نسخہ شہنشاہ ہمایوں اور جہانگیر کے پاس رہا۔ اور اب پٹنہ میں خدا بخش خاں لائبریری میں موجود ہے[1]۔ غالباً نویں صدی ہجری میں اس کو کسی بہترین خوشنویس نے نہایت پختہ اور نستعلیق خط میں لکھا ہے۔ اسمیں چار سو دو صفحات ہیں۔ بعض صفحوں کے حاشیوں پر ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں ہیں جو اُنھوں نے فال نکالنے کے بعد لکھی ہیں۔ اسمیں یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں وقت کس لئے فال دیکھی گئی اور اُس کا کیا نتیجہ ہوا؟ یہ نسخہ سلطان حسین بائی قرا، میمنت خاں، محمد باقر، محافظ خاں، عبداللہ چلپی جیسے مشہور کتابداروں کی تحویل میں رہا۔ اس کے آخر میں سادے صفحوں پر ان کتابداروں کے دستخط اور مُہریں بھی موجود ہیں۔

یہ دیوان جب پٹنہ لائبریری میں پہونچا تو اُس کی بڑی قدر کی گئی۔ لائبریری کے منتظمین نے اس کی ورق گردانی کے بعد دیکھا کہ جلد بنانیوالے نے اس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اس کے حاشیوں کی ضروری ضروری عبارت جو ہمایوں اور جہانگیر کے قلم کی لکھی ہوئی تھی بعض بعض جگہ سے ترش گئی ہے۔ کچھ حرف اور کچھ لفظ غائب ہیں۔ لائبریری والوں نے بڑی کاوش سے اِس نقص کو دُور کیا، عبارت کو پُورا کیا اور واقعات کو تاریخ سے مطابق کر دیا۔ جس سے اب یہ اپنی اصلی حالت سے زیادہ وقیع اور بیش بہا ہو گیا۔

فال نکالنے کا طریقہ دُنیا میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ یونان والے ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی سے فال نکالا کرتے تھے، اسی طرح قدیم رومیوں کے استعمال میں ورجل کے کارنامے تھے۔ عرب میں بھی پُرانے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ چڑیوں کے اُڑنے اور اُن کی آوازوں سے فال لیتے تھے۔ لیکن جو شہرت دیوان حافظؒ نے اس سلسلے میں حاصل کی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اب بھی مسلمان اپنے دل کو بہلانے کیلئے کبھی قرآن شریف، کبھی مثنوی مولانا رومؒ اور کبھی دیوان حافظؒ سے فال نکالتے ہیں۔ اسلام کی بدولت عرب سے تفاؤل کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا لیکن دیوان حافظؒ نے ان ممنوعات کو بُھلا دیا۔

---

[1] اس کو مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور نے اپنی جدی املاک سے اس لائبریری کو تحفۃً دیا ہے۔

خواجہ حافظؒ کو حضرت جامیؒ ایسے بزرگ نے لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کے لقب سے یاد کیا ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں ؎

مردان زخاک ہم خبر آسماں دہند فالِ کلامِ حافظؒ شیراز کن لحاظ

یعنی مرنے کے بعد بھی آسمان کی خبر دیتے ہیں حافظؒ کے کلام کی فال کا لحاظ کر

انھیں باتوں سے خواجہ حافظؒ کی نسبت خیال کرلیا گیا ہے کہ وہ غیب کی زبان ہیں اور پوشیدہ رازوں کو بتاتے ہیں

قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ دیوان حافظؒ سے فال نکالنے کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں خواجہ صاحب ایسے شعر کہتے تھے جن کو لوگ محض تفریح کے طور پر سنتے اور تعریفیں کرکر کے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اُن کو محسوس ہوا کہ لوگ تعریف نہیں کرتے ہیں بلکہ بناتے ہیں۔ جس کا اُن کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ یہ باباکوہی کے مزار پر گئے، اور خوب روئے۔ اتفاقاً آنکھ لگ گئی، خواب میں دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے اُن کو ایک لقمہ کھلا دیا۔ جس سے تمام علوم کے دروازے اُن پر کھل گئے۔ صبح اٹھتے ہی غزل کہی، جس کا مطلع یہ ہے ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

یعنی کل صبح کے وقت (قضا و قدر نے) مجھکو تکلیف سے نجات دی اور رات کی اس تاریکی میں مجھکو آب حیات پلا دیا

خواجہ صاحب کا اس غزل کا سُنانا تھا کہ لوگوں کو حیرت ہو گئی۔ یقین نہیں ہوا کہ یہ اُن کی غزل ہے۔ طرح دی گئی۔ خواجہ صاحب نے اُسی وقت ایسی ہی بلند پایہ غزل کہدی۔ ہر شخص کی زبان پر حافظؒ ہی کا چرچہ اور اُنھیں کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک لوگوں کو یقین ہوگیا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ کوئی روحانی قوت اُن سے کہلاتی ہے۔

فال کا سب سے پہلا واقعہ خود اُن کی وفات کا بتایا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ اُن کی رندمشربی کی وجہ سے لوگوں کو اُن کے جنازہ کی نماز پڑھنے میں تامل تھا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اُن کے دیوان سے فال نکالی جائے۔ دیوان کھولا گیا، یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ کہ گرچہ غرقِ گناہست می رود بہ بہشت

یعنی حافظؒ کے جنازہ کے ساتھ چلنے میں پس وپیش مت کرو کیونکہ اگرچہ وہ گناہوں میں غرق ہے لیکن بہشت میں جارہا ہے،

لوگوں نے جنازہ کی نماز ادا کی۔ لطائف غیبیہ میں اس قسم کی بہت سی فالیں درج ہیں۔ مصنف نے خود اپنا تجربہ بھی لکھا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی فالیں سُنی، دیکھی اور تجربہ میں آئی ہیں اور نہ معلوم کس قدر اوروں کے تجربے میں آچکی ہوں گی۔ یہاں ان سب کے بیان کی گنجائش نہیں۔ ہمایوں اور جہانگیر بھی خواجہ حافظؒ کے بہت معتقد تھے۔ جہانگیر نے خود لکھا ہے کہ مَیں نے اکثر دیوان حافظؒ سے فالیں لی ہیں اور وہ بہت ٹھیک اُتری ہیں۔

اُس دیوان کے چوبیسویں (۲۴) ورق کے دوسرے صفحہ پر جہانگیر کی تحریر ہے۔ جسمیں لکھا ہے :-

"میں نے شاہ خرم کے لئے یہ فال نکالی کہ اُس کی جدائی سے امان ملے"

یہ فال اُس وقت دیکھی گئی جب شاہزادہ خرم (یعنی شاہجہان) آخر شوال ۱۰۲۵ھ میں دکن گیا، اور ۱۱ شوال ۱۰۲۶ھ تک واپس نہ ہوا تھا۔ اِس طویل مدت کی مفارقت نے فال دیکھنے پر مجبور کیا۔ اس دیوان کی پچھترویں غزل کا پانچواں شعر نکلا۔

دوسری تحریر صفحہ ۳۸ پر ہمایوں کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :-

"یہ غزل اور خصوصاً یہ شعر کئی بار ہمایوں کی فال میں آیا" ؎

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید — نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

یعنی

اِدھر آؤ کہ بادشاہ کی آمد کا جھنڈا آگیا — فتح و بشارت کی خوشخبری مہر و ماہ تک پہونچ گئی

اور جس خاص شعر سے فال لی گئی ہے وہ یہ ہے ؎

عزیزِ مصر برغم برادرانِ غیور — ز قعرِ چاہ برآمد بر اوجِ ماہ رسید

یعنی

عزیزِ مصر (یوسف علیہ السلام) اپنے رشک کرنیوالے بھائیوں کے ذلیل و خوار کرنے پر — کوئیں کی تہ سے نکلکر چاند کی بلندی تک پہونچ گئے،

یہ فال بالکل ہمایوں کے حسب حال نکلی، وہ اپنے بھائیوں کی مخالفت سے بہت تنگ تھا۔ اُس نے ۹۴۷ھ ہجری میں شیر شاہ سے شکست کھائی، ہندوستان چھوڑا۔ ایران میں شاہ طہماسپ صفوی کے یہاں پناہ لی، پھر ہندوستان واپس آیا۔ اپنے بھائیوں سے لڑا۔ اُن کو اپنا تابع بنایا۔ ۹۶۲ھ ہجری میں یہ پھر سلطنت ہند پر قابض ہوگیا۔ اسی زمانہ میں اُس نے یہ فال نکالی جس کا نتیجہ اُسکے موافق اور بالکل اس شعر کے مطابق ہوا۔

تیسری تحریر اس نسخہ کے سرسٹھویں ورق کے دوسرے صفحہ پر ہے جو تحقیق سے ہمایوں کی ہے، وہ اس طرح لکھتا ہے :-

"قرآن شریف سے فال میں ربلع اور دیوان حافظؒ سے یہ شاہ بیت نکلی، اکثر مرتبہ اشعار مناسب حال نکلے کہ اگر اُن کی شرح کی جائے تو ایک پوری کتاب ہو جائے۔ اگر خدا نے چاہا جب شرقی ممالک اور وہاں کے لڑنیوالوں پر خدا کے حکم سے فتح حاصل ہوگی تو خواجہ لسان الغیب کو اسکی نذر بھیجی جائیگی اور وہ تمام فالیں بھی درج کی جائیں گی۔ بمنہ و توفیقہٖ شب دوشنبہ ۱۸ ذی الحجہ ۹۶۲ھ ہجری شہر دین پناہ میں لکھا گیا۔ والسلام"

اس نسخے کے حاشیوں کی تحریروں کے جانچ کرنے والوں نے ہمایوں کی اس تحریر کی نسبت بہت کچھ تاریخوں سے پتہ لگایا ہے اور قرآن شریف سے فال نکالنے کے علاوہ دیوان حافظ کی فال کا بھی اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب

ہمایوںؔ ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اُس نے دیوان حافظ[۲] سے تفاول کیا۔ چنانچہ یہ شعر نکلا جس نے اُس کی ہمت اور بڑھا دی ؎

دولت از مُرغ ہمایوں طلب و سایۂ او　　زانکہ با زاغ و زغن شہپر دولت نہ بود

دولت مبارک پرند (ہما) اور اُسکے سایہ سے طلب کر　یعنی　کیونکہ چیل اور کوؤں کے پاس دولت کے شہپر نہیں ہوتے

اِس شعر کے پہلے مصرع میں "ہمایوں" کا لفظ دیکھ کر ہمایوںؔ اُچھل پڑا' اور فتح کی پوری اُمید کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ اور خوش نصیبی سے فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ لیکن جس شاہ بیت کا ہمایوںؔ نے اپنی ۸ ازدی الحجہ ۹۶۲ھ کی تحریر میں ذکر کیا ہے وہ یہ ہے ؎

نظر بر قرعۂ توفیق و یمن دولت شاہ است　　بدہ کام دل عاشق کہ فال بختیاراں زد

اسوقت بادشاہ کی سلطنت کی برکت و توفیق کے قرعہ پر میری نظر ہے ،　عاشق کے دل کا مقصد پورا کر کہ اُس نے نیک فال نکالی ہے

۱۸ ازدی الحجہ والی تحریر ہمایوںؔ نے دہلی میں لکھی ہے۔ اُس کا واقعہ یہ ہے کہ وسط ذی الحجہ ۹۶۱ھ میں ہمایوںؔ کابلؔ سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے نکلا تھا۔ آخر محرم ۹۶۲ھ میں بکرم اور نیلاب سے گذرتا ہوا' ۲ ربیع الثانی کو لاہور اور ساتویں رجب کو سرہند پہونچ گیا۔ دوسری شعبان کو سکندر سور کو شکست دے کر شروع رمضان میں دہلی میں داخل ہوگیا۔ اس سے تین یا ساڑھے تین مہینے بعد کی تحریر ہے۔ اُس وقت دہلی میں داخل ہونے کے بعد ہمایوںؔ مشرقی ممالک جونپور، بہار و بنگال کے قبضہ میں لانے اور فتح کرنے کی تدبیروں پر غور کر رہا تھا۔ اُسی حالت میں ہمایوںؔ نے دیوانِ حافظ سے تفاول کیا اور مرقومۂ بالا شعر نکلا۔ جسکا نتیجہ اُسکے ارادوں کے مطابق برآمد ہوا۔

چوتھی تحریر سترھویں ورق کے دوسرے صفحہ کے حاشیہ پر جہانگیر کے قلم کی ہے۔ وہ اجمیر میں ایک حریف کے خلاف چڑھائی کرنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"اجمیر میں میں نے راناؔ کے خلاف چڑھائی کی تھی۔ شکار میں الماس کا تعویذ میرے سر سے گر پڑا۔ اِس شگون کو اچھا نہ سمجھکر میں نے دیوان حافظ[۷] سے تفاول کیا۔ دوسرے روز تعویذ مل گیا۔
حررہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی محرم ۱۰۲۴ھ ہجری"

اِس شکار کے مفصل حالات اُس نے تزک جہانگیری میں لکھے ہیں۔ جس غزل سے اُس نے فال نکالی۔ اُس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد　　دل رمیدۂ ما را رفیق و مونس شد

ایک ستارہ چمکا اور مجلس کے لئے چاند بن گیا'　یعنی　اور میرے وحشی دل کا رفیق و مونس ہوگیا۔

صفحے کے بائیں حاشیہ پر غزل کے مطلع کے پاس اُس نے لکھا ہے کہ یہ وہ فال ہے جو میں نے الماس کیلئے نکالی تھی

پانچویں تحریر دیوان کے بہترویں ورق کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کی ہے جو اُس نے اپنے حریف کے شاہزادہ خرم کی اطاعت قبول کرنے کے لئے نکالی تھی۔ یہ تحریر محرم ۱۰۲۲ہجری کی لکھی ہوئی ہے جس پر جہانگیر کے دستخط ہیں۔ جو غزل فال میں نکلی اُس کا مطلع یہ ہے ؎

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود — بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود

اب جبکہ پھول چمن میں عدم سے وجود میں آیا — بنفشہ نے اُسکے قدم پر سر کو سجدہ میں جھکادیا

اِس تحریر کی تصدیق تزک جہانگیری سے بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا مہینے کے آخر میں جبکہ وہ شکار میں مشغول تھا۔ اُس کو خبر پہونچی کہ اُس کے حریف نے شاہزادہ خرم کی اطاعت قبول کرلی۔

چھٹی تحریر بھی جہانگیر کی ہے جو اس نسخہ کے ورق اکیاسی کے دوسرے صفحہ پر ہے۔ اُس تحریر میں جہانگیر صرف اتنا ہی لکھتا ہے کہ اُس نے یہ فال حافظ حسن ملازم خانعالم کے لئے نکالی۔ جہانگیر، خانعالم سے بہت محبت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ فرطِ محبت سے اُس کو بھائی کہا کرتا تھا۔ جب خانعالم ایلچی بنکر ایران گیا۔ تو شاہ ایران نے بھی ایک شخص سید حسن کو اپنی طرف سے ایلچی گری پر بھیجا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ حسن ملازم خانعالم، شاہ ایران یعنی شاہ عباس کا خط لے کر آیا تھا۔ جس نے یہاں آکر خانعالم کی طرف سے ایک خنجر جوہردار جس کا قبضہ دندانِ ماہی کا تھا پیش کیا تھا جو کہ شاہ عباس نے خان مذکور کو دیا تھا۔ جہانگیر کی تحریر یہ ہے:-

"خان عالم کے آدمی کے لئے جس کا نام سید حسن تھا فال نکالی تھی۔ خان عالم کو ہم نے دارائے ایران کے یہاں ایلچی گری کے لئے بھیجا تھا۔"

غرض جہانگیر نے فال نکالی جو شعر فال میں نکلا وہ یہ ہے ؎

حافظ از بہر تو آمد سوے اقلیم وجود — قدمے نہہ بوداعش کہ رواں خواہد شد

حافظ تیرے لئے اقلیم وجود کی طرف آیا — یعنی اُس کو رخصت کرنے کیلئے اُٹھ کہ چلا جانیوالا ہے

چنانچہ فال کا نتیجہ جلد برآمد ہوگیا۔

ساتویں تحریر جو ایک سو گیارویں ورق کے پہلے صفحہ پر ہے وہ بھی جہانگیر کے قلم کی ہے، اور وہ اس طرح پر ہے:-

"حکیم ابوالفتح کے لڑکے فتح اللہ کی رہائی کے لئے (یہ فال) نکلی۔ اُس کا گناہ میں نے بخش دیا۔"

فتح اللہ خسرو کے طرفداروں اور قدرتی طور پر جہانگیر کے دشمنوں میں تھا۔ چنانچہ جہانگیر کو قتل کر کے خسرو کو بادشاہ بنانے کی سازش کے سلسلہ میں یہ بھی گرفتار ہوا۔

یہ تحریر ۱۰۱۸ھ کی ہے جو جہانگیر کے جلوس کا چوتھا سال ہے۔ جہانگیر نے اسی سال یہ فال نکالی اور فتح اللہ کا جرم بخش کر اُسے قید سے رہا کر دیا۔ جو غزل فال میں نکلی وہ نو شعر کی ہے۔ ذیل کے دو شعروں سے اُس کی

مطلب براری ہوئی اور رہائی ممکن ہوسکی۔ وہ دو شعر یہ ہیں ؎

آنکہ پامال جفا کرد چو خاک راہم | خاک مے بوسم و عذر کرمش میخواہم
جس نے مجھے خاک راہ کی طرح جفا سے پامال کیا ہے یعنی میں اُس زمین کو چوم کر اُسکے کرم کی تکلیف کا عذر کر رہا ہوں

من نہ آنم کہ بجو راز تو بر نجم حاشا | چاکر معتقد و بندۂ دولت خواہم
میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں کہ تیرے ظلم سے رنجیدہ ہوں یعنی میں تو معتقد خدمتگار اور خیر خواہ غلام ہوں

آٹھویں تحریر ایک سو پندرہویں ورق کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کی ہے۔ اسمیں وہ لکھتا ہے:-

"جس وقت الہ آباد س (الہ آباد) سے والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہونیکے ارادے سے آگرہ جانے کا خواہشمند تھا' راستے میں میرے دل میں خیال آیا کہ خواجہ کے دیوان سے فال لینا چاہئے۔ یہ غزل نکلی۔ رضا جوئی و خدمت کی سعادت اور حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اور ساتھ ہی موروثی دولت (سلطنت) ملی۔ کیونکہ غزل کا بالکل یہی مضمون تھا۔ یہ فال جمادی الثانی میں نکالی گئی"۔

راقم نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی

وہ غزل جس سے جہانگیر نے تفاول کیا۔ یوں شروع ہوتی ہے ؎

چرا نہ در پے عزم دیار خود باشم | چرا نہ خاک کف پائے یار خود باشم
یعنی میں اپنے وطن جانیکے ارادے میں کیوں نہ رہوں | اپنے دوست کے پاؤں کے تلوؤں کی خاک کیوں نہ بنوں

غم غریبی و محنت چو بر نمی تابم | بشہر خود روم و شہریار خود باشم
جب میں مسافرت اور مشقت کی تاب نہیں لاسکتا | تو بہتر ہے کہ اپنے شہر جاکر بادشاہ بن جاؤں

اِس واقعہ کی تصدیق جہانگیر کے پوتے داراشکوہ کی تحریر سے بھی ہوتی ہے اُس نے بھی اپنی کتاب سفینۃ الاولیار میں حضرت حافظؒ کے ذکر کے ساتھ اِس فال کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے خود جہانگیر کی تحریر دیوان کے حاشیہ پر دیکھی ہے۔ اِس تصدیق کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ وہ یہی دیوان اور یہی تحریر ہے جسکا حوالہ داراشکوہ نے دیا ہے

نویں تحریر ایکسو اکیسویں ورق کے پہلے صفحہ پر ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ:-

"عثمان کے مارے جانے کے لئے دیوان حافظؒ سے فال نکالی یہ بیت نکلی۔ اس کے کچھ روز کے بعد اُس کے قتل کی خبر ملی۔ حررہ نور الدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ"

اِس کا واقعہ یہ ہے کہ عثمان بنگال کا ایک خودسر رئیس تھا۔ کئی مرتبہ اُس کی سرکوبی کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۰۲۱ھ میں شجاعت خاں کو جہانگیر نے عثمان سے لڑنے کیلئے بھیجا۔ عثمان کی پیشانی پر گولی لگی اور وہ رات کو مرگیا۔ جس شعر سے جہانگیر نے فال نکالی وہ یہ ہے ؎

خوردہ ام تیر فلک بادہ بدہ تا سرمست عقد در بند کمر ترکش جوزا فگنم

میرے تیر فلک لگا ہے شراب دے کہ مستانہ وار یعنی میں جوزا کی کمر کے ٹپکے میں گرہ لگا دوں

دسویں تحریر ہمایوں کی ایکسواٹھترویں ورق کے پہلے صفحہ پر اس طرح ہے:۔

"منگل کے روز تیرہویں محرم کو اس بیت کا (تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت کام باد) انتخاب عمل میں آیا۔ دارالسلام۔ موضع مونگیر"

اس تحریر میں فال کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ لیکن لفظ مونگیر ہم کو بتاتا ہے کہ یہ تحریر مونگیر میں اسوقت لکھی گئی۔ جب ہمایوں فتح بنگال میں مشغول تھا۔ اور اسی وقت یہ فال نکالی۔ پورا شعر یوں ہے ؎

تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت کام باد این دعا برانس وجان است از دل وجاں ملتزم

رہتی دنیا تک تیرا کام پورا ہوتا رہے یعنی یہ دعا جن وانس پر دل وجان سے لازم ہوگی

یہ خلاصہ اور اختصار تھا۔ ہمایوں اور جہانگیر کی تحریروں کا جو دیوان حافظؒ کے اس نسخہ کے حاشیوں پر دیکھی گئیں۔ جو خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ان تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ ان بادشاہوں نے لسان الغیب پر کتنا بھروسہ کیا۔ اور خواجہؒ نے بھی اپنے معتقدوں کی کس طرح امداد کی۔ اس لئے اگر اس نسخہ کو بولتا ہوا نسخہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا[1]۔

جذبات منوّر

حدِ امکاں سے آگے اپنی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی پا بجولانی نہیں جاتی

مرے سر سے ہوائے عیش سامانی نہیں جاتی
تن آسانی میں بھی فکر تن آسانی نہیں جاتی

لب خاموش ساحل سے سکوں کا درس ملتا ہے
مگر امواج دریا کی پریشانی نہیں جاتی

نہیں تعظیم کے لائق نہیں تکریم کے قابل
وہ در جسکی طرف خود کھنچ کے پیشانی نہیں جاتی

جہاں پہلے کبھی سب گوش بر آواز رہتے تھے
وہاں بھی اب مری آواز پہچانی نہیں جاتی

حقیقت کچھ تو اپنی آبرو کا پاس ہو تجھکو
ہزاروں پیرہن ہیں پھر بھی عریانی نہیں جاتی

دل خوددار ہے عرض طلب سے منفعل کتنا
حصول مدعا پر بھی پشیمانی نہیں جاتی

حیات عشق کو میں تا بہ امکاں طول دیتا ہوں
کچھ اس سے آبروئے حسن لافانی نہیں جاتی

بہت ناکامیِ ارماں سے دل کا خون ہوتا ہے
خلش دل سے منوّر یہ باآسانی نہیں جاتی

منشی اشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

---

[1] بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب لکھنو ریڈیو اسٹیشن

عذابِ زیست[1]

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش - ایم اے

کش مکشِ حیات میں لطفِ حیات ہے کہاں ڈھونڈھ چکے ملی نہیں غم سے نجات ہے کہاں
شہرِ غم و فنا میں ہیں طالبِ راحت و بقا سازِ سکون و زیست زا سوزِ ممات ہے کہاں
ساز میں سوز، سوز میں ناز عذابِ زیست ہے زیست ممات آشنا، زیست صفات ہے کہاں
فرصتِ نالہ بھی نہ دی یہ نہ ٹھہر سکی ذرا کش مکشِ حیات میں وقتِ ثبات ہے کہاں
لطفِ حیات ہے کہاں کش مکشِ حیات میں لطفِ حیات در کنار تابِ حیات ہے کہاں
ظلمتِ غم سے یہ مٹی درد نے اس کو کھو دیا تابشِ زندگی نہیں تابِ حیات ہے کہاں
کیوں دمِ مرگ آشنا بن سکے زندگی کا ساز ہوش بنا اور اُڑ گیا رنگِ حیات ہے کہاں
پی چکے تلخیاتِ دہر زندگی تلخ ہو چکی نیش نواز زندگی نوش صفات ہے کہاں
قند و نباتِ عیش میں مل چکیں جبکہ تلخیاں قند و نبات اب وہی قند و نبات ہے کہاں
دوش پہ اتنا بارِ غم اور یہ ناتوانیاں دل میں سکت رہی کہاں تھی جو وہ بات ہے کہاں
ظلمتیں دور ہونگی یہ کلفتیں دور ہونگی سب رات یہ بے ثبات ہے غم میں ثبات ہے کہاں
پر غمِ روزگار کی کم نہیں مردافگنی ہو گئے صاحبِ فراش تھی جو وہ بات ہے کہاں

ہمتیں چھوٹنے لگیں دورِ نمودِ صبح ہے
بیٹھ کے ڈھونڈھتے ہیں ہم راہِ نجات ہے کہاں

---

[1] ہمارے دوست مدہوش صاحب کو حال میں ایک خورد سال بچے کا داغ اٹھانا پڑا۔ یہ اشعار اس سانحۂ ہوشربا کے ماتحت نظم ہوئے ہیں۔ (ا-ز)

کلامِ میرؔ[1]

(۲)

(از میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

کتابت کی غلطیاں اور اُن کی تصحیح

اب تو چُپ لگ گئی ہے حیرت سے — پھر کھُلے گی زبان جب کی بات

واشد ہوئی دل کو فقیروں کے بھی ملے — (جب) کھلتی نہیں گرہ یہ کسو کی دعا سے آج

واشد ہوئی نہ دل کو فقیروں سے بھی ملے

جیتے ہیں اختیار نہیں ورنہ ہمنشیں — ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی آج

خدا سے آج

کیا جانوں کس کے تئیں لبِ خنداں کہے ہے خاک — میں نے جو آنکھیں کھول کے دیکھیں سو چشمِ تر

خلق

اے سیل ٹک سنبھل کے قدم باؤلی میں رکھ — ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کا مری خطر

بادیہ

بھولا چاہے ہے غمِ بتاں میں جی — غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد

بھولا جا ہے

نوٹ: غمِ بتاں میں جی ہی بھولا جاتا ہے، اپنے ہی تن من کا ہوش نہیں۔

نامراد ہوئی ہو جس پہ پروانہ — وہ جلاتا پھرے چراغِ مراد

نامرادی ہو

پر مروت کہاں کی ہے اے میرؔ — تو ہی مجھ دل جلے کو کر ارشاد

یہ

ناصح مرے جنون سے آگہ نہ تھا کہ ناحق — گودز گیا گریباں سارا سِلا سِلا کر

گودڑ کیا

نوٹ:- سِلواتے سلواتے گریبان کو گودڑ بنا دیا۔

عبث پوچھے ہے مجھ سے میرؔ میں صحرا کو جاتا ہوں — خرابی ہے یہ دل کھا ہے جو تو نے تو بس بہتر

خرابی ہی پہ

نوٹ:- خرابی و بربادی کی ٹھان لی ہے تو بہتر ہے جا۔

---

[1] اس سلسلہ کا پہلا مضمون زمانہ جون سنہ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

کچھ کو کہن ہی سے نہیں تازہ ہوا یہ کام
بہتر ہے عاشقی میں موئے سر کو پھوڑ پھوڑ
بہتیرے

زخمِ درون سے میرے نہ ٹک بے خبر رہو
اب ضبطِ گریہ سے دھر ہی کو سب نچوڑ
اب ضبطِ گریہ سے ہے ادھر ہی کو سب نچوڑ

کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہوں یہ ڈر مجھے
پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

سفر ہستی کامت کر سرسری جوں برباد دے رہرو
یہ سب خاک آدمی تھے ہر قدم پر ٹک تامل کر
بادِ دے

نوٹ: بادِ دے۔ ماہ دے کی بادِ خزاں

سُن اے بیدردِ گلچیں غارتِ گلشن مبارک ہے
یہ ٹک گوشِ مروت جانبِ فریادِ بلبل کر
ہو

مرے پاس اسکی خاکِ پائے بیماری میں رکھا تھا
نہ آیا سرِ مرا بالیں یہ اُدھر جو گیا ڈھل کر
رکھی تھی

تری خاموشی سے قمری ہوا ستورِ جنونِ رسوا
ہا ٹک طوقِ گردون کو بھی ظالم باغ میں گُل کر
طوقِ گردن

کر رحم ٹک کبتک ستم مجھ پہ جفا کار اس قدر
ایک سینہ اور خنجر سیکڑوں یکجان و آزار اس قدر
اک سینہ خنجر سیکڑوں، اک جان آزار اس قدر

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق ہوں اسکی شکل کا
میں اُسکا خواہاں یاں فلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر
تلک

ہے جائے ہر دل میں تری در گزر بے وفا
کر رحم ٹک اپنے اوپر مت ہو دل آزار اس قدر
میں
کر در گزر او بے وفا

غالب کہ دیوے قوتِ دل اس ضعیف کو
تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر
تنکے کو جو دکھاوے ہے پل میں پہاڑ کر

نکلیں گے کام دل کے نہ کچھ اہل ریش سے
کچھ ڈھیر کر چلے ہیں یہ آگے اُکھاڑ کر

قدکشِ چمن کی اپنے خوبی کو بنو چلے ہیں
پایا پھل اُس سے آخر کیا سرو نے اکڑ کر
قدکشِ چمن کے اپنی خوبی کو نیو چلے ہیں

نوٹ: اپنی خوبی کو یعنی اپنی خوبی کی وجہ سے چمن کے تمام اشجار اُس کے (معشوق کے) آگے نیو چلے ہیں (جھک چلے ہیں)، مگر سرو اس کے سامنے اکڑتا ہے تو کیا پھل پائے گا۔

وردی میں دلبروں کی کٹتی ہے کیونکہ سب کی
آدھا نہیں رہا ہوں تجھ سے تو میں بچھڑ کر
دوری میں

رنگِ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے
یاں کی تو صبح دیکھی اک آدھ رات رہ کر
دیکھو

وہ ننگ پوش اِک دن دامن کشاں گیا تھا
رکھی ہے جانمازیں اہل ورع نے تہ کر
رکھی ہیں جانمازیں

شیخجی کا اب کمال ہے کچھ اور　　حال ہے اور قال ہے کچھ اور

شیخ جی کا

وعدے برسوں کے کتنے دیکھے ہیں　　دم میں عاشق کا حال ہے کچھ اور

کس نے

کل رات مُند گئی تھیں بہتو آنکھیں غش سے　　دیکھا کیا نہ کر تو سرمستِ خواب ہو کر

بہتوں کی

بیٹھا تھا صوفی ہر صبح میکدے میں　　شکرِ خدا کہ نکلا واں سے خراب ہو کر

جا بیٹھتا تھا

دنیا ہے بے صرفہ تھو رونیمیں یا کڑھنے میں تو　　نالے کو ذکرِ صبح کر، گریی کو دورِ نہ شام کر

رہو　رونے میں　　گریہ کو وردِ شام کر

نوٹ :۔ یہ دنیا ہے، رونے یا کڑھنے میں اس قدر بے صرفہ اس قدر بے پروا نہیں ہونا چاہیئے کہ صبح دیکھو نہ شام

میر صاحب بھی چوکے اے بدعہد　　ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر

ہی

ہم وے ہیں جن کے خون سے تری سب راہ ہی گل　　مت کر خراب ہمکو تو اوروں میں بیان کر

خون سے ہے سب راہ تیری گل　　اوروں میں بیان کر

افسانے ما و من کے تئیں میر کب تلک　　چل اب کہ سوویں منھ پہ ڈوپٹے تان کر

تئیں　　ڈوپٹے کو

سرو تدرو دونوں پھر آپ میں نہ آئے　　گلزار میں چلا تھا وہ شوخ لٹاپ لٹک کر

لٹک لٹک کر

یہ مشت خاک یعنی ان ہی ہے روکش　　ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹک کر

انسان ہی ہے　　ٹکر

دھولا چکے تھے مل کر کل لونڈے سیدوں کے　　پر سرگراں ہو واعظ جاتا رہا مٹک کر

سٹک کر

نوٹ :۔ ڈھولیں مار مار کے بوکھلا دیا تھا۔

خاک پر میر تیری ہونا و لے　　نہ ہوا اتنا اقتدار افسوس

خاکِ رہ ہوتا

پاوں تو لیتا جا فقیروں کے　　برگ سبز است تحفۂ درویش

پان

ہر خزِ رو مدسے دست و بغل اُٹھتے ہیں خروش　　کس کا ہے زار ہجر میں یارب کہ پے ہیں جوش

کس کا ہے راز ہجر میں یارب کہ یہ ہیں جوش

شب اِس دل گرفتہ کو وا کر برو زِ مے　　بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش

بزورِ مے

نوٹ : دلِ گرفتہ کو مے کے زور سے وا کر کے شراب خانے میں بیٹھے تھے۔

شیخ سچ خوب ہے بہشت کا باغ　　جائیں گے گر وفا کرے گا دماغ

جی

صف الٹ جا عاشقوں کی گر ترے ابرو ہلیں — ایک دم تلوار کے چلنے میں ہووے ملک صاف
(الٹ دیں)

جو دیکھو مرے شیر نر کی طرف — تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف
(شعر تر)

بے لطف تیرے کیونکر تجھ تک پہونچ سکیں ہم — ہیں سنگ عام لینے کتنے یہاں سے واں تک
(سنگ راہ)

رنگینیٔ عشق اُس کی ملی پر ہوئی معلوم — صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے ابتک
(اُس کے ملے پر)

برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک — اک دود بنا اُٹھتا ہے چمن زار سے ابتک
(اک دود سا)

شاید کہ دیوے رخصت گلشن ہوں بے قرار — میرے قفس کو لے چلو تو باغباں تلک
(لے تو چلو)

کیسا چمن اسیری میں کس کو اُدھر خیال — پرواز خوب ہوگئے، ہے بال و پر خیال
(پرداز خواب ہوگئی)

جاتیں ہیں فرشِ رہ تری مت حال حال چل — اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل
(جاتیں)

کلامِ نجم

حضرت نجم آفندی اکبرآبادی

یہ چاہتے ہو کہ دنیا رہے وفا نہ رہے — کوئی غریب محبت کا آسرا نہ رہے

تمہاری پستیٔ فطرت کو کیا کرے کوئی — خدا بنایا تھا بُت بن گئے خدا نہ رہے

کس احتیاط سے کہتے ہیں میرے اُٹھنے پر — چلے تو ہو کہیں محفل میں دل بڑا نہ رہے

ذرا ٹھہر کے چلیں گے یہ قافلے تو بڑھیں — سفر کا لطف بھی آئے جو راستا نہ رہے

ہزار بار یہ عذرِ گناہ سوچا ہے — روا سمجھ کے نہ کرلوں کہ ناروا نہ رہے

تلاشِ عیب میں کیا کیا ہنر نہیں کھلتے — روش جو اہلِ نظر کی مخالفانہ رہے

زمانہ آج فراموش و در گذر کردے — ترا گناہ جو تجھ کو پکارتا نہ رہے

یہ چاہتی ہیں تری بے نیازیاں شاید — کسی کو شکر و شکایت کا حوصلہ نہ رہے

سوالِ جلوہ اہم کیا ہے، بات ہے اتنی — میں دیکھ لوں وہ اگر مجھکو دیکھتا نہ رہے

نہ راہ و رسم کسی سے کہیں نہ دید شنید — خدا کی طرح کوئی بندۂ خدا نہ رہے

جناب نجم یہ پوچھو جناب واعظ سے — رہے زمیں پہ گنہگار کوئی یا نہ رہے

اہلِ مشرق سے خطاب

(ساحلِ مدراس پر سمندر کی موجوں کی ہنگامہ آرائی دیکھکر)

(از حضرت محوی صدیقی، اردو لکچرار مدراس یونیورسٹی)

دے رہا ہے تجھ کو درسِ ہوش اے مردِ فہیم
یہ سمندر اور یہ موجوں کا طوفانِ عظیم

ہاں اسی شورش میں کچھ مضمر ہیں آثارِ حیات
اور خاموشی تو ہے اک موت کا نام اے ندیم

کون سی مشکل ہے جس کا تجھ سے حل ممکن نہیں
پائی ہے تو نے خدا کے فضل سے عقلِ سلیم

دیکھتی ہے صرف دنیا کارنامے تابناک
ہو لباسِ زر کہ تیرے دوشِ نازک پر گلیم

دیکھ تو چشمِ بصیرت سے یہ دریا کا خروش
اے کہ ہے اک تنگ اور تاریک گوشے میں مقیم

دیکھتا ہے یہ جو طیارے، یہ موٹر، یہ جہاز
ہے یہ سب انسان ہی کے ذہن کا فیضِ عمیم

جلوۂ محبوب کا نظارہ کچھ مشکل نہیں
دل میں تو پیدا تو کر ذوقِ عمل مثلِ کلیم

ہے ترے سر پر خلافت کی کلاہِ افتخار
کون ہے اس کائناتِ دہر میں تیرا سہیم

حیف لیکن آج ساری قوتیں مفقود ہیں
جوش سے خالی تخیل، عقل کی حالت سقیم

طاقتیں بیکار، اعضا شل، تمنائیں ضعیف
شوق کے وہ ولولے دل میں نہ وہ عزمِ صمیم

زندگی ہے اک مصیبت، سعی و کوشش اک عذاب
کر لیا ہے اپنے اوپر تو نے جنت کو جحیم

ہے گریزاں محنت و ذوقِ عمل سے آج تو
ورنہ اس میدان میں کوئی نہ تھا تیرا سہیم

شاہدِ عادل ہیں اب تک ذوقِ علم و فضل کی
جو ترے اسلاف نے چھوڑی ہیں تصنیفیں ضخیم

یہ تری پستی، یہ تیری بے حسی، بے مائگی
دیکھ یہ روتی ہیں آنکھیں، دل ہے حسرت سے دو نیم

ذلتیں گھیرے ہوئے ہیں، نکبتیں چھائی ہوئی
ہمتیں ٹوٹی ہوئی، اور عادتیں بالکل ذمیم

تیرے گلشن میں کبھی وہ پھول تھے یادش بخیر
ساری دنیا کو معطر کر گئی جن کی شمیم

پھیر لی مشرق سے اپنی سمت مغرب کی طرف
تجھ سے برگشتہ ہے خود تیرے گلستاں کی نسیم

یہ شرف پایا تھا تو نے بزمِ عالم میں کبھی
جانتی تھی تجھ کو کل دنیا خردمند و فہیم

اک نظر اپنے گزشتہ کارناموں پر تو ڈال
درخورِ غفلت نہیں اے بے خبر دورِ قدیم

ساری دنیا کی تو کیا اپنی نظر سے گر گیا
تجھ سے بڑھ کر آج دنیا میں نہیں کوئی لئیم
تو نے خود کر لی ہے اپنے اوپر او غافل حرام
محفلِ ہستی کی ہر لذت، خدا کی ہر نعیم
یہ ترا ادبار خود ہے تیرا ہی لایا ہوا
غیر منصف اور ظالم کب ہے وہ ربِ رحیم
سکۂ علم و ہنر تیرا رواں تھا دہر میں
تجھ میں پیدا ہوتے تھے صنّاعِ عالم اور حکیم
آہ وہ سب آج اک بھولا ہوا افسانہ ہے
ہے گریزاں تجھ سے ذہنِ صائب و فکرِ سلیم
سینۂ دریا میں گھس کر تو گہر لاتا رہا
کوہ کے سینے سے تو نے زر نکالا اور سیم
آج یہ بے مائگی، یہ بے حسی پھر اس پہ ناز
آج بھی خود کو سمجھتا ہے زمانے کا زعیم
آہ سب کچھ کھو کے بھی آیا نہ پیشانی پہ بل
ہے بڑا شاکر، بڑا قانع، بڑا صابر، حلیم
دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے محوی حکمت طراز
کھول کان اپنے ذرا اے خاکِ مشرق کے مقیم

چاند

از پنڈت اندرجیت شرما

تلاش کس کی ہے اے چاند جستجو کس کی
سفر پہ کس لئے باندھے ہوئے کمر ہے تو
اڑائے پھرتی ہے تجھکو فلک پہ بو کس کی
خبر بھی ہے کہ عبث مائلِ سفر ہے تو
لٹا کے نور کی دولت بھی کچھ نہ پائے گا
بہا کے اشک یونہی زندگی گنوائے گا

چھپی ہیں شوخیاں کیسی یہ ان نگاہوں میں
ادا سے ناز سے کس پر نثار ہوتا ہے
بھٹکتا پھرتا ہے تو کن مہیب راہوں میں
سکوتِ شب میں یونہی بیقرار ہوتا ہے
کبھی نقاب میں لطفِ حیات پاتا ہے
کبھی نقاب سے باہر مچل کے آتا ہے

نکل نکل کے گہن سے گہن میں آتا ہے
بڑھا ہے شوقِ جنوں تابِ انتظار نہیں
چڑھا ہے چرخ پہ کیا ٹھوکریں ہی کھاتا ہے
نصیب ہی میں ترے منظرِ بہار نہیں
ترا رسوخ ہے دنیائے آسمانی تک
حسیں ہے تو بھی مگر دورِ دارِ فانی تک

دیہاتی مدارس اور اُنکے امتحانات

از مسٹر شیو نراین نگم' بی - کام - سی - ٹی '

ہندوستان میں وقتاً فوقتاً تعلیمی کورس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں - ملک کے ماہران تعلیم اس بات کے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں کہ موجودہ طریقہ تعلیم کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے - چنانچہ اسکے متعلق بار بار رو ائل کمیشن اور متعدد تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر ہوتی رہیں - اور اُن کی سفارشوں پر عمل بھی کیا گیا - مگر ان سب کے باوجود اب بھی یہاں کے طریق تعلیم میں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے - پچھلے دنوں یو - پی گورنمنٹ نے دو۲ کمیٹیاں مقرر کی تھیں - جنمیں ایک دیہات کی تعلیم کے متعلق تھی -

دیہاتی مدرسے تین۳ قسم کے ہیں :-

اوّل' لور پرائمری اسکول - جنمیں دوسرے درجہ تک تعلیم دی جاتی ہے -

دوسرے' اپر پرائمری مدرسے - جنمیں چوتھے درجہ تک تعلیم دی جاتی ہے -

تیسرے' مڈل اسکول - جو ساتویں درجہ تک تعلیم دیتے ہیں -

مندرجہ بالا اسکول ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت ہیں - اور عوام کی زبان میں سرکاری اسکول سمجھے جاتے ہیں - ان کے علاوہ اور بھی مدارس ہیں - جن کو بورڈ کی طرف سے مدد دی جاتی ہے - اور وہ امدادی اسکول کہلاتے ہیں - اُن کے اقسام یہ ہیں :-

(۱) امدادی لور پرائمری یا اپر پرائمری (۲) اسلامیہ مکاتیب

(۳) ہندو یا سنسکرت پاٹ شالا (۴) اچھوت پاٹ شالا

(۵) نائٹ اسکول (۶) امدادی نسواں اسکول

ان تمام مدرسوں میں عموماً لور پرائمری درجوں تک تعلیم دی جاتی ہے - ان میں ایک مدرس ہوتا ہے اور ان کی مدد کے لئے بورڈ سے چھ۶ روپیہ سے دس۱۰ روپیہ تک اسکول کی حیثیت کے مطابق مدد دیجاتی ہے - ان اسکولوں میں ایک منیجر ہوتا ہے - بعض وقت بورڈ کی طرف سے بھی اسلامیہ مکاتیب' اچھوت پاٹ شالا اور نسواں اسکول کھولے جاتے ہیں - ایسے بھی اسکول ہیں' جہاں اپر پرائمری درجہ

تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اُن میں دُو یا دُو سے بھی زاید مدرس ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے مدرسوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان اسکولوں کے مدرسین زیادہ تر غیر سند یافتہ (یعنی untrained) ہوتے ہیں۔

مڈل اسکول عام طور پر سرکاری یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے قائم کئے جاتے ہیں۔ اِنکی تعداد ضلع کے رقبہ کے لحاظ سے آٹھ سے بارہ تک ہوتی ہے۔

ہمارے صوبہ میں امدادی مڈل اسکولوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ مثلاً ضلع بستی میں صرف بکھوہ، سندور شمالی، خلیل آباد وہ مقامات ہیں۔ جہاں پر امدادی مڈل اسکول ہیں۔

تعداد مدارس | مارچ ۱۹۳۶ء کے اختتام پر ان اسکولوں کی تعداد یہ تھی:-

مڈل اسکول (لڑکوں کیواسطے)	ڈسٹرکٹ بورڈ	۳۹۷	امدادی	۵۴
" (لڑکیوں کیواسطے)	"	۱۱	"	۱۰
پرائمری اسکول (لڑکوں کے لئے)	"	۱۲۹۸۴	"	۳۲۱۹
" (لڑکیوں کے لئے)	"	۶۹۰	"	۲۸۹

ان مدارس کے طلبار کی تعداد مع لڑکیوں کے ۸۰۸، ۱۰۴۱ تھی۔

مدرسین | کی دُو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے ماتحت ہیں۔ ان کی تقرری، تعیناتی، تبادلہ، ڈسٹرکٹ بورڈ کا محکمہ سررشتہ تعلیم، ڈپٹی انسپکٹر کی سفارش پر کرتا ہے۔

دوسرے امدادی اسکولوں کے مدرسین۔ جنکی تقرری عام طور پر اسکول کے منیجر کرتے ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مڈل پاس یا غیر مڈل پاس امیدوار جو مدرسی اختیار کرنا چاہتے ہیں، یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی ملازمت کے خواہاں ہوتے ہیں وہ امدادی مدارس میں ٹریننگ میں کے لئے جانے اور بعد کو اُن کی تعیناتی کسی سرکاری مدرسہ میں ہو جائے۔ اِس غرض کو مدنظر رکھتے یہ لوگ اکثر اسکول کی بُنیاد ہی ایسی جگہ ڈال دیتے ہیں جہاں پر اُن کا کچھ رسوخ ہوتا ہے اور دیہات والوں سے ایک درخواست منظوری اور امداد کے لئے بھجوا دیتے ہیں۔ جس سے اُن کی کچھ گذر بسر ہونے لگتی ہے۔ گاؤں کے کسی صاحب ثروت یا معزز شخص کو منیجر بنا دیتے ہیں۔ لیکن عموماً ایسے منیجر صاحبان کو اسکولوں کے کاروبار سے شاذ و نادر ہی دلچسپی ہوتی ہے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں کے ملازمین تقریباً ۹۵ فیصدی ٹرینڈ و سند یافتہ لوگ ہوتے ہیں یا تو وہ پی۔ ٹی۔ سی (پرائمری ٹیچرس سارٹیفکٹ) یا وی۔ ٹی۔ سی (ورنیاکیولر ٹیچرس سارٹیفکٹ) پاس ہوتے ہیں۔ پی۔ ٹی۔ سی پاس شدہ مدرسین کی تعیناتی اپر پرائمری یا لوئر پرائمری میں ہوتی ہے۔ لیکن

وی۔ ٹی۔ سی، مڈل اسکولوں کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ملک کے سامنے بیکاری کا مسئلہ درپیش رہ ہے۔ وی۔ ٹی۔ سی کی تعداد سالہاسال بڑھ رہی ہے۔ اس لئے ان کی تعیناتی پہلے پرائمری میں ہوتی ہے اور جب جگہ ہونے پر اُن کو مڈل اسکولوں میں نیابت مل جاتی ہے۔ ان کی تنخواہ کا گریڈ پی۔ ٹی۔ سی کے گریڈ پر منحصر ہے سب سے قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان بیچاروں کی کوئی سالانہ ترقی نہیں ہوتی۔

گریڈ | پرائمری اسکول کے نائب مدرسوں کی تنخواہ سترہ [۱۷] روپیہ سے شروع ہوتی ہے اُس کے بعد دوسرا گریڈ انیس [۱۹] روپیہ ماہوار کا ہے۔ تیسرا گریڈ بیس [۲۰] روپیہ کا ہے۔ افسر مدرسین کی تنخواہ بائیس [۲۲] روپیہ سے شروع ہوتا ہے اُس کے بعد پچیس [۲۵] روپیہ کا درجہ ہے اور آخری گریڈ تیس [۳۰] روپیہ کا ہے۔

مڈل اسکول نائب ماسٹروں کے گریڈس پچیس [۲۵] روپیہ، تیس [۳۰] روپیہ اور پینتیس [۳۵] روپیہ ہیں۔ اس کے بعد ہیڈ ماسٹری کا گریڈ ہے جس کی تنخواہ چالیس [۴۰] روپیہ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرا گریڈ پچاس [۵۰] روپیہ کا ہے۔ اور ساٹھ [۶۰] روپیہ ماہوار کا آخری گریڈ ہے۔

پڑھائی | ان اسکولوں کی تعلیم کی دیکھ بھال اور نگرانی ضلع کے ڈپٹی انسپکٹر نیز اُن کے ماتحت افسران یعنی سب ڈپٹی انسپکٹر صاحبان کرتے ہیں۔ اُن کے حلقے بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر حلقہ میں سو [۱۰۰] اور ڈیڑھ سو [۱۵۰] کے درمیان اسکول ہوتے ہیں۔ ایک سال میں ہر اسکول کا لازمی طور پر دو [۲] مرتبہ معاینہ ہونا چاہئے۔ مگر عملی حیثیت سے یہ قید سخت ہے جس کا اثر ایک حد تک تعلیم پر پڑتا ہے۔ مثلاً گورکھپور جیسے ضلع میں جہاں ہر حلقہ میں قریب ڈیڑھ سو [۱۵۰] مدرسے ہیں۔ وہاں سب اسکولوں کا سال میں دو [۲] مرتبہ معاینہ کرلینا بہت ہی دشوار ہوتا ہے، کیونکہ برسات کے دنوں میں مفصلات کی آمد و رفت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ بہت سے مقامات تک ریل بھی نہیں جاتی ہے اور لاریوں کا بھی دُور تک کوئی انتظام نہیں ہے۔

انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ان تمام مدارس کی تعلیم کچھ بہت خاطر خواہ نظر نہیں آتی۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:۔

(۱) ہر ضلع میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں اسکول کے لئے کوئی خاص عمارت نہیں ہے۔ اس لئے طالب علموں کو ہر موسم میں پیڑوں کے سایہ میں تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے حالانکہ یہ اسکول سالہاسال سے ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے قائم ہیں۔ دوسرے جن اسکولوں کے لئے خاص عمارتیں ہیں وہ بھی عموماً بوسیدہ حالت میں ہیں اور اُن کی مرمت برسوں سے بورڈ کے ممبر صاحبان اور اُن کے ملازمین کی نگاہ کرم کی منتظر رہتی ہے۔ بہرحال عام طور سے برسات کے موسم میں ان اسکولوں میں محض برائے نام پڑھائی ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ اسکول کسی سیلابی مقام پر ہو تو پھر اور بھی سونے میں سہاگا ہو جاتا ہے۔

(۲) بہت سے اضلاع میں تعلیم کا کافی سامان بھی موجود نہیں ہے اور جہاں ہے بھی تو بہت ہی کم اور اکثر مدتوں تک درس کتب بھی مہیا نہیں ہوتیں۔

(۳) آمد و رفت کے راستے درست نہ ہونے کی وجہ سے مدرسین میں بھی لاپروائی ہو جاتی ہے۔ اگر اسکول کسی سڑک کے کنارے یا ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے تو افسران سررشتہ تعلیم کے معائنہ کے لئے آنیکا ہر وقت خدشہ رہتا ہے۔

(۴) بہت سے مدرسین ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبران یا اور کسی دوسرے بارسوخ یا قابو یافتہ شخص کے آوردے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ سرکش ہو کر اپنے فرائض لیاقت و مستعدی سے انجام نہیں دیتے۔

(۵) اکثر گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اپنا زیادہ تر وقت گھر گرہستی کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ جو اسکول سڑک سے کافی دُور واقع ہوتے ہیں، وہاں تک پہونچنے میں دقتیں حائل رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مدرس اپنی طرف سے کسی دوسرے مڈل پاس شخص کو دو چار روپیہ ماہوار پہ نوکر رکھ لیتے ہیں اور خود گھر کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ جب قرب و جوار میں کسی افسر کی آمد کی خبر سُنتے ہیں تو اسکول میں پہونچ جاتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(۶) عموماً مدرسین اپنی علمی استعداد بڑھانے کی فکر نہیں کرتے۔ نہ بیرونی کتابیں ہی پڑھتے ہیں اور نہ کسی اخبار یا رسالہ ہی کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ عام طور پر مڈل اسکولوں کی لائبریریوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے مگر اب گورنمنٹ صوبہ کے محکمہ توسیع تعلیم نے کچھ لائبریریاں اور اخبار گھر کھولے ہیں، اُن سے ضرور بہت بڑا فائدہ ہو گا۔

(۷) معائنوں کی سفارشوں پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ مدرسین اِس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ سررشتہ تعلیم کے چیرمین کی اجازت کے بغیر اُن سے کوئی بازپُرس نہیں ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب کبھی اُن کو یہ خوف ہوتا ہے کہ ان کی غلطیاں نظر انداز نہ کی جائیں گی تو وہ ممبر صاحبان کے ذریعہ چیرمین صاحب پر جائز و ناجائز ہر قسم کا دباؤ ڈالنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔

اِن اسباب کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کا مُضر اثر دیہاتی اسکولوں کی تعلیم پر پڑتا ہے۔

امتحانات سارے صوبہ کے لئے ساتویں درجے کا امتحان رجسٹرار صاحب ورنا کیولر مڈل اگزامینیشن کی زیر نگرانی ایک مقررہ وقت پر ہوتا ہے۔ ہر اسکول میں پانچویں اور چھٹویں درجے کے امتحانات فرداً فرداً اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی زیر نگرانی ہوتے ہیں۔ ان امتحانات کے لئے مدرسین میں سے ایک مدرس بطور رجسٹرار منتخب کر لیا جاتا ہے اور سب ممتحن اپنے اپنے پرچے بنا کر اُسی کے پاس بھیج دیتے ہیں اور وہ اُنھیں چھپوا کر ہر اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس بھیج دیتا ہے اور وقت مقررہ پر

امتحان شروع ہوجاتا ہے۔ یہ طریقہ بہت بہتر ہے۔کیونکہ اسمیں سعی وسفارش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔
اپر پرائمری امتحانات | قریباً ہر سب ڈپٹی انسپکٹر کی زیر نگرانی چالیس سے پچاس، ساٹھ تک اسکول ہوتے ہیں۔ اُن کے امتحانات بھی سب ڈپٹی انسپکٹر صاحبان کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ایجوکیشنل کوڈ کے مطابق چار یا پانچ افسر مدرسین قریب کے اسکولوں کے طالب علموں کو ایک جگہ جمع کرکے، حلقہ کے سب ڈپٹی انسپکٹر کی زیر نگرانی طلبا ر کا امتحان لیتے ہیں۔ سب ڈپٹی انسپکٹر کو امتحان کے پرچے سخت یا سہل کرنے کا اختیار ہے۔ اگر کسی مدرس کے جانچنے یا پرچہ بنانے کا معیار گرا ہوا ہے تو سب ڈپٹی انسپکٹر اسکی رپورٹ سررشتہ میں کریں گے۔
ایجوکیشنل کوڈ کی رُو سے اگر کوئی طالب علم کسی لازمی مضمون میں فیل ہوگا۔ تو وہ پاس نہیں کیا جائیگا۔ کامیابی کے لئے ہر لازمی مضمون میں کسی طالب علم کو پچاس فی صدی سے کم نمبر نہ ملنا چاہئے۔
مگر ان امتحانات کے نتیجے خاطر خواہ نہیں ہوتے۔ معدودے چند مدارس کو چھوڑکر بقیہ اسکولوں کا معیار اوسط سے گرا ہوا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر مدرسین جدید طریقہ تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ رٹے ہوئے سوالات کے جوابات پوچھتے ہیں۔ اگر اُن کے پرچوں میں ذرا بھی رد بدل کیا جائے تو اُن کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں اور وہ پریشان و مضمحل نظر آتے ہیں۔
چونکہ ان صاحبان کے ہاتھ سے یہ امتحان نکال لیا گیا ہے۔ اِس لئے نتیجہ کا مقررہ اوسط برقرار رکھنے کے لئے (جیسا کہ اکثر ضلعوں میں رائج ہے کہ اگر پچاس فیصدی سے کم طالب علم کامیاب ہوئے تو مدرس سے سختی سے باز پُرس کی جاتی ہے) شروع ہی سے تیسرے درجہ سے کمزور لڑکوں کو ترقیاں دینا روک دیتے ہیں یا کمزور طالب علموں کو کسی نہ کسی بہانے سے درجہ سے خارج کر دیتے ہیں۔
بعض اوقات فیل شدہ طالب علموں کو ترقی دلانے کے لئے ایسی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، جنکو سُنکر افسوس اور تعجب ہوتا ہے مثلاً (۱) "یہ لڑکا ضرور پاس کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ زمیندار صاحب کا فرزند ہے۔ اور مَیں اُن کے گھر میں رہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو اُس کے بجائے کسی دوسرے طالب کو فیل کردیں"۔
(۲) "یہ منیجر کا لڑکا ہے اِس کے فیل ہونے سے اسکول کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے اور ہم لوگوں کے معاش کا دروازہ بند ہوجائے گا۔"
غرض اس قسم کی بہت سی لغو باتیں سُننے میں آتی ہیں۔ بعض لوگ امتحان سے ایک دن قبل کسی طے شدہ مقام پر جمع ہوکر سب ڈپٹی انسپکٹر کی غیبت میں پرچہ بناتے اور طالب علموں کو سوالات حل کرا دیتے ہیں۔ اور دوسرے دن اپنے حلقہ کے افسر کے سامنے وہی پرچہ بنا کر دیتے ہیں۔
یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مدرسین پرچہ حل کرنے کے وقت اِس بات کے کوشاں رہتے ہیں کہ

کسی نہ کسی طرح اپنے طلباء کو اشارہ سے جوابات بتلا دیں۔

ان سب باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے مدرسین کا اخلاقی معیار بہت پست ہے۔ اور وہ اپنے طلبا کو پاس کرانے میں جائز و ناجائز ہر طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔

انفینٹ (Infant) یعنی ابتدائی جماعت سے تیسرے درجہ تک کے امتحانات لینا اور ترقی دینا خود مدرسین کے اختیار میں ہوتا ہے۔

اِن سب تفصیلات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دیہات کی موجودہ تعلیم میں جہاں اور ردوبدل کی ضرورت ہے وہاں امتحانات لینے کے طریقے کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ ہمارے یہاں امتحانات کی بہت زیادہ تعداد ہے اور جس طرح امتحانات لئے جاتے ہیں۔ اُس سے طالب علموں کو کوئی خاص لیاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اور نہ انھیں کوئی خاص فائدہ ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر لڑکے کتابوں کے کیڑے ہو جاتے ہیں اور سمجھنے کے بجائے رٹنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔

پینتیس ۳۵ سال پہلے

زمانہ بابت جولائی ۱۹۰۵ء میں پنڈت برج نراین صاحب چکبست لکھنوی کا حضرت داغ دہلوی پر وہ معرکۃ الآرا مضمون شائع ہوا تھا جو اس وقت اُردو کے بعض اعلیٰ امتحانات کے کورس میں داخل ہو گیا ہے اس کے ابتدائی حصہ میں ہمارے فاضل دوست نے شاعری کے مفہوم سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اُسکے جذباتِ دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور اک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاستِ زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ انمیں علاوہ عالم تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جسمیں اُسکے خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اسکے جذباتِ دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اسکی زبان سے نکلتے ہیں غرضکہ جذبات شاعری کی روح رواں ہیں۔ اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے لہذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا۔ وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش میں لائیگا۔ مگر ان جذبات و خیالات وغیرہ کی دو قسمیں ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ جذبات و خیالات سے بحیثیت مجموعی فطرت انسانی کا روحانی حصہ مراد لیا جاتا ہے۔ اور ادنیٰ جذبات و خیالات سے حیوانی حصہ۔ جس شاعر کی فطرت میں اعلیٰ جذبات و خیالات ترقی پر ہوتے ہیں وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی کی ہوا میں اُڑتا ہے اور اس کا کلام دوسروں کے دل میں بھی اعلےٰ جذبات کو جوش میں لاتا ہے۔ برعکس اس کے جس شاعر کی فطرت میں ادنیٰ جذبات و خیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے۔ اُس کے اعلیٰ جذبات و خیالات ریگ تہ نشین کی طرح پامال رہتے ہیں اور اس کی شاعری سننے والے کے دل میں بھی ادنےٰ جذبات برانگیختہ کرتی ہے۔"

نوائے یگانہ

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

حاصلِ فکرِ نارسا کیا ہے — تو خدا بن گیا، بُرا کیا ہے؟
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے؟
آئی کو ٹال دے جبھی جانیں — دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے؟
دل ہے اپنی جگہ خدا اپنا — ہم غریبوں کا آسرا کیا ہے؟
نہ سنا ہوگا راگ فطرت کا — جانتے ہو مری صدا کیا ہے؟
وہی نیرنگیٔ طلسمِ ہوا — موج کیا اور بُلبُلا کیا ہے؟
دیدۂ دل سے دیکھ اپنی طرف — چشمِ حیراں تجھے ہوا کیا ہے؟
نور ہی نور ہے کہاں کا ظہور؟ — اُٹھ گیا پردہ اب رہا کیا ہے؟
حُسن کے ہتھکنڈے ارے توبہ! — درد کیا چیز ہے دوا کیا ہے؟
زہر میٹھا نہ ہو تو زہر ہی کیا؟ — دوست جب دے تو پوچھنا کیا ہے؟
رہنے دے حُسن کا ڈھکا پردہ — وقت بے وقت جھانکتا کیا ہے؟
عکس میرا بھی پڑ گیا ناگاہ — ارے آئینہ کی خطا کیا ہے؟
وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ — سہو کیا چیز ہے خطا کیا ہے؟
دردِ دل کی کوئی دوا نہ دعا — "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟"
کیا ٹلے گی مشیّتِ ازلی! — اِک تسلّی سی ہے دعا کیا ہے؟
ڈوب کر پار اُتر گیا اسلام — آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے؟

اپنے ہی عکس پہ ہو چیں بہ جبیں
کیوں یگانہ یہ ماجرا کیا ہے؟

بوڑھا انور

از مسٹر رہبر بی۔اے

پت جھڑ کا موسم تھا۔ دریا کنارہ کے بڑے بڑے تناور درخت اپنی برہنہ ٹہنیوں پر چند آخری زرد زرد پتّوں کو دریا کے پانی میں لرزتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی چنچل کرنیں موجوں کے آغوش میں چھپ جانے کے لئے پانی کے ریلوں کیساتھ بھاگی چلی جاتی تھیں۔ شفق کا رنگین عکس ابھر ابھر کر سطح پر بکھرا جاتا تھا اور یوں معلوم دیتا تھا گویا دریا کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا ہے۔

یہ ایک خوشگوار اور خیال آفرین شام تھی۔ بوڑھا انور دریا کے کنارے بیٹھا اور بائیں بازو کے سہارے جھکا ہوا صاف پانی میں اپنی بل کھائی ہوئی پیشانی کو یوں دیکھ رہا تھا گویا گذری ہوئی بہاریں گن رہا ہو۔ دریا میں لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ساحل تک پہونچ پہونچ کر لوٹ جاتی تھیں اور پھر واپس آتی تھیں۔ بوڑھے کا عکس بھی درختوں کے پتّوں کی طرح لرزاں تھا۔ اس کے دماغ میں کتنے ہی پریشان کن اور اُلجھے ہوئے خیالات کی رَو بہہ رہی تھی۔ دریا کی لہروں کی طرح ماضی کی کتنی ہی یادیں اُس کے ذہن میں آتی چلی جاتیں اور پھر آجاتی تھیں۔ اُس کے چہرے کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا تھا کبھی سخت ہوجاتا تھا اور کبھی غمگین اسی اثنا میں گلاب کے چند پھول بہتے ہوئے اُس کے قریب آگئے۔ اُس نے ہاتھ پھیلا کر انھیں پکڑ لیا پھول مرجھا چکے تھے، اُن کی خوشبو ضائع ہوچکی تھی۔ مگر گذشتہ بہار کی یادگار تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بوڑھے انور کی آنکھوں میں روشنی کی ایک غیر معمولی چمک نمایاں ہوئی اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی میٹھی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس چمک اور مسکراہٹ کا مجموعی اثر سورج کی آخری کرنوں سے زیادہ حسین اور زیادہ دلکش تھا۔ اب وہ اپنی گذشتہ زندگی کے ایک ایسے واقعہ پر پہونچ گیا تھا۔ جس کی یاد سے اُس کے سوکھے بدن میں ایک نازک کیفیت پیدا ہوگئی اور اُس کے سمجھنے سوچنے کی تمام قوت اس ایک واقعہ پر مرکوز ہوگئی۔ جیسے گھومتے ہوئے لٹو کی قوت گردش ایک نقطہ پر جمع ہوجاتی ہے۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ صبح سے پہلے پھر طلوع نہیں ہوسکتا۔ پھول مرجھا چکے تھے، اُن پر اب تازگی نہیں آسکتی۔ بہار گذر چکی تھی، وقت مقررہ سے پہلے اُسے کوئی واپس نہیں بلا سکتا۔ مگر یاد—

ایک یاد ان سب سے زبردست ہے۔ انسانی دل میں وہ ہر وقت طلوع ہوتی رہتی ہے، وہ ہر وقت تازہ ہے
اُس کی بہار کا کوئی وقت معین نہیں۔ وہ سدا بہار ہے۔ بوڑھے انور کے دل میں بھی یہ یاد اس طرح تازہ
اور شگفتہ تھی گویا کل کی بات ہو۔ اگرچہ واقعہ بالکل مختصر تھا اور اس کی اتنی بڑی زندگی میں آنکھ جھپکنے
کے برابر تھا۔ پھر بھی اتنا کیف آور اور مسرور کن تھا کہ اس کی تمام زندگی پر محیط تھا۔

× ×

اس کا عنفوانِ شباب تھا اور وہ اپنے کھیت میں بیلوں کے لئے چارہ کاٹ رہا تھا کہ سامنے
کنوئیں پر کسی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ وہاں ایک بیری تھی جسے کنوئیں والی بیری کہتے تھے۔ اسکے بڑے بڑے
گول میٹھے اور خوبصورت بیر کلّو کے سیبوں کی طرح مشہور تھے۔ انور نے اُٹھکر دیکھا کہ بیری کے پتّے ہل رہے
ہیں۔ کوئی ٹہنیاں جھکا جھکا کر بیر توڑ رہا ہے۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ غصّے میں
بھرا اور جھلّایا ہوا اُدھر کو چلا۔ یہ لوگ کتنے ڈھیٹھ ہیں، جب منع کر رکھا ہے کہ اس بیری کے بیر کوئی نہ
توڑے تو یہ لوگ کیوں آجاتے ہیں؟ کیا باوا کا راج سمجھ رکھا ہے انھوں نے؟

وہ اسی طرح بڑبڑاتا اور دل ہی دل میں بَل کھاتا ہوا جا رہا تھا اور جب قریب پہونچ گیا تو للکارا:۔
"کون ہے تو بیر توڑنے والا؟ تجھے خبر نہیں۔۔۔۔"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ سامنے عطیہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ہزار دل جنتیں پنہاں تھیں،
انور کا سارا غصہ فرو ہوگیا۔ بلکہ وہ پچھتا رہا تھا کہ میں کیوں اتنا تیز ہوا۔ پہلے ہی دیکھ لینا چاہئے تھا کہ کون ہے،
سب کو ایک ہی لاٹھی سے تو نہیں ہانکا جاتا۔ آخر وہ بیچاری کچھ اپنا ہی سمجھکر تو آئی ہوگی۔ آہ! وہ کس قدر
پشیمان تھا۔ اسے اتنی جرأت نہ تھی کہ آنکھ اُٹھا کر عطیہ سے بات کر سکے۔ اس لئے اُس نے آنکھیں جھکائے
ہوئے ہی مگر ذرا مسکرا کر کہا:۔

"عطّو! بیر توڑ رہی ہو؟"

"ہاں، بیر ہی توڑنے آئی ہوں۔ اگر تم خفا ہو تو چلی جاؤں؟" عطیہ نے اپنی دلرُبا قوتوں کو نوراً افروز
آنکھوں میں بھر کر جواب دیا۔

جس طرح پھول کی خوشبو سے بھونرے کے دل کا راگ اُمڈ آتا ہے۔ اس خود دارانہ جواب سے
انور کا مردانہ غرور جاگ اُٹھا۔ اس نے عطیہ کے اس میٹھے طعنہ کے جواب میں کہا:۔

"واہ! جانے کی بھی ایک ہی کہی۔ بھلا عطّو میں اور تم پر خفا ہوں گا۔ کہو تو اوپر چڑھکر بیر توڑ دوں؟"
انور یہ جملے از خود رفتگی کی رَو میں بہہ کر کہہ گیا۔ کون جانے ان میں ہمدردی زیادہ تھی یا محبت؟

عطیہ نہ تو شرمائی اور نہ اُس نے بُرا مانا۔ بلکہ وہ اپنی بڑی بڑی شوخ آنکھوں کو چمکا کر بولی:۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ"

انور پر جیسے کسی نے جادو کر دیا۔ وہ چارہ اور بیل سب بھول بھال کر بیری پر چڑھ گیا۔ اور بیر توڑ توڑ کر نیچے پھینکنے لگا۔

عطیہ نے انھیں اٹھا اٹھا کر جھولی میں ڈالتے ہوئے کہا:۔

"نیچے کی ٹہنیوں پر تو ایک بھی بیر نہیں۔ لوگوں نے سب توڑ لئے۔ میں تو اب تک یونہی پریشان ہوتی رہی، پہلے ہی تمھیں کیوں نہ پکار لیا"

"پہلے ہی تمھیں کیوں نہ پکار لیا" کیا محبت کی کتاب میں اس سے بہتر نغمہ مل سکتا ہے۔ انور کی خوش نصیبی پر کون نوجوان رشک نہ کھائے گا! اسے بھی کیا معلوم تھا کہ اس کی محنت کا صلہ اس طرح اور اتنی جلدی مل جائے گا۔ اُس نے اِس غیر متوقع مسرت سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے جواب دیا:۔

"کیا کروں عطو؟ میں تو بہتیرا روکتا ہوں۔ پھر بھی لوگ ہیں کہ ذرا نہیں مانتے۔ آگے پیچھے آہی دھمکتے ہیں"

"جیسے میں! اور پھر اتنے ڈھیٹ کہ منع کرنے پر بھی باز نہیں آتے۔ ہے نا؟" عطیہ نے چھیڑ کر کہا:۔

"من میں تو مجھے کوستے ہی ہوگے؟"

"نہیں عطو! قسم خدا کی تمھیں کس طرح یقین دلاؤں۔ تم تو جس وقت بھی چاہو آسکتی ہو۔"

یہ الفاظ انور کی زبان سے نہیں دل سے ادا ہوئے تھے۔ انمیں اتنا خلوص اور اس قدر صفائی تھی کہ عطیہ ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو بھول گئی اور اُس نے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:۔

"کیوں انور میں تمھاری کون ہوتی ہوں؟"

اس وقت اس کی آنکھوں میں کسقدر استفسار، کس قدر جاذبیت اور کس قدر کشش تھی۔ گویا وہ اِس فانی دنیا کی دیہاتی لڑکی نہیں بلکہ کسی لافانی دنیا کی کوئی ساحرہ تھی جو انور کو اپنے بس میں کرنے آئی تھی۔ دونوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دوسرے کو دیکھا اور دیکھا۔ اور میں کیسے بتاؤں کہ اس دیکھنے سے کیا ہوا؟ بس سمجھ لیجئے کہ ہر محبت کی ابتدا اِسی دیکھنے سے ہوتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کے سامنے مرد بے بس ہو جاتا ہے۔ عورت کا یہ جادو مشہور ہے اور اُس کا اثر ہمہ گیر۔ مگر عورت بھی آدمی کے اثر سے مستثنیٰ نہیں ہوتی جذبات کی کشمکش دونوں جانب ہوتی ہے ماہر نفسیات ڈاکٹر ہیوگو کا نظریہ ہے کہ محبت کے معاملہ میں آدمی تو جھجکتا ہی رہتا ہے، پیشقدمی عورت کرتی ہے کیونکہ عورت گریز پسند اور مرد جرأت پسند واقع ہوا ہے۔ اس وقت وہ ایک دوسرے کی صفات حاصل کرتے ہیں۔ اور

دونوں کی قوتیں متوازن ہوکر محبت کو نشوونما دیتی ہیں۔

ہر ایک فعل کا ردِ عمل ضروری ہے۔ کچھ دیر میں جب سرور ٹوٹا تو عطیہ کو محسوس ہوا کہ یہ اُس نے کیا کہہ دیا تھا۔ وہ حیا سے سُرخ ہوکر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ اور انور نے گیہوں کے کھیتوں پر اڑتے ہوئے سارسوں کو دیکھنا شروع کیا مگر جو مجوب کن سی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کو دور کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہنا ضروری تھا۔ اس لئے انور نے چند عمدہ عمدہ پکے ہوئے بیر توڑ کر کہا:-

"دیکھو عطیہ، کتنے خوبصورت بیر ہیں!"

"ہاں! پھینکو نیچے" عطیہ نے اوپر جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسے نہیں پھینکوں گا۔ زمین پر گرے تو ٹوٹ جائیں گے"

"اچھا میں جھولی کرتی ہوں۔ اس میں پھینکنا"

عطیہ نے اپنے سر کی چنری اُتار کر ایک طرف بچھا دی۔ تمام بیر اُس میں ڈال دئے۔ پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور جھولی پھیلا کر انور سے بیر پھینکنے کے لئے کہا۔

انور نے بیر پھینکے اور وہ ہوا میں اُڑتے ہوئے عطیہ کی جھولی کی طرف بڑھے۔ لیکن عطیہ کو یوں معلوم ہوا کہ وہ زمین پر گر پڑیں گے۔ وہ اوپر کو دیکھتی ہوئی ذرا آگے بڑھی۔ بیر اُس کے مُنہ پر گرے اور ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ عطیہ اور انور دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کس قدر مسرت افروز تھی وہ ہنسی! انور کے دِل میں ایک خاص آرزو پیدا ہوئی۔ لیکن اُس نے ہمدردی کے طور پر پوچھا۔

"چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں!" جو بال پیشانی پر آگئے تھے، عطیہ نے انھیں سنوارتے ہوئے کہا۔ اس کے جا بجا پھٹے ہوئے قمیص میں سے اُس کا گورا چٹا حسین جسم نظر آرہا تھا۔

× × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

اُس وقت انور کی عمر بیس اکیس برس کی تھی اور عطیہ کی پندرہ سولہ کی۔ اس کے بعد وہ کبھی دوبارہ نہ مل سکے اور ملتے بھی کیسے؟ انور دوسرے ہی دن شہر چلا گیا اور وہاں فوج میں بھرتی ہو گیا تاکہ روپیہ کما کر گاؤں واپس آئے اور عطیہ سے شادی کرلے۔ اگرچہ روپیہ کا ہونا شادی کی کوئی ضروری شرط نہ تھی کیونکہ اُس کا باپ اچھا کھاتا پیتا آدمی تھا اور کافی زمین کا مالک تھا۔ مگر یہ اُس کے مردانہ وقار کا تقاضا تھا۔ چنانچہ اُس نے خوب جان توڑ کر کام کیا۔ چار ہی سال میں سپاہی سے لیس، نائک اور حولدار کے مدارج طے کرلئے اور تنخواہ میں بھی معتدبہ اضافہ ہو گیا۔

عطیہ کی خبر اُسے برابر آتی رہتی تھی۔ بلکہ اب ان دونوں کی نسبت بھی قرار پا گئی۔ انور نے چھٹی لی کہ گھر جا کر شادی کرے۔ وہ صبح ہی گاؤں کو روانہ ہونے والا تھا۔ مگر رات کو ہی اطلاع پہونچ گئی کہ سب چھٹیاں منسوخ۔ جرمنی سے جنگ چھڑ گئی ہے۔

دو دن میں اُن کی فوج کا دستہ افریقہ کو روانہ ہو گیا۔

اُس کے بعد انور کی زندگی میں یاد کرنے کے لئے کیا تھا۔ صرف جنگ کا محاذ ـــــ بیحس اور بیرحم توپوں کی دنادن ـــــ مظلوم، معصوم، اپاہج اور خون آلود انسانیت! ـــــ اور ان سب سے بھیانک تھی جرمنی کی قید۔ وہ کس طرح دشمن کے ہاتھ میں پڑا اور کس طرح جنگ کا قیدی بنا کر چار سال قید تنہائی میں رکھا گیا۔ اس قید میں اُسے کس قدر تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ کس قدر ذہنی کوفت برداشت کرنی پڑی۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا سکتا ہے کہ وہ چالیس سال کی عمر ہی میں بوڑھا ہو گیا۔ اُس کے سر کے بال جھڑ چکے تھے اور جو باقی تھے وہ سفید پڑ گئے تھے۔ کیا وہ دولت، جاگیر اور پنشن جو اُسے رہا ہونے کے بعد ملی، اُس نقصان کی تلافی کر سکتی تھی؟ کیا وہ چیز جو اُس نے جنگ کی بھینٹ چڑھا دی تھی اُسے واپس مل سکتی تھی؟ کیا اُس کی عزیز جوانی کسی طرح واپس آ سکتی تھی؟

× × × × ×　× × × × × × × × × × × × × ×

اِس وقت انور کی عمر پچاس سال تھی۔ عطیہ اب بوڑھی ہو گئی تھی اور دس بچوں کی ماں تھی۔ اُسکی فوجی زندگی کے واقعات اور قیدِ تنہائی کے اثرات بہت کچھ فراموش ہو چکے تھے اور جو باقی تھے وہ بھی رفتہ رفتہ فراموش ہو رہے تھے۔ مگر وہ چند رومانی لمحے، وہ حسین عطیہ، وہ نورا فروز آنکھیں، وہ ازلی مسکراہٹ ـــــ ان سب کی یادیں جوں کی توں محفوظ تھیں۔ کوئی غیر مرئی ہستی اُسکے دل میں بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ "کیوں انور، میں تمہاری کون ہوتی ہوں؟" یہ اس کی محبت اور جوانی کے غیر فانی لمحے تھے۔

وہ گاؤں سے دور اس جگہ دریا کے کنارے آکر بیٹھا کرتا تھا اور انھیں لمحوں کا تصور باندھ کر لطف حاصل کیا کرتا تھا۔ اسوقت یہ لمحے پھیل کر لا متناہی ہو جاتے تھے۔ آج بھی وہ انھیں لمحوں کی یادیں محو بیٹھا تھا۔ اور نہ جانے کتنی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہتا۔ لیکن ہوا تیز اور سرد ہو گئی۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر اُٹھا۔ اور اپنے فوجی کوٹ کے کھڑوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے گاؤں کی طرف چل دیا۔

چاند نکل آیا تھا۔ سوکھے پتے اِدھر اُدھر اُڑ کر فضا میں خفیف سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے اور دُور کوئی کھیت کا رکھوالا گا رہا تھا ؎

بیریاں دے بیر مک گئے　　دس کہڑے بہانے آواں

اے پریتم! بیریوں کے بیر ختم ہو گئے، بتائیں کس بہانے آؤں؟

<×>

تا الستقۂ تو دو دتھا نہ لیجیے تیکو مری گناہ ...

جذباتِ جنوں

(از مولوی نذیر حسین صاحب صدیقی جنون)

۱
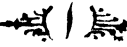
شکیب و صبر کو لوٹا، قرار لوٹ لیا — نگاہِ ناز نے پروردگار! لوٹ لیا
جھکی جھکی یہ نگاہیں، چھپے چھپے یہ خدنگ — تری اداؤں نے اے فتنہ کار لوٹ لیا
کبھی تو لطف کی دل پر نگاہ کی ہوتی — یہ کیا ستم ہے کہ بیگانہ دار لوٹ لیا
یہ دلبری کی ادائیں، یہ رہزنی کے کمال — یہ ایک وار میں سب تار تار لوٹ لیا
ترے تصورِ پیہم نے کر دیا مبہوت — ترے خیال نے انجام کار لوٹ لیا
شکستِ حسن کو حسنِ شکست سے بدلا — نظر جھکا کے پھر اے شرمسار لوٹ لیا

گنوا کے دل کو تہیدست آ رہا ہے جنوں
کسی نے آج سرِ رہ گذار لوٹ لیا

۲

سرورِ غم کو خراب، اے خراب کار نہ کر — خزاں کے کیف کو آلودۂ بہار نہ کر
نگاہِ شوق میں بھر لے تمام عالمِ حسن — مذاقِ دید کو پابندِ روئے یار نہ کر
نظر ملا کے دل و جاں کو لوٹنے والے — مرے ہی ذوقِ تمنا سے مجھ پہ وار نہ کر
اسیرِ حلقۂ وہم و خیال رہنے دے — مرے وجود سے اب مجھ کو شرمسار نہ کر

وہ اٹھ کے رہ گئی آوازِ جاں گداز جنوں
اب اپنی زندگیِ دل کا اعتبار نہ کر

جوششِ غم میں گریۂ بے اختیار آ ہی گیا — ضبط کی حد سے گذر کر کچھ قرار آ ہی گیا

اس نے کچھ دل سے کہا اور دل نے کچھ اُس سے کہا | اس کو دل پر دل کو اس پر اعتبار آ ہی گیا
غیر ممکن تھا کہ رہتا جذبِ الفت بے اثر | حسن کو بھی عشق پر آخر پیار آ ہی گیا
کیا جگر تھامے ہوئے بیٹھا ہے اُن کا بے قرار | اور اس انداز سے گویا قرار آ ہی گیا

پردہ ہائے رنگ و بو کی آڑ لے کر جنوں
وہ بہارِ جان و دل جانِ بہار آ ہی گیا

۳

تسکینِ اضطراب کا ساماں نہ ہو سکا | پایانِ شوق، شوق کا پایاں نہ ہو سکا
جو دل تری نگاہ پہ قرباں نہ ہو سکا | وہ دل کے پاک نام کا شایاں نہ ہو سکا
میری نگاہِ شوق میں کھنچ کھنچ کے بھر گیا | تصویر کا وہ رُخ جو نمایاں نہ ہو سکا
آخر اُبل پڑی غمِ الفت کی سیلِ غم | آنکھوں سے ضبط درد کا طوفاں نہ ہو سکا
دل میں ہجومِ شوق تھا لب پر سکوتِ شوق | اظہار حالِ دل کسی عنواں نہ ہو سکا
آنکھوں سے دُور رہ کے بھی پیشِ نظر رہا | پنہاں بھی ہو گیا تو وہ پنہاں نہ ہو سکا

دل میں تڑپ تڑپ کے بنا دردِ دل جنوں
ہر اشکِ خوں جو ہدیۂ مژگاں نہ ہو سکا

۴

سراپا شوق ہو کر کیف سے معمور ہو جانا | زبانِ عشق میں ہے بے پیئے مخمور ہو جانا
حدودِ ہجر کی یہ وسعتیں اے حسن بے پروا | مرے ہر قرب کے ہمراہ تیرا دُور ہو جانا
نگاہِ حسن کی عکس آفرینی سے بچو ورنہ | تمھیں مسحور کر دے گا مرا مسحور ہو جانا
یہی جبرِ مسلسل اختیارِ عشق کا حل ہے | مجھے مجبور کر کے اُن کا خود مجبور ہو جانا
قیامت ہے کسی کے دیدۂ دل پر قیامت ہے | نظر کا تجھ سے یا تیر انظر سے دُور ہو جانا

بتا اے غیرتِ جوشِ جنوں اے ننگِ آزادی
ترا اس تنگنائے دہر میں محصور ہو جانا

تنقید کتب

باسی پھول

از سید اختر علی تلہری، جوبلی کالج لکھنؤ

علی عباس صاحب حسینی، اُردو کے نامور افسانہ نگاروں میں ہیں۔ اُن کے دلپذیر افسانوں کے ۲ دو مجموعے "رفیق تنہائی" اور "آئی۔ سی۔ ایس" شائع ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ حال میں مکتبۂ اُردو لاہور نے "باسی پھول" کے نام سے ۱۴ چودہ افسانوں کا ایک جدید مجموعہ آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔

حسینی صاحب "نفسیاتی تحلیل و تجزیہ" کا خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کے افسانوں کے افراد کے کرداروں میں زندگی کی شعاعوں کی چمک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے قصّوں میں وہ مختلف سیرتوں کی جو تصویریں کھینچتے ہیں۔ وہ حقیقت بین نگاہوں کو چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ حقائق کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ حسینی صاحب فن کاری (Art) میں بھی یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ حقیقتوں کے بیان کے لئے جو زبان اختیار کرتے ہیں، وہ لطیف استعاروں اور دل نشین تشبیہوں سے سجی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس طرح اُن کی نثر کے بہت سے حصّے شعر منثور کی چمنستانی حدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اِس مجموعہ کا سب سے پہلا افسانہ "باسی پھول" ہے۔ یہ کافی طولانی ہے۔ اِس کے ۲ دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ لائق افسانہ نگار کی سب سے پہلی مشق ہے اور دوسرا عنفوان شباب کی مشق۔ اِس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں، اگر اس کے زمین و آسمان میں "رومانیت" ہی "رومانیت" کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اِس افسانہ کا دوسرا حصّہ اُسوقت میں لکھا گیا ہے، جبکہ افسانہ نگار کے قلم سے بہت سے افسانے نکل چکے تھے اور شباب کی جنون خیز شورشیں متانت و سنجیدگی کے بوڑھے پن میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوسرے حصّہ میں رومانوی عشق و عاشقی کی فضا میں پرواز کرنیکے بجائے مصنف کے قدم واقعیت کی دُنیا میں جمتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور "افلاطونی عشق" (Platonic Love) ازدواجی زندگی کی طلائی بلکہ فولادی زنجیروں میں اپنے کو قید کرا دیتا ہے۔ اس حصّہ میں زبان و بیان کی پختگی خاص طور سے نمایاں ہے۔

اِس مجموعہ کا دوسرا افسانہ "گونگا ہری" ہے۔ اس میں بھی رومانیت کا عنصر موجود ہے۔ مگر افسانہ نگار کی فن کاری پُورے شباب پر ہے۔ ٹھاکر اجیت سنگھ کی اکلوتی چاندسی لڑکی اندرا پر اُنھیں کی ریاست میں بسنے والے سنگتراش کے لڑکے گونگے ہری کا نظریں ڈالنا۔ اور اُس کی پتھر اور مٹی کی مورتیاں بنا بنا کر اپنے پاس رکھنا۔ اُن کے رئیسانہ غرور کو حد سے زیادہ صدمہ پہونچانے والی چیز تھی۔ ٹھاکر صاحب نے اُسے پکڑ وا بلوایا اور اُسے خوب زدو کوب کیا۔ وہ غریب قصبہ سے بھاگ گیا۔ افسانہ نگار اِس آخری مقام کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:۔

"وہ اِس طرح بھاگا جیسے کبوتر بہری کے پنجے سے چھوٹ کر، اور فاختہ بلّی کے مُنھ سے پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے۔ غرور و نخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی۔ محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی، جو ہندوستان میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے۔ مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یونہی بھاگ نکلتی ہے۔ تاریکی اِسی طرح آفتاب کو زرد رو بنا کر جھکا دیتی ہے۔ کالی راتوں سے چاندنی اِسی طرح فرار کرجاتی ہے سیاہ و دراز زلفیں اِسی طرح افشاں کی پتلی لکیر کو ڈھک لیتی ہے۔"

آگے چل کر یہ دکھایا گیا ہے کہ قدرت نے "گونگے ہری" کو نطق کے عیوض ایک خاص چیز عطا کی تھی۔ ہاتھ میں سنگتراشی کا خاص سلیقہ اور دماغ میں اِس فنِ لطیف کے ماہرین کا مادۂ ایجاد۔ اِس حقیقت کے بیان کو اس تمہید سے شروع کیا گیا ہے۔

"داتا کی دین کی عجیب لیلا ہے جس طرح بخشش اُن سے عجب نہیں اُسی طرح ہر ایک کو تول تول کے دینا بھی انھیں کا کام ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے اگر کسی سے کوئی چیز چھین لی تو دوسری چیز دوسروں سے زیادہ دیدی۔ کسان سے ریاست لے لی قناعت دیدی۔ غریب سے امیری لے لی، سچائی دے دی۔ سرمایہ دار سے ایمان لے لیا، عشرت دیدی۔ پھول کو قوتِ پرواز نہ دی، رنگ و بو عطا کردئے۔ ہیرے کو چمک دی تو مشک کی سی خوشبو نہ دی۔ بلبل کو چہکنا دیا تو عقابی پرواز غائب۔ عقاب کو آسمان سے آنکھ لڑانا سیکھایا تو خوش گلوئی ندارد۔"

اگرچہ ترقی پسند مُصنفین کو "داتا کی دین" کا اِس عنوان سے تذکرہ کہ غریبی و امیری کے تفرقے ایک غیبی قوت (خدا) کے رہینِ منت ہو جائیں، پسند نہ آئے گا۔ کیونکہ اس سے اُن کے تصورحیات کو دھچکا پہونچتا ہے۔ مگر مجھے یہاں افسانہ نگار کے اُن نظریات کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں ہے بلکہ صرف اُن کے کمالِ فن کی مثال پیش کرنا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ عرض کرنا بھی ہے کہ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے مُصنف نے اپنے شاعرانہ بیان کو ضرورت سے زیادہ طُول دیدیا ہے

اِس مجموعہ کے چند اور افسانے "بیوی"۔ "نئی ہمسائی"۔ "شکار یا شکاری" بھی خصوصیت سے پڑھنے کے

قابل ہیں۔ اُن میں انسانی عنصر بہت زیادہ موجود ہے۔

سب سے آخر میں "کیا کیا جائے" کے عنوان سے ایک افسانہ ہے۔ جسمیں ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ طبقہ کی ایک رات کی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے مگر اسے بہ تکلف افسانہ کہا جا سکتا ہے، ورنہ ان مناظر کی جگہ ڈرامہ میں زیادہ موزوں ہوتی۔

اس مجموعہ میں دو نقص اور نمایاں طور سے نظر آتے ہیں اول یہ کہ افسانوں کی ترتیب میں کسی خاص نظام کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اسی لئے اس مجموعہ میں مختلف قسم کے انمل اور بے جوڑ افسانے ملتے ہیں۔ چنانچہ بعض افسانوں میں زبان وخیال کی پختگی پورے طور سے موجود ہے اور بعض میں اس عنصر کی ذرا کمی ہے۔ بہرحال یہ مجموعہ ایسے ہار کی حیثیت رکھتا ہے جسمیں کہیں گیندے کے پھول ہیں اور کہیں گلاب کے۔

ان افسانوں کی تصنیف کے سنہ بھی دیدئے جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس سے مصنف کی زبان وخیال کے ارتقائی مدارج طے کرنے کا صحیح اندازہ ہو سکتا۔

اس مجموعہ میں کتابت کی غلطیاں بھی بہت زیادہ ہیں جن سے بعض مقامات پر غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

چند موٹی موٹی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ صفحہ ۹ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

"میں نے علم النفس کی کتاب پھینکی اور یونان کی تاریخ اٹھائی۔ پہلے ہی "انتنی اور کلوپیٹرا" کے قصہ پر نظر پڑی"۔

ظاہر ہے کہ "انتنی اور کلوپیٹرا" کو یونان کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصل میں یونان کے بعد "روما" رہ گیا۔ جس کی وجہ سے یہ غلطی پیدا ہوگئی۔

صفحہ ۲۶ پر "نمک چھڑکا گیا" کی جگہ "جس کے ہرے زخم پر نمک چھڑکے گئے" چھپ گیا۔

صفحہ ۷۱ پر پہلی سطر میں "بین الاقوامی" کی جگہ "بین القوامی" طبع ہوگیا۔ اسی صفحہ میں آگے بڑھ کر "صناعوں" کی جگہ "صنادل" نظر آتا ہے۔

صفحہ ۱۲۰ پر "مگر صدائے برنخاست" کی جگہ "مگر صدائے جواب برخاست" طبع ہوگیا ہے۔

صفحہ ۱۵۹ پر یہ عبارت ملتی ہے: "شوکت حسین کے شکاروں میں تین طرح کی بنات النعش تھیں کچھ تو وہ جنھیں اعصاب مجبور کرتا"۔ یہاں یا تو "کرتے" کے بجائے "کرتا" چھپ گیا ہے یا پھر اعصاب سے پہلے "کشش" کسی طرح حذف ہوگیا۔ اور "کرتی" کے بجائے "کرتا" چھپ گیا۔

صفحہ ۲۱۰ پر محمود موہانی کا یہ شعر "امتحان قدرتت خواہم در ایجاد عذاب" غلط چھپ گیا ہے۔ "قدرتت" کے بجائے صرف "قدرت" طبع ہوا ہے۔ جس سے مصرعہ غیر موزوں ہوگیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں اُنکی تصحیح کردی جائے گی۔ بہ حیثیت مجموعی کتاب بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ اسکی طباعت اچھی ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ اُردو لاہور۔

اقبال کا تعلیمی فلسفہ

IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY.

علامہ اقبال کا کلام ایک بحرِ بے پایاں ہے۔ جس کے مطالعہ میں مصروف ہو کر جب کوئی صاحبِ ذوق غوطہ لگاتا ہے تو اپنی پسند اور اپنے ظرف کے مطابق دامنِ مراد بھر لاتا ہے، کسی کا جال معرفت کے موتیوں سے بھرپور ہوتا ہے، کسی کا دامن تصوف کے جواہر پاروں سے معمور ہوتا ہے۔ کوئی اقبال کے کلام میں تسکینِ روح کے سامان کا جویا ہے، کوئی حقائق و معارف کا اور کوئی اس کے آئینہ میں پیغامِ عمل کی جھلک دیکھتا ہے۔ بہرحال اقبال پر اب تک جتنی کتابیں یا جتنے مضامین علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوئے انہیں مختلف پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر نے کلامِ اقبال کو ایک جدید نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھ کر ان کے فلسفۂ تعلیم پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم سمجھنے سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ علامہ مذکور کے نزدیک علم کیا چیز ہے اور اس کا ماحصل کیا ہے۔ "علم" سے مطلب خود اقبال کی نظروں میں یہ ہے:-

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے۔ جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علمِ حق کی ابتدا ہے، جیسا کہ میں نے "جاوید نامہ" میں لکھا ہے:-

علمِ حق اول حواس آخر حضور　　　آخر او می نگنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا۔ اور جو علمِ حق کی آخری منزل ہے اس کا دوسرا نام عشق ہے۔ علم و عشق کے تعلق میں جاوید نامہ میں کئی اشعار ہیں ۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں　　　علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے۔ اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان حاصل کرے۔ "بولہب را حیدرِ کرار کن"۔ اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے، یا یوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے، تو نوعِ انسان کے لئے سراسر رحمت ہے۔" (اقبال)

مندرجہ بالا عبارت سے ناظرین پر روشن ہو گیا ہوگا کہ اقبال کے نزدیک علم کیا چیز ہے اور اس کا مقصد و ماحصل کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک مشرق خود علم و فضل کا گہوارہ ہے۔ اسے مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی رائے میں مغربی علوم اگرچہ بظاہر خوشنما اور خوش آیند ہیں مگر وہ روحانیت سے محروم ہیں۔

اُن کی بنیاد ریت پر قائم ہے۔ اِسی لئے وہ فرماتے ہیں ؎

سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر　　　اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں

اس سے اقبالؔ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہلِ مشرق مغرب کی خوبیوں سے بہرہ اندوز نہ ہوں۔ البتہ وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی تنقید کر کے کھرے کھوٹے کو پرکھیں۔ اور اندھا دھند تقلید کی رَو میں نہ بہہ جائیں۔ بقول ؎

باید این اقوام را تنقیدِ غرب　　　شرق را از خود برد تقلیدِ غرب

دوسری خاص بات یہ ہے کہ اقبالؔ کا فلسفۂ تعلیم افادی اصول پر مبنی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ علم و فن کو محض علم و فن کی حیثیت حاصل کرو۔ بلکہ اُن کا مقصد حصول علم و فن سے حصول طاقت و توانائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

از ہمیں آتش چراغش روشن است　　　قوتِ افرنگ از علم و فن است

اقبالؔ کے نزدیک ہر چیز جو کتابوں میں لکھی ہو خواہ مخواہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ حقیقتِ اشیاء کے متعلق فلسفیوں نے سیکڑوں نظریئے قائم کئے، جو بعد میں مزید تفتیش و تحقیق پر غلط ثابت ہوئے۔ مثلاً انسٹین کا نظریۂ اضافیاتؔ اس معاملہ میں آخری حکم سمجھا جاتا تھا۔ مگر آنریبل سر شاہ سلیمان کی تحقیقات کے بعد اُس کی صحت بھی مشکوک ہو گئی، اسی لئے اقبالؔ چاہتے ہیں کہ جو علم حاصل کیا جائے وہ تحقیق کی روشنی میں حاصل کیا جائے اور ہر بات کو خواہ مخواہ صحیح نہ مان لیا جائے۔ چنانچہ اس کی ترکیب وہ یہ بتاتے ہیں ؎

یقین کم کن گرفتارِ شکے باش　　　ہمائے علم تا افتد بدامت

خواجہ غلام السیدین صاحب کی کتاب کے دو۲ حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں سات باب ہیں اور اُسمیں تعلیم انفرادیتؔ سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ کے دو۲ باب ہیں، اس کا تعلق تعلیم اور اسلام کے نظام معاشرتؔ سے ہے دونوں حصوں میں جن باتوں پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے متعلق اقبالؔ کے کلام سے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ بانگ درا، جاوید نامہ، رموزِ بیخودی، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق وغیرہ کتابوں سے کثرت کے ساتھ اقتباسات دئے گئے ہیں۔ بہرحال پوری کتاب پڑھنے اور لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔ اقبالؔ کا تمام فلسفۂ تعلیم اِن دو۲ شعروں پر مبنی ہے ؎

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

بے معرکہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں　　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

چھپائی، کاغذ، جلد بندی سب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت دو۲ روپیہ (عہ/)
ملنے کا پتہ:- شیخ محمد اشرف پبلشر، بک سیلر، کشمیری بازار۔ لاہور

۱؎ Education of Individuality ۲؎ Theory of Relativity
۳؎ Education and Social order of Islam

اقبالؔ اور اُس کا پیام

یہ اس فاضلانہ انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ ہے جو علاّمہ اقبالؔ کے لندن جانے پر ڈاکٹر تصدق حسین خالدؔ ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز لندن میں پڑھا تھا۔ ترجمہ عمدگی اور کامیابی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے برادرِ عزیز میاں محمد رفیق خاورؔ ایم۔ اے۔ نے کیا ہے۔ مُصنف نے علاّمہ اقبالؔ کے فلسفہ کا مقابلہ عجمی تصوف اور ہندی ویدانت اور یوگ سے کیا ہے۔ اُن کی رائے میں ویدانت اور عجمی تصوف' دونوں فطرتِ اِنسانی کے خلاف ہیں۔ عجمی تصوف نے دُنیا کو "دُنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ" قرار دیا ہے۔ اور ہندی ویدانت نے اُن کے خیال کے بموجب دُنیا کو "مایا" یعنی ایک فریبِ نظر بتایا ہے۔ لیکن اقبالؔ مرحوم کے نزدیک دُنیا ایک خیالی یا وہمی چیز نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے۔ عجمی تصوف اِنسان کو بے عمل بناتا ہے اور ویدانت کو وہ سمجھتے ہیں کہ ترکِ دنیا کی ترغیب دیتا ہے۔ اقبالؔ کا پیغام ایک درسِ عمل لئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مضمون فاضلانہ ہے اور اسکا ترجمہ عمدہ کیا گیا ہے۔ بہر حال اقبالؔ کے فلسفہ اور شاعری کے شائقین کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ بہت دلچسپ ثابت ہوگا۔ چونکہ اس کے مطالعہ سے کلامِ اقبالؔ کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ کتاب کے شروع میں مولانا سالکؔ، اڈیٹر انقلاب لاہور کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے اور آخر میں استدراک کے نام سے مسٹر خاورؔ نے اپنا تکملہ شامل کیا ہے جس سے کتاب کی خوبیاں دوبالا ہو گئی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۷۵ صفحے۔ شائقین ہاشمی بکڈپو ۳۵ ایمپرس روڈ لاہور سے طلب کریں۔

سائنس کے کرشمے[1]

یہ چھوٹی سی کتاب آٹھ سائنٹفک مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے، جسے میر حسن صاحب ایم۔اے نے مرتب کیا ہے۔ آٹھوں مضمون مختلف اہلِ قلم کے لکھے ہوئے ہیں مثلاً (۱) سائنس کیا ہے؟ مرتب کا لکھا ہوا ہے (۲) ہَوا' یہ مضمون ڈاکٹر سید حسین ایم۔ اے' پی۔ ایچ۔ ڈی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے (۳) پانی' پر مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے نے (۴) بجلی' پر مولوی احمد عثمانی ایم۔ ایس سی نے (۵) ہوابازی پر مولوی فیض محمد نے اور (۶) غیب بینی (ٹیلی ویژن) پر مولوی سید محمد یونس نے مضامین لکھے ہیں۔ کیمیاوی جنگ اور ریڈیو پر بھی مضامین درج ہیں۔ یہ سب مضمون سلیس اُردو میں لکھے گئے ہیں، جن کا مطالعہ عوام کے لئے بہت مُفید ہوگا۔ ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ نے اس مجموعہ کا دیباچہ لکھا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط درجہ کا ہے۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

رفتارِ زمانہ

پچھلے نمبر میں ہم نے فرانسیسی بیڑہ کے متعلق یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ گو جرمنی نے شرائط صلح میں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ اس بیڑے کو برطانیہ کے خلاف لڑائی میں استعمال نہ کرے گا لیکن اس کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر فرانس کے بڑے بڑے جنگی جہاز ہٹلر کے ہاتھ آ جاتے، تو اُسے انھیں برطانیہ کے خلاف استعمال کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا۔ شکر ہے کہ مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ اور انگلستان کی بحری فوج کی مستعدی سے اب یہ خوف قطعی رفع ہو گیا۔ اس بیڑہ میں نو دس بڑے بڑے جنگی جہاز تھے جنکی مجموعی طاقت صرف برطانیہ ہی سے کم تھی۔ انمیں چند جہاز تو پہلے ہی سے برطانوی بندرگاہوں میں تھے۔ کچھ اوران کے بندرگاہ میں تھے مگر یہ شروع جولائی میں برطانوی بحری فوج کے ہاتھوں تباہ کر دیئے گئے۔ برٹش گورنمنٹ نے ان جہازوں سے تین درخواستیں کیں اور ان کی نامنظوری پر ان کو تباہ کر دینے کے فیصلہ سے بھی آگاہ کر دیا مگر فرانسیسی کپتانوں نے پیش کردہ باتوں میں سے کسی کو منظور نہیں کیا اور برطانوی بحری فوج کا مقابلہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ برٹش بحری فوج کو طاقت سے کام لینا پڑا اور اُس نے افسوس کے ساتھ ان جہازوں پر گولہ باری کر کے اُن کو تباہ کر دیا۔ جہازوں کے ساتھ بہت سے فرانسیسی جہازران بھی کام آئے۔ فرانس کے کچھ جہاز اسکندریہ میں تھے وہ بھی ۸ و ۹ جولائی کو بیکار کر دیئے گئے اور انھیں دنوں رشیلو (Rechelieu.) نامی فرانس کا سب سے بڑا جنگی جہاز جس کا ۳۵ ہزار ٹن وزن تھا۔ اور جس پر پچاس لاکھ پونڈ کی لاگت آئی تھی بیکار کر دیا گیا۔ اس طرح برطانیہ کے بحری بیڑے نے فرانس کے بحری بیڑے کا حساب کتاب بالکل صاف کر دیا۔ جرمنی، اٹلی اور فرانس میں اس پر بہت واویلا مچایا گیا۔ اور فرانس نے اس بنا پر برطانیہ سے اپنے سیاسی تعلقات منقطع کر لئے۔ لیکن جیسا کہ مسٹر چرچل وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں پارلیمنٹ میں کہا۔ "برطانیہ کی عافیت و حفاظت کے لئے یہ افسوسناک کارروائی ضروری تھی۔ جس کیلئے دنیا کی تاریخ برطانیہ کو مجبور و معذور سمجھے گی"

فرانس کی خود مختاری تو اُسی دن سلب ہو چکی تھی جب اس کے جنرلوں اور مدبروں نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ۱۱ جولائی کو فرانس کی تیسری جمہوریت کا باضابطہ خاتمہ ہو گیا جسکا ماٹو "آزادی، مساوات اور اخوت" تھا اور جو ستّر سال ہوئے ایسی بپتا کے وقت قائم ہوئی تھی جب دشمن کی تلوار فرانس کی گردن پر تھی۔ یہ ختم بھی ایسے بُرے وقت ہوئی جب فرانس اَدھ موا ہو کر پڑا سسک رہا ہے۔ آزادی کا کون قدردان ہوگا جو اس سانحہ پر چار آنسو نہ بہائیگا۔ زیادہ افسوس تو یہ ہے کہ عموماً ڈکٹیٹروں کا سکّہ فتح کے بعد چلتا ہے لیکن چوراسی سال کے بوڑھے مارشل پیتیاں ایسی گھڑی ڈکٹیٹر بنے ہیں جب اُنھیں نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی گردن جھکا دی۔ نیشنل اسمبلی کے بچے کھچے

ممبروں نے فرانس کی نئی راجدھانی وشی میں جمع ہوکر موسیو لاول کی تجویز پر مارشل پٹیاں کو فرانسیسی ریاست کا سردار اعلیٰ* مقرر کرکے انھیں سیاہ وسفید کا پورا اختیار دیدیا کہ جس طرح چاہیں سلطنت کا انتظام کریں اور جو قانون مناسب سمجھیں اپنے حکم سے جاری کریں۔ آزاد خیال ممبران اسمبلی تو اسوقت فرانس سے بھاگے ہوئے ہیں۔ رہے سہے ممبروں میں صرف تین صاحبوں کو خلاف ووٹ دینے کی ہمت ہوئی۔ باقی ۳۹۵ ممبروں نے نئے آئین کے موافق رائے دی۔ سینیٹ میں ۲۲۵ ممبروں نے اس کے حق میں ووٹ دئے اور صرف ایک ممبر کو مخالفت کی توفیق ہوئی۔ اس کے بعد جب ۱۱ر جولائی کو یہ معاملہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں پیش ہوا تو نیا آئین ۵۶۹ ووٹوں سے بخلاف ۸۰ ووٹ کے پاس ہوا۔ اسطرح فی الحال جرمن تصرف سے فرانس کا جو حصہ باقی بچ رہا ہے اُس کی قسمت بالکل مارشل پٹیاں کے ہاتھ آگئی ہے اور انھیں پورا حق و اختیار حاصل ہوگیا ہے کہ اُلٹا سیدھا جو چاہیں کریں، کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی مدد کے لئے بارہ وزیر نامزد کئے ہیں۔ جن کی امداد کے لئے سکرٹریاں اور اسسٹنٹ سکرٹریاں مقرر کئے گئے ہیں۔ موسیو لبراں کو جو سات سال سے جمہوریہ فرانس کے پریسیڈنٹ تھے، برخاست کرکے موسیو لاول نائب سلطنت مقرر ہوئے ہیں۔

مارشل پٹیاں نے تو یہ کہا ہے کہ ابتک حکومت فرانس کے بڑے بڑے عہدے محض روپیہ کے زور سے ہاتھ آجاتے تھے مگر اب روپیہ ملکی خدمت کا سبب نہیں بلکہ اُسکا صلہ ہوگا اور محنت کرنے والوں اور کنبہ داروں کے حقوق کی حفاظت کیجائیگی، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جرمنوں کی زبردست ماتحتی میں فرانس کے نئے سردار اعلیٰ اپنے نامور ملک کی شان اور اپنے ہموطنوں کی آزادی کب تک اور کیسے قائم رکھ سکیں گے اس وقت تو وہ اپنی مرضی سے اپنی راجدھانی بھی کسی دوسری جگہ نہ ہٹا سکے اور بات بات میں انھیں جرمنی سے احکام لینا پڑتے ہیں، مارشل پٹیاں کے وسیع اختیارات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انھیں نہ صرف وزیروں کی تقرری اور برخاستگی کا پورا اختیار ہے بلکہ فرانس کی نئی اسمبلیاں بھی وہی نامزد کریں گے اور اُن کے جلسے بھی انھیں کی مرضی پر ہوں گے۔ البتہ کسی مصلحت سے انھوں نے لڑائی کے اعلان کرنیکا اختیار نہیں لیا ہے موسیو لاول نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ فرانس میں برطانیہ کا کوئی اثر قائم نہ ہونے دیں گے۔

مارشل پٹیاں بھی انگلستان کے دوست نہیں ہیں اور عرصے سے فرانس اور انگلستان کی دوستی کے خلاف ہیں، مگر برطانیہ کی مخالفت کے علاوہ نئی فرانسیسی گورنمنٹ کی اور کیا پالیسی ہوگی۔ ابھی اس کا صحیح اور پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بعض وزراء نے چند باتوں کا اعلان ضرور کیا ہے مثلاً موسیو پونیارے[1] لیبر وزیر نے کہا ہے کہ نیا فرانس زراعت اور کاشتکاری میں ترقی کی کوشش کریگا۔ ہم کو صنعت و حرفت پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ پالیسی بالکل ہٹلر کی مرضی کے مطابق ہوگی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ جرمنی کو یوروپ میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو اور ہر قسم کی صنعت و حرفت کی ترقی کا

[1] M. Pionare

* Chief of the French State.

پورا سامان میسر ہو اور وہ تمام دُنیا کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ کھیتی باڑی اور ادنیٰ محنت مزدوری کا کام اُس پاس کے ماتحت ملک اپنے ذمہ لیں اور جرمنی سے انھیں تجارتی یا صنعتی مقابلے کا کوئی موقعہ نہ ملے۔ جرمنی ضرورت کے مطابق خوراک کا سامان اُن سے لے لیگا۔ اِسوقت بھی اُس نے فرانس اور پولینڈ وغیرہ کی زراعتی پیداوار پر پورا قبضہ کرلیا ہے۔ چنانچہ امریکہ سے آئی ہوئی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت پولینڈ میں ساڑھے تین کروڑ آدمی فاقوں مر رہے ہیں۔ ملک میں کھانے پینے کا جتنا سامان تھا وہ سب جرمنی بھیج دیا گیا ہے۔ جرمن حکام نے فرانسیسی کارخانوں اور دکانوں کو جبراً چلانے کے لئے اُن کے غیر حاضر مالکوں کی جگہ عارضی منیجر مقرر کر دئے ہیں اور مزدوروں کو ہڑتال کرنیکی ممانعت کردی گئی ہے۔ غرض فرانس کے وزرا کی چاہے جو رائے ہو۔ لیکن جہاں تک جرمنی کا بس چلیگا موجودہ حالات میں فرانس کی یہی حیثیت رہ جائے گی کہ وہ جرمنی کے لئے کھانے پینے کی چیزیں پیدا کرے اور اس طرح اپنا پیٹ بھی پالے۔

فرانس کے نئے وزیر خارجہ نے ایک تقریر میں کہا ہے کہ اُن کی پالیسی فاتحوں کی نقل کرنا یا اُن کو خوش کرنا نہ ہوگی بلکہ وہ نئے طریقوں سے نئی بنیادوں پر سرمایہ داری اور مزدوری کے باہمی تعلقات درست رکھیں گے اور اٹلی و جرمنی کے ساتھ تجارت کرنیکے علاوہ برطانیہ سے بھی کاروبار کرسکیگے۔ مگر اس اعلان پر بھی کیا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

مارشل پٹیاں کی حکومت پہلے فرانس کی ازسرِنو تعمیر کا مسئلہ تو حل کرلے۔ اس وقت فرانس پر جرمن حملے کی بدولت سات سو زائد ریلوے پُل تباہ و برباد ہو چکے ہیں، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، نہریں اور دریاؤں کے پُل تقریباً سبھی تہس نہس ہو گئے ہیں اور کوئلہ، پٹرول اور دوسرے ضروری سامان کی بہت بڑی کمی ہو گئی ہے۔ ان سب چیزوں کی بہم رسانی کا انتظام کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے خصوصاً جبکہ جرمنی فرانس کے حصے بخرے کرنیکی فکر میں ہے۔ اور حال ہی میں اُس نے فرانس کے صوبہ برٹینی (Brittany.) کو موجودہ جنگ کے ختم ہونے پر بالکل ایک آزاد ریاست بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ عجب نہیں کہ دوسرے صوبوں کیساتھ بھی یہی کارروائی کی جائے۔ سمندر پار فرانسیسی حکومت کا قائم رہنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ اُن کی حالت واقعی گومگو کی ہے۔ پہلے اُنھوں نے لڑائی جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر بعد کو جب دباؤ پڑا تو موجودہ حکام خاموش ہو گئے۔ لیکن اُن کا قطعی فیصلہ جنگ کی آیندہ رفتار دیکھکر ہوگا۔

ہزارہا فرانسیسی جو انگلستان اور غیر ملکوں میں پناہ گزین ہیں موجودہ گورنمنٹ فرانس کی پالیسی کے سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ جنرل ڈی گالے نے ایک فرانسیسی فوج تیار کرکے انگلستان کی امداد کا تہیہ کیا ہے اور بہت سے فرانسیسی ہوا باز بھی انگریزوں سے مل کر جرمنی پر حملہ کر رہے ہیں۔ فرینچ گورنمنٹ انھیں طرح طرح کی دھمکیاں دے رہی ہے یہانتک کہ آخری خبر یہ ہے کہ جو فرانسیسی موجودہ گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر غیر ممالک میں رہ جائیں گے اُنکی جائداد وغیرہ ضبط کرلی جائے گی۔ فرانسیسی قومیت کے حقوق سے اُن کو محروم کردیا جائے گا اور اُن کا یہ فعل غداری میں شمار ہوگا جس کی سزا موت تک ہو سکتی ہے۔ ان کے اہل خاندان کو جو فرانس میں ہوں گے اذیتیں علیحدہ دی جائیں گی۔

جو لوگ غیر ملکی گورنمنٹوں کی ملازمت کریں گے اُن کو موت کی سزا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔

غرض اس وقت کشمکش کی صورت ہے اور فرانسیسوں کی حالت قابل رحم ہے۔ اس کی اصلاح اُسی وقت ہو سکتی ہے جب ہٹلر کو برطانیہ کے ہاتھوں شکست حاصل ہو۔ بصورت موجودہ مارشل پٹیان اور ان کے ساتھیوں کی یہ خام خیالی ہے کہ وہ یہ اُمید کر رہے ہیں کہ ہٹلر، فرانس کے ہتھیار ڈالنے کے صلہ میں اس کے ساتھ کوئی خاص رعایت کرے گا۔ جرمنی اور اٹلی کے اخبارات کا رویہ اس بارے میں بالکل صاف ہے اور جب کبھی موقع پڑا ہے اُنھوں نے یہی لکھا ہے کہ فرانس کی چاہے جو کایا پلٹ ہو جائے لیکن اسے اپنی شکست اور شرکت جنگ کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا۔ جرمنی کے ایک با اثر اخبار نے حال میں یہ لکھا ہے کہ گو فرانس نے اب اپنا نظام حکومت بالکل جرمنی کے مطابق بنا لیا ہے لیکن یہ کارروائی بعد از وقت ہوئی ہے اور اس کی بدولت وہ اپنی ذمہ واری سے بری نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مارشل پٹیاں کی گورنمنٹ نے موسیو ڈلادیہ، جنرل گیملن، موسیو رینو اور بہت سے اور وزیروں اور جنرلوں پر جنگ کی ذمہ واری عائد کر کے قومی غداری اور ادائے فرائض میں کوتاہی کے الزام پر مقدمات بھی قائم کر دیے ہیں، اور عنقریب ہی اُن بڑے بڑے مدبروں اور فوجی سرداروں کی ہر طرح سے تخریب کی جائے گی۔ موجودہ فرانسیسی گورنمنٹ نے یہ کارروائی یقیناً جرمنی کو خوش کرنے کی غرض سے کی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان باتوں سے اہل فرانس کو کوئی نفع حاصل نہ ہوگا۔ اور انھیں اپنی پست ہمتی کا خمیازہ اٹھانا ہی پڑے گا۔

یہاں پر بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور اس پر بہت دنوں تک بحث ہوتی رہے گی کہ آخر فرانس کے جرنیلوں نے کیا سمجھ کر اپنی گردنیں جرمنی کے سامنے جھکا دیں، اور اس قدر جلد کیوں ہمت ہار بیٹھے؟ فرانسیسی سپاہیوں کی بہادری مسلمہ ہے۔ پھر وہ کیسے اتنی جلدی اور اس بُری طرح بکھر گئے؟ شکست واقعی فرانسیسی حکومت اور فرانسیسی جرنیلوں کی ہوئی نہ کہ فرانسیسی فوج کی۔ کیونکہ شروع ہی سے جرنلوں نے غلطیوں پر غلطیاں کیں، اور کسی بات کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا۔ جس کی اصلی ذمہ واری فرانس کے خود غرض سرمایہ داروں اور عیش پسند مدبروں پر ہے جنکی پارٹی بندیوں اور باہمی سازشوں نے ملک کی عزت خاک میں ملا دی۔ ان لوگوں کو رفتہ رفتہ حکومت میں اسقدر اقتدار حاصل ہو گیا کہ وزیر اعظم رینو مخطاکار جرنیلوں کو بھی ہٹا نہیں سکے۔ بڑے بڑے عہدوں پر انھیں لوگوں کی سفارشیں چلتی تھیں۔ اہلیت اور قابلیت کی کچھ پوچھ گچھ نہ تھی، اور گورنمنٹ کی اصلی باگ ڈور اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگئی تھی جنکو نہ ملکی عزت کی پروا تھی اور نہ آزادی۔ اخوت و مساوات کی کوئی قدر تھی؛ بلکہ جنھیں صرف اپنے آرام و آسائش اور نفع سے سروکار تھا۔ ملکی اخبارات بھی انھیں چالاک آدمیوں کے ہاتھ میں ہو گئے تھے جنھوں نے دُور سے بیٹھے ہوئے ہر طرف سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اہل فرانس کو دھوکے میں رکھا اور جب کڑا وقت آیا تو ملک کے ساتھ غداری کا پورا ثبوت دے دیا۔

مارشل پٹیاں شروع ہی سے جمہوریت کے دلدادہ نہیں ہیں۔ وہ انگریزوں کے مخالف اور جنرل فرانکو کے ذاتی دوست ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اسپین کی لڑائی میں جنرل موصوف کو بڑی مدد دی۔ اس کا صلہ اب جنرل فرانکو نے یہ دیا کہ جس طرح ہوسکا جرمنی و فرانس کی عارضی صلح کرادی جس کے شکرانے میں مارشل پٹیاں نے انھیں طنجہ (Tangiers) کے بین الاقوامی علاقہ پر قبضہ کرنے کا موقعہ دے دیا۔ اس وقت مارشل پٹیاں کے گرد ایسے آدمی جمع ہو گئے ہیں جن کی شکست خوردہ ذہنیت میں یہ بات سما گئی ہے کہ فرانس کو برطانیہ سے کنارہ کشی کر کے جرمنی سے ناطہ جوڑنا چاہئے۔ یہ لوگ فرانسیسی سلطنت کی وسعت سے بھی پریشان ہیں اور سمندر پار مقبوضات قائم رکھنے کے خلاف ہیں۔ وہ توسیع سلطنت کی پالیسی کو فرانس کی سب سے بڑی غلطی سمجھتے ہیں۔ اور جس تہذیب و آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے فرانس نے برطانیہ سے دوستی کرنا ضروری سمجھی تھی، اُسے بالکل فضول سمجھتے ہیں۔ موجودہ شکست کے بعد وہ اس پالیسی کو قطعی بدل دینا چاہتے ہیں۔ انہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جرمنی کے اقتدار کے مخالف ہیں مگر فی الحال یہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں کہ اٹلی اور جرمنی دونوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔ بعد میں اُن کا خیال ہے کہ اٹلی بھی جرمنی کا بڑھتا ہوا اقتدار پسند نہ کرے گا اور اس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کے درپے ہوگا۔ اُس وقت اُس کو نئے دوستوں کی تلاش ہوگی اور وہ فرانس کی دوستی کی قدر کریگا مارشل پٹیاں اور جنرل فرانکو کی دوستی سے اُن لوگوں کو اُمید ہے کہ بالآخر اسپین بھی اس اتحاد میں شامل ہو جائیگا لیکن بقول لنڈن ٹائمس اِس پالیسی کے حامی اِس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ جرمنی اپنے ماتحت ملکوں کو اس بات کا موقعہ ہی کیوں دیگا کہ وہ مل جل کر کوئی ایسی کارروائی کر سکیں جس سے اُس کو زک پہونچے۔ خیر یہ تو آیندہ کی باتیں ہیں اسوقت تمام دُنیا کی نگاہیں برطانیہ پر لگی ہوئی ہیں کیونکہ سب کو اسی بات کا انتظار ہے کہ برطانیہ پر جرمن حملہ کب اور کس طرح ہوتا ہے۔ ہٹلر اور اُس کے ساتھی عرصے سے اس کا بندوبست کر رہے ہیں کیونکہ وہ اِس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک برطانیہ کا اثر و اقتدار باقی ہے۔ اُنکا دلی مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔ حال ہی میں ہٹلر نے اس کے متعلق جرمن پارلیمنٹ میں ایک زبردست تقریر کی تھی جسمیں اُس نے برطانیہ سے سمجھوتہ کی خواہش کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ اب ایک فاتح کی حیثیت سے صلح کا آرزومند ہے۔ لیکن اُس نے مصلحتاً صلح کی شرائط کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مگر دیگر ذرائع سے جو خبریں معلوم ہوئیں اُن سے یہی واضح ہوا ہے کہ وہ یورپ میں جرمنی کے سوا اور کسی بڑی طاقت کا وجود گوارا نہیں کرسکتا۔ برطانیہ اور مقبوضات برطانیہ کو وہ فی الحال اُن کی موجودہ حیثیت میں چھوڑنے کو تیار ہے بشرطیکہ برطانیہ یورپ کو بالکل ہٹلر کی مرضی پر چھوڑ دینے پر رضامند ہو۔ یہی شرط وہ امریکہ کے ساتھ بھی ملحوظ رکھنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ اِس وقت جرمن فوجیں لڑائی سے تھک چکی ہیں۔ اور جرمنی کے بحری بیڑے کی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ اسلئے اگر چند سال کا موقعہ مل جائے تو وہ اِس کمی کو بھی پورا کر کے تازہ دم فوج کے ساتھ برطانیہ سے نپٹ لے۔ مگر اہل برطانیہ پہلے ہی سے اِس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ خواہ انھیں بالکل

تن تنہا ہٹلر کا مقابلہ کرنا پڑے لیکن وہ اُسوقت تک دم نہ لیں گے جب تک ہٹلر شاہی کا بالکل قلع قمع نہ ہوجائے اور دُنیا میں امن وامان اور حق وانصاف کا راج پھر سے قائم نہ ہوجائے۔ ہٹلر کی تقریر کا جواب برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ ہیلی فیکس نے بالکل صاف اور صریح الفاظ میں دیدیا ہے گو اس جواب میں صرف جنگی مقاصد یوروپین ملکوں کی آزادی اور مسیحی تہذیب کی بحالی ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے ہندوستان کو خواہ مخواہ شکایت کا موقعہ ملا۔ مگر اس شکایت سے قطع نظر یہ جواب ہٹلر کی تحریر کا بالکل مناسب جواب ہے۔ برطانیہ جرمن حملہ کے مقابلہ کے لئے بھی تیار ہو گیا ہے چنانچہ جزائر برطانیہ کی قلعبندی ہوچکی ہے اور کیل کانٹے سے درست چالیس لاکھ مسلح فوج برطانیہ کی حفاظت کیلئے بالکل تیار ہے، رائل ایر فورس کی طاقت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہوچکا ہے اور برطانوی جنگی جہاز تمام سمندری کناروں کی حفاظت کا فرض ادا کررہے ہیں۔ آئرلینڈ میں بھی لکھوکھا اہل ملک فوجی حملہ کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ پارلیمنٹ نے دم کی دم میں لڑائی کے لئے دو ارب اسی کروڑ پاونڈ کا سالانہ صرفہ منظور کرلیا ہے۔ جون کے تیسرے ہفتہ تک برطانیہ پانچ کروڑ پاؤنڈ فی ہفتہ خرچ کرتا تھا لیکن ۱۲ جون سے ۲۰ جولائی تک خرچ کا اوسط پانچ کروڑ ستر لاکھ پاؤنڈ فی ہفتہ رہا۔ اس زبردست صرفہ کو پورا کرنے کیلئے انکم ٹیکس میں بخوشی خاطر غیر معمولی اضافہ کردیا گیا، یعنی دو ہزار پاونڈ آمدنی رکھنے والوں کو اب ۲ شلنگ فی پاونڈ اور بیس ہزار پاؤنڈ آمدنی والوں کو ½ ۹ شلنگ فی پاؤنڈ ٹیکس دینا ہوگا اسطرح جہاں پانچ سال پہلے اس مد سے ۲۹ کروڑ پاونڈ وصول ہوتا تھا وہاں اب ۶۳ کروڑ نوے لاکھ پاونڈ ملے گا۔ بہت سے ٹیکس بڑھادئے گئے ہیں اور ضروریات زندگی پر بھی بڑے بڑے ٹیکس عائد کئے گئے ہیں اور یہ سب ٹیکس ملک نے خوشی سے برداشت کئے ہیں بلکہ اخبارات نے یہ نکتہ چینی کی ہے کہ ابھی تک وزیر خزانہ برطانیہ پرانی لکیروں کو پیٹے جارہے ہیں اور اس غیر معمولی جنگ کے غیر معمولی اخراجات کو پورا کرنے میں نئے طریقوں سے کام لینے سے جھجک رہے ہیں۔ اس نکتہ چینی سے انگلستان کے عام جوش کا ثبوت ملتا ہے جو اس لڑائی کے جاری رکھنے کے لئے ہر طرف ظاہر ہورہا ہے۔ ۲۵ جون سے ۹ جولائی تک اہل انگلستان نے لڑائی جاری رکھنے کیلئے اپنی گورنمنٹ کو ایک کروڑ پاونڈ بلا سود قرض دیا اور نو کروڑ پاونڈ سے زیادہ ½ ۲ فیصدی کے جنگی تمسکات خریدے۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کے علاوہ لکھوکھا مزدور ۸۰، ۸۴ گھنٹہ فی ہفتہ کام کررہے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف ہفتہ وار چھٹیاں لینا بند کردی ہیں بلکہ بہت سی رعایتیں جو بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کی تھیں اُن سے بھی دست بردار ہوگئے ہیں۔ عورتیں بھی جو کبھی کسی کارخانہ میں نہیں گئی تھیں ہفتہ میں دو روز کام کرنے اور اس طرح مردوں کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوگئی ہیں۔ برطانوی فوج میں نئی بھرتی کا اوسط اسوقت سات ہزار روزانہ تک پہونچ گیا ہے ہوائی جہازوں کی کمی بھی بڑی تیزی سے پوری ہورہی ہے۔ اب امریکہ سے روزانہ دس ہزار ڈالر کے ہوائی جہاز مہیا ہورہے ہیں۔ اسوقت ہر ماہ تین سو زائد ہوائی جہاز صرف امریکہ سے آرہے ہیں۔ امریکن ہوابازوں کو بھی برطانوی ہوائی فوج کی ملازمت کرنے کا اختیار دیدیا گیا ہے۔ طاقت کے اضافہ کے ساتھ رائل ایر فورس کی ہمت بھی بہت بڑھ گئی ہے چنانچہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا ہے کہ برطانوی ہوائی جہاز جرمن ہوائی حملوں کا مُنھ توڑ جواب خود جرمنی پر حملہ کرکے نہ دیتے ہوں،

ابتک انگریز ہوا باز جرمنی پر ایک ہزار سے زیادہ حملے کر چکے ہیں اور اُن حملوں میں اُنھوں نے اہم نقصانات پہونچائے۔ اور بہت سا جنگی سامان تباہ و برباد کیا۔ جرمنی نے انگریزی تجارتی جہازوں کو تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن اب تک اُسے انگلستان کی ناکہ بندی میں قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ اور انگریزی جہازوں کا بہت کم نقصان ہوا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ برطانیہ نے جرمنی کی ناکہ بندی پہلے سے بھی زیادہ کڑی کر دی ہے اور تجارتی جہازوں کی نگہبانی کا انتظام پیشتر سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر کر دیا گیا ہے۔ مخالف توپیں ہر وقت جرمن ہوا بازوں کا استقبال کرنے کو تیار رہتی ہیں۔ چنانچہ جولائی سنہ ۴۰ء میں انگلستان میں جرمنی کے ۲۴۰ ہوائی جہاز گرائے گئے اور برطانیہ کے بہت کم جہاز ضایع ہوئے حال میں۔ جرمنی پے درپے انگلستان پر بڑے پیمانہ پر ہوائی حملے کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک اس میں بھی اُسکو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

اب خبر ہے کہ عنقریب ہی ہٹلر انگلستان پر اپنا اصلی حملہ کرنے والا ہے۔ مگر یہ حملہ جب اور جس وقت بھی ہوگا ہم کو اُمید ہے کہ ہٹلر برطانیہ کو اس کے لئے بالکل تیار پائیگا۔ مسٹر چرچل نے تو یہاں تک انتظام کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کوئی ایسی صورت پیش آئے جس کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کیا گیا ہے تو برٹش گورنمنٹ نو آبادیوں سے لڑائی جاری رکھے گی اور اس وقت تک دم نہ لیگی جب تک ہٹلر کی زبردستی کا بالکل خاتمہ نہ ہو جائے ہٹلر اسوقت عجب شش و پنج میں پھنسا ہوا ہے۔ کبھی صلح جوئی کرتا ہے کبھی انگلستان اور سلطنت برطانیہ کو بالکل تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔

اٹلی بھی لڑائی میں ہاتھ پیر تو بہت مار رہا ہے لیکن ابھی تک اُسے کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

مالٹا پر اُس کے ہوائی حملے کارگر نہیں ہوئے۔ بحر روم میں ابھی تک برطانوی بحری بیڑہ کا اقتدار قائم ہے۔ جولائی میں دو ایکدفعہ اطالوی بیڑہ کی انگریزی جہازوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن اطالوی بیڑہ مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اٹلی کی ڈبکنی کشتیوں کا بھی بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ ایک ڈبکنی کشتی کو تو ایک انگریزی جہاز نے تنہا گرفتار کرکے عدن کی بندرگاہ میں پہونچا دیا۔ یہ کارنامہ سمندری لڑائی کی تاریخ میں عرصہ تک یادگار رہے گا۔ ارٹیریا[1] اور ابی سینا میں رائل ایر فورس اور ساؤتھ افریقن ایر فورس کے بہت سے کامیاب حملے ہوئے۔ سابق شاہ ابی سینا اسوقت سوڈان میں پہونچ گئے ہیں اور موقعہ مناسب پر اپنے وطن پہونچ جائیں گے۔ جہاں کے سردار اٹلی سے بغاوت پر پورے طور پر آمادہ اور مستعد نظر آتے ہیں۔ ابی سینا کی اسوقت یہ حالت ہے کہ وہاں باہر سے کوئی سامانِ جنگ نہیں پہونچ سکتا ہے۔ اٹلی کی پن ڈبی کشتیاں بالکل ختم ہوگئی ہیں اور قبائل کی بغاوت کا توڑ مشکل نظر آتا ہے۔

لیبیا[1] میں بھی اٹلی کی خشکی کی فوج کو نیچا دیکھنا پڑا۔ ان سب باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اٹلی کے شریک ہونے سے ہٹلر کو کوئی خاص نفع نہیں پہونچا ہے اور اٹلی کو فائدہ کے بجائے نقصان پہونچنے کا پورا اندیشہ ہے۔

Lybia al Ertria al

Bessarabia
بسریبیا پر روسی قبضہ ہونے کے بعد رومانیہ جرمنی سے زیادہ وابستہ ہوگیا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ نقصان ہی میں ہے کیونکہ روس کے علاوہ ہنگری بھی اپنے مطالبوں پر اڑا ہوا ہے۔ روس نے رومانیہ سے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ وہ عوام الناس سے بہتر سلوک کرے۔ اُس نے سرحد پر بہت سی فوج اور موٹر دستے بھی بھیج دئے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت وہ اُن سے کام لے سکے۔ دراصل روس کے لئے جنگ بہت مبارک ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اسکا اثر اب پہلے سے بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اسی ماہ لیتھونیا، اسٹونیا اور لٹوویا کی ریاستوں نے اتفاق رائے سے اپنے ملکوں کو روسی نظام حکومت سے وابستہ کردیا ہے۔ اس طرح ایک قطرۂ خون بہائے بغیر روس کی سلطنت میں ساٹھ ہزار مربع میل رقبہ اور ایک کروڑ آبادی کا اضافہ ہوگیا۔ ان ملکوں کے مل جانے کے بعد روس اور جرمنی کی سرحدیں ایک سو بیس میل کی لمبائی تک ملگئی ہیں جس سے ان دونوں ملکوں کے آیندہ تعلقات میں پیچیدگیاں پڑنیکے نئے اسباب فراہم ہوگئے ہیں۔ ہٹلر نے روس سے مجبوراً اور مصلحتاً میل کیا ہے۔ مگر دل سے وہ اسٹالین سے گھبراتا ہے اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ فی الحال بلقان میں کوئی جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔ اُس نے رومانیہ و ہنگری کے باہمی جھگڑوں کو آپسمیں طے کرنے کی تاکید کی ہے۔ روس و ترکی کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگیا تھا۔ لیکن یہ اندیشہ فی الحال رفع ہوگیا ہے اور حالات معمول پر آگئے ہیں۔ رومانیہ سے بھی اسوقت روس کو کوئی خاص پرخاش باقی نہیں ہے۔ لیکن اس اثنا میں رومانیہ کو یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ ہٹلر کی دوستی سے اُسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا۔ عجب نہیں کہ اس احساس کے بعد رومانیہ ایک دفعہ پھر جرمنی سے کھچکر دوسری طاقتوں سے میل جول کی کوشش کرے۔

ابھی تک انگلستان اور روس کی صفائی نہیں ہوئی۔ لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس نے جو حال میں انگلستان کے سفیر مقرر ہوکر روس گئے ہیں، بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کردی ہے۔ اسٹالین سے اُن کی مفصل بات چیت ہوچکی ہے۔ اور اسوقت یہ بات بالکل صاف ہے کہ جرمنی اور انگلستان کی لڑائی میں روس بالکل غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے، دراصل روس اور جرمنی کبھی شیر و شکر نہیں ہوسکتے اور اُن کا میل، تیل اور پانی کا ساتھ ہے۔ ایک نہ ایک روز ان دونوں طاقتوں اور تہذیبوں کو ایک دوسرے کے مقابل آنا پڑے گا۔ مدبران انگلستان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ خواہ مخواہ روس سے اس قدر بدظن رہے ورنہ جرمنی کو روس سے میل کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ بہرحال اسوقت جبکہ روس جرمن معاہدہ کی لفظی تعمیل ہو رہی ہے۔ برطانیہ کیلئے تلافی مافات کا موقعہ ہے۔

چین و جاپان کی لڑائی کو تین سال پورے ہوگئے۔ ۷ جولائی کو اس کی چوتھی سالگرہ ہوئی۔ جاپان نے چین کو Chiang Kia Shek دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن چینی سپہ سالار مارشل چیانگ کیاشیک اب بھی اُسوقت تک لڑائی جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں جب تک جاپان اپنی فوج چین سے واپس نہ بلالے۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر روس اور امریکہ سے مدد کی درخواست کی ہے۔ چین کے وزیر جنگ کا بیان ہے کہ لڑائی شروع ہونیکے وقت چین کے پاس صرف

بیس۲۰ لاکھ ہی فوج تھی مگر اب پچاس لاکھ سپاہی اُس کی آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے اب تک ۲۹۶ چینی ہوائی جہاز گرائے ہیں اور ۱۶۸ ہوائی جہاز زمین پر برباد کئے اور منچوکو منگولیا کی سرحد پر جو نقصانات ہوئے وہ اُنکے علاوہ ہیں۔ اُن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اب تک چین کے تیس لاکھ آدمی مارے یا زخمی کئے گئے۔ اس کے مقابل میں جاپان کے صرف پچاسی ہزار آدمی کام آئے۔ لیکن چینیوں کا بیان ہے کہ پچھلے تین سال کے اندر اس لڑائی میں ۱۵ لاکھ جاپانی مارے یا زخمی کئے گئے۔ اور مئی ۱۹۴۰ء تک جاپانیوں کی ۶۰۷ فیلڈ گنیں۔ تین سو مشین گنیں اور ۶۹ ہزار بندوقیں چینیوں کے ہاتھ آئیں۔ اِن اعداد کی بابت کوئی فیصلہ نہیں ہوسکتا ہے مگر اتنا ضرور ظاہر ہے کہ چین و جاپان کی لڑائی برابر جاری ہے اور ابھی تک خود اہل جاپان کو اس کے نتیجہ سے اطمینان نہیں ہوا ہے۔ ورنہ بار بار وزارتوں کی تبدیلی کی نوبت نہ آتی۔ اور جاپان کو اہل چین پر مزید دباؤ ڈالنے کی فکر نہ ہوتی۔ جاپان کے فوجی سرداروں نے جن کا ملک میں طرازور ہے، حال ہی میں وزارت کو ایک مرتبہ پھر پلٹ دیا ہے۔ یہ لوگ یوروپ کے موجودہ انتشار سے فائدہ اُٹھاکر چین کا قافیہ تنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے فرانسیسی انڈوچائنا سے چین تک مال کی آمد و رفت بند کرانے کے بعد برٹش گورنمنٹ پر بھی دباؤ ڈال کر تین۳ ماہ کے لئے برما کا راستہ بھی بند کرادیا ہے۔ چنانچہ اب اس شاہراہ سے فی الحال کوئی جنگی سامان چین کو نہ پہونچ سکے گا۔ برٹش گورنمنٹ کا فیصلہ جو غالباً موجودہ حالات سے مجبور ہوکر کیا گیا ہے امریکہ کو پسند نہیں ہوا ہے۔ ہندوستانی قوم پرستوں نے بھی اسکی مخالفت کی ہے۔ اس وقت جاپان کی فوجی پارٹی علانیہ جرمنی کی طرف جھک رہی ہے۔ اور انگلستان کو خواہ مخواہ دبانے کی فکر میں ہے۔ جاپانی اخبارات کا رویہ بھی برطانیہ کے صریحًا خلاف ہے۔

مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ جنگ جرمن کی وجہ سے وہ اسوقت جاپان سے حتی الوسع کوئی اُلجھن پیدا نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے وعدہ کیا ہے کہ مستقل حیثیت سے وہ ایسی کوئی کارروائی نہ کریں گے۔ جس سے چین کی حیثیت اور آزادی میں کمی ہو۔ اِس وقت برٹش گورنمنٹ چین و جاپان کے درمیان صلح کرانے کی بھی کوشش کررہی ہے اور اگر اس کارروائی سے باعزت صلح ہوجائے تو مضائقہ بھی نہیں، ورنہ یہ رعایت محض فضول ہے۔

ہندوستان کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اب کانگریس کی رہنمائی سے علیحدہ ہوگئے ہیں۔ مہاتما جی عدم تشدد کے پکّے حامی ہیں اور کسی صورت سے بھی تشدد سے کام لینے کو تیار نہیں ہیں۔ لیکن شروع جولائی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جو ہنگامی اجلاس دہلی میں ہوا اُسمیں عدم تشدد کی پالسی کو ملک کی آئینی جدوجہد تک محدود کردیا گیا۔ اور بیرونی حملہ یا اندرونی خلفشار کو طاقت سے دبانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ ملک کی عام رائے

کے مطابق ہے۔ لیکن مہاتما جی اور اُنکے راسخ الخیال پیرو خان عبدالغفار خاں صاحب کانگریس کمیٹی سے کنارہ کش ہو گئے۔
آخری ہفتہ جولائی میں پونا میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں نے اِس فیصلہ کی تصدیق کر دی ہے۔ اِس
سے کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان سمجھوتہ ہونے میں مزید سہولت ہو گئی ہے۔ مہاتما جی کے بعد کانگریس کی
رہنمائی کا زیادہ تر بار اب سابق وزیراعظم مدراس مسٹر راجگوپال اچاریہ پر آگیا ہے، جن کی علمی فضلیت، تجربہ کاری، قوت فیصلہ
اور معاملہ فہمی کی ڈھاک اہلِ ملک اور گورنمنٹ دونوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور جن کے خاص مددگار سردار ولبھ بھائی پٹیل
اور مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی نئی پالیسی کے حامی ہیں۔ لیکن اُن کی بعض تقریروں سے
معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اور اہم مسئلوں پر ابھی تک انھوں نے کوئی استوار و مستحکم رائے قائم نہیں کی ہے۔ مگر اُن کا
عدیم المثال خلوص بے لوث حب الوطنی اور وسیع بین الاقوامی معلومات ملک اور کانگریس دونوں کے لئے بہت مفید ہیں۔ برطانیہ میں
ہندوستانی قوم پرستوں سے سمجھوتہ کی خواہش تو بہت ہے لیکن برٹش گورنمنٹ ابھی تک اپنی جگہ سے انچ بھر بھی نہیں ہٹی ہے۔ وہ وائسرائے
کی انتظامی کونسل کی توسیع کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کو شامل کرنے کو تیار ہے لیکن ابھی تک ملک کیلئے کسی نئی آئینی حیثیت کا
اعلان کرنے یا نمائندہ قومی گورنمنٹ قائم کر کے اُسے قانونی اسمبلی کا جوابدہ بنانے کو آمادہ نہیں ہے۔ پارلیمنٹ نے جنگی ضروریات
کے لحاظ سے وائسرائے ہند کو مختارِ کل کی حیثیت دیدی ہے مگر ان اختیارات کی منظوری کے وقت پارلیمنٹ میں یہ بات
بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اس کارروائی سے آئینی مراعات سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ انتظام محض جنگی پیش بندیوں کے سلسلہ
میں کیا گیا ہے۔ غرض ہندوستانی مطالبات کے متعلق ابھی تک کوئی خاص اعلان نہیں ہوا۔

اِس طرف دو خاص واقعات اور ہوئے جن سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید عنقریب ہی مسلم سیاسیات کوئی نیا پلٹا لے۔
مرکز میں قومی گورنمنٹ کے قیام کے متعلق مولانا آزاد نے مسٹر جناح کے خیالات دریافت کرنا چاہے تھے مگر صاحب ممدوح نے
صدرِ کانگریس کو ایسی جھاڑ بتائی کہ تمام ملک حیران رہ گیا۔ پولیٹکل مخالفین سے بھی خوش اخلاقی کی توقع رکھی جاتی ہے لیکن
مسٹر جناح نے بوجہ تنک مزاجی سے کام لیا جسکا اثر کچھ اچھا نہیں ہوا۔ اور اُنکے نا ملائم بلکہ نامہذب جواب کو عموماً مسلمان لیڈروں
نے ناپسند کیا۔ اِس جواب سے اُن کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ طے ہونیکے متعلق قطعی مایوسی ہو گئی ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کے متعلق مسٹر جناح کا رویہ مقبولِ عام نہیں ہوا۔ اور مسٹر فضل الحق وزیراعظم بنگال اور سر سکندر حیات خاں
دونوں اُنکی پالیسی سے علانیہ طور پر منحرف ہو گئے ہیں۔ بہت سے اور اصحاب بھی ان دونوں صاحبوں کے ہمخیال ہیں۔
حال میں پاکستان اسکیم کی بھی کافی مخالفت ہوئی۔ ۲ جولائی کو لکھنؤ میں مولوی عبدالمجید صاحب کی صدارت اور مختلف مقامات صوبہ
کے پانچ سو ڈیلیگیٹوں کی موجودگی میں آزاد مسلم کانفرنس میں بڑی زور و شور سے اِس اسکیم کی مخالفت کی گئی۔ اور ۲۰ جولائی
کو لکھنؤ ہی میں مسٹر آنے کی صدارت میں آل انڈیا ہندو لیگ اسی اسکیم کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے
مسٹر آنے نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ اگر ہندوستان کو آزادی کی خواہش ہے

تو ملک کے سب باشندوں اور تمام جماعتوں کو اپنی اپنی کارروائیوں میں سب سے زیادہ اور سب سے اوّل اِس امر کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہندوستانی مجموعی حیثیت سے ایک ناقابل تقسیم قوم ہیں۔ آپ نے کہا کہ برطانوی ہندوستان کے نظامِ سلطنت کی، خواہ کوئی صورت ہو۔ لیکن ہم لوگ اہلِ ملک کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی فوج کو قومی فوج بنانے کے متعلق بھی آپ نے بہت معقول رائے دی۔ آپ نے کہا کہ محض یہ کافی نہ ہوگا کہ فوجی بھرتی صرف چند نام نہاد فوجی قوموں تک محدود رہے، بلکہ سب صوبوں اور آبادی کے سب طبقوں اور جماعتوں کو ملک کی حفاظت میں حصہ لینے کا موقعہ دیا جائے تاکہ ہماری فوج ہر پہلو سے قومی فوج کہلانے کی مستحق ہو۔

۶/۷ بنگال میں بلیک ہول میموریل کے خلاف ایجی ٹیشن میں عوام کو جو کامیابی حاصل ہوئی، وہ بھی اِس ماہ کا ایک خاص واقعہ ہے۔

افسوس کہ پچھلے چند ماہ کے اندر اُردو کے کئی نامور شاعر و ادیب داغِ مفارقت دے گئے۔ مارچ گذشتہ میں حضرت آغا شاعر قزلباش اور اکبر حیدری صاحب کی وفات ہوئی۔ ۱۳ مئی ۱۹۴۰ء کو مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بالقابہ شاد کا انتقال ہوا۔ ۹ جون ۱۹۴۰ء کو لکھنؤ کے نامور ادیب خواجہ عبدالرؤف عشرت رہگرائے عالم جاودانی ہوئے اور جولائی میں حضرت اختر مینائی جنت نصیب ہوئے۔

حضرت آغا شاعر ایک فصیح اور قادر الکلام شاعر اور حضرت داغ کے تلمیذ و جانشین تھے۔ آپ نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جنمیں عمر خیام کی رباعیوں کا ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ کی ذات سے پرانی وضعداری کی یادگار قائم تھی۔

حضرت اکبر حیدری کی ذات سے ملک کی ادبی ترقی کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس آپکی قبل از وقت وفات نے ان امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

حضرت اختر مینائی منشی امیر احمد صاحب مینائی کے خلف الرشید تھے۔ اعلیحضرت نظام دکن کی قدردانی کی بدولت حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ عرصہ تک امورِ مذہبی کے معتمد رہے اور نواب اختر یار جنگ کے خطاب سے مشہور تھے۔ چند سال سے وظیفہ یاب ہوکر عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً اُردو رسائل کو اپنے کلام سے مرہونِ منت فرمایا کرتے تھے۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب اُردو زبان کے ماہر کامل اور مشہور و معروف شاعر ہونیکے علاوہ علم ادب کے بڑے قدردان و سرپرست تھے۔ عرصہ دراز تک ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم اور مجلس عالیہ کے صدر اعظم رہے۔ ملک میں آپکی ایک خاص پوزیشن تھی۔ حیدرآباد دکن میں شروع سے آخر تک آپکو اپنی منکسر مزاجی، فیاضی اور خوش اخلاقی کی بدولت جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ شاید ہی کسی دوسرے رئیس یا عہدیدار کے حصے میں آئی ہو۔ ناچیز رسالہ زمانہ کے بھی آپ بڑے قدردان تھے۔ آپکے جنازہ کے ساتھ حیدرآباد کے ہر فرقہ اور ہر طبقے کے ہزارہا آدمی تھے۔ اعلیحضرت خسرو دکن بھی آپ کے انتقال کی خبر سُنکر آپکے دولتخانہ پر تشریف لائے اور دیر تک اظہار رنج و ملال فرماتے رہے۔ آپ کی زندگی پرانی وضعداری، اخلاص و مروت کی بہترین نمود تھی۔ افسوس اب ایسی صورتیں کبھی دیکھنے میں نہ آئیں گی۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت زمانہ کے پرانے مضمون نگار اور عہد واجد علی شاہ کے بہترین سوانح نگار تھے۔ عربی فارسی میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے۔ محاورات زبان، قواعد اور علم عروض کی ایسی اچھی واقفیت تھی کہ اُردو کے بڑے بڑے ادیب اُن کی رائے کی وقعت کرتے تھے۔ آپ نے تقریباً نصف صدی تک اُردو کی خدمت کی اور سچ تو یہ ہے کہ آپ نے علم و ادب اور شاعری ہی کی خدمتگذاری میں اپنی عمر تمام کردی۔ آپکی وفات ایک ناقابل تلافی ادبی سانحہ ہے۔ زمانہ میں تاریخ اودھ کے متعلق آپکے بہت سے دلکش مضامین شائع ہوچکے ہیں جن کی یاد ہمارے ناظرین کے دلوں سے کبھی محو نہیں ہوسکتی ہے۔ پچھلے نمبر میں بھی آپ کا ایک چھوٹا سا مضمون شائع ہوچکا ہے۔ جس وقت یہ مضمون کتابت کے لئے دیا گیا تھا کیا خبر تھی کہ اس کی اشاعت کے پہلے ہی آپ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوجائیں گے۔ افسوس ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا اُمید

خط وکتابت

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم۔ زمانہ ماہ مئی ۱۹۴۰ء میں میری تصنیف "پس پردہ" پر ایک مختصر سا ریویو شائع ہوا ہے۔ جسمیں فاضل تنقید نگار نے غیر دانستہ طور پر اس مجموعہ کے بعض قصوں کو ہندی کا ترجمہ قرار دیا ہے، حالانکہ سبھی افسانے طبعزاد ہیں۔

ایک نقاد کا حوالہ دیکر لکھا گیا ہے کہ "اس قسم کے افسانے پہلے بھی گوش گذار ہو چکے ہیں"۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانے زمانہ، ساقی اور ادبی دنیا میں شائع ہونے کے بعد متعدد اخباروں اور رسالوں میں بلاحوالہ درج کئے گئے۔ ایسی صورت میں ریویو نگار صاحب کی نظر سے ان کا ایک آدھ بار گذر جانا ناممکن نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بعض ایڈیٹر حضرات کی اسی غیر ذمہ دارانہ روش کی بدولت غالباً زمانہ کے نقاد کو یہ سوچنے کا موقع ملا کہ وہ اسی قسم کے افسانے کہیں اور بھی پڑھ چکے ہیں۔

اور اگر فاضل تنقید نگار کا مقصد پلاٹ کی نوعیت سے ہے تو میں یہ کہونگا کہ افسانہ نگاری کا مقصد محض عجیب وغریب پلاٹ پیش کرنا نہیں ہے۔ اور جہاں تک فلسفۂ زندگی، کردار نگاری، مطالعۂ نفسیات اور طرز بیان وغیرہ "فنی تکمیل" کا تعلق ہے۔ نقاد صاحب کو ماننا پڑے گا کہ یہ سب باتیں ان افسانوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ فقط

گتون۔ ضلع جونپور
۲۵ر جولائی ۱۹۴۰ء

نیازمند
چندر بھوشن سنگھ

ہم اس خط کو خوشی سے درج کرتے ہیں۔ زمانہ کے تنقید نگار کی طرف سے ہم مکرمی بھوشن صاحب کو اس سے زیادہ اور کوئی جواب دینا نہیں چاہتے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان"۔ ا۔ ز

(۲)

پوسٹ جیلا، ای۔ آئی۔ آر۔
۱۹ر جولائی ۱۹۴۰ء

کرمفرمائے بندہ! تسلیم

زمانہ ماہ اپریل ۱۹۴۰ء میں میرا جو مضمون بعنوان "نورجہاں کی شاعری" شائع ہوا ہے اسمیں فارسی کے بائیس ۲۲ اشعار منتخب کرکے نورجہاں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ان اشعار کا ماخذ سہواً درج ہونے سے رہ گیا۔ چنانچہ میری اس فروگذاشت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ زمانہ جون ۱۹۴۰ء میں سید اختر علی صاحب تلہری نے ناچیز کے درج کردہ اشعار میں سے چار اشعار کو دوسرے فارسی گو شعراء کا کلام بتاتے ہوئے ناچیز سے ماخذ دریافت فرمایا ہے۔

میں نے جتنے اشعار اسمیں نورجہاں کی طرف منسوب کئے ہیں وہ کل کے کل حضرت سیماب اکبرآبادی کی مطبوعہ کتاب "سوانح نورجہاں بیگم" کے صفحات ۵۲ و ۵۳ سے ماخوذ ہیں۔ مولف موصوف کے ماخذ کیا ہیں؟ اس کی ذمہ داری صاحب موصوف پر ہے نہ کہ مجھ ناچیز پر۔

بندہ سیدہ رضا قاسم مختار (بلاموں)

تصحیح:۔ زمانہ بابت جون ۱۹۴۰ء میں مرزا یگانہ صاحب چنگیزی لکھنوی کے مضمون "میر کا کلام" میں صفحہ ۳۱۹ سطر ۳ میں ایک نقطہ کی بدولت کتابت کی ایک اہم غلطی ہوگئی ہے تیسرے شعر کا دوسرا مصرع اس طرح چھپ گیا ہے:۔

کوچے پہ اوس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
نوحہ

درست مصرعہ یہ ہے:۔

لوحہ پہ اوس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

نوحہ کو مطبوعہ دیوان کے کاتب نے کوچے لکھا جس کی اصلاح کو زمانہ کے کاتب نے یہ کی کہ لوحہ کی جگہ "نوحہ" لکھ دیا۔ جس سے مطلب ہی بدل گیا۔ دراصل "لوحہ" (بمعنی لوح مزار) صحیح ہے۔

زمانہ

جلد ۷۵ — اگست سنہ ۱۹۴۰ء — نمبر ۲

قلعہ رائسین کے کتبات

(از جناب مائل نقوی، صدر انجمن ترقی اردو، و ناظم انجمن ترقی ادب بھوپال)

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں جن ناقابل تسخیر قلعوں کا ذکر بار بار آتا ہے اُن میں قلعہ رائسین کا نام خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے جو اہمیت چتوڑ، کالنجر، رنتھمبور، اجمیر اور گوالیار کے قلعوں کو حاصل رہی ہے، وہی حیثیت ملک مالوہ میں قلعہ رائسین کی بھی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے حالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ قدیم تاریخوں میں اجمالی کیفیت کے ساتھ جابجا اس کا نام ضرور آتا ہے، لیکن وہ سیاسی ڈرامے جو اس کے دامن پر کھیلے گئے اور جنھوں نے یہاں کے رہنے والوں کی قسمت کا کئی بار فیصلہ کیا اُن کی تفصیلات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تاہم انھیں مختصر تاریخی حوالوں اور کثیر التعداد مقامی روایتوں سے جن پر افسانوی رنگ اگرچہ بہت زیادہ چڑھ گیا ہے اس کی قدیم عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قلعہ کی مستند تاریخ کا سلسلہ مرتب کرنے میں جو چیز سب سے زیادہ مفید ہو سکتی ہے وہ اس کے کتبات ہیں جو دستبرد زمانہ سے اس وقت تک محفوظ رہ گئے ہیں اور مؤرخ کی معلومات کے لئے کافی مواد مہیا کرتے ہیں۔

یہ قلعہ اپنے ہمنام قصبہ رائسین کے قریب بندھیاچل کی ایک سرسبز چوٹی پر بھوپال سے جانب مشرق چھبیس میل اور اسٹیشن سلامت پور (جی۔ آئی۔ پی ریلوے) سے ساڑھے بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی عمارت قدیم طرز تعمیر کی شان و عظمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسے ایک ایسی

پہاڑی پر تعمیر کیا گیا ہے جو سطح سمندر سے ۱۹۰۰ فیٹ بلند ہے۔ اپنے عدیم المثل جائے وقوع کے باعث مشرقی مالوہ کی تاریخ میں اسے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ پندرھویں صدی عیسوی سے قبل اس قلعہ کا ذکر تاریخ کے صفحات پر نہیں پایا جاتا لیکن یہ یقین کر لینے کے وجوہ موجود ہیں کہ اس سے صدہا سال پیشتر سے اس علاقہ کی سیاست میں قلعہ مذکور کا خاص حصہ رہتا چلا آیا ہے۔ عرصہ دراز تک تاریخ میں اس کا ذکر نہ آنا بظاہر تعجب خیز ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن واقعات پر غور کرنے سے بہت جلد یہ حیرت رفع ہو جاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ اُس عہد تک کی مشرقی مالوہ کی تاریخ پردۂ خفا میں ہے۔ اول تو اس عہد کی بابت معلومات ہی بہت کم ہے، جو موٹے موٹے واقعات معلوم بھی ہیں وہ شکوک و شبہات سے خالی نہیں ہیں۔

ان مجبوریوں کی وجہ سے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اُس زمانہ کی تاریخ کا ایک سرسری خاکہ ذہن میں لانے کے لئے صرف اُن خاندانوں کے نام لینے پر اکتفا کیا جائے جو وقتاً فوقتاً یہاں حکمراں رہے ہیں۔ ان میں موریا، سنگا، آندھر، چھاترپ، مغربی چھاترپ، گپت، ہن، پرمار اور چالوکیہ خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہن قوم کی تاریخی شکست کے بعد سے جو ۵۲۸ء میں واقع ہوئی ۱۰۲۳ء تک جبکہ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر تسلط حاصل کیا ہندوستان میں نہ تو کوئی مرکزی طاقت تھی اور نہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں باہم اتفاق ہی تھا جس سے اندرون ملک میں نظم و امن قائم رہتا یا کسی بیرونی حملہ آور کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا۔ ان حالات کے درمیان مشرقی مالوہ میں ایک خود مختار ریاست کا قیام عمل میں آیا جو پرمار راجاؤں کے ماتحت رفتہ رفتہ وسط ہند کی سب سے طاقتور حکومت بن گئی۔

اس امر کے تو یقینی شواہد موجود ہیں کہ یہ قلعہ اسی جگہ عرصہ دراز سے واقع تھا لیکن باعث تعجب یہ امر ہے کہ اگرچہ اس نواح میں بوجہ اپنے جائے وقوع کے اسے خاص اہمیت حاصل تھی مزید برآں مشرقی مالوہ کی قدیم راجدھانی ودِشا کے بالکل ہی قریب واقع تھا پھر بھی "پرمار" راجاؤں کی حکومت سے پہلے جو کہ آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک قائم رہی رائسین کی بابت کوئی تاریخی مواد فراہم نہیں ہوتا۔

قلعہ کی وجہ تسمیہ کی بابت بھی سخت اختلافات ہیں۔ پرمار عہد کے بعض حوالجات سے صرف اتنا پایا جاتا ہے کہ سمبت ... بکرمی کے قریب مالوہ میں کوئی جگہ "راجہ سین" نامی تھی۔ اسی سے

قیاس کیا جاتا ہے کہ شاید رائسین کا نام یہی رہا ہو۔ اس بارے میں مقامی روایات جو مشہور ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم کے ایک راجہ "رائے سنگھ" نامی نے اس قلعہ کی بنیاد ڈالی تھی کثرت استعمال سے رائے سنگھ رائے سین ہوگیا۔ یہ روایت زیادہ قرین قیاس اس لئے ہے کہ شہنشاہ بابر نے بھی اپنی "توزک" میں اسے "رائے سین" کے نام سے موسوم کیا ہے[1]۔

قلعہ کی قدامت سے متعلق اس نواح میں جو روایتیں قبول عام حاصل کئے ہوئے ہیں اُن میں پیدائش مسیح سے دو تین صدی قبل اس کا وجود ثابت کیا جاتا ہے، اگرچہ ان روایات کی صداقت معرض بحث میں لائی جا سکتی ہے، لیکن ایک قوی ثبوت اس کی قدامت کی بابت موجود ہے اور یہ قلعہ کے شمالی دروازے کا ایک دلچسپ پتھر ہے۔ اس پتھر پر شکار کا منظر کندہ کر کے دکھایا گیا ہے۔

پتھر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس منظر کو کسی سُرخ قسم کے رنگ سے بنایا گیا ہے پھر اس کے بعد نوکدار آلہ سے خطوط کو کندہ کیا گیا۔ اس خیال کا ثبوت یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ قبل تک شکاریوں اُن کی سواریوں اور شکار کی تصویروں میں سُرخ رنگ جھلکتا نظر آتا تھا۔ باشندگان قرب وجوار کی خوش اعتقادی نے تصویروں کے کندہ نقوش کو چونے سے لیپ لیپ کر بالکل بھر دیا ہے۔ تاہم تہ کی سرخی کہیں کہیں اب بھی نظر آجاتی ہے۔

ان تصاویر کی بابت اس وقت تک کسی عہد خاص کا تعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ تاہم اُن کے طرز و وضع کے دیکھنے سے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُن تصویروں سے بہت بعد کی ہیں جو سلسلۂ کیمور (وسط ہند) کے غاروں کی دیواروں پر کندہ ہیں یا جو ریاست رائے گڑھ (ممالک متوسط) میں دریائے مانڈ کے مشرقی جانب موضع سنگھن پور کے قریب ایک پہاڑی سلسلہ میں بنی ہوئی ہیں، لیکن باوجود ان امور کے قلعہ رائسین کی تصاویر کی قدامت ناقابل انکار ہے۔ یہ تصویریں کس عہد میں کندہ کی گئیں؟ کتنے عرصہ تک ان کا ابتدائی خاکہ محض سُرخ رنگت میں قائم رہا؟ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب صحت و یقین کے ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح میں رائسین کے قریبی مقامات سانچی، ستناری، آندھیر، ست دھارا بھیلسا، بھوجپور جو رائسین سے کسی قدر دُور ہے "بدھ مذہب" انتہائی عروج پر تھا۔ مذکورہ مقامات بدھ مت کی پُرجوش جماعتوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ حال میں قلعہ کے اندر جو سنگین "استوپ"

---

[1] تاریخ ہند جلد چہارم مولفہ مسٹر ایلیٹ و توزک بابری صفحہ ۲۷۰

برآمد ہوئے ہیں اُن سے گمان کیا جاتا ہے کہ رائسین کے حکمرانوں نے بھی بُدھ مت اختیار کرلیا تھا۔ بعض "استوپ" ایسے بھی ہیں جن میں کتبے لگے ہوئے ہیں، امتدادِ زمانہ کے سبب سے ان کی تحریریں بالکل مٹ گئی ہیں۔ تاہم تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعمیر چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں ہوئی ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ گپت راجاؤں کے عہد میں رائسین میں "بدھ مت" کا دور دورہ رہا ہوگا۔ اس کے بعد ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح یہاں بھی "بدھ مت" ہندو مذہب میں جذب ہوگیا ہوگا۔

مسلمانوں کا قدم اس علاقہ میں تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں آیا۔ ۱۲۳۱ء میں سلطان شمس الدین التمش گوالیار کے حاکم راجہ دیبال کو شکست دیکر مالوہ کی طرف بڑھا اور قلعہ بھلسہ کو تسخیر کرتا ہوا اُجین کو اپنی قلمرو میں داخل کیا۔ لیکن اس حملہ کا اثر عرصہ تک قائم نہیں رہا اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد مالوہ نے اپنی خودمختاری دوبارہ حاصل کرلی۔ جب علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) تخت دہلی پر متمکن ہوا تو اُس نے مالوہ پر دوبارہ حملہ کیا۔ سلطان نے راجہ مہاکب دیو اور اُس کے پردھان "کوکہ" نامی کو شکست دیکر اس صوبہ کو مستقل طور سے سلطنت دہلی میں شامل کیا اور عین الملک کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔

لیکن تاریخ فرشتہ کا مصنف اس سے اختلاف کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مالوہ کو سب سے پہلے غیاث الدین بلبن نے ۱۲۶۵ء میں فتح کیا۔ اس وقت سے مالوہ سلطان ناصرالدین محمود ثانی خلف فیروز شاہ تغلق کے عہد تک سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ ۱۳۹۰ء میں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا اُس وقت دلاور خاں صوبہ دار مالوہ نے اپنی حکومت کا سنگ بنیاد رکھکر اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کیا۔ دلاور خاں کے بعد اُس کا بیٹا ہوشنگ شاہ ۱۴۰۵ء میں تخت و تاج کا وارث ہوا۔ ۱۴۳۵ء میں ہوشنگ شاہ کا انتقال ہوگیا، اُس وقت سلطان محمود خلجی نے مالوہ پر اپنا قبضہ جمالیا۔ یہی عہد ہے جب قلعہ رائسین کا نام پہلی مرتبہ تاریخ کے صفحات پر آتا ہے۔ غیاث الدین خلجی محمود خلجی کا بیٹا تھا، اس نے ۱۴۶۹ء سے ۱۵۰۰ء تک مالوہ پر حکومت کی۔ اِس کے عہد میں قلعہ رائسین کے اندر جو عمارتیں تعمیر ہوئیں اُن میں "ایمیا کا مندر" اور "غانم الملک کی مسجد" بطور خاص قابل لحاظ ہیں۔ ان عمارتوں پر سنگین کُتبے بھی لگائے گئے تھے۔

قلعہ کے اندر جو عمارتیں اس وقت تک محفوظ رہ گئی ہیں اُن میں چار محل، چار مندر، دو مسجدیں

اور چند تالاب ہیں۔ ان میں "غانم الملک کی مسجد" بارہ دری، ایمیا کا مندر اور عطردان بہت اچھی حالت میں ہیں۔ حکومت بھوپال کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کی شکست وریخت کی مرمت ہوتی رہتی ہے۔ یہ سلسلۂ عمارات جس احاطہ میں واقع ہے اُس کا مغربی دروازہ بھی اچھی حالت میں ہے۔ اس دروازہ پر ایک پتھر نصب ہے لیکن اُس پر کوئی کتابہ موجود نہیں ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور بھی عمارتیں ہیں لیکن وہ زیادہ جاذبِ توجہ نہیں، ان میں ایک ستون ہے جو مدوّر چبوترہ پر تعمیر کیا گیا ہے، ایک میگزین ہے، ایک حمام ایک شفاخانہ اور تین چھوٹے چھوٹے مندر ہیں، ان سے کچھ فاصلہ پر ایک نقارخانہ ہے۔

قلعہ کے تین دروازے ہیں، دو جنوبی اور ایک شمالی، اُن کی حالت بھی ٹھیک ہے، ان پر ایسی تحریریں بھی ہیں جن سے قلعہ کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، زیادہ تر عمارتوں پر گنبد بنے ہوئے ہیں جنھیں اونچی کرسی دیکر تعمیر کیا گیا ہے، بعض دریچوں اور دیواروں پر جابجا چھوٹی چھوٹی بُرجیاں بنائی گئی ہیں ان سے عمارت کے حُسن ودلآویزی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ عمارتوں کے حُسن کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے مناسب مقامات پر عالیشان اور کشادہ محرابیں تعمیر کی گئی ہیں۔ ہر محراب کو کئی چھوٹی چھوٹی محرابوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی یہ چھوٹی محرابیں بڑی محراب کو سہارا دئے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں محرابوں کا یہ طرز اکثر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن فنِ تعمیر کا جو دلکش نمونہ رائسین کی محرابوں میں ظاہر کیا گیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

تمام عمارات کی دیواروں پر چونے کا موٹا پلاستر کیا ہوا ہے، پلاسٹر پر سفید چمکدار وارنش کرکے گلکاری کا کمال دکھایا گیا ہے، اکثر جگہ یہ گلکاری مٹ گئی ہے، لیکن بارہ دری کے بعض گوشوں میں اب بھی نمایاں ہے۔ عرصۂ دراز تک قلعہ اپنی اصلی قدیم حالت پر قائم رہا۔ اس کے بعد شکست وریخت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جو حصہ مرمت سے درست ہوسکتا تھا اُس کی مرمت کی گئی، باقی حصوں کو ازسرِنو تعمیر کیا گیا، قلعہ کے چاروں طرف سنگین فصیل کھینچی گئی، اس میں بُرج اور مورچے بنائے گئے، پایداری کے لئے پُشتے باندھے گئے، عالیشان دروازے تعمیر کئے گئے، گھونگھٹ کی دیواریں نکالی گئیں، قلعہ کے گرد کھائی کھودی گئی۔

موجودہ حالت میں قلعہ کی مختلف عمارتوں پر حسبِ ذیل کتابے ہیں:-

(۱) ایمیا کے مندر کی دیوار پر بزبان سنسکرت۔

(۲) مسجد غانم الملک کی درمیانی محراب پر فارسی زبان میں۔

(۳ و ۴ و ۵) دروازۂ نظامت پر یہ تینوں کتبے اس علاقے کی زبان میں ہیں جو ہندی سے ملتا ہے۔

(۶) فارسی کتبہ بھوپال دروازہ پر،

مندر کے دروازے پہ کتبے کا جو پتھر نصب ہے اس کا طول ۱۲ ۳/۴ انچ اور عرض ۱۲ ۱/۲ انچ ہے اس میں گیارہ سطریں ہیں اور اس کی زبان بگڑی ہوئی سنسکرت کا نمونہ ہے۔ باد و باراں کے بیشمار حملوں کی وجہ سے تحریر کا بہت زیادہ حصہ محو ہو گیا ہے۔ بڑی کوشش کے بعد کہیں کہیں سے کچھ نشانات پڑھے جا سکتے ہیں۔ ایک جگہ سن، دن، اور تاریخ لکھی ہوئی ہے جو یہ ہے:۔

"بکرمی سمبت ۱۵۴۳، ساکھا ۱۴۱۱ مانگھ بدی تیرس۔ وادی دتا۔ پوسس نکھتر"

یہ دن اور تاریخ یوم شنبہ ۲۳ جنوری ۱۴۹۱ء کے مطابق ہے۔ دوسری سطر میں صرف یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں:۔

"دینا محمودا ساہی"

خیال جاتا ہے کہ پہلے کے جو الفاظ مٹ گئے ہیں وہ ملا کر شاید "غیاث الدین محمد شاہ" بادشاہ مالوہ کا نام ہوگا۔ تیسری سطر میں صرف "مالوہ دیش" پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے آگے جو نقوش ہیں وہ صاف طور سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بڑی دیدہ ریزی کے بعد "گدا۔ اے میا دوا" لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی سطر کا زیادہ حصہ صاف ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں:۔

"ملکا۔ ترکمانا، مالا، ملوکا، سلطانی"

پانچویں سطر کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں لکھا ہوا ہے:۔

"امرتا بابا۔ نامہ

اس کتبہ کی جو عبارت کہیں کہیں سے باقی رہ گئی ہے اور جسے ناظرین سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، وہ اس قدر بے ربط اور مبہم ہے کہ اس سے اصل کتبہ کی حقیقت یا مندر کی بابت کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جیسا آئندہ واضح ہوگا ہم نے اس کا مطلب نکالنے، عبارت کے جوڑ بٹھانے اور ناموں کی تحقیق میں بہت کوشش صرف کی ہے۔ خیال ہے کہ جو نتیجہ اس کوشش سے برآمد ہوا ہے وہ صحت سے بہت زیادہ قریب ہے، اس کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:۔

پہلے کتبہ کی تشریحات :۔ اس کتبہ کی دوسری سطر میں جو "دینا محمودا ساہی" لکھا ہوا ہے وہ "بن محمود شاہ" کا بگڑا ہوا ہے، محمود شاہ کا لڑکا غیاث الدین خلجی تھا جس کا ذکر اوپر کسی جگہ آ چکا ہے، تیسری سطر میں "مالوہ دیش" کا مطلب صاف ہے یعنی ملک مالوہ۔ ہاں "گدا اے میا دوا" کی عبارت

عبارت قابل غور ہے۔ مگر تھوڑی سی فکر کے بعد یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے۔ اس عبارت سے مطلب یہ ہے "قلعہ ایمیا آباد" ایمیا آباد اسلام آباد کا بگڑا ہوا ہے۔ شاہان مالوہ، نے رائسین کا نام اسلام آباد رکھا تھا۔ آج بھی قصبہ رائسین کے ایک حصّہ کا نام اسلام آباد اور دوسرے کا خیر آباد ہے۔ تاریخ فرشتہ میں جہاں مالوہ کا ذکر آتا ہے وہاں اسلام آباد کا نام اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً شاہانِ مالوہ کے سلسلہ میں ایک عبارت کا ترجمہ حسب ذیل ہے

"محمد شاہ سلطان نے شہزادہ احمد شاہ غوری کو اسلام آباد کا علاقہ جاگیر میں عنایت کیا۔ احمد شاہ جب یہاں پہونچا تو قلعہ کے قدرتی محلِ وقوع کو دیکھکر اس کی تسخیر کا ارادہ کیا، اور اسلام آباد کے قریب ایک طاقتور فوج جمع کی۔ محمود خلجی کو جب اس کی خبر ہوئی تو اُس نے اپنے جانباز جنرل تاج خاں کی سرکردگی میں ایک جرّار لشکر شہزادہ کی سرزنش کے لئے روانہ کیا۔ قلعہ کے استحکام اور رفعت کے آگے شہزادہ کا کچھ زور نہ چل سکا۔ اس سے پہلے بھی سلطان کا باپ اعظم ہمایوں اپنی فوجی طاقت اور حملہ کے زور شور کے باوجود قلعۂ اسلام آباد کو مسخر نہ کر سکا تھا۔"

چوتھی سطر میں جو "مارکا، ترکمانا، مالا، ملوکا" لکھا ہوا ہے اور جس کا اعادہ نویں، دسویں اور گیارھویں سطر میں بھی کیا گیا ہے وہ درحقیقت "ملک ترکمان الملک سلطانی" ہے جو غالباً ۱۴۹۱ء میں اس قلعہ کا حاکم تھا۔ پانچویں سطر میں "امرتا، بابا، نامہ" کا مطلب بھی سمجھ لیجئے۔ یہ امرت بائی نامی کی خرابی ہے۔ یعنی مشہور امرت بائی" غالباً یہ وہی نیک خاتون ہے جس نے یہ مندر تعمیر کرایا۔

غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ کے حرم میں جس کے عہد میں مذکورہ بالا مندر تعمیر ہوا مختلف نسل و مذہب کی تقریباً پندرہ سو عورتیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے ساتھ سلطان کو بہت زیادہ محبت تھی۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتبہ کا مطلب صاف ہو گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"سمت ۱۵۴۸ بکرمی مطابق ۱۴۹۱ء ساکھا بنگلہ ماگھ بدی تیرس راوی دنا، یوس نکھتر جبکہ سلطان غیاث الدین بن محمود شاہ مالوہ کا بادشاہ تھا اور جب ترکمان الملک سلطان اسلام آباد کا حاکم تھا حرم سلطانی کی نامور خاتون امرت بائی نے یہ مندر تعمیر کرایا۔"

مندر مذکور سری گنیش کی پوجا کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، اندرونی حصّہ میں گنیش جی کی مورتی بھی نصب کی گئی تھی جو اب موجود نہیں ہے، لیکن مندر کے دروازے اور اندرونی محراب پر گنیش جی کی جو تصویریں کندہ ہیں وہ اب بھی بہت نمایاں ہیں۔ یہ مندر آج بھی "بیمیا مندر" کے نام سے مشہور ہے۔ مندر کا اصلی

لے تاریخ فرشتہ جلد چہارم مرتبہ برک صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۰

حصہ اس وقت تک درست حالت میں ہے۔ حال میں گورنمنٹ بھوپال نے بصرف زر کثیر مندر کی شان و حسن میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ صحن مندر کے شمالی اور جنوبی جانب زمین دوز دالان ہیں۔ شمالی دالان کھلا ہوا ہے، اس پر کوئی چھت نہیں ہے، جنوبی دالان خوبصورت تہ خانہ کی صورت میں ہے۔

غانم الملک کی مسجد:۔ اس مسجد میں کتبہ کا ایک پتھر نصب ہے جس کا طول ۳۲ انچ اور عرض ۲۶ انچ ہے، اسے ۳۶ خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دو خانوں میں حمد و نعت اور بادشاہ وقت کی تعریف ہے، بقیہ ۳۴ خانوں میں سترہ شعر ہیں۔ یہ کتبہ آفات ارضی و سماوی سے بالکل محفوظ رہا ہے تمام اشعار صاف پڑھے جاتے ہیں، تحریر میں "خط نسخ" استعمال کیا گیا ہے لیکن اکثر اشعار ناموزوں ہیں اور جو موزوں ہیں اُن کی بحر میں یکسانیت نہیں ہے۔ کوئی شعر کسی بحر میں ہے کوئی کسی بحر میں۔ بعض جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شعر کے دونوں مصرعے بے ربط بھی ہیں اور ہر ایک کی بحر بھی جداگانہ ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مصنف اصول شعر گوئی اور عروض سے ناواقف محض تھا۔

شائقین تاریخ جو وقتاً فوقتاً اس علاقہ میں آتے رہے اُن میں بہت کم ایسے ہیں جنھوں نے قلعہ کے کتبات پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ بعض صاحبان نے زیر بحث کتبہ کی طرف ضرور توجہ کی لیکن اس طرح کہ زیادہ تر اشعار بغیر پڑھے چھوڑ دیے گئے، اور جن اشعار کو پڑھا گیا اُن کے مشکوک الفاظ کو نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہی امر مسجد کے سنین بنا، اور مرمت کے تعین میں سہو کا باعث ہوا چنانچہ عہد حاضر کے بعض محققین نے مسجد کا سنہ تعمیر ۹۹۵ ہجری مطابق ۱۵۵۰ء تحریر کیا ہے جو کہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ ہے۔ تعمیر کا یہ سنہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اسی کتبہ کے آٹھویں شعر کے پہلے مصرع سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مسجد کی تعمیر سلطان غیاث الدین شاہ مالوہ کے عہد میں ہوئی۔ پھر آخری شعر سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر میں تاریخ تکمیل ۹۰۵ھ (مطابق ۱۴۹۹ء) دی ہوئی ہے جو سلطان غیاث الدین ہی کا دور حکومت ہے۔ اس لئے کہ اس کا انتقال ۱۵۰۰ء میں اس سے ایک سال بعد ہوا ہے۔

مسجد کی مرمت کی بابت بعض محققین فرشتہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ۹۳۴ھ مطابق ۱۵۲۸ء میں بابر نے میدنی رائے کو شکست دینے کے بعد رائسین، چندیری، سارنگ پور اور رنتھمبور کی مساجد کی از سر نو تعمیر و مرمت کی تھی، کیونکہ میدنی رائے نے انھیں مویشی خانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ بابر، چندیری سے آگے کبھی نہیں بڑھا، اس واقعہ کو "توزک" میں خود اُس نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"میرا ارادہ تھا کہ فتح چندیری کے بعد رائے سنگھ (رائسین) بھلسن (بھلسہ) اور سارنگ پور پر حملہ کروں جو کفار کا ملک ہے اور انھیں فتح کرنے کے بعد سنگا" کے خلاف چتوڑ پر فوج کشی کروں لیکن شمالی ہند سے بغاوت کی ناگوار خبریں آنے کی وجہ سے میں نے چندیری، سلطان ناصر الدین سابق بادشاہ مالوہ کے پوتے احمد شاہ کو عنایت کی"[1]

تیسرے کتبہ کی تشریح:۔ اس کتبہ کی زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا مقامی ہے جو ہندی سے مشابہ ہے اس میں مندرجہ ذیل تاریخ دی ہوئی ہے:۔

"سمبت ۱۵۸۲ سوما، پنجم سدی"

یہ تاریخ یوم دوشنبہ ۵۔ فروری ۱۵۲۶ء کے مطابق ہے۔" سلاہا داودا" اور" مہارانا بھوماپتی ساہی" کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں، آخری سطر میں لفظ "ماپھی" اور حسب ذیل مشہور مثل لکھی ہے:۔

"جو لو گنگا جمنا، تو لو"

"سلاہا داودا" اور "مہارانا بھوماپتی ساہی" انھیں باپ بیٹوں کے نام ہیں جنھیں تاریخ میں سلہدی اور بھوپت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "ماپھی" اصل میں معافی ہے۔ یہ اصطلاح اُس زمین کے لئے مخصوص ہے جس پر سرکاری لگان معاف ہوتا ہے۔ جو لو گنگا جمنا، تو لو۔ یعنی جب تک گنگا جمنا میں پانی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک گنگا جمنا میں پانی رہیگا اُس وقت تک یہ زمین بطور معافی کے رہیگی یعنی دائمی معافی۔

سلہدی، رانا سنگا مہارانا چتوڑ کا داماد تھا۔ رانا کی لڑکی درگاوتی کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ محمود ثانی سلطان مالوہ (۱۵۱۲ء ۱۵۲۶ء) پر میدنی رائے کا غیر معمولی اثر تھا۔ میدنی رائے مسلمان سرداروں کو نکلوا کر اُن کے عہدے اور علاقے سلطان سے ہندوؤں کو دلواتا رہتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں محمود کی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں رائسین بھلسہ اور سارنگ پور کے علاقے سلہدی کو دئے گئے۔ اس واقعہ کو فرشتہ ان الفاظ میں لکھتا ہے:۔

"۱۵۲۶ء میں سلطان محمود ثانی نے رائسین اور بھلسہ کے قریب کچھ گاؤں سلہدی کو بطور

---

[1] تزک بابری ص۲۷۰ و تاریخ ہند مصنفہ مسٹر ایلیٹ۔

دائمی جاگیر کے عطا کئے۔[۱]

اس دائمی جاگیر کا فرمان قلعہ رائسین کے اُس ستون پر کندہ ہے جو نظامت کے شمالی دروازہ کی طرف ہے۔

لیکن یہ شخص سخت محسن کش اور ناشکر گذار ثابت ہوا۔ عطائے جاگیر کے تھوڑے دنوں بعد اپنے ولی نعمت سے باغی ہو کر معہ اپنے بیٹے بھوپت کے بہادر شاہ سلطان گجرات سے جا ملا اور اُس سے سازش کر کے اپنے آقا پر فوج چڑھا لایا۔ بہادر شاہ کو جب مالوہ پر فتح حاصل ہوئی تو اُس نے سلہدی کو جس سے اس فتح میں سب سے زیادہ مدد ملی تھی اجین، رائسین اور سارنگ پور کے علاقے عطا کئے۔

سنہ ۱۵۳۱ء میں بہادر شاہ کو اطلاع ہوئی کہ سلہدی نے چار سو مسلمان عورتوں کو اپنے محل میں بجبر رکھ چھوڑا ہے۔ سلطان نے اُس کی سرکوبی کا عزم کیا۔ سلہدی سیوالنس کی طرف بھاگا جا رہا تھا کہ سلطان نے گرفتار کر کے مانڈو میں اُسے قید کر دیا۔ سلہدی نے یہاں بخوشی خاطر اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا، اس کا نام صلاح الدین رکھا گیا۔ شاہی دربار میں پہونچکر اُس نے مسلمانوں کے ساتھ کھانا بھی کھایا، اُسے اِس بات کی اجازت دی گئی کہ رائسین جا کر اپنے لواحقین کو کیمپ میں لے آئے۔ لیکن جس وقت وہ اپنے محل میں پہونچا تو رانی درگاوتی نے اُسے اور اُس کے بھائی لوکمن کو سخت لعنت ملامت کی کہ قلعہ میں عورتوں کو تنہا چھوڑ کر خود فرار ہو گئے۔ رانی نے اُن دونوں کے سر ول پر اس بے حمیتی کا عذاب نازل کرانے کے لئے زنانخانہ کے چاروں طرف ایک بڑی چتا تیار کرائی اور خود معہ سات سو عورتوں کے دہکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑی اور تھوڑی دیر میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی اِس ہولناک منظر سے متاثر ہو کر سلہدی اور لوکمن اپنی نسل کے اکیسو آدمی لے کر بہادر شاہ کی فوج پر اچانک ٹوٹ پڑے اور مختصر سی لڑائی کے بعد مارے گئے۔

اب رانی کا محل اینٹ پتھر کا ڈھیر ہے، ہاں چتا کی جگہ بدستور محفوظ ہے۔ قلعہ میں لوہے کی ایک لاٹھ پڑی ہوئی ہے جو چار فیٹ لمبی چھ انچ موٹی اور دو من وزنی ہے۔ عوام کی خوش اعتقادی اسے سلہدی کا عصا کہتی ہے جسے وہ ہاتھ میں لیکر چلتا تھا۔ اِس کے ایک سرے پر لٹو اور دوسرے سرے پر ایک سوراخ ہے۔ ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ لاٹھ امیا کے مندر میں کسی مدور چبوترہ پر نصب ہو گی اور اس کے سائے سے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہو گا۔

چوتھا کتبہ:- یہ نظامت کے جنوبی ستون پر ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جو شمالی کتبہ کی ہے لیکن

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد چہارم ص ۲۶۶ مرتبہ برگ

یہ اس قدر خراب ہو گیا ہے کہ حروف بالکل نہیں پڑھے جاتے بجز سنہ اور تاریخ کے جو شروع میں لکھی ہوئی ہے اور جو اول الذکر کتبہ کے بالکل مطابق ہے۔

پانچواں کتبہ:- یہ کتبہ بھی اُسی زبان میں لکھا گیا ہے جس میں کہ دونوں سابق الذکر کتبے ہیں، تاریخ حسب ذیل الفاظ میں ہے:-

"سمت ۱۵۹۹ سنی دنا۔ نومی بدی، بھدا بدا"

یعنی سنیچر ۱۹۔ اگست ۱۵۴۲ء۔ اس کتبہ میں یہ نام لکھے ہوئے ہیں:-

"مہاراج ادھیراج پرتاب ساہی دیو"

"مہاراجکمار پورن دیو"

"چندر بھان دیو"

ان میں سے پہلا نام پرتاب ساہ کا ہے، یہ بھوپت کا خرد سال بچہ تھا۔ پورن مل جسے کتبہ میں پورن مار دیو لکھا گیا ہے اور جو تاریخ میں پورن مل کے نام سے مشہور ہے بھوپت کی خرد سالی کی وجہ سے قلعہ رائسین کا انتظام کرتا تھا۔ چندر بھان غالباً وہی شخص ہے جس کا بہت کچھ تعلق تاریخ بھوپال یا گوکل پور کی معرکہ آرائیوں کے ساتھ ہے۔

کتبۂ مذکور کی تاریخی تشریح بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے، رائسین کو ۱۵۳۲ء میں ہمایوں نے فتح کیا تھا۔ اس زمانہ میں ایک شخص ملّو خاں نامی تھا۔ یہ شاہانِ مالوہ کے زمانہ میں بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکا تھا۔ ہمایوں نے جیسے ہی اُدھر سے پیٹھ پھیری ملّو خاں نے نربدا سے بھلسہ تک تمام علاقہ دبا لیا اور مانڈو کو اپنا پایۂ تخت قرار دیکر قادر شاہ کے لقب کے ساتھ مالوہ کا خودمختار حاکم بن بیٹھا۔ ان حالات کو سُن کر پورن مل اور بھوپت دونوں بھائی چتوڑ سے مالوہ کی طرف آئے اور رائسین پر قبضہ کر لیا مگر انھیں قادر شاہ کی اطاعت اختیار کر کے باجگزار بننا پڑا۔ اُس وقت سلہدی کا لڑکا پرتاب بہت کم سن تھا۔ چندیری اور رائسین کے علاقے اُس کی جاگیر میں تھے۔ اس لئے پورن مل ان علاقوں کا منتظم ہو گیا[1]۔

اس پانچویں کتبہ میں اُسی فرمان کا حوالہ ہے جس کے ذریعہ قادر شاہ نے رائسین اور رائس نواح کے مواضعات پرتاب کو جاگیر میں دیئے تھے۔ قادر شاہ زیادہ مدت تک حکومت کا لطف نہیں اُٹھانے پایا کیونکہ ۱۵۴۲ء میں شیر شاہ نے مالوہ کا رُخ کیا اور قادر شاہ کو تخت سے اُتار کر مالوہ پر اپنی

[1] تاریخ شیر شاہی صفحہ ۳۹۱

حکومت قائم کی۔ گاگرون کے مقام پر پورن مل کو حکم ملا کہ اپنے تئیں شیر شاہ کے دربار میں حاضر کرے، دربار میں اُس کے ساتھ مراعات کا برتاؤ کیا گیا اور بحفاظت تمام اُسے اپنے علاقہ پر واپس بھیجا گیا لیکن اُسے اپنے بھائی چھترمل کو بطور ضمانت دربار شاہی میں چھوڑنا پڑا[1]

چھٹا کتبہ:- یہ فارسی زبان میں ہے، اس میں اُس شاہی فرمان کا حوالہ ہے جس کے رو سے شیر شاہ نے رائسین کو معہ مضافات پرتاب کی جاگیر میں عطا کیا تھا۔ ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ کو پرچہ لگا کہ پورن مل نے نہایت ظلم وستم کے ساتھ دو ہزار عورتوں کو اپنی بیویاں بناکر رکھ چھوڑا ہے۔ ان میں کچھ مسلمان عورتیں بھی ہیں۔ احمد یادگار کا بیان ہے کہ ان عورتوں میں سادات بلگرام کی وہ خواتین بھی تھیں جنھیں پورن مل نے بجبر حاصل کیا تھا۔ شیر شاہ یہ خبر پاتے ہی یلغار کرتا ہوا مالوہ کی طرف بڑھا اور قلعہ رائسین کے سامنے فوجیں ڈال دیں مندرجہ ذیل مصرع سے اس واقعہ کی تاریخ نکلتی ہے:-

قیامِ بارگاہ باشد مبارک
۹۵۰ھ

محاصرہ نے کسی قدر طول کھینچا، آخر کار پورن مل نے اطاعت قبول کی۔ شیر شاہ نے اُس کی جاں بخشی کی لیکن حکم دیا کہ قلعہ خالی کردے اور اپنے تمام سامان وسپاہ کو لیکر بعافیت باہر نکل جائے[2]

جب تک شیر شاہ رائسین کے قریب خیمہ زن رہا پورن مل بطور مہمان شاہی کے وہیں مقیم رکھا گیا اس زمانہ میں ہر وقت بیوہ عورتوں یتیم بچوں اور مظلوموں کی کثیر جماعت شیر شاہ کے راستوں پر جمع رہتی تھی اور پورن مل کے مظالم کی داستانیں بیان کرکے فریاد کرتی تھیں۔ پورن مل کو اپنی حسین ترین رانی رتن ولی کی طرف سے بھی اندیشہ تھا، اس لئے موقعہ پاکر اسنے اُس کو تہ تیغ کردیا۔ اِس جرم کی یاداش میں اُسے ساتھیوں سمیت قتل کردیا گیا[3]۔ شیر شاہ نے قلعہ رائسین کو اپنی سلطنت کے خاص قلعوں میں داخل کیا۔ اور اس میں ہر وقت ایک ہزار مسلح سپاہ کا قیام رہنے لگا۔

شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں اس قلعہ کی مرکزیت بدستور قائم رہی۔ شاہی فوج کے کئی مسلح دستے یہاں متعین رہتے تھے۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی کا بازار گرم ہوا تو نواح قلعہ کے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی خود مختاری کا دم بھرنے لگے۔ انھیں میں سے ایک زمیندار نے قلعہ رائسین پر قبضہ جمالیا۔ آخر سردار دوست محمد خاں بانی ریاست بھوپال نے اُسے فتح کرکے دربار دہلی سے اپنے لئے سند حاصل کی۔ ۱۷۶۱ء میں ریاست کے ایک باغی سردار مرید محمد خاں نے یہ قلعہ مرہٹہ سردار بالاراؤ انگلیہ کے حوالہ کردیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وزیر محمد خاں صاحب نے اسے واپس لے لیا! اُس وقت سے ابتک فرمانروایانِ بھوپال کے قبضہ میں ہے۔

---

[1] تاریخ شیر شاہی ۳۹۱ [2] منتخب التواریخ صہ ۶۰ و ۶۱ [3] تاریخ خان جہاں صہ ۱۳۱ [4] تاریخ شیر شاہی صہ ۳۰۲ و ۳۰۳

آغازِ بہار

(از حضرت روشن صدیقی)

رخصت اے قافلۂ شامِ خزاں گلشن سے
صبح کا پرچمِ خورشید نگار آتا ہے
ہر طرف عطر فشاں نکہتِ آزاد ہے پھر
لمحہ لمحہ نفسِ خلد سے آباد ہے پھر
گل فشاں، رنگِ رخِ عالمِ ایجاد ہے پھر
قاصدِ شاہدِ زیبائے بہار آتا ہے

خاکِ افسردہ میں شعلے سے دمک اُٹھے ہیں
بجلیاں دوڑ گئیں برف زدہ نہروں میں
مضطرب، آتشِ سیّال سی ہے لہروں میں
اک نیا جوش ہے دیہات میں اور شہروں میں
بام و در نورِ مسرت سے چمک اُٹھے ہیں

موجزن پھر گل و ریحاں میں ہوا خونِ حیات
خواب پھر جاگ اُٹھے نرگسِ حیراں کے لئے
رہِ میخانہ کھلی سرد خراماں کے لئے
نہ رہی کوئی کشش روضۂ رضواں کے لئے
چھا گیا گلکدۂ خاک پہ افسونِ حیات

گرمیٔ مہر ہے پیغمبرِ آغازِ بہار

نغمۂ جوئے رواں تمکنت افروز ہے پھر
آتشِ لالۂ گلرنگ خزاں سوز ہے پھر
زندگی ذوقِ بقا سے تپش اندوز ہے پھر
عرصۂ دہر ہے ممنونِ تگ و تازِ بہار

جس طرح تابشِ خورشید ہے نقاشِ چمن
ہے یونہی عشق بھی پیغامِ بہارِ ہستی
ہے یہی شعلۂ شاداب مدارِ ہستی
نور بنتی ہے اسی آنچ سے نارِ ہستی
جگمگاتا ہے اِسی شمع سے کاشانۂ تن

قلب جب آتشِ الفت سے پگھل جاتا ہے
زیست سے پھوٹتے ہیں مہر و وفا کے چشمے
سوزِ اخلاص کے، تسلیم و رضا کے چشمے
جوششِ خدمتِ مخلوقِ خدا کے چشمے
ہر نفس قالبِ ایثار میں ڈھل جاتا ہے

نکہتِ عشق سے ہے حسنِ عمل کی معراج
روح جب بوئے محبت سے مہک جاتی ہے
چمنِ جاں میں کچھ اس طرح بہار آتی ہے
کہ خزاں آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے
زندگی عشرتِ فردوس سے لیتی ہے خراج

خواجہ آتش

(از مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

حقیقی شاعری وہ ہے جس میں زندگی کی حرارت و کیفیت بھری ہو، اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر نے زندگی کے جس پہلو کی تصویر کھینچی ہے وہ اتنی مکمل ہو کہ دیکھتے ہی ناظر کا بھی وہی پہلوے زندگی روشن ہوجائے یعنی اُسے اپنی زندگی کی تصویر نظر آنے لگے۔ خواجہ آتش کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کی حرارت و کیفیت سے لبریز ہے۔ ذیل میں ایک غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن میں خواجہ نے زندگی کے مستانہ رخ پر روشنی ڈالی ہے ؎

کون سی جا ہے جہاں تیرے نہیں اے یار مست
دیکھئے جس کوچے میں بڑ مارتے ہیں چار مست

خدا کی خدائی میں جدھر نظر ڈالئے ہر متوالا اپنے اپنے رنگ اپنی اپنی زبان میں اُسی واحد و یکتا کا کلمہ پڑھ رہا ہے، یہ بھی انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے مستانہ و عارفانہ

کون پُوجے بت کو، کس سے ہو سکے یادِ خدا
اپنے اپنے حال میں ہیں کافر و دیندار مست

انسان کتنا ہی طاقتور ہو روحانی اعتبار سے یا جسمانی لحاظ سے، بہرحال اپنے ماحول کا پابند ہے، ماحول جیسا چاہے بنادے۔ خدا کی یاد کے لئے بھی مناسب ماحول کی ضرورت ہے، جہاں ماحول بدلا یادِ خدا بھی خواب فراموش ہوگئی۔ اس مادہ پرستی کے زمانے میں نہ خدا کو کوئی پوجتا ہے نہ بتوں کو۔ گاندھی جی ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کی فکر میں ہیں اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوچکے ہیں۔ اور علامہ اقبال ستلج سے دریائے نیل تک اسلامی سلطنت دوبارہ قائم کرنے کا خواب دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ سب اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔

فصلِ گل ہے ساقیِ یوسف لقا ہے ساتھ ساتھ لالہ گوں مَے پیتے پھرتے ہیں سرِ بازار مست

خوبیِ وقت سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان گھڑی دو گھڑی زندگی کے کچھ مزے اُٹھا لیتا ہے

حُسن کی نیرنگ سازی سے عجب اس کا نہیں
مست ہوشیار تجھکو دیکھکر ہشیار مست

حُسن تو وہی ایک ہے مگر اُس کا اثر مختلف، کتنی سچی تعریف ہے حُسن کی، کہیں آگ کہیں پانی۔ بڑے بڑے صاحبانِ جاہ و جلال کا نشۂ پندار جلوۂ حُسن کے آگے ہرن ہوجاتا ہے اور صاحبانِ ہوش و خرد ایک ہی نظارہ میں آپ سے باہر ہوجاتے ہیں۔

میکدے میں نشہ کی عینک دکھاتی ہے مجھے
آسماں مست و زمیں مست و درو دیوار مست

آسمان و زمین جو ہیں سو ہیں، مگر آنکھوں میں سرسوں پھولی ہوئی ہو تو تمام شش جہت میں مستی ہی برستی نظر آتی ہے، دل چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔ نشہ کا استعارہ عینک سے ایک تازہ اختراع ہے۔ عینک نظر پر ایک خاص رنگ چڑھا دیتی ہے یا نظر کو مصنوعی طور پر ایک عارضی قوت پہونچادیتی ہے مگر اس سے نظرگاہ یا منظر کی حقیقت نہیں بدلتی۔ عینک کیا ہے ایک قسم کا فریب ہے، نشہ بھی ایک فریب ہے، جہاں نشہ اُتر گیا، عینک اُتر گئی، فریب کھُل گیا، مگر یہی فریب یہی کیفیت عارضی وہ شئے ہے جسے اس حیاتِ چند روزہ میں لوگ عین زندگی سمجھتے ہیں۔

نشہ کے فلسفہ پر ایک فلسفی دفتر کے دفتر لکھ سکتا ہے مگر شاعر نے نشہ کی حقیقت واضح کرنے کے لئے ایک ایسا بلیغ لفظ (عینک) انتخاب کیا جو شاعر ہی سے ممکن تھا۔

زاہدوں کے پنجگانہ پر فضیلت ہے اُسے
نشہ کے عالم میں کرتے ہیں جو استغفار مست

نمازِ پنجگانہ کا کوئی نیک اثر پیدا ہو یا نہ ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ نماز پیشہ اصحاب میں سے فی صدی نناوے مغرور و سنگدل ہوجاتے ہیں، دل میں وہ گداز وہ درد، وہ ہمدردی جو ایک انسان میں ہونی چاہیئے نماز پیشہ اصحاب سے کنارہ کر جاتی ہے۔ اس کا سبب کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک شرابی نمازیوں کی طرح سیاہ قلب نہیں ہوتا۔ گو شرابی کی توبہ محض ایک بلّی کی سی توبہ ہوتی ہے مگر کم از کم اُس کا استغفار صدقِ دل سے ہوتا ہے۔ یہی صدقِ دل اور خلوصِ نیت وہ شے ہے جس سے نمازی بے بہرہ ہوتے ہیں، پھر ایسے استغفار کو نمازِ پنجگانہ پر فضیلت کیوں نہ ہو۔ ریاکاروں اور گناہگاروں میں دیکھئے کس کا انجام بخیر ہو۔ اگر دونوں کا انجام یکساں ہوا تو گنہگار ہی اچھے رہے

میرا ایک شعر ہے ؎

ہنسی میں لغزشِ مستانہ اُڑ گئی واللہ تو بیگناہوں سے اچھے گناہگار رہے

ساقی و پیرِ مغاں سے ملتجی ہوتے نہیں
دیکھ لیتے ہیں تری صورت ترے دیدار مست

دیدار مست یعنی مستِ دیدار اضافت مقلوبی ہے۔ ایسے پاکبازانِ محبت کو جو بے پیئے مست رہتے ہیں ساقی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی کیا ضرورت۔ یہی نشۂ دیدار افلاطون کا مذہب تھا جسے محبتِ افلاطونی (Platonic Love) سے موسوم یا مطعون کرتے ہیں۔ یہ وہ محبت ہے جسے دیدار و گفتار کے سوا دیگر لذاتِ نفسانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پاک محبت کا مشاہدہ میرے ایک کرم فرما مرزا عبداللہ صاحب حسرتی لکھنوی مرحوم کو بھی ہوا تھا۔ ایک امریکن مشن کے پادری پروفیسر مرزا صاحب کے اُستاد تھے جو اپنی محبوبہ کے ساتھ لکھنؤ میں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ کھانا پینا رہنا سہنا ایک ہی جگہ تھا مگر اس پر بھی روحانی محبت کے سوا کوئی جسمانی تعلق نہ تھا۔ جب یہ حقیقت مرزا صاحب پر ثابت ہوگئی تو وہ حد درجہ اپنے استاد اور اُن کی محبوبہ کا احترام کرنے لگے۔ مگر پروفیسر صاحب موصوف کا خانساماں اپنی جگہ نوکروں میں بیٹھکر طعنے مارتا تھا اور اُن دونوں کی پاک محبت پر ناپاک الزام رکھا کرتا تھا۔ ایک دن مرزا صاحب نے سُن پایا تو اُسے ڈانٹا کہ خبردار ایسا بیہودہ کلمہ پھر کبھی نہ کہنا۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی۔ مرزا صاحب کو اس پر طیش آگیا اور اُسے خوب ٹھونکا۔ اُس نے عدالت میں دعویٰ دائر کردیا۔ عدالت میں مرزا صاحب کا بیان لیا گیا تو اُنھوں نے اقرار کیا کہ ہاں میں نے اسے ضرور مارا اور اگر پھر ایسی گستاخی کریگا تو پھر مارونگا میں اپنے اُستاد اور اُن کی محبوبہ کی شان میں ایسی گستاخی کو برداشت نہیں کرسکتا کیونکہ اپنے علم و یقین میں ان دونوں بزرگوں کو مقدس اور ولی جانتا ہوں۔

دخترِ رز کے لئے ہونا ہے اک دن کشت و خوں
محتسب پر کھینچتے ہیں آجکل تلوار مست

محتسب دخترِ رز کو حرام ٹھہراتا ہے تو کیا، رندانِ بیباک تلوار کے زور سے حلال کرلیں گے۔

عام سودا ہے تمہارے گیسوئے پُرپیچ کا
روز زنجیروں میں جکڑے جاتے ہیں دو چار مست

اِس نئی روشنی میں گیسو بریدہ عورتوں کا نظارہ اتنا عام ہوگیا ہے کہ یاروں کا مذاقِ حُسن بھی کچھ سے کچھ ہوگیا۔ لمبے لمبے گھونگھر والے بال کٹوا کر پٹے رکھوائے جاتے ہیں۔ زمانے کی بدمذاقی سے نسوانی حُسن لنڈورا ہوکر رہ گیا، مگر مجھے تو خواجہ آتش کا یہ مطلع نہیں بھولتا ؎

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا　　جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

زاہدانِ خشک کو کیفیتِ دنیا نہیں
ساغرِ گل سے ہوے کس دن چمن میں خارمست

حیاتِ انسانی کا یہ پہلوئے خشک ایک طُرفہ تماشا ہے بقول شخصے "من تشنہ آب اندر" زاہدانِ خشک پر خار کی پھبتی کسی ہے کہ جس طرح کانٹے پہلوے گل میں رہ کر بھی کیفیتِ رنگ و بُو سے بے بہرہ رہتے ہیں اسی طرح زاہدانِ خشک دنیا میں رہ کر خدا کی نعمتوں سے محروم رہ جاتے ہیں اور اس حقیقت سے منہ موڑ لیتے ہیں کہ ؎

قدرت کا خزانہ ہے تصرف کے لئے　　تقدیر کے ٹکڑوں پہ قناعت کیسی؟

خارِ خار دل کہے کس سے سُنے بلبل کی کون؟
باغباں مست و صبا مست و گل و گلزار مست

یہ وہ گل و بلبل والی شاعری نہیں ہے جس کے لئے لکھنؤ خواہ مخواہ بدنام کیا جاتا ہے بشاعر گل و بلبل، شمع و پروانہ وغیرہ وغیرہ کے استعارے میں حیاتِ انسانی کا مرقع کھینچتا ہے استعارہ سے لغوی معنی لینا معترض کی کج فہمی ہے۔ اس شعر میں استعاروں کا پردہ ہٹا کر دیکھیے تو مطلب سعدی دیگر است مطلب یہ ہے کہ اس ہنگامہ زارِ عالم میں غریبوں کی کون سنتا ہے؟ اپنا دردِ دل کوئی سُنائے تو کسے سنائے؟ اہلِ دولت تو اپنی رنگ رلیوں میں مست ہیں۔ انھیں چھوڑیے اوروں کی طرف نظر کیجئے تو وہ ہم سے زیادہ مبتلائے درد ہیں۔ غرض سب اپنے اپنے حال میں ہیں۔

روشنیِ دل سمجھتے ہیں زُلالِ بادہ کو
دُردِ مے کو جانتے ہیں غازۂ رخسار مست

شراب کا مرتبہ دکھایا ہے کہ زُلال تو زلال ہے، کسی وقت زلالِ مے نصیب نہ ہو تو اُس کا دُرد بھی دوائے دردِ خمار بن جاتا ہے۔ تلچھٹ سے بھی تسکین ہو جاتی ہے چہرہ پر کچھ رونق آجاتی ہے گویا دُرد بھی غازہ کا کام دیتا ہے، اور زلال کا کیا پوچھنا؟ اس سے تو دل و دماغ کو وہ روشنی پہونچتی ہے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں

واہ آتش کیا زباں رکھتا ہے کیفیت مے کے سوا　　سامعیں ہوتے ہیں سُن سُن کے ترے اشعار مست

موسمِ برسات

(از حضرت شاد عارفی)

رخِ روشن فضا نے جانبِ صحنِ چمن بدلا
سحر کا نور پھیلا ہر طرف، دورِ کہن بدلا
نسیمِ صبح نے "ہلکا گلابی" پیرہن بدلا
فروغِ فصلِ گل سے سرو بدلا یاسمن بدلا

سوئے منظر اُٹھائیں نرگسِ بیمار نے آنکھیں
سکوں پایا تو کھولیں صاحبِ آزار نے آنکھیں

سحابِ مست وہ دریا نوش پی پی کر شراب آیا
گدائے میکدہ بن کر گیا تھا، کامیاب آیا
لئے سلکِ گہر آیا، لٹا تا آب و تاب آیا
گلستانِ خزاں دیدہ پہ جا کر پھر شباب آیا

بہارِ روح پرور کی رگوں میں آ گئیں لہریں
زمینِ تشنہ پہ دریا بہے جاری ہوئیں نہریں

پرے بگلوں کے ہیں اودی گھٹائیں "نور کی موجیں"
سُبک مینوں کی ڈاریں بادلوں میں "برق کی شمعیں"
لووں کے جگمگاتے ابرِ سیہ میں "ضوفگن کرنیں"
ہوا پر صف بہ صف مرغابیاں، شانہ شدہ زلفیں

ہوا ہے ہر کسی کے دل پہ کیفِ سرمدی طاری
وہ کیفِ سرمدی جس میں فراہم رحمتِ باری

شگوفے پھول بنکر نافۂ نکہت لٹاتے ہیں
چمن پھر تہۂ بزمِ سرور و عیش پاتے ہیں
طیورِ خوش نوا آزادیوں کے گیت گاتے ہیں
لبِ جو مطربانِ خوش گلو تانیں اڑاتے ہیں

سرودِ زندگی افروز" کے بیدار ہیں پردے
ربابِ کیف پرور جاگ اٹھا ہشیار ہیں پردے

ہوا پھر گلبنِ پژمردہ معمورِ گل و غنچہ
چمن کا گوشہ گوشہ پھر ہے مستورِ گل و غنچہ
ہوئی پھر عندلیبِ زار مسحورِ گل و غنچہ
زبانِ خار ہے پھر محوِ مذکورِ گل و غنچہ

گھٹا کے ساتھ میخانے کو سرِ دل تنگ چلتا ہے
زہے موسم! کہ دورِ ساغرِ گلرنگ چلتا ہے

مگر وہ، جس کی قسمت نے کوئی حسرت نہ کی پوری — بہاروں سے طلب کرتا ہے احساسِ صبوری
مگر وہ، جس کی عادت ہوگئی ہو یاس و مجبوری — ہوا ہے اور ہو گا روشناسِ زحمتِ دوری
زبوں ہوتا ہے اُس کا حال سیرِ موسمِ گل سے
فزوں ہوتی ہے الجھن اور، دورِ ساغرِ مل سے

وہ، جس کو اک مصیبت ہی بہاروں کی دلآویزی — وہ جس کو گریۂ پیہم ہے بادل کی گہر ریزی
وہ جس کو تلملاتی ہے گلِ نورس کی نوخیزی — وہ جس کو خونِ حسرت ہی شفق کی رنگ آمیزی
یہاں "وہ" ہے ہی جس جانب اشارا، کون ہے؟ میں ہوں
"وہ" اے شادِ حزیں فرقت کا مارا کون ہے؟ میں ہوں

غزل

(از حضرت جگن ناتھ آزاد خلف جناب محروم)

بزمِ جہاں میں آدمی ذوقِ شعور کے سوا — آنکھ ہے نور کے سوا، بادہ سُرور کے سوا
دل پہ تری تجلیاں، راز یہ کر گئیں عیاں — اور بھی ہیں ترے مقام رفعتِ طور کے سوا
تودۂ خاک ہے چمن تیری شمیم کے بغیر — تیرہ و تار ہے جہاں تیرے ظہور کے سوا
آنکھ کا نور ہے فضول آنکھ کے نور پر نہ بھول — اور بھی ایک نور ہے، آنکھ کے نور کے سوا
تیری نگاہِ لطف کا تشنہ رہا دلِ زبوں — اس کو نہ مل سکا سکوں تیرے حضور کے سوا
قولِ حکیمِ ہند[1] سے مجھ پہ ہوا عیاں کہ علم — ایک بہشت ہے مگر جلوۂ حور کے سوا
اس کے رموز[2] نے کیا مجھ پہ یہ راز فاش تر
اور بھی اک کلیم ہے صاحبِ طور کے سوا

[1] علم میں بھی سُرور ہے لیکن + یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں۔ (اقبال)

[2] "رموزِ بیخودی" از اقبال

بحر الکاہل اور سنگاپور کا بحری مرکز

از مسٹر سری کرشن سنہا بی۔اے

موجودہ جنگ کے شعلوں کی روشنی میں بحر الکاہل کا مسئلہ بھی اپنی پوری تابانی کیساتھ چمک رہا ہے۔ جبتک جاپان، روس، برطانیہ اور امریکہ میں تصادم ہونے کا امکان باقی ہے۔ یہ خوف برابر دامنگیر رہیگا کہ مشرق بعید بھی آتشکدہ جنگ بن جائے۔

واشنگٹن کی کانفرنس کے بعد بحر الکاہل پر جنگ کے جو بادل اُمنڈ آئے تھے وہ دُور ہو گئے اور خیال کیا جانے لگا کہ مشرق بعید میں کسی تصادم کا امکان نہیں۔ لیکن یہ عام خیالی خود غرضی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جب کہ حکومت برطانیہ نے سنگاپور کے بحری مرکز (Naval Base) کے قیام کی تحریک برٹش امپیریل کانفرنس ۱۹۲۱ء میں پیش کی۔ تو اس پر عام طور سے تعجب کا اظہار کیا گیا۔ اور مزدور اور لیبرل پارٹی نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ کیونکہ اُن کی رائے میں اس سے جاپان اور برطانیہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہونے کا پُورا اندیشہ تھا۔ لیکن آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی پُر زور تائید پر اس مسئلہ کو پاس کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں اس بارہ میں کام بھی شروع ہو گیا۔

مقاصد اب سوال یہ ہے کہ آخر سنگاپور کو بحری مرکز بنانے میں کون سے مقاصد پنہاں تھے؟ انگلستان کا کیا مفاد اس میں پوشیدہ تھا؟ امریکہ۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے اختتام کے بعد سے

(۱) مشرق بعید کے بازاروں میں چین، امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے مابین تجارتی مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس میں ہر ایک ملک کی یہی کوشش ہوئی کہ ان بازاروں میں زیادہ سے زیادہ مال اسی کا کھپے۔ چنانچہ مشرق بعید ان ملکوں کی تجارتی ریشہ دوانیوں کا تختہ مشق بن گیا۔

(۲) بحر الکاہل میں امریکہ اور جاپان اپنا تسلط جمانے کے لئے عرصہ سے منہمک تھے۔ امریکہ کے جہازوں کا ایک بڑا حصہ بحر الکاہل میں نقل و حرکت کرنے لگا۔ چنانچہ جاپان اور امریکہ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے برطانیہ نے بھی اپنی حفاظت کا سامان مہیا کرنا شروع کیا۔

(۳) آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو امریکہ اور جاپان سے دائمی خطرہ تھا۔ اس لئے برطانیہ نے ان دونوں ملکوں سے استوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔

(۴) ہندوستان میں بھی قومیت کا جوش ترقی پر تھا۔ اس لئے بھی برطانیہ کی سامراجی قوت کی حفاظت کے لئے بحر ہند میں اس قسم کی چوکی قائم ہونا ضروری سمجھا گیا۔

(۵) عرصے سے برطانیہ کی یہی حکمت عملی رہی ہے کہ وہ اپنے مقبوضات کے قریب ایک بحری مرکز ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء میں لارڈ سالسبری نے ایک تقریر کے دوران میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ "سائی پرس حاصل کرکے ہم نے اپنی پرانی حکمت عملی کی تجدید کی ہے۔ جب اسپین میں انتشار پیدا ہوا تو ہم نے جبرالٹر لے لیا۔ اور جب اٹلی کا مسئلہ یورپ میں بنائے مخاصمت تھا تو ہم نے مالٹا حاصل کیا۔ اور آج جب کہ سب کی نظریں مصر اور ایشیائے کوچک کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ہم نے سائی پرس پر قبضہ کیا ہے اور یہ کوئی نیا کام نہیں ہے بلکہ پرانی حکمت عملی کے ماتحت کارروائی ہے۔"

چنانچہ سنگاپور پر بحری مرکز (Naval Base) کا قائم کرنا بھی اسی حکمت عملی کا شاخسانہ تھا۔

(۶) اصل مقصد جاپان کے راستہ میں ایک روڑا اٹکانا تھا کیونکہ اس کی نظریں چین۔ آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ ہندوستان سبھی کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ جاپان کی تجارت نے بھی برطانیہ کی تجارت کو کافی نقصان پہونچایا ہے چنانچہ ان تمام حالات کے ماتحت برطانیہ نے سنگاپور پر بحری مرکز قائم کیا۔

اس کے علاوہ بعض اخبارات نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اگر کبھی ضرورت ہوئی تو برطانیہ اور امریکہ دونوں سنگاپور کو جاپان کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے امریکہ میں بھی اس خیال کی تائید کی گئی۔

نکولاس روزولٹ نے اپنی کتاب "The Restless Pacific" میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:۔ "سنگاپور کے بحری مرکز کے قیام سے جاپان کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا قیام بحرالکاہل میں توازنِ قوت کی زبردست ضمانت ہے۔"

جاپان پر اثر خیر یہ تمام باتیں تو برطانوی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سنگاپور میں بحری مرکز قائم ہونے سے جاپان پر کیا اثر پڑا؟

جاپان اصل میں ایک عرصہ دراز تک خوش اعتقادی کے بھنور میں پھنسا رہا۔ اسے برطانیہ کی دوستی پر کامل بھروسہ تھا۔ چنانچہ جب یہ تجویز زیر غور تھی تو جاپان نے کوئی عذر داری نہیں کی۔ لیکن اب وہ اس مرکز کو اپنے لئے ایک دائمی خطرہ سمجھتا ہے۔ کیونکہ اگر کبھی برطانیہ کی طرف سے ہوائی حملہ ہو تو جاپان بالکل بے دست و پا ہو جائے گا کیونکہ اتنی ترقی کے باوجود بھی ابھی تک اس کو دوسرے ممالک کے رحم و کرم پر

اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی درآمد کا ۸۰ فیصدی حصہ سنگاپور کے راستے سے آتا ہے۔ اگر واقعی جاپان اور برطانیہ میں لڑائی ٹھن جائے تو جاپان کو رسد کی انتہائی دقت پڑے گی۔ یہی کیفیت برآمد کی بھی ہے۔ جاپان کا مال چین، منچوریا، شمالی اور جنوبی امریکہ میں زیادہ کھپتا ہے۔ جنگ کی صورت میں یہ مال باہر نہ جا سکیگا۔ اور اس لحاظ سے جاپان کا مالی انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ سنگاپور کی بحری چوکی جاپان کے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں بھی سدّ راہ ہے۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ جاپان کے تمام حوصلے سرزمین ایشیا سے وابستہ ہیں۔ وہ ایک قسم کا "ایشیائی محاذ" قائم کرنے کا منصوبہ رکھتا ہے جس میں وہ خود تمام ایشیائی ملکوں کا سردار بننا چاہتا ہے۔ مسٹر ارتیٹا کی تازہ تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان کو ایشیائی معاملات میں "منرو اصول" کے ماتحت یورپین ملکوں کی مداخلت کسی طرح گوارا نہیں۔ یہ اصول "ایشیا ایشیا والوں کے لئے ہے" جاپان کی خارجی حکمت عملی کا سنگ بنیاد ہے اسی اصول کے ماتحت اس نے چین میں مداخلت کی اور توسیع سلطنت کی کوشش میں چین سے نبرد آزما ہوا۔ لیکن اس کا یہ خواب جلد اور آسانی سے پورا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بحرالکاہل میں ایک ایسا مرکز قائم کر دیا گیا ہے جس سے چین کو مدد پہنچتی رہے گی اور اسی وجہ سے جاپان کی جنگی رفتار سست پڑ گئی ہے۔

مسٹر بائی واٹر بھی جو بحری مسائل کے استاد و ماہر خاص مانے جاتے ہیں اپنی کتاب Navies and Nations میں لکھتے ہیں کہ گو سنگاپور کے بحری مرکز نے جاپان کے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کی اور برطانیہ کے مفادات کا بھی تحفظ کیا۔ لیکن اس کی وجہ سے جنگ کی گتھی سلجھنے کے بجائے اور الجھ گئی۔ کیا عجب ہے کہ مسٹر موصوف کا یہ خیال صحیح ثابت ہو اور کسی وقت برطانیہ اور جاپان کی توپوں کی گرج ساری دنیا میں سنائی دینے لگے۔

حکومت خود اختیاری[1]

ہندوستان کی یوں تو بہت سی بڑی بڑی لمبی چوڑی تاریخیں موجود ہیں۔ لیکن ایسی بہت کم ہیں جنمیں ہندوستان کی اقتصادی تعلیمی سیاسی و تمدنی ترقیوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہو۔ مگر سید طفیل احمد صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے نے "حکومت خود اختیاری" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھکر اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب تھوڑے ہی عرصہ میں تین بار شائع ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کا تیسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں عہد انگریزی میں ہندوستان کی تدریجی ترقی بیان کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی حالت اور اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے ہندوستان کی کامل آزادی پر بھی دلچسپ بحث کی ہے۔ غرض کتاب پڑھنے، پڑھانے اور کتب خانوں میں رکھنے کے قابل ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۲۴ صفحات۔

---

[1] قیمت مجلد ۱ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

ساون

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔اے)

آسماں پر جن دنوں جھک جھک کے آتی ہے گھٹا
دوش پر پانی کے مٹکے لے کے پھرتی ہے صبا

بادۂ شبنم سے بھر جاتے ہیں جب پھولوں کے جام
نوجوانانِ چمن میں دَور چلتا ہے مُدام

نغمہ زن دوشیزگی جب جھولتی جھولوں میں ہے
اور بھولی بھالی عصمت کھیلتی پھولوں میں ہے

رُک نہیں سکتی ہے جب اُٹھتی جوانی کی اُمنگ
جب بدلتا ہے حیا سے حُسن کے چہرے کا رنگ

کوئلیں رو رو کر سناتی ہیں جب اپنی داستاں
ہچکیاں لے کر پپیہے پوچھتے ہیں "پی کہاں"

جب ہوا پتّوں کو چھو چھو کر بجاتی ہے ستار
دیکھکر کالی گھٹائیں مور گاتا ہے ملار

جب کناروں سے اُمنڈ آتا ہے دریائے شباب
اور بھڑک اُٹھتا ہے جب قلبِ حزیں کا اضطراب

جب پہاڑی ندیوں نالوں کا بڑھ جاتا ہے شور
اور گھٹاؤں کا فلک پر ہر طرف ہوتا ہے زور

چھاگلیں بھر بھر کر گراتا ہے زمیں پر آسماں
ڈھانپ لیتی ہے زمیں کو چادرِ آبِ رواں

پھرتے ہیں بادل پہن کر کالی کالی وردیاں
رعد کا بجتا ہے ڈنکا کوندتی ہیں بجلیاں

جب پہاڑوں سے اُچھلتے کودتے ہیں آبشار
اور بہتی ہے خوشی کے راگ گاتی جوئبار

آسماں پر بادلوں کا جب کہ ہوتا ہے ہجوم
جب فضا میں رعد و برق و باد کی مچتی ہے دھوم

کان میں آتی ہے جب دن رات رِم جھم کی صدا
آسمانی ساز پر جیسے کوئی ہو گا رہا

آرزو زاہد کو جب بھیگے ہوئے دامن کی ہے
تب سمجھ ناشاد وہ رُت وہ گھڑی ساون کی ہے

نواب مُبارک محل

(ولایتی محل شاہ زمن غازی الدین حیدر)

(از شیخ تصدق حسین لکھنوی بی۔اے۔ ایل ایل بی)

مُبارک محل کے باپ کرنیل عیش ایک انگریز تھے اور ماں ایک ہندوستانی عورت چمپا نامی تھی کرنیل عیش کانپور میں قیام پذیر تھے جہاں اُن کا بنگلہ بہت مشہور رہا۔ کرنیل عیش کے ولایت چلے جانے کے بعد مُبارک محل کانپور میں پیدا ہوئیں اور بڑی ہو کر وہیں ایک تعلیم گاہ میں پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ اُن کا نام شروع میں بقول مس سڈنی ہے (Miss Sydney Hay) مؤلف ہسٹارک لکھنؤ (Historic Lucknow) مریم رکھا گیا تھا۔ موصوفہ ابتداءً نصرانی مذہب کی پیرو اور حُسن و جمال میں چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھیں۔ جولائی ۱۸۱۴ء میں مسند وزارت پر جلوہ گر ہونے کے بعد جب حضرت غازی الدین حیدر بغرض ملاقات نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کانپور تشریف لے گئے تو موصوفہ کے چاند سے مکھڑے پر دم دینے لگے۔ چنانچہ اُن کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے آئے اور مذہب اسلام کی تلقین کی۔ جب وہ آغوشِ اسلام میں آگئیں تو ۱۸۱۵ء کی ابتدا میں اُن سے عقد کر کے اُن کا اسلامی نام عزت النساء بیگم مہد عُلیا مبارک محل رکھا اور بمقابلہ محل خاص بادشاہ بیگم صاحبہ اُن کو محل قرار دیا اور اُن کا اہتمام بھی نواب قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی کے سپرد کر کے رنگ محل خطاب دیا بروقت نکاح مُبارک محل کی اُٹھتی جوانی تھی مگر اُن کے شوہر نامدار نے تینتیسویں ۳۳ سال میں قدم رکھا تھا عقد کے بعد غازی الدین حیدر نے اپنی اس ماہرو بیوی کی تنخواہ دو ہزار روپیہ ماہوار مقرر کی اور اپنی بہت سی اسامیاں بھی اُنھیں کے ماتحت کر دیں۔ غازی الدین حیدر مُبارک محل کو دم ہوش چاہتے تھے اسی لئے موصوفہ اکثر بجرے یا گاڑی میں اُن کے ہمراہ پہلو میں رونق افروز ہوتی تھیں۔

واقعات مرقومہ بالا قیصر التواریخ مرتبہ سید کمال الدین صاحب کی بنیاد پر تحریر کئے گئے ہیں، مگر مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے مبارک محل کے جو ابتدائی حالات بیان کئے ہیں وہ ان واقعات سے کسی قدر مختلف ہیں، لہٰذا وہ بھی درج ذیل کئے جاتے ہیں

مولانا نجم الغنی تاریخ اودھ کی جلد سوم میں تحریر کرتے ہیں:۔

"غازی الدین حیدر کے دل میں بادشاہ بیگم کی مفارقت سے خارِ الم کھٹکتا تھا، معتمد الدولہ (آغا میر) نے اُس کے رفع کرنے کے واسطے یہ تجویز نکالی کہ ایک خوبصورت عورت جو ایک انگریز کے نطفہ سے ایک ہندوستانی عورت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور اُس کو مرزا حاجی کانپور سے اپنے ہمراہ لائے تھے بادشاہ کے ساتھ منعقد کی۔ بادشاہ نے رنگ محل خطاب دیا اور مُبارک محل نام مشہور ہوا"

مُبارک محل نہایت دریا دل اور سیر چشم تھیں، ہزارہا بندگان خدا اُن کی بدولت پرورش پاتے تھے۔ تا زیست مذہبِ اسلام پر پُورے انہماک سے قائم رہیں، مسلم مخدرات کی طرح پردہ میں رہتی تھیں، اور اہل اسلام کے طرز معاشرت، اُن کے رسومات و آدابِ صحبت سے پورے طور پر واقف ہو گئی تھیں۔

نواب معتمد الدولہ آغا میر بادشاہ کے محل خاص بادشاہ بیگم سے بوجوہ خار کھاتے تھے اور مصلحتاً چاہتے تھے کہ غازی الدین حیدر اور بادشاہ بیگم میں اَن بن رہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ مبارک محل کی پشت پناہی کرتے تھے۔

غازی الدین حیدر کے ولیعہد صاحبِ عالم نصیر الدین کی نسبت اولاً نواب نصیر الدولہ محمد علی خاں کی بڑی بیٹی سلطان عالیہ بیگم سے قرار پائی تھی، جو بعد کو صاحبِ تخت و تاج ہو کر محمد علی شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مگر معتمد الدولہ نے بادشاہ کو کچھ سمجھا بجھا کر یہ نسبت ترک کرا کے نواب محسن الدولہ سے ٹھہرائی اور بجائے بادشاہ بیگم کے شادی کا مہتمم مبارک محل کو کیا۔

مابعد معتمد الدولہ نے اپنے بڑے بیٹے آغا علی خاں (امین الدولہ) کی نسبت جو خورد محل سے تھے، نواب شاہ میر خاں کی صاحبزادی نواب بی بی عرف بنی بیگم کے ساتھ قرار دینا چاہی۔ مگر شاہ میر خاں، بانیِ خاندانِ شاہی اودھ نواب سعادت علی خاں برہان الملک کے خاندان سے تھے اور اپنی قدر و منزلت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی لڑکی کی شادی اپنے خاندان کے ملازم کے لڑکے سے رچانا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے یہ کہہ کر کہ مجھ غریب کی بیٹیاں غریب خاندانوں میں جاتی ہیں خوبصورتی سے انکار کر دیا۔ مگر معتمد الدولہ نے اپنی صولت و جبروت کا برتے پر جبر و تعدی سے کام لینا شروع کیا جس پر شاہ میر خاں کلکتہ چلے گئے تاکہ اس ظلم و ستم کی شکایت کمپنی کے حکام والاشان سے کریں۔ مگر وہاں بھی سب معتمد الدولہ کا کلمہ پڑھ رہے تھے اس لئے مجبور ہو کر لندن کا عزم کیا، جب وہاں بھی اُن کی سعی بارآور نہ ہوئی تو مصر میں قیام اختیار کیا اور وہیں سے اُس دنیا کو سدھارے جہاں جاکر کوئی واپس

---

۵ بادشاہ بیگم غازی الدین حیدر کی بیاہتا بیوی تھیں، معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم نے مصلحتاً دونوں میں ناچاقی کرا دی تھی۔

نہیں آتا۔ اُن کی بیٹی بتی بیگم کو جو لکھنؤ میں رہ گئی تھیں شاہ غازی الدین حیدر نے مُبارک محل کے سپرد کر دیا کہ اس کو اپنی بیٹی سمجھ کر اُس کی شادی معتمد الدولہ کے بیٹے کے ساتھ کر دیں۔ چنانچہ مُبارک محل نے حسن باغ میں بہت دھوم دھام سے شادی کر دی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے بادشاہ مبارک محل سے بحد مانوس تھے، چنانچہ اُن کی سواری کے لئے جلوس، ڈنکہ اور ماہی مراتب کا حکم بھی نافذ کر دیا تھا، اور دس ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ مقرر کر دیا تھا جس کی بنیاد یوں پڑی کہ ۱۸۲۵ء میں جب جنگ برہما کے شعلے بلند ہوئے تو مولوی محمد خلیل الدین خاں نے جو سفیر شاہی کلکتہ تھے اور سرکار کمپنی نیز سرکار شاہی کے معتمد علیہ تھے شاہ اودھ غازی الدین حیدر کو رضامند کر کے ایک کروڑ روپیہ بطور قرض دوام کمپنی کو دلوا دیا۔ یہ رقم کثیر بذریعہ ریزیڈنسی کشتیوں پر لدوا کر کلکتہ بھیجی گئی جلیل القدر انگریز ریزیڈنسی میں روپیوں کے اس عظیم الشان پہاڑ کو بطور تماشا دیکھنے آتے تھے۔ اس میں سے مولوی صاحب کو بھی دس لاکھ روپئے بحساب دس فیصدی بطور حق السعی ملے۔

وثیقہ کی بابت یہ طے پایا کہ شاہ اودھ غازی الدین حیدر نے ایک کروڑ روپیہ کی رقم جو ہمیشہ کے لئے کمپنی کے سپرد کی تھی اُس کا منافع بحساب پانچ فیصد سالانہ مبلغ اکتالیس ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ہوتا ہے، اس رقم منافع سے منجملہ دیگر اشخاص مبلغ دس ہزار روپیہ ماہوار نواب مبارک محل کو ۱۰۔ اگست ۱۸۲۵ء سے بہ حمایت سرکار کمپنی ملا کریں اور اپنے بعد اپنے وثیقہ کے ایک ثلث تک جو وہ وصیت کریں۔ وہ جائز متصوّر کی جائے، درصورت عدم وصیت پوری رقم میں سے اور درصورت وصیت باقی ماندہ دو تہائی میں سے نصف رقم نجف اشرف اور نصف رقم کربلائے معلی کے مجتہد صاحب اور مجاورین آستانہ کو ابداً موبداً ارسال کی جائے اور اس کے ثواب کے مستحق شاہ اودھ ہوں۔

غازی الدین حیدر نے ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو بعمر تخمیناً چھپن[۵۶] سال اس دار فانی سے کوچ کیا۔

اُن کے انتقال کے بعد نواب مبارک محل کی سرکار میں سیاہ و سفید کا کل اختیار حکیم بندہ مہدی خاں اُن کے طبیب خاص کو ہوا جن کا مکان کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ میں اب تک موجود ہے۔

حکیم صاحب موصوف کے اثر و رسوخ کے متعلق سیّد کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ ناقل ہیں:

"حکیم بندہ مہدی خاں جو مدت سے ملازم خاص سرکار نواب محل کے تھے بظاہر پیشہ طبابت مگر جناب موصوفہ کے وفور عنایت سے اختیار کُلّی اندر اور باہر کار رکھتے تھے اور اسی منظنّہ مادۂ فاسد سے کئی بار وزارت میں قید بھی ہو چکے تھے۔ اس حکم ناطق سے قیام شبانہ روز ڈیوڑھی کا موقوف کر کے خود وقت صبح وقت نباضی اطبا اختیار کیا تھا۔"[۵۹]

جس امر کو صاحب قیصر التواریخ نے مبہم میں بیان کیا ہے اُس کو مولانا نجم الغنی مؤلف تواریخ اودھ نے جلد چہارم میں کھلے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حکیم بندہ مہدی خاں جو نواب مبارک محل زوجہ غازی الدین حیدر کی سرکار میں ملازم تھے بظاہر پیشہ طبابت کا تھا مگر در پردہ بیگم کے ساتھ آنکھ لگی ہوئی تھی، اس لئے بیگم کی تمام سرکار کے مختار کل تھے، اور اسی وجہ سے کئی بار وزارت میں قید بھی ہو چکے تھے۔ انھوں نے بھی اس حکم ناطق سے ڈیوڑھی کا قیام ترک کر کے صرف صبح کی مناصفی کے وقت آنا اختیار کیا۔"

بعد اجرار وثیقہ نواب مبارک محل نے اپنے وثیقہ کی ایک تہائی رقم یعنی تین ہزار تین سو تینتیس ۳۳۳۳ روپیہ پانچ آنہ چار پائی کی بابت ۱۲۳۵ھ ہجری میں ایک وصیت نامہ بزبان فارسی تحریر کیا جس کی رُو سے چودہ اشخاص کے گذارے بلا شرط خدمت مقرر کئے۔ منجملہ ان اشخاص کے حکیم مرزا بندہ مہدی خاں اور اُن کے پسر حکیم بندہ رضا خاں بھی ہیں جن کے گذارے علی الترتیب یک صد و دو صد روپے مقرر کئے گئے ہیں۔ اُن کے علاوہ چند اشخاص کے گذارے بشرط خدمت بھی مقرر کئے گئے۔ وصیت نامہ میں یہ بھی صاف طور سے واضح کر دیا کہ اپنی حیات بھر میں خود ہر ایک مشاہرہ دار کو مشاہرہ تقسیم کرونگی میرے بعد مرزا بندہ مہدی خاں جن کو میں نے اپنی طرف سے متولی مقرر کیا ہے خزانۂ ریزیڈنسی سے وصول کر کے تقسیم کیا کریں گے۔ مشاہروں میں کمی بیشی کرنے کا اختیار کسی کو نہ ہوگا اور نہ میرے بعد میرے کسی ملازم و وابستہ سے محاسبہ و مواخذہ کیا جائیگا۔ وصیت نامہ کی دفعات پنجم و نہم میں کچھ ضروری ہدایات درج ہیں جن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ کی حکیم صاحب اور اُن کے خاندان پر کس قدر نظر لطف و کرم تھی۔ لہذا ہر دو دفعات بہ تمام و کمال پیش کی جاتی ہیں۔ اس وصیت نامہ میں یہ خاص بات ہے کہ نہ اس میں تاریخ درج ہے نہ مہینہ صرف سنہ درج ہے اور بیگم کی صرف مہر ہے دستخط نہیں ہیں۔

دفعہ پنجم

"برائے مصارف بقیہ ثلث مشاہرہ کہ بعد مشاہرہ مشاہرہ داران مبلغ ایک ہزار چار صد و پنجاہ و سہ روپیہ پنج آنہ چار پائی باقی ماند متولی مذکور (حکیم بندہ مہدی) را اختیار است کہ مشارٌ الیہ بعد انقراض حساب این عاجزہ زر بقیہ مذکورہ را بہ تنخواہ قرآن خوانان و مؤذنان و ذاکران و دیگر عملہ ضروریہ متعلقہ مقبرہ و مقبرہ والدہ ام و

(حاشیہ صفحہ ماسبق) لـہ ایک حکمنامہ بوجوہات منجانب سلیمن صاحب ریزیڈنٹ اودھ ہر وثیقہ دار بیگم کے نام بایں مضمون جاری ہوا تھا کہ ہم نے بیگمات کی نگرانی کے لئے ایک محلدار مقرر کی ہے تاکہ وہ پندرھویں روز اُن کے حرکات سکنات سے مطلع کرتی رہے جس کی تنخواہ صاحبات محل کے ذمہ عاید کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک دارو غہ بھی سرکار شاہی سے مقرر ہوا تاکہ وہ بھی بیگموں کے پوست کندہ حالات سے مطلع کرتا رہے۔

والانعقاد مجالس عزا و حج بیت اللہ الحرام و زیارات عتبات عالیات ائمہ ہُدیٰ علیہ السلام صرف کنند و در ضلع تولیت مذکور باہر کہ از اولاد و لواحق اُو باشد یا برائے ہر کسے کہ متولی مذکور برائے تولیت ایں باب خاص وصیت نماید احدے را اختیار تغیر و تبدل دراں نباشد۔"

دفعہ نہم

"اثاث البیت و دیگر اشیاء منقولہ و غیر منقولہ مملوکہ ایں عاجزہ اہالی سرکار دولت مدار انگریز بہادر بعد وفات نیلام فرمودہ ماحصل آں را در سرکار ابد قرار خود جمع نمودہ منافع آں را حسب ضابطہ سرکار خود ماہ بماہ مسطور عنایت فرمایند کہ او از محاصل مزبورہ اول تعمیر مسجد و امام باڑہ بجائے مدفن عاجزہ بہر دیارے کہ اتفاق اُفتد نمودہ من بعد ابداً مؤبداً زر مذکورہ را بصرف مصارف صاحبان بیت الحرام و زائران مشاہد مشرفہ ائمہ علیہ السلام و پرورش و خبرگیری ایتام و سادات مومنین و دیگر محتاجین اہل اسلام در آرد کہ ثواب ایں خیرات مبرات عائد حال ایں عاجزہ گردد۔"

سید کمال الدین حیدر ناقل ہیں کہ بیگم صاحبہ کو اکثر اوجاع باطنی ہو جاتا تھا جو حکیم صاحب موصوف (حکیم بندہ مہدی) کے دست شفا سے رفع ہو جاتا تھا۔ پھر چند روز سے آلام روحانی میں مبتلا ہوئیں، مختصر یہ کہ ایک روز باغ سے آموں کی ڈالی آئی تھی اس میں سے کئی آم رات کو نوش کئے شب ہی میں طبیعت بے لطف ہو گئی۔ حکیم صاحب نے حسب دستور کچھ دوا بھیجی، وہ استعمال کی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ چنانچہ بروز شنبہ بتاریخ ہشتم شعبان ۱۲۶۵ھ مطابق ۳۰۔ جون ۱۸۴۹ء بعہد حکومت جان عالم واجد علی شاہ موت کی چاشنی چکھی سارے محل میں کہرام مچ گیا، گریہ و زاری ہونے لگی۔ قریب دو پہر کے حضور عالم نواب علی نقی خاں وزیر اعظم کے کانوں تک یہ خبر پہونچی تو اُنھوں نے اُسی وقت بادشاہ کو مطلع کیا۔ پہر رات گئے بعد غسل دریا جنازہ اُٹھا۔ بموجب حکم حضرت واجد علی شاہ امام باڑہ نجف اشرف میں اپنے شوہر نامدار کے پہلو میں مدفون ہوئیں۔

امام باڑہ نجف اشرف میں شاہ غازی الدین حیدر کی تین بیویاں تہ خاک موت کی ابدی نیند سو رہی ہیں۔ امام باڑہ میں داخل ہوتے وقت بادشاہ کا مرقد سامنے ہی ملتا ہے جس کے داہنی جانب مبارک محل کی آخری خوابگاہ ہے جس پر ایک شاندار گنگا جمنی حظیرہ ہے۔ نجف کی تمام قبروں سے اس قبر کا ساز و سامان زیادہ پُر شوکت اور بیش قیمت ہے۔ بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب نواب ممتاز محل بادشاہ کی دوسری نو مسلم بیوی کی قبر ہے جس پر چاندی کا کٹھرا رکھا ہے، اور بائیں جانب کے گوشہ میں بادشاہ کی تیسری محبوب بیوی سرفراز محل کا مدفن ہے جس پر ایک چوبی کٹھرا رکھا ہوا ہے۔

مبارک محل کے انتقال کے دوسرے روز بروز یکشنبہ بوقت صبح حسب دستور مجد الدولہ نے بیگم مرحومہ

کے مکان مسکونہ واقع مچھی بھون متصل باؤلی میں تعلیقہ کر کے پہرے بٹھا دیئے اور جو کچھ مال و اسباب ستیاب ہوا داخل سرکار کر دیا۔ بادشاہ نے مال مردہ سمجھ کر دیانت الدولہ کے سپرد کر دیا پھر کچھ خیال نہ کیا جس کی قسمت میں جو کچھ تھا وہ اُسے ملا۔ مجدالدولہ منھ دیکھتے رہ گئے۔ بہت کچھ سامان خفیہ طور پر کھسک گیا پشمینہ وجواہر اُن کے یہاں کا مشہور تھا اُس کا کچھ پتہ نہ چلا کس کے ہاتھ لگا۔ دوشنبہ کو سیوم کی تقریب ہوئی۔ خلعت ماتم پرسی نواب علی نقی خاں نے حکیم صاحب موصوف اُن کے بیٹے حکیم بندہ رضا خاں اور پنڈت دولت کو دیا۔ اور محل میں صرف بواجی کو دیا جو صفِ ماتم پر بیٹھی تھیں۔

امام باڑہ شاہ نجف میں قبر کا میر علی اوسط رشک کا طبع زاد قطعہ تاریخ لگا ہوا ہے جس سے مبارک محل کی تاریخ و سنہ وفات ظاہر ہوتا ہے:

افسوس مبارک محل ایں مریم عصر — رُو کرد سوئے گلشن رضوان اے ہائے

تاریخ وفات خامۂ رشک نوشت — ہشتم بودہ ز ماہ شعبان اے ہائے

بعد رحلت مبارک محل ایک ثلث وثیقہ کی تقسیم حسب منشا مرحومہ ہوئی، اور باقی دو ثلث کی تقسیم نواب اقبال الدولہ پسر نواب سعادت علی خاں کے اختیار سے ہوئی۔

مرزا کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ کسی شخص نے نفع ذاتی کے لئے محل موصوف کے وصیت نامہ میں کچھ تغیر و تبدل بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"وصیت نامہ مہری بیگم صاحبہ (مبارک محل) کلکتہ سے آیا رزیڈنٹ کے پاس چنانچہ رکٹس صاحب (Ricketts) نے خلاف سررشتہ سمجھ کر چاہا کہ بعد تحقیقات بیگم صاحبہ سے دریافت کر کے جاری کریں کہ آپ نے ہماری معرفت روانہ صدر کیوں نہ کیا۔ مہندر نراین خزانچی صاحب کا بڑا معتمد تھا اُس نے بموافقت اپنے کے پیشتر سے موافق ہو چکا تھا صاحب کو سمجھایا کہ آپ بموجب حکم صدر کے تعمیل کیجئے۔ اس تحقیقات سے سوائے دردسری کے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔

معتمدین بیگم صاحبہ یہ کہتے ہیں کہ وصیت نامہ مصنوعی سے اکثر حقداروں کے حق مارے گئے مگر بیگم صاحبہ لاعلم رہیں"

مولوی علی حسن بلگرامی جو اس تحریر مصنوعی کے موجد ہوئے تھے اُن کی تنخواہ سو روپیہ کی اسی ثلث وصیت نامہ بموافقت عملۂ گورنمنٹ علیحدہ ہو گئی اسی سبب سے لوگ مولوی صاحب کی خوش قسمتی کی قسمیں کھاتے تھے۔ بعد انتقال بیگم صاحبہ حکیم بندہ مہدی خاں حسب منشاء وصیت نامہ نجف اشرف کے متولی ہوئے جب انھوں نے ہیضہ سے انتقال کیا تو اُن کے بیٹے حکیم بندہ رضا خاں بحیثیت متولی اُن کے جانشین ہوئے جنھوں نے سنہ ۱۹۰۰ء میں بلا وصیت چھوڑے انتقال کیا۔ ان کے اُن کے مختلف البطن بھائی مرزا بندہ محمد و مرزا بندہ قاسم تولیت نجف کے لئے کوشش کرتے رہے بلکہ ایک دعوی بھی عدالت میں اسی غرض سے دائر کیا مگر اسمیں بھی بالآخر ناکامی و نامرادی کا منھ دیکھنا پڑا اور نجف کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے متعلق کر دیا گیا جو ابتک بدستور قائم ہے، مگر حکیم صاحب کے خاندان والوں کو برُوئے وصیت نامہ وثیقہ برابر ملے جاتا ہے۔

"وہ!"

(از حضرت تسنیم گجراتی سابق ایڈیٹر تعمیر لاہور)

میری دنیائے تخیّل کی جو دوشیزہ ہے
وہ ستاروں سے حسیں پھول سے پاکیزہ ہے
میں نے چھینی ہے ستاروں سے کہانی اُسکی
شعر میں کرتا ہوں منظوم جوانی اُس کی
میرے اشعار کو اشعار بنایا اُس لئے
آنسوؤں کو دُرِ شہوار بنایا اُس نے

وہ مرے کوثری جذبات کا سرچشمہ ہے
میرے الہامی خیالات کا سرچشمہ ہے
اُس کی نظروں نے مرے دل کو فسانے بخشے
اُس کے ہونٹوں نے مجھے زندہ ترانے بخشے
میرے وجدان کی تفسیر جوانی اُس کی
میرے ایقان کی تنویر جوانی اُس کی
شاعری ہے وہ مری۔ ملکہ ہے جذباتوں کی
نظم اِک گاتی ہوئی ہے مری برساتوں کی
کتنی دلچسپ ہے شایانِ محبت ہے وہ
سچ اگر پوچھئے عنوانِ محبت ہے وہ
کتنی ہیں آرزو انگیز ادائیں اُس کی
دل کو تڑپا گئیں سرشار حیائیں اُس کی
آنکھ کیا تارے ملائیں گے اُس آئینے سے
دبتا ہے وقت کا طوفان بھی بھرے سینے سے

میرا احساسِ جواں زندہ و پائندہ ہے
لمحہ ہر ایک مری زیست کا تابندہ ہے
خالقِ حسن ہے رومان مگر شاعر کا
کم نہیں اُس پہ بھی احسان مگر شاعر کا
میری بیتابیِ دل بھی اُسے معلوم ہے اب
جانتی ہے مری گستاخ نگاہی کا سبب
مری بیباک نگاہوں سے وہ شرماتی ہے
تھرتھراتے ہوئے کپڑوں میں سمٹ جاتی ہے
لائقِ دید مگر ہوتا ہے وہ کچھ عالم
آنکھ گھبرائی ہوئی زلف کی دنیا برہم
سانس کی گرمی سے چہرے پہ نکھار آتا ہے
پھول کھل جاتے ہیں طوفانِ بہار آتا ہے
جب کبھی چلتی ہے فردوس رواں کہتا ہوں
دل کی دنیا کے لئے حشر جواں کہتا ہوں
جب کبھی میری نگاہوں نے اُسے دیکھا ہے
اُس کے سینے میں بھی طوفان اُمنڈ آیا ہے
مضطرب ہو کے بظاہر تو بجے ہیں کنگن
میں نے سُن لی ہے مگر قلب کے اُسکی دھڑکن
اے رخساروں میں سُرخی کا وہ سانسیں لینا
منہ کو آنچل سے چھپا کر وہ کبھی ہنس دینا

سُنیے انگڑائیاں آنکھوں میں جو لیتے ہیں اُف
دُور سے جیسے کسی نغمے کو سنتا ہے دِل
تارِ اُمید کی کشتی کو جو کھیتے ہیں اُف
اور بیتابی میں پھول اشکوں کے چُنتا ہے دِل

چھیڑ اُس کافرِ الفت سے چلی جاتی ہے
سادگی حُسن کی سانچے میں ڈھلی جاتی ہے

حُسن کو اُس کے مرے عشق نے چمکایا ہے
میری مضراب نے اُس ساز کو تھرّایا ہے

آگیا جب سے یقیں اس کو مری چاہت کا
ایک فتنے میں ہیں اندازِ قیامت پیدا

میں نے موسیقیٔ پنہاں کو روانی بخشی
مَیں نے خورشیدِ محبت کو جوانی بخشی

ناشنیدہ تھے جو نغمے وہ سنائے مَیں نے
حُسن کے رُخ سے حجابات اُٹھائے مَیں نے

محوِ حیرت ہوں یہ کیا مَیں نے بنا ڈالا ہے
ایک لڑکی کو خدا مَیں نے بنا ڈالا ہے

نیرنگِ نظر

از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

جو کچھ بھی نظر میں ہے تماشا ہے نظر کا
دنیا جسے کہتے ہیں وہ دھوکا ہے نظر کا

نظّارے سے نظّارے نے محروم کیا ہے
پردا ہے نظر کا یہی پردا ہے نظر کا

میرے لئے اِک موت ہے جنبش یہ نظر کی
تیرے لئے اِک کھیل یہ گویا ہے نظر کا

ہمراہ تبسم ہے اِک اندازِ جفا بھی
یہ پھول نظر کا ہے وہ کانٹا ہے نظر کا

پہلو کی طرف دل کی طرف دیکھ رہا ہوں
مَیں خوب سمجھتا ہوں جو منشا ہے نظر کا

کچھ اس کے سوا اور دکھائی نہیں دیتا
جو سامنے آنکھوں کے ہے پردا ہے نظر کا

آئینہ کو خود باندھنے والی ہے نظر بھی
آئینہ اگر باندھنے والا ہے نظر کا

ہر گام فرومومن ترے جلوے پہ فدا ہے
کعبہ ہے یہ دل کا تو کلیسا ہے نظر کا

چلنے کیلئے اسمیں خم و پیچ ہیں لاکھوں
کہنے کے لئے راستہ سیدھا ہے نظر کا

تسکینِ منوّر کے لئے راہِ سخن میں
جو نقش ہے وہ نقشِ کفِ پا ہے نظر کا

از منشی منور لکھنوی

قیافہ شناسی

(شوپنہار کے ایک مضمون کا ترجمہ از جناب غلام ابرار صدیقی صاحب علی گڑھ یونیورسٹی)

یہ مسلمہ بات ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اُس شخص کے دیکھنے کا عام شوق پیدا ہوتا ہے، جس نے بُرائی یا بھلائی کسی وجہ سے شہرت حاصل کی ہو۔ اُس مصنف کو بھی دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے، جس نے دنیا کے سامنے کوئی غیر معمولی تصنیف پیش کی ہو۔ جن لوگوں کو ایسے غیر معمولی اصحاب کو دیکھنے کا موقع نہیں ملتا وہ کم از کم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ کسی کی زبانی ہی معلوم ہو جائے کہ آخر وہ شخص کیسا ہے؛ اس کی شکل وصورت کیسی ہے؛ دیکھنے میں کیسا معلوم ہوتا ہے؛ وغیرہ وغیرہ۔ اسی لئے لوگ کوشش کر کے ایسی جگہ جاتے ہیں جہاں اُن کو اس آدمی کے دیکھنے کی اُمید ہو۔ جس سے اُن کو کسی وجہ سے دلچسپی ہوگئی ہے اخبارات خصوصاً انگریزی اخبارات ایسے آدمیوں کی قلمی تصویریں یا حلئے شائع کرتے رہتے ہیں مصور اور مجسمہ ساز بھی ان کو ہمارے سامنے پیش کرنے میں تساہل سے کام نہیں لیتے، اور فوٹو گرافر تو ضرور ہی ان کی عکسی تصویریں پیش کر کے ہماری خواہشات کو بخوبی پورا کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے فوٹو گرافی کی قدر وقیمت ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جب لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں تو ان لوگوں کے حلئے بیان ہوتے ہیں جن کو اُنھوں نے دیکھا ہے، اور پھر مختلف لوگوں کی شکل وصورت کے متعلق اپنی رائیں ظاہر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اس کے بشرہ سے اس کے ذہنی ارتقا اور اخلاقی کردار معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان کے ظاہر کو باطن سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تو پھر یہ کوشش فضول ہوگی۔ کیونکہ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ روح وجسم میں کسی قسم کا تعلق نہیں۔ روح ایک دوسری شے ہے اور جسم ایک جداگانہ چیز ہے۔ روح وجسم میں صرف اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک کوٹ کو اُس آدمی سے ہے جو اس کو پہنتا ہے۔

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ انسانی چہرہ ایک قسم کا رسم الخط ہے جیسے خط طغریٰ، جس کو بآسانی پڑھا جاسکتا ہے، اور جس کے مکمل ابجد سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ درحقیقت انسان کا چہرہ اُس کی زبان سے کہیں زیادہ اُس کے جذبات، احساسات اور خیالات کو نہایت واضح اور دلچسپ پیرایہ میں

ظاہر کر کے اس کے باطن کو آئینہ کی طرح سامنے پیش کر دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کا چہرہ ان تمام باتوں کو اجمالی شکل میں پیش کرتا ہے جو وہ آئندہ کرے گا۔ گویا انسان کا چہرہ اس کے افعال اور کردار یا اس کے احساسات اور خیالات کا جو اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں ایک مکمل نقشہ ہے۔

زبان انسان کے خیالات ظاہر کرتی ہے۔ مگر چہرہ انسانی فطرت کو بے نقاب کرتا ہے۔ ہر شخص اس لئے قابل دید اور قابل غور ہوتا ہے کہ وہ فطرت کا ایک نہ ایک پہلو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے گفتگو کرنا چنداں ضروری نہیں، اور اگر اس طرح ہر فرد قابل غور و قابل توجہ ہے تو پھر حسن اور بھی زیادہ قابل توجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ فطرت کی اعلیٰ ترین تخئیل کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر شخص کُل کا ایک جزو ہے اور جس میں جو کشش اور جاذبیت ہوتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ ہر فرد واحد فطرت کی تخئیل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ذاتی طور پر لوگ ہمیشہ یہی خیال کرتے ہیں کہ انسان کا باطن بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس کا ظاہر۔ اُصولاً یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا اطلاق دشوار ہے کیونکہ اُصولوں کے اطلاق کا ہنر کچھ خلقی ہوتا ہے اور کچھ تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن کسی کو اس پر مہارت تامہ حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ تجربہ کار شخص بھی اس بارے میں دھوکا کھا سکتا اور غلطی کر سکتا ہے۔ پھر بھی ان تمام باتوں کے باوجود میگیرو کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ چہرہ خود کبھی دھوکا نہیں دیتا بلکہ ہم خود چہرہ میں وہ بات پڑھکر جو وہاں نہیں ہوتی دھوکا کھاتے ہیں۔

چہرہ کے خط و خیال کا صحیح مطالعہ بڑا مشکل ہوتا ہے اور اسکے اُصول باقاعدہ حیثیت سے نہیں سیکھے جا سکتے۔ اس راہ میں کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا بالکل غیر جانبدارانہ نظر سے اُس شخص کے چہرہ کو دیکھے جس کے حالات وہ معلوم کرنا چاہتا ہے دل بھی ہر خیال سے پاک و صاف ہونا چاہیئے، لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں ہے کیونکہ اگر شمّہ برابر بھی کوئی غیر متعلق بات ذہن میں آجائے خواہ وہ طرفداری کا جذبہ ہو یا نفرت خوف یا اُمید کا، کسی قسم کا بھی کوئی خیال دل میں آجائے جو ہمارے مرکز نگاہ میں موجود نہیں ہے تو پھر جس بات یا کردار کو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل غلط اور گڑبڑ ہو جائیگا۔ کسی زبان کے سجع کی لطافت سے صرف وہی شخص لُطف اندوز ہوتا ہے جو اس کو نہیں سمجھتا کیونکہ سمجھنے والا تو الفاظ کے مطلب و معنی کی طرف اس قدر مشغول و متوجہ ہو جاتا ہے کہ اس کو اس کی لطافت و نزاکت کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح قیافہ شناسی میں بھی وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو حالات سے قطعی ناواقف ہو۔

کسی کا چہرہ پڑھنے کے لئے سب سے پہلی نظر بڑی کارآمد ہوتی ہے، کیونکہ پہلی نظر میں دیکھنے والے کے خیالات بالکل صاف اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں چہرہ کا مطالعہ کسی حد تک درست و صحیح ہوسکتا ہے۔ کسی بُو یا مہک کا اثر ہم اُسی وقت محسوس کرتے ہیں جب وہ پہلی مرتبہ ہماری ناک تک پہونچتی ہے، شراب کے پہلے ہی جام سے اس کے اصلی ذائقہ کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح صرف پہلی ہی نظر میں چہرہ بھی ہم پر صاف طور پر اپنے خیالات واحساسات ظاہر کردیتا ہے، اس لئے ہم کو سب سے پہلے خیالات واحساسات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے، اور اگر اس شخص میں کوئی ذاتی خصوصیت ہے تو ان اثرات کو قلمبند کرلینا چاہیئے، بشرطیکہ دیکھنے والے کو اپنی قیافہ شناسی پر اعتماد ہو۔ کیونکہ بعد میں ملاقات اور تعلقات سے اس میں رکاوٹیں حائل ہوجائیں گی اور صحیح نتیجہ پر پہونچنا نسبتاً دشوار ہوجائیگا۔ اِس سے ایک نہ ایک دن یہ بھی ثابت ہوجائیگا کہ آیا وہ خیالات درست تھے یا غلط۔

یہ بات بھی ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ پہلا اثر تقریباً دائمی ہوتا ہے، مگر اُن چہروں سے قطع نظر جو حسین، خلیق اور ذہین ہوتے ہیں زیادہ تر چہرے بالکل مایوس کن ثابت ہوتے ہیں، ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں جو اس کا اثر نہ لیں، یعنی وہ لوگ جو اعلیٰ صفات اور احساسات رکھتے ہیں کسی نئے چہرہ کو دیکھکر اس سے اس کا زبردست اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دیکھنے والے پر چہرہ اپنا حیرت انگیز اور دائمی اثر ڈالتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے چہروں سے وحشت یا دہقانیت یا ذلیل خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور عقل وادراک کا ایسا فقدان نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو دیکھتے ہی حقارت وکراہیت محسوس ہونے لگتی ہے، لیکن کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بُری نظر سے دیکھے خواہ وہ واقعی اس کے مستحق ہوں۔

اس مسئلہ کی وضاحت فلسفہ مابعد الطبیعات سے اس طرح ہوتی ہے کہ ہر انسان کی اصلی خصوصیت وہی ہے جس کے ذریعہ وہ لاکھوں میں پہچانا جاسکتا ہے۔ اگر کسی روحانی وضاحت سے قدرے اطمینان بھی ہوجائے پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ ہر نئے شخص کے لئے کس قسم کے علم قیافہ سے کام لینا مناسب ہوگا۔ جن صورتوں میں چند اور باتوں کے علاوہ تنگ نظری، خودغرضی، رشک وحسد، اوچھے خیالات اور گندی خواہشات کے نشانات چہرہ پر خاص طور پر نمایاں ہوجاتے ہیں، امتداد زمانہ سے یہ نشانات جُھرّیوں اور شکنوں کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کے دلوں میں جن کو ایسے شخصوں کی شکل پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے خوف معلوم ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے عادی اور ان سے مانوس ہوجاتے ہیں

یعنی دیکھتے دیکھتے اتنے بے حس ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

لیکن چہرہ کی ساخت لاتعداد واقعات، حادثات اور خیالات کا نتیجہ ہوتی ہے، اسی لئے نیک یا ذہین شخصوں کے چہروں کی ساخت بھی آہستہ آہستہ اور بتدریج مکمل ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ چہروں کی تکمیل بڑھاپے ہی میں ہوتی ہے اور جوانی میں خصوصیات کے صرف نشانات ہی پائے جاتے ہیں پھر بھی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے پہلی نظر میں جو اثر ہوتا ہے وہی دائمی ثابت ہوتا ہے کیونکہ سچا اور ریلا لگا اثر ہم اُسی وقت قبول کرتے ہیں جبکہ اس شخص سے ہمارا کوئی تعلق و واسطہ نہ ہو، اور ہم نے اس سے بات چیت بھی نہ کی ہو۔ کیونکہ ہر جملہ سے جو ہم اُس سے بولتے یا سُنتے ہیں ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کی بدولت ایک طرح کی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرفداری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اصلی و صحیح جذبات معلوم کرنے کے حق میں سم قاتل ہوتا ہے

مشہور کہاوت ہے کہ "بہت سے لوگ شناسائی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں"۔ اس کہاوت کے معنی یہ ہیں کہ اس طرح ہم لوگ نادانستہ اپنے کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ خواہ لوگوں سے ہماری شناسائی دوستی کے درجہ تک نہ پہونچی ہو تاہم تعلقات شروع ہوتے ہی ہم بہت سی باتوں سے متاثر ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ جیسے ہی کوئی شخص گفتگو کرنے لگتا ہے تو وہ صرف اپنے اصلی اور حقیقی خیالات ہی کا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ اپنی تعلیم و قابلیت بھی ظاہر کرتا ہے۔ یعنی اس کی بات چیت میں صرف اس کی فطرت ہی کا اظہار نہیں ہوتا ہے جو واقعی اس کو خدا کی طرف سے ملی ہے بلکہ ساتھ ہی وہ چیزیں بھی ظاہر ہوتی ہیں جن کی بدولت اس نے اپنے کو دنیا میں رہنے کے قابل بنا لیا ہے۔ درحقیقت اس وقت تین چوتھائی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس کی ذاتی نہیں بلکہ حاصل کردہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ بعض وقت سخت حیرانی ہوتی ہے جب ہم ایک سنگدل آدمی کو شفقت و محبّت سے بولتے ہوئے سُنتے ہیں اور اگر ہم اس سے اور زیادہ مانوس ہو جائیں تو پھر وہ حیوانی خطرت جس کو چہرہ سے ظاہر ہونا چاہیئے تھا از خود اپنے تمام کمالات وخصوصیات کے ساتھ زائل ہو جائیگی۔

اگر کسی میں علم قیافہ سے خاص دلچسپی کے ساتھ ساتھ اس کا مادّہ بھی موجود ہے تو اس کو چاہیئے کہ بعد کی ملاقات سے پہلے جو خیالات واثر اُس کے دل میں کسی دوسرے شخص کے متعلق قائم ہوئے ہوں اُنھیں کو درست و ٹھیک سمجھے۔ کیونکہ چہرہ ہی انسان کی اصلی خصوصیات واحساسات کا آئینہ ہے اور وہ صاف بتا دیتا ہے کہ وہ شخص کتنے پانی میں ہے، اب اگر ہم اس سے دھوکا کھاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں ہمارا ہی قصور ہے قیافہ شناسی کا نہیں۔ کیونکہ جب انسان گفتگو کرتا ہے تو وہ صرف وہی باتیں

نہیں کہتا ہے جن کو وہ درست اور مناسب خیال کرتا ہے بلکہ جن کو وہ کسب علم سے حاصل کرتا ہے، اکثر اوقات تو وہ زیادہ تر ایسی باتیں کرتا ہے جن کو اُس کے باطن سے چنداں تعلق نہیں ہوتا ہے۔

ایک بات اور بھی ہے کہ جب ہم کسی سے گفتگو کرتے ہیں یا کسی کو باتیں کرتے ہوئے سنتے ہیں تو ہم اُس کے اصلی قیافہ پر ٹھیک طور سے توجہ نہیں دیتے۔ حالانکہ یہی سب سے اہم اور ضروری بات ہوتی ہے کیونکہ یہی اصلی چیز ہے۔ مگر اسی کو ہم نظر انداز کر جاتے ہیں۔ درحقیقت اس وقت جس چیز سے ہم کو دلچسپی ہوتی ہے وہ قیافہ نہیں بلکہ چہرے کے تاثرات ہیں۔ یعنی گفتگو کے دوران بات کرنیوالے کے چہرہ میں جو آثار چڑھاؤ اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، اُنھیں کی دیکھ بھال میں ہم مشغول رہتے ہیں۔ بہرحال ان باتوں کی وجہ سے بھلائی و برائی میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

جب سقراط نے ایک نوجوان سے جس کا اس سے تعارف کرایا گیا تھا، اُس کی قابلیت کا اندازہ کرنے کے خیال سے یہ کہا کہ "ذرا تم کچھ باتیں کرو تاکہ میں تم کو اچھی طرح دیکھ سکوں"۔ اس موقعہ پر سقراط نے "دیکھنے" کا لفظ بالکل ٹھیک استعمال کیا۔ کیونکہ صرف بات چیت ہی کے دوران میں چہرہ کے اُتار چڑھاؤ اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور زندگی پیدا ہوتی ہے اور بات چیت کرنیوالے کی ذہنی و دماغی قابلیت اور لیاقت چہرہ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس سے ہم ضرور اس کی ذہنی قابلیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اس سوال سے سقراط کا بھی یہی مقصد تھا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اس اصول کے ذریعہ اخلاقی پہلو کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بڑی گہرائیوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جو بات ہم غیر جانبدارانہ حیثیت سے گفتگو کے دوران چہرے کی ساخت کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں وہ بعد میں جب زیادہ گفتگو ہوتی ہے اور ہم اس درجہ مانوس ہو جاتے ہیں کہ پھر وہ بات جاتی رہتی ہے۔ اور ایک قسم کا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کے باعث ہم کوئی غیر جانبدارانہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے، اس لئے ہم دوسروں سے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ "بھئی بولو مت تاکہ ہم تم کو اچھی طرح (دیکھ) سمجھ سکیں"

کسی انسان کے متعلق اس کے قیافے سے رائے قائم کرنے کے لئے ہم کو چاہیئے کہ ہم اس پر اس وقت غور و توجہ کریں جب وہ بالکل یکہ و تنہا ہو، کیونکہ جماعت اور گفتگو اس میں وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے جو اس کی ذاتی و فطری نہیں ہوتیں، اور ان سے اس کے صحیح احساسات کا اندازہ لگانا ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ اس سے صاف بچکر نکل جاتا ہے۔ لیکن جب انسان بالکل اکیلا ہوتا ہے اور کسی سے ملتا جلتا نہیں بلکہ اپنے ہی خیالات و احساسات میں غرق رہتا ہے تو وہ اپنی اصلی حالت میں ہوتا ہے، اُس وقت

ایک ذہین قیافہ شناس ایک ہی نظر میں اُس کے ظاہر و باطن کا جائزہ لے سکتا ہے، کیونکہ اس کے چہرے کا بغور مطالعہ کرنے پر اُس کے صحیح جذبات و احساسات کا آسانی سے پتہ لگ سکتا ہے

غرض انسان کے افعال و کردار معلوم کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ قیافہ ہے۔ کیونکہ انسان کا چہرہ ہی اس کا وہ حصہ ہے جس میں ذرا بھی تصنع کا اثر نہیں ہوتا کیونکہ مصنوعی تاثرات صاف نقالی معلوم ہوتے ہیں اور کسی ماہر فن کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس وجہ سے میں انسانی حالات معلوم کرنے کے لئے انسان کے چہرہ کا اس وقت مطالعہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جب وہ اکیلا اور صرف اپنے ہی خیالات میں منہمک ہو۔ اس سے قبل اس سے گفتگو بھی نہ کی جائے۔ کیونکہ گفتگو شروع ہوتے ہی جو تاثرات بات چیت سے پیدا ہونگے وہ ہمارے کام میں مخل ہونگے۔ کیونکہ بات چیت میں چرب زبانی اور تصنع سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اور ذاتی تعلقات پیدا ہوتے ہی طرفداری پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہمیں صحیح نتیجہ نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور قابل غور ہے کہ اخلاقی پہلو کی بہ نسبت ذہنی و دماغی قابلیت کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے کیونکہ اس قسم کی قابلیت بہت نمایاں رہتی ہے، اور صرف چہرہ کے اُتار چڑھاؤ اور قیافہ سے ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ چال ڈھال اور رفتار و گفتار سے بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ذرا سی حرکت سے اس کا پتہ چل جاتا ہے، چنانچہ پشت کی جانب سے بھی ایک ذہین اور قابل آدمی اور ایک جاہل کندۂ ناتراش اور احمق میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ احمق کی ہر بات میں سستی و کاہلی کو نمایاں دخل ہوگا، اُس کے ہر پہلو سے حماقت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہین آدمی کی ہر بات سے ذہانت و ذکاوت ٹپکتی ہے۔ لابریری (La Bruyeri) نے کہا ہے کہ ہماری کوئی حرکت اور بات ایسی معمولی، سادہ یا غیر مرئی نہیں ہوتی کہ اس میں ہماری سرشت و کردار کا دخل نہ ہو اور یہی باتیں ہم کو دوسروں سے ممتاز کرتی رہتی ہیں۔ ایک احمق کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست اور اُس کی ہنسی خوشی اور رنج و غم کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جو ایک عقلمند اور ہوشیار انسان کی مانند ہو۔ ہاں اس بات کو ضرور مان لینا چاہیئے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ انسان میں بھی یہ بات بقول ہل ویٹس (Helvetius) ضرور ہوتی ہے کہ وہ قابل آدمی کو پہچان کر اس کے راہ سے الگ ہو جاتا ہے۔

اس کا خاص سبب یہ ہے کہ انسان کا دماغ جتنا زیادہ بڑا ہوتا ہے اُسی کی مناسبت سے اُس کی پٹھے اور رگ و پٹھے زیادہ پتلے اور نازک ہونگے اتنی ہی اُس کی ذہانت و ذکاوت زیادہ تیز ہوگی اور اس کے اعضا میں بھی اتنی ہی چستی و پھرتی ہوگی۔ کیونکہ دماغ اُن چیزوں کو بہت جلد اور مستقل طور پر اپنے زیر اثر

رکھتا ہے، اُس کی ہر حرکت میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح جو حیوان ترقی کے جتنے زیادہ مدارج طے کر چکا ہوگا اُس کا مارنا اتنا ہی آسان ہوگا کیونکہ اس کو ایک ہی زخم سے نڈھال کیا جا سکتا ہے مگر وحشی جانوروں کو مارنا اتنا ہی دشوار ہوتا ہے۔ مثال کے لئے جراثیم کو دیکھئے کہ وہ نقل و حرکت میں کتنے سست و کاہل ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کتنے تکلیف دہ و تباہ کن ہیں، ان میں حس بالکل نہیں ہوتی لیکن زندگی کے معاملے میں کیسے سخت گیر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ کے مقابلے میں اُن کی ریڑھ اور اعصاب بہت بڑے اور موٹے ہوتے ہیں۔ اعضا کی عام حرکات و سکنات دماغ کے زیر اثر ہوتے ہیں، دماغ ہی سے ہمارے اعضا کو ریڑھ کے ذریعہ جنبش کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ کام جن کا احساس سے زیادہ تعلق ہے ہم کو جلد تھکا ڈالتے ہیں، اور تھکاٹ اور ماندگی کا احساس درد کی شکل میں دماغ ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن عوام کا یہ خیال غلط ہے کہ اس کا احساس اعضا کو ہوتا ہے، اسی لئے حرکت سے نیند آتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ حرکات جو از خود دماغ کے اثر کے بغیر ہوتی رہتی ہیں مثلاً دل اور پھیپھڑوں کی حرکت وہ تھکن پیدا کئے بغیر اپنا کام برابر جاری رکھتی ہیں چونکہ انسانی خیالات بھی حرکات و سکنات کی طرح دماغ ہی کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں اس لئے دونوں صورتوں سے دماغی رجحانات کا پتہ چلتا ہے جس کا احساس ہر شخص کی ساخت پر ہے۔ ایک احمق شخص کی حرکات و سکنات سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوتی لیکن ایک ذہین انسان کی حرکات و سکنات بلکہ اس کی ہر جنبش میں صدہا معنی و مطلب پنہاں ہوتے ہیں۔ چہرہ کے اُتار چڑھاؤ اور حرکات و سکنات سے ذہنی ارتقا کا اتنا صاف پتہ نہیں چلتا جتنا کہ خود چہرہ کی ساخت سے۔ سب سے زیادہ دماغ کی جسامت، حرکات و سکنات اور سب سے بڑھکر آنکھیں۔ پھوٹی، بے رونق اور مُردنی چھائی ہوئی سور کی آنکھوں سے لیکر بڑے سے بڑے عالم کی پُر رونق اور چمکتی ہوئی آنکھوں تک سب اندرونی کیفیات اور جذبات و احساسات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ایک معمولی شخص کا فطری مذاق، اُس کی عقل و فہم (خواہ وہ بہترین ہی قسم کی کیوں نہ ہو) لیکن وہ ہر حالت میں ایک عالم سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس لئے ہم اس روایت کو بآسانی تسلیم کر سکتے ہیں جو اسکوارزافیشی (Squarzafichi) نے اپنے معصر جوسف بریوس (Joseph Brivius) نامی شاعر کے کلام کی بنیاد پر بیان کی ہے۔ روایت یہ ہے کہ کسی وقت وسکونٹی (Visconte) اپنے دربار میں بیٹھا تھا اور پیٹرارک کے علاوہ بہت سے علما و فضلا بھی حاضر تھے۔ اتنے میں وسکونٹی نے اپنے بیٹے سے (جو ابھی بچہ ہی تھا اور بعد میں میلان کا سب سے پہلا رئیس ہوا) کہا کہ حاضرین دربار میں سے سب سے بڑے قابل عالم کو چن کر میرے سامنے حاضر کرو۔ لڑکے نے اول تو سب پر نظر ڈالی پھر آہستہ

اُٹھکر پیٹر ارک کا ہاتھ پکڑ کر بادشاہ کے سامنے حاضر کر دیا۔ جس پر حاضرین دربار کو اس بچّہ کی ذہانت و عقل پر سخت حیرت ہوئی۔ چنانچہ سبھوں نے اس کی بہت تعریف کی۔ بات یہ ہے کہ فطرت ایسے خوش قسمت انسان کی پیشانی پر اپنی مہر ثبت کر دیتی ہے جس کو ایک کمسن بچّہ بھی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے میں اپنے عقلمند احباب کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر آئندہ وہ معمولی آدمیوں ہی میں سے کسی کو عالم و فاضل کا درجہ دینا چاہتے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور لحاظ رکھیں کہ اس مقصد کے لئے ایسے شراب فروش کو انتخاب نہ کریں جس کی پیشانی پر فطرت نے نمایاں طور پر لکھدیا ہو کہ یہ "ایک ادنیٰ انسان" ہے۔

لیکن جن باتوں اور جن اُصولوں سے کسی شخص کی ذہنی لیاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اُن سے اُس کی اخلاقی خوبیوں پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، اور واقعی اس کا قیافہ سے اندازہ لگانا دشوار ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر فلسفہ ما بعد الطبیعیات سے ہوتا ہے۔ اور اس لئے بڑی گہرائی میں ہوتا ہے گو یہ صحیح ہے کہ اخلاقی کردار کا جسم کی ساخت سے بڑا تعلق ہوتا ہے اور صرف ساخت ہی سے نہیں بلکہ اس کی حِس سے بھی اس کا کافی تعلق ہوتا ہے لیکن اتنا صاف اور قریبی تعلق نہیں ہوتا جتنا کہ ذہنی و دماغی خصوصیات کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص ہر موقعہ پر اپنی ذہانت اور ذکاوت کی قابلیت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کو حتی الوسع ظاہر بھی کر دیتا ہے۔ لیکن ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اخلاقی کردار کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اچھے لوگ اس کو اپنی اخلاقی خوبیوں کیسا تھ وقت اظہار کرنے کے بجائے حتی الوسع چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، اور رفتہ رفتہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن بُرے اور ناپاک خیالات رفتہ رفتہ اپنے نشانات عموماً چہرہ پر اور خصوصاً آنکھوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی آدمی کو دیکھکر یہ تو بآسانی بتایا جا سکتا ہے کہ یہ شخص دنیا کے سامنے کبھی کوئی غیر معمولی تصنیف پیش نہیں کر سکتا، لیکن یقین کے ساتھ یہ بات ہرگز نہیں کہی جا سکتی کہ آئندہ اس سے کسی مکروہ گناہ یا جرم کا بھی ارتکاب نہ ہوگا۔

حدیثِ دیگراں

کل بارگہِ ناز میں مَیں نے یہ کیا عرض
بلبل طلب گل میں ہے اک عمر سے مضطر
کیسا یہ ستم ہے کہ کسی عہد میں اب تک
بلبل کی صداؤں سے پسیجا نہ گُلِ تر
یہ سُنتے ہی پیدا ہوئی رخسار پہ سُرخی
کچھ شرم کے آثار تو کچھ غیظ کے تیور
سُرخی سے جھلکنے لگی اک دھوپ سی ناگاہ
وہ دھوپ جو چمکتی ہے جو تِتلی کے پروں پر

(جوش ملیح آبادی)

ساون کی ہُوک

ایک گیت

(منشی جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی بی۔ اے۔ ایل ایل بی)

ساون آیا (۱) بادل چھایا
امرت برسے چاتک برسے
وہ نہیں آئے پھر کیا بھائے؟
کوئل اُڑ جا
کوک نہ اِس جا

گِن گِن تارے (۲) سب بَن ہارے
چین نہ آئے جی گھبرائے
تن سے لگی ہے من سے لگی ہے
کوئل اُڑ جا
کُوک نہ اس جا

کہہ نہ پیا سے (۳) نیتا پیاسے
"وہ جو آتے چھوڑ نہ جاتے"
اُڑ نہ ہوا سے تیری بلا سے
کوئل اُڑ جا
کُوک نہ اس جا

جی کا جلانا (۴) کھیل ہے مانا
دیکھ ستا کر آگ لگا کر
تو بھی جلے گی ہاتھ ملے گی
کوئل اُڑ جا
کُوک نہ اِس جا

جا جا، جا جا (۵) آ گئے راجا
شرط لگا لے منھ تو بنا لے
چپ نہ رہے گی اپنی کہے گی
بیرن اُڑ جا
کوک نہ اِس جا

دیکھ تو کیا ہے (۶) کون بسا ہے
دیدۂ تر میں نیچی نظر میں
دل میں جگر میں پریم نگر میں
اُڑ جا، اُڑ جا
کُوک نہ اِس جا

کیسے بتاؤں (۷) آ تو دکھاؤں
دیکھ ادھر آ آ گئے راجا
آنکھ کے تل میں شیشۂ دل میں
دیکھا؟ اچھا!
اب تو اُڑ جا

برسات کا گیت

(از پنڈت بدری پرشاد صاحب شاطر الہ آبادی)

ساون کی جھڑی ہے موتی کی لڑی ہے
پُر لطف بڑی ہے ہر وقت کھڑی ہے
برسات ہے برسات

مینا کے ہیں جلوے ساغر ہیں اچھوتے
تھوڑی سی تو پی لے اللہ کے بندے
برسات ہے برسات

ہیں رقص میں بادل بھر جائیں گے جل تھل
جگنو لئے مشعل ہر سمت ہیں بیکل
برسات ہے برسات

گنگا تھی ادھوری جمنا بھی تھی سوکھی
تقدیر جو پلٹی کلفت مٹی سب کی
برسات ہے برسات

مہتاب کا ہمسر خورشید بھی چھپ کر
مفقود فلک پر دن رات برابر
برسات ہے برسات

ہیجان بپا ہے ہنگامہ اُٹھا ہے
وہ سرد ہوا ہے دل کانپ رہا ہے
برسات ہے برسات

اُٹھتی ہیں گھٹائیں لیتی ہیں بلائیں
چلتی ہیں ہوائیں بدلی ہیں فضائیں
برسات ہے برسات

موجوں کا تلاطم طوفاں کا تصادم
اس لطف میں ہوں گم اک ناؤ پہ ہم تم
برسات ہے برسات

ہر رنگ نیا ہے ہر ڈھنگ جدا ہے
کچھ اور مزا ہے مے خانہ کھلا ہے
برسات ہے برسات

ارماں کو بچا لو حسرت کو ڈبو دو
ہونا ہو جو وہ ہو ہاں ساتھ نہ چھوڑو
برسات ہے برسات

شاطر کی حکایت بن جائے حقیقت
مضطر رہے فطرت موزوں ہو طبیعت
برسات ہے برسات

ترانۂ بہار

(از بندھو لال صاحب ٹیگور)

پھر چل رہا ہے ساغر و پیمانہ آج کل ۔۔۔ پھر ہے خودی بھی بیخود و دیوانہ آج کل
پھر ہر نگاہ جلوۂ سینا ہے اِن دنوں ۔۔۔ پھر ہے جنوں میں جوش کلیمانہ آج کل
پھر ہر نفس میں جذبۂ وحشت ہے کامراں ۔۔۔ پھر حُسنِ شوخ خود بھی ہے دیوانہ آج کل
پھر ان سے بندھ رہی ہیں اُمیدیں وفا کی اب ۔۔۔ پھر وہ ہیں نرم، مائلِ پروانہ آج کل
پھر عرش پر تزلزلِ رندانہ ہے بپا ۔۔۔ ہے فرش پر وہ نعرۂ مستانہ آج کل
پھر مٹ گیا ہے بندہ و خواجہ کا امتیاز ۔۔۔ پھر فقر ہی ہے مسلکِ رندانہ آج کل
پھر کیف فقر میں نہیں کون و مکاں کی فکر ۔۔۔ پھر فقر میں ہے لذتِ شاہانہ آج کل
پھر فقر کا وہ جذبۂ خفتہ اُبھر گیا ۔۔۔ پھر فقر میں کنیز ہے سلطانہ آج کل
پھر کیوں کسی کی تیز خودی آج بھی نہ ہو ۔۔۔ پھر مٹ چکی ہے خوئے غلامانہ آج کل
پھر جا چکا جدال و جنگ اُٹھ چکی ہے اب ۔۔۔ پھر ہے شریک حضرتِ میخانہ آج کل
پھر سب صدائے مسجد و بتخانہ بند ہے ۔۔۔ پھر سجدہ گاہ شیخ ہے نمخانہ آج کل

پھر وہ فسانہ خواں ہے یہ ٹیگور اِن دنوں
ہے ہر نفس میں جذبۂ رندانہ آج کل

صنعت گرِ ازل کا ہے اِک نقش دل نشیں ۔۔۔ وہ صنعتِ لطیف تمنا کہیں جسے
اہلِ نماز کو نہ ہوئی آج تک نصیب ۔۔۔ وہ حیرتِ جمال کہ سجدہ کہیں جسے

آغازِ برشگال

(از سید کرم علی صاحب نسیم گوالیاری)

ذرّاتِ دل کو جمع کئے جا رہا ہوں میں
آغازِ برشگال پہ اِترا رہا ہوں میں

سرشار و مستِ بادۂ گل جا رہا ہوں میں
سیلابِ رنگ و بو میں بہا جا رہا ہوں میں

دامانِ دل میں پھول بھرے جا رہا ہوں میں
جیبِ نظر میں لعل و گہر پا رہا ہوں میں

اِک ایک گل میں جذبِ نظر پا رہا ہوں میں
غنچوں کو دیکھ دیکھ کے شرما رہا ہوں میں

مانوسِ حُسنِ یار ہوا جا رہا ہوں میں
صحنِ چمن کا لُطف سوا پا رہا ہوں میں

ساقی ہے سبزہ زار ہے ابرِ بہار ہے
فکرِ مآلِ عیش گلستاں میں خار ہے

مقاماتِ طلب

ابر کے سائے میں مخمور ہواؤں کا خرام
شب کی تاریکی میں بربط کی نواؤں کا خروش
دور سبزے پہ کسی شاعرِ محزوں کا سرود
چھیڑ دیتے ہیں مری روح کا ساز
میری تنہائی افسردہ کے افکارِ جمیل
لے کے آجاتے ہیں اِک خوابِ حسین
نیند اِک تیرے تصور کے طفیل
عشق کے درد سے بے بڑھ کے لطیف
آنکھ گو عاشقِ بیمار کی لگتی ہی نہیں
ہوش بیگانہ بنا دیتے ہیں یہ تیرے خیال
صبح ہوتی ہے تو
گل تیرے تبسم کی طرح
مجھکو پھر بیخود و مجبور بنا دیتے ہیں
اور اِس کیف کے عالم میں مجھے
اِک صبوحی کی طلب اور ترے ہاتھ سے وہ

نیشتر جیلانی

چراغِ ساحل

از مسٹر نند گوپال غیرت انبالوی

"بملا! کیا آج صبح نہ ہو گی؟"

سمندر کے کنارے ایک اب خوردہ جھونپڑے سے، جس کا پھونس دھوئیں اور گرد و غبار کا رنگ چڑھتے چڑھتے سیاہ ہو گیا تھا۔ ایک بھرائی ہوئی آواز نکلی۔ جس کے ختم ہوتے ہی جھونپڑے کے ایک گوشہ میں کچھ بوسیدہ چیتھڑوں کو حرکت ہوئی۔ اور بملا گدڑی کے لعل طرح خواب آلودہ و مخمور آنکھیں ملتی ہوئی دونوں ہاتھوں کے سہارے اُٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب سمندر کے کنارہ نہیں بلکہ جھونپڑے کے گوشہ میں انگڑائی لے رہا ہے۔

بملا اٹھی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی اور سیاہ زلفوں کو جو اُس کے چمپئی رخسار کے بوسے لے رہی تھیں اُوپر کو اُٹھایا۔ اس کی نیم باز انکھڑیوں میں نیند کے خمار کے سُرخ ڈورے گردش کر رہے تھے۔ اُس نے ایک غلط انداز نگاہ سے جھونپڑے کے باہر دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری اور "اُٹھتی ہوں"! کہتی ہوئی قیامت کی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب تو بہت سونے لگی ہے۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھ گیا ہے۔ رکمنی، نروا، سادھنا سب سمندر کے کنارے پہونچ چکی ہیں، اور تو ابھی تک سو رہی ہے"۔ بوڑھے نے جال سلجھاتے ہوئے کہا۔

"میں اب کہاں سو رہی ہوں بابا —— ابھی جاتی ہوں"۔

"ہاں، جاؤ —— اگر آج بھی جال خالی آیا تو شام کو ہماری جھونپڑی چراغ بغیر تاریک پڑی رہے گی"۔

"ایسا نہ ہو گا —— بابا —— لائیے جال مجھے دیجئے —— میں جاتی ہوں"۔

بملا ایک فرسودہ اور پرانا جال لے کر چلی۔ اُس کی ہمسایہ لڑکیاں پہلے سے کنارے پر پہونچ چکی تھیں وہ کسی خیال میں محو چلی جا رہی تھی اور اُس کے جال کا ایک حصہ ریت پر خطِ کہکشاں کھینچنے میں مصروف تھا۔

وہ سمندر کے کنارہ ایسی جگہ پہونچ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ اس نے جال ریت پر پھینک دیا۔ بجھتے ہوئے سورج کو دیکھ کر مسکرائی۔ اپنے کالے اور گھنے بال کمر سے نیچے تک کھول دئے اور جسم سے لپٹی ہوئی

سُرخ تگرمیلی ساری کے دامن ہاتھ میں لئے ہوئے غسل کرنے کے لئے پانی میں نیچے اتر گئی۔

"اگر آج بھی مچھلی نہ ملی تو جھونپڑی میں چراغ نہ جلے گا۔"

بوڑھے باپ کے یہ الفاظ اس کے کان میں گونج رہے تھے مگر وہ اپنی دھن میں نہاتی رہی ــــ اس کے سیاہ بالوں کا جال سمندر کی سطح پر تیر رہا تھا۔ جب وہ اچھی طرح نہا چکی۔ تو اُس نے اپنی ساری کھول دی سڈول ہاتھ پانی سے باہر نکالے، ساری کو نچوڑا۔ اور باندھتی ہوئی ساحل پر آگئی۔

بملا نے اپنا ٹوٹا ہوا جال اٹھایا۔ اور تھوڑی دُور آگے بڑھ کر ایک تنگ جگہ میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے پھینک دیا۔ اُس کے دماغ میں یہ آواز بدستور گونج رہی تھی۔

"اگر آج بھی مچھلی نہ ملی تو جھونپڑی میں چراغ نہ جلے گا"

دن کے بارہ ۱۲ بج گئے۔ مگر جال میں کچھ نہ پھنسا۔ اور پھنستا بھی کیونکر جال کے حلقے اتنے پُرانے اور کمزور ہوگئے تھے کہ پانی میں جاتے ہی مٹی کی طرح گھُل جاتے تھے۔ بملا اُداس تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر آج مچھلیاں نہ ملیں تو اُس کا باپ بہت خفا ہوگا۔ اور اس کی جھونپڑی ساحل کی ہیبتناک فضا میں تاریک پڑی رہے گی۔ رکمنی، نروا اور سادھنا اپنے بھرے ہوئے جال لے کر ادھر سے گذریں۔ اور بملا کو دیکھ کر اُنکے نازک ہونٹوں پر فخر اور غرور کی مسکراہٹ آئی۔ بملا نے اپنی آنکھیں اُن کی طرف سے پھیر لیں۔ اور یاس وحسرت کے ساتھ دیکھنے لگی۔

فطرت اپنے حجاب کی بلندیوں سے وہ مسکراہٹ اور یہ ندامت دیکھ رہی تھی۔ اور بملا اپنی جھونپڑی کے لئے ایک چراغ کی جستجو میں بدستور مچھلیوں کا انتظار کر رہی تھی۔

بملا ایسے کام میں مصروف تھی جو اُس کی کوشش سے بالاتر تھا۔ یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ مچھلیوں کو جال میں لے آئے۔ تاہم وہ مایوس نہ تھی۔ اس کی کنول ایسی آنکھوں میں شبنم کے سے موتی جھلک رہے تھے۔ اُس کے دل میں یہ خیال چٹکیاں لے رہا تھا کہ آج اُس کی جھونپڑی رات کو تاریک رہیگی۔ اُسے بھوک پیاس کی فکر نہ تھی۔ اُسے اپنے پھٹے ہوئے لباس کا خیال نہ تھا۔ مگر وہ اس خیال سے کانپ رہی تھی کہ آج اس کی جھونپڑی تاریک رہے گی ــــ شام کے چھ ۶ بج گئے، وہ ساحل سے لوٹی۔ مگر اس کا دِل اُسے گھر جانے سے روک رہا تھا۔

وہ جھونپڑے کے دروازے پر آکر ٹھٹک گئی۔ جال کو جھونپڑے پر ڈال دیا۔ وہ مغموم اور خوف زدہ کھڑی

ہوئی تھی۔ اُس کا بوڑھا باپ دروازے سے باہر آیا۔ بملاؔ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور جال پر ایک مایوس سی نظر ڈالتے ہوئے کہا:۔

"کب آئی بملاؔ؟"

"ابھی آئی ہوں پاپا"

"کیا آج بھی مچھلیاں نہیں ملیں؟"

"نہیں!"

"کیا سمندر ہماری غذا سے خالی ہو چکا ہے، کیا سمندر کی موجوں میں اب ہماری زندگی کیلئے کوئی سامان نہیں رہا؟ ـــــ اے سمندر کے دیوتا ہم پر رحم کر" بوڑھے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

بملاؔ عالم محویت میں جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا۔ بوڑھے نے کانپتے ہاتھوں سے اُسے اُٹھایا اور اندر لے گیا۔

کچھ دیر بعد بملاؔ نے آنکھیں کھولیں۔ لیکن جھونپڑی کو تاریک دیکھکر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے تصوّر میں اُس کی جھونپڑی تھی۔ اُس کے مُنہ سے آواز نکلی:۔

"میں اپنی جھونپڑی کو بے چراغ نہیں دیکھ سکتی"

"تمہاری جھونپڑی بے چراغ نہیں رہ سکتی بیٹیا" بوڑھا چلّایا۔

بملاؔ نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا "چند نوجوان شکاری رات بسر کرنے کے لئے اُن کے جھونپڑے میں داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھ میں جاتا ہوا لیمپ تھا۔ بملاؔ نے اطمینان کی نگاہوں سے اِس منظر کو دیکھا" اُسے تسلی ہوئی کہ اس کی جھونپڑی روشن ہے۔

اسی اطمینان اور اسی سکون میں اُس نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

فطرت کا چراغ بجھ چکا تھا۔ بملاؔ کا چراغ روشن تھا۔ اُس کی جھونپڑی تاریک اور اداس رات میں بھی منوّر تھی۔ اور بوڑھا اُس کے سرہانے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

رات کا سکون

(نتیجۂ فکر حضرت اختر ہوشیارپوری، بی۔ اے)

رات آدھی آگئی سارا جہاں خاموش ہے
دم بخود فرشِ زمیں ہے آسماں خاموش ہے

وقت کی نبضوں میں خونِ گرم کا دورہ نہیں
بزمِ عشاق و ہجومِ گلرخاں خاموش ہے

اب پپیہا سو گیا ہے کہتے کہتے "پی کہاں"
گلشنوں میں عندلیبِ خوش بیاں خاموش ہے

ساحلوں پر اِک سکوتِ مرگ ہے چھایا ہوا
بلبلے اُٹھتے نہیں موجِ رواں خاموش ہے

گم ہیں صحرا میں جرس کے نالہائے دلنواز
راستے ویران، میرِ کارواں خاموش ہے

نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں زمزمہ سنجانِ بزم
ساز سب ساکن ہیں صوتِ مطرباں خاموش ہے

دھیمے دھیمے جل رہے ہیں قصرِ دولت میں چراغ
گرد دالانوں کی، چولھوں کا دھواں خاموش ہے

تہ نشیں ہیں خواب کے دریا میں شیخ و برہمن
بتکدے میں سنکھ، مسجد میں اذاں خاموش ہے

اِک فقط میں ہوں کہ اختر رو رہا ہوں زار زار
وقت کے ایما سے ہر پیر و جواں خاموش ہے

رُباعیات منور

(حضرت منور لکھنوی)

اپنے ہی طریق کو سراہے جاؤں
اپنی ہی نظر سے تجھ کو چاہے جاؤں
اے کاش سزاوارِ کرم ہونے کو
میں وضع گناہوں کی نباہے جاؤں

حیران نگاہوں سے مدد لیتا ہوں
کھوئی ہوئی راہوں سے مدد لیتا ہوں
اپنے معبود تک پہونچنے کے لئے
میں اپنے گناہوں سے مدد لیتا ہوں

تنقید کتب

طلسم عمل[1]

فلسفۂ نفسیات پر آپس کے میل جول اور حسن معاشرت کا دارومدار ہے۔ جس قدر کسی شخص کو فلسفۂ نفسیات پر عبور ہوگا اُسی قدر دوسروں سے اُس کے تعلقات اچھے ہوں گے۔ اُردو زبان میں ابھی تک اِس موضوع پر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب سید مجتبیٰ احسن صاحب بی۔اے نے مشہور ماہر نفسیات مسٹر ڈیل کارنیگی کی کتاب کا عمدہ اور شگفتہ اُردو میں ترجمہ کرکے اس بڑی کمی کو پورا کردیا ہے۔ ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں گھریلو اور باہری۔ گھر میں اُس کا اپنے بال بچوں اور عزیزوں سے تعلق ہوتا ہے۔ اور باہر اُن لوگوں سے جن سے اُس کے اغراض و مقاصد وابستہ ہوں۔ چنانچہ اِس کتاب میں ان دونوں حیثیتوں سے اچھی زندگی بسر کرنیکے اصول بتائے گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو اصول قائم کئے گئے ہیں اُن کی مثالیں بھی تاریخی لوگوں کے واقعات سے دیدی گئی ہیں۔ اسلئے اگر اس کتاب کو صحیح یا عمدہ زندگی بسر کرنے کا دستور العمل کہا جائے تو بالکل درست ہوگا۔ کیونکہ اسمیں ایسی عملی ہدایتیں درج ہیں۔ جن سے ہر شخص کو اپنی زندگی عمدہ طریقہ سے بسر کرنے میں مدد ملے گی۔ ان ہدایتوں پر عمل کرکے ایک سمجھدار شخص اچھا مقرر، کامیاب تاجر، ہردلعزیز دوست، محبوب شوہر حتیٰ کہ ملک کا اچھا خاصا لیڈر تک بن سکتا ہے۔ اِس کتاب کی لکھائی چھپائی اور کاغذ وغیرہ بھی سب پسندیدہ ہے اور جلد بھی مضبوط اور خوشنما ہے۔ حجم ۲۵۸ صفحات

برق و باراں[2]

یہ کتاب اُردو کے ذہین و طباع نوجوان شاعر مسٹر شمیم کرہانی کی دلکش نظموں کا خوشنما مجموعہ ہے۔ نظمیں زیادہ تر انقلابی رنگ کی ہیں۔ جن کے پڑھنے سے روح میں آزادی اور جذبات عمل کی تحریک ہوتی ہے خود کتاب کا نام ہی ان نظموں کے انقلابی بلکہ طوفانی ہونے کا پتہ دیتا ہے۔ آجکل سرمایہ داروں کو کوسنا اور کسانوں و مزدوروں کی مصیبتوں کا رونا رونا ایک شاعرانہ فیشن ہوگیا ہے۔ چنانچہ یہ مجموعہ بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ جہاں تک شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے شمیم صاحب کی نظموں میں سلاست، روانی، ترنم،

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ایس۔ اے۔ ام حسن صاحب ناظر باغ لکھنؤ۔ [2] قیمت عمر ملنے کا پتہ:۔ انڈین بک ڈپو لکھنؤ۔

ترکیبوں کی چستی اور الفاظ کی برمحل نشست سب کچھ موجود ہے۔ قریب قریب تمام نظمیں شگفتہ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ اِس مجموعے کی ایک دلچسپ جدّت یہ بھی ہے کہ جن نظموں کو کسی ایک باب میں جمع کیا گیا ہے اس باب کا عنوان مصرعہ میں رکھا گیا ہے۔ مثلاً ع "مرا ہندوستان بے چین ہے آزاد ہونے کو" "بزم فانی میں حیات بادداں لایا ہوں میں"۔ "غیر قوموں سے ملاتے آنکھ شرماتا ہوں میں"۔ وغیرہ وغیرہ شمیم صاحب نے ہر نظم میں کوئی نہ کوئی اخلاقی یا سیاسی نتیجہ نکالا ہے۔ مثلاً سات شعروں کی ایک نظم کا عنوان "کانی عورت" ہے۔ جو بظاہر بدنما ہے۔ لیکن اسمیں بھی شاعر نے معنوی پہلو نظر انداز نہیں کیا ہے، چنانچہ اس عورت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

چشموں سے عیب جو آنکھوں کی شرمائی ہوئی　　سر کو نہوڑائے چلی آتی تھی شرمائی ہوئی
دیکھتے ہی ہوگیا دل اس تصور سے دو نیم　　مسلم و ہندو بھی ہیں اک ماں کی دو آنکھیں شمیم
پھوٹ جائے ایک پھر کس طرح مُنھ دکھلائیگی　　مادرِ ہندوستاں بھی تو یونہی شرمائیگی

اِس کتاب کی کتابت، چھپائی اور کاغذ سب نفیس ہے اور جلد بھی انگریزی وضع کی نظر فریب ہے حجم ۱۲۸ صفحات

ارمغانِ جذب

یہ مسٹر راگھوندر راؤ جذبؔ وکیل عالم پوری کی دلکش و سبق آموز رُباعیوں کا دلاویز مجموعہ ہے۔ شروع میں حضرت ماہر القادری کا لکھا ہوا تقریباً ایک جزو کا مقدمہ ہے۔ جسمیں جذبؔ صاحب کے کلام کی خوبیاں اُجاگر کی گئی ہیں۔ بعض رُباعیاں پند و نصیحت کے جواہر پارے ہیں۔ مثلاً ؎

کٹتا ہے ہمیشہ وقت اک عالم کا　　تحصیل میں علم کی، جو بالکل ہے بجا
افکار میں، یا نیند میں، یا جھگڑے میں　　کٹ جاتا ہے وقت جاہل و ناداں کا

یہ رُباعیات جذبؔ کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔
لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔

محبت کی چھاؤں

یہ کتاب جو ادارۂ ادبیات اُردو کی پینتیسویں کتاب ہے، مرزا ظفر الحسن کے ایک درجن دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مرزا ظفر الحسن صاحب کا طرز تحریر بہت دلچسپ ہے۔ زبان بھی پیاری اور سلیس ہے۔ البتہ متانت و سنجیدگی کا عنصر ضرور کم ہے۔ بہرحال نوجوانوں کے لئے یہ کتاب کافی دلکش ثابت ہوگی۔ ان افسانوں سے حیدر آباد کی موجودہ سوسائٹی کے رنگ ڈھنگ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن

اندھا دیوتا

یہ انگلستان کے مشہور شاعر جان کیٹس کے تین منظوم افسانوں:- (۱) ازابیلا (۲) لیمیہ اور (۳) دی ایو آف سینٹ ایگنیز کا اُردو ترجمہ ہے۔ پہلے افسانہ کا مسٹر احسان علی شاہ کے "جام ریحان" کے نام سے، دوسرے کا مسٹر عبدالرحیم شبلی نے "لیمیہ" کے نام سے اور تیسرے کا میرزا ادیب نے "اندھا دیوتا" کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ تینوں افسانے بہت دلچسپ ہیں اور اُن کا ترجمہ بھی ادبی پہلو لئے ہوئے ہے۔ شروع میں جان کیٹس کی سوانحعمری اور اُن کے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔ کتاب دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ ظاہری آرائش و زیبائش دلکش۔ حجم ۱۱۲ صفحات۔ قیمت بارہ آنے

عروس سخن[۲]

یہ اُردو کے نامور مرثیہ گو میر انیس کے گیارہ گرانقدر مرثیوں کا ایک دلپسند مجموعہ ہے۔ جن کو مرتب کر کے بیگم صاحبہ سید عابد رضا صاحب نے ایک قابل قدر ادبی خدمت انجام دی ہے۔ ان مرثیوں کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ کی نظر انتخاب نے گلستان انیس سے وہ خوش بو اور خوشرنگ پھول چنے ہیں جو ہر زنانہ مجلس میں پسند کئے جائیں گے۔ مجموعہ کے شروع میں میر انیس کی ہاف ٹون تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے جلد انگریزی وضع کی اور ٹائیٹل پر کربلائے معلیٰ کی تصویر دی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ حجم ۲۰۸ صفحات۔

یادگار جگر[۳]

یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب منشی رنگ بہادر لال جگر مرحوم وکیل گورکھپور کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے پانڈے سرسوتی پرشاد صاحب نے دلی محنت اور خاص اہتمام کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ کلام کی خوبی اور مصنف مرحوم کی ہر دلعزیزی کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس چھوٹے سے مجموعہ کلام پر پروفیسر رگھوپتی صاحب فراق ایم۔ اے حضرت مجنون گورکھپوری، جناب الیاس احمد صاحب، آنریبل خان بہادر جسٹس محمد اسمٰعیل صاحب، آنریبل مسٹر پرکاش نرائن سپرو بیرسٹرایٹ لا، رائے بہادر منشی نرسنگھ پرشاد صاحب، پانڈے جگدمبا پرشاد صاحب ایڈوکیٹ، نواب زادہ سید محمد علی کبیر خان صاحب وغیرہ نے فاضلانہ تنقیدیں لکھی ہیں جو اس کے شروع میں درج ہیں۔ جہانتک ہم نے اس مجموعہ کی سیر کی ہے واقعی جگر مرحوم کا کلام عمدہ، زبان شستہ اور مضامین بلند ہیں۔ اس کلام کو دیکھکر ناظرین کو بھی جگر صاحب کی جوانمرگ کا دلی افسوس ہوگا۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب بہت عمدہ۔ حجم ۱۲۲ صفحات۔

---

(۱) ملنے کا پتہ:- اُردو اکیڈیمی پنجاب، لوہاری دروازہ لاہور۔ (۲) قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ:- نظامی پریس بدایوں
(۳) قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ:- پانڈے سرسوتی پرشاد لائبریرین، گورکھپور ہائی اسکول۔ گورکھپور

منتخب المکاتیب[1]

یہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سبق آموز اور بصیرت افروز فارسی خطوط اور رقعوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے، جو مولوی سیدمحی الدین احمد صاحب فاضل کامل نے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں عالمگیر کے پچاس خطوط ہیں۔ جن کو فارسی کے طالب علموں کے لئے انتخاب کیا گیا ہے اور آخر میں مشکل الفاظ اور جملوں کی ایک فرہنگ بھی دیدی گئی ہے کتاب مجلد ہے اور لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ حجم ۱۰۳ صفحے

قواعد وضوابط قانون پٹوارہ[2]

اس کتاب میں پٹوارہ کے قاعدے اور اصول درج ہیں۔ اور پٹوارہ مینویل کا ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ قانون مالگزاری کا انتخاب اور اس کے متعلق ضروری نظائر بھی دیدی گئی ہیں۔ چنانچہ امینوں، پٹواریوں اور زمینداروں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس کی عمدگی اور اہمیت کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک قلیل عرصہ میں یہ چار مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اسکی لکھائی، چھپائی، کاغذ بھی اوسط درجہ کا اچھا ہے۔ حجم ۲۲۴ صفحے۔

کیوں اور کیسے؟[3]

اس کتاب میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے روزمرہ کی بہت سی باتوں کے متعلق سائینٹفک وجوہات بیان کئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے بچوں کی معلومات میں اضافہ اور عقل و ذہانت میں ترقی ہوگی۔ کتاب کی زبان بھی سلیس اور سہل ہے مثلاً آندھی کیسے چلتی ہے؟ لاسلکی۔ اولے کیسے پڑتے ہیں؟ دریا کیسے بنتے ہیں؟ موٹر کیسے چلتی ہے؟ سینما کیسے چلتا ہے؟ کھانسی کیوں آتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مضمون سمجھانے کیلئے جگہ جگہ نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بچوں کے لئے بہت مفید ہے اور درسی کتاب کے طور پر استعمال کیجاسکتی ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت ۱۰۲ صفحے۔

خبطی[3]

یہ محمد علی واحدی صاحب کا ایک چھوٹا سا ناول ہے جسمیں انھوں نے کردار نگاری کی کوشش کی ہے لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں کا قصہ باندھا گیا ہے۔ جسمیں تین کیرکٹر عمدہ دکھلائے گئے ہیں۔ مہندر غیور اور خوددار نوجوان ہے، سرجی دیہاتی زمیندار کا بیٹا شیخی باز اور بیوقوف۔ سرلا دیوی ایک سمجھدار، ذہین مگر شوخ لڑکی ہے۔ زبان بھی سلیس ہے۔ ناول کے مصنف جو ہونہار معلوم ہوتے ہیں کا یہ نقش اوّلین ہے۔ اُمید ہے کہ نقش ثانی اس سے بہتر ہوگا۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ وغیرہ معمولی ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحات

---

[1] قیمت سات آنہ، ملنے کا پتہ:- لالہ رام نراین لال بک سیلر الہ آباد۔ [2] قیمت بارہ آنے۔ ملنے کا پتہ:- نظامی پریس بدایوں۔
[3] قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

رفتارِ زمانہ

جنگِ یورپ

اگست ۱۹۴۰ء کے خاتمے کیساتھ یورپ کی لڑائی کا پہلا سال ختم ہوگیا۔ لڑائی ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی اور اسی تاریخ کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا۔ اس کی وجہ جیسا کہ ناظرین کو معلوم ہے یہ تھی کہ جرمنی نے پولینڈ پر اچانک حملہ کردیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے یورپ کے کتنے ہی ملکوں کی آزادی خاک میں ملادی۔ ان افسوسناک واقعات سے کون واقف نہیں ہے؟ لیکن اس موقعہ پر یادداشت تازہ کرنے کی غرض سے ایک سال کے واقعات کا مختصر بیان بیجا نہ ہوگا۔ یہ لڑائی دنیا کی تاریخ میں اس لئے بھی یادگار رہے گی کہ ہٹلر نے اسمیں پرانے جنگی طریقوں کو خیرباد کہکر بالکل نئے طریقوں سے سائینس کے بل بوتے پر ہر جگہ معرکہ آرائی کرکے فتح حاصل کی۔ اُس نے نئے حربی آلات اور نقل و حرکت کے جدید ذرائع سے کام لے کر ایسی باتیں کر دکھائیں، جن کا پہلے لوگوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ سائینس سے مدد لینے کے علاوہ ہٹلر نے سیاسی حیثیت سے بھی وہ کام کئے۔ جن کا خواب میں بھی خیال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً دنیا جانتی تھی کہ روس کی اشتراکیت اور جرمنی کی نازیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہٹلر، روس کا جانی دشمن تھا۔ اور اُس نے ہر موقعہ پر دل کھولکر روسی لیڈروں کی توہین کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ لیکن جب خود اُس کو ضرورت ہوئی تو اُس نے روس سے دوستانہ معاہدہ کرلیا۔ اور اس طرح جب اُسے اپنی مشرقی سرحد کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو اُس نے مغربی جمہوریتوں (یعنی فرانس اور برطانیہ) پر رُخ کیا۔ اور پولینڈ، ڈنمارک، ہالینڈ، ناروے، بلجیم اور فرانس پر ایسا بے پناہ حملہ کیا کہ ان سب کو اُسکی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوائے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ ہٹلر اور اسٹالین کا معاہدہ کسی خلوص اور دوستی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اُسکی تہ میں فریقین کی خودغرضی چھپی ہوئی ہے اسی لئے جب جرمنی نے حملہ کرکے پولینڈ کی بہت کچھ طاقت توڑ دی تو روس نے بھی پولینڈ پر حملہ کرکے اسکا ایک بڑا حصہ دبالیا۔ غرض جرمنی اور روس دونوں نے چاروں طرف سے گھیر کر غریب پولینڈ کے حصے بخرے کر لئے۔ پولینڈ کے بعد روس نے لتھوینیہ، اسٹونیہ اور لٹویہ کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لے لیا۔ فن لینڈ نے روسی مطالبات منظور کرنے سے انکار کیا تو اُس پر فوجکشی کرکے جبراً اپنے مطالبات منوا لئے۔ اس کے بعد رومانیہ سے صوبہ بیسارابیہ اور شمالی بکووینا چھین لئے گئے۔ ان سب علاقوں پر قبضہ کرنیکے بعد روس نے بحیرۂ بالٹک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی

اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔

جرمنی کی جیرہ دستیاں پولینڈ تک ختم نہیں ہوئیں بلکہ اُس نے ناروے اور ڈنمارک پر بھی اچانک حملہ کرکے قبضہ کر لیا۔ ڈنمارک نے خاموشی کیساتھ اطاعت قبول کر لی۔ مگر ناروے نے چند روز تک مقابلہ کیا۔ لیکن آخر اُس کو بھی شکست نصیب ہوئی۔ اُس کے بعد جرمنی نے ہالینڈ، لکسمبرگ اور بلجیم پر بغیر کسی وجہ کے حملہ کر کے انکی آزادی و خود مختاری کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ ہالینڈ نے ایک ہی ہفتہ میں اطاعت قبول کر لی۔ بلجیم نے چند روز مقابلہ کیا مگر عین اُس وقت جبکہ فلینڈرس میں اتحادی فوجیں دشمن کا مقابلہ کر رہی تھیں، بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ نے اتحادیوں کے ساتھ دغا کر کے جرمنی سے صلح کر لی اور اپنی فوج کو لڑنے سے منع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادی فوجیں بری طرح نرغہ میں پھنس گئیں۔ اور انھیں فلینڈرس سے یکایک ہٹنا پڑا۔ ہٹلر چاہتا تھا کہ وہ اتحادی فوجوں کو یا تو بالکل تباہ کر دے یا گرفتار کر لے۔ مگر اس بُرے وقت میں فضلِ الٰہی نے اتحادیوں کا ساتھ دیا اور برٹش بحری طاقت کا معجزہ دیکھنے میں آیا جسکی بدولت برطانیہ کی تین لاکھ پینتیس ہزار فوج صحیح سلامت انگلستان پہونچ گئی۔ البتہ جس عجلت سے یہ کارروائی ہوئی۔ اسمیں بہت سا سامانِ جنگ وہیں رہ گیا۔ بلجیم کے بعد جرمن فوج کا سیلاب روکے نہ رُک سکا اور چند ہی ہفتوں میں اُس نے شمالی فرانس کو پامال کر دیا۔ فرانس کے رہنماؤں کو بھی ہتھیار ڈالنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ اُسوقت سے اب تک برطانیہ تن تنہا جرمنی سے لڑ رہا ہے۔ اور یورپ کو ہٹلر کی مطلق العنانی سے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ ہٹلر اُسے مٹانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ مگر اُس کا پروگرام ایک دفعہ تو پلٹ ہی گیا ہے۔ ہٹلر نے لندن میں داخل ہونے کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۰ء کی کی تاریخ مقرر کی تھی۔ مگر برطانیہ کی اٹل قوتِ ارادی کی بدولت ابھی تک اُس کی اُمید پوری نہیں ہوئی۔ اور اسوقت برطانیہ نے اپنی حفاظت کا ایسا وسیع اور پختہ انتظام کر لیا ہے کہ جون گذشتہ کے مقابلہ میں ستمبر ۱۹۴۰ء میں جرمن حملہ آوروں کو کہیں زیادہ مشکلات پیش آئیں گی۔ یہ ضرور ہے کہ اس قول کے مطابق کہ شیطان مارتا نہیں، مگر ہلکان ضرور کرتا ہے آجکل جرمنی رات دن برطانیہ پر ہوائی حملے کر رہا ہے۔ مگر برطانیہ کی ہوائی فوج بھی اب پہلے سے بہت زیادہ طاقتور ہوگئی ہے۔ چنانچہ جرمن ہوا بازوں کا مقابلہ کرنے کے علاوہ برطانوی ہوا باز آئے دن جرمنی پر بھی حملے کرتے رہتے ہیں۔ اور ابتک انھوں نے فوجی حیثیت سے جرمنی کو بہت کچھ نقصان پہونچایا ہے۔

جرمن حملے جولائی تک تو معمولی رہے لیکن اگست ۱۹۴۰ء میں ان حملوں کا زور و شور بہت بڑھ گیا۔ لیکن جرمنی کے مسلسل حملوں اور برطانیہ کی جوابی کارروائیوں نے اس بات کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ ہٹلر ان حملوں سے جان و مال کا نقصان پہونچانے کے علاوہ اپنا اصلی مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ جرمنی کا دعویٰ ہے کہ دو مہینوں کے اندر یعنی جولائی و اگست ۱۹۴۰ء میں اُس نے برطانیہ کے ۱۹۲۱ ہوائی جہاز تباہ کئے۔ لیکن بقول مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ

یہ تعداد بہت مبالغہ آمیز ہے۔ واقعی صرف ۵۵۸ ہوائی جہاز برباد ہوئے مگر اُن کے بہت سے ہوا باز بچا لیئے گئے۔ پچھلے ماہ اگست کے مسلسل ہوائی حملوں سے صرف ایک ہزار چھہتر آدمی جان سے مرے اور باقی قدر یا اس سے کچھ زیادہ آدمی زخمی ہوئے۔ باقیں بہت سی عورتیں اور بچے ہیں۔ چھوٹے موٹے نقصانات سے قطع نظر اگست میں انگلستان کے آٹھ سو مکانات بالکل برباد ہو گئے۔ مگر برطانیہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ مکان ہیں۔ جس میں دس پانچ ہزار مکانات بالکل منہدم بھی کر دیے جائیں، اور اسی طرح دس بارہ ہزار آدمی کام بھی آجائیں تو اس سے برطانیہ کے عزم و ہمت میں کمی نہیں آسکتی۔ پچھلے دو موقعوں پر بھی یعنی ۱۸۰۵ء-۱۸۱۵ء و ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کی لڑائیوں میں انگلستان کی پوزیشن اس سے کہیں زیادہ نازک ہوگئی تھی ۱۹۱۷ء میں جرمنی اور اُس کے حلیف آسٹریا، ہنگری، ٹرکی و بلغاریہ کا اثر بحیرہ شمالی سے لیکر بحیرہ ایجئین تک پھیلا ہوا تھا اور بلقان میں یونان کے سوا تمام ریاستیں جرمنی کے زیر اثر تھیں، ملک شام، فلسطین، عراق اور عرب کا بھی اکثر حصہ دشمنوں کے قبضہ میں تھا۔ یوروپ میں ایک چھوٹا سا علاقہ چھوڑ کر تمام بلجیم اور شمالی فرانس پر جرمنی چھایا ہوا تھا اٹلی جس نے فرانس و برطانیہ کا ساتھ دیا تھا، صرف اتنا کر سکتا تھا کہ آسٹریا کے حملوں کو روک سکے۔ لیکن بعد میں کاپوریٹو کے میدانِ جنگ میں اٹلی کے چھ لاکھ آدمی ہلاک و زخمی ہو گئے اور تین ہزار توپیں نکل گئیں۔ جس کے بعد فرانس و برطانیہ کو دس ڈویژن فوج سے اٹلی کو مدد دینا پڑی۔ اور اسوقت اٹلی کی بحری طاقت اتنی کمزور تھی کہ وہ برطانوی بیڑے کی مدد کے بغیر بحیرہ ایڈریاٹک میں بھی اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ گویا اٹلی کی دوستی سے اتحادیوں کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ امریکہ نے میدانِ جنگ میں تازہ تازہ قدم رکھا تھا۔ اور ابھی وہاں سے کافی مدد نہیں پہونچ سکی تھی۔ البتہ مشرق میں ضرور اُمید کی جھلک نظر آرہی تھی جہاں مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد فتح کر لیا گیا تھا۔

بحری لڑائی میں جرمنی کی ڈیڑھ سو آبدوز کشتیاں کام کر رہی تھیں اور اُن کا کوئی توڑ اتحادیوں کو سوجھا نہ تھا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے ۱۶۹ جہاز ضائع ہوئے تھے۔ اور روزمرہ کی ضروریات کی کمی پڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ امریکہ سے بھی بہت کم مدد پہونچ رہی تھی۔ جاپان نے بحیرۂ روم میں صرف آدھے درجن تباہ کن جہازوں سے مدد دی تھی۔ بہر حال کم سے کم چھ جگہ لڑائی جاری تھی اور سب جگہ فوجیں اور سامان بھیجنے کی ضرورت تھی۔ غرض ۱۹۱۷ء میں جنگ کا تمام بوجھ برطانوی جہازوں اور برطانوی فوجوں ہی پر تھا۔ شکر ہے کہ آج بھی برطانیہ کا سمندری بیڑہ سمندروں پر اتنا ہی اقتدار رکھتا ہے پچھلے دنوں جب فرانس نے ہار مان لی تو فرانسیسی بیڑہ کے جرمن ہاتھوں میں پڑ جانیکا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ مگر اب وہ خطرہ بھی جاتا رہا ہے۔ اور اسوقت برطانوی بیڑہ، جرمن، اطالوی اور بقیہ فرانسیسی بیڑوں کی مجموعی طاقت سے بھی زیادہ زبردست طاقت رکھتا ہے اور یہی بحری اقتدار برطانوی فتح کی گارنٹی ہے۔ اس کے علاوہ اب برطانیہ کے تجارتی بیڑہ میں ناروے، بلجیم اور ہالینڈ کے جہاز مل گئے ہیں۔ جس سے انگلستان کی بحری قوت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔

موجودہ لڑائی میں فتح پانے کے لئے دو باتیں خاص طور پر ضروری ہیں۔ ایک تو بحری اقتدار اور دوسرے ہوائی غلبہ۔ ظاہر ہے کہ بحری اقتدار جرمنی اور اس کے ساتھی اٹلی کو حاصل نہیں۔ جرمنی نے برطانیہ کو بڑی بڑی دھمکیاں دے رکھی تھیں۔ مقناطیسی سرنگیں برطانوی جہازوں کو ختم کرنے کیلئے تیار کیگئی تھیں لیکن ان سب کے باوجود انگلستان کا سمندری بیڑا پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے اور تجارتی جہازوں کی آمد و رفت بدستور جاری ہے۔ جرمنی نے لاکھ کوشش کی مگر سال بھر کے حملوں میں پانچ فیصدی سے زیادہ تجارتی جہاز نہ ڈبو سکا۔ یہ نقصان برطانیہ کے لئے کسی طرح ناقابل برداشت ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ بہت سے دوسرے تجارتی جہاز بھی اسکے حصے میں آگئے ہیں

اب رہا ہوائی طاقت کا معاملہ اس میں بھی ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ رائل ایئر فورس روزانہ جرمنی پر ہوائی حملے کر کے نقصان پہونچاتی رہتی ہے جرمنی کے پاس ہوائی جہازوں کی بہت کثیر تعداد تھی اور اس نے غیر معمولی فوقیت حاصل کرلی تھی مگر یہ فوقیت اب ختم ہو رہی ہے۔ کیونکہ برطانیہ نے اس کمی کو جلد سے جلد پورا کرنیکا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ اور امریکہ، کناڈا وغیرہ ہر جگہ سے نئے نئے ہوائی جہاز خرید رہا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان میں بھی ہوائی جہاز تیار کرنے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ جرمنی کے مقابلے میں انگریزی ہوا باز اور انگریزی مشینیں بہت اچھی ثابت ہوئی ہیں اور پچھلے دو ماہ کی ہوائی لڑائیوں میں ان کی فوقیت بخوبی ثابت ہوگئی۔ کیونکہ ان لڑائیوں میں اگر برطانیہ کا ایک جہاز ضائع ہوا تو جرمنی کے چار طیارے تباہ ہوئے۔ جہاں تک خشکی کی فوج کا تعلق ہے۔ اسوقت برطانیہ کے پاس پچیس ۲۵ لاکھ فوج کیل کانٹے سے درست جرمن حملہ کا دل توڑ کر مقابلہ کرنیکو تیار ہے۔

ہٹلر نے برطانوی حملہ کے لئے ۱۵ اگست کی تاریخ مقرر کی تھی جس کو تین ۳ ہفتے گذر گئے ہیں۔ مگر ابھی تک وہ خشکی پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اگست کے آخر میں اس نے جو تقریر کی اسمیں اس نے اس حملہ کا ایک مرتبہ پھر وعدہ کیا ہے لیکن اس کی دو باتیں خاص طور پر معنی خیز ہیں۔

ہٹلر نے برطانوی ناکہ بندی کے خلاف بہت کچھ غم و غصے کا اظہار کیا ہے جس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ سمندروں پر برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم ہے۔ دوسرے اس نے ڈنکرک سے انگریزی فوج کے سلامتی کیساتھ بچ نکلنے کو بھی قبول کیا ہے اور برطانیہ کی جغرافیائی پوزیشن کی اہمیت بھی تسلیم کی ہے۔ ان سب باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کو برطانیہ پر حملے کرنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا ہو رہا ہے اور یہ حملہ اس کے لئے اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ وہ پہلے سمجھا تھا۔ مسٹر چرچل نے اپنی تازہ ترین تقریر میں اس بات کا خاص طور پر یقین دلایا ہے کہ اگر یہ حملہ ہوا تو جرمنی کو بہت مہنگا پڑے گا۔

اٹلی نے اس طرف کچھ ہاتھ پیر نکالے ہیں۔ برطانوی سمالی لینڈ اور ایک آدھ اور معمولی مقامات پر اس نے فوجی دباؤ ڈال کر قبضہ کرلیا ہے لیکن بحیرۂ روم میں ابھی تک اس سے کچھ بنائے نہیں بنی۔ حال میں برطانوی

بحری بیڑہ نے کامل چھ دن تک بحرۂ روم کے پورے رقبہ کا متواتر گشت لگایا جسکے دوران میں برٹش جنگی جہازوں نے اٹلی کے بحری اڈوں پر سمندر سے گولہ باری کی اور ہوائی جہازوں نے اوپر سے بم برسائے۔ سارڈینیا Sardinia اور سسلی کے ہوائی اڈوں پر بمباری کر کے کئی اطالوی ہوائی جہاز تباہ کر دئے۔ اٹلی کا جنگی بیڑہ جسمیں جنگی جہاز کروزر۔ تباہکن جہاز سبھی شامل ہیں پاس ہی منہ دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ اور انگریزی بیڑہ کی مزاحمت کی ہمت نہ ہوئی۔ برطانی ہوائی جہاز لیبیا، حبش اور شمالی لینڈ وغیرہ پر بھی بمباری کرتے رہتے ہیں۔

اٹلی مصر پر بھی حملہ کی تیاری کر رہا ہے لیکن مصر نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس پر کوئی زیادتی ہوئی تو وہ جنگ میں شامل ہو کر جوابی کارروائی سے باز نہ رہے گا۔

فرانس میں پیٹاں گورنمنٹ کو پیرس یا وارسائی میں اپنی راجدھانی لے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ مارشل پیٹاں نے فرانس کے جنرل گیملن، کئی سابق وزیروں اور جرنلوں کو گرفتار کر کے ان پر جنگ کے سلسلہ میں ملکی غداری کے الزامات لگا کر مقدمے قائم کئے ہیں مگر مارشل پیٹاں کو یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ فرانس کے اکثر لوگ اُن کے خلاف ہو رہے ہیں۔

آزاد فرانسیسوں کے افسر اعلیٰ جنرل ڈی گال کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس ماہ افریقہ کی کئی چھوٹی چھوٹی فرانسیسی نوآبادیوں نے جنرل موصوف کی رہنمائی میں لڑائی جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ مختلف ملکوں کے فرانسیسی باشندے جنرل ڈی گال کی فوج میں شامل ہو رہے ہیں۔ مثلاً کابل کے چند فرانسیسی باشندے اسی ارادہ سے لنڈن گئے ہیں اور برازیل، امریکہ، کناڈا اور مشرق بعید کے ملکوں کے فرانسیسی نے جنرل موصوف کا ساتھ دینے کا اعلان کیا ہے۔ مراکو میں بھی انتشار پھیلا ہوا ہے اور ایسٹ انڈیز کی بھی یہی حالت ہے۔ غرض دنیا کے ہر گوشے سے فرانسیسی اپنے وطن مالوفہ کی آزادی کی خاطر جان و مال کی قربانی کرنیکو تیار ہو رہے ہیں اور جنرل ڈی گال کی فوج میں روز مرہ ترقی ہو رہی ہے۔ افریقہ کے تمام فرانسیسی مقبوضات کے جنرل ڈی گال کے ساتھ کے ساتھ ہو جانے سے جرمنی بلجین کانگو پر آسانی سے قبضہ نہ جما سکے گا۔

مارشل پیٹاں نے جنرل ڈی گال کے تمام فوجی اعزاز ضبط کر لئے ہیں اور اُن کیلئے پھانسی کا حکم بھی دیا گیا ہے لیکن جنرل موصوف نے اِن سب باتوں کا صرف یہ جواب دیا ہے کہ ابھی تو وہ فرانس کی آزادی کی خاطر لڑ رہے ہیں مگر جب یہ آزادی مل جائے گی تو وہ کڑی سے کڑی سزا کو جو اُن کے آزاد ہموطن تجویز کریں گے، خوشی سے بھگت لیں گے۔ اِسوقت تو مارشل پیٹاں کو سخت مشکلات کا سابقہ پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اُن کو جنرل ویگاں کو فرانسیسی افریقہ کی بغاوت فرو کرنے کیلئے تعینات کرنا پڑا۔

بلقان کی حالت پہلے سے بھی نازک ہو گئی ہے۔ رومانیہ کا قضیہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ جرمنی کی کوشش

برابر جاری ہے کہ وہ ہنگری، بلغاریہ اور رومانیہ کا تمام خطہ اپنے اثر و اقتدار میں رکھے اور روس کو یہاں دخل نہ پانے دے۔ ادھر روس رومانیہ کے ایک جزو کو اپنی حکومت میں شامل کر چکا ہے اور اب یگوسلاویہ کا پر اپنا اثر بڑھانا چاہتا ہے۔ یونان اور اٹلی کے درمیان بھی چشمکیں ہو رہی ہیں۔ اطالوی اخبارات اہل یونان پر کھلے بندوں یہ الزام لگا رہے ہیں کہ وہ البانیہ کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دے رہے ہیں۔ اور یونان میں البانوی باشندوں پر مظالم توڑے جا رہے ہیں غرض اٹلی یونان کو طرح طرح کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ مگر ترکی اور برطانیہ دونوں نے ضرورت پڑنے پر یونان کو ہر طرح سے مدد دینے کا وعدہ کیا ہے بسا ریبیہ پر روسی قبضہ ہوجانے کے بعد سے ہنگری، رومانیہ سے ٹرانسلونیا کا علاقہ مانگ رہا تھا۔ جرمنی شروع ہی سے رومانیہ پر ہنگری سے پرامن سمجھوتہ کرنے کے لئے زور ڈال رہا تھا اُس نے رومانیہ کو برطانیہ سے پہلے ہی علیحدہ کر لیا۔ اسلئے رومانیہ کو مجبور و معذور جرمنی کی بات ماننا پڑی۔ اور گو اُس نے ایکدفعہ اس معاملے میں بات چیت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں اُسے جرمنی اور اُس کے ساتھی اٹلی کا دباؤ ماننا پڑا۔ چنانچہ وائنا میں ایک کانفرنس ہوئی جسمیں اٹلی و جرمنی کے وزیر خارجہ کونٹ چیانو اور ربن ٹراپ کی موجودگی میں رومانیہ کے نمایندوں کو ٹرانسلونیا کا علاقہ ہنگری کے حوالہ کرنا پڑا۔ اب اِس سمجھوتہ سے تمام رومانیہ میں بڑی ناراضگی پھیل گئی ہے۔ اور جبر و تشدد کا بازار بھی گرم ہوگیا ہے۔ مشہور آئرن گارڈ پارٹی نے انقلاب برپا کر دیا ہے شاہ کیرول نے پہلے تو اُس کو دبانے کی کوشش کی۔ جس پر وزارت مستعفی ہوگئی اور شاہ موصوف نے ملک آئین معطل کر کے پارلیمنٹ کو برخاست اور جنرل انٹانسکو نئے وزیر اعظم کو غیر معمولی اختیارات دیکر ڈکٹیٹر بنا دیا۔ مگر اس سے کام نہ چلا۔ اور آخر اُن کو اپنے بیٹے شاہزادہ مائیکل کے حق میں تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ کہتے ہیں کہ شاہ کیرول کے قتل کی بھی کوشش کی گئی مگر اُس میں کامیابی نہیں ہوئی اور وہ جان بچا کر سوئزرلینڈ چلے گئے۔ یہ دوسرا موقعہ ہے کہ شاہزادہ مائیکل رومانیہ کے بادشاہ قرار دئے گئے ہیں۔ وہ پہلے ۱۹۲۷ء میں بھی تھوڑے عرصہ (تین سال) کے لئے تخت نشین رہ چکے ہیں۔ مگر اُس وقت اُنکی عمر صرف چھ سال کی تھی۔ اِس لئے کونسل آف ایجنسی قائم ہوئی تھی۔ اب اُن کی عمر انیس ۱۹ سال کی ہے اور اُن کی ماں کوئین ہیلن بھی اپنے بیٹے کی امداد کے لئے آگئی ہیں۔ اور وزیر اعظم ملک کے مختار کل ہو گئے ہیں۔

ابھی تک روس کے تعلقات ترکی وغیرہ کے ساتھ باضابطہ حیثیت سے بالکل صحیح و درست ہیں۔ آیندہ بلقانی ریاستوں میں جرمنی اور روس کے متضاد مفاد میں کوئی تصادم ہوگا یا نہیں؟ اس کے متعلق کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ تھوڑے سے عرصے میں رومانیہ میں جو انقلابات ہوگئے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب ہے کہ آیندہ واقعات کے متعلق کوئی قیاس آرائی نہ کیجائے بلکہ

واقعات کا صبر و خاموشی کے ساتھ انتظار کیا جائے۔ اِس جنگ کی بدولت اب تک چار بادشاہوں کو مجبوراً
اپنے تخت و تاج سے علیحدہ ہونا پڑا۔ آیندہ دیکھئے کیا نوبت آتی ہے؟

ہندوستان

پچھلے نمبر میں ہم نے دو باتیں لکھی تھیں۔ اول یہ کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس پونا نے بیرونی حملوں کی مدافعت کے لئے عدم تشدد کے متعلق کانگریسی نقطۂ خیال میں جو تبدیلی منظور کی ہے اُس سے کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان سمجھوتہ ہونے میں مزید سہولت ہوگئی ہے۔ دوسری یہ کہ شائد مسلم سیاسیات اب کوئی نیا پلٹا لے مگر پچھلے ماہ جو واقعات ہوئے اُن کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ گورنمنٹ برطانیہ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتہ کی اُمید اب پہلے سے کہیں زیادہ دُور ہوگئی اور مسلم لیگ گورنمنٹ ہند سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ قریب آگئی ہے۔

۷ راگست کو حضور وائسرائے نے شملہ سے ایک طولانی بیان شائع کیا جو بحالات موجودہ برٹش گورنمنٹ کا قول فیصل سمجھا جاتا ہے اور جسمیں اس بات کو ایک مرتبہ پھر دُہرایا گیا ہے کہ ہندوستان کے متعلق تاج شاہی اور برٹش پارلیمنٹ کی اب بھی وہی پالیسی ہے جس کا پہلے اعلان کیا جاچکا ہے اور جس کو برٹش گورنمنٹ منظور کرچکی ہے یعنی یہ کہ بالآخر ہندوستان کو دولت مشترکہ برطانیہ کے اندر ایک آزاد رکن اور برابر کے ساتھی کا مرتبہ دیا جائے۔ لیکن اس درجہ کے حاصل ہونے کے لئے کئی شرطیں لگادی گئی ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مرتبہ جلد اور آسانی سے حاصل نہ ہو سکے گا۔

برٹش گورنمنٹ کا بھی یہی اندازہ ہے۔ اسی لئے جدید اعلان میں لارڈ لنلتھگو نے اس بات کو بخوبی واضح کردیا ہے کہ:۔

"بحالات موجودہ ہندوستان میں امن و عافیت قائم رکھنے کی جو ذمہ واری برٹش گورنمنٹ پر عائد ہے اُس کو وہ کسی
"ایسے طریق حکومت کے سپرد کرنے کا خیال ہی دل میں نہیں لاسکتی ہے جس کے حکم و اقتدار کو ہندوستان کی قومی زندگی
"کے بڑے بڑے اور طاقتور اجزا علانیہ طور پر تسلیم نہ کرتے ہوں۔ اور نہ وہ (یعنی گورنمنٹ برطانیہ) ان اجزا کو ایسی
"گورنمنٹ کے سامنے گردن تسلیم خم کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔"

اسی کے ساتھ حضور وائسرائے نے آئینی اصلاحات کی سرآیندہ اسکیم کے متعلق بھی یہ اعلان کیا ہے کہ جب کبھی
"موجودہ اسکیم میں کوئی ترمیم یا تبدیلی تجویز کی جائے گی تو گورنمنٹ برطانیہ اُس کے متعلق قلیل تعداد والی جماعتوں کی رائے
"کو پوری وقعت دیگی۔" آیندہ چل کر اس بات کو بھی دُہرایا گیا ہے کہ آئین ہند کے مسئلہ پر غور کرتے وقت گورنمنٹ
"انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور اس کی بنیادی پالیسی اور طرز عمل پر بھی از سر نو غور کیا جائے گا اور موجودہ جنگ کے ختم ہوتے
"ہی گورنمنٹ برطانیہ نئے آئین حکومت کا خاکہ تیار کرنے کیلئے بلاکسی تاخیر کے ہندوستان کی قومی زندگی کے خاص خاص
"اجزا کے نمایندوں کی ایک جماعت قائم کردیگی اور حتی الامکان تمام امور متعلقہ کے متعلق جلد سے جلد فیصلہ کرنے میں
"ہر ممکن مدد دیگی۔ اسکے علاوہ اگر اہل ہندوستان اسوقت بھی دوستانہ طریق پر جنگ کے بعد والی نمایندہ جماعت کے متعلق عملی
"حیثیت سی باہمی مشورہ شروع کردیں تو گورنمنٹ اُس کا خیر مقدم کریگی۔ اسکیساتھ گورنمنٹ برطانیہ نےیہ بھی اُمید ظاہر کی ہے کہ
"موجودہ جنگ کے دوران میں سبھی پارٹیاں، جماعتیں اور فرقے متفق و متحد ہوکر مرکزی گورنمنٹ کے ساتھ فتح حاصل
"کرنے کی کوشش میں پوری مدد دیں گے۔"

جنگ میں ہندوستان کی امداد حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ برطانیہ نے گورنر جنرل ہند کی انتظامی کونسل کی

فوری توسیع منظور کی ہے۔ چنانچہ مختلف پارٹیوں کے چند لیڈروں کو انتظامی کونسل میں جگہ دیجائے گی۔ اور ایک جنگی مشاورتی کمیٹی بھی قائم کی جائیگی۔ جس میں ہندوستانی ریاستوں کے نمایندے شامل ہوں گے۔

پارلیمنٹ میں صاحب وزیر ہند مسٹر ایمری نے اِس بیان کی جو توضیح کی تھی اُس میں اُنھوں نے اکثر جگہ تو وائسرائے کے اعلان کے الفاظ ہی دُہرا دے۔ اور کہیں کہیں فصاحت و بلاغت سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن مطلب کی باتوں کے متعلق اُنھوں نے وائسرائے کے اعلان پر ایک نقطہ کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ ڈومینن اسٹیٹس Dominion Status کے سلسلہ میں اُنکی تقریر نے مزید غلط فہمی پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ اُنکی رائے میں یہ ضروری نہیں کہ کسی اصول کے ماتحت سب جگہ یکساں کارروائی ہو۔ کم سے کم ملکی حفاظت اور خارجی معاملات میں ہندوستان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات دوسرے مقامات سے مختلف ہیں۔ دوسرے پُرانے تعلقات کی وجہ سے برطانیہ پر چند خاص ذمہ واریاں بھی عائد ہوگئی ہیں۔ جن کا لحاظ رکھنا لازمی ہے"۔ بہرحال اِن باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ ہندوستان کو دوسری نوآبادیوں کے طرز پر اپنی سیاسی، تمدنی اور اقتصادی ضروریات کے مطابق اپنا آئین بنانے کی آزادی دینے کو تو تیار ہیں"۔

یہاں اِن بیانوں پر مفصل بحث کرنے کا موقعہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ کانگریسی لیڈروں نے انھیں بالکل ہی ناقابل قبول قرار دیا ہے اور ملک کے کسی طبقے کو ان سے اطمینان کلی نہیں ہوا ہے۔ اور تو اور مسلم لیگ یا اُس کے پریسیڈنٹ مسٹر جناح کو بھی اِس اعلان سے پورا اطمینان نہیں ہوا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس بمبئی نے بھی قلیل تعداد والی جماعتوں کے متعلق وائسرائے کے اعلان اور وائسرائے کی کونسل کی توسیع کو پسند تو کیا ہے لیکن ابھی بہت سے وسوسے باقی رہ گئے ہیں۔ جن کے حل کرنے کے لئے عنقریب ہی مسٹر جناح وائسرائے سے ملاقات کرینگے۔ بعض ذی اثر اصحاب کے زور ڈالنے پر مسٹر جناح کو ممبران لیگ کو جنگی کمیٹیوں میں شریک ہونے کی آزادی تو دینا پڑی۔ لیکن جن الفاظ میں یہ آزادی دی گئی ہے اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جناح ان کمیٹیوں کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے۔ بہرحال گورنمنٹ برطانیہ نے کانگریس کو پس پشت ڈال کر اب فرقہ وارانہ تحریکوں سے تعاون حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ لیکن مسٹر جناح مرکز میں مسلمانوں کے لئے پچاس فیصدی نیابت مانگ رہے ہیں۔ ہندو مہاسبھا اس پر رضامند ہوگی یا نہیں یہ دیکھنے کی بات ہے۔ خبر ہے کہ سکھوں اور پست اقوام سے قطع نظر وائسرائے ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ دونوں کو دو دو ممبر نامزد کرنے کا اختیار دینے کو تیار ہیں۔ لبرل لیڈروں نے بھی اپنی کمیٹی کا خاص اجلاس کر کے اِس اعلان میں بہت سی باتوں کی کمی محسوس کی ہے۔ مگر اسوقت لبرل پارٹی کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہے۔ اُن کی پارٹی کا بھی کوئی نمایندہ وائسرائے کی کونسل میں نہ لیا جائے گا۔ اِس سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ اِسوقت مختلف فرقہ وارانہ جماعتوں سے معاملہ کرنا چاہتی ہے۔ کانگریس کے متعلق اِسوقت بقول صاحب وزیر ہند برٹش گورنمنٹ مزید گفتگو کے لئے کوئی نیا ذریعہ یا طریقہ ڈھونڈھنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

مختلف صوبوں میں کانگریس کے خاص خاص کارکنوں کی گرفتاری کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ کانگریس سیوادل کے والنٹیروں کی پریڈ کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ میں بھی گرفتاریاں جاری ہوگئی ہیں۔ اِسوقت تک صوبہ متحدہ میں تین چار سو آدمی گرفتار ہو چکے ہیں۔ یہی حال دوسرے صوبوں کا ہے۔ کانگریسی لیڈران عجب مخمصے میں ہیں کیونکہ دل سے وہ ہٹلر شاہی کے مخالف ہیں۔ لیکن برٹش گورنمنٹ نے اُن کے تعاون کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ورنہ برطانیہ کی ہندوستانی پالیسی میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی۔ اور باہمی اختلافات سے فائدہ اُٹھانے کی روش قائم نہ رہتی۔ مرکز میں نیشنل گورنمنٹ قائم کرنیکی جو تجویز کانگریس نے پیش کی تھی وہ ایک بہترین تجویز تھی۔ لیکن برٹش گورنمنٹ کو اس جنگ میں اپنی قوت پر پُورا بھروسہ ہے۔ امریکہ سے بھی اُسے بیدریغ امداد مل رہی ہے اِس لئے اِسوقت اہل ہند کو فوری طور پر راضی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہماری اخلاقی کمزوری اور نا اتفاقی ایک مرتبہ پھر ملک کی آئینی ترقی کی سدراہ ہوئی۔ یہ ایک دلشکن حقیقت ہے۔ لیکن یہ بات بھی غور طلب ہے کہ برطانیہ کا امپیریلزم نازیت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کانگریس کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور اگر کوئی باعزت سمجھوتہ ہو سکے تو کر لینا چاہئے۔ مصیبت یہ ہے کہ اُس کے کتابی اصول و فلسفہ اسے دب کر معاملہ کرنے نہیں دیتے۔ تاہم کانگریس کے حامی اپنے اصولوں کی خاطر ہر وقت تکلیف و

نوٹ :- موسم برسات کی رعایت سے ہم اِس نمبر میں ملار راگ کی ایک رنگین تصویر ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں جو اس ماہ کی موسیقی نظم کے ساتھ عام پسند ہو جائے۔

جلد ۷۵ — ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء — نمبر ۳

کون سی راہ؟

(ایک حقیقت پرست کے قلم سے)

"ہم اِنسان ہیں اور ہمیں انسان کی طرح زندہ رہنا چاہیئے"

یہ سوال کم وبیش ہر انسانی دماغ میں پیدا ہوتا ہے، اور ہر شخص اپنی قوتِ فکر کے مطابق اِس مسئلے پر سوچتا بھی ضرور ہے۔ اسی خیال نے دنیا میں بہت سے مذاہب اور بہت سے فلسفے پیدا کئے ہیں۔ لیکن اس مقصدِ عظیم کو کن ذرائع سے حاصل کیا جا سکتا ہے' اسے ہر دماغ نہیں سوچ سکتا، جنھوں نے سوچا اور ایک لائحہ عمل دنیا کے سامنے پیش کیا وہ مذاہب کے بانی ہوئے' اُن کا فلسفۂ زندگی زندہ ہے، لیکن جن لوگوں نے سوچا اور اُسے کتابوں تک چھوڑ گئے وہ فلسفی ہیں۔ ایک فلسفی اور پیغمبر میں یہی فرق ہوتا ہے کہ پیغمبر دنیا کے سامنے اپنی تعلیمات کا نمونہ پیش کرتا ہے' اُس کی اشاعت کے لئے صعوبتیں اٹھاتا ہے' مصیبتیں جھیلتا ہے' لیکن انسانی دل ودماغ کا تعاقب نہیں چھوڑتا۔ مگر فلسفی میدان جنگ سے بھاگے ہوئے سپاہی کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ سوال آج بھی ہمارے سامنے اُسی طرح تازہ ہے جس طرح آج سے چھ ہزار سال پہلے تھا، بلکہ حالات نے اِس میں اور بھی شدّت پیدا کر دی ہے، اس لئے آج اس اہم مسئلے کو حل کرنے میں ہر بہتر دماغ اُلجھا ہوا ہے، اور جب تک یہ گُتھی سُلجھ نہ جائے گی اسی طرح اُلجھا رہے گا۔

ہم بھی اپنی فکر کے مطابق سوچتے ہیں، لیکن سوچتے وقت ہمارا دماغ بہت سی پابندیوں میں جکڑا ہوتا ہے اِن پابندیوں میں سب سے بڑی پابندی روایات کی ہے' ہمیں زندہ رہنے کے لئے ابتک یہی نسخہ بتایا جاتا ہے'

کہ ہم اپنی قومی روایات کو فراموش نہ کریں، بلکہ ان کو ہمیشہ زندہ اور باقی رکھیں کیونکہ یہی ہماری زندگی کی بنیاد ہیں۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ ہماری ذہنی غلامی ہے جو ہمیں اپنے فرسودہ ماحول سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور ہم اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لئے کوئی نیا ذریعہ نہیں نکال سکتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ہم آج سے سیکڑوں سال پہلے تھے وہیں اب بھی ہیں۔ بہرحال یہ سوال اُس وقت جس قدر اہم تھا آج اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

لیکن یہ نسخہ جذباتی ہے جس میں دماغ سے کام لینے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جہاں روایات کو زندہ اور باقی رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترقی کرو اور جہاں تک ممکن ہو ترقی کرتے جاؤ، حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر ہم موجودہ حالت سے ترقی کرنا چاہیں گے تو پھر آج کی حالت خود بخود مٹ جائیگی، اور جب یہ مٹ جائیگی تو پھر اس کو زندہ رکھنے کا کیا سوال رہتا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ماضی اور حال میں ہمیشہ ایک قدرتی سلسلہ باقی رہتا ہے جسے ہم توڑنا بھی چاہیں تو نہیں توڑ سکتے۔ وہ ہماری زندگی کے ساتھ زندہ اور موت کے ساتھ مردہ ہو جائیگا۔

انسانی ارتقا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جیسے جیسے انسان ارتقا کی منزلیں طے کرتا گیا ہے اپنی قدیم روایتوں کو غیر شعوری طور پر چھوڑتا بلکہ ٹھکراتا گیا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ارتقا کے دوران میں جو نتیجہ نکلتا گیا ہے اُسے انسان قبول کرتا چلا گیا ہے۔ لیکن دنیا کی موجودہ حالت کا تقاضا ہے کہ انسان کا ہر فعل شعوری ہو تاہم ترک و قبول کا غیر شعوری سلسلہ جاری ہے، جہاں شعور بیدار ہو جاتا ہے وہاں اپنے طرز عمل کی صحت یا غلطی کا احساس ہوتا ہے، ورنہ ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی اور قدرتی مطالبات خود بخود پورے ہوتے جاتے ہیں، اس لئے روایتوں کو باقی اور زندہ رکھنے کی ہدایت پر عمل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو ترک کریں یا اس کا بدل حاصل کرنے کی کوشش کریں تو غور و فکر کے بعد ہی کریں۔

مسولینی جس کا فسطائی نظام دنیا کیلئے عذاب عظیم کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اپنی کتاب Fascism میں ایک جگہ پتے کی بات کہہ گیا ہے

Life is concieved as a struggle in which a man is bound to win for himself a really worth y place, first of all by filling himself physically, morally and intlectually, and to have the necessary qualities for winning it. As it is for the individual, so it is for the Nation, and for all mankind.

"(یعنی) زندگی ایک ایسی جد و جہد تصوّر کی گئی ہے جس میں انسان کے لئے یقینی طور پر اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہئے
"مگر اس کے لئے اُسے سب سے پہلے تمام ضروری اوصاف کو حاصل کر کے خود کو جسمانی، اخلاقی اور ذہنی حیثیت سے
"اِسکے لائق بنانا ہوگا اور جس طرح یہ بات ایک فرد واحد کے لئے لابدی ہے اسی طرح پوری قوم بلکہ تمام بنی نوع انسان کیلئے بھی ضروری ہے

یہ ایک حقیقت ہے جس سے آنکھیں موڑ کر شاید تھوڑی دیر کے واسطے کچھ سکون کا سامان حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن کوئی مستقل فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ دنیا کے سارے فلسفیوں نے زندگی کو ایک جد وجہد، اور دنیا کو اس جد وجہد کا ایک میدان قرار دیا ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ حتیٰ کہ وہ مذاہب بھی جو بنیادی طور پر خود فراموشی کی تعلیم دیتے ہیں، اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جد وجہد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ خود کو فراموش کرنے کے لئے بھی ایک مستقل جد وجہد کی ضرورت ہے۔ کوئی شخص مستقل جد وجہد کے بغیر نہ خود کو اور نہ دنیا ہی کو بھول سکتا ہے۔ اس کے لئے بھی بعض "فطری صلاحیتوں اور طاقتوں" سے جنگ کی ضرورت ہے۔ جب خود فراموشی کے لئے اس قدر جد وجہد کی ضرورت ہے اُن مذاہب کا تذکرہ ہی فضول ہے جو "خود شناسی" کی تعلیم دیتے ہیں۔ اُن کے فلسفہ کے مطابق زندگی ایک مستقل جد وجہد کی دوسری صورت ہے۔

لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان جب ارتقا کی ابتدائی منازل میں تھا اور اُس کی بہت سی قوتیں بیدار نہ ہو پائی تھیں تو اس میں خود فراموشی کا جذبہ زیادہ تھا لیکن جیوں جیوں وہ ترقی کرتا گیا فطری صلاحیتوں اور طاقتوں سے کام لے کر حقیقتوں کو جانتا گیا، خود فراموشی کا جذبہ کم اور خود شناسی کا زیادہ ہوتا گیا۔ اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل خود مذہب کا وجود ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ اب بھی دنیا میں بعض ایسی قومیں موجود ہیں جو جسمانی طور پر تو مکمل انسان ہیں، لیکن اُن کی ذہنی اور دماغی صلاحیتیں وہی ہیں جو اُن کے آبا و اجداد کی تھیں اُن کے عادات و اخلاق، اُن کے رسم و رواج اور مذہبی خیالات وغیرہ آج بھی وہی ہیں جو دو ہزار سال پہلے تھے، چنانچہ آج اُن کی زندگیاں ایک مستقل بیچارگی کا نمونہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم نے تو بہت زیادہ اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لیا ہے تاہم ہماری بیچارگی کا وہی عالم ہے، پھر ہم کہاں ہیں؟

اس کا جواب بالکل صاف ہے، ہم بھی ابھی تک ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ جب ہمیں ضروریات زمانہ مجبور کرتے ہیں تو دماغ پر زور دے کر اپنے حالات میں سُدھار کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ ہم بھی کسی نئی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتک ہمارے تمام شعبۂ زندگی پر فرسودہ خیالات حاوی ہیں۔ اور ہم قدیم رعایات کو زندہ رکھنے کی کوشش میں ان تمام خیالات کی بھی حفاظت کر رہے ہیں۔ جو آج کی زندگی میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات ہماری قومی زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمیں کیا ہونا اور کیا کرنا چاہیئے؟

اتنا کہہ دینا تو آسان ہے کہ ہم انسان ہیں، ارتقا کی منزلیں طے کر رہے ہیں، اور ہمیں ایک دن "مکمل انسان" بننا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم مقصد کے حاصل کرنے کو ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ دنیا کے بہترین دماغ اس سوال کا جواب دینے میں مشغول ہیں۔ اور جب تک دنیا قائم ہے مشغول رہیں گے۔ در اصل جیسے جیسے حالات بدلتے جائیں گے اُسی لحاظ سے اس سوال کا جواب بھی بدلتا جائے گا۔

جن حالات میں ہم آج زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں ان سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کا کوئی صحیح تصور ہی نہیں مکمل انسان کو کیا ہونا چاہیئے اس کا تصور ہمارے دماغوں سے بہت دُور ہے۔ اسی لئے یہ سارا اضطراب اور بدحالی ہے، اگر ہم مکمل انسانیت کا تصور قائم کر لیں، (خواہ وہ تصور کیسا ہی نامکمل ہو) تو بھی یہ مشکل کچھ آسان ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ذرائع نئے دریافت کرنے کی صورتیں نکل سکتی ہیں۔ لیکن ہم زمین پر رہ کر آسمانوں کی سیر کرنے کے عادی ہیں، روایتوں کے غلام ہیں زمین کے پھولوں اور کانٹوں سے زیادہ آسمان کے ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں اور لطف اُٹھاتے ہیں حالانکہ ہزاروں سال سے ہم ان ستاروں کو دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی روشنی میں ہم ابتک کوئی راستہ تلاش نہ کر سکے۔

آسمان اور ستارے محض تمثیلی طور پر گفتگو میں آ گئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تلخ حقیقتوں کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے، بلکہ ہر قسم کی تلخی سے قلب و دماغ کو محفوظ رکھنے کے لئے شاعرانہ تلمیحات سے لُطف اُٹھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حقیقتیں دل اور دماغ کو ٹھوکر لگاتی ہیں، اور سُہانے تصورات سے دلوں کو گُدگُدایا کرتی ہیں۔ حقیقتوں کی تلخی سے بچنے کے لئے جن شاعرانہ خیالات سے ہم نے مدد لی ہے اُس کا نام ہم نے "روحانیت" رکھ کر اُسے ماورائے عام عقل انسانی بھی قرار دے دیا ہے، تاکہ جن لوگوں کو اس شاعرانہ تخیل سے لطف نہ آئے اُن کو معمولی دل و دماغ کا آدمی کہہ کر خاموش کر دیا جائے۔ جب کبھی ہم زندگی کی جدوجہد سے بھاگنا چاہتے ہیں تو اسی "روحانیت" کے خوشنما اور سدا بہار محل میں بھاگ کر پناہ لیتے ہیں۔ اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم ایک مستحکم قلعے میں آ گئے جہاں حوادث زندگی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام کو اس خود فراموشی اور روحانیت کا درس حکمراں طبقوں کے زیر اثر مذہبی بزرگوں نے اس لئے دیا تھا کہ وہ صاحب اختیار لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکیں بلکہ اپنی حالت پر قانع رہیں۔

یہاں پر ایک اور سوال بھی کیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخر ایسے لوگ مطمئن کس طرح

ہو جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب دل و دماغ کسی چیز کو قبول کر لیتا ہے تو اُس سے کسی قدر لُطف بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہم روزانہ سیکڑوں دیوانوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی حالت پر قطعی مطمئن ہوتے ہیں، اُنھیں کوئی ایک تصور اتنا زیادہ محو کئے رکھتا ہے کہ اُن کو کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔ جب انسانی تصور ایک مستقل شکل اختیار کر لیتا ہے تو ساری زندگی اسی نقطہ میں جذب ہو جاتی ہے، مگر یہ چیز ایسی نہیں جس کو قبول کر کے ہم انسانی جدوجہد سے باز آجائیں۔ بفرض محال اگر اس طرح چند آدمیوں کو سکون قلب بھی حاصل ہو جائے تو اُسے ساری انسانیت کے لئے مستقل پیغام سمجھنا سراسر غلطی ہے۔ درحقیقت یہ نسخہ اب بہت پُرانا ہو چکا، بار بار اور مختلف طریقوں سے آزمایا جا چکا، لیکن انسانیت کو اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہونچا۔

اِس لئے ہمیں دینی دُنیوی ضروریات کو مدِّ نظر رکھ کر کوئی ایسا نسخہ تجویز کرنا چاہیئے جس سے کُچلی ہوئی انسانیت تازہ دم ہو کر ترقی کے راستے پر آگے بڑھتی چلے۔ یہ نسخہ ایسا ہونا چاہیئے جسے معمولی سے معمولی آدمی بھی استعمال کر سکے کیونکہ کوئی ایسا نسخہ مرتب کرنا بیکار ہوگا، جس کو حاصل کرنے کے لئے انسانیت سے ماورائے تخیلی منزلیں طے کرنی پڑیں۔

اگر واقعی ہم اس منزل کو آسان کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی پہلی فرصت میں اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے۔ اور اس فلسفۂ روحانیت کو چھوڑ کر اُن فلسفوں کا جائزہ لینا چاہیئے جن کی بنیاد روحانیت کی ضد یعنی "مادیت" پر قائم ہے یہ "روحانیت" کی ناکامی اور "مادّیت" کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ "روح" کی ترقی کا تو نشان نہیں ملتا مگر مادّے کی ترقی کا ساری دنیا میں ثبوت مل رہا ہے۔ دنیا نے اب تک جو کچھ جدوجہد کی ہے وہ مادّی ہی تھی اور رہے اِسی میں دنیا نے ترقی حاصل کی اور کر رہی ہے۔ انسان ہر روز فطرت کی کسی نہ کسی نامعلوم طاقت کو مسخر کر کے اپنی فوقیت کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ آج انسان جو کچھ کر رہا ہے، اُس کا خیال بھی اگر دو سو برس پہلے کوئی شخص ظاہر کرتا تو لوگ اُسے پاگل سمجھتے۔ لیکن آج انسان فطرت پر فتح پر فتح حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اور یہ ساری فتوحات مادّی ہیں۔

اِس سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ دنیوی ترقی کے لئے اگر کسی نئے نظام تمدن کی بنیاد کسی فلسفہ پر رکھی جا سکتی ہے تو وہ مادّیت کا فلسفہ ہے، اس لئے ہمیں اپنی مادّی طاقتوں کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا اور مادّیت کی بنیاد پر زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اسی طرح ہم دنیا میں بحیثیت انسان کامیاب و کامراں ہو سکتے ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ اس کی تکمیل میں ہزاروں دقتیں پہاڑ بن کر ہمارے سامنے آئیں گی، لیکن اس سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے، کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان مکمل انسان بن سکتا ہے۔ غرض یہ بات بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ اس دنیا کو حقیقی بہشت بنالیں یا بہشت کے خیالی تصور میں اس کو جہنم بنا ڈالیں۔

پینتیس ۳۵ سال پہلے

زمانہ بابت ستمبر ۱۹۰۵ء میں "راجہ رام موہن رائے" پر منشی سورج نراین صاحب مہر دہلوی مرحوم کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا جس میں فاضل مضمون نگار نے راجہ رام موہن رائے کو کبیر، نانک، چینبہ مہاپربھو وغیرہ ہندوستان کے باکمال بزرگوں میں شمار کیا ہے۔

راجہ رام موہن رائے نو سال کی عمر تک مکتب میں فارسی پڑھتے رہے، پھر تحصیل عربی کے لئے پٹنہ گئے، وہاں قرآن اقلیدس، تصوف اور ارسطو کی تصانیف پڑھیں، حافظ اور مولوی معنوی کا کلام مطالعہ کیا۔ بارہ برس کی عمر میں سنسکرت پڑھنے کیلئے بنارس گئے اور عموماً تمام شاستروں اور خصوصاً ویدانت کو پڑھا۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے کا قد پورا چھ فٹ کا تھا، سر بڑا بدن توانا اور جسیم اور رنگ کچھ زردی لئے وجیہ آدمی تھے۔ آنکھوں سے جلال اور رعب برستا تھا۔ مگر جب آپ باتیں کرتے تھے یا اخلاق و مذہب کی باتیں تو اُن سے نرمی، رحمدلی اور اندرونی مہربانی عجیب انداز سے ترشح ہوتی تھی اُن کو دیکھکر ہر شخص کو یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ خوراک کا یہ حال تھا کہ پچاس پچاس آم بارہ بارہ سیر دودھ ایک ایک سموچے بکرے کا گوشت نارجیون کا گچھے کا گچھا ایک ایک دن میں ہضم کر جاتے تھے۔ آنھوں نے بلا کا حافظہ پایا تھا جسکو ایک مرتبہ دیکھ لیتے پھر نہیں بھولتے تھے۔ اُن کی جزو رسی باریک بینی اور دُور اندیشی مشہور عام تھی، لوگ قانونی معاملات میں اُن سے صلاح لینے آیا کرتے تھے... جو پولیٹکل پروگرام اُنھوں نے سوچا تھا تقریباً ایک صدی بعد نیشنل کانگریس نے اُسی کو قبول کیا۔

وہ اپنی دھن کے پکّے اور ارادے کے پُورے تھے، اُنکا دل و زبان اور عمل یکساں تھا۔ وہ خوف کا نام نہ جانتے تھے، ہر کام بیباکانہ اور دلیرانہ کرتے تھے۔ ان کمالات پر مزاج بہت سادہ اور تکلف و تصنع سے بری تھا۔ عورتوں کی تہ دل سے تکریم کرتے تھے۔ آپ بیٹھے ہوتے تو کسی عورت کا کھڑے ہونا گوارا نہ کرتے تھے، بچوں کے عاشق تھے، گھر میں ایک جھولا پڑا تھا جسمیں محلّے کے لڑکے آکر کھیلا کرتے تھے۔ آپ اُنھیں جھلاتے اور پھر خود اُسمیں بیٹھتے کہ اب میری باری ہے تم مجھے جھلاؤ۔ نوکروں اور مزارعوں سے حق سلوک سے پیش آتے تھے اور وہ بھی اُن پر فدا تھے۔ وہ اپنی ذات پر تکلیف گوارا کرتے لیکن اپنے باعث دوسروں کو تکلیف دینا پسند نہ کرتے۔ ان کی ساری کمائی خیرات کے کاموں میں صرف ہوئی۔ ۲۷ ستمبر اُنکی وفات کی تاریخ ہے، چنانچہ اُنکی پاکیزہ زندگی کی یادگار میں اس تاریخ کو ابھی تک ملک کے ہر حصے میں جلسے ہوتے ہیں۔

سکون

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔اے، ایل ایل۔بی۔ شاہجہانپوری)

اے سکوں راحت میں ہر تو یا غمِ پنہاں میں ہے
خندۂ گلبن میں ہے یا گریۂ شبنم میں ہے
تیری فرقت غم فزائے خاطرِ رنجور ہے
آہ تو اقصائے عالم میں کہاں مستور ہے؟
انجمن آرا ہے تو قصرِ شبِ خاموش میں
یا ترے جلوے ہیں قصاں صبح کے آغوش میں
حسن کی محفل میں تو مصروفِ ناؤنوش ہے
یا غمِ اُلفت کی جانکاہی میں تو روپوش ہے
جستجو تیری کروں ہنگامۂ گلزار میں
یا تجھے ڈھونڈوں سکوتِ دامنِ کہسار میں؟

آہ تو گہوارۂ طفلی میں تھا سرمستِ خواب
تیری جولانگاہ تھا شاید خمستانِ شباب
گو تغیّر آفریں نیرنگیِ ایام ہے
یہ گماں بھی اِک فریبِ خاطرِ ناکام ہے
زیست جب دشوار ہوتی ہے غمِ جانسوز سے
دوش کو بہتر سمجھتا ہے بشر امروز سے

جی نہیں لگتا ہے میرا عالمِ ایجاد میں
مضطرب رہتا ہوں اِس کنجِ خراب آباد میں
باعثِ آلام ہے ہنگامۂ محفل مجھے
کر دیا بارِ علائق نے پریشاں دل مجھے
قلب کے جذبات میں افسردگی پاتا ہوں میں
شاہدِ گل سے چمن زاروں میں شرماتا ہوں میں
خوں رُلاتا ہے مجھے نظارۂ گلزار بھی
کاہشِ جاں ہے فضائے وادیِ پُرخار بھی
دن کی شورش کو بھی میں تسکیں فزا پاتا نہیں
شب کی خاموشی میں بھی مجھکو قرار آتا نہیں

راحت و آلام سے نالاں دلِ دلگیر ہے
طبعِ نازک پر گراں نیرنگیِ تقدیر ہے
یا سکوں مفقود یکسر محفلِ قدرت میں ہے
یا سکوں ناآشنا رہنا مری قسمت میں ہے
خوش کسی تدبیر سے قلبِ حزیں ہوتا نہیں
ہے سکوں بھی کوئی شئے اسکا یقیں ہوتا نہیں

قلبِ مضطر سے یہ کہتی ہے تمنائے سکوں
جلوہ گر ہے موت کے محمل میں لیلائے سکوں

جی میں آتا ہے بنائے زندگی ویراں کروں
نقد کونین یہ لیکن کس طرح قرباں کروں؟

گو بظاہر خفتگانِ خاک محوِ خواب ہیں
کیا خبر آسودۂ تربت ہیں یا بیتاب ہیں

آہ جامِ نیستی میں بھی ہے شاید دُردِ غم
خالی از علت نہیں خاموشیِ اہلِ عدم

ہم نشیں! طرفہ گرفتارِ غمِ دنیا ہوں میں
زیست سے بیزار ہوں مرنے سے بھی ڈرتا ہوں میں

آؤ میخانہ میں طوفِ ساغر و مینا کریں
گو سکوں مفقود ہے لیکن اُسے پیدا کریں

اس قدر پی لیں کہ عقلِ نکتہ چیں مدہوش ہو
خواہشِ تسکیں بھی غرقِ بادۂ سرجوش ہو

دل کے ہر گوشے میں ہو طغیانیِ کیفِ شراب
اور اس کی رَو میں بہہ جائیں سکون و اضطراب

ہوش کے ہمراہ احساسِ غمِ ہستی بھی ہے
دونوں عالم سے جدا اِک عالمِ مستی بھی ہے

یہ وہ عالم ہے جہاں رنج و خوشی مفقود ہیں
کشمکشہائے حیات و مرگ بھی نابود ہیں

آہ کیا اعجازِ کیفِ بادۂ گلفام ہے
تابعِ فرمانِ رنداں گردشِ ایام ہے

جذباتِ حسرت

(مولنا حسرت موہانی)

مداوائے دلِ دیوانہ کرلتے
یہ کرتے ہم تو کچھ اچھا نہ کرتے

وفا صادق اگر ہوتی ہماری
وہ کرتے بھی تو جور اتنا نہ کرتے

ہم اچھا تھا جو بھر پردہ پوشی
محبت کا تری چرچا نہ کرتے

تمہاری فتنہ پردازی کا شکوا
جو ہم کرتے تو کچھ بیجا نہ کرتے

نگاہیں عاشقوں کی تھیں ہوس کار
وہ کیا کرلتے اگر پردا نہ کرتے

جو پھر ملنے کی ہوتی کچھ بھی اُمید
تو ہم اس کے لئے کیا کیا نہ کرتے

طلب کا حوصلہ ہوتا تو اِک دن
خطاب اُس بت سے بے باکانہ کرتے

ہمارا پاس انھیں کچھ بھی جو ہوتا
کسی کی اور ہم پردا نہ کرتے

شکیبائی کا دم رکھتے تو حسرت
اُنھیں یوں شوق سے دیکھا نہ کرتے

ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ

از مسٹر محمد یونس ایم۔اے

دُنیا میں مختلف معاشرتیں پائی جاتی ہیں۔ہر ایک کے رسم و رواج اور دستور ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔اِس اختلاف کی بڑی وجہ آب و ہوا اور دوسری جغرافیائی باتوں کا مختلف ہونا ہے۔ہندوستان کی بھی ایک معاشرت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے۔یہاں کی معاشرت نے اِنسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک خارجی زندگی دوسری داخلی زندگی۔خارجی زندگی میں تلاشِ روزگار، تجارت، سرکاری و غیر سرکاری ملازمتیں، پولیس، فوج وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔داخلی زندگی کے دائرہ میں بچّوں کی پرورش، گھر کا انتظام، سینا پرونا وغیرہ وغیرہ آتا ہے۔اِس تہذیب کے مطابق خارجی زندگی میں مرد حصہ لیتے ہیں۔داخلی زندگی عورتوں کے ذمہ ہے۔اِس تقسیم عمل نے نہ صرف مرد اور عورت کی زندگی میں ایک رشتۂ محبت و رابطہ اتحاد قائم کر دیا تھا۔بلکہ زندگی کو زیادہ پُرلطف بنا دیا تھا۔

دوسری طرف ہم یوروپ کی موجودہ زندگی دیکھتے ہیں۔جس کا مقصد یہ ہے کہ عورت اور مرد کی زندگی میں کوئی تقسیم عمل یا تخصیص نہ کیجائے۔بلکہ جو کام مرد کر سکتا ہے وہی نہایت آزادی سے عورتیں بھی کریں، اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ یوروپ کے اکثر ملکوں میں عورتیں باقاعدہ حیثیت سے مردوں کے دوش بدوش کام کرتی نظر آتی ہیں۔

جیسے ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان یوروپ کی تہذیب کے بڑی جلدی دلدادہ ہوگئے تھے۔آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری وہ تعلیم یافتہ بہنیں بھی جنھوں نے میٹرک یا ایف۔اے، بی۔اے پاس کرلیا ہے اُسی تہذیب کی نہ صرف نقل کر رہی ہیں بلکہ ہندی تقسیم عمل کی زندگی کو دُور کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں

بیشتر اس کے کہ ہم اس چیز کا ذرا غور سے مطالعہ کریں۔آیئے دیکھیں کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے؟ عورتوں کا یہ کہنا کہ ہم کو ملازمتوں میں، اسمبلیوں میں جگہ دو، کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ دُنیا میں مرد عورت کو ساتھ ملکر رہنا ہے۔دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔قدرت ہی نے دونوں کو بعض باتوں میں ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔لہذا دونوں کی زندگی کا مقصد

زیادہ سے زیادہ خوشی، محبت اور باہمی اعتماد حاصل کرنا ہونا چاہئے۔ یہ کہنا کہ مرد کو یہ چیز حاصل ہے، تو عورتوں کو بھی وہی چیز ضرور ملنا چاہئے، بالکل غلط ہے۔ درحقیقت عورت اور مرد کی زندگی کو ایک زندگی سمجھنا چاہئے۔ دونوں کے کام علیحدہ علیحدہ ہوں لیکن مفاد علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اگر مرد خوش ہے اور عورت ناراض یا عورت خوش ہے اور مرد ناراض تو یہ کوئی کامیاب زندگی نہیں ہے۔ اگر دونوں خوش ہیں اور دونوں کو ایک دوسرے کا اعتماد حاصل ہے اور دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں تو یقیناً یہ کامیاب زندگی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ آپس کا پیار محبت، باہمی اعتماد اور خوشی تقسیم عمل کی تہذیب میں زیادہ حاصل ہوتی ہے یا غیر تقسیم عمل کی زندگی میں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں یہ چیزیں، تقسیم عمل کی زندگی ہی میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اسی زندگی میں قدرتی طور پر مرد عورت کو اور عورت مرد کو اپنا غیر منقطع ساتھی اور مددگار سمجھتی ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی پوری پروا ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف غیر تقسیم عمل کی زندگی میں مرد عورت ایک دوسرے کو معاون نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اقتصادی طور پر وہ بڑی حد تک ایک دوسرے سے آزاد ہوتے ہیں۔ انمیں رشتہ اور جوڑ کی کڑی زیادہ مضبوط نہیں ہوتی۔ ایک کو دوسرے پر پورا پورا اعتماد نہیں ہوتا۔ کیونکہ مرد کو نہیں معلوم کہ میری عورت کے کیا خیالات ہیں اور اسی طرح عورت کو نہیں معلوم کہ میرے مرد کے کیا خیالات ہیں؟ غرض تقسیم عمل کی زندگی میں مرد اور عورت کو زیادہ سے زیادہ باہمی اعتماد، محبت اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر میں دو باتوں کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کو رفع کر دینا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ یورپ میں غیر تقسیم عمل یا آزاد زندگی بہت کامیاب رہی۔ اسکے متعلق میں یہ عرض کرونگا کہ دور کے ڈھول سہاون معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کو گہری تحقیق کئے بغیر یورپ کی خانگی زندگی کے متعلق اپنی رائے قائم نہ کرنا چاہئے۔ ہم روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ یورپ کے فلاں فلاں ملک میں عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں۔ سوک گارڈ کے لئے اپنے آپ کو پیش کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بے شک یہ سب باتیں بہت اچھی ہیں۔ لیکن ان ہنگامی چیزوں سے ہم کو غیر تقسیم عمل کی تہذیب کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اس تہذیب کے نقصانات معلوم کرنے کے لئے زمانہ امن کے معمولی اور روزمرہ کے واقعات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ وہاں آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی خانگی زندگی بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کیا آپ کے یوروپین ملکوں کے آئے دن کے طلاق کے قصے نہیں سُنے؟ آپ وہاں کے مرد اور عورتوں کی زندگی کے پورے ریکارڈ پڑھئے، تو معلوم ہوگا کہ اس غیر تقسیم عمل کی زندگی نے انہیں کیسے کیسے روحانی اور جسمانی روگ پیدا کر دیئے ہیں۔ وہ تو کہئے کہ چونکہ وہاں عوام کی حالت یہاں سے بہت اچھی ہے۔ دوسرے سائنس نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔ اِس لئے ان روگوں کا کچھ

تدراک ہوجاتا ہے اور ہم کو اُن کی بھیانک صورت نظر نہیں آتی ہے۔

لیکن یوروپ کی مثال ہی کیوں دی جائے ؟ یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم بلا سوچے سمجھے اور بلا حالات کا مطالعہ کئے اور آب وہوا اور اقتصادی حالت کا اندازہ لگائے بغیر یوروپ کی غیر تقسیم عمل کی تہذیب کو یہاں چیپاں کرنا چاہتے ہیں۔ اور تہذیب بھی وہ جو اُن ملکوں کے مالدار طبقے اور اونچے درجہ کے لوگوں کی ہے۔ کیونکہ اُنھیں کے حالات اخباروں وغیرہ کے ذریعہ سے ہم تک پہونچتے ہیں۔ بہرحال کیا واقعی آپ کو پورا یقین ہے کہ وہاں کے عوام اور متوسط درجہ کے لوگ بھی ایسی ہی آزاد اور غیر تقسیم عمل کی زندگی بسر کرتے ہیں ؟ مثلاً غیر ممالک کے مالدار طبقوں میں مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے کاروبار میں لگے رہتے ہیں اور اُن کے بچوں کی پرورش کسی پرورش گاہ یا اسکول میں ہوجاتی ہے۔ وہ اس کے اخراجات کو کچھ تو خود برداشت کرتے ہیں اور کچھ اُن کی حکومت برداشت کرتی ہے۔ مگر کیا ہندوستان کے لوگ بھی اس قسم کی پرورش گاہوں کے اخراجات برداشت کرسکتے ہیں ؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے مقابلے میں یہاں اسکی چوتھائی آمدنی بھی نہیں ہے۔

ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں بھی لوگ اتنے ہی مالدار ہوجائیں تو یہ اخراجات بخوشی برداشت کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ یقیناً اتنے مالدار نہیں ہوسکتے۔ اور شاید اب یوروپ کے لوگ بھی اتنے مالدار نہیں ہوسکتے۔ وہ وقت نکل گیا۔ آخر یوروپ کی عورتیں تجارت اور صنعتوں میں مردوں کے دوش بدوش کیوں آئیں ؟ بات یہ ہے کہ انیسویں[۱۹] اور بیسویں[۲۰] صدی میں یوروپ کے اکثر ملکوں نے سائنس میں بڑی ترقی کی اور ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ کے لوگوں کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اور وہاں اپنے کارخانوں کا بنایا ہوا مال بھیجنے لگے۔ مال کی مانگ بڑھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کو فروغ ہوا۔ مرد کافی نہ تھے۔ لہٰذا عورتوں کو بھی کارخانوں میں شامل کرنا پڑا۔ پھر ان ملکوں کو یہ توقعات ہوئیں کہ آیندہ بھی ہمارے مال کی مانگ بڑھتی رہے گی۔ اور ہم اسی طرح اجارہ دار بنے رہیں گے۔ لیکن آج دُنیا میں کیا ہورہا ہے۔ ہر ملک اقتصادی طور پر دوسرے تمام ملکوں سے آزاد ہونے کی فکر کررہا ہے چاروں طرف اقتصادی قومیت کا نعرہ بلند ہورہا ہے۔ یوروپ کے بڑے بڑے ملکوں کے ہاتھ سے بیرونی منڈیاں نکل رہی ہیں اور دوسرے ملک ان منڈیوں کو حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کررہے ہیں۔ یہی کشمکش اس خوفناک جنگ کا اصلی سبب ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئیے کہ پرانی منڈیاں اب کسی کو نہیں ملیں گی۔ اور اس جنگ کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یوروپ کے ملکوں کی بیرونی تجارت کم ہوجائے گی اکثر کارخانے بند اور لوگ بیکار ہوجائیں گے۔ اب خواہ خاوند بیکار ہو اور عورت کام سے لگی رہے، خواہ خاوند کام سے لگا رہے اور عورت بیکار ہوجائے۔ ایک نہ ایک بیکار ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہ

نہیں ہو سکتا کہ دونوں کام سے لگے رہیں۔

کیا ایسی حالت میں جب دُنیا کا نقشہ اسقدر بدل گیا ہو آپ اسی راستہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے خود وہاں کے لوگ حالات سے مجبور ہوکر پھر رہے ہیں؟ موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت دو چیزوں میں ربط یا Coordination. پیدا کرنا ہے۔

ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں ہندوستانی سوسائٹی کو نقائص سے بالکل پاک اور بَری سمجھتا ہوں۔ یقیناً یہاں کی تہذیب میں نقائص ہیں اور اُن نقائص کو مردوں عورتوں دونوں کو ملکر دُور کرنا چاہئے۔ لیکن اگر نقائص کو دُور کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عورت اور مرد کو اقتصادی حیثیت سے آزاد کیا جائے اور دونوں میں صرف برائے نام رشتہ باقی رکھا جائے جو ہر وقت توڑا جا سکتا ہے۔ تو یہ سخت غلطی ہوگی۔ ہاں اگر نقائص کو دُور کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عورت اور مرد کی مشترکہ زندگی زیادہ محبت اور زیادہ اعتماد والی بنائی جائے تو یقیناً یہ مقصد حق بجانب ہے۔

ہندوستانی خواتین کا دوسرا اعتراض یہ ہے جس کا میں جواب دینا چاہتا ہوں کہ یہاں کے مرد عورتوں پر ظلم کرتے ہیں، ہم کو کم عقل اور کم فہم سمجھتے ہیں، اسمبلیوں میں جو قوانین بناتے ہیں۔ اُس میں عورتوں کا مطلق خیال نہیں کرتے، خود جو تعلیم حاصل کرتے ہیں عورتوں کو نہیں دلاتے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک کم عقل سمجھنے کا سوال ہے میں مردوں میں اِس نقص کی موجودگی کو مانتا ہوں۔ بیشک ہندوستان کے اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہے کہ عورتیں مردوں سے کم عقل ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے مرد اپنی عورتوں سے بہت سی باتوں میں مشورہ نہیں لیتے۔ لیکن ایسا خیال مردوں کے دماغوں میں پیدا کیوں ہوا ہے حکومت کا کوئی قانون نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ عورت کم عقل ہوتی ہے یا مرد زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ تمام مذاہب عورتوں کو پوری طور پر مرد کا شریکِ زندگی قرار دیتے ہیں۔ پھر اسکی کیا وجہ ہے؟ بات یہ ہے کہ بڑی حد تک اسمیں خود عورتوں کا قصور ہے۔ کیا ہماری عورتیں شروع ہی سے لڑکے اور لڑکی میں تفریق کرنا نہیں شروع کر دیتی ہیں؟ قدرتی طور پر بھی ماؤں کو بیٹوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بھائی بہنوں کو مارتے ہیں مگر ماں کچھ نہیں کہتی۔ ماں بیٹوں کے بہت سے کام اپنی بیٹیوں سے کراتی ہے۔ بیٹوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہناتی ہے لیکن بیٹیوں کو اُس سے گھٹیا۔ بیٹوں اور بیٹیوں کو ساتھ کھیلنے نہیں دیا جاتا۔ گھر کے بہت سے کام صرف بیٹیوں کو کرنا پڑتے ہیں وغیرہ وغیرہ

اِس برتاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے لڑکا لڑکی کے مقابلہ میں اپنی بڑائی محسوس کرنے لگتا ہے اور لڑکی قدرتی طور پر خیال کرنے لگتی ہے کہ میرا درجہ لڑکے سے کم ہے۔ یہیں سے غلطی کا بیج

بٹھا دیا جاتا ہے۔ جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو یہ خیال اُن کے دماغوں میں باقی رہتا ہے اور اسی وجہ سے مرد بلا ارادہ عورت کو کم عقل اور کم حیثیت سمجھتے ہیں۔ ہماری ماؤں کو چاہئے کہ لڑکوں لڑکیوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کریں۔ بچوں میں کسی کے دل میں بھی یہ خیال نہ پیدا ہونے دیں کہ میں دوسرے سے بڑا ہوں یا میں کسی سے کم حیثیت ہوں۔ تقسیم عمل سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی جزو کا کرنیوالا کسی دوسرے جزو کے کرنیوالے سے زیادہ عقلمند یا بلند مرتبہ خیال کیا جائے۔ درحقیقت تقسیم عمل کے خیال کو بچپن میں پیدا ہی نہ کرنا چاہئے اس کا خیال تو اُس وقت دلانا چاہئے جب بچے بالغ ہو جائیں اور اُس وقت بھی اس کا خیال اس صورت سے پیدا کرنا چاہئے کہ کوئی کسی دوسرے کے کام کو گھٹیا یا بڑھیا خیال نہ کرے۔

لیکن اس اعتراض کے دوسرے حصہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ واقعی یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مرد خود تو تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر عورتوں کو حاصل نہیں کرنے دیتے، خود اسمبلیوں وغیرہ میں جاتے ہیں۔ عورتوں کو نہیں جانے دیتے وغیرہ۔ بڑے بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ مردوں کی کچھ تعداد ضرور ہے۔ لیکن دیکھنا یہ چاہئے کہ تمام ہندوستان میں تعلیم کی کیا حالت ہے؟ اتنے وسیع ملک میں صرف چند لاکھ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ورنہ پچانوے ۹۵ فیصدی لوگ تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ اس لئے ہماری خواتین کا یہ رونا کہ مردوں کو تعلیم دی جارہی ہے ہمیں نہیں دی جاتی، بالکل فضول ہے۔ یہاں تھوڑی بہت تعلیم جو ہے وہ ایک وقتی تقاضہ کی چیز ہے۔ حکومت انگلشیہ جب ہندوستان میں قائم ہوئی تو سرکاری دفاتر کے لئے انگریزی تعلیم یافتہ آدمیوں کی ضرورت ہوئی۔ لہذا ایسی تعلیم کا انتظام کیا گیا جو کلرک پیدا کر سکے۔ لیکن کلرکوں کی مانگ کی ایک حد ہوتی ہے۔ اسی لئے حکومت اس نظام تعلیم کو بدلنے کی فکر میں ہے۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ عورتیں اُس میٹرک اور بی۔اے کی ڈگریوں کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ جس کی اب کوئی قدر باقی نہیں رہی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان کی عورتیں تعلیم حاصل نہ کریں اور جاہل رہیں۔ نہیں تعلیم ضرور حاصل کریں۔ بلکہ مردوں سے زیادہ حاصل کریں۔ لیکن ایسی تعلیم حاصل کریں جو اُن کو صحیح معنوں میں اعلیٰ ترین بیوی، بہترین ماں اور بچوں کی صحیح اتالیق و پرورش کنندہ بنائے۔ اور جس کی مدد سے وہ ملک اور قوم کے لئے بہترین فرزند پیدا کر سکیں۔ جو مرد اور عورت کی مشترکہ زندگی کو مکمل اعتماد، محبت اور پیار پر قائم کر دے۔

کیا میں اُن معزز خواتین سے جو میٹرک یا بی۔اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کی شائق ہیں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی ہندوستان کی اُن کروڑوں عورتوں کا بھی کوئی خیال کیا ہے؟ جن کے باپ، بھائی یا خاوند جاہل ہیں۔ جنھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ آپ کو تو شکر کرنا چاہئے کہ آپ کے باپ، بھائی اور خاوند تعلیم یافتہ تو ہیں۔

موجودہ تعلیم نے تعلیم یافتہ حضرات اور عوام میں ایک گہری خلیج حائل کر دی ہے۔ پھر کیا عورتیں بھی موجودہ تعلیم حاصل کر کے عورتوں میں بھی ایسی ہی گہری خلیج حائل کرنا چاہتی ہیں؟ کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ جب تک موجودہ تعلیم میں زبردست تبدیلیاں نہ ہوں گی تعلیم یافتہ طبقہ عوام سے جُدا رہے گا۔

اب رہا اسمبلیوں کے داخلہ اور قوانین بنانے کا سوال۔ اُس کے بارہ میں میری بہنوں کو سوچنا چاہئے کہ ممبرانِ اسمبلی مردوں کے کونسے حقوق کی حفاظت کر رہے ہیں؟ یوں بھی عورتوں کے علاوہ کروڑوں اچھوتوں، کسانوں اور مزدوروں کے لئے اسمبلیاں کیا کر رہی ہیں؟

درحقیقت جب تک مُلک میں قابل افراد پیدا نہ ہوں گے، اُس وقت تک ہماری حالت نہ سُدھرے گی۔ چند عورتیں جو اسمبلیوں کی ممبر ہوگئی ہیں اُنھوں نے ملک کی بھلائی کے لئے کیا خاص کام کیا ہے؛ اور سوسائٹی کے افراد میں یہ خیال ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ مرد، مرد کا پارٹ لیں اور عورت، عورت کی وکالت کرے۔

عورتوں کو ملازمتوں میں جگہ دینے کے معنی ملک میں مزید بیروزگاری پھیلانا۔ اور تقسیم دولت میں مزید عدم مساوات پیدا کرنا ہوگا۔

آخر میں میں اپنی تعلیم یافتہ بہنوں اور ماؤں سے اپیل کروں گا کہ اگر اُن کے دل میں قوم و ملک کا درد ہے اور وہ سوسائٹی کی اصلاح کرنا چاہتی ہیں تو اس خیال کو چھوڑ دیں کہ مرد اور عورت کا مفاد علیحدہ ہے۔ اور تقسیم عمل کی زندگی کو بہتر زندگی سمجھیں۔ ملازمتوں میں جانے اور تجارت اختیار کرنے کی وہ بالکل کوشش نہ کریں۔ بلکہ ان مقاصد کو دل میں رکھکر اپنی بہنوں کی حالت درست کرنیکی خدمت اپنے ذمہ لیں۔ چھوٹا سا تعلیمی کورس بنا لیجئے۔ محلوں میں جائیے اور کسی مکان میں عورتوں کو جمع کر کے تقریر و تحریر کے ذریعہ تعلیم دیجئے۔ اور اپنی بہنوں کو بچوں کی پرورش کے بہترین اصول بتائیے۔ اگر آپ یہ مہم شروع کر دیں تو یقین مانئے کہ چند ہی سال میں سوسائٹی کا نقشہ بدل جائے گا۔ اور عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کی حالت بھی سُدھر جائے گی۔ فقط۔

رُباعیاتِ جگرؔ

محفل ہے نئی، نیا ہے رنگِ محفل
عشاق نہیں ہیں اب وفا کے قائل
لیکن نہ حقیقتیں مٹی ہیں نہ مٹیں
دُنیا بدلے، بدل نہیں سکتا دل

پیدا ہے بشر غم نہانی کے لئے
کیا چاہیئے اور عمر فانی کے لئے
انجام حیات کی حقیقت معلوم
کافی ہے اُمید زندگانی کے لئے

نوائے فراق

(پروفیسر رگھوپتی سہائے ایم اے کا تازہ کلام)

کسی کا کون رہا یوں تو عمر بھر۔ پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار ادھر سے زمانہ گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

غم فراق کے کشتوں کا حشر کیا ہوگا
شب فراق تو ہو جائے گی سحر پھر بھی

خوشا اشارۂ پیہم زہے سکوت نظر
دراز ہو کے فسانہ ہے مختصر پھر بھی

کہیں یہی تو نہیں کاشف حیات و ممات
یہ حسن و عشق بظاہر ہیں بے خبر۔ پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن۔ پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکش جنت ہو۔ گھر ہے گھر پھر بھی

لٹا ہوا چمن عشق ہے۔ نگاہوں کو
دکھا گیا وہی کیا کیا گل و ثمر۔ پھر بھی

خراب ہو کے بھی سوچا کئے ترے مہجور
یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر۔ پھر بھی

جو با اثر ہے تو ہو بے اثر بھی خاک تری
وہ کیمیا ہی سہی رہ گئی کسر پھر بھی

لپٹ گیا ترا دیوانہ گرچہ منزل سے
اڑی اڑی سی ہے یہ خاک رہگذر پھر بھی

ترے خیال سے بچنے میں عمر گزری ہے
اتر گیا رگ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

جھپک چلی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

خطا معاف ترا عفو بھی ہے مثل سزا
تری سزا میں ہے اک شان درگزر پھر بھی

اگرچہ بے خودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراق کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

دیگر

ابد بھی اپنی پرچھائیں ازل بھی روشنی اپنی
محبت کو کمی کیا موت اپنی زندگی اپنی

لٹا دے اپنی ظلمت عام کر دے روشنی اپنی
لرزتی ہے دھندلکے میں فضائے زندگی اپنی

چمن کی تازگی آئینہ دار اشک شبنم ہے
جھلکتی ہے تری رنگینیوں میں سادگی اپنی

سکوت ناز میں رنگ تکلم جذب ہونے دے
نکھرنے دے ذرا شان پیام سرمدی اپنی

نسیم صبح کا دامن کہیں آلودہ ہوتا ہے؟
بچا لیتا ہے حسن نرم خو دوشیزگی اپنی

خوشا یہ جلوہ آرائی زہے یہ کفر سامانی
خوشی اپنی، غم اپنا، نور اپنا، تیرگی اپنی

نشاطِ حسن کو احساسِ خود ناآگہی کب تھا
مکمل ہو چلی شاید کہ غم شائستگی اپنی

محبت نے حصولِ زندگی کچھ اور ہی سمجھا
کہ دنیا میں نہ غم اپنا نہ دنیا میں خوشی اپنی

غمِ امروز کو وقفِ غمِ فردا کیا ناحق
وہ دنیا چیز جس کی بھی ہو، یہ دنیا تو تھی اپنی

چھپاتا جا رہا ہوں تجھ کو اپنی چشمِ حیراں سے
بڑھاتا جا رہا ہوں فرصتِ نظارگی اپنی

وفورِ زندگی بھی کارواں در کارواں نکلا
سوادِ گردِ منزل بن گئی ہے موت بھی اپنی

کرم ہو یا ستم کچھ حد بھی رکھتی ہے یہ غیریت
نہ تیری دوستی اپنی نہ تیری دشمنی اپنی

محبت نام تھا دنیا میں اک پیہم کشاکش کا
کہ اپنی زندگی بھی تھی کبھی تیری کبھی اپنی

کوئی سنتا نہیں تو بے زبانی کیا زباں بنتی
سکوتِ بےکسی نے آج کھوئی بات بھی اپنی

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اکھڑے
نفس کی موج کو دیدے ادائے کم روی اپنی

ہم اہلِ غم نے کل پہ ٹال رکھا رحمتِ حق کو
کھلے تھے خلد کے در بھی طبیعت نہ تھی اپنی

وہ راہیں چھوڑ دیں میں نے خضر جن میں بھٹکتے تھے
دلیلِ منزلِ مقصود ہے گم گشتگی اپنی

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

ذرا دیکھو تو حسن و عشق کی دنیا کہاں پہنچی
فراق اب تک لئے بیٹھے ہو آشفتہ سری اپنی

متفرقات

۱ شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

پچھلے پہر شبِ فراق کون یہ مجھ سے کہہ گیا
تیرا جواب پھر کہاں تو یہ جو درد سہہ گیا

عمرِ جاوداں تجھ پہ نثار
موت کی آنکھ میں آنکھ تو ڈال

ہم ترکِ محبت کا تم کو الزام نہیں دیتے لیکن
یہ کب سے فراق محبت سے دل اچٹا اچٹا رہنے لگا

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تکیہ چھوڑے مدت گزری
اب تو غم سجادہ نشیں ہے

کبھی برس بھی پڑے گا غمِ محبت کو
ابھی تو ابرِ سیہ کو کوہسار ہونے دے

ٹراٹسکی

(از سید مبارز الدین صاحب)

لیون ٹراٹسکی (جس کا اصلی نام لاٹینا براننٹائین تھا) ۱۸۸۱ء میں بہ مقام نکولالف واقع یوکرن پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک یہودی دوا فروش تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اُس نے پٹروگراڈ کے مزدوروں کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اس جماعت کی بغاوت ناکام رہی اور ٹراٹسکی جلاوطن کردیا گیا۔ مگر ۱۹۰۷ء میں اُس نے کسی نہ کسی طرح روسی سرحد پار کرلی اور وائنا چلا گیا۔ جہاں سے اُس نے روس میں اشتراکیت کی ترقی کے لئے زبردست کوشش کی اسی دوران میں جب یورپ میں جنگ عظیم شروع ہوگئی تو ٹراٹسکی پیرس چلا گیا۔ اور وہاں سے اُس نے ایک روسی اخبار نکالنا شروع کیا جو شہنشاہیت پر حملے کرتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکومت نے اس کو ملک بدر کردیا۔ اور سوئٹزرلینڈ اور اسپین نے بھی اس کو اپنے یہاں جگہ دینے سے انکار کردیا۔ چنانچہ وہ ممالک متحدہ امریکہ چلا گیا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں جب اُسے روس میں زارشاہی کے تباہ ہونے کی خبر پہونچی تو وہ وطن کے ارادے سے چل پڑا۔ راہ میں برطانوی حکومت نے اُسے گرفتار کرلیا، مگر آخر کار مزدوروں اور سپاہیوں کی کونسل کے دباؤ سے روسی حکومت نے خاص درخواست کرکے رہا کرادیا۔ روس پہونچتے ہی اُس نے کرنسکی بورجوا کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے لینن سے تعاون شروع کردیا۔ کرنسکی حکومت نومبر ۱۹۱۷ء میں قائم ہوئی تھی۔

معاملات خارجہ کے صدر کی حیثیت سے اُس نے پُرانی حکومت کے خفیہ معاہدوں کو شائع کرنا شروع کردیا۔ اس کے بعد اس نے تمام متحارب سلطنتوں کو صلح کی گفتگو کے لئے مدعو کیا۔ مگر اس دعوت کو روس کے سابقہ حلیفوں نے مسترد کردیا۔ اس کے بعد بالشویک حکومت نے ٹراٹسکی کی تحریک پر وسطی دول سے گفتگو شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲۔ دسمبر کو عارضی صلحنامہ ہوگیا۔ لیکن [illegible] پیام سے ایک مستقل معاہدہ ہوجانے کی توقع تھی۔ لیکن ٹراٹسکی نے جرمنی میں انقلابی تحریک کی توقع پر [illegible] میں دیر لگادی۔ اسی اثنا میں وسطی دول یورپ نے ۹۔ فروری ۱۹۱۸ء کو یوکرین سے صلح کرلی [illegible]

ٹراٹسکی نے اعلان کردیا کہ روس جنگ سے علیحدہ ہو جائے گا۔ اسی زمانے میں جرمنوں کا ایک تازہ حملہ ہوا جس سے روسی بالشویک حکومت کو لتھونیا اور استھونیا سے دست بردار ہونا پڑا۔
۸۔ مارچ کو صلح کی گفتگو دوبارہ شروع ہوئی اور سوویٹ نمایندوں نے برسٹ لٹوسک کے مقام پر صلحنامہ پر دستخط کر دیئے۔ اس پر ٹراٹسکی نے معاملات خارجہ کی کمیٹی کی صدارت سے استعفا دیدیا۔

اس کے بعد ہی وہ محکمۂ جنگ کا صدر مقرر ہوا۔ اور سُرخ افواج کی تنظیم میں مشغول ہوگیا۔ اس فوج کی مدد سے کچھ عرصے تک وہ پولینڈ کے خلاف کامیاب جارحانہ کارروائی کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی فوج کے بعض دستے جرمن سرحد تک پہنچ گئے۔ لیکن آخر میں اس کارروائی کو کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم ٹراٹسکی کے ذاتی اقتدار کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا کیونکہ اس کے بعد ہی وہ بالشویک جماعت کا رہنما بن گیا۔ اس جماعت میں وہ سب لوگ شامل تھے جو لینن کی اس رواداری کو ناپسند کرتے تھے جو اس نے قدیم نظام کے ساتھ روا رکھی تھی۔ لیکن لینن کے مرنے کے بعد وہ سلطنت میں اپنے بلند مرتبے کو قائم نہ رکھ سکا، اور دوسرے رہنماؤں کی سازشوں میں پھنس گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جماعت کے اندر دہشت انگیزی کا خاتمہ ہو جائے اور اس سے اطاعتِ مجہول کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ چونکہ وہ اسٹالن، کمینیاف اور زینوفیف کی حکمت عملی پر حملے کرنے لگا۔ اس لئے اس پر مشتوک ہونے کا الزام لگایا گیا اور بورژوا طبقہ کا دوست ہونیکا اتہام بھی عائد ہوا یہاں تک کہ اپنے ذاتی اغراض کے لئے جماعت کو تباہ کرنے کا بہتان تراشا گیا۔

اس زمانے میں ٹراٹسکی کی صحت بھی خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ قفقاز چلا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ اپنی جماعت کے جلسے میں شریک ہونے کے لئے واپس آیا لیکن پھر جنوب کی طرف واپس ہوگیا۔ اس سال کے آخر میں اُس نے اپنی مشہور کتاب "اکتوبر کے تجربات" لکھنا شروع کی جس میں اُس نے انقلاب کے ابتدائی زمانے میں اس کے ساتھیوں نے جو غداریاں کی تھیں اُن کو بے نقاب کیا، اور اول الذکر تین شخصیتوں پر تنقید کی، جن کی وجہ سے اس کو لوگوں نے باغی سمجھا۔ اور چاروں طرف سے لے دے ہونے لگی۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں اس کو محکمہ جنگ کی صدارت سے ہٹا کر قفقاز بھیجدیا گیا، مگر اس مرتبہ بھی اس کی روانگی کا سبب صحت کی خرابی بتایا گیا۔

اسکے بعد پھر جزوی مصالحت کرادی گئی، اور وہ مئی ۱۹۲۵ء میں ماسکو واپس آیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصالحت اس وجہ سے کی گئی کہ اسٹالن، کمیناف، اور زینوفیف کو سُرخ افواج پر کافی اقتدار حاصل نہیں تھا کیونکہ یہ افواج ٹراٹسکی ہی کی مرتب کی ہوئی تھیں اور تینوں کو اپنی نئی معاشی حکمت عملی جاری

کرنے کے لئے ایک قوی شخصیت کی امداد کی ضرورت تھی۔ اس لئے ٹراٹسکی کو "صدر مجلس رہائیت" کا نگراں بنایا گیا، اور جنوری ۱۹۲۶ء میں وہ جماعت کا رہنما منتخب ہوا۔ تاہم اسٹالن سے اُس کا طرز عمل مخالفانہ ہی رہا۔ ٹراٹسکی کو اپنے قدیم مخالف زینوفیف اور کمیناف کی وجہ سے مخالف پارٹی سے مل جانا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹالن اپنی پارٹی کو سرمایہ داری کی طرف لے جا رہا ہے، اور اس کی ریاستی مہمات اشتراکی اصولوں پر مبنی ہیں۔ ٹراٹسکی حکمت عملی نے اپنے آپ کو مزدور طبقہ سے بالکل جدا کر لیا تھا۔ اسٹالن حقیقت میں اشتراکی تھا اور ٹراٹسکی خالص اشتمالیت کا علمبردار، اس لئے دونوں میں مصالحت کی گنجائش نہ تھی۔ ٹراٹسکی اس اصول کا حامی تھا کہ بالشویک کا مقصد انقلاب عالم ہونا چاہیئے۔

اگست میں ٹراٹسکی کو دوبارہ "رخصت" دی گئی، پھر اس کو اپنی پچھلی خدمت سے علحدہ کر کے صدر معاشی مجلس میں جگہ دی گئی۔ اسی زمانے میں اس کی کتاب "اشتراکی آمریت کے بدلنے کی کوشش" کا داخلہ ملک میں ممنوع قرار دیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء میں وہ اس الزام پر انٹرنیشنل کی جماعت عاملہ سے نکال دیا گیا کہ اُس نے اسٹالن پر زبردست حملہ کیا تھا۔ دوسرے ہی مہینے ٹراٹسکی اور بعض دوسرے لوگوں کو بھی پارٹی سے نکال باہر کیا گیا اور اس کی بیوی کو اپنے ذاتی عجائب خانہ کی نگرانی سے بے تعلق ہونا پڑا۔ ٹراٹسکی چیختا رہا کہ "پرولتاری آمریت محض خود غرضانہ جتھابندی پر اُتر آئی ہے اور مزدور طبقہ سے تقریر اور اجتماع کی آزادی سلب کر رہی ہے۔ اسٹالن کی احمقانہ حکمت عملی نے ملک کو معاشی تباہی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور اس کی خارجی حکمت عملی بھی مضحکہ خیز بن کر رہ گئی ہے"۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں اختلافی جماعت نے بیرونی اشتمالیوں کو خطوط لکھ لکھ کر اس بات پر اُبھارنا شروع کیا کہ وہ "انٹرنیشنل" میں آمریت کے خلاف جنگ شروع کر دیں۔ آمریت ان پر یہ الزام لگاتی تھی کہ یہ شورش پسند مخالف اشتراکیت عناصر سے مدد حاصل کر رہے ہیں۔

اسی مہینے اسٹالن اور اُس کی جماعت نے ٹراٹسکی اور اس کے ساتھ مخالف جماعت کے تقریباً تیس سے زیادہ ارکان کو اس بنا پر جلا وطن کر دیا کہ وہ ماسکو کے بیرونی سفیروں کی مدد سے ایک خفیہ سیاسی نظام قایم کر کے سوویٹ کے خلاف جد و جہد میں حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۶۔ جنوری کو ٹراٹسکی اپنے جلا وطنی کے مقام سے نکل کر ترکستان اور چین کی سرحد پر پہونچ گیا۔ ماسکو چھوڑنے سے پہلے وہ اور دوسرے لوگوں نے انٹرنیشنل میں ایک یادداشت روانہ کی جس میں انھوں نے یہ لکھا کہ اب جب کہ کشمکش شروع ہو چکی ہے اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ تمام واقعات اس کے سامنے پیش کر دیئے جائیں۔ یادداشت مذکور کے آخری الفاظ یہ تھے "ہم نے فی الحال قوت کے آگے اپنا سپر ڈال دیا ہے۔ لیکن ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ آئندہ

جو مہیب کشمکش ہونے والی ہے، اس میں ہم اپنی جگہ پر واپس آجائیں گے۔ اس لئے ہم "انٹرنیشنل" سے جماعت میں داخل کر لئے جانے کی درخواست کرتے ہیں"

ٹراٹسکی کی جلاوطنی کا مقام قریب ترین ریلوے اسٹیشن سے ایک سو پچیس میل کے فاصلے پر تھا یہاں اُس نے اپنی بیوی اور اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا شروع کی۔ چنانچہ سیاسی جدوجہد سے اس جبری سبکدوشی نے اس کی صحت بحال کر دی۔ اور چونکہ اس پر پولیس کی نگرانی بہت سخت تھی اس لئے صحت کی بحالی میں مزید آسانی پیدا ہوگئی۔ وہ اکثر اپنے کتے اور بندوق کے ساتھ قریب کے دیہاتوں میں نکل جاتا اور سیر و شکار سے دل بہلاتا تھا۔ اشتراکی جماعت کی مجلس عاملہ نے اس کے لئے پچیس پونڈ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ٹراٹسکی کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ وہ رقم تھی جو سرکاری مطبوعات کے ٹرسٹ سے اس کو اپنی تصانیف کے حق طباعت و اشاعت کے معاوضہ میں ملتی تھی۔ ۱۹۲۸ء کے تین مہینوں میں اس کو اس مد سے ۸۵ پونڈ ملے تھے۔

ٹراٹسکی کی ضروریات زندگی بہت محدود تھیں، اس لئے وہ بالکل آرام سے زندگی بسر کرتا رہا اس کا بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس دوران میں اُس نے حسب ذیل تین کتابیں لکھیں (۱) "اشتراکیت اور فسطائیت" (۲) "چینی انقلاب کے تجربات" (۳) "دوامی انقلاب" اس دوران میں اس نے اپنی سوانح عمری بھی لکھی۔ اس کے علاوہ روس میں رہنے والے دوستوں اور دوسرے جلاوطنوں سے مراسلت کرتا رہا۔ خصوصاً زنیکووسکی اور راڈک سے۔

ملیریا میں مبتلا ہو جانے کے بعد ٹراٹسکی نے علاج کی غرض سے قفقاز جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر یہ درخواست مسترد کر دی گئی، گو بعد میں اُسے کچھ عرصہ کے لئے ماسکو آنے کی اجازت مل گئی۔ اور اسٹالن اس کو وہاں اس شرط پر رکھنے پر راضی ہوگیا کہ وہ حکومت کی مخالفت نہ کرے۔ ٹراٹسکی نے اس شرط کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور دوبارہ جلاوطنی کی زندگی اختیار کر لی۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کو اس بنا پر روس سے نکال دیا جائے کہ اُس کے حامیوں نے اسٹالن کی حکومت کے خلاف ایک سازش کی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلے کی تہ میں یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ٹراٹسکی کو اپنے حامیوں سے جدا کر دیا جائے۔

اس کے بعد ٹراٹسکی اپنی بیوی بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ "سی مراف" کے فرضی نام سے قسطنطنیہ پہونچا، جہاں سوویٹ سفیر نے اس کو فوراً اپنی نگرانی میں لے لیا اور اس کے ساتھ عملاً ایک قیدی

کا سا برتاؤ کیا جانے لگا۔ وہ روسی افسروں کے سوائے کسی اور سے خط و کتابت بھی نہ کرسکتا تھا آخر کار اس نے بحیرۂ مارمورہ کے جزیرۂ پرنکی پو میں سکونت اختیار کی۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں اس کے چوبی مکان کو آگ لگ گئی اور وہ تباہ ہوگیا، کیونکہ اس مکان کا دود کش بہت ناقص تھا۔ بہر حال اس کا تمام فرنیچر، کتب خانہ اور اس کے ساتھ ہی اس کے کاغذات کا بیشتر حصہ جل گیا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے لینن کی مراسلت، اپنی تالیف کردہ روسی انقلاب کی تاریخ کا مسودہ اور دوسری تالیفوں کا مسالہ بچا لیا۔ اس کی یادداشتیں ۱۹۳۰ء میں شائع ہوچکی تھیں جن کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوگیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ۱۹۳۱ء میں بعض یورپی ممالک سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ وہ اس کو اپنے ملک میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیں، لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں اس کو ترکی سے نکلنے کی اجازت دی گئی، اس سے پہلے اس کو چیکو سلواکیہ میں علاج کی غرض سے داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ طلبار کو مخاطب کرنے کے لئے ڈنمارک روانہ ہوگیا۔ ٹراٹسکی کو کولمبیا کی اشاعتی کمپنی نے اپنے لکچروں کا خلاصہ نشر کرنے کے لئے تین سو پونڈ پیش کئے، لیکن ڈنمارک کی نشرگاہ نے اسکو ان لکچروں کے نشر کرنیکی اجازت نہ دی، اس لئے اس کی تقریروں کا خلاصہ ٹیلی فون کے ذریعہ لندن اور وہاں سے نیویارک بھیجا گیا۔ ایک امریکی فلم کمپنی نے اس کو اپنی ہفتہ وار اخباری ریل میں گفتگو کرنے کے لئے پندرہ سو پچاس پونڈ پیش کئے۔

ڈنمارک چھوڑنے کے بعد اس نے فرانس میں سکونت اختیار کرلی، مگر اس کے مکان واقع باربیزان میں کسی تاجر کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے رات کے وقت اس کے ملاقاتیوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے روس کے بالشویکوں کو ایک یادداشت روانہ کی جس میں اس نے لکھا کہ میری بیٹی کی موت کا ذمہ دار اسٹالن ہے۔ اس کی بیٹی نے اسی زمانے میں برلن میں خودکشی کی تھی۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ جرمنی کے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اس کی صحت کی بحالی کے لئے اسکو اپنی زندگی کے معمولی حالات میں فوراً واپس ہوجانا چاہیئے۔ اس کا خیال تھا کہ اب صرف اس کا خاندان ہی اس کو بچا سکتا ہے۔ لیکن اسٹالن نے اس کو روسی شہریت کے حق سے محض اس لئے محروم کردیا کہ اس کو مجھ سے کد تھی، اور وہ میری لڑکی پر سختی کرکے اپنا انتقام لینا چاہتا تھا۔ بہر حال اس کے دوستوں نے اس کی بیٹی کو شہری حقوق دلانے کی جتنی کوششیں کیں وہ سب ناکام ہوئیں۔

کیراف جو اسٹالن کا دست راست تھا دسمبر ۱۹۳۴ء میں قتل کردیا گیا۔ فروری ۱۹۳۵ء میں ٹراٹسکی نے اس جرم میں کسی قسم کی شرکت سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔ اسی زمانے میں اس نے

یہ لکھکر اپنے مکمل ذہنی انقلاب کا ثبوت دیا کہ اسٹالن اپنی حکمت عملی میں حق بجانب تھا، اور انقلاب عالم کے متعلق خود اس کا تصور غلط تھا۔

جون ۱۹۳۵ء میں ٹراٹسکی پر ماسکو سے یہ الزام لگایا گیا کہ کیرآف کے قتل کی سازش میں اس کا اثر کام کر رہا تھا۔ زینوفیف اور ٹراٹسکی کے برادر نسبتی کمینیاف کو اس الزام پر کہ وہ اس سازش کے بانی مبانی ہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اگست ۱۹۳۶ء میں ماسکو میں اِن دونوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اِن کے علاوہ اور دوسرے چودہ اشخاص بھی اسی الزام میں ماخوذ کئے گئے۔ ان میں سمرناف، اوڈکی موف، اور باکے رف پر یہ الزام تھا کہ اُنھوں نے اسٹالن اور دوسرے ممتاز سوویٹ لیڈروں کی جان لینے اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی تھی۔ فیصلہ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ خود ٹراٹسکی نے شخصی طور پر اِن کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور کمیناف نے تسلیم کر لیا کہ اس نے زینوفیف اور ٹراٹسکی کے ساتھ مل کر دہشت انگیزی کی سازش کی تھی۔ ایک ملزم نے بیان کیا کہ اس نے "ٹراٹسکی کی عام ہدایات کے ماتحت" کانگریس میں اسٹالن کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہ اُس کی زد سے بہت دُور تھا اس نے کہا کہ ٹراٹسکی نے اس کو اسٹالن کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ دوسرے قیدی نے بیان کیا کہ ٹراٹسکی نے اس سے کہا تھا کہ اسٹالن کو علحدہ کر دینا چاہیئے تاکہ ہم دوبارہ اقتدار حاصل کر لیں۔ بہر حال سولہ آدمی مجرم ثابت ہوئے اور ان سب کو گولی مار دی گئی۔

جون ۱۹۳۵ء سے ٹراٹسکی ناروے میں مقیم تھا، یہاں سے اُس نے یہ بیان دیا کہ اُس پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کی حیثیت ایک سیاسی انتقام سے زیادہ نہیں ہے، اور یہ انتقام ایسے پیمانہ پر لیا گیا ہے جس کے آگے ڈریفس (Dreyfus) کا مقدمہ بھی ہیچ ہے۔ یہ الزام صرف چند سازشیوں اور سوویٹ کی خفیہ پولیس کا اختراع کردہ ہے۔ ان لوگوں کو گولی مار دینے پر اُس نے رائے ظاہر کی کہ اگر ان کو قتل کرنے کے بجائے قید کر دیا جاتا تو حکومت کو اندیشہ تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اصلی حقائق کا انکشاف کر دیں گے۔ ٹراٹسکی نے کہا کہ "وہ اس عظیم الشان جرم کو بے نقاب کر سکتا ہے۔" اُس نے یہ بھی کہا کہ لینن کی وفات کے بعد ہی سوائے اسٹالن کے سب ہی لوگوں پر مملکت کے خلاف سازش کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ آگے چل کر اُس نے بیان کیا کہ اسٹالن نے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے رشتہ کی آخری کڑی کو بھی توڑ دیا۔ کیونکہ نئے دستور کے معنی عوام کی سیاسی جدوجہد کے خاتمے کے ہیں، اور اب تمام قوت چند لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔

اس مقدمہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناروے کی حکومت نے ٹراٹسکی سے یہ وعدہ لینا چاہا کہ وہ ناروے کے

قیام کے دوران میں سیاسی سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لے گا۔ ٹرالسٹکی نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے حکومت نے اس پر نگرانی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سوویٹ حکومت نے ناروے سے مطالبہ کیا کہ وہ ٹرالسٹکی کو ملک بدر کر دے اور اگر اس کو ناروے میں اپنی سرگرمی جاری رکھنے کی اجازت دی گئی تو روس کی حکومت اس کو غیر دوستانہ فعل تصوّر کرے گی۔ لیکن ناروے کی حکومت نے اس مطالبہ کو قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹرالسٹکی پر نگرانی قائم کر دی گئی ہے۔ اس نگرانی کی صورت یہ تھی کہ ٹرالسٹکی جس مکان میں رہتا تھا اُس پر پولیس کا پہرہ قائم کر دیا گیا ٹیلیفون کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا گیا اور اُس کے خطوط کی جانچ پڑتال ہوتی تھی۔ خاص خاص موقعوں کے سوائے کسی شخص کو اُس سے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ اس کے بعد ٹرالسٹکی کے معتمد لوگوں کو ناروے سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔ مگر چند دنوں کے بعد ٹرالسٹکی ناروے چھوڑ کر میکسیکو چلا گیا، اور یہاں چونکہ اسے جان کا خطرہ لگا ہوا تھا اس لئے وہ بالکل عزلت گزیں ہو گیا۔

۱۹۳۲ء میں اس کی کتاب "روسی انقلاب کی تاریخ" کی پہلی جلد کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔

۲۰۔ اگست ۱۹۴۰ء کو ٹرالسٹکی پر جاکسن نامی ایک فرانسیسی یہودی نے قاتلانہ حملہ کیا، اور اُس کے سر پر ہتھوڑوں سے شدید ضربات پہونچائیں۔ ۲۱۔ اگست ۱۹۴۰ء کو چہارشنبہ کے دن اسی صدمے سے اُس نے وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ امبولینس کار میں شفاخانے جاتے ہوئے ٹرالسٹکی نے کہا کہ اُس کا حملہ آور "آگ پو" کا کوئی رکن یا کوئی فاسسٹی تھا۔ بیہوش ہونے سے قبل اُس نے حسب ذیل جملے کہے:-

"میں ایک سیاسی حملہ کی وجہ سے موت کے قریب ہو گیا ہوں، براہ کرم ہمارے دوستوں سے کہہ دیجئے کہ مجھے "چوتھی انٹرنیشنل" کی کامیابی کا کامل یقین ہے، اس لئے آگے بڑھتے چلے جائیں"

کلامِ جلیل

آج تک دل کی آرزو ہے وہی ۔۔۔ پھول مرجھا گیا ہے بُو ہے وہی
مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو ۔۔۔ بھول جاتا ہوں میں کہ تُو ہے وہی
ہوئی پوری تو آرزو نہ رہی ۔۔۔ جو نہ پوری ہو آرزو ہے وہی
صبر آجائے اس کی کیا اُمید ۔۔۔ میں وہی دل وہی ہے تُو ہے وہی

میکدے کا جلیل رنگ نہ پوچھ
رقصِ جام و خم و سبو ہے وہی

(ادبِ لطیف) ۔۔۔ جلیل مانکپوری

نوائے یگانہ

(تازہ کلام مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

زمانہ خدا کو خدا جانتا ہے یہی جانتا ہے تو کیا جانتا ہے؟
اِسی میں دل اپنا بھلا جانتا ہے کہ اِک ناخدا کو خدا جانتا ہے!
وہ کیوں سر کھپائے تری جستجو میں؟ جو انجامِ فکرِ رسا جانتا ہے!
وہی منھ چھپانا، وہی لن ترانی! تو اِس کے سوا اور کیا جانتا ہے؟
خدا ایسے بندوں سے کیوں پھر نہ جائے جو بیٹھا دُعا مانگنا جانتا ہے!
بُرائی میں تو دیکھتا ہے بھلائی تو کیا بوم کو بھی ہُما جانتا ہے؟
فرشتوں کی پرواز کو مانتا کیا جو دل کی تڑپ کو رسا جانتا ہے!
جسے موت مانگے نہ ملتی ہو واللہ وہی زندگی کا مزا جانتا ہے!
کدھر جا رہا ہے ترا خوں گرفتہ؟ مگر غیب کا راستا جانتا ہے!
وہ کیوں پھول توڑے، وہ کیوں پھول سونگھے؟ جو دل کو دُکھانا بُرا جانتا ہے!
زہے سہوِ کاتب کہ سارا زمانہ مجھی کو سراپا خطا جانتا ہے!
انوکھا گنہگار، یہ سادہ انساں نوشتہ کو اپنا کیا جانتا ہے!

یگانہ تو ہی جانے اپنی حقیقت
تجھے کون تیرے سوا جانتا ہے؟

شاعرانہ مبالغہ

(از مسٹر شایق ہندو)

چونکہ عرف عام میں مبالغہ اور شاعری ہم معنی الفاظ ہیں لہٰذا مبالغہ کے جواز میں کسی شاعر کا کچھ لکھنا بظاہر اپنی ذاتی کمزوریوں کی صفائی پیش کرنا ہے۔ مگر بحث یہ ہے کہ مبالغہ صرف شاعری سے مخصوص ہے یا یہ وبا عالمگیر ہے۔

کچھ ایسے لوگ جن کے متعلق غالب نے "انھیں کچھ نہ کہو" کہہ کر سب کچھ کہہ دیا ہے، شاعری کو جملہ اصول کلام سے آزاد اور شعریت کو محض ایک سیلانی کیفیت خیال کرتے ہیں، اُن کی رائے میں یہ لطیف فن ایک "رنگین کھینچ" سے زیادہ نہیں۔ مگر اس رائے پر جو گویا "شپرۂ چشم" کی "چشمۂ آفتاب" کے متعلق ہے کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔ شعرگوئی کی پابندیوں کا صحیح اندازہ تشاعر بھی مشکل ہی سے کرسکتے ہیں، چہ جائیکہ ایک ایسا گروہ نامحرماں جو دار حیات میں "راز درون خانہ" سے مطلقاً بے بہرہ اور صرف خدمت دربانی میں مصروف ہو۔ سلاسل شاعری کی گرانباری کا حال اس سے پوچھئے جو اس فضائے تنگ میں حصولِ عرفاں کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور "جوئے شیر" لانے سے زیادہ سخت کام یعنی کوزہ سے سمندر نکالنا اپنے ذمہ لیتا ہے۔ شاعری دراصل "ہر مردے وہر کارے" کی کسوٹی ہے۔ یہاں حصول معراج کے لئے انسان کو ذاتی برکات کی ضرورت ہے۔ اس جناب میں باریاب ہونے کے لئے محض "بال و پر" کافی نہیں۔ اس لئے اہل نظر شاعری کو علم لدنّی اور شعراء کو تلامیذ الرحمٰن کہتے ہیں۔

خیر یہ تو شعرگوئی کی مشکلات پر ایک سرسری تبصرہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعری کہتے کسے ہیں اور اس پر مبالغہ کا الزام کہانتک عائد ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے نفس شاعری پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں خود ادیبوں میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ شاعری کی کوئی صحیح اور جامع تعریف نہیں ملتی۔ مبادی اور مصطلحات میں اُلجھنا بیکار ہے۔ لہٰذا مخالف نظریات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اس قدر کہنا ہے کہ شاعری کا اصلی مقصد کشمکش حیات کے متعلق مظاہر کی تنقیح و تشریح کرنا نہیں، جیسا کہ عام خیال ہے یہ کام فلسفہ اور اسی قسم کے دوسرے فنون کا ہے۔ شاعری فلسفیانہ موشگافیوں سے کہیں زیادہ اونچی

جاتی ہے۔ وہ دراصل حقیقت محض کی بشارت دیتی ہے اس سلسلہ میں نوامیس فطرت سے کوئی معاہدہ کرنے کے بجائے شاعری اس سے صرف ایک قسم کا مفاہمہ کرتی ہے اور زندگی کے زیر وزبر کو پیش نظر رکھتے ہوئے حیاتِ انسانی کے اِن مقامات کی تعین اور تمیز عمل میں لاتی ہے جو عام نظروں کی رسائی سے بالا ہیں۔ گویا وہ اپنے مریدوں کو "یارۂ نزدیک از ہر دور باش" کر دینے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی شاعری کی نظر "جواہر طرف کلہ" کے بجائے ہمیشہ "اوجِ طالع لعل و گہر" پر پڑتی ہے۔

چونکہ شاعر کو سطحی باتوں کے بجائے زیادہ تر واقعات کے امکانات سے بحث کرنا ہوتا ہے لہذا اظہارِ خیالات کے التزام میں مبالغہ کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اور گفتگو میں "ناز و غمزہ" کی جگہ "دشنہ و خنجر" کہنا پڑتا ہے۔ مگر اس طرح کسی قسم کی حقیقت کشی نہیں ہوتی بلکہ اس کے علی الرغم یہ مبالغہ انجلاءِ حقیقت کا سبب ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ اظہار کر دینا بھی ضروری ہے کہ بیشتر شاعری میں پہونچکر کچھ ہنس کی چال کے دلدادہ "کوئے" "مبالغہ کا بیجا تصرف کرنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی صفائی نہ یہاں منظور ہے اور نہ اس معاملہ میں اس کی کوئی گنجائش ہے۔

بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگ شاعری کے اس نظریہ سے اتفاق نہ کریں اور اس کو محض ایک انفرادی نقطۂ نگاہ خیال فرمائیں مگر ایسے لوگوں کو کوئی جواب دینے کے بجائے ان کے حق میں دعائے خیر کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کو صبح سے لیکر شام تک اپنے گرد و پیش ہر وقت اس نظریہ کا ثبوت ملتا رہتا، اور یہی نہیں بلکہ وہ بھی برابر اس قسم کے فقرے بولتے رہتے ہیں کہ:۔

"سر کے درد سے مرے جا رہے ہیں"
"بوجھ سے جسم کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں"
"غم سے سینہ شق ہو گیا" وغیرہ وغیرہ۔

مگر نوبت تجہیز و تکفین تو کیا ہسپتال تک کی بھی نہیں پہونچتی۔ ڈھول کے اس پول کو دیکھکر پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر آپ جو صبح سے لیکر شام تک اپنی گفتگو میں ایک مشہور حکایتی مینڈک کی طرح پھول پھول کر بیل بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو کیوں؟ جواب صاف ہے کہ گفتگو میں صحیح واقعہ کا اظہار کرنے کے بجائے انسان کی فطری شعریت مجبور کرتی ہے کہ واقعہ سے متعلق انتہائی احساسات کا تذکرہ کیا جائے۔ چونکہ طول طویل گفتگو کی فرصت نہیں ہوتی اور خیال کو چند الفاظ میں ادا کرنا ہوتا ہے لہذا مبالغہ روزمرّہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اسی طرح شاعری سے بھی مبالغہ وابستہ ہے بھلا اس سے زیادہ شاعری کا فطری انداز اور کیا ہو سکتا ہے۔

اِن سب باتوں کی روشنی میں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مبالغہ فطرتِ انسانی کا ایک جزو ہے پھر اگر شاعر بیچارہ اس کا استعمال کرتا ہے تو خوردہ گیری کا کیا محل ہے؟ درحقیقت شاعر اپنے کلام میں مبالغہ کا استعمال محض اُس وجہ سے جائز نہیں رکھتا جس کی بنا پر قاضی شراب کو حلال سمجھتا ہے بلکہ اس کو اس کا استعمال شعرگوئی کے چند در چند مشکلات اور فطرتِ انسانی کے رُجحانات کو مدنظر رکھ کے کرنا پڑتا ہے کیونکہ شاعر بہر حال سوسائٹی کے عناصر ترکیبی سے باہر نہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ سنتے چلئے۔

ایک صاحب کسی جگہ بَر دکھائی جا رہے تھے، ان کے ایک دوست نے جو ذرا "کھینچنے" کے عادی تھے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ گھر بسنے کا معاملہ تھا اس لئے اِن صاحب نے دوست سے صاف کہہ دیا کہ "بھائی تم جھوٹ بہت بولتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارا جھوٹ دیکھکر مجھکو بھی

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

کے اُصول پر لوگ جھوٹا سمجھنے لگیں۔ اس پر دوست بولے "واہ یہ بھی کوئی بات ہے، اول تو ایسی حرکت ہو ہی گی نہیں اور اگر شاید چُوک ہو بھی جائے تو تم کھنکار دینا میں سنبھل جاؤنگا۔" اس معاہدہ کے بعد دونوں منزلِ مقصود پر پہونچے۔ حسنِ اتفاق سے شام کو وہاں کھانے پر افریقہ کے جانوروں کا ذکر چھڑ گیا۔ بھلا ایسے موقعہ پر یہ حضرت کہاں چوکنے والے تھے، جھٹ بول اُٹھے "جی ہاں افریقہ میں بھی کیا عجیب عجیب جانور پائے جاتے ہیں، جیسے وہاں کی گلہریاں، اجی قبلہ اُن کی ننو ننو گز کی دُمیں ہوتی ہیں ننو ننو گز کی!" دوست کی یہ پرواز دیکھکر ہونے والے دولھا کھنکارے، حضرت کو معاہدہ کا فوراً خیال آ گیا اور بات بنانے کو کہا "اگر ننو گز کی نہیں تو اسّی نوّے گز کی تو ضرور ہوتی ہونگی"۔ دولھا نے پھر کھنکارا۔ اس پر یہ پھر سنبھل کر بولے "بہر حال پچاس ساٹھ گز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہے"۔ دولھا نے پھر کھنکارا تب تو یہ جھلا اُٹھے اور دولھا سے بگڑ کر بولے "ہوں! اب تم چاہے کھانس کھانس کر گلا پھاڑ ڈالو اس سے کم نہیں ہو سکتیں"۔

ایک درخواست

"زمانہ" کی توسیع اشاعت کی سخت ضرورت ہے، اس لئے براہ کرم اپنے علم دوست احباب کے نام و پتہ سے مطلع فرمائیے تاکہ ہم زمانہ کا نمونہ اُن کی خدمت میں بھیجکر ان کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں۔

منیجر "زمانہ"

تلاشِ حق

از پنڈت اندر جیت شرما۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ

ننھے حسین تارو! کیوں اس قدر ہو بے کل — کیا بات ہے جو مضطر سیماب وار ہو تم
ہر بار ڈالتے ہو منہ پر سیاہ آنچل — کس کی نظر سے گر کر یوں اشکبار ہو تم

محروم عاشقوں کا انداز ہے تمھارا
کیا بات ہے تمھاری کیا راز ہے تمھارا

خوف و خطر ہے کیسا، کیوں تھرتھرا رہے ہو — تقدیر میں تمھاری دولت نہیں سکوں کی
جنبش میں ہو سراپا لرزہ سا کھا رہے ہو — دیوانگی کی باتیں حالت ہے یہ جنوں کی

اک داستانِ غم کی تصویر ہو سراپا
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تفسیر ہو سراپا

سودا ہے کیا سروں میں وحشت ہی کیا دلوں میں — کس ذوق میں تڑپ کر راتیں گذارتے ہو
روزِ ازل سے یوں ہی تاریک منزلوں میں — پھرتے ہو سر ٹپکتے تھکتے نہ ہارتے ہو

ہر روز دل کا لیکن کچھ مدعا نہ پاکر
پہلے ہی صبح سے تم اُڑتے ہو مُنھ چُھپاکر

فلسفۂ ہستی

کچھ ہوش تو کر ہوش بھی مستانۂ ہستی — کس بات کی خوبی یہ ہے دیوانۂ ہستی
تھامے ہے قضا ہاتھ میں پیمانۂ ہستی — اک خواب پریشاں ہے یہ میخانۂ ہستی

پُر درد و جگر پاش ہے افسانۂ ہستی — پروانۂ ہستی بھی ہے بیگانۂ ہستی
اک پھول کا بھی نام و نشاں تک نہیں ملتا — کانٹوں سے ہے آباد یہ ویرانۂ ہستی

سرگشتہ،

ممتاز محل

(از شیخ تصدق حسین لکھنوی، بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

اس خطاب کی اودھ میں کئی بیگمات گزری ہیں، اولاً یہ خطاب مسماۃ صبح دولت کو دیا گیا، جو پادشاہ بیگم صاحب محل خاص شاہ زمن غازی الدین حیدر کی خواص تھی۔ شاہ موصوف اس گلبدن غنچہ دہن پر فریفتہ ہو کر اُس کے باغِ حُسن سے گلچینی کرنے لگے۔ جب اُس کے بطن سے شہزادہ نصیر الدین حیدر عرف مرزا علی حیدر بتاریخ ۲۲۔ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ پیدا ہوئے تو اُس کو ممتاز محل کا خطاب عطا کر کے سربلند کیا۔ مگر شہزادہ کی ولادت کو چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ممتاز محل کو اپنی جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کرنا پڑی۔ بعد وفات غازی الدین حیدر اُن کے نورنظر نصیر الدین حیدر کے سر پر ۱۸۲۷ء سے لیکر ۱۸۳۷ء تک تاج شاہی جگمگاتا رہا۔

منشی عبدالاحد مصنف "وقائع دلپذیر" جو پادشاہ بیگم کے ہمعصر تھے، اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ پادشاہ بیگم سوت کا جلاپا برداشت نہ کر سکیں اور صبح دولت کو اذیتیں دے دے کر ختم کرا دیا۔ اُسکی لاش شہر کے ناکہ پر چھانکڑ باغ میں جہاں غریب غربا کے مُردے دفن ہوتے تھے سپرد لحد کی گئی۔ اُس کی وفات کے بعد پادشاہ بیگم نے چاہا کہ گلِ نوشگفتہ نصیر الدین حیدر کو بھی ٹھکانے لگا دیں مگر فیض النسا مغلانی نے خدا ترسی کر کے اُن کو اس مکروہ فعل سے باز رکھا۔ بعدہٗ پادشاہ بیگم نے بچہ کا نام نصیر الدین حیدر رکھا، ایسی محبت اور شفقت سے اپنا بیٹا بنا کر پرورش کیا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ نصیر الدین حیدر اُن کے بطن سے نہیں ہیں۔ جب نصیر الدین حیدر تاج و تخت کے مالک ہوئے اور اُن کو نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کی حقیقی ماں ممتاز محل کو پادشاہ بیگم نے طرح طرح کی بدسلوکیاں کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا تو انھوں نے اپنی والدہ کی قبر پر ایک مقبرہ بنوا دیا، جو استدادِ زمانہ سے اب منہدم ہو کر رہ گیا ہے۔

ممتاز محل ثانی

یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کی نومسلم بیوی اوری لال بقال کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں

جگناتھ بقال کی رشتہ دار تھیں جو بعلت باقیداری اپنی گلو خلاصی کے لئے از خود مسلمان ہوگئے تھے۔ ان کا اسلامی نام غلام رضا خاں رکھا گیا تھا اور اشرف الدولہ کے خطاب سے بھی ممتاز ہوئے تھے۔ انھیں اشرف الدولہ کا بنوایا ہوا روضہ کاظمین محلہ منصور نگر لکھنؤ میں اب تک موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ممتاز محل کی ایک اور بہن بھی دائرۂ اسلام میں آئی تھیں جن کا اسلامی نام لاڈو خانم رکھا گیا تھا۔

بعد انتقال صبح دولت المخاطب بہ ممتاز محل شاہ غازی الدین حیدر نے موصوفہ سے نکاح کر کے اُن کو بھی ممتاز محل کے خطاب سے افتخار بخشا۔ بیگم کا چہرہ طباقی، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی اور رنگ گندمی تھا۔ کان کی لوؤں میں ترکیوں کے پہننے کے چاک تھے۔ اور بائیں ہاتھ میں گودنا گدا ہوا تھا۔ بزمانۂ حیات غازی الدین حیدر ممتاز محل ثانی امام باڑہ نجف اشرف کی پشت پر ایک مکان میں رہتی تھیں یہ جو دریا اور نجف کے درمیان واقع تھا۔ یہ مکان تخمیناً ۱۹۱۳ء میں جب بٹلر روڈ (Butler road) دریا کے کنارے نکالی گئی تو کھد گیا۔ اب صرف ایک دیوار لب دریا بطور نشانی باقی رہ گئی ہے۔

مبلغ ایک کروڑ روپیہ جو شاہ غازی الدین حیدر نے سرکار کمپنی کو بتاریخ ۱۷ اگست ۱۸۲۵ء بطور قرض دوام دئے تھے اُس رقم کے سود سے منجملہ اور محلات کے ممتاز محل کے بھی گیارہ سو روپیہ ماہوار بطور وثیقہ مقرر ہوئے تھے، مگر بوجہ لاولد انتقال کرنے کے اُن کا وثیقہ انھیں پر ختم ہوگیا۔

بیوہ ہوجانے کے بعد موصوفہ کا لباس سادہ اور سفید ہوتا تھا، اونچا جوڑا مو باف سے بندھا ہوا سر پر سفید ململ کا دوپٹہ، گلے میں اصلی جامدانی کا کرتہ، پیروں میں بڑے پائنچوں کا پاجامہ اور سفید کاشانی مخمل کا گھیتلا جوتا، ہاتھوں میں علی بند یعنی سمرنیں پہنتی تھیں تخمیناً ۱۸۹۶ء میں اُنھوں نے انتقال کیا۔ امام باڑہ نجف اشرف میں داخل ہوتے وقت اُن کی قبر بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب ملتی ہے جس پر چاندی کا کٹھرا لگا ہوا ہے۔

بعد انتقال غازی الدین حیدر ۱۸۵۷ء کے فساد عظیم تک موصوفہ پنج محلے واقع مچھی بھون میں رہیں پھر جب انگریزوں نے مچھی بھون کو اپنے قبضہ میں کرلیا تو شہر میں کرایہ کا مکان لے کر رہنے لگیں، بعدہٗ محلہ گولا گنج میں اپنا ذاتی مکان بنوا کر اُس میں منتقل ہوگئیں۔ یہ مکان اب فروخت ہو کر کھد گیا ہے صرف پُرانا پھاٹک اُن کی یاد دلانے کو باقی ہے۔ مگر اُن کی ایک خوشنما مسجد محلہ چاندی خانہ میں کنگلے محل کے امام باڑہ کے پاس ڈیوڑھی آغا میر سے متصل اب تک قائم ہے، جو اُن کے نام کو روشن کئے ہوئے ہے۔ مسجد میں ایک قطعۂ تاریخ بھی نصب ہے جو زیادہ تر مٹا ہوا ہے صرف الفاظ مندرجہ ذیل بدقت پڑھے جا سکے

عاشق فاطمہ ممتاز محل صاحب عفت ......

زوج اُو شاہ غازی الدین خود چو خورشید

کرد تعمیر چو از بہر نماز .... اندر خاک

مسجد نہایت دیدہ زیب ہے، مینت کا کام بھی نہایت دلکش ہے مگر سنہ تعمیر پڑھا نہیں جاسکا۔

ممتاز محل ثالث

تیسری بیگم جن کو ممتاز محل یا ملکہ تخت ممتاز محل کا خطاب عطا ہوا وہ جان عالم واجد علی شاہ کی بیوی تھیں۔ اُن کا نام عالیہ بیگم تھا اور کشمیری محلہ لکھنؤ کی رہنے والی تھیں، اُن کے والد کا نام احمد علی خاں بتایا جاتا ہے۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اُن کی ماں اُن کو اپنے ہمراہ بوجوہات کلکتہ لے گئیں، جہاں شاہ معزول نے اُن سے متعہ کرکے داخل حرم کرلیا، پھر صاحب اولاد ہونے پر ملکہ تخت ممتاز محل کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ موصوفہ سے صرف ایک ہی صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام پرنس اکرم حسین ہے۔ اب حضرت واجد علی شاہ کے شہزادوں میں صرف پرنس موصوف ہی بفضلہ بقید حیات ہیں۔

بقول مصنف "صحیفۂ زریں" شہزادہ موصوف ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے اور شاہ مرحوم کے بائیسویں فرزند ہیں۔ آپ کا پورا نام مع خطاب افسر الملوک پرنس مرزا اکرم حسین بہادر ہے۔ ۱۸۸۸ء میں گورنمنٹ ہند نے آپ کو پرنس کا خطاب عطا فرمایا۔ شکل و شباہت میں آپ اپنے پدر نامدار سے بہت ملتے ہیں مگر ایک بات میں آپ اُن کی بالکل ضد ہیں، یعنی باپ نے تو سیکڑوں محل کئے مگر آپ نے ایک شادی بھی نہ کی اسی وجہ سے لاولد ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں جب حضرت واجد علی شاہ نے انتقال فرمایا تو گورنمنٹ نے آپ کے گزارہ کے لئے اٹھارہ سال کی عمر تک کے لئے مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار اور اُس کے بعد کے لئے مبلغ پانچسو روپیہ ماہوار مقرر کئے، مگر اب تخمیناً پچھلے دس سال سے بجائے پانچسو روپیہ ماہوار کے پندرہ سو روپیہ ماہوار کردئے ہیں۔ بروقت انتقال سلطان عالم آپ کی عمر صرف چھ برس کی تھی اس حساب سے آپ کا سن شریف اب ساٹھ سال کا ہوتا ہے۔ تخمیناً تین سال کا عرصہ ہوا جب موصوف شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے صدر ہوکر لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ آپ نہایت ہی منکسر المزاج صاحب اخلاق، نیک نفس و بے تعصب بزرگ ہیں، اور شیرف (Sheriff) کلکتہ اور وائسرائے ہند کی کونسل کے نامزد شدہ ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ کلکتہ میں اپنی عالی شان کوٹھی افسر منزل نامی میں بمقام بالی گنج سرکلر روڈ تشریف رکھتے ہیں۔ انگریزی بولنے میں آپ کو بہت مہارت ہے اور لہجہ بھی بہت عمدہ ہے۔

سلطان عالم کی وفات کے بعد بموجب اخبار ایڈوکیٹ مورخہ ۵۔ اگست ۱۸۸۷ء گورنمنٹ نے

واجد علی شاہ مرحوم کی دو سو نو ۲۰۹ بیگیوں کو بلحاظ خاندان و مراتب آٹھ درجوں میں تقسیم کر کے مبلغ گیارہ ہزار اُنچاس روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر کی۔ اُن میں سے آٹھ بیگمات (۱) ملکۂ تخت ممتاز محل (۲) نواب صنوبر محل (۳) نواب عایش محل (۴) نور افروز محل (۵) خوشخصال محل (۶) ہمایوں محل (۷) ملکہ شاہ نواب مہرا فروز محل (۸) وملکۂ عالم ماہ افروز محل کو درجۂ سوم میں جگہ دی گئی جن کے لئے مختلف رقوم کے گزارے مقرر ہوئے۔ ملکۂ تخت ممتاز محل کو اکیسو تیس ۱۳۰ روپیہ ماہوار عطا ہوئے۔

تخمیناً ۱۸۸۹ء میں موصوفہ نے دبیر الدولہ مرحوم کے منجھلے پوتے سید عبد الحق اخلاص الدولہ سے عقد ثانی کر لیا، جن سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئیں موصوفہ کا انتقال تخمیناً ۱۹۰۵ء میں مرض طاعون سے، بمقام مارسڈن اسٹریٹ (Marsden street) کلکتہ ہوا۔ لاش مٹیا برج میں دفن کی گئی۔ وہیں اُن کی والدہ کی قبر بھی ہے۔

جذبات نظامیؒ

از حضرت نظامی بدایونی۔ ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں

ادائیں نئی ہیں ترے بانکپن میں
نہ کیوں فرق آجائے رسم کہن میں

نہ پوچھو قفس میں گزرتی ہے کیونکر
نظر تیلیوں پر ہے دل ہے چمن میں

وہ صیاد خود بیچ میں آ گیا ہے
چمن سے خبر آئی ہے یہ وطن میں

کئے جا کئے جا، ستم ہی کئے جا،
مزہ ہے کڑھن میں مزہ ہے مرن میں

کہاں تک یہ تاکید ضبط فغاں کی
لگا یا ہے کیوں قفل میرے دہن میں

وفا کا سلیقہ، جفا کا طریقہ
ہمارے چلن میں تمھارے چلن میں

کوئی ہم سے پوچھے ہے کتنی صداقت
تمھاری قسم میں تمھارے بچن میں

محبت کا انجام شاید یہی ہے
کہ شعلے سے اٹھنے لگے تن بدن میں

محبت کی باتوں سے کر رام مجھ کو
رکھا کیا ہے اذکار دار و رسن میں

نظامی کرو اُن سے کیا عرض مطلب
اثر ہی نہیں جب تمھارے سخن میں

ؒ یہ غزل کل ہند اُردو کانفرنس بریلی کے مشاعرہ کے لئے لکھی گئی تھی۔

بھارت ماتا کی اُداسی

(از حضرت اقبال ورما سحر ہنگامی)

ماتا! تجھے ہوا کیا، ایسی اُداس کیوں ہے؟ چہرہ پہ آج تیرے اِک رنگِ یاس کیوں ہے؟
بدلی ہوئی یہ صورت اب غم شناس کیوں ہے؟ تجھکو فسردگی کا اِس طرح پاس کیوں ہے؟
ہاں دامِ فکر کی تو نخچیر بن گئی کیوں؟
حسرت کی اِک سراپا تصویر بن گئی کیوں؟

بگڑا ہوا ہے ماتا! تیرا یہ حال کیسا؟ کرتا ہے جو پریشاں، ہے وہ خیال کیسا؟
تیرا یہ جسم سارا اب ہے نڈھال کیسا؟ پژمردہ کر رہا ہے تجھکو ملال کیسا؟
کیا تفرقہ پڑا ہے ترتیبِ آب و گل میں؟
پیدا کیا ہے جس نے یہ درد تیرے دل میں!

کرتی ہے تو جو ماتا آہستہ آہ و زاری یہ ضبط کس لئے ہے، کیوں ہے یہ بیقراری؟
کتنی اَلم فزا ہے یہ تیری سوگواری کیا ہوگیا وہ تیرا اندازِ غمگساری؟
ماتا! اب آہ کیسا یہ صدمۂ قلق ہے؟
ہے خستہ دل بھی تیرا، تیرا جگر بھی شق ہے؟

تیری زبان پر ہے اِک درد کی حکایت بچّوں کی آہ اپنے حسرت بھری شکایت
ماتا وہ دل میں تیرے اُن کا خیالِ غایت وہ اُن کی بے وفائی، وہ غفلتِ عنایت
تیری مصیبتوں کی اُن کو خبر نہیں ہے
تیری محبتوں کا دل میں اثر نہیں ہے

تیرا خیال اُن کو کیا آئے مستیوں میں یعنی وہ مست ہیں اب اپنی ہی ہستیوں میں
مصروف ہیں کچھ ایسے ظاہر پرستیوں میں جس سے ضمیر اُن کا ہر دم ہے پستیوں میں
اپنی ہی ابتری پر جن کی نہ کچھ نظر ہو،
تیری تباہیوں کی پھر اُن کو کیا خبر ہو؟

اپنے ہی بھائیوں کو کیا کیا ستا رہے ہیں کتنوں کو رنج دے کر راحت اُٹھا رہے ہیں
انسانیت کے کیسے جوہر دکھا رہے ہیں روتا ہے کوئی اور یہ خوشیاں منا رہے ہیں
جس کو سمجھ رہے ہیں یہ اشکِ شادمانی
آنکھوں سے گر رہا ہے گویا حیا کا پانی!

بیوؤں کے تیز نالے دل میں اُتر رہے ہیں بیکس یتیم کیسی فریاد کر رہے ہیں
چھ چھ کروڑ بھائی فاقوں سے مر رہے ہیں کتنے ہی کشتۂ غم جاں سے گزر رہے ہیں
یوں کلفتوں سے ماتا! تیرا منو ہو غارت
سج دھج سے یہ دکھائیں خود جلوۂ امارت

جن کا یہی ہے شیوہ خود بھائیوں سے لڑنا غیروں سے جھک کے رہنا، اپنوں سے پر اکڑنا
ماتا! غضب ہے تیرا ایسوں کے ساتھ پڑنا تجھ کو بگاڑتا ہے ان کا یہی بگڑتا
دکھلائیں اس طرح جو راہِ نفاق تجھ کو
تو اُن سے ہو سکے پھر اتفاق تجھ کو؟

ماتا! عبث ترا تھا ان پر یہ پیار ہونا یوں پال کر پھر ان سے اُمیدوار ہونا
تھا ان کی ذلتوں میں تجھ کو بھی خوار ہونا اُف تیری آرزو کا تھا یوں فشار ہونا
ہستی میں تیرے دم سے جن کا ہوا گزرنا
اے سحر اُنھیں کے ہاتھوں تجھ کو پڑا ہے مرنا!

کرشن جی کی نذر

از منشی منظور الحق صاحب حکیم

کیسی ہے دلکشی بھری صورت نے نواز میں حسن سمٹ کے آگیا جلوہ گہ مجاز میں
ایک طرف جمال کرشن جس نے شکست فاش دی ایک طرف جلال کرشن کنس کے ترکتاز میں
پریم کی بدلیاں اُٹھیں چھا گئیں سارے ہند پر کوندتی برقِ حسن ہے چشمِ نظارہ ساز میں
قابلِ غور و فکر ہیں ارجن و کرشن کے قصص بھر گیا ذوقِ غزنوی کیسے دلِ ایاز میں
راز تو ہے کلیم کچھ کرشن کی شکل دلفریب
پتلی کی طرح پھرتی ہے آج بھی چشم باز میں

آزاد ہندوستان

مشہور بنگالی شاعر نذر الاسلام کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ

از مولوی محمد حسین خطیب بنگالی

مصیبتوں کے طوفان میں تباہی کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔
اور اُن میں بربادی کی بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔
مگر ہم شوریدہ سر لوگوں نے اندھیری رات میں اپنی ٹوٹی ہوئی ناؤ دریا میں ڈالدی ہے
کالے بادلوں میں کھیلتی ہوئی تباہی کی بجلی ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔
ہمارے قدموں کے اثر سے تپتے ہوئے ریگستان میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔
ہمارا جادو اثر جوش سنسان اور اندھیرے قبرستان میں زندگی کی لہر دوڑا رہا ہے۔
ہم شمع کی لو کی طرح گھر گھر روشنی پہنچاتے پھرتے ہیں۔

"حیاتِ نو" کے "ساحلِ فرات" پر پیاس کی شدت سے
کربلا کے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں۔
سر پر جلتا ہوا آفتاب ہے۔ اور پاؤں کے نیچے تپتا ہوا ریگستان،
یوروپی یزید کی فوجیں اِدھر اُدھر، نزدیک اور دُور بکھری پڑی ہیں۔
اور ہم اُن کے محاصرہ میں "عباس" کی طرح پانی لایا کرتے ہیں۔

جب ظالم "فرعون" "موسیٰ" اور صداقت کو فنا کے گھاٹ اُتارنا چاہتا ہے۔
تو ہم دریائے نیل کی فوجیں بن کر اُسے غرق کر دیں گے۔
آج بھی "نمرود" "ابراہیم" کو ہلاک کرنے پر آمادہ ہے۔
مگر رحمت کے فرشتے دہکتی ہوئی آگ میں پھول کھلادیں گے۔
ہم ملک کے ڈرپوک اور کمزور دل لوگوں کو

ہمت افزا گیت سنائیں گے۔
اور بوڑھوں کو جوانوں کا دل دے کر میدان میں لا کھڑا کریں گے۔
ہماری اُمیدوں کی رنگین اور پُر بہار صبح
سیاہ قسمت رات کے آنسوؤں کو شبنم بنا کر پھول کھلا دے گی۔
ہم زندگی کی مشعل جلا کر تاریک اور طوفانی راتوں کو
صبح سے زیادہ روشن بنا دیں گے۔
نئے زمانہ کے نئے مسافر اسی راہ سے گزریں گے۔
اس لئے آج ہی سے ہم اپنی روح اپنا دُکھ سُکھ
سب کچھ اسی راہ پر بچھانا شروع کر دیں گے۔

مستقبل کا آزاد، حیات پرور، اور نور فشاں پرچم،
جس دن فتح کے رتھ پر انتہائی شان سے اُڑتا ہوگا۔
جس دن "آزاد ہندوستان زندہ باد" کے نعرے،
آسمانوں سے گزر کر "عرش اعظم" کو چومیں گے
اُس دن ہم دو تاروں کی دنیا میں
تمہاری مسرت کا تصور کر کے دل کھول کر مسکرائیں گے۔

رُباعیات منوّر

از حضرت منور لکھنوی

ہر ذرہ سے کسب نور کرتا ہوں میں
گرد ظلمت کو دُور کرتا ہوں میں
دل ہی کو بناتا ہوں مقام معراج
سینے ہی میں سیر طور کرتا ہوں میں

دریا جو کوئی عبور کر لیتا ہوں
گرداب سے خود کو دُور کر لیتا ہوں
یہ سوچ کے پھر زعم نہ کر دے مجھے غرق
ساحل پہ نظر ضرور کر لیتا ہوں

دنیا کے تعلق سے کنارا کرتے
دل کا یہ تلوّن نہ گوارا کرتے
رہتے جو ذرا ہوش ٹھکانے اپنے
ہستی و عدم میں سر نہ مارا کرتے

فریب

(ایک ڈرامہ)

محترمہ صفیہ سلیم عبدالواحد صاحبہ ~~سکینہ بیگم صاحبہ~~ بی-اے بریلی کے قلم سے

افراد

(۱) زاہد حسین :- سراغرساں
(۲) محمود :- مظلوم
(۳) ذاکر :- محمود کا دوست
(۴) حامد :- زاہد حسین کا دوست
(۵) اشرف :- پولیس آفیسر
(۶) لیاقت حسین :- مجرم
(۷) رحیم :- زاہد حسین کا نوکر

(پہلا سین)

ایک کمرہ میں زاہد اور حامد بیٹھے ہیں۔

زاہد :- "کیوں حامد! تمھاری کیا رائے ہے آج سینما چلیں؟ احسن کا بڑا اصرار ہے۔"

حامد :- "بھئی ضرور چلو۔ بہت دن سے جانا ہی نہیں ہوا۔ اچھا تو آج چلنا طے ہے؟"

زاہد :- "ہاں! آج ضرور۔"

(اتنے میں نوکر ایک ملاقاتی کارڈ لے کر آتا ہے۔ زاہد کارڈ دیکھتا ہے۔)

حامد :- "کون ہیں؟"

زاہد :- (کارڈ دیتے ہوئے) "کوئی صاحب محمد ذاکر ہیں۔" (نوکر سے) "رحیم! ان صاحب کو بلالو۔"

رحیم :- "بہت اچھا۔"

محمد ذاکر داخل ہوتے ہیں۔ حامد اور زاہد دونوں صاحبان کی طرف پریشانی یا گھبراہٹ کے انداز سے دیکھتے ہیں۔

زاہد :- "تشریف رکھئے۔"

(ذاکر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

زاہد :- "فرمائیے میں حاضر ہوں؟ (حامد کی طرف اشارہ کرکے) یہ میرے دوست حامد ہیں۔"

ذاکر:۔ "مجھے ایک نہایت اہم اور نجی معاملہ میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ نے سیکڑوں مجرم پکڑے ہونگے، مگر کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ ایک نہایت ہی اصول کا پابند اور غیر معمولی طور پر دیانتدار شریف آدمی روپیہ لے کر بھاگ جائے۔ اس کو نہ اپنی عزت کا خیال ہو اور نہ اپنی خاندانی بدنامی، نیکنامی کا لحاظ۔ میں تو صاحب کبھی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ بھائی محمود چور ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میرے گھر کیوں نہیں آئے۔ آپ یقین کیجئے کہ محمود کے سے بااصول آدمی سے ہرگز ایسی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔"

زاہد:۔ (سگریٹ پیش کرتے ہوئے) "معاف کیجئے میں حالات سے بالکل ناواقف ہوں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ اطمینان سے کل واقعہ بیان کریں۔"

ذاکر:۔ (شرمندہ ہوکر) "معاف فرمایئے، مجھ کو بدحواسی میں یہ خیال نہیں رہا کہ میں ایک قطعی ناواقف شخص سے حالات بیان کر رہا ہوں۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ محمود بھائی میرے گھر رہتے تھے محمود در اصل میرے بھائی نہیں ہیں لیکن تعلقات حقیقی بھائیوں سے زائد ہیں۔ بیروزگاری کے باعث وہ پریشان تھے، اور جو اخبار دیکھتے یا جہاں خالی جگہ سنتے وہاں درخواست ضرور بھیجتے۔ تقریباً بیس یا بائیس روز ہوئے ہمدرد میں ایک اشتہار چھپا کہ ایک سکرٹری کی ضرورت ہے۔ محمود نے درخواست بھیجی اور ۲۰ مارچ کو انتخاب کے سلسلہ میں اُن کو بلایا گیا۔ اور پچاس روپیہ ماہوار پر تقرر ہوگیا۔"

زاہد:۔ (گہرے غور کے انداز میں) "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ تقرر کے وقت کچھ شرائط بھی ہوئی تھیں؟"

ذاکر:۔ "محمود بھائی سے صرف دو تین بیڈھنگے سوال کئے گئے اور بس تقرر ہوگیا۔"

زاہد:۔ "مثلاً؟"

ذاکر:۔ "ان سے پوچھا گیا کہ وہ شادی شدہ ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب انھوں نے نفی میں دیا۔ اس کے بعد رشتہ دار پوچھے گئے جس پر انھوں نے بتایا کہ اُن کا کوئی رشتہ دار زندہ نہیں ہے اور وہ میرے یہاں رہتے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ میں اُن کا کون ہوں؟ انھوں نے کہا کہ میں اُن کا دوست ہوں، اُن سے کوئی رشتہ نہیں۔"

زاہد:۔ "بڑے دلچسپ سوالات تھے۔"

ذاکر:۔ "جی ہاں، محمود خود اس کا مذاق بناتے تھے۔"

زاہد:۔ "پھر کیا ہوا؟"

ذاکر:۔ "محمود بھائی کا تقرر ہوگیا اور کچھ پرانی کتابوں کی فہرست بنانے کا کام اُن کے سپرد ہوا۔"

زاہد:۔ "بس؟"

ذاکر:- "جی ہاں- اب ایک ہفتہ ہوا کہ بھائی محمود آئے تو ایک عجیب واقعہ بیان کرتے تھے- کہتے تھے کہ لیاقت علیخاں آئے اور ان سے کہا کہ اُن کے کپڑے پہن کر کچھ دیر کے لئے پیٹھ پھیر کر کھڑکی میں بیٹھ جائیں"-

زاہد:- "لیاقت علی خان کون صاحب ہیں؟"

ذاکر:- "لیاقت علی خان اُن صاحب کا نام ہے جن کے یہاں بھائی محمود سکرٹری مقرر ہوئے تھے"-

زاہد:- "تو لیاقت علی خان کے بھیس میں محمود صاحب کو کھڑکی میں بٹھایا گیا؟"

ذاکر:- "جی ہاں! محمود بھائی کو جب لیاقت علی خان نے دیکھا کہ اُن کے کپڑے پہننے میں تأمل ہے، تو اُن سے کہا کہ کوئی اہم بات نہیں بلکہ ایک دوست کو دھوکا دے کر محض مذاق کرنا مقصود ہے۔ قصہ مختصر محمود بھائی کہتے تھے کہ وہ اُن کا کوٹ پہنکر کھڑکی میں بیٹھے۔ اُس کے بعد جو محمود بھائی میرے گھر آئے تو کہتے تھے کہ اُن کا دل اِس نوکری سے بیزار ہوگیا ہے۔ اس سے جلد سے جلد علیحدگی کا ارادہ ظاہر کرتے تھے۔ آج صبح یکایک میرے گھر لیاقت علیخان آئے اور بولے کہ محمود پرسوں ایک ہزار کی اشرفیاں اُن کے گھر سے لیکر غائب ہوگئے۔ اور وہ اُن کی تلاش میں میرے گھر آئے ہیں۔ مجھکو یہ واقعہ سُن کر سخت حیرت ہوئی۔ یہ تو میں کسی طرح یقین ہی نہیں کرسکتا کہ محمود چوری کرسکتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ محمود ہیں کہاں؟"

زاہد:- "آپ نے لیاقت علی خاں سے کیا کہا؟"

ذاکر:- "میں نے اُن سے کہا کہ اُن کا خیال بالکل غلط ہے۔ یہ حرکت کسی اور نے کی ہے"

زاہد:- "لیاقت علی خان کہاں رہتے ہیں اور اُن کے ساتھ کون کون رہتا ہے؟"

ذاکر:- "لیاقت علی خان کے بیوی بچے نہیں ہیں- وہ تنہا کوٹھی نمبر ۲۳ قرولباغ میں رہتے ہیں- اُن کے صرف ایک رشتہ کے بھائی الطاف علی ہیں- جو کبھی کبھی اُن سے ملنے آیا کرتے ہیں لیکن رہتے کہیں اور ہیں"

زاہد:- "اچھا تو آپ ذرا مسٹر محمود کا حلیہ لکھکر مجھکو بھیج دیجئے- میں حتی الامکان اُن کا پتہ لگانے کی کوشش کروں گا"

(ذاکر چلا جاتا ہے)

حامد:- "زاہد یہ تو دلچسپ واقعہ"-

زاہد:- "ہاں اب سوال یہ ہے کہ کس کے قول کا اعتبار کیا جائے- لیاقت علی خان کا یا ذاکر کا۔ محمود اگر واقعی مجرم ہے تو اس کا روپوش ہونا کوئی نئی بات نہیں، اور اگر بیگناہ ہے تو روپوش کیوں ہے؟"

حامد:- "میرے خیال میں تو محمود حاجتمند تھا اس کی نیت کا بگڑنا تعجب کی بات نہیں- اور وہ محض پولیس کے خوف سے روپوش ہے لیکن لیاقت علی خاں نے پولیس میں اطلاع کیوں نہیں کی ورنہ ضرور گرفتار ہو جاتا۔

جتنی دیر میں رپورٹ کریں گے اتنی ہی دقت اُس کے پتہ چلنے میں ہوگی۔"

زاہد:۔ (ایک ساتھ کرسی سے اٹھ کر) "حامد تم غیر معمولی طور پر سمجھدار ہو، جو بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی وہ تم نے سمجھ لی۔ بس بھائی جلد کرو۔ محمود شدید خطرے میں ہے۔ پولیس میں خبر نہیں کی ورنہ پتہ چل جاتا۔"

حامد:۔ (گھبرا کر) "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی، جس سے تم کو محمود کے خطرے میں ہونیکا خیال ہوگیا"

زاہد:۔ "حامد خدا کے لئے جلدی چلو۔" حامد:۔ "کہاں؟"

زاہد:۔ "لیاقت علی کے گھر!"

زاہد اور حامد دونوں قرول باغ پہونچے۔ کوٹھی میں گھستے ہوئے۔ حامد یہ تو خالی معلوم ہوتی ہے؟

زاہد:۔ "حامد، آہستہ سے، تم کو بو نہیں معلوم ہوئی؟" حامد:۔ "ہاں، اسپرٹ کی سی بو آرہی ہے۔"

زاہد:۔ "حامد جلدی کرو۔ خدا کے لئے جلدی اس کھڑکی کو توڑ دو۔"

(دونوں ملکر کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہوتے ہیں۔ اندر کمرے میں محمود بیہوش خون میں تر بتر پڑا ہے۔ زاہد اور حامد اٹھا کر باہر لاتے ہیں، اتنے میں کمرے میں آگ لگ جاتی ہے)

حامد:۔ (نبض دیکھ کر) "زندہ ہے خیر ہوگئی۔ اگر کہیں دس منٹ کی دیر ہوجاتی تو بیچارہ جل کر مرجاتا۔"

(موٹر میں ڈال کر پولیس اسٹیشن لے جاتے ہیں۔ جیب میں سے کھٹ سے کوئی چیز گرتی ہے)

حامد:۔ "یہ کیا؟" زاہد:۔ "مصنوعی دانت۔"

(دوسرا سین)

انشورنس کا دفتر

زاہد:۔ "آپ لیاقت علی خان کے بھائی الطاف علی خاں ہیں؟"

الطاف علی:۔ "جی ہاں!" زاہد:۔ "آپ ہی مرحوم کے کل ترکے کے وارث ہیں؟"

الطاف علی:۔ "جی ہاں، کیونکہ میرے مرحوم بھائی کے کوئی اور نہ تھا۔ اس لئے میرے ہی حق میں وصیت کی تھی کیا خبر تھی کہ یہ حادثہ پیش آئے گا۔"

زاہد:۔ "تیس ہزار انشورنس کے سوا جو کچھ لیاقت علی کا ترکہ ہے اُس کے بھی آپ ہی جائز وارث ہیں، اس لئے اجازت دیجئے کہ میں آپکو آپ کے بھائی کی نشانی پیش کردوں۔"

(جیب سے مصنوعی دانت نکالکر دیتا ہے)

الطاف علی:۔ "یہ کیا؟"

زاہد:۔ یہ آپ کے مرحوم بھائی کے دانت ہیں جو آگ کی زد سے بالکل محفوظ رہے اور آپ کے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں

(اشارہ کرتا ہے دو کانسٹبل پکڑ کر وہ دانت الطاف علی کے لگا دیتے ہیں اور مصنوعی مونچھیں الگ کر دیتے ہیں) ۔

زاہد:۔ (اشرف علی سے) "معاف کیجئے میں آپ سے اِن کا (الطاف علی کی طرف اشارہ کر کے) تعارف کرانا بھول گیا۔
لیجئے اشرف صاحب یہ ہیں لیاقت علیخاں مرحوم یا الطاف علی خاں بقید حیات۔ اب میرا کام ختم ہوا یہ آپکے سپرد ہیں"

اشرف:۔ "لیکن کم از کم یہ تو بتائیے کہ آپ کو یہ سب واقعہ کیسے معلوم ہوا؟"

زاہد:۔ "محمود کے نوکر اور غائب ہونے کا واقعہ تو محمد ذاکر صاحب سے معلوم ہوا۔"

اشرف:۔ "وہ تو ہمارے یہاں بھی محمد ذاکر نے رپورٹ کی لیکن آپ یہ کیسے سمجھے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟"

زاہد:۔ "حامد صاحب نے اصل مجرم کا پتہ مجھکو بتایا"

حامد:۔ "زاہد صاحب مذاق کرتے ہیں۔ میں خود حیران ہوں کہ محمود کے بجائے لیاقت علیخاں پر ان کو کیسے شبہ ہوا؟"

زاہد:۔ "تم نے کہا تھا کہ پولیس میں اطلاع کیوں نہیں کی جو پتہ چل جاتا۔ اس بات پر غور کرنے کے بعد مجھ کو یہ یقین ہو گیا کہ لیاقت علی خاں، محمود کا پتہ چلانا نہیں چاہتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیوں؟ ظاہر ہے کہ مجرم کے حق میں بیگناہ شخص کا لاپتہ ہی رہنا مفید ہے۔ اس صورت میں ایک مجرم یہ کرے گا کہ مظلوم کو کسی جگہ مقید کر دے۔ جہاں سے جبتک اُس کی مصلحت ہو رہائی ناممکن ہو۔ اب بالکل معاملہ صاف تھا کہ محمود مقید ہے۔ اس کے بعد محمود کو اپنے کپڑے پہنانے کی اہمیت میری سمجھ میں آگئی کہ محمود کو لیاقت علیخاں بنا کر کہیں رکھا ہے۔ یہ سمجھ میں آتے ہی میں نے محمود کی تلاش شروع کر دی، اور وہ جس طرح ملا آپ کو معلوم ہے اُس غریب کے چھ دانت نکال کر مصنوعی دانت جیب میں رکھ دیئے گئے تھے۔ تاکہ آگ لگنے کے بعد اُن دانتوں کی شناخت سے محمود کی لاش سے لیاقت علیخاں کا مرنا ثابت ہو جائے اور لیاقت علی الطاف علی بنکر تیس ۳۰ ہزار انشورنس کا روپیہ وصول کریں۔"

اشرف:۔ "لیاقت علی خاں نہایت ہی خطرناک آدمی ہے۔"

زاہد:۔ "جی ہاں، مگر انسان سے غلطی ہوتی ہے اِن سے بھی ہو گئی۔ اُنھوں نے یہ تو معلوم کر لیا تھا کہ محمود کے کوئی رشتہ دار نہیں ہے لیکن یہ معلوم کرنا بھول گئے کہ کوئی دوست بھی ہے یا نہیں۔"

رازِ دل

(مس کے۔ احمد شجاع صاحبہ)

صبر کو آزما کے دیکھ لیا ۔۔۔ تیر یہ بھی چلا کے دیکھ لیا
لاکھ پردے میں تم چھپے لیکن ۔۔۔ ہم نے پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا
بے وفا ہے وہ بے وفا ہم نے ۔۔۔ آزما آزما کے دیکھ لیا
کہتی ہے خاک شمع و پروانہ ۔۔۔ جل کے دیکھا جلا کے دیکھ لیا
ہے ندامت سی رازِ دل کہہ کر ۔۔۔ راز اُن کو بتا کے دیکھ لیا
خود ہی محفل میں ہو گئے رُسوا ۔۔۔ تم نے ہم کو اُٹھا کے دیکھ لیا

نہیں کوئی انیسِ غم عصمت
ہم نے خوب آزما کے دیکھ لیا

جذباتِ جنوں

عشق پابند نے ہر قید سے آزاد کیا ۔۔۔ خود کو ہم بھول گئے اتنا تجھے یاد کیا
اپنے مجبورِ محبت کی یہ مجبوری دیکھ ۔۔۔ دل نے ہر درد کے ہمراہ تجھے یاد کیا
کوئی راحت مجھے سامانِ مسرت نہ ہوئی ۔۔۔ ہاں ترے غم نے ترے غم کی قسم شاد کیا
آج ممکن نہ ہوا ضبطِ محبت دل سے ۔۔۔ چپکے چپکے تری آنکھوں نے وہ ارشاد کیا

چشمِ مخمور نے مخمور کیا دل کو جنوںؔ
ایک مے نوش نے اک میکدہ آباد کیا

مُباحثہ

قتیل اور غالب

(از حکیم ابو العلاء ناطق صاحب لکھنوی)

بذکرم رگ شبے زندہ داشتن ذوقیست
گرت فسانۂ غالب شنیدنست مخسپ

سید اسد علی صاحب انوری نے "قتیل اور غالب" کے نام سے ایک رسالہ لکھکر مکتبۂ جامعہ دہلی میں چھپوایا ہے جس کا اصل مقصد صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کو غالب نے جو زبان و قلم سے مقتول کیا ہے اُس کا انتقام لیا جائے اسی لئے غالب کی زندگی کا کوئی شعبہ باقی نہیں رہا جس کے پوست کندہ حالات قلمبند نہ کئے گئے ہوں اور ہر بات بڑی تحقیقات و استدلال سے لکھی گئی جس کی وجہ سے یہ کتاب قابل توجہ ہوگئی ہے۔

جن لوگوں نے اس کتاب کو تمام و کمال نہیں دیکھا اُن کو یہ مغالطہ ہوسکتا ہے کہ قتیل اور غالب کا ادبیات میں مقابلہ اور موازنہ کیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ مؤلف نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ غالب فارسی میں تو غالب تھا ہی، اُردو میں بھی تخئیل کے لحاظ سے قتیل کو کوئی نسبت نہیں تھی، کیونکہ قتیل کا مایۂ ناز کمال شاعری تھا دوسرے اُردو شاعری سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتا تھا۔

انوری صاحب نے قتیل پر سے وہ اعتراضات رفع کئے ہیں جو غالب کی طرف سے وارد کئے گئے ہیں، اور غالب پر ہر حیثیت سے اعتراضات کئے ہیں، مثلاً چند عنوان پیش کرتا ہوں جو اس کتاب کے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

بداخلاقی۔ محسن کشی۔ فحش کلامی۔ عزیزوں سے بے رُخی۔ بی بی سے نفرت۔ انعام و خطاب کی ہوس۔ انگریزوں کی بھبتی۔ ادبیات میں صحت و سند کا غلط معیار۔ اساتذۂ سلف کا حسب ضرورت اقرار اور انکار۔ معروف و مقبول ادیبوں سے رشک و حسد اور دشمنی۔ قتیل سے دشمنی اور کلکتہ میں غالب پر اعتراضات۔ غالب کی ادبی غلطیاں برہانِ قاطع پر ردّ و قدح۔

مَیں (تبصرہ نگار) غالب کا معتقد ہوں، خصوصاً اُردو شاعری کی تخئیل و طرز ادا کا، اور فارسی کلام کی فارسیت میں فارسی کا۔ اور ہمیشہ ان حملوں کو تقریراً اور تحریراً رد کرتا رہا ہوں جو کسی نے ان پر کئے ہیں۔ مگر انوری صاحب نے غالب پر ایسا بھاری طعنہ کر دیا ہے کہ ع "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

تاہم اخلاقی اور ادبی فرض یہ ہے کہ ایک کامل فن شاعر جو مرنے کے بعد دعائے مغفرت کا محتاج ہے جب اُس کی لاش پر ذلت اور رسوائی کی بارش ہو رہی ہو۔ اگر سائبان نہ ہو سکے تو چھتری ہی لگا دیجائے۔ اخلاقی حیثیت سے غالب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اُنھوں نے رئیسوں کی بھٹئی کی ہے اور سب سے پہلے انگریزوں کی مدح میں قصائد لکھے۔

واقعہ یہ ہے کہ سلاطین۔ عمائد اور حکام وقت کی مدح میں متنبی۔ ابونواس۔ اصمعی سے لیکر انوری۔ سعدی خسرو۔ اور انشا۔ ذوق۔ اخیر تک سب ہی نے قصائد لکھے اور سب نے دنیوی منافع کے لئے مدح خوانی کی، بلکہ تمام دنیا میں ایسے شعرا بہت کم نکلیں گے جنھوں نے قصیدہ گوئی سے گریز کیا ہو جس کو دیکھنا ہو خزانۂ عامرہ میں ان کا تذکرہ دیکھ لے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے کچھ زیادہ لوگوں کی مدح سرائی کی یا مدح میں زیادہ قصیدے لکھے، تو اس کی ذمہ داری اُن رؤسا پر ہے جنھوں نے قدر نہیں کی اور بخل سے کام لیا، ورنہ اگر کوئی رئیس قدردانی کرتا تو وہ کیوں مارے مارے پھرتے۔ امیر خسرو نے کتنی جگہ ملازمت کی، اور کتنی جگہ ایک جگہ سے دوسری جگہ صرف جلب منفعت کے لئے تبدیل ملازمت کرکے گئے، اور اپنے قدیم وطن کو چھوڑا۔ اُردو شاعروں میں میر محمد تقی میر کو غالب سے بھی زیادہ دروازے کھٹکھٹانے پڑے، اور سوائے لکھنؤ کے کہیں نباہ نہ کرسکے۔ غالب کو بھی انھیں لوگوں میں سمجھیے

دوسرا اعتراض غالب پر یہ ہے کہ اُنھوں نے وطن اور بیوی اور اعزا کی شکایت کی اور اُن سے اچھا سلوک نہیں کیا۔ اِن امور کے متعلق گزارش یہ ہے کہ وطن کیا اگر جنت بھی ہو تو ہر آدمی خصوصاً شاعر جو ایک آزاد طائر سے کم نہیں ہوتا ایک جگہ رہتے رہتے کیوں نہ گھبرا جائے۔ خصوصاً جبکہ وطن میں آمدنی محدود ہو اور ضروریات میں اضافہ۔ رہ گئیں بیوی وہ جداگانہ طبیعت رکھتی تھیں، یہ رند وہ ثقہ، ان کی آمدنی میں کوئی حصہ نہ لگائے بلکہ کچھ اضافہ ہوتا رہے، وہاں اُنھوں نے پنشن بھی اپنے نام کرالی تھی۔ پھر اعزا کی کفالت اور کنبہ پروری کہاں سے ہوتی۔

غالب کی فحش کلامی۔ غالب نے غصے میں جو فحش الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ عام وخاص خصوصاً مذاق سلیم رکھنے والے لوگوں کے نقطۂ نظر سے نہ صرف کریہہ بلکہ غیر شریفانہ ہیں۔ مگر دہلی کے عام مذاق سے کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہیں۔ وہاں کے لوگ باہم مزاحیہ طور پر ایسے الفاظ استعمال کرنے کے اکثر خوگر تھے۔ اور ماشاء اللہ سودا اور انشا کے فواحش سخن کو دیکھکر غالب کا یہ جرم خفیف سمجھنا چاہیئے۔ یوں بھی طعن وتشنیع کے پیہم سلسلے نے غالب کے غم وغصہ کے شعلوں کو اس قدر بلند کردیا تھا کہ اُن کی زبان قابو میں نہ رہ سکی۔

تاہم یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ غالب سے زیادہ میر کو فلاکت نے دربدر پھرایا تھا، اور حوادث روزگار نے جو صدمات

تیر کو پہونچائے تھے وہ غالب کو نہ پہونچے تھے۔ لیکن یہ طبعاً صدمات کے اثر کو دل میں جذب اور ضبط کرتے تھے اور غالب میں اس قدر نفسی قوت نہ تھی۔ بیشک اُن کا یہ جرم کہ انھوں نے قتیل کی روح تک کو غیر مہذب الفاظ کے شعلے پہونچائے قابل معذرت یا قبول معذرت کے قابل نہیں ہیں۔ پھر بھی جس طرح اُنھوں نے قتیل کی روح کو صدمہ پہونچایا ہے ہم کو مناسب نہیں کہ ہم غالب کی روح کو شرمندہ کریں۔

کلام غالب کے ادبی کارنامے چار شکلوں میں ہیں، اُردو ونثر۔ فارسی نثر فارسی نظم اُردو نظم۔ اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط ہیں، بہت کم حصہ تقریظوں کی شکل میں ہے، جیسے فسانۂ عجائب سرور کی تقریظ، جوکہ بالکل اُسی رنگ میں ہے جس رنگ میں فسانۂ عجائب ہے۔ اور یہ طرز عبارت اُس زمانہ کا بہترین اور پُرکار نقش انشا سمجھا جاتا ہے۔ جو بعد کو سادہ لباس میں تبدیل ہوا۔ اور جس کے اعلیٰ ترین مناظر میر خواجہ درد کے سہل ممتنع اشعار میں سب سے بلندی پر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کے بعد غالب کی اُردوے معلیٰ ہے، اور ذوق و آتش کے کلیات ہیں۔

غالب کی فارسی نثر، جو کلیات نثر فارسی کے نام سے طبع ہوگئی ہے۔ ان کی فارسی نثر و نظم خسرو کے بعد نقش ثانی فخر ہندوستان ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان گلہائے ایران کو ہندیت کے پانی سے غالب نے نہیں سینچا ہے۔

مگر اُردو غزلوں میں اُردو کی بیخ و بنیاد متزلزل کردی ہے، اگر ذوق و آتش اور خود اُن کے خطوط نہوتے تو اُردو زبان اپنی ترقی اور صناعی و لطافت کی شاہراہ سے گمراہ ہوکر منزل تکمیل سے منحرف ہوجاتی۔ انھوں نے اپنی اُردو شاعری کا اصل اصول یہ رکھا تھا کہ جس قافیے کے ماتحت اُن کو ایسا جدید اور لطیف مضمون مل جاتا تھا کہ شعر ممتنع ہوکر نظم ہوجائے اس میں کوئی اغلاق یا ترکیب فارسی نامانوس داخل نہیں کرتے تھے، اور اگر ایسا مضمون نہیں ملتا تھا تو شعر کو عام سطح سے بلند کرکے ایسی پیچیدگی ڈال دیتے تھے اور الفاظ اِس قدر ذنی کردیتے تھے کہ خواہ نخواہ الغریہ مرد آدمی معلوم ہو۔ اس حد سے دیوان میں دورنگ کے اشعار میں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ فارسی ٹکڑے اُردو زبان کے راستے میں روڑے بن گئے ہیں۔ چونکہ شعر کی تمام لطافتوں نزاکتوں اور تاثیر و کیفیت شعری کا دارومدار زبان کی خوبی اور فصاحت ہے۔ جس شعر کے اثر اور برمحل الفاظ کی حقیقت اور فلسفے پر غور کیجئے گا تو اُس کی تہ میں زبان کی خوبیاں پوشیدہ نظر آئیں گی۔

خود غالب نے اپنے اس رنگ کے اشعار میں بے کیفی محسوس کرلی تھی۔ اور ایک مرتبہ ذوق پر ظاہر بھی کردیا تھا کہ میں اپنے اس ادبی نقص سے ناواقف نہیں ہوں۔ ع بگذر از گلدستۂ اُردو کہ بیرنگ من است۔

یہ بیرنگی صرف اس وجہ سے تھی کہ اُردو بچہ کے حلق میں فارسی کے بڑے اور سخت نوالے ٹھونسے گئے جو اس قدر ثقیل تھے کہ چالیس سال کے بعد ہضم ہوئے اور اب اُن کی قدر ہوئی، مگر قدر کرنے والوں میں

جو شعرا مقلدِ غالب ہوگئے اُن کو نہ تو یہ قابلیت ہے کہ جہاں فارسی ترکیب غلط یا صحیح استعمال کرکے شعر کو عام سطح سے بلند کیا ہے، وہاں غالب کی پوری تقلید کرکے غالب کے ایسے مہمل ممتنع شعر اور نادر الوجود مضامین بھی پیدا کرکے دکھاتے۔ ورنہ تقلیدِ مہمل سے بجز تحصیل مہمل اور کیا حاصل۔ اور اُردو کی تخریب گھاتے میں رہی مگر ہندوستان میں کچھ ایسے بھی مقلدِ غالب ہوئے ہیں جو وحشت (کلکتہ) اور صفی لکھنوی کی طرح فارسی کی صحیح ترکیبوں تک غالب کی تقلید محدود رکھتے ہیں، اور جدت اور تجدید بھی رکھتے ہیں۔ بہرحال غالب کی فارسی نما اُردو نے اُس وقت غالب کو ذوق کے مقابلے میں ناکام رکھا۔ ادھر نوجوان اور شوخ مزاج شاعروں نے مہمل ٹکڑے اور مضحک پیوند لگا کے اشعار جوڑے اور غالب کو چڑھانے کے لئے اُن کے سامنے پڑھے اور تمسخر کرکے اُن کو جلایا۔

اُردو کلام کی تو یہ گت ہوئی اور فارسی کا یہ حشر ہوا کہ باوصف کمال و کامیابی اُن کی عدم ہر دلعزیزی کا ایک سیلاب دہلی سے بنگال تک پھیل گیا، ہر طرف سے لے دے ہونے لگی، ہر طرف اعتراضوں کے طومار حملوں کی آندھیاں اور نفرت و عداوت کے شعلے اُٹھنے لگے۔ اتنا بڑا کامل فن جس نے اُردو میں ایسے شعر کہہ دیئے کہ لاکھوں مقلد منہ چڑھاتے ہی رہ گئے مگر ایک شعر بھی اس رنگ اور اس ترکیب کا نہ کہہ سکے جس میں غالب نے پچاسوں شعر کہہ دیئے۔ بہرحال تمام دنیا نے اس یکتائے روزگار کی دشمنی پر کمر باندھ لی۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ ہم کو صرف اسلئے اُن اسباب کی تلاش کرنا چاہیئے کہ ہم اور ہمارے ہم خیال اِن بلاؤں میں مبتلا نہ ہوں۔

غالب کی ذہنیت اپنے کلام کے بارے میں یہ تھی کہ اُن کی فارسی قابلیت الہامی ہے اور دوسروں کی اکتسابی جیسا کہ اُن کے اشارات سے ظاہر ہے

ع "ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب"

ع "جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب"

اس کے متعلق غالب کو اپنے اوپر اعتماد ہو گیا تھا، جس کا اظہار صرف شاعری ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ خطوط میں بے شمار مقامات پر اُنھوں نے اپنی خود اعتمادی اور "انا ولا غیری" کو صاف صاف ظاہر کیا ہے ان باتوں سے دو خرابیاں پیدا ہوگئیں، اول یہ کہ خود ستائی کا قدرتی خاصّہ یہ ہے کہ لوگوں کو نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور عام طبیعتیں نکتہ چینی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ دوسری بلا یہ نازل ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھتا ہے تو وہ دوسروں کی زیادہ تحسین و شہرت سنتا ہے تو رشک و حسد اور صدمہ و ملال پیدا ہوتا ہے جب اُس کی اور ترقی ہوتی ہے تو ایک ہنگامۂ عظیم برپا ہوتا ہے، اپنے آپ کو غم و غصہ اور کوفت، دوسروں کو بغض و عداوت حسد جنگ کی تیاری۔ لکھنؤ میں قتیل کی قابلیت قدردانی کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل سمجھی گئی۔ بنگال

کے قاضی محمد اختر خاں جن کو غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا قتیل کے شاگرد ہوئے اودھر مولوی غلام امام شہید حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور یہ سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔

برہان قاطع کے مصنف نے اپنے دیباچہ میں جو ماخذ اپنے لغات کے تحریر کئے ہیں اُن میں میرزا قتیل کی چار شربت کا بھی نام لیا ہے۔ غیاث الدین نے غیاث اللغات لکھی تو انھوں نے بھی تصانیف قتیل کے حوالے دیئے۔ یہ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ صدہا دوست حتیٰ کہ غالب کے شاگرد اور معتقد بھی قتیل کے معترف نظر آنے لگے، غالب جب کلکتہ گئے تو وہاں بھی اردو میں اختر اور فارسی میں قتیل کا آوازۂ شہرت اس قدر بلند تھا کہ ہر آواز تحلیل ہوکر فانی و نامسموع ہو جاتی تھی۔

ہر طرف کی نا امیدی پر غالب کے غم و غصہ نے انھیں بدمزاج اور بدزبان بنا کر عام نفرت و دشمنی پھیلا دی۔ ایسے حوادث میں اگر شاعر کے دماغ میں شعر و شاعری سے کوئی گوشہ بچ رہتا ہے تو وہ موقع کی نزاکت اور زمانہ کی نامساعدت کو دیکھ کر نقل و حرکت کرتا ہے۔ غالب نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ گمان کیا کہ قتیل کو نالایق اور نا قابل بنانے سے لوگ مرعوب و مغلوب ہو کر غالب کو غالب سمجھیں گے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی اُن کی اُمید کے خلاف نکلا اور اُن کے خلاف ایک عام نفرت و عداوت پھیل گئی۔ آخر کار انھوں نے وہ کام جو پہلے کرنا چاہیئے تھا بعد کو کیا یعنی اپنی سخت مزاجی کی کمان اُتاری اور جس طرح ذوق کے مقابلہ میں سہرے کی بنا پر ایک عذرت نامہ اردو میں نظم کیا تھا اُسی طرح کی ایک نظم کلکتہ میں پڑھی، لیکن لوگوں پر اس کا زیادہ اثر اس لئے نہیں ہوا کہ اس سے پہلے برہان قاطع کے قصہ کو طول ہو چکا تھا اور اس فارسی نظم میں بھی قتیل وغیرہ کی توہین کا پہلو نمایاں تھا۔ چند در چند خطوط میں اہل فن معتقد علیہ ادیبوں کو ناشایستہ الفاظ میں بُرا بھلا کہا گیا تھا۔

اِن عبرت انگیز واقعات سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں ہر علم و فن اور کمال و کامیابی سے حسن اخلاق ضروری ہے اور اگر بداخلاقی و بدمزاجی شریک حال ہوتی ہے تو کوئی علم کوئی ہنر کوئی کمال کام نہیں آتا، سب کچھ خاک میں ملجاتا ہے

اعتراضات۔ غالب نے جو اعتراضات قتیل پر کئے ہیں انوری صاحب نے اُن کے جوابات دئے ہیں جن پر اب میں ایک اجمالی نظر ڈالتا ہوں۔

(۱) قتیل کی قابلیت پر غالب کا اعتراض یہ ہے کہ قتیل کی نظر ایرانیوں کے کلام پر کافی و وافی نہیں۔ میری رائے میں اس اعتراض کی تردید قتیل کے تصنیفات سے بوجہ احسن ہوتی ہے، کیونکہ چار شربت، شجرالامانی اور دیگر تصنیفات و کتب قواعد کوئی شخص لکھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ اہل ایران کے کلام پر وسیع نظر نہ رکھتا ہو نور مطالعۂ حیات قتیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قتیل کی عمر کا زیادہ حصہ شبانہ روز ایرانیوں کی صحبت اور تحصیل زبان میں گذرا ہے۔ اسی لئے وہ ایران گئے اور اسی لئے مسلمان ہوئے۔ ایرانیوں کی مصاحبت کا اثر جس شخص کے دین و مذہب

اور عقائد پر پڑا اُس کی زبان پر کہاں تک نہ پڑا ہوگا۔ ایسی حالت میں غالب کا یہ دعویٰ بے دلیل قابل قبول نہیں قتیل اور غالب میں یہی بحث کتاب کی جان تھی حالانکہ اسی بحث کو لوگ سہل انگاری سے نظرانداز کر گئے۔
۲۔ غالب کا دوسرا الزام یہ ہے کہ قتیل کی ادبی معلومات کا ماخذ اور مستند علیہ ایرانیوں کی گفتگو ہے، جو کہ رو اروی میں غلط سلط سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔
گو یہ بات سچ ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ کہ قتیل کی تمام معلومات ایرانیوں کی صرف تقریر اور گفتگو سے مکمل ہوئی ہے،
۳۔ غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ " یہ الّو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ و شفقت کدہ نشتر کدہ، و ہمہ جا، ہمہ عالم کو غلط کہتا ہے۔
(۱) اس عبارت میں دو اعتراض ہیں، قتیل نے صفوت کدہ اور نشتر کدہ کو غلط بتایا ہے۔
(۲) ہمہ عالم و ہمہ جا کو قتیل نے ناجائز قرار دیا ہے۔
یہ دونوں الزام قتیل پر بہتان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، کیونکہ نہ تو اُنھوں نے (قتیل نے) کہیں صفوت کدہ اور نشتر کدہ کا نام لیا ہے اور نہ ہمہ عالم و ہمہ جا کو کہیں غلط بتایا ہے۔ ان اعتراضوں کی ماخذ قتیل کی یہ عبارت ہے:۔

> یکدہ بمعنی خانہ باشد یا پنج لفظ ملحق شدہ سوائے آں مسموع نیست بُتکدہ، غمکدہ، آتش کدہ، میکدہ، گلشن کدہ، وغیر آں چون آب کدہ، نمی دانم درست یا نادرست است یعنی اینہا اُصول اند و سوائے ایں فروع و فروع در اصل داخل است چوں حیرت کدہ بنفیل کدہ، ویراں کدہ، حسرت کدہ، ماتم کدہ، راحت کدہ تغافل کدہ، جہنم کدہ، و بہشت کدہ ہر دو در گلشن کدہ داخل است چرا کہ گلشن جائے گل معنی بود ماتم کدہ و عشرت کدہ تحت غم کدہ داخل اند حصر مقصود نیست الخ

اِس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ لفظ اصول اور باقی الفاظ جو کدہ کے ساتھ مرکب ہیں وہ فروع ہیں اور یہ بھی اصل میں داخل ہیں یعنی ان کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔
قتیل نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صفوت کدہ، اور نشتر کدہ وغیرہ غلط ہیں، مگر میں قتیل کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ پانچ لفظ اُصول ہیں سوائے اس کے مسموع نہیں ہے۔ مسموع کے بارے میں حسب ذیل گزارش ہے:۔

تسکیں کدہ۔ رضی دانش:۔

کعبہ تسکیں کدہ دیر تسلّی گاہ ست نالہ سرکن ہمہ جا خانۂ فریاد رس ست

جفا کدہ۔ سراج الدین خاں آرزو:۔

دریں جفا کدہ از کس مجوے رنگِ ثبات — کہ طفلِ اشک ہم اینجا چو نالہ ہرجائیست

پروین کدہ، حکیم زلالی :-

دریں پروین کدہ چندان بماند — کہ شعرے چند بر شعرے فشاندم (ستارہ)

پریشاں کدہ: جلال اسیر:-

در پریشاں کدۂ یاس بود فیض رسا — سایۂ بید خوش آیند شمالے دارد (بہار عجم)

مجھے اصول و فروع کی تعمیم سے بھی اختلاف ہے۔ غالب نے جو نشتر کدہ، صفوت کدہ و شہرت کدہ کے متعلق لکھا ہے کہ قتیل ان الفاظ کو غلط بتاتے ہیں۔ قتیل نے تو کہیں ان الفاظ کا ذکر بھی نہیں کیا، یہ اُس غریب پر تہمت ہے بلکہ اُنھوں نے تو صاف لکھدیا ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے۔ میں نے ساٹھ ستّر الفاظ کدہ سے مرکب دیکھے ہیں، نہ تو ان میں یہ الفاظ ہیں اور نہ میرا ذاتی ذوق ان الفاظ کو قبول کرتا ہے جب تک کسی ایرانی کے کلام میں دیکھ نہ لوں۔

۴۔ غالب کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قتیل نے نثر مسجّع و عاری کی تعریف غلط بتائی ہے، حالانکہ خود غالب نے بقول انوری صاحب عبدالغفور کے نام ایک خط میں وہی تعریف لکھی ہے جو قتیل نے چار شربت میں لکھی ہے اور جو صحیح ہے۔ "یعنی نثر مسجّع وہ نثر ہے جس کے فقرے مقفّیٰ ہوں، مرجز وہ ہے جس کے ہر دو فقرے ہم وزن ہوں، اور نثر عاری میں نہ قافیہ کا التزام ہوتا ہے نہ وزن کا۔ اس کی تفصیل "قتیل اور غالب" کے صفحات ۳۰، ۵۰ پر ناظرین ملاحظہ کریں۔

۵۔ اس کے بعد ایطا کی بحث ہے، غالب نے قتیل پر اعتراض کیا ہے کہ قتیل کہتا ہے کہ ایطا جلی وہ ہے کہ بلا تامّل ظاہر ہو جائے اور ایطا خفی غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود غالب نے یہ تعریف کی ہے کہ مطلع میں ہو تو ایطا جلی ہے اور غزل یا قصیدہ کے اشعار میں موجود ہو تو خفی ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غالب کی تعریف ایطا جلی و خفی غلط ہے، اور قتیل کی تعریف صحیح ہے، مگر تفصیل نہیں کی ہے۔ ایطا کی صورت یہ ہے کہ مطلع میں اس وقت ایطا ہوگا جب دونوں قافیوں کے حروف مکرر جو ماقبل رَوِی ہوتے ہیں، اگر علیحدہ کر دیں تو دو لفظ بامعنی رہ جائیں اور باہم مقفّیٰ نہ ہوں جیسے ایک مصرع میں گلستاں ہو اور دوسرے میں بوستاں دونوں قافیوں میں 'ستاں' مکرر ہے، دونوں کو جُدا کرنے کے بعد ایک 'گل' رہ جاتا ہے دوسرا 'بو'، یہ دونوں لفظ بامعنی ہیں اور باہم مقفّیٰ نہیں لہذا ایطا ہے۔

اشعار میں ایطا یہ ہے کہ بار بار قافیہ مکرر آئے یا ایسے قافیے آئیں جیسے مطلع میں بیان کیے گئے۔ گلستاں۔ بوستاں۔ شبستاں وغیرہ۔ ایطا خفی کی صورت یہ ہے کہ بقول قتیل واضح نہ ہو، مثلاً اُٹھاتا ہے،

دکھاتا ہے۔ وہاں "اٹھ" رہ گیا، یہاں "دکھ" رہیگا۔ دکھ وضاحتاً کوئی لفظ معنی دار نہیں ہے، مگر چونکہ اصل میں یہ "دیکھ" ہے اور یہ معنی دار ہے تعلیلاً "دکھ" بنایا گیا اس لئے ایطا خفی ہے۔

اُردو شعراء صرف مطلع میں ایطا سے احتیاط کرتے ہیں، بقیہ اشعار میں ایطا کی پروا نہیں کرتے ہیں۔ عربی میں جائز ہے کہ ایک مصرع میں معرفہ ہو اور دوسرے میں نکرہ، جیسے رجل، الرجل، اور عربی میں علامات نحوی نکالنے کے بعد اگر با معنی لفظ بچے اور دونوں باہم قافیہ ہوں تو بھی ایطا ہے جیسے شایق و عاشق۔ الف علامت فاعل نکالنے کے بعد شوق، اور عشق رہ جاتا ہے، لہذا ایطا ہے

غالب نے قتیل پر آٹھ اعتراضات کئے ہیں جن میں سے صرف ایک اعتراض صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ اور وہ یہ کہ قتیل نے فارسی میں ایک جگہ اُردو کا محاورہ ترجمہ کر دیا ہے۔ ۵

یک وجب جائے بکوئے تو زخوں پاک نبود کشتہ برکشتہ تپاں بود وگر خاک نبود

"ہیچ نبود" کی جگہ "خاک نبود" قتیل نے لکھا ہے، یہ ہندوستان کا محاورہ ہے نہ کہ ایران کا۔

اس محاورہ کی غلطی کو انوری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے، دیگر حضرات تبصرہ نگار انھیں اعتراضات اور جوابات کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ حالانکہ انھیں پر محاکمہ کی ضرورت تھی۔

قتیل پر جو اعتراضات غالب کی طرف سے ہوئے ہیں اُن کے جوابات دینے کے بعد سید اسد علی صاحب نے غالب کے چند اُردو اشعار پر شبہات وارد کئے ہیں، جن میں سے بعض غلط ہیں اور بعض صحیح، مگر اس کا ذکر کچھ زیادہ مفید نہ ہوگا۔ اس سے زیادہ ضروری مسئلہ کتاب کے آخر میں ایک طویل بحث اہل زبان اور زبان داں کے متعلق ہے جس پر غالب اور حالی نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور انوری صاحب نے بھی۔ یہ مسئلہ ہندوستان میں مدتوں سے معرکۃ الآرا رہا ہے۔ اس لئے میں اسی بحث پر اپنے تبصرہ کو ختم کروں گا۔

ہر ملک میں ایک دو شہر ایسے ہوتے ہیں جہاں دارالحکومت کی قدر دانی کی وجہ سے اہل علم و ادب جمع ہو کر زبان کی اصلاح اور ترتیب کرتے ہیں۔ ان مقامات پر تمام ملک کے علماء و ادباء جمع ہوتے ہیں اور یہیں رہ جاتے ہیں، ان کے اہل و عیال اور یہاں کے باشندے جو ان علوم سے ذوق و مناسبت رکھتے ہیں وہ اہل زبان کہلاتے ہیں، اُن کے اقوال و محاورات مستند سمجھے جاتے ہیں اور نظیر میں پیش ہونے کے قابل ہوتے ہیں مثلاً ایران میں اہل زبان شیراز اور اصفہان مانے گئے ہیں، اور دوسرے شہروں کے ادباء ان کے مقلد تھے۔ مگر اہل زبان نے اُن کو تسلیم کیا ہے ہزاروں کا شمار بھی انھیں میں رہا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی اُردو زبان کے فصحاء کا مجمع پہلے دہلی میں رہا اور اس سے قبل آگرہ میں بھی تھا، مگر اُس وقت تک اُردو سے زیادہ فارسی کا رواج تھا۔ دہلی میں اُردو شعراء کا اجتماع ہوا۔ انتزاع سلطنت پر بلکہ اس سے پہلے دکن

میں بھی اُردو شاعری کا زور و شور رہا۔ لیکن یہاں زبان کی اصلاح اور ترمیم نہ ہوئی۔ ہر شاعرِ مابعد اپنے ماقبل شاعر کا مقلد رہا۔ تصرف اور ترمیم سے ڈرتا تھا، مگر جب لکھنؤ میں ہندوستان بھر کے ادیب جمع ہوئے خصوصاً دہلی اور آگرہ کے سخنورانِ کامل تو ان سب نے ملکر اُردو کے صدہا قابلِ ترک الفاظ چھوڑ دیئے اور ہزاروں کی تعلیل کر کے اُن کو فصیح بنایا۔ جیسے "میرے کو۔ سے مجھکو" "کرا، سے کیا"۔ اور "آوے" سے آئے" بنا کر استعمال کیا۔ یہی اصلاح شدہ الفاظ اور ترقی یافتہ زبان لکھنؤ میں ہر عالم اور جاہل بولتا ہے۔ ہر لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعر کا ماحول یہی ہے نہ کوئی اس کے خلاف سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ دوسرے شہروں میں اب تک وہی قدیم زبان بولی جاتی ہے۔ مگر ہند کے اُردو مصنف اپنے تصانیف میں بھی لکھنوی زبان جو اصلاح پاچکی ہے استعمال کرتے ہیں۔ ان ہی اسباب سے لکھنؤ کے ادیب اہل زبان مانے جاتے ہیں۔ اور دہلی چونکہ لکھنؤ کا ماخذ ہے اس لئے وہ بھی ادباء کا زادبوم تسلیم کیا جاتا ہے۔

اِس بحث میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، اول یہ کہ اگر دہلی اور لکھنؤ کو اہل زبان اور مستند نہ مانا جائے تو ہر شہر بلکہ ہر قصبہ اور ہر گاؤں یہ دعویٰ کرسکے گا کہ ہماری زبان ہے، ہمارے یہاں کا محاورہ یہی ہے۔ اُس کے اس دعوے کا کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ کیونکہ جب تک مرکز نہ ہوگا زبان کی غلطی و صحت کا کوئی معیار نہ رہے گا۔ اس لئے مرکز اور اہل زبان کا ماخذ کسی نہ کسی شہر کو ضرور معین کرنا ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہل زبان اُسی کو کہہ سکتے ہیں جو زبان داں بھی ہو، یعنی ادب پر اُس کی نظر بلکہ مزاولت ہو۔ اہل زبان کا ہر ہموطن اہل زبان ہرگز نہیں ہے، بلکہ تمام اہل زبان اُن زباندانوں کے ممنون و مرہونِ منت ہیں جنھوں نے لغات و قواعد اور ہزاروں ادبی و علمی کتابیں تصنیف کر کے اہل زبان کو بھی خاطر خواہ فائدہ پہونچایا ہے۔

رُباعیات جگر

حضرت جگر بریلوی، بی۔اے

کر جاتی ہے کچھ کام اگر عقلِ رسا
ہوتا ہے جو تدبیر سے عقدہ کوئی وا
ہستی کے قیود بھُول جاتا ہے بشر
اپنے کو سمجھتا ہے کہ ہوں میں ہی خدا

ہم طالب داد اپنے جوہر کے نہیں
ہے ننگِ ہنر ہم کو خیالِ تحسیں
دل کی عظمت کا بھُول جانا ہی محال
ہستی خاتم ہے اور حمیت ہے نگیں

تنقید کُتب

جدید جغرافیہ پنجاب[1]

کچھ عرصے سے اُردو میں مزاحیہ مضمون نگاری کا شوق عام ہوگیا ہے اور شاذ ہی کسی اخبار یا رسالہ کا کوئی نمبر اس قسم کے مضامین سے خالی رہتا ہو۔ لیکن اصلی مزاحیہ مضمون لکھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے چنانچہ جن صاحبوں نے اس صنفِ ادب پر توجہ دینا اپنا مخصوص فرض سمجھ لیا ہے اُنکے بھی صرف چند خاص مضامین ہی ادبی معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ لیکن پنجاب کے مشہور اخبار نویس مولوی چراغ حسن صاحب حسرتؔ کو اس فن خاص میں غیر معمولی کمال حاصل ہے۔ کیونکہ اِس اہم صنفِ ادب کے لئے اُن کی شوخ اور خوش مذاق طبیعت خاص طور پر موزوں واقع ہوئی ہے۔ "سندباد جہازی" کے نام سے اُن کے اکثر مضامین ملک کے مشہور اخبار اور رسالوں میں شائع ہوکر مقبول عام وخاص ہو چکے ہیں۔ اب اُنھوں نے ایک خاص قسم کے مضامین کو جن کا صوبہ پنجاب کی موجودہ سیاسیات سے تعلق ہے "جدید جغرافیہ پنجاب" نامی ایک دلچسپ و دلکش کتاب میں جمع کردیا ہے جس سے وہاں کی سیاسی زندگی کے دلچسپ پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب میں پنجاب کے دلچسپ صوبہ کی ایسی تقسیم کیگئی ہے جسکی تصدیق مروجہ جغرافیہ یا سرکاری نقشوں سے نہیں ہوسکتی ہے۔ فاضل مُصنف نے ادیبانہ شوخ بیانی سے کام لیکر اپنے صوبہ کی مختلف سیاسی پارٹیوں، لیڈروں اور حکام وغیرہ پر نہایت خوبصورت طریقے پر چنگی چنگی پھبتیاں کسی ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم ذیل میں چند نام درج کرتے ہیں جن سے اِس "جغرافیہ" کی حقیقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً:۔

منوہر پربت (منوہر لال وزیر مالیات پنجاب)۔ کوہِ خضر (میجر خضر حیات خاں ٹوانہ)۔ سُندر بن (سر سُندر سنگھ مجیٹھیہ)۔ میاں کا ٹیلا (میاں عبدالحیٔ وزیر تعلیم پنجاب)۔ درہ غضنفر (راجہ غضنفر علی خاں)۔ اچل ڈنڈی (سردار اچل سنگھ سکھ لیڈر)۔ کالی ناگ (بابو کالی ناتھ ایڈیٹر ٹریبیون)۔ کچلو نگر (ڈاکٹر سیف الدین کچلو)۔ ٹیکم گڑھ (چودھری ٹیکا رام) وغیرہ۔ پنجاب کا ایک خطہ مسلم لیگ کے اعتبار سے "وادی لیگ" قائم کیا گیا ہے جہاں کی پیداوار جو بتائی گئی ہے۔ اور دوسری باتیں بھی جو لکھی گئی ہے پتہ کی لکھی گئی ہیں:۔

"یہ وادی اگرچہ بہت چھوٹی ہے لیکن اس میں ہر قسم کی جنس پیدا ہوتی ہے، ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں، مولوی بھی

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی پنجاب، لوہاری دروازہ، لاہور

اور بلم ٹیر بھی۔ لیکن وادیٔ لیگ کی پیداوار پنجاب سے زیادہ یو۔پی میں فروخت ہوتی ہے۔ اس وادی کا ایک حصہ جو دریائے ظفر علیخاں کی گذرگاہ ہے "اتحادِ ملت" کہلاتا ہے، اور خاصا سرسبز علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں مانسہروی قسم کا مولوی بھی پیدا ہوتا ہے اور بہت قیمت پاتا ہے۔ ....."مردہ باد" اور "زندہ باد" بھی یہاں کثرت سے ہوتے ہیں۔ "جلسہ" اور "جلوس" یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ جلوس اگرچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن جلسہ سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔"

خوش مذاق مصنف نے یہ ستم ظریفی بھی کی ہے کہ دوسری درسی کتابوں کی تقلید میں اسکے ہر باب کے آخر میں چند امتحانی سوالات دے دیئے ہیں۔ حالانکہ ٹائیٹل پر یہ صاف لکھ دیا ہے کہ اِس جغرافیہ کو سررشتہ تعلیم نے منظور نہیں کیا ہے۔ سوالوں کا نمونہ یہ ہے:۔

"دریائے الہٰ بخش کہاں سے نکلتا ہے اور کہاں گرتا ہے۔ یہ بھی بتاؤ کہ اگلے سال یہ دریا کہاں سے نکلیگا اگر تم نہیں جانتے تو اپنے باپ سے پوچھ کے بتاؤ۔"

بعض جگہ مدرس کو بھی ہدایت کی گئی ہے جو لطف سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً:۔

"استاد ہر لڑکے سے پوچھے کہ ان کے گھر میں کتنی گائیں کتنی بھینسیں، کتنی بکریاں، کتنی مرغیاں اور کتنے ووٹ ہیں، جس لڑکے کے گھر میں کوئی ووٹ نہ ہو اُسے کلاس سے نکال دیا جائے۔ کیونکہ اس کا تعلیم حاصل کرنا بے سود ہے۔"

آخر میں ناموں کی ایک فہرست بھی دیدی گئی ہے۔ جس سے ہر بات کی توضیح اور تشریح ہو جاتی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت ۴۴ صفحے۔ جلد انگریزی۔ ناظرین اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

تقلقہ[۱]

یہ "سندباد جہازی" کے بھیا "حاجی لقلق" کی مزاحیہ نظموں اور غزلوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جو پنجاب کے اخباروں و رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں اور جنھیں اب اُردو اکیڈیمی پنجاب نے دلکش صورت میں جمع کر دیا ہے۔ کلام میں مزاح کا وہی درجہ ہے جو طعام میں نمک کا۔ اور واقعی انسان ہر وقت متانت و سنجیدگی میں اپنی تمام عمر بسر نہیں کر سکتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے "حاجی لقلق" کی ترکیبیں پُرلطف ہوتی ہیں، بندش چست اور الفاظ کی نشست درست ہوتی ہے اور کلام میں بیان کی شوخی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اِس مجموعہ میں پولٹیکل غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ لکھائی، چھپائی، ٹائٹیل وغیرہ سب عمدہ۔ حجم ۱۶۰ صفحات

---

[۱] والنیٹر　　[۲] قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اُردو اکیڈیمی پنجاب، لوہاری دروازہ، لاہور

جنگ آلودہ دُنیا[1]

یہ چھوٹی سی پُر از معلومات کتاب لوکل سلف گورنمنٹ کے محکمہ توسیع تعلیم کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور اس عمدگی سے مرتب کی گئی ہے کہ اگر اسے "جام جہاں نما" کہئے تو بجا ہے۔ تمام دُنیا کے ملکوں کا اسمیں مختصر حال درج ہے اور جو ملک موجودہ لڑائی میں شریک ہیں اُن کے متعلق تمام ضروری معلومات خاص طور پر اس میں دیدی گئی ہے۔ اسمیں اکتالیس (۴۱) نقشے اور چارٹ ہیں جن سے ایک ہی نظر میں شریکِ جنگ ملکوں کی بابت تمام باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ مختلف ملکوں کے حالات درج کرنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ضروری باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں آپ کو مختلف ملکوں کے تجارتی و اقتصادی اور جنگی طاقتوں کے اعداد و شمار بھی ملیں گے۔ غرض موجودہ جنگ کی صورت میں اس کتاب کے مطالعہ سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔ جس کے لئے ہم اس کے لائق مؤلف پنڈت وِنکٹیش نرائن تواری کو قابلِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اسکی لکھائی چھپائی وغیرہ سب عمدہ ہے۔ حجم ۱۰۶ صفحات

دو ڈاکٹر[2]

اس چھوٹی سی دلچسپ کتاب میں پنجاب کے مشہور مزاحیہ نگار "سندباد جہازی" نے پنجاب کے دو مشہور لیڈروں "ڈاکٹر ستیہ پال" اور "ڈاکٹر عالم" کی سوانحعمری پر مزاحیہ پیرایہ میں بہت دلچسپ روشنی ڈالی ہے۔ اُردو ادب میں ابھی تک کسی مُصنف نے سوانح نگاری کا پُورا حق ادا نہیں کیا ہے۔ زیادہ تر سوانحعمریوں میں صرف زندگی کے خاص خاص واقعات بہ قیدِ سنہ رنگین و شستہ زبان میں بیان کردئے جاتے ہیں۔ اور انسانی سیرت کی باریکیوں پر کسی کی نظر نہیں جاتی ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ چھوٹی سی کتاب اُردو میں اپنے قسم کی پہلی تصنیف ہے۔ فاضل مُصنف نے اسمیں انسانی خصلت کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کی ہے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک اُنھیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے صحیح راستہ پر چلے ہیں۔ اُنھوں نے دونوں ڈاکٹر صاحبان کے کریکٹر کو صاف صاف بلا رو رعایت بیان کردیا ہے۔ اور حتی الوسع بے لوثی کے ساتھ اُن کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھادی ہیں۔ بہرحال ہم کو یہ چھوٹی سی کتاب بہت دلچسپ معلوم ہوئی اور ہمارا خیال ہے کہ ہمارے ناظرین بھی اسے ہاتھ میں لیں گے تو ختم کئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ اس کی لکھائی چھپائی، کاغذ اور جلد وغیرہ سب دیدہ زیب ہیں۔ حجم پانچ جزو

انشاء سلمیٰ عرف رقعاتِ نسواں[3]

ولی احمد خاں صاحب ایم۔ اے نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھکر لڑکیوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس میں

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس الہ آباد۔ [2] قیمت ۸/ ملنے کا پتہ:۔ اردو اکیڈمی پنجاب بھاری دروازہ لاہور [3] قیمت ۹/ ملنے کا پتہ:۔ عصمت بکڈپو دہلی

جدید طرز کی خطوط نویسی کے نمونے یعنی مختصر القاب و آداب کے ساتھ بڑوں، چھوٹوں اور برابر والوں کے نام خطوط پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں مشکل لفظوں کی فرہنگ بھی دیدی گئی ہے۔ شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جسمیں اُردو خطوط نویسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ اوسط۔ ضخامت چار جزو۔

غلامی کا اِنسداد[1]

یہ سبق آموز کتاب روس کے مشہور مصلح کاونٹ ٹولسٹائی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس کا انگریزی زبان میں "سماجی خرابیاں اور اُن کا علاج"[2] کے نام سے ترجمہ ہوچکا ہے۔ اب لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور نے اس کا اُردو ترجمہ "غلامی کا انسداد" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ٹولسٹائی نے اس لاجواب کتاب میں غلامی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کی قسمیں بھی بیان کی ہیں اور ان کی مختلف صورتوں اور طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی سلسلہ میں "گورمنٹ"، "قانون" اور "ہر شخص کی انفرادی حیثیت" پر بھی فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔ بہر حال یہ قابل قدر کتاب پڑھنے کے قابل ہے، لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ ہے۔ اور جلد بھی خوبصورت۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات

صنعت و حرفت کے قیمتی راز[1]

مسٹر پرمانند منیجنگ ایڈیٹر رسالہ "کرانتی" لاہور نے یہ کتاب مرتب کرکے ملک کے بیکار طبقہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک نظری، دوسرا عملی۔ نظری حصہ میں فاضل مصنف نے محنت کی برکتیں اور کاروبار کے اصول بیان کئے ہیں اور اپنی تائید میں دنیا کے مشہور ماہرین فن کے اقوال اور نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ عملی حصہ میں جس کے دراصل سات حصے ہیں۔ مختلف قسم کی سیکڑوں چیزیں بنانے کے نسخے اور ترکیبیں درج کی ہیں۔ بعض نسخے اور فارمولے واقعی بہت ہی کم لاگت میں تیار کئے جاسکتے ہیں۔ بہر حال یہ کتاب ملک کے بیکار اور محنتی طبقہ کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔ حجم ۲۸۸ صفحے۔

ہٹلر کیا چاہتا ہے؟[3]

آجکل جبکہ ہٹلر نے یورپ کی سلطنتوں کو پامال کر رہا ہے اور تن تنہا برطانیہ اُس کا مقابلہ کرنیکو رہ گیا ہے اس کتاب کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اسمیں نہ صرف موجودہ جنگ کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ہٹلر کے دلی مقصد کا راز بھی فاش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جرمنی معاہدہ وارسائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے لڑ رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جرمنی کا مقصد اپنی کھوئی ہوئی نوآبادیاں حاصل

---

[1] و [1] دونوں کتابوں کی قیمت بارہ بارہ آنے اور اُنکے ملنے کا پتہ:۔ میسرز لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

[2] Social Evils & their Remedies.

[3] قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سیوا بک ڈپو پوسٹ بکس نمبر ۲۶۸ لاہور

کرتا ہے۔ اور بعض کا یہ خیال ہے کہ چونکہ ۱۹۱۸ء میں جرمنی کے حصے بخرے کر کے اُس کے علاقہ کو بُری طرح سے محدود کر دیا گیا تھا۔ اور جرمنی کا رقبہ اتنا تنگ رہ گیا تھا کہ جرمن قوم اس میں گھٹی جاتی تھی، اس لئے جرمنی اپنی روزافزوں آبادی کے لئے اپنی سلطنت کی ضروری توسیع چاہتا ہے۔ مگر یہ سب خیالی باتیں ہیں۔ ہٹلر کا اصل مقصد تمام دنیا پر اپنا اور جرمن قوم کا اقتدار قائم کرنا ہے۔ وہ دنیا بھر کو ہر معاملے میں جرمنوں کا دست نگر بنانا چاہتا ہے۔ بہرحال جو لوگ ہٹلر کے اصلی اغراض و مقاصد معلوم کرنا چاہتے، وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ ضخامت ننو صفحات۔

ہٹلر کے ڈھول کا پول[1]

کارپس کرسٹی کالج آکسفورڈ کے فیلو مسٹر اینسر (R. C. K. Ensor.) نے اس چھوٹی سی کتاب میں ہٹلر کی پالیسی کا راز فاش کیا ہے۔ اور یہ بھی دکھایا ہے کہ ابتک ہٹلر کی پالیسی کو کس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے اور آیندہ کیا امکانات ہیں۔ اِس پمفلٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نسل اور وطن کے بارہ میں ہٹلر کا کیا عقیدہ ہے؟ اور دوسرے ملکوں کے متعلق اُس کا کیا نقطہ نظر ہے؟ اس کا حجم دو جزو ہے۔

موجودہ جنگ کے متعلق اٹلس[1]

یہ مفید رسالہ بھی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ اِس میں پندرہ نقشے اور مختلف ملکوں کے مختصر حالات درج ہیں۔ جن کے دیکھنے سے موجودہ جنگ کے واقعات سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ مسٹر بیکر نے نقشوں کی یہ چھوٹی سی کتاب مرتب کر کے واقعی ایک پبلک خدمت انجام دی ہے۔

سلطان محمود غزنوی[2]

یہ مولوی محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جسے سید جمیل حسین ایم اے (علیگ) حیدرآباد سول سروس نے اُردو میں کیا ہے۔ اسمیں دسویں صدی میں اسلامی دنیا کی حالت بیان کر کے غزنوی سلطنت کی بنیاد اور اسکے سلسلہ میں سلطان محمود غزنوی کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سلطان محمود غزنوی اپنے زمانہ کا بہترین جرنل تھا۔ ہندوستان پر جو حملے محمود نے کئے تھے اُنکا اصلی سبب کوئی مذہبی جذبہ نہیں بلکہ لوٹ مار اور حرص و آز بتایا گیا ہے۔ اسکی تائید میں فاضل مصنف نے مختلف مورخوں کی تصانیف کے حوالے بھی دئے ہیں۔ جغرافیائی مقامات کی تشریحات سے یہ کتاب اور زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ حجم ۱۳۸ صفحات

---

[1] دونوں کتابوں کی قیمت تین تین آنہ ہے اور اُن کے ملنے کا پتہ:۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔ کلکتہ۔ مدراس۔

[2] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

رفتارِ زمانہ

جرمنی نے برطانیہ پر ہوائی حملوں کا سلسلہ بڑے زور شور سے شروع کیا تھا لیکن دو ماہ کے واقعات نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ برطانیہ کی ہوائی طاقت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے اور بحری طاقت میں بھی اچھا خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ انھیں دونوں کی بدولت جرمنی کو اب تک اپنا مشہور حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ البتہ ہوائی حملے روزانہ ہو رہے ہیں ان کی مدافعت کا بھی پورا انتظام کر لیا گیا ہے اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب ہی ان کا زور کم ہو جائیگا۔ ستمبر میں ۱۵ و ۲۷ تاریخ کو دو بڑے ہوائی معرکے ہوئے جن میں برطانیہ کے رائل ایر فورس کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اور جرمنی کے ہوا بازوں کو بڑے نقصانات کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ پچھلے دو مہینوں میں انگلستان پر کیسے شدید حملے ہوئے، اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس عرصے میں اوسطاً چار سو جرمن ہوائی جہاز روزانہ حملہ آور ہوئے اور انھوں نے شہری آبادی یعنی عورتوں بچوں اور بوڑھوں سبھی پر بے محابا بمباری کی جس میں صنعتی اور فوجی نقصانات تو بہت کم ہوئے لیکن ہزاروں مکان جو زیادہ تر معمولی آدمیوں اور مزدور پیشہ لوگوں کے تھے تباہ و برباد ہو گئے۔ ستمبر میں ساڑھے آٹھ ہزار آدمی بھی ہلاک اور تیرہ ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ لیکن پچھلی جنگ عظیم کے نقصانات سے مقابلہ کیا جائے تو جان کا نقصان پچھلی لڑائی کے نقصان کا صرف ۱/۱۳ حصہ ہوا۔ زیادہ نقصان نہ ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے ہوائی حملوں سے پناہ لینے کا کافی انتظام کر لیا ہے اس نقصان کا ایک خاص پہلو یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جہاں پچھلی لڑائی میں صرف نوجوان فوجی مارے جاتے تھے وہاں اب بچے بوڑھے اور عورتیں بھی ہلاک ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف جوانوں کا قتل ملک کے لئے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح گو بڑی بڑی سرکاری عمارتیں، تاریخی گرجے اور شاہی محل بھی ہوائی حملے سے محفوظ نہیں رہے تاہم اگر تباہ شدہ عمارتوں کا حساب لگایا جائے تو ہٹلر کو شہر لندن کے برباد کرنے میں دس سال کا عرصہ لگے گا اور بقول مسٹر چرچل آئندہ دس سال کے اندر خدا معلوم کیا سے کیا ہو جائے گا۔

جرمنی کا دعویٰ ہے کہ ابتک بائیس ہزار ٹن بم لندن پر گرائے جا چکے ہیں، اور جرمن ہوا بازوں نے ستمبر کے صرف ایک ہفتہ میں دو سو اکیاون ٹن وزن کے بم گرائے۔ مگر اس بمباری سے صرف ایک سو اسی آدمی ہلاک ہوئے۔ گویا بقول مسٹر چرچل ایک انگریز کے قتل کرنے کے لئے جرمنی کو ایک ٹن سے زیادہ وزن کے بم گرانا پڑے۔ اس کے علاوہ یہ ہوائی لڑائیاں جرمنی کو بہت مہنگی پڑ رہی ہیں۔ کیونکہ اگست ۱۹۴۰ء میں برطانیہ میں گیارہ سو پندرہ ہوائی جہاز برباد ہوئے اور ستمبر ۱۹۴۰ء میں ایک ہزار چھیالیس جہاز کھیت رہے۔ فی جہاز اگر ڈھائی آدمیوں کے نقصان کا اوسط لگایا جائے تو ان کے مقابلہ میں

انگلستان کا تہائی چوتھائی نقصان ہوا، اور ہوابازوں کا نقصان اور بھی کم کیونکہ انگریزی جہازوں کے اکثر ہواباز بچالئے گئے۔ جرمنی اور برطانیہ کے نقصانات کا صحیح اندازہ اسی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ۵۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ختم ہونیوالے ہفتہ میں جہاں جرمنی کے ایکسو چار ہوائی جہاز اور ڈھائی سو ہواباز کام آئے، وہاں برطانیہ کے صرف چالیس جہاز ضائع ہوئے اور ان کے اکیس ہواباز بچالئے گئے۔

برطانوی ہوائی طاقت اس وقت صرف ملکی حفاظت کا فرض ہی انجام نہیں دے رہی ہے بلکہ وہ برلن جاکر جرمنی کے صنعتی اداروں اور فوجی کارخانوں پر بھی بمباری کررہی ہے۔ اور برلن کے علاوہ وہ فرانس وغیرہ کے بندرگاہوں پر بھی جو اس وقت جرمنی کے قبضے میں ہیں جرمنی کے فوجی استحکامات پر پے در پے حملے کررہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہٹلر کے بڑے بڑے منصوبے درہم برہم ہورہے ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہو جب برطانوی ہواباز جرمنی اور جرمنی کے مقبوضات کو نقصان نہ پہونچاتے ہوں۔ اس طرف حملہ آور ہوائی جہازوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہورہی ہے اور اب اتلاف جان و مال میں بھی کمی ہورہی ہے۔ عنقریب ہی جاڑے کا موسم شروع ہونیوالا ہے جس میں کُہر کی وجہ سے معمولاً ہوائی حملوں کا اندیشہ کم ہوجاتا ہے لیکن اگر کسی حکمت سے اس کا سلسلہ برابر جاری رہا تو اس کا کچھ نہ کچھ توڑ سوچ لیا گیا ہے جس کی طرف مسٹر چرچل حال ہی میں اشارہ کرچکے ہیں۔ غرض یہ بات اب بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ اندھا دھند ہوائی حملوں سے ہٹلر برطانوی قوم کو مرعوب نہیں کرسکا۔ ہٹلر نے لندن والوں پر خوف و دہشت طاری کرنے کی بڑی کوشش کی بھی لیکن دُو ماہ کی بمباری کے بعد بھی شہر لندن کی حالت بقول ہز مجسٹی ملک معظم یہ ثابت کررہی ہے کہ "وہ اتحاد و اتفاق ہی کے لئے تعمیر ہوا ہے"۔ شاہ ممدوح نے ۲۳ ستمبر کو اپنی براڈکاسٹ تقریر میں فرمایا ہے کہ "کسی شہر کے در و دیوار شہر نہیں ہوتے ہیں بلکہ جو لوگ وہاں رہتے ہیں ان سے شہریت قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ لندن والوں کا یہ تہیہ معلوم ہوتا ہے کہ خواہ اس عظیم الشان شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے لیکن اُن کی اسپرٹ ہمیشہ مضبوط اور مستقل رہے گی"۔

بہرحال اہل برطانیہ ہمت و استقلال کے ساتھ ہٹلر شاہی کو ختم کرنے کا تہیہ کرچکے ہیں اور جان و مال کی ضروری قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ برطانیہ کے عوام و خواص اپنی گورنمنٹ کے ساتھ ہیں اس لئے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہیگی جب تک جرمنی پر پوری طرح فتح حاصل نہ ہوجائے۔

برطانیہ کو امریکہ اور نوآبادیوں سے بھی پوری مدد مل رہی ہے۔ امریکہ اعلان جنگ کے علاوہ ہر ممکن طریقہ سے برطانیہ کی مدد کررہا ہے۔ اور تازہ واقعات امریکہ اور برطانیہ کو پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کا ہمدرد و معاون بنا رہے ہیں۔ امریکہ نے برطانیہ کو اپنے پچاس تباہ کن جہاز دیدیئے ہیں، اور ہر قسم کا سامان جنگ بہت افراط کے ساتھ مہیا کررہا ہے۔ برطانیہ نے بھی امریکہ کو بہت سے ضروری بحری اڈے ننانوے سال کے ٹھیکہ پر دیدیئے ہیں۔ غرض اس وقت دونوں ملک ایک دوسرے کے شریک حال ہوگئے ہیں۔ مسٹر روزویلٹ صدر امریکہ اور ان کے مدمقابل مسٹر ولکی (جو آئندہ انتخاب میں ان کے خلاف صدارت

کے امیدوار ہیں) دونوں برطانیہ کو زیادہ سے زیادہ جنگی امداد دینے کی حق میں ہیں۔ لیکن مسٹر روزویلٹ جن کے سہ بارہ صدر منتخب ہونے کی اُمید ہے۔ اپنی کوشش سے امریکہ کو جنگ کے بہت قریب لے آئے ہیں اور باخبر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ انتخاب کے بعد ہی دو تین ماہ کے اندر جرمنی کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دیں گے۔

برطانوی نوآبادیاں بھی پوری طاقت سے برطانیہ کو مدد دے رہی ہیں۔ مثلاً کینیڈا میں آخر ستمبر ۴۰ء تک ساڑھے ہزار جدید والنٹیروں کی فوجی تربیت مکمل ہوگئی ہے۔ اگلے سال تک ایک لاکھ والنٹیر اور فوجی تعلیم پا جائیں گے۔ اس وقت بھی کینیڈا کے چھیالیس ہزار مسلح سپاہی برطانیہ کی حفاظت کے لئے انگلستان میں موجود ہیں۔ پچھلے نو ماہ کے اندر اہل کینیڈا تیرہ کروڑ پاؤنڈ کے جنگی تمسکات خرید چکے ہیں۔

آسٹریلیا میں اس وقت دو ہزار والنٹیر ہوابازی کی تربیت پا رہے ہیں۔ عنقریب ہی آسٹریلیا کی ہوائی فوج میں پچاسی ہزار نوجوان ہو جائیں گے۔ آسٹریلیا کی ½ آبادی جنگی قرضہ میں حصہ لے چکی ہے۔

نیوزی لینڈ کے ایک ہزار ہواباز آجکل برٹش رائل ایئر فورس میں کام کر رہے ہیں، اور خود نیوزی لینڈ میں آٹھ ہزار دو سو ہواباز اپنے ملکی حفاظت کے لئے مستعد ہیں۔

جنوبی افریقہ کی ہوائی فوج وہاں کے اطالوی اڈّوں پر برابر بمباری کر رہی ہے، اور کینیا کی چھوٹی سی نوآبادی کے قریب قریب ہر نوجوان نے فوجی رضاکاروں میں اپنا نام لکھایا ہے۔

یہ سب باتیں برطانیہ اور اہل برطانیہ کیلئے بہت حوصلہ افزا ہیں۔ غرض اس نازک موقع پر انگریز بڑی اُولوالعزمی اور پامردی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہٹلر کے مظالم اور اُس کے زبردست انتظامات انگریزوں کی ہمت کو کسی طرح پست نہیں کر سکے۔

جرمنی سمندروں میں بھی تجارتی جہازوں کو نقصان پہونچا رہا ہے اور ہر ہفتہ دو تین لاکھ ٹن وزن کے برطانوی اور دوسرے ملکوں کے تجارتی جہاز غرق کر دیتا ہے۔ لیکن برطانیہ اس نقصان کو بخوبی برداشت کر رہا ہے۔ جنگ شروع ہونے کے وقت اُس کے پاس دو کروڑ دس لاکھ ٹن وزنی تجارتی جہاز تھے جن میں سے ایک کروڑ پچاسی لاکھ ٹن وزن کے جہاز برابر چل رہے تھے۔ لڑائی کے دوران میں جہاں بہت سے جہاز برباد ہوئے وہاں اور بہت سے نئے جہاز بھی بن گئے۔ بہت سے جہاز دوسرے ملکوں سے خرید لئے گئے اور ایک معقول تعداد دشمن کے جہازوں کی بھی ہاتھ آگئی ہے۔ غرض ان سب جہازوں کے اضافہ سے اب دو کروڑ بیس لاکھ ٹن وزن کے جہاز برطانیہ کے قبضے میں ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی جب فرانس، ہالینڈ اور ناروے وغیرہ کے ساحلی کناروں پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا ہے، ہر ہفتہ اوسطاً دو سو تجارتی جہاز برطانیہ پہونچتے رہتے ہیں اور برطانیہ کی غیر ملکی تجارت برابر جاری ہے۔ اس دفعہ کی لڑائی میں سب سے زیادہ بحری نقصان گذشتہ جون کے مہینہ میں ہوا یعنی اس ماہ تین لاکھ ۶۰ ہزار ٹن وزن کے برطانوی اور دیگر جہاز برباد ہوئے لیکن پچھلی لڑائی کے نقصانات کو دیکھتے ہوئے یہ نقصان نسبتاً بہت کم ہے۔ اپریل ۱۹۱۷ء کے مہینہ میں آٹھ لاکھ اکیاسی ہزار ٹن وزن کے جہاز غرق ہوئے تھے۔ ستمبر ۴۰ء کے اول دو ہفتے میں نسبتاً اور بھی کم نقصانات ہوئے۔ یعنی ان

دو ہفتوں میں ۵ ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن کے جہاز ڈبوئے گئے۔ سال بھر کی لڑائی میں جرمنی اور اٹلی کے سمندری نقصانات بھی کچھ کم نہیں ہوئے۔ جرمنی کے سال بھر کے نقصانات کی میزان بارہ لاکھ ۳۶ ہزار ٹن اور اٹلی کے نقصانات کی میزان نو لاکھ ۳۶ ہزار ٹن ہوئی ہے۔ اور چونکہ ان دونوں کے پاس تجارتی جہازوں کی تعداد پہلے ہی سے کم تھی اس لئے ان کو یہ نقصانات نسبتاً زیادہ محسوس ہونگے۔ بہر حال سوقت بھی برطانیہ میں باہر سے آنے والے مال کی مقدار کا اوسط ۴۵ لاکھ ٹن ماہوار ہے امن کے زمانہ میں اوسطاً ساٹھ لاکھ ٹن کا مال برطانیہ میں آیا کرتا تھا، یہ کمی اس لئے قابل لحاظ نہیں ہے کہ اس وقت بہت سی چیزوں کی جو عیش میں داخل ہیں کوئی کھپت نہیں رہی، دوسرے بہت سی چیزوں کا پہلے ہی سے کافی ذخیرہ موجود ہے بہر حال جرمنی نے برطانیہ کی بحری ناکہ بندی کی جو دھمکی دی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے خلاف خود جرمنی کی تجارت معطل ہو گئی ہے۔

جس طرح جرمن ہوائی حملوں سے اسپتال اور مذہبی عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں اُسی طرح جرمنی کی بحری سُرنگوں سے بچوں کو باہر لیجانیوالے جہاز بھی تباہی سے بچ نہ سکے۔ چنانچہ "سٹی آف بنارس" نامی جہاز جو انگلستان سے نوسٹے بچے کناڈا لئے جارہا تھا، ۱۷ ستمبر کو ایک جرمن آبدوز کشتی نے بحر اٹلانٹک میں انگلستان سے چھ سو میل کے فاصلہ پر بغیر کسی اطلاع کے تارپیڈو مار کر غرق کر دیا۔ اس حادثے میں صرف سات بچوں کی جان بچائی جاسکی اور تراسی بچے ڈوب گئے۔ بادشاہ سلامت نے اس اندوہناک واقعہ پر دل ہلا دینے والے الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے۔

اس طرف برطانیہ کی مجلس وزارت میں جو ردوبدل ہوا ہے اس سے عام رائے کا رُخ بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر چیمبرلین جو وزیر اعظم کے عہدہ سے علحٰدہ ہونے پر بھی وزارت سے الگ نہ ہوئے تھے اب خرابی صحت کی بنا پر اپنے موجودہ عہدہ لارڈ پریزیڈنٹ سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مسٹر چرچل نے کئی اور لائق مدبروں کو وزارت میں شامل کر لیا ہے اور کچھ ردوبدل بھی کئے ہیں۔ جن کے بعد اب وزارت پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ عام رائے ابھی کچھ اور تبدیلیوں کی خواہشمند نظر آرہی ہے چنانچہ یہ تبدیلیاں بھی ہو کر رہیں گی۔ مسٹر چیمبرلین کنسرویٹو پارٹی کی لیڈری سے بھی کنارہ کش ہو گئے اور اُن کی جگہ مسٹر چرچل پارٹی لیڈر منتخب ہو گئے ہیں اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں اس بات کو بھی واضح کیا کہ جنگ کی وجہ سے غیر معمولی حالات پیدا ہو رہے ہیں اس لئے کنسرویٹو پارٹی کے ممبروں کو ملکی ترقی کے لئے بہت سی قربانیاں کرنی پڑیں گی اور انھیں ابھی سے بہت سی باتوں کے متعلق اپنے خیالات تبدیل کرنا ہونگے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت جنگ کی وجہ سے دنیا تہ و بالا ہو رہی ہے اور انگلستان میں بھی ایک ذہنی اور تمدنی انقلاب رونما ہو رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کیا ہو کر رہیگا۔

لڑائی کی آگ آئندہ کہاں تک پھیل جائیگی اس کے متعلق بھی کچھ کہنا آسان نہیں ہے، مگر آثار یہی بتارہے ہیں کہ ہٹلر انگلستان پر حملہ نہیں کر سکا ہے تو اس ناکامیابی کی کسر دوسری جگہ نکالے گا۔ ۲۸ اکتوبر کو اس نے مسولینی سے درہ برینر

پر جہاں جرمنی و اٹلی کی سرحدیں ملتی ہیں، تین گھنٹہ تک طویل ملاقات کی۔ سرکاری طور پر صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ دونوں ڈکٹیٹروں نے اپنے وزرائے خارجہ کی موجودگی میں ان تمام معاملات پر غور کیا جن کا تعلق دونوں ملکوں کے مفاد سے ہے اس ملاقات پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ اغلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مصر پر حملہ، افریقہ کی جنگ اور بلقان میں الجھنیں پیدا کرنے کی تدبیریں سوچی گئی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہی رومانیہ میں جرمن فوجیں داخل ہوئیں اور اب یونان پر حملہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہٹلر کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے ڈینیوب پر مکمل قبضہ کر کے بحیرۂ اسود میں اپنے لئے کوئی راستہ نکالے۔ لیکن بحیرۂ اسود پر روس کا قبضہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ روس اس پیش قدمی کو کہاں تک گوارا کرتا ہے۔ ادھر اٹلی کو تیل کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اور جرمنی کو اپنا اسٹاک پورا کرنے کی فکر ہے۔ اس لئے عراق پر وقت دونوں کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ اسپین کو جنگ میں شامل کرنے کی تدبیریں ابھی تک کامیاب نہیں ہوئیں۔ اب خبر ہے کہ خواہ اسپین لڑائی میں شامل ہو یا نہ ہو مگر جرمنی نے جبرالٹر پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ ادھر وہ ترکی پر بھی حملہ کر کے یا دباؤ ڈال کر درۂ دانیال پر بھی اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے۔ ادھر اٹلی مصر پر حملہ کر کے نہر سویز پر قابو حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ سو وقت مصر کی سرحد پار کر کے ساٹھ میل تک اطالوی گھس بھی آئے ہیں۔ کسی مصلحت سے مصر کی گورنمنٹ نے ابھی تک اٹلی کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا ہے۔ لیکن انگریزی اور مصری دونوں فوجیں مستحکم مقامات سے اٹلی کی فوج کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ترکی بھی نہ صرف اپنی ملکی آزادی برقرار رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے بلکہ برطانیہ کا ساتھ دینے کے معاہدہ کی تکمیل کرنے اور یونان کو امداد دینے کے وعدے کو پورا کرنے کو مستعد ہے۔

جرمنی اور اٹلی نے امریکہ کو لڑائی سے دور رکھنے اور برطانیہ پر ایشیا میں مزید دباؤ ڈالنے کی غرض سے ستمبر میں جاپان کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ جس کی شرطوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جاپان نے جرمنی اور اٹلی کو یورپ کی قسمت کا مالک و مختار تسلیم کر لیا ہے۔ اور جرمنی اور اٹلی نے اپنی طرف سے جاپان کو اجازت دیدی ہے کہ وہ ایشیا میں جو نظام چاہے قائم کرے۔ ان تینوں طاقتوں نے یہ بھی باہمی وعدہ کیا ہے کہ اگر کوئی نئی طاقت جو اس وقت جنگ میں شامل نہیں ہے کسی سلطنت پر حملہ کرے تو باقی دونوں سلطنتیں اپنے ساتھی کی مالی، فوجی ہر قسم کی مدد کریں گی۔ یہ معاہدہ فی الحال دس سال کے لئے کیا گیا ہے مگر اس کے بعد اس کی تجدید کا اختیار رہیگا۔ جرمنی ایک عرصہ سے جاپان کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کر رہا تھا، اور جاپان بھی کچھ دنوں سے انگلستان کے خلاف اور جرمنی کے موافق ہو رہا ہے۔ مگر چین میں وہ کچھ ایسا پھنسا ہوا ہے کہ ابتک لڑائی میں جرمنی کا ساتھ نہ دے سکا۔ اب فرانس کی شکست سے البتہ اسے اپنا حلقۂ اثر وسیع کرنے اور چین پر مزید دباؤ ڈالنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ چنانچہ ہند چینی میں جرمنی کی مدد سے اُس کو پورا تسلط حاصل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اب برہما کا رخ کر سکتا ہے۔ اور بحر الکاہل میں بھی امریکہ اور برطانیہ کو ایک دوسرے کی امداد کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ اس کا توڑ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ امریکہ بھی جنگ میں سرگرمی سے شریک ہو جائے۔ دوسرے

برطانیہ اور امریکہ دونوں چین کو جاپان سے مقابلہ کرنے میں پوری مدد دیں۔ چنانچہ مسٹر روزویلٹ نے اس معاہدہ کا مقابلہ کرنے کی جو تیاریاں شروع کردی ہیں وہ امید ہے کافی ثابت ہونگی ادھر وزیر اعظم برطانیہ نے بھی ۱۷۔ اکتوبر سے چین کے لئے برما روڈ کھول دینے کا اعلان کردیا ہے۔ اس فیصلے کو عام طور پر پسند کیا گیا ہے، چینیوں نے بھی اس پر اظہار خوشی کیا ہے اور ہندوستان کے قومی لیڈروں کو بھی اس سے اطمینان ہوا ہے۔ چین کے قومی لیڈر استقلال اور مستعدی کے ساتھ اپنے ملک کی آزادی قائم رکھنے کے لئے جاپان سے لڑ رہے ہیں اور ہماری اور مہذب دنیا کی دلی ہمدردی اُن کے ساتھ ہے۔ بہرحال بقول لندن ٹائمس جرمنی۔ اٹلی۔ جاپان کا معاہدہ نہ چینیوں ہی کو پست کرسکا اور نہ امریکہ ہی کو خاموش کرسکا۔

ہندوستان

ہندوستان کی سیاسی حالت میں کچھ عجیب انتشار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے کانگریس کو پس پشت ڈال کر مسلم لیگ کو ملانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ وزیر ہند اور حضور والسرائے دونوں نے لیگ کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن دونوں مسٹر جناح کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورے نہ کرسکے۔ فرقہ وارانہ جماعتوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہمیشہ یہی دقت رہیگی کہ ہر جماعت اپنے لئے خاص پوزیشن کی دعویدار ہوگی مسٹر جناح نے غالبًا اس امید پر کہ گورنمنٹ کانگریس کو نظر انداز کرنے کے بعد جس طرح بھی ہوسکے گا مسلم لیگ سے معاملہ کرنے پر مجبور ہوگی اس مرتبہ توسیع شدہ ایگزیکیٹو کونسل کے پچاس فیصدی عہدے ممبران مسلم لیگ کے لئے طلب کئے۔ دوسری طرف ہندو مہاسبھا بھی آبادی کی بنیاد پر اپنا حصہ لینے پر اڑ گئی، اور ایک حد سے زیادہ دینے پر رضامند نہ ہوئی، پست اقوام اور سکھوں کے مطالبے ان کے علاوہ تھے۔ مسٹر جناح نے والسرائے سے یہ بھی وعدہ لینا چاہا کہ انتظامی کونسل کے ممبروں کو اُن کی رائے اور مشورہ سے مختلف محکمے سپرد کئے جائیں اور جن صوبوں کی وزارتوں نے استعفےٰ دیدیا ہے وہاں کی حکومت بھی مسلم لیگ کے سپرد کی جائے۔ حضور والسرائے یہ دونوں مطالبے منظور نہ کرسکے اور مسٹر جناح کو مایوسی سے سامنا ہوا۔ چنانچہ ان کی تحریک پر مسلم لیگ کونسل نے اتفاق رائے سے توسیع شدہ کونسل کے لئے ممبر نامزد کرنا منظور نہیں کیا۔ لیکن لیگ میں بہت سے معززین ایسے بھی ہیں جو ہمیشہ سے سرکار پرست رہے ہیں اور اب بھی گورنمنٹ کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس لئے مسٹر جناح کو انھیں ذاتی حیثیت سے جنگی کمیٹیوں میں شریک ہونے اور جنگی امداد دینے کی آزادی دینا پڑی۔ لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں جو ستمبر کے آخر میں ہوا کئی اور رزولیوشن بھی پاس ہوئے اور یہ قرارداد بھی منظور ہوئی کہ پاکستان کا مطالبہ دوران جنگ میں ملتوی رکھا جائے، مگر اس کے موافق پروپیگنڈا ابھی تک جاری ہے۔ سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب نے البتہ اس اسکیم سے اپنی قطعی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے اور پنجاب کے لئے اس تحریک کو سراسر ناموزوں سمجھتے ہیں۔

لیگ کونسل کے اس اجلاس میں مسٹر جناح نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ بھی کہا کہ جہاں تک انکا خیال ہے برطانوی حکومت ابھی اپنے اقتدار و اختیارات سے دست کش ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے، اور والسرائے نے مختلف جماعتوں کے رہنماؤں سے جو طویل ملاقاتیں کیں اُن سے بھی ان کی رائے میں یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ ابھی آقا و اور غلام کا تعلق ہی قائم رکھنا چاہتی ہے۔" مہاتما گاندھی نے بھی لارڈ لنلتھگو سے اپنی آخری ملاقات کے بعد اسی قسم کا بیان شائع کیا ہے، اور لارڈ لنلتھگو کے حسن اخلاق کی انتہائی تعریف کرنے کے ساتھ اس بات کی سخت شکایت کی ہے کہ ہر مسئلہ کے متعلق والسرائے اپنی رائے قائم کرنے کے بعد گفتگو کرتے ہیں مگر گفتگو کے بعد اپنی رائے میں تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتے مسٹر ساورکر صدر ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر مونجے بھی والسرائے کی باتوں سے مطمئن ہو کر نہیں گئے۔ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ برطانی گورنمنٹ اس وقت جنگ میں کچھ ایسی مصروف ہے کہ وہ ابتک ہندوستان کے آئندہ نظم ونسق کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم نہیں کر سکی ہے۔ اسی لئے وزیر ہند اور والسرائے دونوں اپنی اپنی جگہ پر اڑے ہوئے ہیں اور کہیں سے ٹس سے مس ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صاحب وزیر اعظم نے بھی ہندوستان کے متعلق ابھی تک ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ یقیناً جنگی کاموں سے انھیں اتنی فرصت نہیں ملی کہ وہ ہندوستانی مسئلہ کی طرف توجہ دے سکتے۔ مگر ایسی صورت میں یہی بہتر ہوتا کہ والسرائے اپنی انتظامی کونسل کیلئے جتنے زائد ممبر درکار ہوتے انھیں مختلف طبقوں سے چپ چاپ انتخاب کر لیتے اور جس طرح سے ہو سکتا جنگ کا کام چلاتے رہتے۔ اور آئینی اصلاح و ترقی کا نام ہی نہ لیتے۔

کانگریس نے اپنے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس جنگ میں برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دینے کی بہت کوشش کی لیکن برطانوی مدبران اس وقت کوئی خاص رعایت کرنیکو آمادہ نہیں اسلئے کانگریس کو بھی ناچار اپنی پیشکش واپس لینا پڑی مگر اب وہ عجیب نرغے میں پھنس گئی ہے۔ ایک طرف تو وہ ہٹلر شاہی کے مخالف اور دل سے برطانیہ کی فتح کے خواہشمند ہے دوسری طرف حب الوطنی کا تقاضا اور قومی خود داری کا احساس اُسے کسی نہ کسی حد تک ملک کی موجودہ بےبسی کو دُور کئے بغیر برطانیہ سے تعاون کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

کانگریس سے ابتدائی غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے محض اس بنا پر کہ برٹش گورنمنٹ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرتے وقت ہندوستان سے مشورہ نہیں کیا، صوبوں کی وزارتوں سے استعفا دیدیا۔ حالانکہ گورنمنٹ برطانیہ پچھلے رواج اور موجودہ نظام کے ماتحت اس معاملے میں صوبجاتی وزارتوں سے مشورہ لینے کی پابند نہ تھی۔ اس لئے کانگریس کو اس کے خلاف معمولی پروٹسٹ کرنے کے سوائے اور کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے بعد گورنمنٹ نے بھی جنگ کے دوران بھر کانگریس کو دُور ہی رکھنا مناسب سمجھا ورنہ مرکز میں عارضی طور پر اسمبلی کی جوابدہ حکومت قائم کرنا مشکل نہ تھا ان حالات میں کانگریس کے لئے جنگی امداد سے دستکش ہونیکے سوائے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ اس پر بھی اس نے ایک دفعہ پھر تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور بیرونی حملوں کی مدافعت کیلئے عدم تشدد کی پالیسی ترک کرنے پر بھی رضامند ہو گئی لیکن جب گورنمنٹ

نے اس تبدیلی کی بھی قدر نہ کی، تو کانگریس کو ۱۶ ستمبر کے اجلاس آل انڈیا کمیٹی بمبئی میں پھر اپنی پوزیشن بدلنا پڑی، اور اس نے دہلی اور پونا کی پیش کش کو واپس لےکر عدم تشدد کے ساتھ ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا تہیہ کیا۔ لیکن چونکہ عموماً حامیانِ کانگریس اور خصوصاً مہاتما گاندھی دوران جنگ برطانیہ کو مزید پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ اس لئے مہاتما جی نے آل انڈیا کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق اس جدوجہد شروع کرنے کے کل اختیارات اپنے ہاتھ میں لیکر عام ایجی ٹیشن کا راستہ مسدود کر دیا۔

اب مہاتما جی نے صرف آزادیِ ضمیر کے متعلق انفرادی ستیہ گرہ کی اسکیم تجویز کی ہے۔ اس کے متعلق بھی انھوں نے از خود شملہ جا کر وائسرائے سے دو لمبی چوڑی ملاقاتیں کیں، مگر ان ملاقاتوں میں ان دونوں صاحبوں میں اتفاق رائے کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ چنانچہ اب انھوں نے اپنے خاص معتمد علیہ لوگوں کے ذریعہ اس انفرادی ستیہ گرہ کو جاری کرنا طے کیا ہے۔ وار دھا میں انھوں نے اس نئے قسم کے ستیاگرہ کی اسکیم کے متعلق کانگریس ورکنگ کمیٹی سے تبادلۂ خیالات کر لیا ہے۔ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو نے اس اسکیم کی بہت کچھ مخالفت کی لیکن مہاتما جی اپنی رائے پر قائم رہے اور ان دونوں صاحبوں کو مہاتما جی کے سامنے جھکنا پڑا۔ ابھی تک کوئی بات صاف نہیں ہوئی ہے۔ خود مہاتما جی کو معلوم نہیں کہ ان کا مجوزہ ستیہ گرہ آئندہ کیا صورت اختیار کریگا۔ مگر انھوں نے اس بات کو بالکل صاف کر دیا ہے کہ یہ ان کا آخری ستیہ گرہ ہے فی الحال وہ خود تا حدِ امکان جیل خانہ جانے سے بچے رہیں گے، اس میں بھی انکی یہی مصلحت ہے کہ دوران جنگ برٹش گورنمنٹ اُن کی گرفتاری سے پریشانی میں نہ پڑے۔ لیکن ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مہاتما جی تا اختتام جنگ اس ستیہ گرہ کو بالکل معطل ہی رکھتے؟

جنگی امداد کے خلاف جس پروپیگنڈے کی وہ اجازت مانگتے ہیں، وہ کوئی گورنمنٹ نہیں دے سکتی خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی۔ انگلستان میں صلح پسند لوگ لڑائی میں شریک ہونے سے مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں اور انھیں اپنے عقائد کے اعلان کا بھی حق ہے۔ لیکن انھیں بھی حکومت نے لڑائی کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا اختیار نہیں دیا ہے۔ ایسی صورت میں مہاتما جی کا یہ امید کرنا فضول ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستانی عوام کو جنگی امداد سے منحرف کرنے کی اجازت دیگی۔ بہرحال اس جدوجہد میں مہاتما جی کا نقطۂ خیال معمولی فہم کے آدمیوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ خیر جو کچھ ہو ہماری تو یہی تمنا ہے کہ اب بھی انگلستان و ہندوستان کے باہمی سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے، اور گورنمنٹ اور قوم پرستوں کا تصادم نہ ہو سکم از کم اس جنگ کے دوران پھر تو کوئی ایسی بات نہ ہونا چاہیئے جس سے خواہ مخواہ دشمنوں کی حوصلہ افزائی ہو یا انھیں ہم پر ہنسنے کا موقعہ ملے۔

زمانہ

جلد ۷۵   اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء   نمبر ۴

مُلک بے قوم

(حضرت جوش ملیح آبادی)

مِرے ہندکے بحرِ اعظم کے اندر
غلط ہے کہ جوش و روانی نہیں ہے

یہاں قحط ہے کس متاعِ ہنر کا
یہاں کون سی نکتہ دانی نہیں ہے

چہ شیلی، چہ شبلی، چہ ہومر، چہ حافظ
یہاں کس کی جادو بیانی نہیں ہے

یہاں کس کے رنگین ساغر کے اندر
اُبلتی مئے ارغوانی نہیں ہے

فضاؤں میں کیا قحط ہے رنگ و بُو کا
ہواؤں میں کیا گل فشانی نہیں ہے

یہاں کی فسوں آفریں سرزمیں پر
ہمالہ کے گنگا کا پانی نہیں ہے؟

یہاں قحط ہے کون سی دلبری کا
یہاں کون سی لن ترانی نہیں ہے

جو چمکے تو تلوار۔ جھومے تو بادل
کسی مُلک میں یہ جوانی نہیں ہے

مسیحی۔ یہودی مُسلمان و ہندو
کسی قوم کی بھی گرانی نہیں ہے

مگر اِس کے باوصف ہندوستاں میں
کوئی جوش ہندوستانی نہیں ہے

رُباعیاتِ جوشؔ

(۱)

حق کو نہ کبھی اہلِ یقیں سے پوچھو
صوفی سے نہ شیخ درس و دیں سے پوچھو
برداشت کی طاقت ہو تو اسرارِ حیات
رندانِ خرابات نشیں سے پوچھو

(۲)

رندانِ خرابات نشیں کی آواز
واللہ ہے عرشِ بریں کی آواز
صہبا میں ہیں جب سے معرفت کی موجیں
قلقل میں ہے جبریل امیں کی آواز

کلامِ حسرتؔ

(مولٰنا حسرت موہانی)

حال میں خوش نصیبی سے ہم کو مکرمی حسرت موہانی صاحب کا کچھ تازہ کلام دستیاب ہوا ہے، ناظرینِ زمانہ بھی اس سے لطف اندوز ہوں:-

آنکھ اس کی جو فتنہ بار اُٹھی — ہر نظر الاماں پکار اُٹھی
لیکے ہر جان کا شکیب جھکی — کر کے ہر دل کو بے قرار اُٹھی
خیلِ خوبانِ شام سے وہ حسیں — بن کے سلمائے روزگار اُٹھی
دین و ایماں کی اس کے خیر کہاں — جس کی جانب نگاہِ یار اُٹھی
کر کے آخر وہ فتنۂ پلتورؔ — دلِ حسرتؔ کا بھی شکار اُٹھی

ہماری قومی تحریک

(مسٹر گوری سرن لال سریواستو، ایم۔ اے)

جب ہندوستان میں مغربی تمدن کا دور دورہ ہونے لگا، تو لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ آخر اس کا اثر کیا ہوگا۔ ہندوستان اپنے تمدن کے لحاظ سے واحد ملک ہے جس نے زمانۂ قدیم سے عروج وارتقا کی ایک مسلسل کڑی پیش کی ہے اس ملک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو اکثر خونریزی اور تشدد کے دلدوز مناظر دکھائی دیں گے۔ لیکن اس کی علمی اور ادبی تاریخ میں ربط وسلسلہ کی ایک حیرت انگیز مثال ملتی ہے۔ حیرت ہے کہ پچھلی پچاس صدیوں سے یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہا ہے۔ وید اور اپنشدوں کے زمانہ سے گوتم بدھ تک ہندوستان ہی نے سارے ایشیا کو علم کی روشنی دکھائی۔ گوتم بدھ کے گیارہ سو برس بعد سری شنکراچاریہ نے ہندو قوم میں زندگی کی روح پھونکی، انگریز تو ہزار برس بعد آئے، اس درمیان میں بھگتی اور تصوف کی تحریکوں نے ہندوستان میں زبردست بیداری پیدا کی۔ سیکڑوں حکومتیں قائم ہوئیں اور فنا ہوگئیں۔ نہ جانے کتنی قومیں عروج وزوال کے منازل طے کرچکیں حملہ آور اس ملک میں آئے اور یہاں کے رہنے والوں میں اس طرح گھل مل گئے کہ اب انھیں پہچاننا بھی مشکل ہے اور ان کے کارنامے بھی افسانہ بنکر رہ گئے ہیں۔ ہندوؤں نے اپنی شاندار علمی عمارت سیلاب کی موجوں پر نہیں بنائی تھی۔ اُنھوں نے اپنے علوم کا جوہر طبع انسانی میں پیوست کردیا تھا چنانچہ مذاہب عالم پر ان کا اثر نمایاں ہے۔ متعدد زبانیں پیدا ہوئیں جن کا خمیر انھیں علوم سے ہوا ہے۔ یہاں تک کہ سارے ملک میں کتبے نصب کردیئے گئے جن سے ان علوم کا فیض عام ہوگیا۔ رامائن اور مہابھارت کی اس ملک میں جس قدر اشاعت ہے اُس کا سبب بھی مذہبی جوش نہیں علمی تشنگی ہے۔ یہ ایک کارنمایاں تھا، اسی نے اسلام کے طوفان کا مقابلہ کیا، جو شنکراچاریہ کے بعد ہی آیا۔ مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی، عالی شان شہر بسائے، علم وادب کی اشاعت کی اور صدیوں تک اس برّاعظم میں حکومت کی۔ ہندو قوم ایسی سخت جاں تھی کہ پھر بھی اپنی حالت پر قائم رہی، بلکہ خود مسلمان ہندوؤں کے رسم ورواج پر فدا ہوگئے۔

ہم جتنا ہی ہندوؤں کی علمی اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، اُسی قدر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہزاروں رکاوٹوں کے باوجود اس کی ترقی بدستور جاری رہی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد انسان کی روحانی زندگی پر قائم کی گئی ہے۔ مغربی تمدن کو اس آہنی دیوار کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس نے بھی وہ کام کر دکھایا

جو کسی سے نہ بنا۔ اس کا باعث مسیحی تعلیم کی اشاعت ہے۔ چونکہ مسیح کی تعلیم ہندوستان کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، اس وجہ سے مغربی تہذیب اس ملک میں آسانی سے پھیل گئی۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہم نے مغرب سے صرف مادیت کا درس لیا ہے، دراصل یورپ نے ہمیں روحانیت کا تحفہ بھی عطا کیا ہے۔ یہی روحانیت ہماری قومی تحریک میں کارفرما نظر آتی ہے۔ یہ تحریک یکایک اس وسیع ملک میں نہ پھیلتی اگر مسیح کی اہنسا کی تعلیم اس کی روح رواں نہ ہوتی۔

مذہبی تحریکوں کا زور

ہندوستان کی تحریکوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں مذہب کا عنصر شامل ہے۔ ہندو مذہب پر جب مغربی رنگ چڑھا تو برہمو سماج کی تحریک وجود میں آئی، جس نے ہندی خیالات پر مغرب کا غازہ چڑھا دیا۔ اس کے جواب میں آریہ سماج کی تحریک شروع ہوئی، جس کا خاص مقصد قدیم ہندو تہذیب کو زندہ کرنا ہے۔ اگرچہ اس کے بعض اُصول بظاہر سناتن دھرم سے مختلف ہیں لیکن اس نے ہندوؤں کو زمانہ کے ساتھ چلنا سکھایا۔ اتری ہندوستان میں آریہ سماج کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ کچھ عرصہ تک تھیاسوفی نے بھی خاصی ترقی کی مگر اب وہ مدھم پڑ گئی ہے۔ رام کرشن مشن کی تحریک زیادہ کامیاب رہی، اس کے بانی سوامی دیویکانند تھے، جن کے خلوص نے اس مشن کو آب بقا پلا دیا۔ تلک اور گاندھی کی مجاہدانہ تحریکیں بھی اسی دھرم کے سنگ بنیاد پر قائم ہیں۔ اس سے بڑھکر حسن قبول اور کیا ہو سکتا ہے۔ تلک کی تفسیر بھگوت گیتا شنکر آچاریہ کی تفسیر سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ سناتن دھرم اور تھیاسوفی کے اصولوں میں اختلاف ہے۔

ان سب تحریکوں کی بنیادی چیز ہندوستانی تہذیب ہی ہے۔ مغربی اثر نے اس میں صرف کاٹ چھانٹ کی ہے۔ برہمو سماج کے موجد راجہ رام موہن رائے "کلین" برہمن تھے۔ اُن کے خاندان کو بنگال کے مسلمان بادشاہوں سے بہت ربط ضبط تھا، انھوں نے اسلامی علوم کی تعلیم پائی تھی، وہ روشن خیال تھے، اس وجہ سے اُن کا دھرم باد مخالف کے تھپیڑے سہہ کر بھی سرسبز ہوتا رہا۔ اگر یہ چودھویں صدی میں پیدا ہوئے ہوتے تو اُنھیں کبیر اور نانک کی طرح پیغمبری کا رتبہ مل گیا ہوتا۔ رام موہن نے چوبیس سال کی عمر میں انگریزی شروع کی اور دس سال میں وہ خاصے "کرسٹان" ہو گئے۔ ان کی ماں اور بیوی بھی ان سے چھوت چھات کرنے لگیں۔ بارہ سال بعد انھوں نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی جس اتفاق سے انھیں پادری کیرے مل گئے، جن کے زیر اثر انھوں نے انجیل کا مطالعہ عبرانی اور یونانی زبانوں میں کیا۔ اُدھر سنسکرت میں ویدوں کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ اس طرح راجہ رام موہن رائے نہ صرف مذاہب عالم سے خاصی واقفیت حاصل کر لی بلکہ ہفت زبان بھی ہو گئے۔ ہمارے لیڈروں میں شاید ہی کوئی اتنی زبانیں جانتا ہو۔ راجہ رام موہن

توحید کے قائل اور بت پرستی کے مخالف تھے، انھیں تثلیث پر بھی اعتقاد نہ تھا۔ اُپنشد ہو یا انجیل زبور ہو یا قرآن انھیں ہر طرح ہر آیت میں توحید کی تعلیم نظر آتی تھی۔ بت پرستی کی بیخ کنی مدتوں بعد۔ راجہ رام موہن سے شروع ہوئی اور ابتک جاری ہے۔

رام موہن کے جانشین دیویندر ناتھ ٹیگور ہوئے، جنھوں نے برہمو سماج کو بہت فروغ دیا۔ پہلے ان کے ماننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، لیکن توحید کی برکت سے قدامت پرستی کی بنیاد ہلا دی ادھر پادریوں کا بھی دل دہل گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں برہمو سماجیوں کی تعداد بڑھنے لگی اور شنکر کے مقلد کم ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ویدوں کا پہلا ہندوستانی ترجمہ ہوا۔ جب مہرشی نے خوب روشنی پھیلائی تو پہاڑ کے دامن میں جا چھپے اور باقی زندگی لکھنے پڑھنے میں گزار دی۔

کیشب چندر سین اُن کے معاصر ہیں، جو کمی رشی سے رہ گئی تھی اُسے انھوں نے پوری کر دی۔ انھوں نے انگریزی خوب اچھی طرح لکھی پڑھی تھی۔ انگریزی تعلیم کا رواج بھی اُس وقت بنگال میں بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اس لئے کیشب چندر اپنے جدید خیالات کا خوب پرچار کر سکے۔ وہ قدامت پرستی کے سخت دشمن تھے، ذات پات، چھوت چھات وغیرہ سے بھی انھیں نفرت تھی۔ چنانچہ اب سے ایک صدی پہلے وہ مختلف ذات پات والوں کو آپس میں شادی بیاہ کرنے کی تعلیم دے رہے تھے۔ انھیں یسوع مسیح کے سنہرے اُصول پسند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سب لوگ اُنھیں مانیں۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ سری چیتنیہ کے قائل ہو گئے اور ویشنو دھرم کے پرچار کا بیڑا اُٹھایا۔ بہرحال برہمو سماج پہلی چیز تھی جو مغرب کے اثر سے پیدا ہوئی۔ مغربی تعلیم نے اسی دھرم کے ذریعہ قومی تحریک پیدا کی۔ جو لوگ قوم کے ناخدا ہوئے وہ اسی رنگ میں رنگ گئے۔

لیکن برہمو سماج اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تو کیونکر؟ ہندوستانیوں کو مغرب کی نسبت بہت کچھ معلوم نہ تھا جس سے وہ اس کی قدر کر سکتے۔ ادھر ہند قدیم کی عظمت کا خیال بھی اُن کے دل سے محو ہو چکا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُنھیں دیویندر ناتھ ایسے مہاتما مل گئے جنھوں نے ہندوؤں کی بہت سی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اُن کی تقریروں نے بھی سوسائٹی پر بہت اثر ڈالا، لیکن یہ بھی تا بہ کے۔ اُن کے بعد اس تحریک میں جان ہی نہ رہی۔ یہاں تک کہ اب اس کا عدم وجود دونوں برابر ہے۔

آریہ سماج کی تحریک سوامی دیانند سرسوتی سے شروع ہوئی۔ وہ مغربی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ جیسا ہر بڑے آدمی کی زندگی میں ہوتا ہے۔ دیانند نے بھی اپنا دھرم پھیلانے میں بڑی مصیبتوں کا سامنا کیا۔ پہلے اُنھوں نے بھی مندروں کی خاک چھانی اور پنڈتوں کے پاؤں چومے۔ لیکن سوامی ویرجانند کی

صحبت نے اُن کی کایا پلٹ کردی۔ اور اُنھوں نے توہمات کے مٹانے میں اپنی زندگی صرف کردی۔ اور ویدوں کی تعلیم کو عام کیا۔ گو سوامی دیانند قدیم گہوارۂ تمدن میں پلے تھے لیکن انھوں نے وہ ذہنی انقلاب پیدا کیا جو ولایت سے اعلیٰ تعلیم پاکر واپس آنے والے بھی نہ کرسکے تھے، اس لئے ہندوستان کی آب و ہوا اُن کی تعلیم کو راس آئی اور آریہ سماج خوب پھیلی۔ خود سوامی دیانند کی شخصیت ایسی تھی جس کی بدولت اُن کی تعلیم پر لوگ دھیان دیتے تھے۔ پہلے اُن کی سخت مخالفت ہوئی لیکن دن بدن یہ طوفان تھمتا گیا۔ اس مخالفت نے انھیں سکھا دیا کہ کس طرح زمانہ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس لئے جب آریہ سماج کی بنیاد پڑی تو اس میں قدیم و جدید دونوں عناصر شامل ہوگئے۔

شمالی ہند کے باشندوں نے آریہ سماج کی وہ خدمت کی جو سوامی جی کے تخیل میں بھی نہ رہی ہوگی۔ مغربی تہذیب کے خلاف یہ ایک جہادِ عظیم تھا جس نے ہندو قوم کی انفرادی حیثیت کو بیسویں صدی میں بھی قائم رکھا۔ مگر اس کی اشاعت مغربی طور پر ہوئی جو اُس کے لیڈروں کی زمانہ شناسی کا ثبوت ہے، ورنہ اس قدر ترقی نہ ہوسکتی۔

عملی جنبت ہے یا نفری؟

آریہ سماج کا تعلیمی پروگرام بہت وسیع ہے، اس نے اچھوتوں کو پناہ دی ہے۔ یہ بیچارے صدیوں کے مظلوم ہیں اور اب تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔ مگر اب اُن کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اچھوتوں کے مل جانے سے آریہ سماج بہت منظم ہوگئی ہے اتنی طاقت حاصل ہونے ہی کی وجہ سے اُس نے ہندوؤں کے سیاسی، تمدنی، اور مذہبی شعبوں میں بہت سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔

ادھر شمالی ہند میں یہ تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں، اُدھر مہاراشٹر میں تھیوسوفی کا ڈنکا بج رہا تھا اس تحریک میں قدیم و جدید کا اتنا خوشگوار تناسب ہے کہ ہر خیال کے آدمی کو یہ مرغوب ہے۔ اس کے لیڈروں میں مادام بالداسکی، کرنیل اولکاٹ اور مسز اینی بسینٹ بہت مشہور ہیں۔ سوامی دیانند کو اُنھوں نے تعلیم کی اشاعت میں بہت مدد دی۔ اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اچھی چیز کی اشاعت میں کس طرح ہر فرقہ کی دلی ہمدردی شامل رہتی ہے۔ تعلیم کے علاوہ اگر دوسرے شعبوں میں بھی سوامی جی اُن کا ساتھ دیتے تو ایک بے مثل تحریک پیدا ہوجاتی جس کی مثال ایشیا کی تاریخ میں نہ ملتی۔ پھر بھی تھیوسوفی نے ہندو قوم کو بیدار کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ اس بیداری کا اہم ترین نتیجہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی بنیاد ہے

رام کرشن

اسی دوران میں ایک اور ستارہ اُفقِ مشرق سے طلوع ہوا۔ ہماری مراد سوامی رام کرشن سے ہے،

جن پر مغربی تہذیب کے نقوش بھی تھے۔ یہ نہ کوئی بڑے عالم تھے اور نہ پیغمبر یا مصلح اعظم۔ وہ یورپ کے رفارمر سینٹ فرانسس (St. Francis) کی طرح مجنون اور گم کردہ عقل تھے اور انھیں کی طرح اُن کا دل بھی فراخ اور اُن کی روح پاکیزہ تھی۔ اسلام اور مسیحیت کسی سے اُنھیں بَیر نہ تھا۔ اُن کا قول و فعل بالکل ایک تھا۔ ایک طرف دیانند نے اور دوسری طرف کیشب نے اُن کے اصولوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنے اپنے خیالات کی اشاعت کی۔ رام کرشن نے محض اِن دونوں میں روح پھونک دی۔ ان کے شاگرد دیویکانند نے مشن کی بنیاد ڈالی۔ مشن والوں کے لئے مٹھ بنے ہوئے ہیں جن میں علوم دینی کا گہرا مطالعہ ہوتا ہے۔ یہاں کے سادھو غریبوں کی خدمت میں عمر بسر کرتے ہیں۔ اسی جذبۂ خدمت نے مشن کو ترقی کی معراج پر پہونچا دیا ہے۔

جس وقت اس تحریک کی ابتدا ہوئی ہندوستان پر مذہبی تہذیب رنگ جما چکی تھی۔ مسیح کا نام گھر گھر مشہور ہو چکا تھا۔ ہندی روایات بھی مٹی نہ تھیں پھر بھی باہری تہذیب سے پرہیز کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جیسوئٹ (Jesuit) پادریوں کی طرح اس مشن کے لوگوں نے وسیع علمی تبحّر کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا۔ اسی لئے رام کرشن مشن آج ایک زندہ جاوید تحریک ہے۔ جدید ہندوستان کی یہ ایک بہترین پیداوار ہے اس کی تعلیم برہمہ سوتر پر مبنی ہے جو ہندو مذہب کی روح رواں ہے۔ اسے شنکر کا اُصولِ وحدانیت بھی پسند ہے۔ یہی نہیں کرم یوگ کا فلسفہ بھی اس کا ستون ہے۔ آج اس کا کوئی مخالف نظر نہیں آتا کیونکہ اس کی بنیاد سچائی پر رکھی گئی ہے۔ ہندی اور مسیحی خیالات کے مل جانے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندو تنگ نظری سے بچ گئے اور عیسائی ہندو دھرم کی عظمت سے واقف ہو گئے۔

برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفی اور رام کرشن مشن نے مسالہ تیار کر رکھا تھا۔ اِس لئے جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی تو دم کے دم میں سارے ملک میں پھیل گئی۔ مہاتما گاندھی نے جو بگل بجایا تو اُس کی آواز راس کماری سے نگا پربت تک گونج اُٹھی۔ مہاتما کی گرفتاری نے منصور کا افسانۂ دار و رسن یاد دلا دیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ مسیح کا رومن استبدادیت سے مقابلہ تھا۔ یہ آگ دھیرے دھیرے سُلگی اور یکایک بھڑک اُٹھی۔

ان تحریکوں کا ذکر ہندوستان کی مختلف زبانوں میں آیا ہے چنانچہ ہر زبان کے ناول، افسانے اور مضامین اُن سے بھرے پڑے ہیں یہی نہیں بلکہ اکثر تحریکوں کے بانی بھی خود ادیب اور اخبار نویس تھے۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے سے لے کر مہاتما گاندھی تک جتنے لیڈر ہوئے ہیں سب ادیب اور اخبار نویس رہے ہیں۔ ہندوستانی زبان کی محض اس لئے تجدید نہیں ہوئی کہ نئے خیالات کو ان میں جگہ ملے بلکہ

اس وجہ سے بھی کہ لٹریچر کی جو اصناف پیشتر سے موجود تھیں اُنھیں وسعت ملی۔ چنانچہ ناول۔ افسانہ۔ مضامین اور سوانح عمری ہر ایک کی دیسی زبانوں میں بہتات ہوگئی، اور پریس کی ترقی ہوئی تو ہر جگہ کتابیں آسانی سے پہونچنے لگیں۔

فنون لطیفہ کی تجدید

ہندوستانی ادب نے انگریزوں کے آنے سے قبل ہی کافی ترقی کرلی تھی، مگر فنون لطیفہ کی ترقی کے لئے وقت اور سرمایہ درکار ہوتا ہے، اس لئے وہ پیچھے رہ گئے۔ حق تو یہ ہے کہ مغلوں کے زوال کے ساتھ وہ بھی برباد ہوگئے۔ ہمارا نیا ادب نئے ماحول کا پیداوار تھا۔ جو ایک دلچسپ ادبی حقیقت ہے لیکن فنون لطیفہ کی تجدید اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہ مردہ ہوچکے تھے اور اُن کا جاننے والا کوئی باقی نہ تھا۔ زمانۂ قدیم میں ہندوستان نہ صرف اپنے فلسفہ بلکہ فنون لطیفہ کے لئے بھی مشہور تھا۔ ملک پر بار بار حملے ہوئے لیکن فنون پر آنچ نہ آئی۔ حملہ آور یہاں کی دولت لوٹنے کے لئے آتے تھے لیکن یہاں کے علوم و فنون انھیں اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے اور اُن میں سے اکثر یہیں آباد ہوجاتے تھے۔ مذہبی خیالات کا اظہار فنون لطیفہ کے ذریعہ بہت اچھی طرح ہوتا ہے اور مذہب ہندوستان کی روح ہے اس لئے یہاں اُن کی ترقی بہت ہوئی۔ باہر سے جو لوگ آئے وہ یہاں کے باشندوں سے اس طرح گھُل مِل گئے کہ یہاں کا مذہب بھی اختیار کرلیا۔ مسلمان بت شکن تھے اس وجہ سے اُنھوں نے پہلے تو مختلف فنون کو سخت دھکا پہونچایا لیکن جب اُنھیں ہوش آیا تو انھوں نے اس کی عظمت کا احساس کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی سنگ تراشی، معماری، مصوری اور خوشنویسی ہر ایک میں ہندوستانی رنگ جھلکنے لگا۔ ایران خود فنون لطیفہ کا مرکز تھا، جب ہندوستان کا غازہ اس پر چڑھایا گیا تو اُس کا حُسن دوبالا ہوگیا۔

حسین اور باریک چیزوں کی صنعت ہندوستان میں ہمیشہ سے قائم تھی سوت۔ ریشم اور طلائی دھاگوں کی صنعت، دھات اور جواہرات کا کام، ہاتھی دانت کی مصنوعات عام پسند چیزیں تھیں اور اس مُلک میں برابر زندہ رہی ہیں۔ دکن میں کسی صنعت کو نقصان نہیں پہونچا کیونکہ وہاں بہت کم بت شکن گئے معماری، پچّی کاری اور چوب کاری میں ڈراوڑوں نے بڑی ترقی کی۔ موسیقی ایسی ہر دلعزیز تھی کہ اورنگزیب بھی اُسے مٹا نہ سکا۔ اس وقت بھی جب ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق ضرب المثل ہوگیا ہے ہندوستانی موسیقی سرمایۂ اتحاد ہے۔ موسیقی کی ترقی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندو مسلمان دونوں نے اسے مالامال کیا ہے۔

مغربی اُصولوں کی اندھا دُھند تقلید کرنے کی وجہ سے بعض فنون لطیفہ کو سخت نقصان پہونچا ہے مصوری خاص طور پر اس سے متاثر ہوئی۔ انسان، جذبات کا پُتلا ہے اور وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار موسیقی

رقص۔ شاعری۔ مصوری اور پرستش وغیرہ مختلف صورتوں میں کرتا ہے۔ یوں تو کوئی فن لطیف صاحبِ فن کی ذات پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، لیکن مصوری خاص طور پر دیکھنے والوں کے لئے ہوتی ہے۔ مصور کا کمال یہ ہے کہ دیکھنے والوں پر وہی کیفیت پیدا کردے جو خود اُس کے دل میں ہے۔ اس کے لئے وہ اپنی انفرادیت سے کام لیتا ہے۔ ہمارے مصور جب مغربی اسالیب پر چلتے ہیں تو یہی بات بھول جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت نقال کی سی رہ جاتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب اس کا ردِ عمل شروع ہوگیا ہے بنگال میں مصوری کے بعض ایسے اسکول قائم ہوئے ہیں جنھوں نے گوتم بدھ کی قدیم یادگاروں کو تازہ کیا۔ اسی طرح بمبئی اور اندھرا دیس میں بھی بہت مفید کام ہو رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے ذریعہ حیاتِ انسانی کی دَور بدور ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ آج جو ہندوستان میں فنون کی تجدید ہو رہی ہے تو ہماری آنکھیں اپنے ملک کے شاندار مستقبل کا خواب دیکھنے لگی ہیں۔

نتیجہ

ہم نے ان چند تحریکوں کا ذکر کیا ہے جو اس ملک میں امن وامان قائم ہو جانے کے بعد وجود میں آئیں یہی وہ تحریکیں ہیں جن پر کانگریس کی موجودہ تحریک کی بنیاد قائم ہے۔ ان کی بدولت اتنا ضرور ہوا کہ قدیم ہندوستان کی صنعت وحرفت زندہ ہونے لگی اور ہندو مسلمانوں میں جو صدیوں تک کلچرل اتحاد تھا اس کا نظارہ دکھائی دینے لگا۔ تعلیم کی اشاعت ہوئی اور ملک کی اقتصادی حالت بہتر ہونے لگی، سماج کی جڑیں کھودنے والی جو بُرائیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ رفتہ رفتہ دُور ہونے لگیں، پردہ کا رواج کم ہوگیا۔ چھوت چھات کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئیں، سمندر پار جانے کی قید دُور ہوگئی، آزادیٔ نسواں کا تخیل لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا عورتوں کی تعلیم کا چرچا بڑھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ ہم میں ایک آزاد اور خود دار قوم کی صفات پیدا ہونے لگیں۔

فنونِ لطیفہ کی تجدید سے یہ فائدہ ہوا کہ ہم اپنی انفرادیت قائم رکھ سکے، ورنہ دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہم بھی بے راہ روی اختیار کر لیتے۔ فنونِ لطیفہ کا مستقبل ہندوستان میں بہت روشن معلوم ہوتا ہے اور گو اس وقت بعض حالات دلشکن ہیں پھر بھی اُمید کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی روح ایک نئے قالب میں اوتار لے کر ہماری تہذیب کو ترقی کے ساتھ زندہ رکھے گی۔

رات کی صحبتیں جو یاد آئیں — اٹھ گئے شمع رو کے محفل سے

ڈوبی ہے کس غریب کی کشتی — سر پٹکتی ہیں موجیں ساحل سے

آمیر مینائی

عیدِ بہاراں

(حضرت سرشار کسمنڈوی)

ہوائیں معطّر، فضائیں درخشاں — یہ کون آ رہا ہے خراماں خراماں
یہ زورِ جوانی، یہ جوششِ بہاراں — کوئی نغمہ پیرا ہے کوئی غزل خواں
مرے جوشِ وحشت کو ٹھکرانے والے — سمجھتے نہیں حرمتِ چاک داماں
وہ دن آ رہا ہے کہ ڈھونڈو گے مجھکو — بیاباں بیاباں، گلستاں گلستاں
نہ دل میں حرارت، نہ آنکھوں میں آنسو — نہ اب سوزِ پنہاں، نہ سازِ نمایاں
کہاں آ گئے تم، کہاں آ گئے تم — یہ گورِ غریباں ہے، گورِ غریباں
یہ بھیگی ہوائیں، رسیلی گھٹائیں — یہ کوئل کی کوکو یہ وحشت کے ساماں
نظامِ مشیّت، وہ سایہ، یہ آندھی — جوانی پریشاں، محبّت گریزاں
کوئی مطمئن اپنی سادہ دلی پر — کوئی اپنی آنکھوں کی شوخی پہ نازاں
دلآویزیِ خلد اپنی جگہ پر — مگر کوئے جاناں، مگر کوئے جاناں
جوانی کے شعلوں سے ہشیار رہنا — یہ ظالم ہمیشہ سے ہیں برق ساماں
جہاں نغمتِ بیخودی بٹ رہی ہے — وہیں جا رہا ہوں میں افتاں و خیزاں
کبھی اہلِ سطوت کی دلدوز آہیں — کبھی اُن کے کوچے میں شورِ گدایاں
فضائیں نکھرتی چلی جا رہی ہیں — کہ درپیش ہے ان کو عیدِ بہاراں

محبت مقدّس ہے سرشار لیکن
خدا پاکیِ ذوق بھی دے تو احساں

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا — احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر — لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

اکبر

"ہندستانی" زبان اور آرزو لکھنوی

(از سید اعظم حسین ایڈیٹر "سرفراز" لکھنؤ)

زبان کا مسئلہ ملک کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اگر صرف ادبی حیثیت رکھتا تو اتنا زیادہ اہم نہ ہوتا لیکن اُس نے ادبی سے زیادہ سیاسی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سوال اس وقت ملک کا سب سے بڑا سوال ہوگیا ہے۔ ہندستان میں ہندو و مسلمان دو عظیم الشان قومیں آباد ہیں، جن میں اگر نباہ نہ ہوسکا تو پھر ملک خانہ جنگی سے تباہ و برباد ہو کر رہ جائیگا۔ ان دونوں قوموں کا میل ستر فیصدی زبان پر منحصر ہے۔ اگر ان کی زبان ایک ہے تو پھر زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان میں ایکا رہنا بالکل فطری ہے۔ آج یورپ کی تقسیم بہت حد تک زبان ہی کی بنا پر ہو رہی ہے جتنی آبادیاں ایک مشترک زبان بولتی ہیں وہ آپس میں جتھہ بندی کر رہی ہیں، برخلاف اس کے جو قومیں ایک دوسرے سے مختلف زبانیں بولتی ہیں وہ ایک دوسرے سے الگ ہوتی جا رہی ہیں۔

ہندستان میں صدیوں سے مختلف زبانیں بولی جا رہی ہیں لیکن ملک پر نظر کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو جماعت ایک خاص زبان بولتی ہے وہ ملک کے ایک خاص رقبہ میں آباد ہے۔ بنگالی تامل ٹلیگو۔ مرہٹی۔ پنجابی زبانوں کے مخصوص و محدود رقبے ہیں جن کے اندر یہ زبانیں بولی جاتی ہیں اور انھیں زبانوں کی وجہ سے یہ رقبے ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہیں۔ اگر ملک میں مسلمان بھی کسی ایک حصہ یا خطّہ میں آباد ہوتے اور اُن کی وہاں کی ایک خاص زبان ہوتی تو آج جدید فرقہ وارانہ رجحانات کی موجودگی میں صورت حال اتنی پیچیدہ نہ ہوتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان سارے ہندستان میں پھیلے اور ملک کے ہر حصہ میں آباد ہیں۔ وہ ہر جگہ ہندو آبادی سے معاشرت میں مخلوط ہیں لیکن اس کے بعد بھی اُن کے لیڈر زبان کے مسئلہ میں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

اگر فرقہ وارانہ جذبات سے دلوں کو خالی کرکے دیکھا جائے تو یہ صورت حال کہ مسلمان سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، زبان کے مسئلے کو اور سہل کر دینے والی ہے۔ اس لئے کہ مسلمان جس رقبے میں ہیں وہاں کی جو مقامی زبان ہے وہی اُن کی بھی مادری زبان ہے۔ اور وہ وہی زبان بولتے اور لکھتے ہیں لیکن آج بدبختی سے ملکی سیاسیات پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے ہندو قوم کی طرف سے

یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اُن کی مادری زبان ہندی ہے، اور مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ اُن کی مادری زبان اُردو ہے۔ اگرچہ آج اتنے تعصب کی فضا میں بھی مختلف رقبوں کے ہندو مسلمان اپنے رقبوں کی مخصوص زبان کے آگے ہندی و اُردو کی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ جب مدراس میں کانگریس گورنمنٹ نے ہندی رائج کرنا چاہی تو وہاں کے ہندوؤں نے جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہے، اس کی شدید مخالفت کی اور ستیاگرہ کے ذریعے مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ اسی طرح جب بنگال میں لیگی حلقوں کی طرف سے اُردو کو رواج دینے کی کوشش کی گئی تو بنگال کے مسلمانوں نے اس کوشش کو بالکل پسند نہیں کیا اور اُن کی مخالفانہ اسپرٹ کو دیکھکر حامیانِ اُردو کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ بنگال میں اُردو کو قوت کے ساتھ رواج دیں۔ آج بھی بنگال کے جلسوں میں جو تجاویز منظور کی جاتی ہیں وہ یا بنگلہ زبان میں ہوتی ہیں یا پھر انگریزی زبان میں۔

لیکن ان ٹھوس حقیقتوں کے باوجود فرقہ وارانہ تعصب کی ایک کالی آندھی ملک میں چل رہی ہے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیاری میں ہندی والے ہندی کا شور مچا رہے ہیں اور اُردو والے اُردو اُردو چلا رہے ہیں۔ یہ ہنگامہ اب اتنا قوی ہو گیا ہے کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب ہندی و اُردو کے سوال کو کسی نہ کسی طرح طے ہی کرنا ہے، آل انڈیا ریڈیو میں آجکل جو زبان بولی جاتی ہے، اس پر ہندی والوں کی طرف سے بڑی لے دے ہو رہی ہے، ان میں سے بعض اعتراض تو بالکل ہٹ دھرمی کے ہوتے ہیں، لیکن بعض میں معقولیت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً کچھ اعتراض کرنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ اس ریڈیو پر سیدھی سادی ہندوستانی بولی جائے، ایسی زبان نہ بولی جائے جس میں بے ضرورت عربی، فارسی یا سنسکرت و ہندی کے لفظ ٹھونسے جاتے ہوں۔

درحقیقت یہی سمجھوتا ایسا ہے جو زبان کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے، اور اگر اس پر ایمانداری سے عمل کیا جائے تو ملک کا یہ سب سے زیادہ خطرناک جھگڑا النسبتاً آسانی سے چُک سکتا ہے۔

مجھے یہاں یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ اس حل کو جس نے سب سے پہلے سب سے زیادہ سائنٹفک طریقے سے ادبی و علمی دنیا میں پیش کیا وہ جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی کی ذات ہے۔ جناب آرزو ماضی قریب کی معتدل غزلگوئی کے فن لطیف کے ایک ممتاز پیشوا ہیں۔ آپ کی سیکڑوں غزلیں "فغانِ آرزو" اور "جہانِ آرزو" میں چھپ چکی ہیں اور ہندوستان میں ہر طرف مشہور ہیں۔ کراچی ہو یا رنگون، دہلی ہو یا حیدرآباد ہر جگہ راہ چلتے یہ غزل گائی جاتی ہے کہ ؎

آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا تو کوئی نہیں

سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں
قتالِ جہاں معشوق جو تھے سونے ہیں پڑے مرقد اُن کے
یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں

جناب آرزو کی اِن غزلوں کے علاوہ اُن کی وہ تازہ نظمیں اور گیت جو وہ نیو تھیٹرس لیمیٹڈ کے ڈراموں کے ذریعے پیش کر رہے ہیں ملک میں زبانوں پر عام طور سے جاری ہو گئے ہیں۔ کون ہے جس نے نیو تھیٹرس کا "مکتی" دیکھا ہے اور اُس کے کانوں میں یہ شعر نہیں گونج رہے ہیں:-

عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے کہ ہیں ظلم پر ظلم اور بے بسی ہے
کمائی کسی کی ہے، قبضہ کسی کا جدھر دیکھئے اُلٹی گنگا بہی ہے
غریبوں کا خون آرزو جل رہا ہے
امیروں کے گھر ہر طرف روشنی ہے

آرزو کی ان غزلوں اور گیتوں نے ایک رومانی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ میں نے ضلع اعظم گڈھ کے ایک دیہاتی ڈاک کے ہرکارے کو دیکھا کہ وہ اپنے کاندھے پر چٹھیوں کا جھولا ڈالے سنسان جنگل کی پگڈنڈیوں پر یہی غزل گاتا اکیلا چلا جا رہا تھا۔ ع

"آرام کے تھے ساتھی کیا کیا جب وقت پڑا تو کوئی نہیں"

یا کاروباری شہر کی تاریک کوٹھریوں میں دن بھر کے تھکے ماندے مزدوروں کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے "عجب زندگی ہے، عجب زندگی ہے" کے نغمے سے اپنے پریشان دل کو تسکین دے رہے ہیں!

کلام کی یہ مقبولیت جناب آرزو کی بہت بڑی کامیابی ہے، یقیناً لٹریچر میں آرزو کا نام بحیثیت ایک ایسے شاعر کے یاد کیا جائیگا جس کے کلام سے عوام کے دلوں کو قدرے سکون ملتا تھا۔ لیکن آرزو کی سب سے بڑی تاریخی اہمیت ان کی ان کوششوں کی بدولت ہے جو اُنھوں نے "ہندستانی" زبان کو رواج دینے کے لئے کیں۔

جناب آرزو اُردو زبان کے مصلح اعظم ناسخ مرحوم کے اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناسخ کے جانشین رشک، رشک کے جانشین جلال اور جلال کے جانشین آرزو لکھنوی ہیں۔ ناسخ۔ رشک۔ جلال سب نے اس اصول پر زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو زبان میں دیسی لفظیں زیادہ استعمال کی جائیں یعنی اگر ایک مفہوم کے لئے دو مروجہ لفظیں موجود ہوں جن میں ایک فارسی کی ہو اور دوسری بھاشا کی تو ان دونوں میں سے

بھاشا کی لفظ کو فارسی پر ترجیح دینا چاہیئے۔ مصلحین زبان کے اس سلسلے کے علاوہ اردو کے بعض دوسرے شاعروں نے بھی اس اصول کی حمایت کی ہے۔ چنانچہ اردو کے مشہور غزل گو داغ دہلوی مرحوم لکھتے ہیں:۔

کہتے ہیں اسے زبانِ اردو

جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

جناب آرزو نے اسی اصول کو پوری اہمیت دی اور اُسے صرف سرسری طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اس پر غور و خوض کر کے اسے ایک خاص نظام و ضابطہ دیدیا۔

چنانچہ جناب آرزو نے اپنی تصنیف "نظام اردو" میں جس میں زبان اردو کے قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں، لکھا ہے:۔

"اردو کی اصل وہی زبان مانی جاسکتی ہے جس کے الفاظ سے بلا شرکت غیرے ایسا جملہ بن جائے جسے اردو کہہ سکیں۔ یہ بات سوا الفاظ ہندی کے غیر ہندی کو حاصل نہیں مثلاً میر:۔

"تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے"

دیکھ لو کہ شعر بھر میں کوئی لفظ غیر ہندی نہیں اور مطلب ادا ہو گیا۔ برخلاف اس کے کلمات غیر ہندی سے کوئی ایسا جملہ نہیں بنتا جسے بغیر شرکت لفظ ہندی کے اردو کہہ سکیں، مثلاً غالب:۔

"شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا"

اس شعر کا اردو کہا جانا صرف "آمد" کی جگہ "آیا" استعمال کرنے پر موقوف ہے۔ اس تفصیل سے اردو زبان کے اجزائے بنیادی ہندی اور اجزائے امدادی کلمات غیر ہندی ہیں، عام اس سے کہ وہ فارسی ہوں یا عربی یا ان کے علاوہ۔

ہندی سے کوئی خاص زبان مراد نہیں بلکہ اس لفظ میں یائے نسبتی ہے جو اندرون ملک کی تمام زبانوں کے ان الفاظ کو جو اردو میں مخلوط ہیں ملک ہند کی طرف منسوب کر رہی ہے مثلاً آٹا بھاشا، نتھا گجراتی، منڈا پنجابی، کیس بنگالی، چورن سنسکرت زبان کا لفظ ہے، مگر اردو میں مناسبت ملک سے سب ہندی کہے جاتے ہیں، اگرچہ اکثر میں تغیر صورت و تبدل معنی سے امتیاز اصلیت باقی نہیں ہے"

جناب آرزو نے اس کتاب میں آگے چل کر بتایا ہے کہ ہندی لفظوں کے علاوہ عربی اور فارسی وغیرہ کی جو لفظیں اپنی معنی یا صورت میں تبدیل ہو کر اردو میں آگئی ہیں انھیں اصطلاح میں مہند معنوی یا مہند صوری کہتے ہیں۔ یعنی وہ کسی نہ کسی حیثیت میں ہندی بنا لی گئی ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان میں ہندی کو کس قدر زیادہ عمل دخل ہے برخلاف عربی و فارسی کے "ہندی الفاظ ہر حالت

میں ہندی کہے جاتے ہیں کہ وہی اجزا، بنیاد زبان ہیں، اگرچہ ان میں بھی اُسی طرح تغیرات صوری ومعنوی موجود ہیں جیسے بادر سے بادل، تروار سے تلوار، چندر سے چاند وغیرہ۔ تغیر صوری کے شاہد ہیں یا چورن سنسکرت میں آٹے کو کہتے ہیں، مگر اُردو میں خاص قسم کی دوائے ہاضم کا نام ہوگیا، یا منڈا پنجابی میں لڑکے کو کہتے ہیں اور اُردو میں ہر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو سر کے بال صاف کرادے۔"

ہندی کو اُردو کا اصلی، بنیادی اور لازمی عنصر بتانے کے بعد جناب آرزو اسی کتاب میں "بحث اضافۂ الفاظ" کے زیر عنوان فرماتے ہیں:-

"وقت ضرورت لفظ کا اضافہ اکثر غیر ہندی سے ہوتا ہے، اور قبول اثر کے بعد حکم ہندی میں آجاتا ہے کیونکہ ہندی سے اُردو زبان کی بنیاد پڑی اور غیر ہندی سے اس کی ترقی ہوئی، اسی ضرورت سے انگریزی الفاظ بھی اُردو میں داخل ہوئے اور برابر شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

"ہندستانی" زبان کے اس بنیادی نظام کو جناب آرزو نے اپنی غزلوں کے تیسرے مجموعہ "سُریلی بانسری" میں زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے۔ آپ سریلی بانسری کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:-

"بات کرتے وقت جتنی لفظیں منھ سے نکلتی ہیں وہ تین ہی طرح کی ہوتی ہیں، یا نام یا کام یا دونوں کو ملانے والی جن کو (اسم۔ فعل۔ حرف) کہتے ہیں۔ اُردو میں یہ تینوں قسمیں جن سے بات پوری ہوتی ہے ہندی ہی سے بل رہی ہیں، جس کے ثبوت میں سید انشا کی "رانی کیتکی" والی کہانی اور میری سوا سو سے زیادہ غزلیں جن کے ساتھ رُباعیاں، دوہتیاں، نظمیں، قطعے اور دو نثریں اسی کتاب میں آنکھوں کے سامنے ہیں، اس سے یہ پتا تو چل گیا کہ اُردو کی اصل سوا ہندی کے کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کی ترقی اور تکمیل بدیسی لفظوں ہی سے ہوئی جس سے یہ ادھوری زبان پوری ہوگئی۔ اب یہ بتانا رہا کہ ہندی کیا چیز ہے۔

اِس ہندی کی چندی یہ ہے کہ دلّی ہی پہلے بھی یہاں کی سب سے بڑی راجدھانی تھی، اسی لگاؤ سے ہندوستان بھر کے لوگ جن کی زبانیں الگ الگ تھیں دلّی میں آتے جاتے رہتے تھے، اور آپس کی بات چیت سے پنجابی، گجراتی، بنگالی، تلنگی اور سبھی دیسی زبانوں کی لفظیں ہندی میں کھپتی چلی جاتی تھیں جس سے دلّی کی زبان دیسی زبانوں کی کھچڑی بن گئی تھی، آج اس کھچڑی کو ہندی کہا جا رہا ہے۔ کسی ایک زبان کو نہیں۔ ہم نے دیسی لفظوں کو سمیٹ کر ایک جگہ کر دیا اب بدیسی لفظوں کا میل اور اُن کی حد بتانا رہی۔

ہر دیس میں پردیسیوں کا آنا جانا بھی لگا ہی رہتا ہے جس سے بدیسی لفظیں بھی دیسی بول چال

میں کھپتی رہتی ہیں، جو گھُل مل کر ایسی کھپ جاتی ہیں کہ پرائی نہیں رہتیں اپنی ہو جاتی ہیں، اور اس گھال میل سے دنیا کی کوئی زبان بھی نہیں بچی ہے، پھر ہندی کیونکر بچ سکتی تھی۔

جب مسلمان یہاں آکر سب طرف پھیل گئے اور میل جول بڑھا تو ان کی فارسی زبان کے ساتھ ترکی۔ عربی۔ یونانی۔ عبرانی۔ سُریانی اور نہ جانے کن کن زبانوں کی لفظیں دیسی زبان میں مِل گئیں، مگر صرف نام یا اصطلاحیں یا بعض وہ مرکب لفظیں جو مفرد کی طرح لائی جاتی ہیں، اس کے آگے کچھ نہیں۔ بس یہ ہے دیسی زبان میں بدیسی لفظوں کی حد اور یہ ہے ساجھے کی کھچڑی، زبان جو سب کی ہے ایک کی نہیں۔

پہلے اس سدھاری ہوئی اور ترقی دی ہوئی شہری عام زبان کا نام ہندی ہی رہا اور فرق سمجھنے کے لئے دیہاتی زبان کا نام ٹھیٹھ ہندی ہو گیا، مگر جب یہ شہری ہندی فارسی حرفوں میں لکھی جانے لگی تو اس کا نام اُردو ہو گیا۔

اس کو یوں سمجھئے کہ کسی کسی لفظ کے معنی سمجھنے میں دھوکا ہوتا تھا، جیسے "نذیر" کے معنی اور "نظیر" کے معنی اور، تو فارسی حرفوں سے بھی کام لینا پڑا کہ ا۔ ع۔ ذ۔ ظ کی طرح ث۔ س۔ ص۔ ت۔ ط۔ کے فرق سے بھی معنی بدل جاتے ہیں۔ عرب کی طرح ہمارا لہجہ ان حرفوں کا فرق نہیں بتاتا نہ ان حرفوں کی جگہ ناگری میں دوسرے حروف تھے۔ جب ہندی کا ٹھاٹھ سننے کے ساتھ دیکھنے میں بھی کچھ کا کچھ ہو گیا تو جو ہندی دیہات میں پھیلی ہوئی تھی اُس سے الگ کرنے کے لئے اس شہری ہندی کا نیا نام رکھنا پڑا ایک نام "ریختہ" رکھا گیا وہ دل کو نہ لگا، دوسرا نام "اُردو" رکھا گیا وہ زبانوں پر چڑھ گیا۔

مسلمان دعویٰ کریں کہ اُردو ہماری زبان ہے تو غلط ہے، اور ہندو کہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے تو غلط ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ فارسی زبان لائے تھے، اُردو تو آپس کے میل سے یہیں بنی، جس میں باہر کی آئی ہوئی لفظیں گنتی کی ہیں جنھیں ہم بتا چکے ہیں۔ آج جس زبان کو ہم بول رہے ہیں وہ سبھی کی ہے۔ ساجھے کی چیز میں سب کو برابر کا حق پہونچتا ہے۔ اگر کچھ لفظیں دونوں کی الگ الگ ہیں تو وہ قومی اور مذہبی اصطلاحیں ہیں جو ایک ہو ہی نہیں سکتیں، ہندو ہمیشہ سے پُوجا۔ اشنان۔ بول رہے ہیں اور ہمیشہ بولیں گے۔ مسلمان غسل۔ عبادت۔ اور ایسی ہی بہت سی لفظیں بولا کرتے ہیں اور بولا کریں گے۔ اتنے فرق سے ایک کی دو زبانیں نہیں سمجھی جا سکتیں۔ نئی لفظیں وہی بڑھائی جا سکتی ہیں جن کی ضرورت پڑتی ہے۔ .... پڑھے لکھوں نے بجلی کے تاروں کا نام مثبت منفی بنایا کہ پازیٹو اور نگیٹیو علم اُردو کے قابل نہ تھا لیکن خود مزدوروں کے لئے دونوں برابر تھے، آخر انھوں

نے اپنے مطلب کے نام ٹھنڈا تار اور گرم تار رکھ کر ایسی اصطلاحیں بنالیں جو زبانوں پر چڑھ گئیں۔ پڑھے لکھوں کو چاہیئے کہ اپنی ضرورت کی لفظیں یعنی علمی اصطلاحیں بنائیں، دوسروں کا کام اُن پر چھوڑ دیں جب زبان بن چکی، ترقی کر چکی، کمی پوری کرنے کے طریقے معلوم ہو چکے، تو اب آگے بڑھنا ہو یا پیچھے ہٹنا راہ سے ہٹ کر گراو چلنے کے برابر ہے۔ پہلے ایک نے بدنما پیوند لگا کر زبان کی چوعدّی کو بگاڑا جس سے ہندی اور اُردو کا سوال پیدا ہو گیا اور ایک کی دو زبانیں سمجھی جانے لگیں۔ پھر دوسرے نے بھدّے بوڑ بٹھا کر حد سے تجاوز کیا اور اُردو کو ہندی بھی نہیں سنسکرت بنا ڈالنے کی فکر کی۔ یہ وہ چلن ہیں جن سے بنتا کام بگڑ جاتا ہے اور میل کے بدلے پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ زبان بنا کر بڑھائی نہیں جاتی، وہ تو آپ سے آپ بنتی ہے اور پھیل جاتی ہے، زبان کی دیکھ بھال اتنی ہو رکھنا چاہیئے جس سے حدیں نہ بگڑیں اور علمی سرمایہ جو ایک کا نہیں سب کا ہے بیکار نہ ہو جائے۔ آجکل میں کلکتے میں ہوں اور بابو لوگوں سے ہر وقت کا ساتھ ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے بنگلہ زبان کی سو لفظوں میں بیس سے کم فارسی، عربی کی لفظیں نہ ملیں گی۔ مگر وہ اپنی زبان سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ اُسے بدلنا نہیں چاہتے سب لفظوں کو اپنا سمجھتے ہیں۔ انھیں نکالنا اور دیسی لفظوں کو ان کی جگہ دینے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے۔ یہ سمجھدار قوم جانتی ہے کہ ہر آدمی سے اُس کی عادت چھوڑوانا، نیا سبق رٹوانا نہ بس کی بات ہے نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ کام تو چل ہی رہا ہے اس لئے جو قیمتی وقت ضروری کاموں میں لگانے کا ہے اُسے بے کام کے کام میں کیوں گنوائیں۔ دنیا کی ہر زندہ قوم آئی ہوئی لفظوں کو نکال نہیں رہی ہے، بلکہ جو اپنے یہاں نہیں ہے دوسروں سے لے رہی ہے۔

یہی ہم کو بھی کرنا چاہیئے، آج جو لفظیں زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، وہ دیسی ہوں یا بدیسی، سب زبان میں کھپ چکیں، اُس کا جزو بن چکیں، انھیں سے کام لینا چاہیئے اور جو شہری زبان میں نہیں رہیں جیسے چرن گوڑ، پاؤں، پیر کی جگہ یا وہ لفظیں جو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیئے۔ یہی آسان زبان ہوگی جسے سب بول سکیں گے، سمجھ سکیں گے۔ اور یہی خالص اُردو زبان ہوگی جسے "ہندستانی" بھی کہہ سکیں گے۔"

جناب آرزو صرف یہ اُصول پیش کر کے بیٹھ نہیں رہے ہیں بلکہ اس پر انھوں نے حیرت انگیز طور پر عمل کیا ہے، اور "سُریلی بانسری" اسی عمل کا ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا ثبوت ہے۔

"سُریلی بانسری" میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ در اصل ردّ عمل (Reaction) ہے اس اجنبی اور ٹھوس زبان کا جو ہندی والے سنسکرت اور اُردو والے عربی و فارسی کی بے محل و بے ضرورت ٹھونس ٹھانس سے تیار کرتے ہیں۔ جناب آرزو نے "سُریلی بانسری" میں جو زبان لکھی ہے وہ "ہندستانی"

سے بھی زیادہ محدود ہے۔ اس زبان کے متعلق جناب سید علی عباس صاحب حسینی ایم۔ اے "سریلی بانسری کے" تعارف" میں لکھتے ہیں:۔

"آرزو صاحب نے جو بندھن اپنے اوپر باندھ لئے تھے وہ بڑے کڑے تھے، انھوں نے ہندستانی سے عربی، فارسی اور سنسکرت کے لفظ بالکل چھانٹ کر اپنا کام بہت کٹھن بنا لیا تھا۔ وہ کہتے تھے ان کی "خالص اردو" میں ہندی کے وہی لفظ لئے جائیں گے جو اردو بن گئے ہیں۔ اور دوسری زبانوں کے بھی وہی لفظ لئے جائیں گے جو صورت یا معنی میں اپنی اصل سے ہٹ گئے ہوں یا اردو محاورے میں آ گئے ہوں"

"ہندستانی" زبان میں آرزو صاحب کی "خالص اردو" کی سی شرط نہیں ہے۔ اس میں سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے ہزاروں لفظ ہیں، بس اتنی شرط ہے کہ یہ لفظ ملک میں لوگ روزانہ کی بات چیت میں بولتے ہوں۔ "خالص اردو" کا گھیرا اس سے کم ہے۔ اس لئے ہم آرزو صاحب کی ان غزلوں کو "ہندستانی" کا پخوڑیا رس کہہ سکتے ہیں۔"

خود جناب آرزو بھی اس کے مقر ہیں کہ آپ نے "سریلی بانسری" میں جو زبان لکھی ہے "ہندستانی" زبان اس سے زیادہ وسیع ہے۔ آپ نے تو "لزوم مالایلزم" اپنے اوپر عائد کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ اتنی مقید؟ محدود زبان میں دل کی باتیں اور اچھے سے اچھے خیالات بیان کئے جا سکتے ہیں تو پھر "ہندستانی" جو اس سے کہیں وسیع ہے اس میں تمام باتیں کیوں نہیں کہی جا سکتیں۔ اور "ہندستانی" ملک میں کیوں نہیں رائج ہو سکتی۔

اس مضمون میں "سریلی بانسری" پر مفصل تبصرہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہاں ناظرین کو صرف یہ دکھانے کے لئے کہ جناب آرزو کو "ہندستانی" زبان پر کتنی زیادہ قدرت ہے، اور ایسی مشترکہ زبان کے ہوتے ہوئے ملک میں ہندی و اردو کے مسئلے پر اختلاف کتنا فضول ہے ہم نیچے "سریلی بانسری" سے چند شعر نقل کرتے ہیں جن سے ناظرین خود اپنی جگہ پر "ہندستانی" زبان کی وسعت کے متعلق رائے قائم کر سکیں گے:۔

"سریلی بانسری" کا پہلا شعر ہے:۔

"جس نے بنا دی بانسری گیت اُسی کے گائے جا سانس جہاں تک آئے جائے ایک ہی دُھن بجائے جا"

اس شعر سے جہاں ایک طرف خدا پرست مسلمان اور اہل دل صوفیائے کرام کی روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے وہاں دوسری طرف مہاراج کرشن کے ماننے والے بھی تڑپ اُٹھتے ہیں۔ ابھی سال گزشتہ کا واقعہ ہے کہ کلکتہ کے کچھ ہندوؤں نے جنم اشٹمی کے موقع پر جو شاندار جشن مسرت منایا اور اُس کے جو متعدد گیت بنائے اُن گیتوں پر یہی شعر موٹے حرفوں میں لکھا گیا اور اُن کے گانوں میں بھی یہی گیت بار بار

زبانوں پہ آتا رہا۔

چونکہ ان شعروں میں ایسی زبان نظم کی گئی ہے جو عام فہم ہے، اس لئے ان کا اثر بھی عام طور پر ہوتا ہے۔ چند متفرق شعر اور ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسن و عشق کے سوز و گداز بھی ہیں اور حکمت و فلسفہ کے حقائق و معارف بھی، تغزل کی لطافتیں آٹھویں، نویں، دسویں شعر میں دیکھئے، اور حکیمانہ باریک بینیاں دوسرے تیسرے، پندرھویں شعر میں ملاحظہ فرمائیے۔ پھر تشبیہوں اور استعاروں کی تازگی اور اُن کے اس "بھاشا پن" پر نظر کیجئے جس نے شعروں میں حقیقت کی جان ڈال دی ہے۔

- یہ آنکھ اپنی ساون ہے وہ آنکھ بھادوں ٹپاٹپ ہے آنسو کی، پانی کا جھالا
اِس اندھیر نگری میں بتی نہ ڈھونڈھو جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اُجالا
اُلہنے جو دیتے ہیں پہلے کہاں تھے کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا

- کہاں نبھ سکا بن کے انجان جانا جھجکنا مرا اُن کا پہچان جانا

منھ بنا رہتا ہے گونگا چاہ میں بول اُٹھتا ہے گلا کاٹا ہوا

سب کی متیں پلٹ گئیں، سنکی بندھی ہوئی تو ائیں جی ہی نہیں اداس اُداس، کرتا ہے من بھی بھائیں بھائیں

- ہوگئیں کیاریاں ہری، جیسے کہ رُت پلٹ چلی کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

چاہت کا پھل ایسا ہے جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی

پوچھی تھی چھیڑ کر جو آپ نے کہنے نہ دی وہ بات بھی تم نے کھٹکتی پھانس کو چھوڑ دیا اُبھار کے

کالی گھٹا میں کوندا لپکا رو کے جو کوئل کوک گئی جتنی گہری سانس کھچی تھی اُتنی لمبی ہوک گئی

رات ستانے سے مٹ جاتی ہے کچھ دل کی تھکن | اُجالا کرنے والے کچھ اندھیرا چھوڑ دے

تیرے تو ڈھنگ ہیں یہی اپنا بنا کے چھوڑ دے | وہ بھی بڑا ہے باؤلا تجھ کو جو پا کے چھوڑ دے
اُس نے لُبھا کے آرزو بدلی ہے مجھ سے آنکھ یوں | جیسے کوئی چھڑک کے تیل آگ لگا کے چھوڑ دے

پتّا کیسا بُوٹا کیسا جڑ تو ایک ہے دونوں کی | کہنے کو ہم بھی کہہ دیتے ہیں یہ پتّا ہے وہ بُوٹا ہے
تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی | کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹا ہے

آپ ہیں ایک نام دو کا ہے | یہ تو گنتی نہیں ہے دھوکا ہے
آرزو ہاتھ وہ نہ چھٹنے پائے | جس نے گرتے میں تجھ کو روکا ہے

جناب آرزو کو زبان کی نباضی میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ کے دل میں "ہندستانی" زبان کو ترقی دینے کا سچا جذبہ کارفرما ہے۔ اِن دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ذمہ دار حلقے آپ کی شخصیت کی طرف اپنی پُوری توجہ فوراً مبذول کریں اور "ہندستانی" زبان کے مسئلے میں آپ کی زرّیں خدمات حاصل کریں۔ اگر آپ کو اور کاموں سے فرصت ہو اور آپ اپنا پُورا وقت "ہندستانی" کو رواج اور ترقی دینے کی تدبیروں میں صرف کریں تو مجھے یقین ہے کہ مُلک میں زبان کا مسئلہ اتنا دشوار نہ رہ جائے، اور "ہندستانی" زبان دیکھتے دیکھتے ہندو و مسلم میں پھیلنے لگے۔ جناب آرزو کی خدمات سے حکومت کو فائدہ اُٹھانا چاہیئے، آپ سے ہندستانی زبان کا لغت تیار کرالینا چاہیئے۔ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم ریڈیو کی زبان کو زیادہ سے زیادہ عام فہم اور صحیح معنوں میں "ہندستانی" بنانے کے لئے اس محکمہ کو آپ سے مستقل مشورے حاصل کرنے کی صورت نکالنا چاہیئے۔

اِس زمانے میں ایسے دم بہت غنیمت ہیں، جو تمام ناموافق حالات کے باوجود اتحاد و اتفاق کی عملی تدبیریں نکالتے رہتے ہیں۔ جناب آرزو لکھنوی بھی انھیں گنتی کے چند مخلص بہی خواہانِ وطن میں ہیں ہم ہندوستانیوں کو آپ کی قدر و قیمت سمجھنا چاہیئے اور آپ کے وجود پر فخر کرنا چاہیئے۔

خلوت

(پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

شورشِ دہر سے مَیں دُور رہونگا جاکر　　اپنا دکھ درد اکیلا ہی سہونگا جاکر
دِل کو بہلاؤں گا قدرت کے میں نظاروں سے　　حال پوچھوں گا زمانے کا مَیں کہساروں سے

اپنی قسمت کا پتہ لوں گا مَیں ستاروں سے
دِل کا جو راز ہے خلوت میں کہونگا جاکر

دل کو کلیوں کی حیا سے کبھی بہلاؤنگا　　وجد میں ساغرِ شبنم سے کبھی آؤنگا
مست ہوجاؤں گا پھولوں کے تبسم سے میں　　کبھی بہتے ہوئے چشموں کے ترنم سے مَیں

کبھی خاموش ہواؤں کے تکلم سے میں
کبھی پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں سوجاؤنگا

روشنی دیں گی ضیا بار فضائیں مجھکو　　اور سکوں دینگی ہماچل کی گپھائیں مجھکو
میں چمکتے ہوئے تاروں سے ضیا مانگوں گا　　اور میں چشمِ غزالاں سے حیا مانگوں گا

میں ہراِک ذرّے سے صحرا کے دعا مانگوں گا
راگ قدرت کا سنائیں گی ہوائیں مجھکو

بزمِ دنیا کا مجھے پھر نہ خیال آئے گا　　نہ کبھی لب پہ مرے حرفِ سوال آئے گا
چاہ دنیا کی جو ہے دل میں وہ گھٹ جائیگی　　صبح کٹ جائے گی اور شام بھی کٹ جائیگی

باقی جو تھوڑی سی ہے وہ بھی نبٹ جائیگی
نہ خوشی آئے گی دل میں نہ ملال آئے گا

دہر میں کوئی کہاں میرا نشاں ڈھونڈیگا　　نہ ملوں گا میں اگر سارا جہاں ڈھونڈے گا
میں کسی وادیِ خاموش میں چھپ جاؤنگا　　کسی کہسار کی آغوش میں چھپ جاؤنگا

پردۂ ابرِ سیہ پوش میں چھپ جاؤنگا
مجھکو دنیا میں بھلا کوئی کہاں ڈھونڈے گا

ڈوب جاؤں گا کسی بحر کی گہرائی میں — یا نہاں ہوں گا کسی دشت کی پہنائی میں
پھر مجھے محفلِ ہستی نہ نظر آئے گی — رات دن دہر کی بستی نہ نظر آئیگی
اور یہ رنج کی بستی نہ نظر آئے گی
چھپ کے بیٹھوں گا کسی گوشۂ تنہائی میں

کلامِ اسد

(حضرت اسد ملتانی)

غمِ تلاش سے بچنے کا کیا بہانہ ملا — پڑے ہیں نقشِ قدم پر کہ آستانہ ملا
ستم کو بھی کرم دوست جان کر خوش ہوں — زہے نصیب کہ دل مجھکو عاشقانہ ملا
خدا نے دی مجھے دولت غمِ محبت کی — نہ ہو سکے جو کبھی ختم وہ خزانہ ملا
کچھ اس طرح سے مرے دل میں انکی یاد آئی — کہ جیسے پھر مجھے گذرا ہوا زمانہ ملا
نبردِ عشق میں فرہاد کی تو جان گئی — زبانِ خلق کو اچھا سا اک فسانہ ملا
ہے ذرہ ذرہ یہاں کا کسی قفس میں اسیر — خوشی ہو کیا جو گلستاں میں آشیانہ ملا
شکم پری ہی نہیں ہے عیارِ آزادی — کہ طائروں کو قفس میں بھی آب و دانہ ملا
میں اہلِ دیر کو مسجد میں لاکے پچھتایا — خدا کے گھر میں کوئی بندۂ خدا نہ ملا
اسد ہے ناز ہمیں اپنی خوش نصیبی پر
کہ ہم کو حضرتِ اقبال کا زمانہ ملا

ہمت والا پھنسے مصیبت میں اگر — مٹتا نہیں پھر بھی اس کا اعلیٰ جوہر
جلتی ہوئی آگ کو الٹ دو سو بار — رہتا ہے بلند پھر بھی شعلہ کا سر

(رہبر ترکی) — جذب عالمپوری

پریم چند

ایک اصلاحی افسانہ نگار کی حیثیت سے

(از ملک حامد حسن صاحب ایم۔ اے۔ (علیگ)

پریم چند ملک کے ایک خاص دور کی پیداوار ہیں، زمانہ حال کے اُردو ادب میں اُن کی افسانہ نگاری ایک زندہ قوت ہے جو آئندہ زمانہ میں ماضی کی تاریخ کا کام دیگی۔ اس لئے پریم چند کی ذات اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی زندہ جاوید رہیگی۔ ہمارا وطن مستقبل قریب میں کیا کروٹیں لے، اِس کی بابت کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی، ممکن ہے کہ گردشِ ایام ہم کو پیچھے کی طرف ڈھکیل دے اور پھر وہی نظام کہن عروج پکڑ جائے جس سے ہندوستان کی سرزمین کئی ہزار سال قبل دوچار ہو چکی ہے۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اشتراکیت اور اشتمالیت اپنے کھڑے پر ہندوستانی غازہ مل کر ہندوستان میں نازل ہو جائے۔ غرض اس وقت ہندوستان ایک انقلابی دور سے گزر رہا ہے اور مختلف عناصر علیحدہ علیحدہ ذہنیتوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے بازی لیجانا چاہتے ہیں۔ پریم چند کے ہر صفحہ میں ہندی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کے پہلے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے، لیکن یہ قدم قدیم تاریخی تمدن کی طرف جا رہے ہیں۔ خود ان کا قول ہے کہ "میری زندگی ہموار میدان ہے جس میں کہیں کہیں گڑھے تو ہیں لیکن ٹیلوں پہاڑیوں، گہری کھائیوں اور غاروں کا پتہ نہیں جن حضرات کو پہاڑ کا شوق ہو اُنھیں یہاں مایوسی ہوگی" موصوف نے اپنے وسعتِ دامن کی حد خود ہی مقرر کر دی ہے۔ اس لئے ان سے تنگیِ داماں کی شکایت کرنا فضول ہے۔ اس پہلو کو ملحوظ رکھکر ان پر تبصرہ کیا جائے تو ان کے حُسن و قبح کا ایک صحیح جائزہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس ذہنیت کی فتح ہوئی جس کے پریم چند خود علمبردار ہیں تو یقیناً جس طرح آج وہ شہنشاہِ ادب ہے اُسی طرح مستقبل میں بھی ان کا یہ شرف ان سے کوئی نہ چھین سکے گا۔ لیکن اگر ہندوستان نے پلٹا بھی کھایا اور اُن کی ذہنیت ہندوستان سے محو بھی ہو جائے تب بھی اُن کی تصانیف شاندار آثار قدیمہ میں شمار کی جائیں گی۔

پریم چند ہندوستان میں قدیم آرین تہذیب و تمدن کے از سر نو نشو و نما پانے کا خواب دیکھ رہے تھے مگر میرا یقین کامل ہے کہ زمانۂ موجودہ تہذیب و تمدن کے تار و پود کو یکسر بکھیر کر پرانی طرز زندگی کو دوبارہ اختیار کر نیگا

پریم چند کے نظریہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ لوگوں میں موجودہ سماجی غلطیوں کا احساس پیدا کرتے اور اپنے انقلابی نظریہ کے قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ اسی لئے اُن کی تصانیف میں تہذیب ہند کی امرت میں بسی ہوئی روح ہے۔ چونکہ ان کے ذہن پر قدیم تہذیب غالب ہے اس لئے وہ بار بار موجودہ پلاٹ اور کیرکٹر سے نکل کر پرانے تہذیب و تمدن میں پہونچ جاتے ہیں جہاں اُن کی ساری خفیہ طاقتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

پریم چند کا ذہنی ارتقا زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اُن کے شروع کے افسانے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا ذہن ابھی دُور تک نہیں جاتا ہے۔ اُس وقت نہ اُن میں وسیع النظری پیدا ہوئی تھی اور نہ اُن کے کرداروں پر اس طرح مذہبیت چھائی ہوئی تھی کہ اپنے مذہبی روایات کا زیادہ خیال ہے، لیکن بُرے رسم و رواج کے وہ شروع ہی سے مخالف تھے۔ جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے وہ ابتدا ہی سے سامراجی حکومت کے دشمن ہیں۔ "سوز وطن" اُسی ہنگامی دور کی تصنیف ہے، جس میں وہ بلا کے وطن پرست بن گئے۔ اس زمانہ کے سیاسی افسانوں میں صرف تنفر اور عمّال حکومت سے نفرت اور حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ سیاسی پروگرام کا سراسر فقدان ہے۔ لیکن "میدانِ عمل" اور "گئو دان" میں اُنھوں نے اچھا خاصہ سیاسی پروگرام پیش کیا ہے جس میں معاشرت کی اصلاح بھی شامل ہے۔ زمانہ جس طرح بدلتا گیا اُن کے ذہن پر اقتصادیات اور سیاسیات کا اثر زور پکڑتا گیا، اسی لئے اُن کے آخری ناولوں میں معاشرتی رنگ کم اور سیاسی و اقتصادی رنگ غالب ہو گیا ہے۔

پریم چند کا اسلوب بیان سادگی کے ساتھ کچھ اس قدر دلچسپ ہے کہ ہر عام و خاص اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اُردو افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ حقیقی زندگی کو اس کی مادی شکل میں پیش نہ کر سکتے تھے۔ یا یوں کہئے کہ مافوقیت اور فطرتیت میں تناسب قائم نہ کر سکتے تھے۔ مگر پریم چند نے اس خامی کو پورا کیا۔ ان کے افسانوں اور روزمرہ کی زندگی میں بہت زیادہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان میں مافوق الانسان ہستیاں کام نہیں کرتیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے ماحول میں کوئی چیز کھوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان میں بھی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کے افراد گناہ و عصیان میں اپنی زندگی کی ابتدا کرتے ہیں، لیکن اخیر تک پہونچکر وہ یکبارگی عجب پلٹا کھاتے ہیں جس کا کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا، اور پلٹا کھاتے ہی وہ نیک خوئی اور انسانیت کے پتلے بن جاتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس سارے تغیر کی وجہ ایک روحانی (باطنی) نور تھا جس نے اُس کے قلب عصیاں پر زندگی کے سارے راز منکشف کر دیئے۔

پریم چند کے چھوٹے چھوٹے جملے بہت فصیح ہوتے ہیں اور اُن میں بلا کا اثر پایا جاتا ہے۔ پڑھتے ہی

انسان یا تو باغ باغ ہو جاتا ہے یا ایسا کبیدہ خاطر ہوتا ہے کہ سر پھوڑ لینے کو طبیعت چاہتی ہے۔ ایک غریب کسان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ جملے کتنے پُر درد مگر اثر انداز ہیں:۔

"بیمار پڑتے ہیں وہ جنھیں بیمار پڑنے کی فرصت ہوتی ہے" اس جگ میں موٹا ہونا بے حیائی ہے، سو کو دُبلا کر کے تب ایک موٹا ہوتا ہے، ایسے موٹاپے میں کیا سُکھ، سُکھ تو تب ہے جب سبھی موٹے ہوتے"

ان درد بھرے الفاظ میں سکون اور اطمینان اور تسکین کی شراب بھری ہوئی ہے۔

"جسے پیٹ کی روٹی میسر نہیں اُس کے لئے آبرو اور مرجاد سب ڈھونگ ہے۔ جب آدمی کا بس نہیں چلتا تو وہ اپنی بھاگ پر چھوڑ دیتا ہے"

اس جملہ میں کتنا یاس اور کتنا عظیم جذبۂ عمل پایا جاتا ہے۔ پریم چند نے اُردو ادب کی سونی محفل کی کایا پلٹ دی وہ مصلح معاشرت ہیں مگر اس سے بھی بڑھکر وہ مصلح ادب ہیں۔ ان کی افسانہ نویسی اور ناول نگاری نے اُردو ادب میں ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ ہمیں سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم اپنی کم نظری و کوتاہ اندیشیوں کی بدولت ایک بڑے ادیب کی خاطر خواہ قدر نہ کر سکی۔ یقیناً وہ اُردو ہندی کے مسئلہ کو حل کرنے میں بھی بہت حد تک کامیاب رہے۔ ان کی زبان ایسی ہے جس کو ہندوستان کا بچّہ بچّہ پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ اسے ہم ادبی زبان نہیں کہہ سکتے پھر بھی اُنھوں نے قوم و ملک کے سامنے ہندوستانی زبان کا ایک نمونہ پیش کر دیا ہے ان کے نقش قدم پر چلکر ہمارے افسانہ نگار منزل مقصود پر پہونچ سکتے ہیں۔

پریم چند کے پیام کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں،

(۱) مذہبی یا روحانی (۲) معاشرتی (۳) سیاسی و اقتصادی

اُن کا نکتہ رس دماغ اور فکر رسا ہر شعبۂ حیات کی خرابیوں کو واضح طور پر اس طرح پیش کرتی ہے کہ بہت سی معمولی باتیں جو نظر میں نہ آسکتی تھیں مسلمہ حقیقت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ پریم چند نے اپنی ساری زندگی ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے مطالعہ اور دیہاتی لوگوں کو سمجھنے میں گزار دی خود بنارس کے گرد و نواح میں ایک غیر معروف گاؤں کے باسی تھے۔ وہ دیہات کے رہن سہن لوگونکے جذبات و خیالات سے بخوبی مانوس تھے۔ اسی سے اہل دیہات کی زندگی کا مطالعہ اُن کے لئے آسان ہو گیا۔ اور چونکہ وہ ہر مسئلہ کی تہہ تک پہونچ چکے تھے۔ اسی لئے اُن کی تحریر کا ایک ایک لفظ دل میں گھر کر جاتا ہے۔ غریبی کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

"چاہتا تھا کہ ٹھنڈ کو بھول جائے اور سو رہے۔ مگر تار تار کمبل، پھٹی رضائی اور ٹھنڈ سے گیلا او پلا، اتنے بیریوں کے سامنے نیند میں آنے کی ہمت نہ تھی۔ آج تمبا کو بھی نہ ملا۔ او پلا سلگا لیا تھا پر وہ بھی ٹھنڈ سے ٹھنڈا ہو گیا

بوائی پھٹے پیروں کو پیٹ میں ڈال کر اور ہاتھوں کو رانوں کے بیچ میں دبا کر کمبل میں منہ چھپا کر اپنی ہی گرم سانسوں سے اپنے کو گرمی پہونچاتا رہا۔ پانچ سال ہوئے یہ رضائی بنوائی تھی، یہ کمبل تو اُس کے جسم کے پہلے کا ہے بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ اسمیں سوتا تھا۔ جوانی میں سوتا تھا، بڑھاپے میں گوبر (اس کے لڑکے کا نام ہے) کو لے کر اس کے جاڑے کٹتے تھے۔"

ایک دوسرے اقتباس کو بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

"دیہات کی زندگی میں نہ کوئی اُمنگ ہے اور نہ کوئی اُمید، گویا اُن کی زندگی کے سوتے سوکھ گئے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔ مگر ان کی ناک میں بُو ہے نہ آنکھوں میں نور، سرشام سے دروازے پر گیدڑ رونے لگتے ہیں مگر کسی کو غم نہیں اُن کے بیل چوتی چوکر بغیر ناند میں منہ نہیں ڈالتے، مگر انھیں صرف پیٹ بھرنے کو چاہیئے، ذائقے سے کچھ مطلب نہیں، اُن کی قوت ذائقہ مرچکی ہے، ان سے دھیلے دھیلے کے لئے بے ایمانی کرالو، مٹھی بھر اناج پر لاٹھیاں چلوالو، پستی کی وہ انتہا ہے کہ جب آدمی عزت و حرمت کو بھی بھول جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

آج تیس سال تک زندگی سے لڑتے رہنے کے بعد وہ ہار گیا، اور اب ایسا ہارا گویا شہر کے پھاٹک پر کھڑا کر دیا گیا ہے، اور جو آتا ہے اُس کے منہ پر تھوکتا ہے۔"

یہ اقتباسات خود اپنی اثر اندازی اور صحیح مرقع ہونے کی دلیل ہیں، اور ہوں بھی کیوں نہ، یہ ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جو اپنے اوائل عمر میں ان منازل سے گزر چکا ہے۔ جسے اس کی صغر سنی میں ایک مہینہ کی محنت و مشقت کا صلہ صرف دو چار روپیہ ملا کرتا تھا جو خود احتیاج و افلاس کے تلخ گھونٹ پی لیتا ہے وہ دوسروں کی تکلیف کا احساس بھی جلد کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند کو حسن بیان، منظر نگاری اور فطرت کی تصویر کھینچنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

پریم چند کے دل میں وطن کی محبت، مذہب کی عقیدت مندی اور سماج کی فلاح و بہبود کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ پیدا بھی اُس وقت ہوئے تھے جب ملک میں بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی۔ انھوں نے "سوز وطن" لکھکر اپنے حب وطن کی سوز کا ثبوت دیا، مصنف قوم حالات کا گہرا مطالعہ کرکے اپنے لئے ایک لائحہ عمل تلاش کرتا ہے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ معاشرت کی خرابی ہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس لئے سماج کی اصلاح پر وہ کمر باندھکر ڈٹ گئے۔ حقیقتاً معاشرتی اصلاح کے بغیر آزادیِ وطن کا تخیل ایک ڈھونگ ہے۔ ہماری قوم اُن کی اس توجہ فرمائی کی مدتوں احسانمند رہیگی۔

آج کل ہندوستان کے مطلع پر پانچ چیزیں خاص طور پر نمایاں ہیں

(۱) افلاس۔ (۲) فرقہ وارانہ کشمکش۔ (۳) جہالت (۴) مذہبی تعصب یا مذہبی اصولوں سے بےخبری (۵) چھوت چھات۔

قسمت کا ایسا غلط تخیل عوام کے ذہن پر چھا گیا ہے کہ اُس کو نکالے بغیر دنیا کی کوئی اصلاح عمل میں نہیں لائی جاسکتی۔ پریم چند نے بھی لوگوں کو توہم پرستی اور تقدیر کے غلط تصور کی لعنت سے آزاد کرانا چاہا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"تلقین وعمل، سورگ و نرک کا جو خیال رکھتے ہیں وہ مردہ ہیں، ہماری سب کچھ یہی زمین ہے، اور اسی دارالعمل میں کچھ کرنا چاہیئے۔

یہ مسلمانوں کے نظریۂ آخرت اور عقیدہ یوم الحساب سے جداگانہ ہے۔ مسلمان کا ہر عمل دنیاوی زندگی کی بہبودی اور آخرت کی زندگی کے فلاح کے ماتحت ہوتا ہے۔ پریم چند ہی پر کیا منحصر کوئی بھی موجودہ سماج پر نظر ڈالے گا تو اُسے محسوس ہوگا کہ آج ہندوستان غربت و افلاس کی اس حد کو پہونچ چکا ہے جس کی مثال دنیا کے پردہ پر کہیں نہ ملے گی۔

پریم چند مغرب کے ہجو نگار مصنفین (Satirist) سے بہت بلند ہیں، وہ عوام کی پستی اور دکھ کو دیکھکر اُن سے نفرت نہیں کرتے اور نہ انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں (جیسا کہ مغربی مصنفین کا شیوہ ہے) وہ اُن سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس طرح کہ وہ انھیں کے ایک آدمی معلوم ہونے لگتے ہیں) وہ انھیں سمجھاتے ہیں گالیاں نہیں دیتے۔ دیہاتیوں کے دھن دولت حتیٰ کہ ان کے زور بازو میں گھن لگانے والے عناصر کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں، زمیندار اور مہاجن خون چوسنے والی جونکوں کی طرح ہر جگہ سماج میں اپنا کام کر رہے ہیں۔ افلاس کی انتہا یہ ہے کہ دولت کے متعلق عوام کی ذہنیت ہی بدل گئی ہے۔ "گئو دان" میں مفلس ہوری کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں "پہلے ہم نے جیسا کیا تھا اُسی کا سکھ (دکھ) اُٹھا رہے ہیں"۔ لیکن اسی کے ساتھ نئی نسل میں جس کا نمایندہ گوبر ہے انقلابی خیالات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ طبقاتی امتیازات کے ڈھونگ پر یقین نہیں کرتا، اس کے نزدیک سب برابر ہیں چاہے کسان ہو یا زمیندار جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے وہ دوسروں کو کچل کر بڑا بن جاتا ہے"۔ گوبر اور ہوری میں رائے صاحب کے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے۔ ہوری کہتا ہے کہ وہ چار چار گھنٹے بھجن کرتے ہیں ظالم نہیں ہو سکتے۔ ہوری کو مذہبی ظاہر داری پسند ہے، اسی لئے رائے صاحب کی مذہبی ریاکاری کا اُس پہ خاص اثر پڑتا ہے۔ لیکن گوبر کا جواب بہت ہی دندان شکن ہے جس کو سُنکر نام نہاد پنڈتوں اور ظالم زمینداروں کے ہوش اُڑ جاتے ہیں" وہ چار گھنٹے بھجن محض مزدوروں کے بل پر کرتے ہیں۔ اپنے دھن کو بچانے کے لئے، ہمیں کوئی دو جون کھانے کو دے تو ہم آٹھوں پہر بھگوان کا بھجن ہی کرتے رہیں۔ اگر اُدکھ گوڑنا پڑے تو ساری بھگتی بھول جائیں"۔ ہوری اس ذہنیت کا مرقع ہے جو آجکل کسانوں اور مزدوروں کی اکثریت

---

۱ وقت

پر غالب ہے" یعنی آدمی وہ ہیں جن کے پاس بل ہے، دھن ہے اور بدیا ہے۔ ہم لوگ بیل ہیں جوتنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں" ہندوستانی کسان پر حکومت کا تازیانہ، اقتصادیات کی ضرب، زمیندار اور مہاجن کا ڈنڈا، داروغہ اور پولیس کی گالیاں، غرض اسے منزلِ حیات میں جو کوئی بھی ملتا ہے اپنی اپنی باری دو ایک جوتے لگا ہی جاتا ہے۔ مگر اس کی زبان سے اُف تک نہیں نکلتا۔ تقدیر نے اس کے باغیانہ جذبات اور غیرت وحرمت کے خیالات پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ افسوس کاروانِ ہند کی زبوں حالی پر نہیں بلکہ ہم لوگوں کے دلوں سے احساسِ زیاں کے مٹ جانے پر ہے۔ کسان کی زندگی قرض کے بار سے لدی ہوئی ہے۔ ہوری کی زندگی آجکل کے کسانوں کا ایک حقیقی مرقع ہے۔ گویا وہ اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ ساری عمر کولھو کے بیل کی طرح چکر کاٹتا رہے اور اس کی گاڑھی کمائی چوکیدار، مکھیا، نمبردار اور پٹواری سے لیکر مہاجن، زمیندار، سپاہی اور تھانیدار ہڑپ کر جائیں۔ موجودہ حکومت نے گویا اُن کے بدن میں اتنی مہلک جونکیں چمٹا دی ہیں جو اس کی زندگی کے رس کو ہر وقت تھوڑا تھوڑا چوستی رہتی ہیں۔ اور آخرکار ایک دن بے گور و کفن کسی مرگھٹ پر جلا دیا جاتا ہے۔ یا کسی زمیندار سے دو گز زمین مانگ کر اسے دفن کر دیا جاتا ہے زندگی میں بیچارے کو کسی طرح چین نصیب نہیں، اس سے اُٹھتے بیٹھتے، چلتے سوتے، کھاتے پیتے ہر وقت اس دنیا میں زندہ رہنے کا جرمانہ وصول کیا جاتا ہے (حالانکہ حکومت اور مذہب کی طرف سے خودکشی بھی حرام اور جرم قرار دے دیگئی ہے) اس کے کمزور وجود پر ہزاروں آفتیں، اُس سے رشوت اور نذر لی جاتی ہے۔ مہاجن کو سُود اور زمیندار کو بھینٹ نذر کرنی پڑتی ہے۔ مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ لگان کے لئے قرض۔ شادی کیلئے قرض۔ تھانیدار کو جبری رشوت دینے کے لئے قرض، پھر سماج کا پیٹ بھرنے کیلئے قرض۔ اس پر لطف یہ کہ سماج اُسے کبھی کبھی ایک لقمہ بھی دیدیتی ہے تاکہ وہ زندہ رہے۔ کیونکہ کسان ہی کے زندہ رہنے پر ہمارے اعلیٰ طبقہ کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اسی لئے ہوری کا سارا اثاثہ قرق کر لیا جاتا ہے مگر اس کے بیل اور چند کھیتی کے سامان واپس کر دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ کھیتی کر کے لوگوں کے لئے سستے داموں پر غلہ مہیا کر سکے۔

پریم چند اس اہم نکتہ کو سمجھتے ہیں، لیکن ان نقائص کو مٹانے کے لئے اُن کے پاس صرف روحانی حربہ ہے جس کی بروح عدم تشدد ہے۔ ان کی اصلاح کے دو میدانِ عمل ہیں۔ اُن کے پاس موجودہ انقلاب پسند جماعتوں سے الگ ایک دوسرا تعمیری پروگرام ہے جس کو روحانی پروگرام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی رفتار موجودہ ہندوستان کی رفتار سیاست کے برابر ہے" گئودان" اور "میدانِ عمل" انکی ناولوں میں سب سے زیادہ انقلابی شمار کئے جاتے ہیں، مگر ان میں بھی وہی ذہنیت کارفرما ہے۔ وہ کسانوں میں

جاگیرتی اور بیداری کی اشاعت کرتے ہیں۔ وہ ان میں مقاومت کی قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کسانوں کے حقوق، ان کی ذمہ داریاں اور اُن کی منشا رِ زندگی سے بحث کرتے ہیں" کاش یہ لوگ زیادہ تر انسان اور کم تر فرشتہ خصلت ہوتے تو اس طرح نہ ٹھکرائے جاتے" "آہِ بیکس" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ" اگر دنیاوی عدل و انصاف جرم کو نہ معلوم کر سکے تو مظلوم کی آہ سب سیہ کاریوں کو مٹانے کے لئے کافی ہے"۔ لیکن وہ انقلاب اور ہنگامہ کو بُرا خیال کرتے ہیں، وہ ظالم طبقہ میں بھی روحانیت کو بیدار کرنا چاہتے ہیں، اور اُن کا خیال ہے کہ جب ان پر روحانیت فرماں روا ہو جائیگی تو وہ خود بخود کسانوں کے سارے حقوق تسلیم کرلیں گے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ رحم و کرم اور ہمدردی کا جذبہ خود بخود ظالم طبقہ میں پیدا ہوگا اور وہ خود غریبوں کی سدھار میں کوشاں ہونگے لیکن شرط یہ ہے کہ کسان پہلے سے اپنے حقوق کو پہچان لے۔

"گوشۂ عافیت" کے مایا شنکر اور "گئو دان" کے رائے صاحب اور "میدانِ عمل" کا امر کانت اس امر کی شہادتیں ہیں کہ جہالت ہی سارے گناہوں کی جڑ ہے، وہ گناہ کرتے ہیں لیکن ان کا گناہ مجبوری کا ہے "میدانِ عمل" میں اُنھوں نے جہالت دُور کرنے کا ایک مکمل پروگرام پیش کیا ہے۔ حکومت کی طرف سے بھی سیکڑوں شبینہ مدرسے کھولے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ اسکیم اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ان مدارس میں انگریزی پڑھے لکھے مدرسین نہ مقرر کئے جائیں جو عوام میں کتابی تعلیم دینے کے علاوہ سیاسی۔ معاشی۔ اقتصادی اور مذہبی معلومات کی اشاعت کر سکیں۔ پریم چند کا امر کانت اِن تمام صفتوں سے متصف ہے۔ وہ چماروں کے لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے اور عوام میں سیاسی بیداری بھی پھیلاتا ہے۔

مذہبی تعصب کا یہ عالم ہے کہ ہر چہار طرف فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو رہے ہیں، اس کی ساری ذمہ داری علمائے بے عمل اور غلط ذہنیت رکھنے والے پنڈتوں پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لئے پریم چند نام نہاد رہنمایانِ مذہب و علمارِ دین کا اکثر مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُنھوں نے مذہب کا بلّا لگانے والے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور افسانہ "دیر و حرم" میں ان کی خوب قلعی کھولی ہے۔ "میدانِ عمل" کے امر کانت کے پاس ایک ضرورتمند غریب کسان چاندی کے کڑے گرو رکھنے کے لئے لاتا ہے۔ وہ اس کی مفلسی پر رحم کھا کر اس کے کڑے واپس کر دیتا ہے۔ اس پر سیٹھ جی اپنے بیٹے کی یوں ملامت کرتے ہیں:۔

"جانتے ہو دولت کیا چیز ہے، سال میں ایک بار بھی گنگا اشنان کیا ہے، ایک بار بھی دیوتاؤں کو جل چڑھایا ہے، کبھی رام کا نام لیا ہے، کبھی ایکادشی یا دوسرا برت رکھا ہے، کبھی کتھا پُران پڑھتے ہو یا سنتے ہو، تم کیا جانو دھرم کیا چیز ہے، دھرم دوسری شے ہے اور روزگار دوسری شے، چھی چھی ٹکے سود پر روپیہ

پانی پھیر دیا"

پریم چند ایسے لوگوں سے ہمدردی ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ اصلی مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ مذہب کے ظاہری رسومات کے سخت پابند ہیں مگر مذہب کے اصلی جوہر سے قطعاً نابلد ہیں۔ وہی سیٹھ جی ایک مرتبہ رامائن کی کتھا سننے کے لئے نوسو روپیہ دیدیتے ہیں۔ درحقیقت مذہب کی روح ان سے مفقود ہو چکی ہے اُن کا مذہب صرف نسلی اور تقلیدی ہے، وہ صبح نہائے بغیر گلے سے پانی نہیں گھونٹ سکتے، شام کو مندر میں آرتی اور تلسی چڑھانے میں ناغہ نہیں کر سکتے مگر اس کے باوجود غریبوں کا خون چوسنا گناہ نہیں سمجھتے۔

ہریجنوں کے بارے میں پریم چند بہت آزاد خیال ہیں۔"میدان عمل" میں ابتدا سے انتہا تک ہریجن سدھار کی تبلیغ کی گئی ہے۔ اونچی ذاتوں کے ہندو انھیں مندر میں داخل نہیں ہونے دیتے، اور نہ مذہبی کتابیں پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ہریجن پیدائشی ناپاک اور ذلیل سمجھا جاتا ہے، اسے کسی صورت سے بھی مساویانہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا" مذہب کا یہ ظلم کہیں بھی دنیا کے پردہ پر نہ ملے گا۔ پریم چند ہریجنوں کو بھائی بنانا چاہتے ہیں۔

ہندو مسلم تنازعات کو بھی وہ افسوس بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلم متحد ہو کر ہندوستان کی سرزمین میں زندگی بسر کریں۔ اُن کا خیال ہے کہ غلط تواریخیں آپس کی شکر رنجی کی بنیاد ہیں۔ کیونکہ حکومت برطانیہ کے زمانہ میں بہت سی کتابیں صرف نفاق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جس قوم کا تاریخی سرمایہ ہی لٹ چکا ہو اُس کے پنپنے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

ازدواج کو انسانی زندگی میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو دین میں پوجا اور عبادت کو۔ جب اسی میں گھن لگ جاتا ہے تو قوم کی قوم اور نسل کی نسل فنا کے گھاٹ اُتر جاتی ہے۔ پریم چند نے "گئو دان" میں دکھلایا ہے کہ دیہاتی اپنی جہالت کے باعث اخلاقی عیوب میں پھنس گئے ہیں۔ ناجائز جنسی تعلقات ایک وبا کی طرح پھیل گئے ہیں، چھوٹے سے لیکر بڑے تک، گوبر سے لیکر پٹیشوری تک، جوان سے لیکر بڈھے تک کیا مرد اور کیا عورت، سب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں سے نظربازی، کنواری اور غیر کنواری لڑکیوں کو بھگا لے جانا معمولی باتیں ہوگئی ہیں۔ سماج ان کا انسداد اس وقت نہیں کرتی جب گوبر ایک عورت سے ناجائز تعلقات پیدا کر کے بھگا لے جاتا ہے۔ مگر اس وقت جبکہ گاؤں کے کارکنانِ قضا و قدر اور اس کے خاندان میں اَن بَن ہو جاتی ہے۔ گویا پنچایت کا قدم اصلاحی نہیں بلکہ انتقامی ہوتا ہے۔ یہ سماج کی پستی اور خواری کی ایک دردناک داستان ہے۔ سماج کو کیا فکر کہ وہ ایک فرد واحد کے ضمیر کی اصلاح

کے درپے ہوں۔ بیواؤں کی شادی ہندوؤں میں منع ہے، مگر مسلمان بھی اپنی جہالت میں سرشار ہیں
اس بد دماغی کا کیا علاج کہ بیوہ کی شادی میں خاندان کی عزت وحرمت پر آنچ آتی ہے، اور مظلوم و بے زبان
عورتوں کے زندہ درگور ہو جانے سے اُن کا خاندانی وقار دوبالا ہو جاتا ہے۔ پریم چند کو اس تلخ حقیقت کا
اندازہ تھا۔ انھوں نے اس دردناک مسئلہ کے حل کی دو تجویزیں پیش کی ہیں۔ اولاً یہ کہ بیواؤں کی شادی
سماجی اور قانونی حیثیت سے جائز کر دی جائے۔ خاندان کا وقار اور دوسری پیچیدگیاں بیوہ کے راستہ
میں حائل نہ ہوں، دوسرے اُن لوگوں کو جن کی بیویاں داغ مفارقت دے چکی ہوں، اخلاقی۔ مذہبی۔
سماجی طور سے اجازت نہ ہو کہ وہ کنواری لڑکیوں سے اپنا اُجڑا ہوا گھر بسا سکیں۔ اس طرح اُن کی
رائے میں بیوگی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا ، مگر یہ صرف قانونی حیثیت سے نہ ہو بلکہ اخلاق۔ مذہب
ہمدردی کا ایک ایسا افسوں لوگوں میں پھونک دیا جائے کہ وہ صرف بیواؤں سے عقد ثانی کر سکیں۔ لیکن جو
لوگ اس قدر قربانی نہیں کر سکتے اُن کو بیواؤں کو مالی امداد پہونچانا اور بدھوا آشرم قائم کرنا چاہئیے۔ اور جنکو اتنی
استطاعت بھی نہ ہو وہ کم سے کم کسی نہ کسی بیوہ کے لئے وظیفہ ہی مقرر کر دیں

پریم چند ایک معاشرتی مصلح تھے۔ پس ناممکن تھا کہ وہ صدہا عورتیں جو سر بازار عصمت فروشی کرتی ہیں اُنکی
نگاہ دوررس سے بچ جاتیں۔ اس نظارہ سے ان کے درد مند دل کو سخت صدمہ پہونچا ہے۔ اور اُنھوں نے
اپنے خیالات "بازارِ حسن" میں صاف طور سے دنیا پر ظاہر کر دئیے۔ اُنھوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ عورتیں
اپنے حالات سے مجبور ہو کر بداخلاقی کی زندگی بسر کرنے لگتی ہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ فاحشہ عورتوں کی سرشت
ہی آوارگی کی طرف مائل ہوتی ہے، مگر پریم چند کو اس نظریہ سے اختلاف ہے۔ اُن کے خیال میں فطرتاً کوئی شخص
بدچلن نہیں ہوتا، معاشرتی بے اطمینانی ہی اس طرز زندگی کی ذمہ دار ہے، اور غلط راستے پر پڑ جانے پر بھی
فطری خوبیاں مفقود نہیں ہوتیں۔ اسی سبب گمراہ قیدیوں میں روحانیت اور اخلاقیات کا احیا کیا جاتا ہے تو
وہ اکثر مخلص ترین روحانی انسان بن جاتے ہیں۔

پریم چند ہندو فلسفہ سے بہت متاثر ہیں، اُن کے نزدیک عورتوں کا درجہ (اصولی اعتبار سے) بہت
بلند اور ارفع ہے۔ عورت کو اپنے ایثار اور قربانی سے وہ مرتبہ حاصل ہے جس کے حاصل کرنے میں مرد اپنی تمام عمر کی
عبادت۔ ریاضت۔ تپسیا کے باوجود بھی ناکام رہتا ہے لیکن عورتوں کی آزادی اور اُن کے حقوق کے معاملے
میں وہ بہت رجعت پسند واقع ہوئے ہیں۔ عورت کے لئے ہندو سوسائٹی میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر
سے بے وفائی کرے۔ شوہر کتنا ہی بداخلاق اور بدچلن ہو مگر عورت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کی خدمت اور اطاعت
کرتی رہے اور اس طرح اُس پر روحانی غلبہ حاصل کرلے۔ "گئو دان" میں مسٹر کھنّا کی بیوی کو محض اپنے دشمن خیال

دھرتیہ فلسفی نے بھی یہی سمجھایا تھا۔ علاوہ بریں مہتا نے صرف اس لئے شادی نہ کی کہ ان کو کوئی ایسی عورت نظر نہ آئی جو اُن کے روحانی معیار پر پوری اتر سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں پر اگر قانونی نہیں تو اخلاقی و سماجی پابندی ہی عائد کر دی جائے کہ وہ اپنے شوہر سے کسی صورت میں بھی چھٹکارا نہ پا سکیں۔ مگر یہ سراسر ظلم ہے۔ اور موجودہ تہذیب اسے کسی طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اور حقیقت کی دنیا میں اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں عورت برابر کی شریک نہ ہوگی بلکہ غلام بن جائیگی۔ پریم چند کے نزدیک عورتوں کے لئے دیا۔ تیاگ۔ اور بھگتی ہے، پس اسے انھیں چیزوں کو اپنا نصب العین بنانا چاہیئے۔ "گئودان" میں مسٹر مہتا نے عورتوں کے حقوق کو بالکل واضح کر دیا ہے:۔

"عورتوں کو مردوں کا کام کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی ہے، (عورت اتنی ہی مرد سے برتر ہے جتنا روشنی تاریکی سے) ۔۔۔۔۔۔ ووٹ نئے جگ کا جال ہے، فریب ہے، کلنک ہے، دھوکا ہے، اس جھگڑے میں پڑکر آپ (عورت سے خطاب ہے) نہ ادھر کی ہونگی اور نہ اُدھر کی۔ دنیا میں سب سے بڑے حقوق خدمت قربانی سے ملتے ہیں، وہ آپ کو ملے ہوئے ہیں، ان حقوق کے سامنے ووٹ کی کوئی حقیقت نہیں۔۔۔۔۔ جہاں عورتیں مالکہ کے درجے سے گر کر شوق و پسند کی چیزیں بن گئی ہیں۔۔۔۔ وہ گرہست عورتوں کا دھرم چھوڑ کر تتلیوں کا رنگ پکڑ رہی ہیں۔"

عورتوں کے حقوق اور اُن کی آزادی کے متعلق پریم چند کے یہ خیالات ہیں۔ ان سے آپ خود پتہ لگا سکتے ہیں کہ وہ زمانۂ حاضر کے ساتھ کہاں تک چل سکتے ہیں۔

پریم چند "اہنسا پرمو دھرما" کے قائل ہیں، وہ "ہنسا" کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن وہ زندگی کو تیاگ کر سنیاس اختیار کرنے کے بھی سخت مخالف ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"وہ خود اتنے بڑے مہاتما ہیں مگر سنیاس، تیاگ، مندر، مٹھ، پنتھ ان سب کو ڈھونگ سمجھتے ہیں، کہتے ہیں، سماجی بندشوں کو توڑ دو، اور انسان بنو، دیوتا بننے کا خیال چھوڑ دو، دیوتا بن کر تم انسان نہ رہ جاؤ گے"

غرضکہ وہ مٹھ اور مندر میں دھونی جما کر بیٹھنے والوں کو سماج کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں رہے اور سماج کی خدمت کرے۔ کسی گوشہ میں بیٹھکر تپسیا کرنا سراسر خود غرضی ہے۔ وہ مسئلۂ تناسخ میں بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان اس دنیا میں سخت سے سخت آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے شہوانی جذبات کی آزمائش سب سے عظیم ترین آزمائش ہے۔ "پردۂ مجاز" کی جلدوں میں انھوں نے اس آزمائش کا ایک واقعہ پیش کیا ہے۔ یعنی ایک شخص محض آزمائش محبت میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے دوسرا جنم لیتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے نفسانی خواہشات کو یکسر فنا کر دیتا ہے تب اُسے آواگون

سے نجات مل جاتی ہے۔ پریم چند سچے ہندو اور سناتن دھرمی تھے، مگر اُن کے مذہب کی بنیاد رحم۔ ایثار حسن خدمت۔ تہذیب نفس پر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

حضرت محمد کو خدا کا رسول مان لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں، وہ مجھے بدھ۔ کرشن۔ رام کی تعریف کرنے سے نہیں روکتا۔[۵۱]

سیاست کے میدان میں وہ انقلاب پسندوں کی صف میں نظر آتے ہیں جہاں مفاہمت اور اصلاحات کے قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اصلاحات ہندوستانیوں کو آزادی دلانے کے بجائے انھیں شہنشاہیت کی مضبوط تر زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ بقول اقبال مرحوم

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

ایک جگہ پر تو انقلابی ذہنیت کو انھوں نے یوں دکھلایا ہے:۔

اجتماعی ذہنیت ہمیشہ انتہا کی طرف مائل ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ناقابلِ خیال ہے سیلاب آبادیوں کو غرق کرتا ہے تو زمین کو زرخیز بھی کرتا ہے، خون بیداد انتقام کے لئے مشتعل ہو گیا ہے… صدہا آدمی موٹر کی طرف دوڑے۔

اس جگہ پریم چند کے برسوں کا غصہ و بال پر آ گیا ہے۔ اس جگہ وہ حقیقی انقلاب پسند نظر آتے ہیں۔ سامراجی حکومت ان کے مطمح نظر کے بالکل متضاد ہے۔ وہ اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے گئو دان کا ایک نوجوان ان جماعتوں کے پروگرام سے جو سامراجی حکومت سے کسی قسم کی مفاہمت کر سکتے ہیں، اظہار نفرت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

مجھے اُمید نہیں کہ جلسے جلوسوں سے آزادی مل سکے۔ یہ تو اپنی معذوری اور کمزوری کا صریحی اعلان ہے، جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں آزاد نہیں ہوتیں، مجھے تو یہ طرز عمل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے…… اصل چیز اس وقت ملیگی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔"

اس کی ماں جیل کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے "کیا ہم کم قربانی کر رہے ہیں"۔ اس پر نوجوان اور بپھر جاتا ہے اور کہتا ہے:۔

اس سے انگریزوں کا کیا نقصان۔ وہ ہندوستان اُسی وقت چھوڑیں گے جب انھیں یقین ہو جائے کہ ہم اب یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے……" روس اسی طرح آزاد ہوا

---

۵۱ ایک پریم چند نہیں بلکہ عام ہندوؤں کا یہی رویہ ہے۔ (ا۔و)

آئرلینڈ اسی طرح آزاد ہوا۔ ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا۔"

طبقہ وارانہ تقسیم معاشرت ان کی طبیعت پر گراں گزرتی ہے، بڑوں کا ظلم اور چھوٹوں کی تہیدستی و بے بضاعتی کا خیال اُن کے خون کو گرم کر دیتا ہے۔ مگر اس کے انسداد کے لئے اُن کے پاس صرف روحانی پروگرام ہے۔ کہیں کہیں اپنے جوش و عمل سے تقدیر کو پلٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ کوشش بھی بزدلی کے ساتھ ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلۂ تناسخ میں یقین کرنے کے بعد وہ قسمت پرست بن جانے پر مجبور تھے۔ آواگون کا مسئلہ انسانی ہمت و عمل کی چنگاری پر پانی ڈال دیتا ہے اس کے بعد انسان کی حرارت عمل سرد ہو جاتی ہے اور وہ مُردے سے بدتر[1] ہو جاتا ہے۔ مگر پریم چند ان تقدیر پرستوں میں نہیں ہیں جو مرگ چھال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ایشور ان کے منھ میں نوالہ ڈالدیگا۔ وہ ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ حقیقتاً وہ غریبوں کی غربت اور اُن کی حق تلفی سے بہت متاثر ہیں۔ لیکن اس مسئلہ کے حل کو سوچنے کے بجائے وہ ایک تمثیلی حکومت کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ "گوشۂ عافیت" کے اختتام میں انھوں نے ایک "رام راج" قائم کر دیا ہے جس میں رعایا ہر طرح سے سُکھی ہے۔ زمیندار اور رعایا، مالک اور مزدور میں کوئی امتیازی فرق باقی نہیں اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہے۔

ناگرک جیون[2] (ہندی)

اس کتاب کا مقصد اور موضوع اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ اس کے مصنف مسٹر دیبی سہائے سرپواستو ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی افسر محکمہ کوآپریشن یو۔ پی ہیں جو دیہات سدھار کے کاموں سے پندرہ سال سے عملی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کتاب میں اس مسئلہ سے بحث کیگئی ہے کہ ہم کس طرح اچھے شہری بن سکتے ہیں اور طریق معاشرت میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اپنا جیون سُدھار سکتے ہیں۔ ضمنی طور پر بہت سی باتیں بیان کر دی گئی ہیں جن کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ کتاب عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت مجلد عہ

سُکھی جیون (ہندی)

یہ بھی مسٹر دیبی سہائے کی تصنیف ہے جو خاص طور پر دیہات کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے جس سے کوآپریٹو سوسائٹیوں میں کام کرنے والے لوگ بھی پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ طرز زبان سلیس ہے قیمت مجلد عہ

سُدھار سنگیت مسٹر دیبی سہائے سرپواستو نے دیہات کے لوگوں کے دلچسپی کے گانے درج کئے ہیں جن کو بچے گائیں گے اور بوڑھے پڑھ کر لُطف اندوز ہوں گے۔ قیمت ۲ر

---

[1] یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھیں مسئلہ تناسخ کی محض سطحی معلومات ہے۔ (ا۔ز)

[2] ملنے کا پتہ:۔ مسٹر دیبی سہائے سرپواستو ایم۔ اے ڈپٹی سی۔ ڈی۔ او۔ گورکھپور

منشی پریم چند آنجہانی

(از حضرت عبد العزیز صاحب فطرت)

اے صاحبِ عزّتِ دوامی تجھ پر نازاں ہے خوش کلامی
اُردو کی ہے قسمتِ گرامی جس نے کی ہے تری غلامی
اُردو کے ادیب مایۂ ناز
اونچی ترے فکر کی ہے پرواز

الفاظ تھے صدق کی زبانیں فقرے تھے کھچی ہوئی کمانیں
افسانے حقیقی داستانیں رومان پرست گو نہ مانیں
قصّے غربا کی بیکسی کے
نقشے ہیں اصل زندگی کے

سیرت کی بلندیوں کو تو نے پستی سے کبھی دیا نہ چھونے
دل موہ لئے ہیں تیری خو نے اے عصمتِ فکر کے نمونے
مظلوموں کے غم بیاں کئے ہیں
یا داغِ جگر عیاں کئے ہیں

تیرے نزدیک سب نزاعات تھے جہل و خرابی و خرافات
احساس فروز تیری ہر بات اسرار نما ترے اشارات
تیری فطرت کی بے ریائی
اب مان رہی ہے اک خدائی

میدانِ عمل کے سارے کردار ہیں تیرے کمال فن کا اظہار
میں نے جو اسے پڑھا تو ہر بار پلکیں ہوئیں اشکوں سے گرانبار
یہ نقش ہیں صدق اور صفا کے
پیکر ہیں خلوص اور وفا کے

تقدیر کے پیچ و خم کی روداد — ظلم و جبر و ستم کی روداد
بیواؤں کی چشمِ نم کی روداد — ہر ایک کہانی غم کی روداد
مزدور کا درد تیرا غم تھا
خوں روتا ہوا ترا قلم تھا

زردار کی بے حسی پہ آنسو — لوٹی ہوئی جھونپڑی پہ آنسو
اُجڑی ہوئی زندگی پہ آنسو — افلاس کی بے کسی پہ آنسو
تو درد کا بحرِ بیکراں تھا
مظلوموں کی آہ کا دھواں تھا

ممکن نہیں بہارِ سخن ہو نہ بے خزاں

(منشی جگیشور ناتھ بیتاب بی، اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

چکبست اور سرور سدھارے سوئے جناں — اب لطفِ شعر سرخیِ خونِ جگر سے ہے
عنقا مثالِ ابر فلک سے ہوئے رواں — بامِ افق پہ نورِ چراغِ نظر سے ہے

چرخِ بریں پہ برق کا سکہ رواں ہوا — روشن زمینِ شعر منورؔ کے دم سے ہے
محرومؔ آہ یوسفِ بے کارواں ہوا — بیتاب سربکاک و وفورِ الم سے ہے

کرسی ملی ہے برقؔ کو سات آسمان کی — اہلِ نظر کی عرش پہ رہنے لگی نظر
شیداؔ فداؔ وفاؔ سے ہے رونق جہان کی — ہفت آسماں کو فخر ہے کیفیؔ کی ذات پر

دریائے حسنِ شعر کا اللہ رے خروش — پیری میں بھی جوان ہے ساحرؔ سا نکتہ داں
گلچیں ہیں شادؔ طالبؔ و ملّا فراقؔ و جوشؔ — ممکن نہیں بہارِ سخن ہو نہ بے خزاں
شاعر ہیں بے شمار مگر اس کا کیا جواب
قسمت سے اپنی اندر کو ہونا تھا لاجواب

لہ اس نظم میں صرف ان ہندو شعرا کے نام گنائے گئے ہیں جن سے مصنف کو بالواسطہ یا بلاواسطہ شرف تعارف حاصل ہے، ورنہ اِس نظم کی تصنیف سے کسی کی پائمالی یا دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ (بیتاب)

شکار

ایک قصہ

(از مسٹر روشن لال انبالوی)

جب سے کناٹ پلیس کا کافی ہاؤس کھلا ہے وہاں بہت بھیڑ بھاڑ رہنے لگی تھی۔ ہر قسم اور ہر خیال کے آدمی آتے تھے۔ شام کو شرفا کی رونق رہتی تھی، چھوٹی چھوٹی میزوں کے اردگرد چار کرسیاں رکھی رہتی تھیں جن پر خوش پوش نوجوان اور نوعمر عورتیں زرق برق لباس پہنے بھی نظر آتی تھیں۔ ہر روز رات کو نو بجے کے وقت ایک بوڑھا فوجی افسر بھی آتا تھا اور کافی کا پیالہ پی کر سگریٹ کا دم لگا کر تھوڑی دیر کے بعد دو تین لمبی لمبی سانس لیکر چلا جاتا تھا۔ اس کے جسم پر ایک فوجی وردی ہوتی تھی جو پُرانی ضرور تھی مگر ہر طرح سے صاف تھی، اس کے بٹن شیشے کی طرح صاف اور چمکدار تھے، سر پر پگڑی اور کمر میں چمڑے کی پالش دار پیٹی اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ بوڑھا کسی وقت کوئی بارعب افسر رہ چکا ہے۔ اس کے سیاہ فوجی جوتے اور پاؤں کی پنڈلیوں پر چمڑے کے لمبے پاپوش بتاتے تھے کہ کسی وقت یہ بوڑھا افسر جان پر کھیل کر کام کرتا ہوگا۔ اس کا چہرہ بارعب، ماتھا چوڑا، سینہ کشادہ اور اُبھرا ہوا اور ہاتھ لمبے تھے۔ اس کے تمام اعضا یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ مضبوط جسم کا انسان ہوگا اور جوانی میں اس کا بدن خوبصورت ہوگا۔ ایک روز جب وہ چلنے لگا تو میں نے اُسے فوجی سلام کیا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک میری طرف غور سے دیکھا میری فوجی وردی بھی خوب غور سے دیکھی اور اس کے بعد اُس نے اپنی وردی کی طرف نگاہ ڈال کر بولا۔

"تم کون ہو؟"

میں نے سلام کرکے کہا کہ "ابھی بھرتی ہوا ہوں"۔

"کہاں کے لئے؟"

"صحیح تو معلوم نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ سرحدی صوبہ کی طرف جانا ہوگا" میں نے جواب دیا۔

میرے جواب کو سُنکر اُس کے چہرے پر سُرخی سی دوڑ گئی، اور آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی، اُس نے ذرا بلند آواز میں مجھ سے پوچھا "کیا کہا سرحدی صوبہ کی طرف؟"

"جی ہاں خیال تو یہی ہے"

"نوجوان! تم جا تو رہے ہو لیکن ذرا ہوشیاری سے جانا، بہادری کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔"

"بہت خوب" میں نے سلام کر کے جواب دیا۔

"اور سنو، وہ بھی بہادروں کا ملک ہے، وہاں کے جانبازوں سے بازی لے جانا کوئی مذاق نہیں وہ لوگ جان کو کچھ نہیں سمجھتے۔"

"تو کیا جناب وہاں رہ چکے ہیں؟"

اس فوجی افسر نے ایک کرسی سرکا کر آگے کی میز پر بیٹھ کر میری طرف دیکھا، اور اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا: "میں اس علاقے میں نمبر گیارہ راجپوت کمپنی کے ہمراہ پچیس سال رہا ہوں اور صوبیدار بن کر ریٹائر ہوا تھا۔"

"مجھے اُمید ہے کہ آپ کی بدولت مجھے بھی وہاں کی کچھ واقفیت حاصل ہو جائیگی۔"

اُس نے اشارہ کیا اور میں ایک کرسی اُس کے سامنے رکھکر بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالکر سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ منہ سے لگا کر بولا "عجیب و غریب ملک ہے۔"

"ضرور ہوگا۔"

"کبھی تم نے صوبیدار میجر بلبیر سنگھ نمبر گیارہ راجپوت رجمنٹ کا نام سنا ہے؟"

"جی نہیں!"

"ٹھیک ہے، اِسی کا نام دنیا ہے، یہاں ہزاروں بہادر آئے، ہزاروں نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور قوم و ملک کے نام پر قربان ہو گئے، لیکن آج اُن کے نام و نشان سے بھی کوئی شخص واقف نہیں۔ سچ ہے دنیا والے نفس پرستی اور آرام طلبی کی دھن میں جب پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں تو اپنے قومی جانبازوں کو بھول جاتے ہیں۔ میں ہر روز اس کافی ہاؤس میں آتا ہوں، لوگوں کی باتیں سنتا ہوں لیکن میں نے آج تک کسی کو شہیدانِ وطن کی یاد میں ایک کلمہ بھی کہتے نہ سُنا۔"

"آپ درست فرماتے ہیں جناب"

"میرے دوست جس طرح آج تم جوانی کے نشے میں مدہوش اور دنیا سے بے خبر ہو، جس طرح تم خوبصورت، لمبے اور تندرست ہو، جس طرح آج یہ نئی وردی تمھارے جسم پر بھلی معلوم دیتی ہے اُسی طرح ہر پچھلے جانباز کا بھی حال تھا۔ جانباز سپاہی صرف اپنے وطن کے محافظ بلکہ قوم و ملک کے محافظ ہوتے ہیں۔ یہی اس کا ایمان اور اسی میں اس کا دین ہے۔"

"جی ہاں جناب"

"تو وہ بلبیر سنگھ راجپوت صوبۂ پنجاب کا باشندہ تھا۔ بائیس برس کا عرصہ ہوا اُسے ملازمت کی ضرورت ہوئی، بابا۔ دادا کی تلوار سنبھال کر خاکی پیرہن پہن لیا اور فوج کے ہمراہ رہنے لگا۔ اس کی پلٹن کا نام تھا نمبر گیارہ راجپوت رجمنٹ۔ اس رجمنٹ کو حکم ہوا کہ پشاور سے پچاس میل کے فاصلے پر سرکاری چوکی پر حاضر ہو۔ چنانچہ رجمنٹ کی دو کمپنیاں پشاور سے روانہ ہوئیں، جن میں لگ بھگ تین سو جوان ہونگے۔ ان میں وہ بلبیر سنگھ بھی تھا۔ اس چوکی کا نام تھا "مارے خیل" اس سے آگے کوئی سرکاری چوکی نہیں تھی، اور یہاں سے آگے علاقۂ غیر شروع ہوتا تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جو کابل کی سرحد سے ملحق ہے اور اس کا کوئی بادشاہ نہیں۔ لیکن یہاں خانہ بدوش سرحدی قبائل آباد ہیں۔ جو سیکڑوں برس سے ہماری سرکار کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ نہ کبھی دوست بنے ہیں اور نہ کبھی دوست بن سکیں گے۔ یہ لوگ غریب مگر طاقتور ہیں، بہادر اور جنگجو ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انتقام لینے میں کبھی نہیں چوکتے اور ہمیشہ سرکاری علاقوں پر یورش کرتے رہتے ہیں، شہری رعایا کو لوٹتے، دیہاتوں کو تباہ کرتے اور فصلوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لئے اُن کو دبانے اور سرحد پر امن قائم کرنے کے لئے سرکار کو بہت سی فوج رکھنی پڑتی ہے۔ اسی لئے یہاں خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ اس علاقے میں پانی کی قلت اور خوراک کی سخت کمی ہے قصہ کوتاہ سوائے پہاڑ اور چٹیل میدانوں کے یہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ موسم سرما میں اس قدر برف گرتی ہے کہ راستے بند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بلبیر سنگھ کو اس ملک کی آخری چوکی مارے خیل میں قیام پذیر ہونا پڑا۔ اس چوکی میں دو سرکاری دوکانیں تھیں جن میں معمولی قسم کی چیزیں اور کچھ کپڑے اور دوائیں فروخت ہوتی تھیں دن کو اس چوکی کے دروازے کھول دیئے جاتے تھے تاکہ آس پاس کے لوگ ضروریات کی چیزیں خرید سکیں اور غروب آفتاب کے بعد دروازے بند کر دیئے جاتے تھے اور جو لوگ باہر کے اندر بھی ہوتے انھیں چوکی سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ چوکی کا یہ کام بلبیر سنگھ کے سپرد تھا، وہ چار سپاہیوں کو لیکر تمام چوکی کے احاطے میں جاتا تھا اور کونہ کونہ دیکھکر اپنی تسلّی کر لیتا تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا برف پڑ چکی تھی، ہوا تیز چل رہی تھی جس کی وجہ سے سردی کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ شام کو پانچ بجے سورج غروب ہو جاتا تھا اور آدھ گھنٹے کے بعد چراغ روشن کرنے کی نوبت آجاتی تھی۔ بلبیر سنگھ حسب معمول پانچ بجے کے بعد چار سپاہیوں کو لے کر نکلا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور یہ سب چوکی کے احاطے میں ادھر اُدھر دیکھنے لگے کہ باہر کا کوئی آدمی اندر تو نہیں رہ گیا ہے۔ دیکھتے دیکھتے ابھی ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا اور ابھی احاطے کا کچھ حصہ باقی بھی ہوگا کہ لکڑیوں کے ایک بڑے ڈھیر کے اندر جس پر برف پڑی ہوئی تھی کچھ کھٹکے کی آواز آئی، اسے سنکر بلبیر سنگھ چونکا، آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر دیکھا

کہ لکڑیوں کے نیچے ایک نوجوان عورت چھپی بیٹھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورت لکڑیاں ہٹا کر بیٹھ گئی ہے، اور اس کے بعد اُس نے لکڑیاں اپنے اوپر اس طریقہ پر رکھ لی تھیں کہ کسی کی نظر اُس پر نہ پڑ سکے۔ اتفاق سے لکڑیاں کچھ ہل گئیں جس کی آواز سے فوجی لوگ چونک گئے۔

بلبیر سنگھ نے لکڑیاں ہٹائیں اور اس عورت کو اپنے روبرو کھڑا کیا، وہ کانپ رہی تھی۔

اس نے غور سے دیکھکر پشتو زبان میں دریافت کیا "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

عورت نے اشارے میں جواب دیا کہ وہ موجودہ حالت میں کچھ نہ بتا سکے گی"

سپاہیوں نے عورت کو اُٹھا لیا، بلبیر سنگھ اُسے اپنے کمرے میں لے گیا، جہاں خوب آگ روشن تھی اور چائے کی کیتلی میں کافی تیار ہو رہی تھی۔ اس عورت کو آگ کے نزدیک بٹھا دیا گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اُس کو ہوش آیا۔ بلبیر سنگھ نے اپنے ہاتھ سے گرم گرم کافی کا ایک پیالہ اس کو دیا اور تھیلے سے کچھ خشک میوہ بھی دیا۔

عورت نے درخواست کی کہ تخلیہ ہو جانا چاہیئے، اِس پر بلبیر سنگھ نے سپاہیوں کو ہٹا دیا۔ وہ عورت آگ کے سامنے بیٹھ گئی، اب اس میں ہمت آ گئی تھی۔ بلبیر سنگھ نے پوچھا:۔

"تو یہاں کیوں چھپی تھی"؟

"انتقام لینے"

"کب سے چھپی تھی؟"

"دو روز سے"۔

"کیا کہا دو روز سے چھپی تھی"؟

"ہاں، رات کو دبے پاؤں اپنے شکار کو تلاش کرتی تھی"

"تیرا شکار کون تھا؟"

"وہ مجھے معلوم ہو گیا"

"پھر تو نے اُس کے گلے پر چھری کیوں نہیں چلائی؟"

"میری مرضی"

"تو نے اپنے شکار کو کب دیکھا تھا؟"

"پہلے ہی دن، چھپنے کے دو گھنٹے بعد"

"پھر اُس سے بدلہ کیوں نہ لیا؟"

"کہہ تو دیا کہ میری مرضی"

"تو جانتی ہے کہ اب تیرا حشر کیا ہوگا؟"

"موت"

"کیا تجھے معلوم تھا کہ تیرا یہ حشر ہوگا؟"

"بیشک معلوم تھا، اگر انتقام لے لیتی تو خبر پھیل جاتی اور میں گرفتار ہوکر ماری جاتی۔ اب میں جا بھی نہیں سکتی، کیونکہ بلا انتقام لیئے واپس جانے پر وہاں بھی موت ہے۔ اس لیئے میں نے فیصلہ کیا کہ جتنے دن اپنے شکار کو دیکھ سکوں اچھا ہے۔ پکڑی جاؤنگی تو بھی ماری ہی جاؤنگی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تو بھوکی ہے؟"

"دو روز سے"

"کچھ کھائے گی"

"اگر کچھ مل گیا تو"

"موت سامنے ہے پھر بھی"

"وہ خوشی کی موت ہوگی"

بلبیر نے سوچا کہ بھوک اور سردی کی شدت سے دو روز تک تکلیف اُٹھا کر اس عورت کا دماغ خراب ہوگیا ہے، ورنہ اس دنیا میں ایسا کون ہے جو موت سے خوف نہ کھائے۔ سرکار کا حکم تھا کہ جاسوسی کرتے ہوئے جو شخص گرفتار کیا جائے اس کی سزا موت ہے۔ اس خیال کے آتے ہی بلبیر کے دل پر ذرا سا خیال پیدا ضرور ہوا لیکن اُس نے سوچا کہ بھوکے انسان کو موت کے گھاٹ اُتارنے میں کیا مل جائیگا اس نے ایک پیالہ کافی کا لبالب بھرا کچھ میوہ اور ڈبل روٹی کی چند قاشیں اس عورت کے سامنے اور پیش کیں۔ اس عورت نے مسکراتے ہوئے انھیں قبول کرلیا اور کہا کہ "کیا آپ کچھ نہ پئیں گے"؟

بلبیر نے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "بڑی سردی پڑ رہی ہے۔ آپ بھی ضرور ایک پیالہ کافی پی لیں۔"

"ارادہ تو نہیں ہے" بلبیر نے جواب دیا۔

"اس کی خاطر جو آپ کو پیار کرتا ہو جس کا درد آپ کے کلیجے میں ہو۔"

"ایسا کوئی نہیں ہے"

اس نے بلبیر کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا "تو اپنی خاطر، اپنی حفاظت کی خاطر"

بلبیر نے ایک پیالہ کافی کا لبریز کیا۔ اس کی سطح پر بھاپ اُڑ رہی تھی جس کے بل دیکھتے دیکھتے ختم ہو جاتے تھے، اور خاص مہک پیدا کرتے تھے۔ درمیان میں چمکدار آنچ کے انگارے کھل رہے تھے دھوئیں کا نام و نشان نہ تھا۔ ایک طرف وہ عورت ایک ایک قطرہ کر کے کافی کا حلق کے نیچے اتار رہی تھی، دوسری طرف سامنے نیچی نگاہ کیئے بلبیر کافی کا پیالہ لبوں سے لگائے ہوئے تھا۔ حد درجے کی خاموشی طاری تھی اور اس فوجی کمرے میں صرف دو سانس چل رہے تھے۔

بلبیر نے اس عورت سے پوچھا " تمھارا نام ؟"

"حُسن آرا"

"تمھارا گاؤں"

" علاقۂ غیر میں ہے اور اس مارے خیل کی چوکی سے کوئی چار کوس کے فاصلے پر۔"

"ہاں تو تم نے اپنے شکار کا حال نہیں سنایا"

"میرے قبیلے کا اُصول ہے کہ ان کے ہر خاندان کا ایک انسان غازی بنتا ہے اور اسے حکم ملتا ہے کہ سرکاری علاقے میں جائے اور دشمن کا سب سے بڑا افسر مار کر واپس آجائے۔ چنانچہ میرے نام قرعہ پڑا۔ اور چونکہ میں عورت تھی اس لیے اس کام کے لئے مجھے ایک خنجر دیا گیا۔"

حسُن آرا نے خنجر نکال کر بلبیر کو دکھایا، وہ نہایت خوبصورت فولاد کا چار انگل لمبا پتلا سا تھا اس میں لچک اس قدر تھی کہ وہ دُہرا ہو جاتا تھا اور چمک اتنی زیادہ تھی کہ آنکھیں چُندھیاتی تھیں۔ اس پر چمڑے کا ایک خوبصورت خول چڑھا ہوا تھا جس میں وہ خنجر آبدار رکھا جاتا تھا۔ حسن آرا نے بلبیر سے کہا "دکھائیے اپنا ہاتھ"

بلبیر نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا"

حسُن آرا نے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی نہایت نزاکت سے اپنے ہاتھ میں تھام لی اور اس کے سرے پر نہایت ہلکی سی تراش خنجر سے لگائی اور اس کی بے معلوم لکیر نے اس نوجوان فوجی کی انگلی پر ہلال کا نشان بنا دیا۔ اور اس نشان میں جلد کے ذرا سے کٹ جانے پر خون جھلکا اور جھلک کر رہ گیا بوند بن کر باہر نہ آسکا۔ حسُن آرا نے کہا " دیکھا آپ نے اس کا کمال، خون دھار پر لگ گیا ہے لیکن زخم ایسا ہے کہ بال سے بھی زیادہ باریک۔" بلبیر اس خنجر کی ساخت پر واقعی تعجب کرنے لگا۔

حسُن آرا نے کہا " یہ خنجر میں اپنے سینے میں چھپا کر شام ہونے سے قبل کچھ عورتوں کے جھرمٹ کے ہمراہ دو کانوں تک گئی اور نظر بچا کر لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپ گئی۔ جب رات کے نو بجے گارد نے تلاشی لی

اور پہرہ تبدیل ہو گیا اور دوسری گارد آ گئی تو میں دبے پاؤں وہاں سے نکلی، میرے پاس سیاہ رنگ کا ریشمی لبادہ تھا اُسے اوڑھا اور نظر بچا کر اپنے شکار کا مسکن دیکھنے لگی۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے آخر کار میں اُس کے ڈیرے پر آ پہونچی، اُس وقت رات کے بارہ بجے کا عمل ہو گا۔ میں نے آہستہ سے دروازے کا پردہ اُٹھایا دیکھا کہ عین کمرے کے درمیان آگ روشن ہے اور اُس کے اوپر کیتلی میں کافی اُبل رہی ہے اور اُس کی خوشبودار بھاپ تمام کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک طرف کونے میں لالٹین جل رہی تھی میں نے لالٹین کی روشنی بند کر دی اور کمرے میں جو آگ جل رہی تھی اُس کی روشنی میں دیکھنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ مسافری کرمچ کی چھوٹی چارپائی پر کمبل بچھائے اور کمبل اوڑھے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی گود میں آرام کر رہا ہے۔ بالکل بے خبر اُس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی، اُس کا ماتھا چوڑا، بڑی بڑی آنکھیں، سُرخ رنگ دھیمی دھیمی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ میں چاہتی تو اُسے ہلاک کر کے جس طرح آئی تھی اُسی طرح واپس چلی جاتی۔ اور صبح نمودار ہونے تک لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپی رہتی۔ جب صبح ہوتی، اور دروازے کھلتے، اور باہر کے آدمی آتے تو اُن کے ساتھ مل کر باہر چل دیتی۔ لیکن میرے دل میں ایک آواز اُٹھی، اتنی تیز جیسی سمندر کی لہر کسی نے میرا ہاتھ روکا، کسی نے میرے کان میں کہا، "اے تو عورت ہے، بنی نوع انسان کو تیرے جسم سے نشو و نما ملتی ہے، تیری آنکھ میں مروّت اور دل میں محبت کا سمندر موجزن ہے، تو نے سکندر اعظم جیسے، تاتاری تیمور جیسے، بابر اور محمود جیسے، فردوسی اور شیراز جیسے انسانوں کو اپنی گود میں کھلایا ہے، انھیں پیدا کیا ہے، اور نسل انسانی تیرے ہی جسم سے بنتی ہے۔ تو حور ہے فرشتۂ جنت ہے۔ کسی کی جان لینا تیرا کام نہیں ہے۔ دُور ہو، دُور ہو، اس طوفانِ قیامت سے دُور بھاگ"

اس خیال کے آتے ہی میرا ہاتھ کانپ گیا، میری نظر اُس کے چہرے پر جمی رہی۔ جب مجھے ذرا تسلی ہوئی اور میرا دل ٹھکانے ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ پسینے سے میرا جسم تر ہو گیا ہے۔ حالانکہ کڑکڑاتا جاڑا تھا اور رہا کی تیزی سے خون سرد ہوا جاتا تھا۔ میں نے خنجر نیام کیا اور سینے میں چھپا لیا۔ لٹکتی ہوئی کافی کی کیتلی سے دو پیالے کافی کے بھرے۔ ایک ایک قطرہ کر کے حلق سے نیچے اتار گئی، ایک اپنے حصّے کا اور دوسرا اُس کے نام کا۔ رات بھر اُس کے چہرے کو دیکھا اور سوچا کہ کسی چیز کو مسمار کر دینا آسان ہے لیکن تعمیر کرنا ممکن نہیں۔ جب صبح کے چار بجے کا گھڑیال بجا تو میں دبے پاؤں وہاں سے نکل کر لکڑیوں کے ڈھیر میں چھپ گئی، اپنے اوپر اور چاروں طرف لکڑیاں اس طریقے سے جالیں کہ باہر کا آدمی دیکھ نہ سکے۔ کچھ دیر جاگتے رہنے کے بعد نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں بیدار ہوئی تو سورج کی روشنی خوب پھیل چکی تھی۔

"پھر"؟ بلبیر نے پوچھا۔

"میں وہیں دن بھر بیٹھی رہی"

"بھوک کی پیاسی؟"

"نہ مجھے بھوک تھی نہ پیاس، میرے دل میں ایک خیال تھا، صرف ایک"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ ایک مرتبہ پھر اپنے شکار کو دیکھ لوں، لیکن یہ خیال اب میری موت کا باعث بن گیا مجھے قبیلے کے حکم کے مطابق دوسری صبح واپس جانا چاہیئے تھا، جو واپس نہیں جاتا اور اُسے دیر لگ جاتی ہے قتل کر دیا جاتا ہے اُس کے جسم کے چار ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں، ہمیں ایک رات سے زیادہ باہر رہنے کا حکم نہیں ہے"

اتنا کہہ کر حسن آرا نے لمبی سانس لی۔

"پھر" بلبیر نے اس کی طرف دیکھکر پوچھا:-

"رات کو پھر میں بارہ بجے کے بعد اس مقام سے نکلی اور سیاہ لبادہ اوڑھ کر دبے پاؤں اُس کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ پہلی رات کی طرح آج بھی کیتلی میں کافی اُبل رہی تھی، پیالے رکھے تھے، مَیں نے گزشتہ شب کی طرح دو پیالوں میں کافی لبریز کی اور ایک ایک قطرہ کرکے آہستہ آہستہ دونوں پیالے ختم کئے اور اس شیر مرد کے چہرے پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ وہ چار گھنٹے چار لمحے کے برابر معلوم ہوئے اور بات کی بات میں تمام رات گزر گئی۔ جب چار بجے کا گھڑیال بجنے کو ہوا تو میں نے ہاتھ ڈال کر خنجر نکالا، وہ بالکل بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے اس خنجر سے اس کے ماتھے پر ایک خفیف سا نشان ہلال کا بنادیا۔ اس نشان میں خون جھلکا اور چھلک کر رہ گیا۔ اس کے بعد اُس نے کروٹ لی، دونوں ہاتھ پھیلائے اور پھر سو گیا۔ میں بھی آہستہ سے اُٹھی اور ڈیرے کے باہر آگئی۔ دوسرا دن بھی لکڑیوں کے ڈھیر میں گزارا، دن بھر سوچتی رہی کہ آخر اس طرح کب تک کام چلے گا اور اس کا حشر کیا ہوگا کہ شام ہوگئی۔ سردی اور بھوک کی شدت نے بھی پریشان کر دیا، جسم کانپنے لگا۔ چنانچہ رات ہونا مشکل ہوگئی اور وہی ہوا جس کا علم تھا۔ میں تاب نہ لاسکی، اور میرے گرنے سے لکڑیاں منتشر ہوئیں۔ ٹھیک اس وقت جبکہ آپ ادھر سے گزر رہے تھے۔" یہ کہکر وہ بلبیر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

بلبیر نے کہا "حسن آرا تیری داستان حیرت انگیز ہے لیکن افسوس ہے کہ تو نے اپنے شکار کا نام نہ بتایا"

"میں اُس کا نام نہیں جانتی"

"اُسے پہچانتی ہے؟"

"ہاں، وہ ہر وقت میری آنکھوں کے روبرو رہتا ہے۔"

"اب بھی ؟"

"چوبیس گھنٹے"

"سرکار کے حکم سے تو واقف ہوگی کہ جاسوس کی سزا موت ہے۔" "اور تو جاسوس ہے"

"مجھے منظور ہے"

"لیکن میرے ہاتھوں تیری موت نہ ہو سکے گی"

"کیوں ؟"

"یہ نہیں بتا سکتا"

"پھر"

"اپنی طرف سے میں تجھے آزاد کر دونگا"

"اس کا نتیجہ ؟"

"تاکہ تو زندہ رہے"

"فضول ہے"

"وہ کیسے ؟"

"میں دوبارہ یہاں آ نہیں سکتی، ضرور ماری جاؤنگی، اور فرض کیجئے میں بچ بھی گئی تو کیا میں اُسے حاصل کر سکوں گی؟"

"ممکن ہے"

"بالکل ناممکن ہے۔"

اس کی پلٹن تبدیل ہو جائیگی، وہ دوسری چھاؤنی میں چلا جائیگا"

"پھر؟"

"میرے خیالات میرے جسم سے نکل کر ہوا میں مل چکے ہیں، مَیں انھیں برباد کرنا نہیں چاہتی - جو کیفیت دیکھ چکی ہوں اُس سے بہتر نہ دیکھ سکونگی۔ اگر میرے خیالات میں اتنی طاقت ہے اور وہ صحیح راستے سے گزر رہے ہیں تو وہاں بھی اثر پیدا ہوگا، بس اتنی ہی میری تمنا تھی"

"کافی کے دو پیالے اور لبریز کرو"

"کیوں ؟"

"میں کہتا ہوں"

خاموشی سے نیچی نگاہ کرکے حسن آرا نے کافی کے دو پیالے تیار کئے۔ بکبیر نے کہا "ایک تم پیو دوسرا میں پیتا ہوں، تمہارے شنکار کی یادگار میں"

حسن آرا مسکرائی۔

"کافی پی چکنے کے بعد بکبیر نے کہا "حسن آرا!"

حسن آرا نے گردن جھکالی،

"وہ خنجر کہاں ہے؟" بکبیر نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"مجھے دے دو، یہ میں اسے دے دونگا تمہاری یادگار"

حسن آرا نے خاموشی سے خنجر بکبیر کے ہاتھ میں دے دیا۔

"وقت نزدیک ہے" وہ بولی

"آؤ میرے ہمراہ" بکبیر حسن آرا کو لے کر نہایت احتیاط سے چوکی کے اس جانب گیا جس طرف کچھ خاموشی تھی، اور پہرہ بھی ہلکا تھا۔ وہاں ریت کی بوریوں سے دیوار کو اونچا کیا گیا تھا۔ وہاں کھڑے ہوکر دونوں نے سامنے دیکھا۔

"تم اس دیوار سے اُتر کر جاسکتی ہو"

"لیکن یہ کافی اونچی ہے"

"پھر؟"

"آپ میرا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ اُتار دیں"

بکبیر نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کے ہاتھ تھام لئے اور اُسے اُٹھا کر دیوار کی دوسری طرف اُتار دیا۔ حسن آرا نے بکبیر کے چہرے کی طرف پھر دیکھا اور بولی "وہ خنجر اُسے ضرور دینا میری نشانی ہے۔"

"دیکھو حسن آرا سامنے" بکبیر نے کہا "اس طرف برف کم ہے اور جگہ جگہ چٹانیں نکل رہی ہیں، پتھر کی آڑ ہے، تم دبے پاؤں ان پتھروں میں ہوتی ہوئی سیاہ لبادہ اوڑھکر دور نکل جاؤ، سپاہیوں کی آنکھ سے اوجھل رہوگی، اور میں روند کرتا ہوا اس طرف کے سپاہیوں کو اپنی طرف متوجہ کرلونگا، جب تک تم زد سے باہر ہوجاؤ۔ دیکھو کسی اور طرف مت جانا۔ باقی ہر سمت میں برف سفید چاندنی کی طرح زمین پر بچھی ہے، کوئی رکاوٹ یا پتھروں کی آڑ نہیں ہے۔ اگر تم اس طرف چلی گئیں تو سیاہ نشان سفید زمین پر حرکت کرتا ہوا فوراً معلوم ہوجائیگا اور سپاہی تمہیں مار دینگے۔ اس چوکی کے ایک ایک میل کے دائرے میں

سپاہی رات میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔"

"اچھی بات ہے"

گھنگھور گھٹا چھا رہی تھی، روئی کی طرح ہلکی ہلکی برف کے گالے پڑنا شروع ہو گئے تھے بلبیر حسن آرا کو اُتار کر پرونڈ لگانے گیا تاکہ سپاہی اس طرف متوجہ نہ ہوسکیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ اپنے ڈیرے کی طرف واپس آیا۔ ابھی وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ بڑے زور سے فائر کی آواز سنائی دی۔ بلبیر نے اپنا سر تھام لیا دو فوجی سپاہی دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "حضور، دشمن کا ایک آدمی قلعے سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا گیا اور اُسے ہلاک کر دیا گیا"

"کس طرف؟"

"شمال مغربی دروازے سے چار فرلانگ پر"

"شمال مغربی دروازے کی طرف؟"

"جی ہاں!"

"چلو!"

بلبیر اُن کے ہمراہ چلا، اُس کے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہ تھی لیکن اُس نے کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا شمال مغربی دروازے پر پہونچکر اُس نے حکم دیا "سرچ لائٹ جلاؤ" بجلی کی تیز روشنی چھوڑی گئی جنگل کا کونہ کونہ روشن ہو گیا۔ زمین پر پڑی ہوئی سوئی بھی نظر آنے لگی۔ بلبیر نے دیکھا کہ کوئی سیاہ چیز بے حس و حرکت پڑی ہے اس کے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا۔

حولدار نے آگے بڑھکر کہا "کیا حکم ہے؟"

بلبیر نے کہا "دروازہ کھول کر جانے کی ضرورت نہیں، ممکن ہے دشمن کثرت سے موجود ہوں، صبح دیکھا جائے گا"

سرچ لائٹ بند کر دی گئی، بلبیر واپس آگیا، لیکن اس کی آنکھوں نے سرچ لائٹ کی روشنی میں وہ چیز دیکھی جس کی توقع نہ تھی۔ قدرت نے اس انوکھے شکاری کو برف میں ڈھانپ دیا۔

اتنا حال سنا کر وہ بوڑھا فوجی افسر خاموش ہو گیا، اُسکی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار تھے جو اُس نے اپنے رومال سے پونچھے۔ میرے خیال نے بتایا کہ اس کے ماتھے پر ہلکا سا نشان بھی ہے۔ اس کے بعد اُس نے ایک پیالہ کافی کا خاموشی سے پیا۔ لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ شاید سوچ رہا ہو کہ یہ پیالہ اُن کی یاد میں ہے جو اس دنیا سے گمنام رہ کر گزر گئے ہیں۔

بیوہ کی دیوالی

(از مسٹر راجیندر نراین سکسینہ بسمل، بی اے)

طلسمِ ظلمت ہوا شکستہ جہاں پہ تنویر چھا رہی ہے
نکل کے پردوں سے لیلیٔ شب متاعِ جلوہ لٹا رہی ہے

بکھیرے چراغوں سے اپنا دامن عروسِ شب مسکرا رہی ہے
جبیں پہ اپنے خنک ستاروں کی نرم افشاں لگا رہی ہے

جہاں میں ہر سمت چھا کے جلوے نشانِ ظلمت مٹا رہے ہیں
بنی ہیں اک موجِ نور کرنیں، گلی گلی جگمگا رہی ہے

جہاں میں پھولا نہیں سماتا خوشی کے مارے کوئی بھی لیکن
اداس بیٹھی ہے ایک بیوہ، لہو کے آنسو بہا رہی ہے

پڑے ہیں شانوں پہ بال بکھرے الجھ رہے ہیں شمیمِ گل سے
نہ چوڑیاں ہیں کلائیوں میں نہ ہنس رہی ہے نہ گا رہی ہے

جو مانگ سیندور کیلئے تھی غضب کا تھا جسمیں رنگ شوخی
وہ آج غمگین وحشتوں میں شباب اپنا لٹا رہی ہے

فسردہ چہرہ پہ اشکِ حسرت کی گرم بوندیں ڈھلک رہی ہیں
گلوں کی بیچارگی پہ شبنم تڑپ کے آنسو بہا رہی ہے

سہاگ کا غم ستا رہا ہے بجھا ہوا ہے چراغ گھر کا
خموش ظلمت کدے میں اپنے غموں کے جلوے دکھا رہی ہے

وہ اپنے گھر کا چراغ ہے خود کہ جسکی دھندلی سی روشنی سے
چراغ والوں کی انجمن میں قرارِ دل کا جلا رہی ہے

شباب لیتا ہے چٹکیاں جب اُمڈنے لگتے ہیں دل کے ارماں
جگر میں اُٹھ اُٹھ کے ہر تمنا لہو میں غم کے نہا رہی ہے

نصیب کو اپنے دیکھتی ہے تو ڈوب جاتی ہے آنسوؤں میں
کسے خبر ہے کہ ایک بیوہ خوشی بھی رو کر منا رہی ہے

قطعہ

سیہ رو بادلوں میں خواہ کتنا ہی رہے مستور
مہِ تاباں کبھی پھیکا نہیں پڑتا نکھرتا ہے

یونہی جو فطرتاً پاکیزہ دل ہو صحبتِ بد میں
وہ جتنا ڈوبتا جاتا ہے اُتنا ہی اُبھرتا ہے

سید تجمل حسین اختر بریلوی

گورکھ دھندا

(ایک قصّہ)

از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر۔ کشتہ

موسم گرما کی ایک شام کو مسٹر نورمن شہر کے شور و شغب سے گھبرا کر ہائڈ پارک میں ایک تنہا اور پُرسکون مقام پر بنچ پر بیٹھے ہوئے طلوع ماہتاب کے خوشنما اور دل فروز منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اُن کے نزدیک ہی بنچ کے دوسرے سرے پر تھوڑی دیر سے ایک سن رسیدہ شخص نہ معلوم کن خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ اس کی جھرّیاں اور چہرہ کی افسردگی اُس کے بوڑھے دل کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس کے لاغر و نحیف جسم سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کو آرام دہ بنانے کی جدوجہد میں ناکام رہا ہے۔ وہ دنیا کی محفل بے ہنگام کے ایک ساز کہنہ کی طرح تھا جس کی لے اور گت پر کوئی وجد نہیں کرتا۔ اور جس کے نغمۂ بے کیف کو سُن کر سامعین کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ غرض وہ اس غم کدۂ عالم کا ایسا سوگوار فرد تھا جس کو روتا ہوا دیکھکر زمانہ مُسکرا دیتا ہے۔

اُس کے بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یا تو عہد گزشتہ کی یاد میں محو ہے، یا کوئی ایسی شاطرانہ چال چلنے کی فکر میں مبتلا ہے جس سے حصول معاش میں اُسے مدد ملے۔ اُس نے اچانک اتنی زور سے ایک آہ سرد کھینچی جس سے مسٹر نورمن کی توجہ اُس کی جانب مبذول ہوگئی۔ یہ بھی خواہش ہوئی کہ اس سے کچھ گفتگو کریں اور ہو سکے تو اس سے اس کی زندگی کے حالات سنیں۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اپنی تمنا کا اظہار کریں وہ بزرگ اُٹھ کر چل دیا۔ اور سایہ کی طرح درختوں کے جھرمٹ میں روپوش ہوگیا۔

اس بوڑھے آدمی کو گئے ہوئے زیادہ وقفہ نہ ہوا تھا کہ ایک نوجوان آیا اور غصّے کا اظہار کرتے ہوئے نخرے سے اپنا کوٹ بنچ پر پٹک کر مسٹر نورمن کے قریب بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرہ سے گھبراہٹ اور پریشانی نمایاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔

مسٹر نورمن نے اس کی پریشانی کا سبب معلوم کرنے کے لئے ہمدردی سے اس سے دریافت کیا "کہیئے جناب، کس پریشانی میں مبتلا ہیں؟ مزاج کچھ برہم معلوم ہوتا ہے"۔

نوجوان نے فوراً ہی بے رُخی سے بے تکلفانہ جواب دیا "اگر جناب کے ساتھ بھی وہی واقعہ پیش آتا،

جو میرے ساتھ ہوا ہے تو جناب مجھ سے کہیں زیادہ پریشان نظر آتے۔"

"جی ہاں! بہت ممکن ہے" مسٹر نورمن نے تائید کی، مگر کیا میں اصل واقعہ معلوم کرسکتا ہوں اس بے تکلفی کے لئے معاف کیجئے گا۔" انھوں نے مزید کہا "جی ہاں ضرور، مگر یہ واقعہ بڑا عجیب ہے، بات یہ ہے کہ میں آج سہ پہر کو سیر و تفریح کی غرض سے یہاں آیا تھا اور دو چار روز پیلیس ہوٹل میں مقیم رہ کر خوب سیر سپاٹے کا ارادہ تھا۔ مگر جب میں اس جگہ پر پہونچا جہاں پہلے وہ ہوٹل تھا تو معلوم ہوا کہ پچھلے چند ماہ سے اس عمارت میں ہوٹل کے بجائے ایک سینما قائم ہوگیا ہے۔ مجبوراً شہر کے ایک اور ہوٹل میں قیام کرنا پڑا، وہاں سامان وغیرہ رکھ کر چند ضروری خطوط لکھنے کے لئے پوسٹ آفس گیا۔ پھر خیال آیا کہ غسل کے لئے صابن بھی خرید لوں۔ کیونکہ ہوٹل کے صابن کے استعمال سے مجھے نفرت ہے۔ اور مکان سے عجلت میں میں اپنے ساتھ لانا بھول گیا۔

غرض بازار جاکر میں نے صابن کی ایک ٹکیہ خریدی اور پھر ادھر اُدھر سیر و تفریح کرتا رہا۔ جب ذرا تکان محسوس ہوا تو واپسی کا خیال آیا۔ مگر نہ راستہ کا خیال رہا اور نہ ہوٹل ہی کا نام یاد آیا۔ اتنا دھیان بھی نہ رہا کہ وہ ہوٹل شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔

اب آپ اس غریب الدیار کی مصیبت اور مشکلات کا اندازہ لگائیں جو لندن جیسے وسیع شہر میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہو اور جہاں اُس کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ اس ہوٹل کا پتہ معلوم کرنے کے لئے میں اپنے مکان کو تار بھیج سکتا ہوں، مگر اس کا جواب بھی کل سے پہلے نہیں آسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ اتنے عرصہ تک بغیر روپیہ پیسہ کے کہاں اور کیسے رہا جائے۔ بازار جاتے وقت میں نے احتیاطاً ایک شلنگ جیب میں ڈال لیا تھا، اس میں سے کچھ خطوط لکھنے اور صابن کی ٹکیہ خریدنے میں صرف ہوگیا۔ اور کچھ دو ایک مرتبہ شربت وغیرہ پینے میں، اب بمشکل چند آنے بچے ہیں، جو کسی ہوٹل میں جگہ حاصل کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔

اتنا قصہ اور تمام دلیلیں پیش کرچکنے کے بعد نوجوان اپنی تصنع آمیز اور لطیف تقریر کا اثر دیکھنے کے لئے کچھ دیر خاموش رہا۔ اُس نے مکرر کہنا شروع کیا۔ ممکن ہے جناب کو شک ہو کہ میرا قصہ بناوٹی ہے مگر مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور اس دنیا میں بڑی عجیب عجیب باتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔"

"بیشک بیشک،۔ مگر مجھکو آپ کی باتوں پر مطلق شبہ نہیں ہوا" مسٹر نورمن نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ایک مرتبہ خود بھی ایک غیر ملک میں ہو بہو ایسی ہی غلطی کرچکا ہوں۔ مگر میرے ایک دوست کو اس

مقام سے واقفیت تھی اس لئے مصیبت سے بچ گیا۔"

"خیر شکر ہے جو آپ نے مجھ پر یقین کیا، ورنہ کون کسی کا دُکھڑا سنتا ہے، دنیا کو اپنے مطلب سے کام ہے، کس سے کوئی اپنا غم کہے۔ اگر ایسے آڑے وقت میں کوئی شریف آدمی کچھ رقم مستعار دیدے تو یہ مشکل حل ہو سکتی ہے، ورنہ بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔"

اِن آخری الفاظ کو نوجوان نے کچھ ایسے مؤثر اور رقت انگیز پیرائے میں ادا کیا کہ مسٹر نورمن کا دل پگھلنے لگا۔ لیکن انھوں نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "انسان کو انسان کا ہمدرد ہونا ہی چاہیئے آپ کی مشکل حل کرنے کے لئے میں ہی آپ کو روپیہ اُدھار دے سکتا ہوں۔ مگر بُرا نہ مانیئے آپ کے بیان میں ایک ثبوت کی کمی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو صابن کی ٹکیہ خریدی تھی وہ کہاں ہے؟"

یہ اعتراض پیش ہوتے ہی نوجوان چونک پڑا، اور فوراً اپنے کوٹ اور پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا اور پھر گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئی، ضرور کہیں گر گئی، ورنہ اور کہاں غائب ہو جاتی"، اور یہ کہہ کر اپنا کوٹ کاندھے پر ڈال کر وہ تیزی سے پھاٹک کی طرف بھاگ گیا۔

مسٹر نورمن مجسمۂ حیرت بنے ہوئے وہیں بیٹھے رہے۔ وہ اس گورکھ دھندے کو بالکل نہ سمجھ سکے۔ واقعات پر غور کرتے ہوئے وہ سوچنے لگے کہ اگر اس نوجوان نے ذرا سی اور چالاکی و دانشمندی سے کام لیا ہوتا اور ثبوت میں وہ صابن کی ٹکیہ پیش کر دی ہوتی تو اُس کی شاطرانہ چال کام کر گئی ہوتی۔ بعض اوقات ذرا سی غلطی انسان کے کئے دھرے کو خاک میں ملا دیتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ وہاں سے اُٹھ کر چلنے لگے تو بنچ کے نیچے ایک چھوٹے سے پیکٹ کو دیکھ کر چونک پڑے، اُس کو اُٹھا کر دیکھا تو صابن کی ٹکیہ تھی۔

"یقیناً یہ نوجوان کی جیب سے گر پڑی۔" اور وہ فوراً نہایت تیزی سے پھاٹک کی سمت دوڑے اور نوجوان کو چاروں طرف تلاش کرنے لگے تاکہ صابن کی ٹکیہ ملنے کی اطلاع دے دیں، مگر اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ لاچار اس سلسلہ کو ختم کر کے وہ پارک کی طرف واپس لوٹے، تو راستہ میں ایک تنہا مقام پر اس نوجوان کو متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کھڑا ہوا پایا۔

"ہیلو مسٹر" انھوں نے اسے زور سے پکارا۔ "آیئے، یہ لیجئے یہ آپ کا گواہ مل گیا" صابن کی ٹکیہ دکھاتے ہوئے اُنھوں نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ جس وقت آپ وہاں آکر بیٹھے تھے اُسی وقت یہ آپ کی جیب سے بنچ کے نیچے گر پڑی، مگر غنیمت سمجھیئے کہ مل گئی۔ آپ کی باتوں پر یقین نہ کرنے

کے لئے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مگر اُس وقت تو صورت حالات نے یقین نہ کرنے ہی کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اب تو معاملہ بالکل صاف ہو گیا، یقین نہ کرنے کی اب کوئی وجہ نہیں۔ لیجیئے یہ ایک گنّی اور فی الحال اپنا کام چلائیے، اور یہ ہے کارڈ، اس پر تحریر شدہ پتہ پر آپ اس ہفتہ کے اندر جس روز چاہیں یہ رقم واپس کر دیں، اور یہ لیجیئے اپنی صابن کی ٹکیہ۔ اب اسے احتیاط سے رکھیئے گا۔"

نوجوان نے مُسکرا کر گنّی اور صابن کی ٹکیہ جیب میں رکھ لی اور آہستہ سے "شکریہ" کے الفاظ کہتے ہوئے فوراً رفو چکّر ہو گیا۔

"عجیب شخص تھا" مسٹر نورمن کہنے لگے، "خیر بیچارے کو آنے والی مصیبت سے تو نجات مل گئی میں نے کس قدر ناانصافی سے کام لیا تھا جو حالات کا مطالعہ کیئے بغیر ہی اُس کو جھوٹا تصور کر لیا تھا"۔ انھیں واقعات پر غور کرتے کرتے جب وہ پارک میں اُس جگہ پہونچے جہاں اِس عجیب و غریب ڈرامہ کا آغاز ہوا تھا تو دیکھا کہ وہی بزرگ جو اس نوجوان کے آنے سے پیشتر اُن کے نزدیک بیٹھ چکا تھا کسی چیز کی جستجو میں مصروف ہے۔

مسٹر نورمن نے اُس کے نزدیک جا کر دریافت کیا "کیا آپ کی کوئی چیز گُم ہو گئی ہے؟"

"جی ہاں، صابن کی ایک ٹکیہ تھی" بوڑھے نے دبی زبان سے کہا۔

"عجیب گورکھ دھندا ہے" مسٹر نورمن نے چڑھ کر کہا۔ (ترجمہ)

پینتیس ۳۵ سال پہلے

اکتوبر ۱۹۰۵ء میں 'زمانہ' کا ایک خاص نمبر شہنشاہ اکبر اعظم کی سہ صد سالہ برسی کی یادگار میں "اکبر نمبر" کے نام سے شائع ہوا تھا جسمیں سوامی رام تیرتھ آنجہانی۔ مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم۔ شیخ سر عبد القادر صاحب ایڈیٹر مخزن۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب شروانی۔ رائے بہادر لالہ نہال چند صاحب جج مرحوم۔ منشی نوبت رائے نظر لکھنوی۔ منشی پریم چند (نواب رائے) خواجہ حسن نظامی صاحب مولانا اشہری۔ حضرت سرور جہان آبادی۔ پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم وغیرہ کے مضامین نظم و نثر شائع ہوئے تھے۔ اس نمبر کے آغاز میں ایک دعا "دعائے اکبر" کے نام سے شائع ہوئی ہے جو اب ۳۵ سال بعد بھی ویسی ہی ضروری ہے جیسے اس وقت تھی۔ اس لئے یہ دعا اس نمبر کی یاد میں درج ذیل ہے:-

"یا خدا جہاں دیکھتا ہوں سب تیری ہی تلاش میں ہیں۔ اور جس سے سنتا ہوں سب تیرا ہی ذکر کرتے ہیں کافر اور مسلمان تیرے ہی راستے میں دوڑنے والے اور وحدہٗ لاشریک کہنے والے ہیں۔ اگر مسجد ہے تو اُس میں تجھی کو پکارتے ہیں اور اگر بتخانہ ہے تو تیرے ہی شوق میں سنکھ بجاتے ہیں، کبھی مندر میں بیٹھتا ہوں کبھی مسجد میں۔ غرضکہ تجھکو گھر گھر تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ اگرچہ تیرے خاص لوگوں کو کافر اور مسلمان سے کوئی کام نہیں، اور ان دونوں کو تیرے پوشیدہ بھید میں کوئی دخل نہیں۔ کافر کیلیئے کفر اور دیندار کیلیئے دین درد دل کی دوا ہے۔

اے خدا تو ہی سب کاموں کا ظاہر کرنیوالا ہے اور تمام کاموں کا حصر نیت پر رکھا ہے۔ تو ہی نے بادشاہوں کو بادشاہوں کے لائق نیت عطا کی

تنقید کتب

میری کہانی میری زبانی

یہ سید ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا حیدرآباد دکن کی خود نوشت سوانح عمری ہے جسے اُن کی وفات کے بعد اُن کی اہلیہ محترمہ صغرا بیگم صاحبہ نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کا شمار حیدرآباد دکن کے مشہور اور ہر دلعزیز معززین میں تھا وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور بڑے باخلاق آدمی تھے۔ شعر و سخن اور تصوّف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے سماع سے شوق تھا، فن موسیقی سے آگاہ تھے۔ گانا سنتے تھے اور خود بھی گایا کرتے تھے۔ حافظہ نہایت قوی تھا۔ آخری عمر میں وہ اپنی سوانح عمری لکھنے پر متوجہ ہوئے تو تمام زندگی کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ قلمبند کر دئے۔ مرحوم نے کرشمہ تقدیر، شاہراہ نجات، گلشن ترنم، آثار صنادید دکن، ابن رشد وغیرہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جہانتک اس کتاب کا تعلّق ہے دراصل یہ مرحوم کی محض سوانح عمری نہیں ہے بلکہ تمام ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے پچاس سالہ تغیر و تبدّل پر ایک دلچسپ ریویو ہے جس سے ہماری معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں کئی ہاف ٹون تصویریں ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۳۲۸ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ صغرا بیگم ہمایوں مرزا، ہمایوں نگر، صغرا منزل، حیدرآباد دکن

تذکرۂ بے نظیر

یہ فارسی تذکرہ ۱۱۷۲ھ میں میر عبدالوہاب افتخار اورنگ آبادی نے لکھا تھا، اب اسے سید منظور علی ایم اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی نے تحقیق و تصیح کے بعد ترتیب دیا ہے اور الہ آباد یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ اس تذکرہ میں اُن ۱۵۴ شاعروں کا حال اور نمونہ کلام درج ہے جو بارھویں صدی ہجری کے پہلے بہتر ۷۲ سال ایران یا ہندوستان کے اندر گذرے ہیں۔ حالات کی تحقیق و صحت میں مصنف نے خاص محنت کی ہے۔ کلام کا انتخاب بھی خوب ہے۔ فارسی شاعری کے شائقین کے لئے یہ ایک قابل قدر چیز ہے۔ چھپائی ٹائپ کی ہے، کاغذ عمدہ دبیز استعمال کیا گیا ہے۔ آخر میں انگریزی زبان میں مرتب کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں "افتخار" کی سوانح عمری پر روشنی ڈالتے کے ساتھ ساتھ اس تذکرہ کی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتابستان الہ آباد۔

نذر دکن

یہ کتاب انیس[۲۹] گرانمایہ مضامین نظم و نثر کا ایک دلاویز مجموعہ ہے۔ جن کا تعلق سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن سے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مضامین نظم و نثر تعلیم یافتہ خواتین کی انشاپردازی کا نمونہ اور فکر سخن کا نتیجہ ہیں۔ نثر میں "دکن میں سلاطین اسلام کی آمد، سلاطین بہمنیہ کے سکے" "دکن کے چند نامدار شعراء" "دکن کی وحشی قومیں" اور "عہد عثمانی کی تعمیری ترقیاں" بہت دلچسپ ہیں۔ اور نظم میں رابعہ بیگم، انوار اللہ کی نظم "عہد عثمانی میں عورتوں کی ترقی" بہت شگفتہ نظم ہے۔ دوسری غزل نما نظم لطیف النساء بیگم صاجبہ کی ہے۔ جس میں قوم کو درس عمل بھی دیا گیا ہے۔ کتاب میں چار ہاف ٹون تصویریں بھی ہیں اور لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ حجم سو صفحوں سے زائد ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:- ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن۔

مغربی تصانیف کے اُردو تراجم

ہندوستانی زبان میں مغربی کتابوں کے ترجموں کا سلسلہ انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی کوششوں سے شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً دہلی کالج، حیدرآباد دکن، اودھ، علیگڈھ وغیرہ میں ترجموں کے مرکز بنتے رہے۔ اب یہ سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا ہے جس میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، جامعہ ملیہ دہلی، دار المصنفین اعظم گڈھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب کے مصنف میر حسن صاحب نے اردو ترجموں کی مختصر تاریخ سنہ ۱۸۰۰ء سے لیکر ۱۹۱۷ء تک درج کردی ہے اور خاتمے میں ذاتی کوششوں کا ذکر بھی سنہ ۱۹۳۵ء تک کردیا ہے جن کتابوں کا ترجمہ ہوگیا ہے اُن کی فہرست مع نام مترجم دیدی گئی ہے جو بہت مفید ہے۔ اُردو میں یہ کتاب اپنی قسم کی پہلی کتابوں میں ہے۔ اس سے پہلے عرصہ ہوا مرزا سجاد بیگ صاحب دہلوی مرحوم نے حیدرآباد سے الفہرست کے نام سے اسی قسم کی ایک جامع کتاب شائع کی تھی۔ شروع میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے اس کے لئے مقدمہ لکھا ہے۔ اس کا حجم ۱۵۲ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ادارہ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

منگل پربھات[۱]

جب مہاتما گاندھی یروده جیل میں تھے تو وہ گاندھی سیوا آشرم لاہور کے رہنے والوں کی رہنمائی کے لئے ہر ہفتہ منگل کے روز ایک خط لکھا کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی کتاب مہاتما جی کے انھیں خطوں کا مجموعہ ہے۔

---

[۱] حجم ۹۰ صفحات۔ قیمت چھ پیسے۔ ملنے کا پتہ:- سکریٹری شری گاندھی سیوا آشرم شاہدرہ لاہور

اور چونکہ ہر خط منگل کے روز لکھا جایا کرتا تھا، اسلئے اس مجموعہ کا نام بھی "منگل پربھات" رکھا گیا جو بہت موزوں ہے۔ اس چھوٹے سے رسالہ میں مہاتما جی نے ستیہ، اہنسا، برہمچریہ وغیرہ تقریباً چودہ پندرہ باتوں کا اُپدیش دیا ہے جن پر عمل کرنے سے ہر قوم اور ہر فرقہ کا آدمی نفع حاصل کرسکتا ہے۔

گیت مالا[۱]

یہ چھوٹی سی کتاب ستائیس[۲۷] دلچسپ اور جذبات آفریں ہندی گیتوں کا مجموعہ ہے۔ جو مختلف ہندو مسلمان اہل قلم کی تصنیف ہیں۔ صلاح الدین احمد اور میرا جی صاحبان نے ان گیتوں کو مرتب کرکے تین حصہ میں سجایا ہے پریت کے گیت۔ موسمی گیت۔ اور جگ بیتی۔ پہلے حصہ کے گیتوں میں حُسن وعشق، سوز وگداز اور ہجر وارماں کے مضامین ہیں۔ دوسرے میں ساون بھادوں اور دوسری رتوں سے متعلق گیت ہیں۔ اور تیسرے حصہ میں جو گیت ہیں اُن کا موضوع مختلف ہے۔ سب گیت عمدہ ہیں اور لکھائی چھپائی وغیرہ بھی خاطر خواہ ہے۔ ضخامت تین جزو قیمت چھ آنے

نقشے

محکمہ توسیع تعلیم یوپی نے جنگ کے متعلق دو نقشے شائع کئے ہیں۔ ایک میں یوروپ، افریقہ اور مغربی ایشیا کا کچھ حصہ یعنی ایران تک دکھایا گیا ہے اور دوسرے میں تمام یوروپ، فلسطین، شام، ٹرکی وایران دکھائے گئے ہیں، دونوں نقشے دبیز کاغذ پر اُردو میں ہیں اور دیوار پر آویزاں کئے جاسکتے ہیں۔ دونوں نقشے موجودہ جنگ کی رفتار کو سمجھنے کے لئے بہت مفید ہیں۔

ندیم بہار نمبر[۲]

یوں تو صوبہ بہار سے بھی متعدد اُردو پرچے شائع ہونے لگے ہیں لیکن ان میں جو خصوصیت شہر گیا کے ماہوار اُردو رسالہ "ندیم" کو حاصل ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے بعض دوسرے پرچوں کی طرح رسالہ "ندیم" بھی خاص نمبر نکالا کرتا ہے۔ چنانچہ امسال اُس نے "بہار نمبر" کے نام سے جو خاص پرچہ شائع کیا ہے وہ ایک سو چھبیس[۱۲۶] اعلیٰ پایہ مضامین نظم ونثر کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ تقریباً تمام مضامین اچھے اچھے انشا پردازوں اور شاعروں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ مضامین میں بہترین مضمون پاکیزگی زبان اور دلنشین ترکیبوں کے اعتبار سے سید وصی احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر مونگھیر کا مضمون "سپاہی کی بیٹی" ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے بہت ہی خوبصورت پیرایہ میں فارسی اور اُردو کی رام کہانی بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سلیمان ندوی کا "مولینا شبلی اُردو شاعر کے لباس میں"۔ جناب حمید عظیم آبادی کا "بہار میں اُردو"۔ پروفیسر

---

[۱] ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور [۲] قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب رسالہ ندیم گیا۔

"طاہر رضوی ایم۔اے کا" فردوسی و دقیقی"۔ گلاب چاند صاحب بی۔اے کا۔ شاد کا امتیازی رنگ وغیرہ بھی بہت فاضلانہ مضامین ہیں۔حضرت صوفی سبزی کا پانچ شعروں کا قطعہ تاریخ فن تاریخگوئی کی حیثیت سے ایک شاہکار ہے۔ جس کے لفظوں اور مصرعوں کے اعداد کو مختلف طریقوں سے ترتیب دیکر ساڑھے تین سو تیس تاریخیں نکلتی ہیں۔اس نمبر میں مختلف قسم کی بینتالیس رنگین دو ٹو بلاک تصویریں ہیں اور پٹنہ آرٹ کی ایک رنگین تصویر بھی ہے۔بہر حال یہ نمبر بہ حیثیت مجموعی بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔اس کی ضخامت ساڑھے چار سو صفحوں سے زیادہ ہے۔قیمت دو روپیہ

ادب لطیف کا افسانہ نمبر

یہ تقریباً چالیس، مختصر افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جس میں بعض طبع زاد اور بعض ترجمے ہیں۔طبعزاد افسانوں میں مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ افسانہ "بھوجائی کا ڈاکخانہ" بہت ہی دلچسپ ہے اور "گل پژمردہ" کے نام سے حضرت صادق الخیری صاحب ایم۔اے کا ترجمہ بھی بہت قابل قدر ہے۔علی عباس حسینی صاحب ایم اے کے "ردعمل" کی زبان اتنی پیاری ہے گویا سطریں نہیں ہیں موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ال احمد صاحب کا افسانہ "ماں کی گود" بہت دلچسپ ہے اور ماہر القادری صاحب کا مضمون "افسانہ و زندگی" حکیمانہ و فاضلانہ ہے۔ کہیں کہیں نظم کی چاشنی بھی اس مجموعہ میں موجود ہے۔امین حزیں۔اور آثر لکھنوی صاحبان کی غزلیں بہت بلند پایہ ہیں۔چغتائی کی افسانہ نگاری پر سید بادشاہ حسین صاحب کا تبصرہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔غرض یہ نمبر بہ حیثیت مجموعی بہت دلچسپ ہے۔لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ضخامت ۱۶۶ صفحات۔

پنجاب فروٹ جرنل

پنجاب پراونشل کوآپریٹو فروٹ ڈیولپمنٹ بورڈ لاہور کے اہتمام سے "پنجاب فروٹ جرنل" نامی ایک ماہی رسالہ شائع ہوتا ہے۔اس نے بھی اس سال کا سالنامہ شائع کیا ہے جو مضامین کے لحاظ سے فن باغبانی کے متعلق بیش بہا معلومات کا مرقع ہے۔اس سالنامہ میں فن، باغبانی اور مختلف پھلوں کے متعلق چالیس کے قریب بہت پُر معلومات مضامین درج ہیں جن سے باغ لگانے والوں کو بہت سی عملی معلومات معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس میں ترشاوہ، سیب، انگور، آم، کھجور اور بیر وغیرہ کے متعلق بھی بہت قیمتی مضامین لکھے گئے ہیں۔فن باغبانی کے شائقین کو اس کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ ہے۔سالانہ قیمت ۲؎

مست قلندر عورت نمبر

"مست قلندر لاہور" اپنی دلچسپیوں کے لحاظ سے خاص طور پر ہر دلعزیز ہے۔اس نمبر میں جو عورت نمبر کے نام سے شائع کیا گیا ہے ستر کے قریب نظم و نثر مضامین ہیں ان سب کا تعلق کسی نہ کسی رنگ میں صنف نازک سے ہے۔ماہر القادری صاحب کی نظم "عورت" اور مسز علی عباس حسینی ایم۔اے کا مضمون "ظالم عورتیں" بہت خوب ہیں۔اس نمبر میں چند مجرب نسخے۔اور مروجہ قسم کی گئی رنگین تصویریں بھی ہیں۔ قیمت ۶؍

علمی خبریں اور نوٹ

کچھ دنوں سے لاہور سے "داستان" نام کا ایک نیا اور دلچسپ رسالہ خلیل احمد اور بشیر ہندی صاحبان کی اڈیٹری میں شایع ہونا شروع ہوا ہے یہ رسالہ ہندوستانی نوجوانوں کے احساسات کی ترجمانی کیلئے جاری ہوا ہے اسکے تازہ پرچے میں ایک مضمون نگار خاتون نے "ادب میں عریانی" کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں اور بہت صحیح لکھتی ہیں کہ ہمارے دور کے اکثر نوجوان افسانہ نگار عریانی کے آرٹ سے تو واقف نہیں ہوتے البتہ جاپانی کیلنڈروں کی عریاں تصویریں اُنکی نگاہ میں ہوتی ہیں۔ اسلئے اسی تصویریں وہ افسانہ نگاری کئے چلے جاتے ہیں اور انکی افسانہ نگاری حد درجہ افسوسناک ہوتی ہے اُن کے عشق و محبت کے اکثر افسانے نہ صرف بیہودہ اور لغو بلکہ فحش بھی ہوتے ہیں خاتون موصوفہ نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ عورت و مرد کا تعلق ایک ایسا نازک اور لطیف رشتہ ہے جو بیحد مرغوب اور لطافت انگیز بھی ہوسکتا ہے اور الفاظ کے جامے کے ساتھ ہی بیحد گھناؤنا اور نفرت انگیز بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور اسی پر آرٹ کی عریانی اور غیر عریانی کا مدار ہے۔ کم ظرف اور خالی الذہن افسانہ نگار اکثر اوقات اپنی ہی رو میں بہہ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عریانی کے ساتھ بہیمیت کا ذکر کرکے اُنھوں نے آرٹ پر کرم کیا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ وہ لٹریچر کے مقدس نام پر سیاہ داغ لگاتے ہیں" کاش ہمارے افسانہ نگار اس رائے پر غور فرمائیں۔

حال میں اردو افسانہ نگاروں سے ہمعصر لیڈر الہ آباد کے ایک نامہ نگار نے شکایت کی ہے کہ وہ اکثر حسن و عشق کے قصّے لکھتے وقت مذہبی تعصب کا ثبوت دیتے ہیں عشق و محبت میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہوتی اور مختلف مذہب رکھنے والے لوگ بھی بعض اوقات عشق کے دام میں پھنس جاتے ہیں لیکن نامہ نگار موصوف کی شکایت یہ ہے کہ اردو افسانوں کے عاشق اکثر ایک ہی مذہب کے لوگ دکھائے جاتے ہیں اور اُنکی محبوبہ عموماً دوسرے مذہب کی لڑکیاں ہوتی ہیں اردو افسانوں کا یہ پہلو عرصہ سے لوگوں کو کھٹک رہا ہے مگر اب مختصر افسانوں کی رواج یہ شکایت پہلے سے بڑھ گئی ہے ہماری رائے میں اس بارے میں کسی کو بہت ذکی الحس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ باتیں کسی فرقہ یا ملت کے لئے مخصوص نہیں ہیں اور واقعاتی دنیا میں ہر طبقہ میں ہر قسم کی مثالیں موجود ہیں لیکن اردو ادیب اس شکایت کا لحاظ رکھیں تو یہ اُن کے حسن و اخلاق کی دلیل ہوگی۔ ایڈیٹر صاحبان بھی اس بارے میں عام جذبات کا بہت کچھ احترام کرسکتے ہیں۔

آگرہ میں جامعہ اردو کے نام سے ایک نئی تعلیمی مجلس قائم ہوئی ہے جس کے روح رواں ہمارے مکرم محمد طاہر رضا صاحب فاروقی (آگرہ) ہیں۔ اس جامعہ کے صدر نواب صاحب چھتاری اور امیر مجلس رائٹ آنریبل ڈاکٹر سپرو صاحب اور نائب امیر مولوی عبدالحق صاحب ہیں انتظامی کمیٹی میں یونیورسٹیوں کے اردو ڈپارٹمنٹ کے صدر اور انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ اور بعض دیگر تعلیمی جماعتوں کے نمایندے شامل ہیں۔ اس جامعہ کی نگرانی میں ہر سال اردو کی اعلیٰ قابلیت کے تین امتحانات "ادیب"، "ادیب ماہر" اور "ادیب کامل" کے نام سے ہوا کریں گے مزید حالات پروفیسر محمد طاہر ایم اے رجسٹرار جامعہ اردو آگرہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

صوبہ بہار کی ہندوستانی کمیٹی نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں کے ترجمے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جس نے جغرافیہ، حساب، الجبرا وغیرہ کی اصطلاحیں تیار کرلی ہیں اور عام رائے معلوم کرنے کے لئے انکو ملک کے اکثر اہل علم کے پاس بھیجدیا ہے۔ ان اصطلاحوں کو سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کمیٹی نے جو نئے الفاظ وضع کئے ہیں ان میں سے اکثر بھدّے اور نامانوس ہیں اور ادبی و تعلیمی دونوں حیثیتوں سے مقبول عام ہونیکے مستحق نہیں ہیں ہماری رائے میں کمیٹی کو اس بارے میں بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے کام کرنا چاہیئے۔

راجہ صاحب محمود آباد اور انکے برادر گرامی راجکمار صاحب محمود آباد اردو ادب کے بڑے سرپرست و قدر دان ہیں چنانچہ انکی عنایت و توجہ سے ریاست محمود آباد میں تصنیف و تالیف کا ایک محکمہ قائم ہے اور اس وقت تک اس دار التصنیف و تالیف کے انتظام و اہتمام سے کئی قابل قدر کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور عنقریب ہی لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت ظریف کا مجموعہ کلام بھی شایع ہونے والا ہے اس کی ترتیب کا کام جناب صفی لکھنوی کے زیر نگرانی ہو رہا ہے

کانگریس گورنمنٹ نے صوبہ متحدہ کی ہندستانی اکیڈمی کی از سر نو ترتیب کیلئے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی جس سے اس مسئلہ پر بھی رائے طلب کیگئی تھی کہ ہندی اور اردو دونوں کو ایک زبان کی حیثیت دیجاسکتی ہے یا نہیں، کمیٹی کے ممبران مسٹر کرن سنگھ کین پارلیمنٹری سکریٹری تعلیم۔ خان بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن صوبہ اور پنڈت گوبند مالویہ ممبر اسمبلی تھے سنا جاتا ہے کہ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ اردو ہندی دونوں کو علحدہ علحدہ ترقی کرنیکا موقعہ دیا جائے اور اس سوال کو کہ یہ دونوں کبھی ایک زبان کی حیثیت اختیار کرسکتی ہیں یا نہیں آیندہ کے لئے اٹھا رکھا جائے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ کمیٹی نے اکیڈمی کی موجودہ ساخت میں ترمیم اور کمیٹی کارکن کی توسیع کی سفارش کی ہے۔

اور یہ بھی رائے دی ہے کہ آیندہ سے اکیڈیمی خود کوئی کتاب شایع نہ کرے بلکہ مصنفین کو اچھی اچھی تصانیف کی دعوت اور انعامات دیکر ان کی حوصلہ افزائی کرے۔

ان سفارشوں پر کیا کاروائی ہوئی اسکا تو کچھ پتہ نہیں لیکن شروع سال سے ڈاکٹر تاراچند صاحب کے بجائے مسٹر کاظمی انسپکٹر مدارس قسمت الہ آباد اکیڈیمی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ جہانتک ہمکو معلوم ہے فی الحال اکیڈیمی معطل سی ہے۔ البتہ اس کا ماہی رسالہ اب بھی جاری ہے۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو امیدیں اس اکیڈیمی سے وابستہ کی گئی تھیں یا جن خیالات کو پیش نظر رکھکر سر ولیم ہیریس کے عہد حکومت میں یہ اکیڈیمی قائم ہوئی تھی وہ پوری نہیں ہوئے اور اکیڈیمی بھی ایک سرکاری محکمہ کیطرح بیکار کمیٹیوں اور طرح طرح کے قاعدوں اور ضابطوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے ہمارے دوست اور اردو کے مشہور مزاحیہ مضمون نگار مسٹر عظیم بیگ چغتائی کی ایڈیٹری میں "جارچی" نام سے ایک مزاحیہ رسالہ جاری ہونیوالا ہے جسمیں اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں کے مزاحیہ مضامین افسانے اور ڈرامے شایع ہوا کریں گے۔ قیمت تین روپیہ سالانہ تجویز کیگئی ہے۔ شائقین دفتر کتابت جودھپور سے خط کتابت کریں۔

حیدرآباد دکن کے مشہور علم دوست امیر نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں "مجلس اشاعت دکنی مخطوطات" کے نام سے ایک اشاعتی دفتر قائم کیا گیا ہے جس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد ہیں۔ اس مجلس کے اہتمام سے اتبک قدیم دکنی زبان کی ایسی چھ بلند ادبی کتابیں شایع ہو چکی ہیں جو صرف نایاب مسودات کی صورتمیں موجود اور عوام کی دسترس سے باہر تھیں یہ کتابیں متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے کے بعد فرہنگ کے ساتھ باتقریر شایع کی گئی ہیں اب ان کے علاوہ عنقریب ہی آٹھ کتابیں اور شایع کیجانیوالی ہیں انمیں ملک الشعرا نصرتی کا گلشن عشق اور علی نامہ (تصنیف ۱۰۶۸ ہجری و ۱۰۷۶ ہجری) کلیات محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد اور کلیات شاہ سراج اورنگ آبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ملک محمد اسلم خاں صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا لاہور کی صاحبزادی سلیمہ بیگم صاحبہ منشی دوارکا پرشاد صاحب طالب بنارسی کی نظموں کا ایک مجموعہ تیار کر رہی ہیں۔ طالب صاحب کا کلام زیادہ تر اردو کے پرانے رسالوں میں موجود ہے اسلئے اسکا جمع کرنا مشکل ہو رہا ہے چنانچہ صاحبزادی صاحبہ چاہتی ہیں کہ جن صاحبوں کے پاس طالب صاحب کے کلام کی نقل ہو یا جنکو طالب مرحوم کے عزیزوں کا پتہ معلوم ہو جن سے ان کا کلام مل سکے وہ براہ مہربانی محمد وحید سے نمبر ۲ مشن روڈ لاہور کے پتہ پر خط کتابت کریں

اردو کی بزم ادب پرانے ادیبوں سے خالی ہوتی جاتی ہے۔ پچھلے چند ماہ کے اندر بھی کئی مشہور و معروف انشاپرداز و مصنف ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے۔ مولانا احسن صاحب مارہروی کی وفات وطن سے دور پٹنہ میں واقع ہوئی جہاں آپ علاج کی غرض سے تشریف لیگئے تھے لیکن افسوس وہاں سے واپس نہ آسکے آپ حضرت داغ دہلوی کے شاگرد اور علمی فضیلت کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے تھے اور ادبی حلقوں میں استاد داغ کے جانشین سمجھے جاتے تھے انکی ساری عمر علم و ادب کی خدمت اور تصنیف و تالیف ہی میں گذری اسکے علاوہ بیس سال تک آپ نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد کی حیثیت سے بھی اردو کی تعلیم و توسیع میں نمایاں حصہ لیا صحت زبان اور تحقیق الفاظ کے متعلق آپ کی رائے اکثر قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی آپ نے اردو نثر کی ایک متند تاریخ اور رقعات غالب کا ایک مشرح ایڈیشن اپنی یادگار چھوڑا ہے اور "احسن الکلام" کے عنوان سے اُن کے بلند پایہ اشعار اردو کے اکثر رسالوں میں شایع ہوتے رہتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ اپنا کل وقت تصنیف و تالیف کی نذر کرنیکا ارادہ کر رہے تھے مگر افسوس موت نے مہلت نہ دی زمانہ پر بھی آپ کی ہمیشہ عنایت خاص رہا کرتی تھی چنانچہ آپ کا ایک تنقیدی مضمون جو کئی ماہ سے ہمارے پاس امانت رکھا ہوا ہے عنقریب ہی ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا انکی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں مگر افسوس اب سب خاک میں مل گئیں۔ اسی طرح ریاست حیدرآباد کے راجہ راجیشور راؤ اصغر والی تمساں دوم گنڈہ کی وفات بھی اردو و ادب کیلئے ایک اہم سانحہ ہے مرحوم عربی فارسی سنسکرت ہندی اردو زبانوں کے عالم و فاضل تھے اور آپ کا شمار ادب کے خاموش مگر حقیقی خدمت گذاروں میں تھا آپ نے اپنی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف کر دی اور کئی قابل قدر تصانیف اور ترجمے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں، انمیں آپ کی جدید عربی اور جدید فارسی کی فرہنگیں اور ہندی لغت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ نے رامائن اور مہابھارت کے مقبول عام ترجمے بھی کئے۔ افسوس آپ کے انتقال پرملال سے شاندار ادبی خدمات کا ایک قابل قدر سلسلہ ختم ہو گیا

دو موتیں اور بھی بہت افسوسناک ہوئیں نواب احمد یار خانصاحب دولتانہ پنجاب کے چیف پارلیمنٹری سکریٹری ایک ہر دلعزیز مدبر اور اردو کے اچھے شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے آپ کے اشعار میں اکثر آپ کے سیاسی جذبات کی جھلک نمایاں رہتی تھی ذاتی حیثیت سے وہ بڑے فراخ دل اور فیاض طبع رئیس تھے اور اردو کے بڑے حامی و قدردان تھے۔ افسوس آپ کی عمر نے وفا نہ کی۔ ابھی آپ کی سیاسی زندگی کا عروج شروع ہی ہوا تھا کہ بیوقت کی موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

پچھلے ستمبر میں لاہور میں مسٹر راجیشور پرشاد زیبا کی صرف ۳۷ سال کی عمر میں وفات بھی ایک سانحۂ عظیم ہے

ریاض احسن نہایت ذہین اور طباع نوجوان تھے انھوں نے لاہور اور دہلی کے اکثر اخباروں کی ایڈیٹری کے فرائض بڑے خوبی سے انجام دیئے اور فتح - ہندوستان - وطن - تیج - سوراج - گلدستہ - رفیق التعلیم دیش اور بھارت وغیرہ متعدد اخبار اور رسالوں کے ذریعہ اردو کی قابل قدر ادبی خدمت کی - آکاش بانی اور ستارہ نام کے دو رسالے خود بھی جاری کیئے شعر و سخن سے بھی انھیں خاص ذوق تھا - چنانچہ انھوں نے بہت سی نظمیں لکھیں غزلیں کہیں - کتابیں تصنیف کیں اور ترجمے کیئے اور ناٹک بھی لکھے مگر ملک کی عام ناقدری کی بدولت کہیں پہنچنے نہ پائے انکی اکثر چیزیں اُن کے نام سے نہیں بلکہ دوسرے شہرت طلب اصحاب کے نام سے شایع ہوئیں ان دل شکن واقعات سے ملول خاطر اور بد دل ہوکر انھوں نے زندگی کو ایک خشک و طویل سفر سمجھ لیا اور اسی خیال میں محو رہنے لگے کبھی کہیں چلے گئے اور کبھی کسی اور جگہ جا نکلے اسطرح دہلی - جھانسی - رڑکی ہوتے ہوئے آپ پھر لاہور پہونچ گئے - یہی اُن کا آخری سفر تھا - اور یہیں اُن کا سفر حیات ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا - افسوس : - اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

گورنمنٹ نے امسال نامور اردو ادیب و محقق علامہ تاجور کو شمس العلما کا گرانقدر خطاب دیکر اپنی علمی قدردانی کا ایک دل خوش کن ثبوت دیا ہے جسپر ہم اپنے محترم دوست اور قدر شناس وزیر اعظم پنجاب دونوں کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں - علامہ تاجور فارسی عربی کے بلند پایہ ادیب ہونے کے علاوہ علوم قرآن اور فقہ پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں - اردو ادب کی بھی انھوں نے عظیم الشان خدمت کی ہے ادبی دنیا اور شاہکار اور لاہور کے کئی اور قابل قدر رسالے انھیں کی کوششوں سے وجود میں آئے ہیں اردو مرکز لاہور بھی انکی ادبی خدمات کا رہین منت ہے اور اردو ادب کے منتخبات کی تیس جلدوں میں جو اس مرکز سے شایع ہوئی ہیں آپ نے صدیوں کے لٹریچر کو نچوڑ کر جمع کر دیا ہے

تصحیح ہمکو افسوس اور ندامت ہے کہ زمانہ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء میں ڈرامہ "فریب" کے مصنفہ کا نام غلط چھپ گیا ہے صحیح نام صغیر بیگم صاحبہ نہیں بلکہ محترمہ صفیہ بیگم عبدالواجد صاحبہ ہے - ناظرین تصحیح فرمالیں -

اسیطرح صفحہ ۱۶۶ پر نظم "کرشن جی" کا دوسرا شعر غلط چھپ گیا ہے کلیم صاحب کا اصل شعر یہ تھا -

دیدہ ی جمال نے شکست کرشن کا ایک بھیس تھا کھیل رہا جلال تھا کنس کے ترک و تاز میں

اسی نمبر میں یعنی زمانہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء کے صفحہ ۱۹۰ پر کلام حسرت کے ذیل میں دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ غلط چھپ گیا ہے صحیح مصرعہ یہ ہے

لیکے ہر جان کا شکیب جھُکی کرکے ہر دل کو بے قرار اٹھی

جھُکی کی جگہ "جھکی" غلط چھپ گیا ہے - ناظرین نوٹ فرمالیں

مراسلات

فلسفۂ دہریت

(از حضرت فراق گورکھپوری)

ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء کا "زمانہ" ملا۔ اس کا پہلا مضمون بہ عنوان "کون سی راہ" جس کے لکھنے والے نے اپنا نام نہ دے کر اپنے کو صرف "ایک حقیقت پرست" لکھا ہے دیکھکر جی بہت خوش ہوا۔ میں بھی ایک مدت سے دنیا کے لئے اور خاصکر ہندستان کے لئے مادیت اور دہریت کے فلسفہ کی بڑی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ جہاں تک عربی فارسی اور اردو شاعری کا تعلق ہے۔ اس فلسفہ کے کچھ پہلوؤں پر ضرور روشنی ڈالی گئی ہے۔ کفر، گناہ، رندی اور مستی، شراب اور عشق مجازی، صنم خانوں کے جلوے، خشک مذہبیت کے خلاف نعرہ زنی کے ثبوت ہیں۔ لیکن کفر و ایمان کی اس نوک جھونک میں ایک مہذب تعیش پرستی زیادہ نمایاں تھی اور سنجیدہ اور فلسفیانہ تفکر کی جھلک بہت کم نمایاں تھی۔ خدا ایک قایم بالذات وجود ہے اور روحیں قریب قریب قایم بالذات وجود ہیں۔ یہ عقیدہ اور ایمان قریب قریب ہر شاعر کا رہا ہے۔ مادی دنیا کی توہین تو ہمارے شعرا نہیں کرتے تھے لیکن اسے عموماً کسی غیر مادی روحانی وجود کا جلوہ یا ایک حسین دھوکا تصور کرتے تھے۔ ہندوستان میں گوتم بدھ نے سرے سے خدا، روح اور مادہ سب سے انکار کیا اور سنسار کو ایک ہستی نما نیستی قرار دیا جس میں ہر تموج اور ہر سانس کے ساتھ گتھیاں پڑتی جاتی ہیں ہستی سراسر جھوٹھ اور دکھ ہے، یہاں تک کہ سکھ بھی دکھ کی ایک شکل ہے اس لئے نجات ہستی دکھ اور سکھ سب سے نکل کر نیست ہو جانے میں ہے۔ لیکن جدید سائینس اور فلسفہ نے مادہ کی جو ماہیتیں دریافت کی ہیں ان سے فلسفۂ مادیت اور دہریت کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ ہم میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ ہم ایک شخصی یا غیر شخصی خدا کے وجود سے انکار کریں۔ روح کے وجود سے انکار کریں، صرف مادے کا وجود مانیں اور مادے کے حیات بخش تصور سے نئے عقائد، نئے اخلاق، نئی تہذیب قائم کریں اور اپنے شعور کی پوری پوری تشفی کریں۔ اس فلسفہ کی سچائی کے احساس سے متاثر ہو کر میں نے ادھر بہت سے اشعار کہے ہیں جنھیں "زمانہ" کی خدمت میں پہلی بار حاضر کر رہا ہوں۔ یہ اشعار پچھلے کئی سال کے غور و فکر کے نتیجے ہیں۔

یہ خدا خوب ہے ترا۔ لیکن ۔۔۔ کوئی دنیا ہے وہ جو خود نہ بنے ؟

ترے لئے ہو تصور خدا کا نا ممکن ۔۔۔ جو مادے کی طہارت کا ہو تجھے احساس

مادے کی لطافتوں کے نام ۔۔۔ ہیں کئی جیسے روح اور خدا

یہ عالم خیزیاں، خلاقیاں ہیں سب عناصر کی ۔۔۔ وہ دنیا کوئی دنیا ہے خدا پیدا کرے جس کو

خدا کو اہل جہاں جب بنا چکے تو فراق ۔۔۔ یہ بول اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

خدا پہ تو ایمان لانا ہے سہل ۔۔۔ مگر مادے کا سمجھنا محال

مادے پہ لا سکیں جو ایمان اگر ۔۔۔ ذرے ذرے سے کھل اٹھیں جنتیں

مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے — نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے

نئے خیال کی تکلیف، الاماں، کہ حیات — تمام زخم نہاں ہے تمام نشتر ہے

دہریت کو تو نے کیا سمجھا فراق — سر بسر ہے، یہ طہارت قلب کی

تھے جو محوِ شہود وہ بھی فراق — مادّے سے دو چار ہو نہ سکے

آسمانی خدا ترا ایمان — کیا تو جانے زمین کی عظمت

اِس مادّی دنیا پر ایمان نہ کیوں لاؤں — کیفیتیں بنتی ہیں اخلاق سنورتے ہیں

ارے یہ ہم ہیں کہ معراجِ آب و گل ہے فراق — حیات کہتے ہیں جس کو ہے مادّے کا نکھار

نہ پوچھ مادّی دنیا کی جلوہ سامانی — فراق ایک چکاچوند سی ہے روح کو آج

مذہب کی حکومت تھی، دولت کی حکومت ہے — اب دیکھ حکومت کب ہوتی ہے محبت کی

کائنات کی خاطر نیستی و ہستی ہے — ہم مٹیں تو یہ دنیا پھر بنے نئے سر سے

نیست ہو جانے کا غم کیا۔ ارتقائے دہر ہے — نت نئی انسانیت کی شکل میں جلوہ نما

نسل انسانی بدلتی جا رہی ہے بے دریغ — اگلی روحیں مٹ کے عالم کو بناتی ہیں نیا

مٹ، کہ دنیا ہو پھر نئی دنیا — اِک حماقت ہے تیری فکر دوام

زندگی کو خدا سے کیا نسبت — زندگی خاک و خوں کا آگنا ہے

عجیب جلوے ہیں ان پر ہستی نہ کیوں آئے — حماقتوں کے چمکنے کا نام جنت ہے

سمجھے گی نہ یہ راز تو مٹ جائے گی دنیا — اخلاق کو مذہب سے سروکار نہیں کچھ

"دنیا میں ہندو اور مسلماں رہنے کے دن بیت گئے — یہ اہل جہاں سے کہہ دے کوئی مذہب چھوڑیں انسان بنیں

بے شمار روحوں کے واسطے نہیں ہستی — ارتقائے ہستی کی منزلیں ہیں یہ روحیں

ہم کو دوام ہو تو تمہارے جہاں کو کون — تجدید کائنات ہماری فنا سے ہے

تو عمر جاوداں کا تصور تو کر ذرا — اس قید محض کی کوئی میعاد ہی نہیں

فنا فی اللہ ہونا سہل سی اک خود فریبی ہے — فنا فی المادّہ ہونا ذرا مشکل سے آتا ہے

واصل بخدا ہونا اک سہل پسندی ہے — واصل بجہاں ہونا ہے ہمّتِ مردانہ

نہیں صدائے انا الحق میں اب کوئی خطرہ — انا الجہاں کے ہیں نعرے پیامِ دار و رسن

کفر کی صورتیں ہزاروں ہیں — ایک اُن میں خدا پر ایمان بھی

خوفِ خدا یا عشقِ خدا ہو بات تو دونوں ایک ہوئی
ایک غلام کا اک آقا سے عشق اور خوف برابر ہے

خدا پر بھروسا بہت سہل ہے — ہے خود اعتمادی ذرا ٹیڑھی کھیر

پہلے خدا کا چھوڑ سہارا — درسِ عمل آسان نہیں ہے

رُباعی

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے — دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے

ہاں میکدۂ جہاں کا ذرّہ ذرّہ — سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے

میر انیس کی ایک غزل اور حقیقت حال

(از مسٹر ارشاد فاطمی بی۔ اے)

کئی ماہ ہوئے رسالہ زمانہ میں میر انیس مرحوم و مغفور کی ایک غزل چھپی تھی چند روز سے جد مرحوم حضرت شاد کا ایک غیر مطبوعہ قلمی نسخہ میرے زیر مطالعہ ہے۔ یہ "فکر بلیغ" کا دوسرا حصہ ہے جسمیں جناب شاد نے تمام مرثیہ گو حضرات کا مفصّل تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ میر انیس مرحوم کے حال میں مندرجہ ذیل واقعہ درج کرتے ہیں جس سے میر انیس کی شائع شدہ غزل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اسے مہربانی فرماکر آپ رسالہ زمانہ میں جگہ دیدیں تاکہ ایک نئی بات کا انکشاف ہو۔

جناب شاد نے جس مشاعرہ کا تذکرہ کیا ہے وہ مغلپورہ واقع پٹنہ سٹی میں ہوتا تھا اور وہ اُس زمانے کی باتیں کہہ رہے ہیں جب میر انیس مرحوم خود پٹنہ عظیم آباد تشریف لائے تھے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای کے ہاں قیام پذیر تھے۔

حضرت شاد اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک دن بعد دوپہر میر انیس پلنگ پر دلائی لپیٹے سو رہے تھے۔ میں اور سید سلطان میرزا میر مونس کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں مشاعرہ کا تذکرہ ہوا۔ میں نے کہا کہ بعد چہلم یہاں مشاعرہ ہونیوالا ہے۔" وہ شب کو بام پہ اپنے رہے قمر کی طرح" یہی طرح ہے۔ کچھ غور کر کے میر مونس نے مطلع کہکر پڑھا ؎

کچھ آج شام سے چہرہ ہے فق سحر کی طرح ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح

اُن کے ارشاد پر راقم الحروف نے بھی ٹوٹے پھوٹے تین چار شعر کہے۔ میر مونس کے سب شعر تو یاد نہیں دو شعر یاد ہیں

بُلا تو بھیجئے دوری ہے آپ کے نزدیک ابھی پہونچتے ہیں ہم ڈاک میں خبر کی طرح

یہ بوسۂ لب شیریں نے تلخ کی ہے حیات کہ بند بند کو باندھے ہوں نیشکر کی طرح

اتنے میں میر انیس اُٹھ بیٹھے۔ صاحب سلامت مزاج پرسی کے بعد پوچھا کہ آپ لوگ شعر کہہ رہے تھے میں سنتا تھا۔ مجھ بڈھے کا بھی ایک شعر سُن لیجئے۔

خدا جہاں میں سلامت رکھے تجھے اے قبر کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح

پھر رفع ضرورت کو چلے گئے تو میر مونس نے کہا کہ حضرت کی عادت ہے کہ جب میں شعر کہتا ہوں تو طرح پوچھکر خود بھی ایسا عمدہ شعر کہہ دینگے کہ دوسرے کا جی چھوٹ جائے۔ چنانچہ بنارس سے آتے ہوئے آپ جہاز پر ٹہل رہے تھے میں سلام کہہ رہا تھا پوچھا تو میں نے مطلع کا مصرعہ پڑھا ؎ لہو روتی ہیں آنکھیں مثل گل آنکھوں میں لالی ہے"

آپ نے یہ شعر کہہ دیا:

تباہی میں سفینہ آچکا تھا اُمت جد کا یہ کشتی بحر خوں میں ڈوب کر شبّر نے نکالی ہے

زمانہ

جلد ۷۵ نومبر ۱۹۴۰ء نمبر ۵

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر مرحوم

جناب راجہ نرسنگھ راج صاحب بہادر عالی سررشتہ دار افواج سرکار دکن

ایک ایسی عظیم الشان ہستی کا ذکر خیر کرنا اور ضبط تحریر میں لانا مشکل اور سخت مشکل ہے جس کے لئے ہزاروں کیا لاکھوں انسانوں نے آنسو بہائے ہیں اور جس کی یاد ابھی تک دلوں کو بے چین کئے ہوئے ہے۔ میرے قلم میں یہ طاقت کہاں کہ وہ لکھتے ہوئے لرز نہ جائے۔ میرے دل میں یہ ہمت کہاں ہے کہ میں اپنے اس محسن بزرگ عنایت فرما کے حالات خاطر خواہ لکھ سکوں۔ عالی جناب سر مہاراجہ بہادر کے تعزیتی جلسے ہر طبقہ ہر فرقہ میں ہوئے وہیں یاد کیا گیا۔ مگر میری ہمت نہ پڑی کہ میں دو کلمہ بھی اس سانحہ عظیم اور داغ مفارقت دائمی سے متاثر ہونے کے بعد زبان سے نکالتا۔ میں نے معافی مانگی اور اس دلخراش روح فرسا فرض کی ادائگی سے قاصر رہا۔ عالی جناب سر مہاراجہ آنجہانی کو نہ معلوم مجھ سے کیوں اتنی محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا عزیز ترین خیال فرماتے اور ہمیشہ مشفق و محب کے لقب سے افتخار بخشتے تھے۔ مجھے گھنٹوں ان کی ہمکلامی اور ہمنشینی کی عزت حاصل رہی ہے۔ میں انتہائے فخر کے ساتھ یہ عرض کرسکتا ہوں کہ میرا جتنا وقت لطف و اعزاز صحبت مرحوم میں صرف ہوا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے کو میسر ہوا ہو۔ دعوت اور تقریب اور خوشی کے موقعہ پر مجھے ہمراہ رکھا اور ہر تعزیت اور تکلیف میں نزدیکی کا شرف بخشا۔

بہر حال میں اور میرے مرحوم بھائی محبوب راج محبوب کو یہ طرۂ امتیاز رہا۔ ان وسیع تعلقات کی بناپر اکثر ناواقف اشخاص مجھے مہاراج مرحوم و مغفور کا قرابت دار تصور فرماتے اور قرابت کی صراحت چاہتے

مجھ سے کوئی رشتہ داری تھی نہ کوئی قرابت۔ البتہ محبت کا وہ مضبوط غیر متزلزل اور مستحکم رشتہ تھا جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا اور جس کو دنیا کی کوئی قوی طاقت بھی مٹا نہیں سکتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ داجب التعظیم مہاراج کے خاندان سے مجھے تین پشتوں سے بلحاظ خاندان جدّی و مادری تعلق رہا ہے اور سب سے بڑھکر خصوصیت یہ رہی ہے کہ میرے پرنانا رائے عالم چند مرحوم کو معتمدی پیشکاری کا سالہا سال تک خاص امتیاز حاصل رہا۔ انھوں نے مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی کے لئے اپنی ناچیز خدمات کو ایسے زمانہ میں پیش کیا جبکہ ناموافق حالات زمانہ نے مہاراجہ ممدوح کو نہایت بیدل اور مایوس کر دیا تھا۔ اس کے صلہ میں حسن خدمات کا اعتراف مہاراجہ نریندر صاحب بیکنٹھ باسی نے فرمایا اور ایسی پُرعظمت قدر فرمائی جو آج تک تازہ اور باقی ہے۔ اسی طرح میرے والد مرحوم راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی کو اس خاندان سے اتنی عقیدت اور محبت تھی کہ بعد انتقال مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی یہ ہمیشہ اپنے آقائے ولی نعمت سے اپنے محسن مہاراجہ نریندر کے جانشین مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت آنجہانی کے لئے عرض کرتے اور ہر وقت ان کی خدمت اپنا فرض عین سمجھتے۔ متعدد عنایت نامہ ابھی تک راقم کے یہاں موجود ہیں جو غیر معمولی خاندانی تعلقات کے شاہد ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہی موروثی محبت اور عقیدت مجھے بھی نصیب ہوئی کہ میں مہاراجہ آنجہانی کے تلطفات بیکران کا مورد رہا۔ بخوف طوالت یہاں اُن گذشتہ واقعات کو سپرد قلم نہ کر کے آپ کو اس پاکیزہ صفات بزرگ کے حالات زندگی سناتا ہوں جس کے لئے مجھ سے فرمایش کی گئی ہے۔ قبل آغاز مضمون میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ ممدوح میں اسقدر خوبیاں جمع تھیں کہ ان میں سے ایک ایک کو گنا یا جائے اور اسکی وضاحت کی جائے تو صرف ایک ہی خوبی کا بیان اس مضمون کی تمام جگہ لے لیگا اور اسکے بعد بھی تکمیل نہ ہو سکے گی۔

خاندانی حالات آپ راجہ ہرکشن بیکنٹھ باسی کے فرزند اور مہاراجہ نریندر پیشکار و مدار المہام سرکار عالی کے نواسہ تھے جو مہاراجہ چندولال کے نبیرہ تھے۔ مہاراجہ نریندر کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ تین کروڑ کے پُتلے تھے یعنی ایک کروڑ درس و تعلیم ایک کروڑ زنار بندی اور ایک کروڑ انکی شادی میں مہاراجہ چندولال نے خرچ کیا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی ۱۰ شعبان المعظم ۱۲۸۰ھ ہجری (یعنی ۱۸۶۳ء میں) پیدا ہوئے

"فرزند فرخندہ"

آپ کی تاریخ ولادت ہے۔ بچپن سے آپ ذکی تیز اور خود دار تھے اپنے والد کے گھر رہنے کا آپ کو کم موقعہ ملا۔ نانا کے چہیتے آنکھوں کے تارے تھے۔ مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی کو اولاد نرینہ نہ ہونے سے آپ نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا تعلیم دلائی اور ایسے معقول اساتذہ مقرر کئے جو آپ کو فارسی عربی

فقہ تفسیر منطق اور فلسفہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دیتے رہے۔ آپ کو پڑھنے کا ازحد شوق تھا۔ آپ کے اوقات صبح سے شام تک قابل ترین اساتذہ کی فیض صحبت میں گزرتے۔ آپ کو جسمانی ورزش پھینک بٹہ بنوٹ وغیرہ سکھلانے کے لئے بھی ممتاز اشخاص مقرر کئے گئے تھے۔ کمسنی ہی میں یعنی بعمر تیرہ سال آپ کی والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ جس کا آپ کو ہمیشہ ملال رہا۔ آپ ماں کی محبت کو یاد کرکے اکثر آبدیدہ اور ملول خاطر ہوجاتے تھے۔ خصوص اس واقعہ کا بطور خاص اظہار فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کو کثرت سے چیچک نکل آئی تھی اور زیست کی اُمید باقی نہ رہی تھی۔ آپنے اپنے چہرہ کو اسقدر کھجایا تھا کہ چیچک کے بہت سے داغ پڑگئے تھے ایک روز آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو گود میں لیکر بارگاہ الٰہی میں نہایت منت وزاری کے ساتھ دست بدعا ہوئیں کہ "اے میرے رحیم وکریم مالک اس لڑکے کے چہرے کو بے داغ بنادے۔" آپ فرماتے تھے کہ ایک سال کے اندر آپ کا چہرہ بالکل صاف ہوگیا۔ آپنے تعلیم حاصل کرکے اپنے نانا مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی کی ہمراہی میں امرا اور دیگر معززین کے مجلس ومحفل میں شرکت کی۔ چنانچہ نواب سر سالار جنگ اول کے یہاں ونیز دربار ول میں آپ ہمیشہ شریک ہوتے رہے۔ دربار شاہانہ کی حاضری اور اُمراء کی شرکت نے آپ کو تہذیب اور آداب کا ایک مکمل انسان بنادیا۔ مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی کے حیات میں اور اُس کے بعد آپکے بعض اعزاء جو جانشینی مہاراجہ بیکنٹھ باسی کا خواب دیکھ رہے تھے اور جس کی تعبیر اُن کے حق میں ناموافق اور مضر ثابت ہورہی تھی آپ سے دل ہی دل میں بغض وحسد رکھتے تھے اور تمام ممکن ذرائع سے آپکے پیمانہ زندگی کو قبل از وقت ختم کرنے کی ناکام کوششوں میں لگے رہے۔ آپ پر آگ ڈالی گئی آپ نہ جلے آپ کو زہر دیا گیا آپ کی نانی صاحبہ کو عین وقت پر غذا کا رنگ دیکھکر شبہ ہوگیا اور آپ بچ گئے۔ آپ پر فیر کیا گیا۔ نشانہ خطا کر گیا۔ بہرحال آپ ایک ایسے صاحب تقدیر انسان تھے جس کو قدرت ہی کا ہاتھ بچا رہا تھا۔ بقول ہندی شاعر

"جاکو راکھے سائیاں مار سکے ناکوئے"

ترجمہ (جسکو خدا رکھنا چاہے اس کو کون مار سکتا ہے) قدرت کو اس ہستی کو آفات سے بچاکر بہت سے کام لینے تھے وہ کیسے مرنے دیتی زندہ رکھا اور صحت عافیت کی زندگی بخشی۔ آپ اپنے نانا کے حیات ہی میں بتاریخ ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ[۱] خطاب "راجہ بہادر" سے سرفراز ہوئے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام امراء۔ جاگیردار منصبدار اعلیٰ عہدہ داران سے آپ کی ملاقاتیں اور تعلقات رہے جوالیان پیشکاری سے تعلق رکھتے تھے اور کم وبیش حاضر ہوتے تھے اس کے علاوہ متعدد عالم فاضل افراد شعراء اور حکما سے روز کی ملاقاتیں رہتیں اور لطف سخن ومجلس رہتا۔ آخر ۱۲ رماہ رمضان ۱۳۰۶ھ کی تاریخ آئی جس روز مہاراجہ نریندر نے رحلت فرمائی۔ آپکے لئے یہ دن سخت مصیبت کا تھا۔ باوجودیکہ مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باسی نے

---

[۱] مطابق ۱۸۷۴ء ۲ و ۱۳ رمئی ۱۸۸۹ء

سرکار و نیز دیگر امرا میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو اپنا جانشین وارث قرار دیدیا تھا۔ مگر بعض دشمنوں کی کوششیں اور انھیں چند عہدہ داروں کی حمایت نے اس مسئلہ کو اسقدر پیچیدہ بنادیا تھا کہ حسب رسم و رواج ہنود مہاراجہ آنجہانی کو بروز تجہیز و تکفین آگ دینے سے روکنے کی کوشش کی گئی اور اعلیٰ ترین حکام سے عین وقت پر خلاف حکم حاصل کیا گیا۔ مگر "بھاری کا ہو سے نہ ٹرے" کی مصداق ہو دیر ہونے اور اکثر معززین کی رائے سے میت اٹھائی گئی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے کفن باندھا اور رواج ہنود کے موافق آگ دی۔ انتقال مہاراجہ نریندر بہادر کے بعد سے آپ کا دور زندگی رنج اور پریشانیوں میں مبدل ہو گیا آپ کا سکون جاتا رہا بفکری نے ساتھ چھوڑا۔ بہر صورت آپکے یہ چار سال بہت کٹھن گذرے۔ مقابلوں سے دو چار ہونا پڑا۔ آپ بلا کے علو ہمت اور مستقل مزاج تھے اور کبھی نہیں گھبرائے۔ ہمیشہ مالک حقیقی کا بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے مالک مجازی کی رضا جوئی پر اپنی زلیست کی کشتی کو چھوڑ دیا۔ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ مصیبتیں یکے بعد دیگرے گن گن کر آئیں۔ دوست دشمن اور اپنے پرائے بن گئے مگر انھیں اسکی پروا نہوئی اور نہ انھوں نے کبھی ہمت کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اسی زمانہ میں عادتاً آپ کا ملین اور اہل دل بزرگوں کی خدمت دل سے کرتے تھے۔ آپ کو دنیا کے کسی رشتہ اور تعلق سے جب تسکین کی صورت نظر نہ آئی تو اس تعلق اور رشتہ نے آپ کے دل کو بہت ابھارا۔ آپ کو ان مقدس واجب التعظیم ہستیوں میں بعض ایسے شفیق ملے جنکو آپ عمر کے آخری دن تک فراموش نہ کر سکے۔ انھیں مشاہدات اور تجربات نے آپ کو ان کا اتنا راسخ الاعتقاد بنادیا تھا کہ آپ اسکے خلاف کبھی کسی کی نہ سنتے تھے اور سنتے بھی تو اس پر مطلق اعتبار نفرما اور رتی برابر بھی اپنے عقیدہ سے نہ ہٹتے۔ چنانچہ اسی کے یہ اثرات تھے کہ آپنے بزرگوں کے اقوال پر عمر بھر بھروسہ کیا۔ یہ چار سالہ دور در اصل وہ تھا جس نے آپ کو مکمل انسان بنایا تھا۔ آپ مصیبت نہ اٹھاتے تو دوسرے مصیبت زدوں کے دکھ درد میں حصہ نہ لیتے۔

انسان مصیبت اور تکالیف کے بغیر کسی طرح زندگی کی تکمیل نہیں کر سکتا، عاشقان خدا اسی مصیبت میں لطف زندگی کا مزہ لیتے اور اسکو جان سے پیارا سمجھتے تھے۔ ان کو راحت زہر اور مصیبت آبحیات معلوم ہوتی تھی۔ یہ راحت کو عارضی، نقصان رساں اور خدا سے بچھڑا دینوالا سمجھتے ہیں اور اسکو کوستے ہیں انھی کی زبان سے سنئیے

"سکھ کے ماتھے سل پڑو سب ہردے سے جائے"

"بلہاری وا دکھ کے جو چھن چھن نام جپائے"

ترجمہ:- راحت کے سر پر سل گرے اور یہ سب دلوں سے کافور ہو جائے ہم اس مصیبت پر قربان

جاتے ہیں جو ہر لحظہ یادِ الٰہی کا باعث بنے۔" مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی نے اسی زمانہ کے بعد تصوف کے بیش بہا مستقل رنگ میں غوطہ لگایا کہ جس کے بعد ان پر کسی محدودیت اور تعصب کا کوئی مذہبی رنگ نہ چڑھ سکا اور آخر آپ دنیا میں ایک بلند پایہ اور بلند مرتبہ انسان بصورت امیر یہ خیالات فقیر نظر آئے۔

آپ کا یہ دور پریشانی ۲ رجب ۱۳۱۰ھ[1] کو ختم ہوا اور آپ کے آقا محبوب جہاں حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ نے اپنی قدما پرور ذرہ نواز نظر سے آپ کو موروثی خدمت پیشکاری سے سرفراز فرمایا اور خلعت عطاء فرمائی۔ اب آپ کی غیر معمولی قابلیت نے جہاں اپنے مالک کے دل میں جگہ کر لی تھی وہاں آپ کی وفاشعاری رضا جوئی، بہی خواہی اور جاں نثاری کے اوصاف نے ایک ایسا درجہ حاصل کر لیا تھا کہ جس کی مماثل کوئی اور ہستی امرا میں پیش نظر ملک و مالک نہ تھی۔ آپ صدر المہام فوج اور وزیر افواج کے خدمت جلیلہ سے ۱۸ اسفندار ۱۳۰۲ف[2] کو ممتاز کئے گئے ۲۰ رمہر ۱۳۱۰ف[3] تک آپ نے اس خدمت کو انجام دیا اس کے بعد ذمہ دارانہ اہم ترین خدمت مدار المہامی سے ۱۰ رجمادی الاول ۱۳۱۹ہجری[4] مشرف ہوئے جس کا آپ کے مورثین مہاراجہ چندو لال اور راجہ رام بخش جیسے ممتاز و مشہور ہستیوں کو سالہا سال فخر رہا۔ اور جن کی سندیں آج تک ریاست کے بڑے بڑے خاندانوں کے لئے ماحصل زندگی بنی ہوئی ہیں۔ زمانہ مدار المہامی میں آپ نے ہمیشہ اپنے مالک کی رضا جوئی کو خدمت شہرت اور عزت پر برتری دی اور اسی سے آپ کی خدمات بیحد پسندیدہ اور مقبول پیشگاہ سلطانی ہوئیں۔ آپ اس خدمت جلیلہ پر ۲۵ رجب ۱۳۳۰ھ[5] تک مامور رہے اور خود مستعفی ہوئے۔ آپ کے خطابات کی تفصیل یہ ہے:۔

راجہ بہادر۔ ۶ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ۔ موقع سال گرہ مبارک (۱۸۷۴ء)

راجہ راجایان۔ ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ۔ موقع سال گرہ مبارک (۱۸۷۴ء)

یمین السلطنت ۱۸۹۴ء جشن جوبلی حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ ۱۸۹۴ء

سی۔ آئی۔ ای)
جی۔ سی۔ آئی۔ ای) } (از سرکار عظمت مدار برطانیہ)

بھارت بھوشن۔ قومی خطاب۔ از بنارس

ال۔ ال۔ ڈی۔ از جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۳۸ء

آپ پہلے مدار المہام گذرے ہیں جن کی مدار المہامی میں نواب وائسرائے لارڈ کرزن بہادر نے بمعیت حضرت بندگان عالی غفران مکان علیہ الرحمۃ آپ کی ڈیوڑھی سے محرم کی پانچویں تاریخ

---

[1] ۲ مئی مطابق ۱۲ جولائی ۱۸۹۳ء [2] ۲۶ اگست ۱۹۰۱ء مطابق ۱۲ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ [3] ۲۵ اگست ۱۹۰۱ء

کا لنگر ملاحظہ فرمایا۔

خدمت مدار المہامی سے ہٹنے کے بعد آپ نے طویل سفر پنجاب۔ دہلی۔ بمبئی۔ اجمیر شریف وغیرہ کئے اور اپنا وقت مصروفیت ہی میں گذارا۔ آپ کو ریاضت حبس دم اشغال اور افکار کا بھی شوق تھا۔ آپ نے زمانہ مدار المہامی کے قبل سے اس میں اچھا ملکہ حاصل فرمایا تھا۔ مگر گراں بار خدمت نے اس کو خاطر خواہ جاری نہ رکھنے دیا۔ اس کے بعد آپنے پھر ان اشغال کو جاری رکھا اور شعر وسخن کے تذکرہ تازہ فرمائے۔ علماء، فضلاء، اور کاملین کی ملاقاتوں میں افکار علمی وروحانی سے سیر کام ہوتے رہے اور آپکے اوقات کبھی بیکاری میں نہ گذرے۔ اس زمانہ میں آپ کو پینٹنگ کا قدیم شوق یاد آیا اس میں بہت دلچسپی لی۔ اور اس طرح سال تک اپنے اوقات گذارے۔ آپ کو حضرت غفران مکان کے انتقال کا اس قدر صدمہ تھا کہ آخر عمر تک جب کبھی اُن کا ذکر آتا تو ان کی پرورش خبرگیری اور کمال عنایات کی یاد سے اس قدر روتے کہ ہچکیاں لگ جاتیں کئی دستی رومال تر ہوجاتے اور طبیعت بالکل بے قابو ہو جاتی۔ آپنے اس سانحہ عظیم کے بعد اپنی ڈیوڑھی میں دیوالی کی روشنی موقوف فرمادی۔

اپنے آقاء ولی نعمت حضرت پیر و مرشد بندگان عالی متعالی کی درازی عمر و اقبال کے لئے ہر وقت نہایت خلوص سے دست بدعا رہتے اور آپ ہمیشہ فرماتے کہ خدا اس مقدس ہستی کو دیرگاہ سلامت رکھے کہ اب ہم قدیموں کی لاج اسی کے ہاتھ ہے اور یہی قدوم میمنت لزوم ہماری زندگیوں کا سہارا ہیں اسی مضبوط اور مستحکم عقیدت کا نتیجہ تھا کہ پھر مہاراجہ ممدوح کو مالک کی بالغ اور دور اندیشانہ نظر نے ملک دکن کی صدارت عظمیٰ کے لئے منتخب فرمایا اور آپ پھر اس خدمت سے ممتاز فرمائے گئے۔ اس کی مسرت میں متعدد جلسے ہوئے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آپکے صاحب اقبال ہونے کی یہ بڑی دلیل تھی کہ آپ کی حکومت کا زمانہ مقبول رہا۔ آپکے اخلاق نے۔ علم نے۔ برتاؤ محبت نے۔ خیرات و دادودہش نے صرف حیدرآباد ہی کو آپ کا فدائی نہیں بنایا بلکہ ہندوستان اور خصوصاً انگلستان کی بڑے بڑے ممتاز ہستیاں آپ کی شیدائی تھیں اکثر والسرائے۔ گورنران۔ کمانڈرانچیف اور رزیڈنٹ صاحبان اور دیگر یوروپین عہدیداروں اور انکی لیڈیوں کے خطوط میں نے دیکھے ہیں وہ سب نہایت بلیغ اور شاندار الفاظ میں آپ کی تواضع اور مدارات کا ہر سال بزمانہ کرسمس خیر مقدم کرتے رہے ہیں جس سے آپ کی غیر معمولی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر نے تو انتہائی محبت و خلوص میں بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ آپ ہمیں کبھی ایسا موقع عطا کریں کہ ہم آپ کو اپنا مہمان بنا کر اپنی دلی آرزو پوری کریں۔ آپ کی وزارت کا دور تقریباً گیارہ

سال رہا اور پھر صدارت عظمیٰ کا عہد بھی کئی سال تک رہا۔ اور آپ کے عہد حکومت میں متعدد اصلاحی کام انجام پائے۔ آپ کا وہی قدیم خیرخواہانہ وطیرہ اس دور میں بھی وقعت و وقار کی نظر سے دیکھا گیا۔ آپنے متعدد موقعوں پر اپنے مالک کی غیر متزلزل وفاداری اور اہل ملک کی دلی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ آپ حق رسی کے معاملہ میں اس قدر مستقل مزاج تھے کہ کبھی آپ نے کسی عزیز یا قرابت دار کو بھی غیروں پر ترجیح نہیں دی اور اکثر موقعوں پر اُن کو ناکام اور مایوس ہونا پڑا۔ آپ کے خدمات مدارالمہامی اور صدر اعظمی کے دو واقعات قابل نوٹ ہیں۔ ایک تو یہ کہ نواب سر وقارالامرا سے آپ نے مدارالمہامی کا جائزہ حاصل فرمایا اور ان کے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر سے صدارت عظمیٰ کا۔ اسی طرح حضرت غفران مکاں علیہ الرحمۃ کی جشن جوبلی میں بحیثیت مدارالمہام ملک کی جانب سے آپ نے ایڈریس گذرانا اور پھر حضرت بندگان عالی متعالی کے جشن سیمیں کے موقعہ پر بحیثیت صدراعظم ایڈریس پڑھنے اور گذارنے کا شرف حاصل فرمایا۔ یہ امتیاز مشکل سے کسی دوسرے مدارالمہام یا صدراعظم کو نصیب ہوا ہوگا کہ دو عہد حکومتوں میں کارگذاری مقبول اور پسندیدہ رہی۔ اور مرتے دم تک ملک و مالک کی نظر میں سچے وفادار جاں نثار اور بہی خواہ ملک رہنا میسر ہوا ہو۔

خدمت پیشکاری ۱۲۲۱ھ سے تاریخ انتقال سر مہاراجہ بہادر ۱۳۲۹ھ تک آپ کے گھر رہی۔ اور اس موروثی خدمت کا یہ رتبہ اور درجہ حضرت بندگان عالی متعالی نے قایم فرمایا کہ دیگر صدراعظم بہادر کے دور میں بھی سر دربار سر یمین السلطنت مہاراجہ بہادر کی کرسی سب سے پہلی رہی۔ دربار شاہانہ کی قدر افزائیوں سے مہاراجہ مالا مال ہوجاتے تھے اور اپنے جامہ میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ کسی چیز کے طالب نہ تھے سوائے اپنے مالک کی نظر رحم و کرم کے دونوں شاہی دور میں اُن کے اعزاز اور وقار بلند تر اور حضرت بندگان عالی متعالی نے آپکے "لفظ سے ہمیشہ یاد فرماکر عزت افزائی فرمائی۔ جریدہ غیر معمولی مورخہ ۹ ر آبان ۱۳۴۰ف میں حضرت پیر و مرشد کے ارشاد پر جو آپنے اظہار خیال فرمایا وہ درج جریدہ ہے اس سے آپ کی عقیدت اور بلند نظری کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی کے فارسی ارشادات اور زور قلم کی جو مدح سرائی فرمائی اور جس کی نسبت حضور پرنور بندگان عالی مدظلہ العالی نے جو ارشاد فرمایا اس کو آپ نے "پیمانۂ عقیدت" نامی کتاب میں درج فرمایا ہے۔

یہ وہ عزت تھی جو کسی معزز فرد پیشکاری کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

آپ کے محل ہندو محل اور اہلِ اسلام سے تھے۔ آپکے پندرہ صاحبزادے ہوئے جن میں ۹ نو ہندو اور ۶ چھ مسلمان تھے۔ اب ان میں صرف پانچ زندہ ہیں۔ ایک راجہ ارجن کمار عرف راجہ خواجہ پرشاد بہادر

۱ ۱۸۰۴ء ۲ ۱۹۱۱ء ۳ ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۳ء

جانشین سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر۔ دوسرے نواب اسد اللہ خاں صاحب ۔ نواب نصر اللہ خاں صاحب ۔ نواب عظمت اللہ خاں صاحب اور نواب حشمت اللہ خاں صاحب ۔ پندرہ صاحبزادیاں تولد ہوئیں اب تیرہ بقید حیات ہیں جن میں چار ہندو بقیہ مسلمان ہیں ۔آپ کا اولاد کا اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ کا دل موم ہوگیا تھا۔ آپ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے مگر اولاد کی نسبت کوئی کچھ کہے تو اُس کا سننا پسند نہ فرماتے اور نہ ان پر سختی یا ان کے خلاف ایک لفظ بھی آپ کو گوارا تھا۔ آپ صاحبزادہ اور صاحبزادیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی اولاد کو بھی جان سے زیادہ عزیز اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب سے چھوٹی مہارانی صاحبہ کا انتقال ہوا آپ بہت ہی غمگین و ملول رہتے اور اکثر اوقات دل بہلانے کے لئے تھیٹر یا سینما تشریف لے جاتے۔ آپکے اسٹیٹ کی آمدنی دس لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔ جو کسی والی اسٹیٹ پیشکاری کے زمانہ میں نہ تھی۔ انتظام اسٹیٹ اور ادائے قرض کا معقول بندوبست تھا۔ تیس چالیس لاکھ کا قرض آپ ہی کے زمانہ میں ادا ہوا۔

آپ ملک کے ہر خاندان سے واقف تھے اور ہر ایک سے ان کے لحاظ سے ملاقات فرماتے تھے۔ آپ امراء اور اُن کے صاحبزادوں کو موٹر تک جا کر لیتے اور چھوڑتے تھے۔ آپ حکیم تھے۔ حکمت سیکھی تھی۔ بزمانہ پیشکاری مطب فرمایا کرتے تھے۔

آپ علم رمل جفر اور جوتش کے بھی ماہر تھے۔ اکثر صحیح احکام لگاتے تھے جس کا مجھے خود ذاتی تجربہ ہے۔ بلدہ کے معزز اصحاب بھی اس سے واقف ہیں آپ سپاہیانہ جوہر سے متصف تھے۔ شکار اچھا کرتے تھے۔ تلوار بنوٹ وغیرہ سے خوب ماہر تھے۔ آپ نے برسوں باضابطہ ورزش کی تھی اور جسمانی طاقت کو بہت ترقی دی تھی۔ آپنے فن مصوری نقاشی بید سازی مٹی کے کھلونوں کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کو موسیقی میں بھی بہت اچھا دخل تھا۔ آپ نے اس کو باقاعدہ سیکھا تھا ستار ہارمونیم وغیرہ آپ کے خاص مذاق کی چیزیں تھیں۔ آپ کھانے اور کھلانے کے بڑے شایق تھے۔ اکثر مرتبہ مجھے اور اپنے دوسرے دوستوں کو بعض نایاب کھانے بنا کر کھلائے ہیں۔ عالموں مشائخوں اور بزرگوں کے آپ شیدائی تھے۔ شعرا کی عزت آپ کے دربار میں خاص تھی۔ آپ کے یہاں کے مشاعرے امراء معززین اور قابل حضرات کی شرکت سے ایسے خاص اور شاندار ہوتے تھے جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ پرانے زمانہ میں مرحوم مہاراجہ چندولال کے مشاعرے ابھی تک زبان زد عام ہیں جس میں بڑے بڑے اساتذہ نے غزلیں پڑھی ہیں آپ جوانی میں حُسن پرست تھے اور اس عمر میں بھی حسین صورت دیکھکر صانع حقیقی کی صنعت کی ثنا فرماتے تھے۔

آپ قدردان فن تھے۔ اور صاحب کمال کی عزت فرماتے تھے۔ دشمنوں سے بھی آپ محبت سے پیش آتے تھے اور ہر مذہب و ملت کی عزت کرتے تھے۔ کسی کے خلاف کچھ کہا اور جس سے ایک دفعہ راہ و رسم قائم فرمائی اس کے خلاف عمل آپ کی وضعداری کے بالکل خلاف تھا۔ اس عمر میں بھی آپ کی زندہ دلی قابل تقلید تھی۔ آپ نے کبھی یاس و محرومی کو نزدیک پھٹکنے نہیں دیا۔ آپ دوستوں کی صحبت سے بیحد مسرور ہوتے اور ان کی ہر وقت یاد فرما کر تسکین پاتے۔ آپ کسی کا کام نکالنے کے لئے زبانی یا تحریری سفارش سے کبھی عار نہ فرماتے اور ذات سے بطریق سرکاری جو واجبی امداد دی جا سکتی بخوشی دیتے۔ آپ کے یہاں متعدد دفعہ حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ اور اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی رونق افروز ہوئے اور مکارم شاہانہ کا اظہار فرمایا تھا جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ ملک آپ کا فدائی تھا۔ اور جہاں کہیں بڑے بڑے جشن یا تقاریب میں آپ شریک ہوتے تو اظہار مسرت اور خیر مقدم میں پبلک بکثرت سلام کرتے ہوئے تالیاں بجاتی اور جہاں جہاں آپ کی سواری جاتی تالیوں کی گونج سے گزرتی آپ حیدرآباد میں تو مشہور ہی تھے کہ امیر ہیں۔ اور آپ سے کوئی بڑا سخی داتا نہیں۔ ڈیوڑھی یا ایوان سے دفتر باب حکومت تک یا جہاں سے آپ کی سواری جاتی دو رویہ مانگنے والوں کی قطاریں کھڑی رہتیں اور آپ کا دست کرم مصروف بہ خیرات رہتا۔ آپ پولیس سرکار عالی و انگریزی کے جوانوں کو انعام دیتے اور ان کے لئے موٹر چلانے والے کو تاکید تھی کہ وہ موٹر کو اس رفتار سے چلائے کہ لینے والوں کو زحمت نہ ہو۔ ہر وقت موٹر کے پیچھے دوسری موٹر کا چلنا دشوار تھا کہ ہجوم فقرا رہتا تھا۔ رات میں بارہ ایک بجے بھی مانگنے والے حاضر رہتے۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں مستفید ہوتے۔ علاقہ انگریزی۔ مثل بنگلور۔ دہلی۔ کلکتہ میں بھی یہی حال تھا۔ آپ کا نام بچوں جوانوں اور بڈھوں کی زبانوں پر تھا اور سوائے دعائے خیر کوئی کلمہ سنائی نہ دیتا تھا۔ آپ کی سواری آنے کی خبر سیٹیوں سے ہو جاتی تھی۔ اس کے سنتے ہی گلی کوچوں ہوٹلوں اور چار خانوں تعمیرات کے مزدور اکثر کم معاش سائکل سواروں اور پیادہ پا اشخاص کھنچ آتے اور آپ کی موٹر تک پہونچنے کی کوششوں میں ایک عجیب کشمکش کا سماں نظر آتا تھا۔ آپ ہر غریب کی فریاد سنتے اور اس کی درخواست بغور دیکھکر ملتفت ہوتے۔ آپ کو امداد و اعانت کا ازحد شوق تھا۔ آپ جس قدر زیادہ کسی کو دیتے اتنا ہی خوش اور مسرور ہوتے۔ آپ اپنی داد و دہش کو ظاہر کرنا نہ چاہتے تھے۔ نہ کبھی اس پر ناز فرماتے۔ آپ اپنے نانا مہاراجہ چندولال کے نقش قدم پر چلتے جو لاکھوں روپیہ تقسیم فرماتے مگر سر نیچا کئے ہوئے داد و دہش کے معاملہ میں کبھی اوپر نہیں دیکھتے تھے۔ اور جس کو دیتے تھے اس کی صورت بھی نہیں دیکھتے تھے۔ کسی نے مہاراجہ سے دریافت کیا کہ دیتے ہوئے آپ

کیوں نیچے دیکھتے ہیں" آپ نے جواب دیا کہ میں شرماتا ہوں کہ جتنا مجھے دینا چاہئیے نہ دے سکا یہی حال مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کا تھا۔ آپ اتنے رقیق القلب تھے کہ مرضی اور طبیعت کے خلاف کسی واقعہ کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ حضرت بیگم صاحبہ قبلہ والدہ پیرومرشد حضرت بندگان عالی متعالی کی جب علالت سخت ہوئی تو آپ ہر روز بہت پریشان رہتے تھے۔ اکثر نہایت عجز وانکساری سے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑاتے اور دعائیں کرتے کہ اے خدا میرے مالک کی محنت بخیر کر۔ اس کے دل کو اطمینان بخش۔ اے مولا ایک دفعہ میری اس دعا کو قبول کر۔ میرے مرحوم بھائی محبوب راج محبوب کے انتقال کے بعد جس وقت میں پہلی دفعہ دیوڑھی گیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر اتنا روئے کہ میرا کوئی بزرگ بھی شاید ہی اسقدر اظہار رنج وغم کرتا۔ عالی جناب نواب فخر الملک مرحوم ومغفور عالی جناب نواب خان خاناں مرحوم ومغفور۔ نواب صاحب تاڑبن کے انتقال کی کیفیتیں سُنکر اس قدر مضطرب اور بے چین ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ حقیقی بھائیوں اور قریبی عزیزوں کے انتقال پر ماتم کر رہے ہیں آپ کی پیشی میں اگر کوئی مظلوم بیکس اور محتاج پہونچ جاتا اور اپنا دردناک قصہ بیان کرتا تو رو پڑتے اور اس کی پوری امداد فرماتے۔ آپ کے یہاں امتیازی تا حیات ملازمین کے وفات کے بعد آپ کی رحمدلی نے امداد کا سلسلہ کبھی بند نہ کیا۔ حالانکہ قواعد سرکار عالی کی رو سے یہ قابل بحالی نہ ہوتے۔ سینکڑوں معذوروں محتاجوں کے متعلقین آپ کی ذات سے وابستہ تھے ماہانہ مقررہ تنخواہیں علیحدہ تھیں جو سینکڑوں ہزاروں کو دی جاتی تھیں۔ آپ کے چندہ ہر قوم وملک کے لئے تھے۔ آپ کا ہمیشہ یہ قول تھا کہ خدا آخر وقت تک میرا ہاتھ نہ روکے اور نہ اپنی یاد سے مجھے محروم رکھے۔ آپ کی دعاء مقبول ہوئی بستر علالت پر قریب ہونے کے دن تک آپ دست کرم نہ رُکا۔

آپ فارسی میں کلام فرماتے تھے۔ اسی طرح اُردو میں نثر اور نظم میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں جملہ کتب کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثر ختم ہو چکی ہیں "پریم درپن" "نذر عقیدت" "پیمانہ عقیدت" "ہندو مسلم اتحاد" وغیرہ مقبول تصانیف ہیں۔ آپ کا غیر مطبوعہ کلام اُردو فارسی ہنوز کافی موجود ہے آپنے دیوان حُسن سحری کو طبع کراکے دنیائے ادب فارسی پر بڑا احسان کیا۔ آپکی محفل میں گھنٹوں بیٹھنے والے کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کبھی عالم فاضل جمع رہتے تو کبھی مہندس ورمال۔ کبھی فلسفی وشاعر کبھی ریفارمر یا مذہبی سادھو ومشایخ۔ بہرحال ایک ایسا سلجھا ہوا مجمع رہتا جو کہیں اس طرح نظر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ ایک معمولی شخص جے پور سے آیا کارڈ بھیجا آپنے یاد فرمایا اس نے اپنے کو علم جوتش ورمل کا ماہر تبلایا۔ آپنے چند سوالات فرمائے اور

جان گئے کہ مبتدی ہے مگر اس کے بعد ایک لفظ بھی نہ فرمایا بیس روپیہ میرے ذریعہ مرحمت فرمائے۔ اس قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو میری آنکھوں نے دیکھا۔

پرانے شاہی خاندانوں کی عظمت آپ کے دل میں بہت تھی آپ کا برتاؤ ان افراد کے ساتھ خاص تر پیدا کرتا تھا۔ ایک موقعہ پر ایک صاحب تشریف لائے اور اپنے کو تیموری خاندان کا رکن بتایا ملاقاتی کارڈ بھیجا لباس اسقدر معمولی تھا کہ مجلس کے حاضرین نے حیرت کی کہ سر مہاراجہ بہادر ان کے لئے آگے بڑھتے ہیں اور ان سے جھک کر ملتے ہوئے اپنے بازو میں جگہ دیتے ہیں۔ دیر تک گفتگو فرمائی اس کے بعد جو نذر دینی تھی دے کر ان کو دروازہ تک چھوڑا۔ یہ اب قصے رہ گئے ہیں اور بقول شاعر

"اب آنکھیں ترسیں گی دیکھ نہ سکیں گی مگر ایسا پرشان اور قدردان نظر نہ آئے گا"

تواضع اور مہانداری نواب راجہ مہاراجہ دیوان شاعر ادیب مشائخین فلاسفر ریفارمر ایڈیٹر واعظ جو کوئی حیدرآباد آتے آپ سے ملنے کے بغیر نہ جاتے یا آپ ان کی دعوت کئے بغیر ان کو واپس ہونے دیتے خواہ کتنی دفعہ یہ کیوں نہ آئیں۔ مہاراجہ کا دستر خوان ان کا منتظر رہتا تھا۔

مہاراجہ بیکانیر۔ مہاراجہ دھولپور نواب صاحب خیرپور نواب صاحب لوہارو۔ سر مرزا اسمٰعیل۔ سر تیج بہادر سپرو۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولوی سبط حسن صاحب۔ پنڈت دینیدیال۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ آپ کے مہمان رہ چکے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی حضرت کلیمی شاہ آپ کے یہاں مہمان ہوتے تھے کئی کئی مہینوں تک آپ نے پنڈت جگت پرشاد جی کو پانچ روپیہ یومیہ دیکر اپنی بارہ دری میں ٹھیرایا تھا۔

جاترائیں۔ عرس اور میلے آپ کے علاقہ میں الوال اور ایملواڑہ کی جاترائیں نہایت مشہور سمجھی جاتی ہیں۔ الوال کی جاترا کے لئے متعدد لوکل ٹرینیں چلتی ہیں اور جملہ دفاتر و رزیڈنسی کو ایک روز کی تعطیل دی جاتی ہے۔ عرس حضرت داؤد علی شاہ صاحب ہر سال پھول باغ میں نہایت تزک و احتشام سے فرماتے تھے۔ بلدہ کی دیوڑھی میں ہر سال عشرہ شریف نہایت اہتمام و اعتقاد سے منایا جاتا تھا۔ نویں تاریخ کو حضرت نعل صاحب کی سواری اور دسہرہ کے بعد بھرت ملاپ اور گنیشوں کے جلوس آپ کے پاس بڑے دھوم دھام سے آتے تھے اور معمولات مقرر تھے۔

ہندو مسلم اتحاد کے آپ نمونہ تھے۔ اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوا کرتی ہے۔ آپ نے اپنے گھر میں دونوں کے میل جول کا ایک بین ثبوت دیا تھا۔ آپ کے محلات میں ہندو مسلم رانیاں اور بیگمات تھیں آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہندو مسلم تھیں۔ ان میں مطلق غیریت کا نام و نشان نہ تھا بلکہ جہتی یک دلی ایک دوسرے کی خبر گیری تبلاتی تھی کہ عملی اخلاق ایسا ہوتا ہے۔ مسرت محل

کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے اور صاحبزادیوں کی دیکھ بھال و نگرانی بڑی مہارانی صاحبہ راحت محل نے ایسی فکر و محبت سے فرمائی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ اسی طرح چھوٹی مہارانی صاحبہ کے انتقال پر سب مسلم صاحبزادے اور صاحبزادیاں بجید ملول و غمگین ہوئے اور ہر تعزیتی رسم میں شریک ہوئے آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ ریاست حیدرآباد میں جب تک ہندو مسلم اتحاد و اتفاق ہے اُس وقت تک ریاست نیک نام۔ رعایا میں امن و سکون اور مالک کی شہرت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس اُصول کے خلاف جب کبھی عمل ہوگا بےچینی اور اضطرار رونما ہوگا۔ اور ایسی بدکیفی پیدا ہوگی جو وبال زندگی ہوجائے گی۔ آپ کے اثرات دونوں فرقوں پر یکساں رہے۔ ہر ایک بلا لحاظ قوم و ملت آپ کی بے تعصبی اور یکسانیت کا معترف تھا۔ آپ ہی ایسے خوش قسمت وزیر گذرے ہیں جن کو یہ افتخار حاصل رہا کہ آپ کے دور وزارت و صدارت میں بہت کم ایسے تکلیف دہ مواقع پیش آئے جو دونوں فرقوں کی تنگ نظری کا نمونہ رہے ہوں۔ آپ صرف انھیں لوگوں کو ہی خواہ ملک و مالک تصور فرماتے تھے جو تعصب کے تنگ و تاریک نظریہ سے بلند تھے۔ آپ نے راقم کے اس شعر کو بہت پسند فرمایا تھا جو حسب حال ہے۔

تعصب سے خدا محفوظ رکھے ہزار دل مرچکے ہیں اس دیا سے

ہندو مسلم فساد کے موقعہ پر آپ نے آنسو بہائے تھے اور انتہائی تکلیف و رنج کا اظہار فرمایا تھا۔

آپ ۱۳۴۸ف کے موسم گرما میں علیل ہوئے علالت ایسی نہ تھی جو صاحب فراش ہوتے۔ دل کی شکایت تھی۔ اس سے بے چینی اور دھڑکن ہوتی اور حملہ کے وقت سخت تکلیف محسوس فرماتے تھے۔ نیند نہ آنے سے اکثر راتیں جاگتے ہوئے گذاریں۔ آپ صوفی تھے فقیروں کی صحبت میں برسوں گذاری تھے۔ یاد الٰہی کا مشغلہ جاری رکھنے کے لئے قوالوں کی چوکیاں دن رات کئی مہینوں تک حاضر رکھی گئیں۔ صبح سے خاصہ کے وقت دن میں اور تمام شب یہ سلسلہ جشن جاری رہتا اور معلوم ہوتا تھا کہ آپنے اس بیماری اور تکلیف کو مبدل بہ راحت و خوشی کیا ہے۔ اس زمانہ میں آپنے درباروں میں حاضری دی دعوتوں تقاریب اور تعزیتی موقعوں پر شرکت فرمائی کبھی مریض کی طرح بستر پر نہیں رہے۔ نہ پریشان ہوئے۔ انتقال کے ڈھائی تین مہینے قبل آپ کے بائیں ہاتھ میں درد شروع ہوا اور مونڈھے کے جوڑ میں بجید تکلیف شروع ہوئی۔ ہاتھ پوری طرح اُٹھانا تکلیف دہ تھا۔ متعدد علاج ہوئے ڈاکٹر واگھرے ڈاکٹر سنکٹ چند اور ڈاکٹر انصاری صاحب کا علاج رہا۔ حکیم مقصود علی خاں صاحب حکیم سید معوری صاحب وغیرہ کا علاج بھی ہوا۔ مگر خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ عارضی سکول

۱۵ مئی ۱۹۳۹ء

نظر آتا تھا مگر وزن برابر گھٹتا گیا اور آپ کمزور ہوتے رہے باایں ہمہ مقررہ کاروار اور اوقات کی پابندی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ آخر ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۹ف روز جمعہ کو شام کے چھ بجے آپ حسب معمول چار بجے بیدار ہو کر خلاف عادت پھر آرام فرما گئے اور ایسا سوئے کہ پھر نہ جاگے اور نہ زبان سے کچھ کہا حسب فرمان خسروی ڈاکٹروں کی کمیٹی کے مشورہ سے علاج فوراً آغاز ہوا۔ حضرت بندگان عالی نے خبر سنتے ہی حکیم مقصود علیخاں صاحب اور ہوش صاحب بلگرامی کو روانہ فرمایا۔ خود بدولت ہفتہ اور اتوار کی شام کو قدم رنجہ فرما کر عیادت فرمائی اور معالجہ کی نسبت ہدایات فرمائیں۔ مگر حالت روز بروز خراب ہونے لگی" اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ پہلے بخار نہ تھا بڑھ کر ایک سو چار پانچ تک پہونچ گیا۔ ہچکیاں ہوئیں تنفس بڑھ گیا۔ بہرحال وہ تمام آثار پیدا ہوگئے جو مریض کے جاں کنی کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ ۱۳ خور ۱۳۴۹ف دوشنبہ کے دن کو چار بجکر ۵ منٹ شام کے وقت آپ کی روح پاک قالب عنصری سے پرواز کر گئی اور ہمیشہ کے لئے آپنے ملک و مالک بیوی بچوں دوستوں رفیقوں کا ساتھ چھوڑا۔ آپ ستتر سال کے تھے۔ آپ کے زائچہ کے لحاظ سے یہ سال نہایت ناقص تبلایا جاتا تھا۔ بہرحال آپ تنہا آئے تھے تنہا گئے۔ آتے وقت جو گنج مخفی ساتھ لائے تھے وہ اوصاف حمیدہ اور لاتعداد خوبیوں کی صورت میں نمایاں چھوڑ گئے۔ جس کا تذکرہ ہر زبان پر جس کی یاد ہر دل میں اور جس کا بیان ہر مکان اور محفل میں برابر جاری رہا۔ اور لوگ مرنے کے بعد یاد کئے جاتے ہیں کیونکہ دنیا مردہ پرست ہے۔ مگر مہاراجہ آنجہانی زندگی میں ہر جگہ اور ہر ملک میں یاد کئے گئے۔ ہر جگہ عزت ہوئی۔ ایسے صاحب تقدیر اور صاحب اقبال انسان کم پیدا ہوتے ہیں جو جیتے جی لوگوں کے دلوں میں گہری جگہ کرلیں اور اپنے اخلاق وکرم کا سکہ اس طرح بٹھائیں جو مٹ نہ سکے۔ انتقال کے روز پانچ چھ کے درمیان سواری شاہانہ نہفت افروز ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی جس مالک کا قدیم فدائی جو ہمیشہ دیدار کا طالب مالک کی صحت و عافیت کا متمنی۔ عمر و دولت کا خواہاں رہتا تھا۔ اس کی عزت افزائی ایک رحمدل خدا پرور ذرہ نواز وجود بابرکات شاہانہ سے نہ ہوتی تو کس سے ہوتی۔ تشریف لاکر حضرت اقدس و اعلیٰ نے انتہائی وفادار جاں نثار اور قدیم امرا کے آخری نام لیوا پر اظہار رنج وسوگ فرمایا۔ محلات اور صاحبزادے صاحبزادیوں کو دلاسا دیا۔ اس کے بعد حسب اجازت پونے بارہ بجے جنازہ بلحاظ رسم وطریق خاندانی اٹھایا گیا۔ راجہ خواجہ پرشاد عرف ارجن کمار نے آگ دی اور رسوم تعزیتی انجام دئے۔ امراء۔ معززین۔ عہدہ داروں کے سوا ہزار ہا مخلوق جنازہ کے ہمراہ تھی۔ جس کی صراحت مقامی اخبارات سے بخوبی ہو چکی ہے۔ آپکے ہاتھ اولاً نہ جلے اور ایک انگلی رہ جانے کا واقعہ اخباروں میں آچکا ہے جو صحیح ہے۔ آپ کی سمادھ مہاراجہ چندولال اور مہاراجہ

۵۱ ۹ رمئی ۱۹۴۰ء ۵۲ ۱۳ رمئی ۱۹۴۰ء

نریندر بکنٹھ باسی کے درمیانی خالی حصہ میں بنادی گئی ہے۔ آپ کے اوصاف کا تذکرہ اس قدر مختصر اوراق میں ناممکن و دشوار تھا۔ خصوص ان واقعات کا تفصیلی ذکر جو سالہا سال ساتھ رہنے کی وجہ میرے مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ قطعی ناممکن تھا۔ صرف فرمائش ایڈیٹر صاحب زمانہ کی بنا، پر یہ چند سطور ناظرین کے ملاحظہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ راقم کی ایک رباعی اور ایک قطعہ نم احباب شاد سے نذر کیا جاتا ہے جو زیر طبع ہے

رُباعی

ناثر تھے ادیب تھے سخنور تم تھے — دل والے سخی داتا مخیر تم تھے
کیا اور کہے عاؔلئ خستہ تم کو — بیچارہ و بے کس کے مقدر تم تھے

قطعہ

آج رونا ہے اپنی بستی پر — دل کی اُجڑی ہوئی سی بستی پر
سینکڑوں کیا ہزاروں اے عاؔلی — روتے ہیں شاؔد جیسی ہستی پر

کلام شاد

یہاں پر ناظرین کی دلچسپی کے لئے مہاراجہ صاحب مرحوم کے چند اشعار بھی درج کئے جاتے ہیں۔

عشق منظور ہے گر سوز جگر پیدا کر — دیکھنا ہے جو اُسے پہلے نظر پیدا کر
تیری فریاد سے کیا خاک پسیجے کوئی — اپنے دل میں تو ذرا پہلے اثر پیدا کر
عشق کہتے ہیں جسے کھیل نہیں لڑکوں کا — سوز پنہاں سے ابھی دل میں اثر پیدا کر
شمع بننا تو ہے دشوار حقیقت میں مگر — مثل پروانہ ابھی سوز جگر پیدا کر
طاعتیں گر نہیں ہوتیں تو خطائیں ہی سہی — جس طرح ہو دل محبوب میں گھر پیدا کر
نہ سہی کعبہ تو بتخانہ ہی اچھا ہے شاؔد — سجدہ کرنے کے لئے کوئی تو در پیدا کر

کہے کیا حال کوئی اور تمنا کوئی — نظر آتا نہیں اب پوچھنے والا کوئی
ہائے واقف نہیں ہر کوئی حقیقت سے مری — کوئی قطرہ مجھے کہتا ہے تو دریا کوئی
جیسا ہوں ہیں میری حالت سے خدا واقف ہے — کہنے دو مجھ کو بُرا یا کہے اچھا کوئی
خوگر درد ہوں پروا نہیں کچھ اسکی مجھے — میری فریاد کو جو سمجھے بہانا کوئی

امکانات

(از حضرت فراق گورکھپوری)

فراق اِک نئی صورت نکل تو سکتی ہے
بقول اُس آنکھ کے دُنیا بدل تو سکتی ہے

ترے خیال کو کچھ چُپ سی لگ گئی ورنہ
کہانیوں سے شبِ غم بہل تو سکتی ہے

عروسِ دہر چلے کھا کے ٹھوکریں لیکن
قدم قدم یہ جوانی اُبل تو سکتی ہے

پلٹ پڑے نہ کہیں اس نگاہ کا جادو
کہ ڈوب کر یہ چھُری کچھ اُچھل تو سکتی ہے

بجھے ہوئے نہیں اتنے بجھے ہوئے دل بھی
فسردگی میں طبیعت مچل تو سکتی ہے

اگر تو چاہے تو غم والے شادماں ہو جائیں
نگاہِ یار! یہ حسرت نکل تو سکتی ہے

اب اتنی بند نہیں غمکدوں کی بھی راہیں
ہوائے کوچۂ محبوب چل تو سکتی ہے

کڑے ہیں کوس بہت منزلِ محبت کے
ملے نہ چھاؤں مگر دھوپ ڈھل تو سکتی ہے

حیات لَو تہِ دامانِ مرگ دے اُٹھی
ہوا کی راہ میں یہ شمع جل تو سکتی ہے

کچھ اور مصلحتِ جذبِ عشق ہے ورنہ
کسی سے چھُٹ کے طبیعت سنبھل تو سکتی ہے

ازل سے سوئی ہے تقدیرِ عشق موت کی نیند
اگر جگائیے کروٹ بدل تو سکتی ہے

غمِ زمانہ کو سوزِ نہاں کی آنچ تو دے
اگر نہ ٹوٹے یہ زنجیر گل تو سکتی ہے

شریکِ شرم و حیا کچھ ہے بدگمانیٔ حسن
نظر اُٹھا یہ جھجک سی نکل تو سکتی ہے

کبھی وہ مل نہ سکے گی میں یہ نہیں کہتا
وہ آنکھ آنکھ میں پڑ کر بدل تو سکتی ہے

بدلتا جائے غمِ روزگار کا مرکز
یہ چال گردشِ ایام چل تو سکتی ہے

وہ بے نیاز سہی دل متاعِ ہیچ سہی
مگر کسی کی جوانی مچل تو سکتی ہے

تری نگاہ سہارا نہ دے تو بات ہے اور
کہ گرتے گرتے بھی دنیا سنبھل تو سکتی ہے

یہ زور و شور سلامت، تری جوانی بھی
بقولِ عشق کے سانچے میں ڈھل تو سکتی ہے

سُنا ہے برف کے ٹکڑے ہیں دل حسینوں کے
کچھ آنچ پا کے یہ چاندی پگھل تو سکتی ہے

ہنسی ہنسی میں لہو تھوکتے ہیں دل والے
یہ سرزمین مگر لعل اُگل تو سکتی ہے

جو تو نے ترکِ محبت کو اہلِ دل سے کہا
ہزار نرم ہو یہ بات، کھل تو سکتی ہے
ارے وہ موت ہو یا زندگی، محبت پر
نہ کچھ سہی کفِ افسوس مل تو سکتی ہے
ہیں جس کے بل پہ کھڑے سرکشوں کو وہ دھرتی
اگر کچل نہیں سکتی نگل تو سکتی ہے
ہوئی ہے گرم لہو پی کے عشق کی تلوار
یونہی جلائے جا یہ شاخ پھل تو سکتی ہے
گذر رہی ہے دبے پاؤں وقت کی دیوی
سبک روی سے جہاں کو مسل تو سکتی ہے
حیات سے نگہِ واپسیں ہے کچھ مانوس
مرے خیال سے آنکھوں میں پل تو سکتی ہے

نہ بھولنا یہ ہے تاخیرِ حسن کی تاخیر
فراق آئی ہوئی موت ٹل تو سکتی ہے

نوائے راز

(جناب ابوالفاضل راز چاند پوری)

نہ سوز ہے ترے دل میں نہ سازِ فطرت میں
یہ زندگی تو نہیں زندگی حقیقت میں
پیامِ ہوش نہ دے کوئی بزمِ فطرت میں
کہ بیخودی ہی تو اک چیز ہے محبت میں
کہاں ہیں غیر، سب اپنے ہیں بزمِ فطرت میں
کہ قیدِ مذہب و ملت نہیں محبت میں
یہ فرقِ شیخ و برہمن تو اعتباری ہے
نہ شیخ ہے نہ برہمن کوئی حقیقت میں
خمارِ نشۂ ہستی سے بے نیاز رہا
ملا وہ کیف مجھے بادۂ محبت میں
سمجھ کے کیجیئے عہدِ وفا، سمجھ کے ذرا
وفا کا نام ہے بدنام بزمِ الفت میں
یہ انقلابِ زمانہ، ارے معاذ اللہ
خودی کا رنگ ہے میخانۂ محبت میں
خرابِ بادۂ الفت نہیں یہاں کوئی
تلاش کرتا ہے تو کس کو بزمِ غربت میں
وفائے عشق کی روداد کہنے دو مجھکو
جفائے حسن کا قصہ کہوں گا فرصت میں
جو بوالہوس تھے وہ گمراہ ہو گئے آخر
اکیلا رہ گیا میں منزلِ محبت میں
خلافِ پیرِ مغاں گو جہاں نے سمجھایا
نہ آیا فرق مگر آج تک عقیدت میں
یہ شوق و ذوق، یہ جوشِ طلب، خدا حافظ!
ہزاروں مشکلیں ہیں منزلِ محبت میں
وطن بخیر، بہارِ وطن بخیر، اے راز!
وطن کی یاد پھر آئی ہے وحشتِ غربت میں

زبان اور انسان

(از محمد ریاض الحق صاحب ایم اے)

یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ ہم آپ جو زبان بولتے ہیں کیونکر پیدا ہوئی اور اس میں انسانی وسیلہ کو کتنا دخل ہے۔ ہر شخص اپنی زبان کو ایک سماوی حیثیت دیکر اس کو باعظمت اور قدیم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تحقیق لسانی میں اِن ڈھکوسلوں سے کام نہیں چلتا۔ ماہرین لسان نے بڑی کاوشوں کے بعد زبان کو انسانی پیداوار ثابت کر دیا ہے۔

انسان کو حیوانِ ناطق کا خطاب ہے اور نطق ہی اس کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ نطق یا قوت گویائی کیسے وجود میں آئی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ انسان کے پاس دل و دماغ ہے اور وہ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں غرق رہتا ہے اور پھر طرہ یہ کہ وہ مدنی الطبع بھی ہے اور اپنے خیالات اور احساسات و کیفیات دوسروں تک پہونچانے کے لئے بےچین رہتا ہے۔ یہی اظہار کی خواہش زبان کے وجود کی علّت غائی ہے۔ زبان ایک سلسلۂ الفاظ ہے اور الفاظ سلسلۂ آواز کے سوا کچھ نہیں، یا یوں سمجھئے کہ انسانی خیالات کی صوتی تصاویر کا نام زبان ہے۔

لسانی تاریخ پر غور کرنے سے یہ راز افشا ہوتا ہے کہ زبان میں ہر وقت ترقی و تنزل کا عمل جاری رہتا ہے، یعنی یہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ اور بعض اوقات مر بھی جاتی ہے۔ کسی زبان کا مرنا یہ ہے کہ لوگ اس کے استعمال سے منہ موڑ لیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زبان میں ترقی و تنزل کا عمل جاری رہتا ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں قوتِ نمو ہے اور انسانی ذرایہ کو بھی دخل ہے۔ لیکن بعض محققین لسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں قوت نامیہ اسطرح مضمر ہے جس طرح خودرَو پودوں اور پھولوں میں یعنی جس طرح خودرَو پودے اور پھول اُگتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور ان کی روک تھام انسانی طاقت سے باہر ہے اُسی طرح زبان بھی خود بخود پیدا ہوتی ہے، زندہ رہتی ہے اور مر بھی جاتی ہے لیکن انسان اس میں دخل نہیں دے سکتا ہے۔ چنانچہ مشہور مصنف میکس مولر کا خیال ہے

"Although there is a continuous change in language, it is not in the power of man either to produce or prevent it."

یعنی گو کہ زبان میں ہمیشہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان تغیرات کو روک سکے یا انھیں خود پیدا کر سکے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ زبان میں تبدیلی پیدا کرنے کا خیال ایسا ہی ہے جیسا کہ دورانِ خون کے اصولوں کو بدلنے کا خیال یا جیسے انسان اپنی لمبائی میں اضافہ[1] نہیں کر سکتا۔ اسی طرح زبان بھی نہیں بدل سکتا۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ چند تاریخی مثالیں پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سگسمند شاہ جرمنی اور بیطریس شہنشاہ روم نے لاطینی زبان کے چند الفاظ میں تذکیر و تانیث کے متعلق کچھ رد و بدل کرنا چاہا تھا مگر قواعد دانوں نے ان کو تنبیہ کی اور کہا کہ ان کا مثل و نظیر روئے زمین پر ملنا مشکل ہے لیکن لاطینی زبان کی مملکت میں دست درازی کرنا مناسب نہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ زبان انسانی دسترس سے باہر ہے!

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ میکس مُلر لفظ آدمی (Man) سے کیا مراد لیتا ہے۔ اگر اس کا مطلب فرد واحد (Individual) سے ہے تو یقیناً اس کا خیال ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ اس سے نوع انسان (Mankind) مراد لیتا ہے تو اس کا خیال بالکل غلط ہے کیونکہ جب ہم لسانی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو اس کے برعکس بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

انگریزی لفظ TARTAR سے تو آپ بخوبی واقف ہونگے، لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کی اصلی شکل کیا تھی۔ یہ لفظ دراصل "تاتار" یا "تتار" تھا۔ جب تاتاری یورپ پر یورشیں کر رہے تھے اور اپنے مسلسل حملوں سے سرزمین یورپ کو برباد کر رہے تھے اس وقت فرانس پر نیک طینت اور پاک باز بادشاہ لوئی حکمراں تھا۔ جب اس نے ان کی ظلم و ستم کی داستانیں سُنیں تو وہ مبہوت ہو کر چیخ اُٹھا کہ ان کو تو "Tartar" کہنا چاہیئے کیونکہ ان کے افعال و حرکات بعینہ ان شیطانوں کے سے ہیں، جو Tartarees سے آئے تھے۔ اس لفظ کی موزونیت رنگ لائی اور فرانسیسیوں کی تقلید میں تمام یورپ اور انگلستان کے لوگ تاتاریوں کو (Tartars) کہنے لگے۔

اِس کے علاوہ خود اُردو زبان کو دیکھیئے! ایک روز اکبر بادشاہ اپنے اصطبل میں جا نکلا دیکھا کہ ہلال خور (بھنگی) ٹوکرے بھر بھر کر نجاستیں اُٹھا رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بڑی محنت کی روٹی کھاتے ہیں۔ اُن کو حلال خور کہا کرو چنانچہ یہ لفظ آج تک جاری ہے۔ محمد شاہ نے بلبل ہند کا نام گلدُم رکھا یہ بھی آج تک مستعمل ہے، انھیں نے سنگترہ کو رنگترہ کہا اور دلیل یہ پیش کی کہ ایسے لطیف اور بامزہ میوہ کو

---

[1] آج کل مختلف قسم کی ورزشوں کے ذریعے انسان اپنی لمبائی میں اضافہ تو کر سکتا ہے مگر گھٹا نہیں سکتا۔

پتھر مارنا سخت جرم ہے اس کو زنگترہ کہنا چاہئیے کہ خوش رنگ بھی ہے اور لطیف بھی، چنانچہ یہ لفظ بھی برابر استعمال ہوتا ہے۔

میکس ملر نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو مثالیں پیش کی ہیں ایسی مثالیں اُردو زبان میں بھی ملتی ہیں۔ جہانگیر بادشاہ نے جمعرات کا نام مبارک شنبہ رکھا اور کہا کہ اس کو مبارک شنبہ کہنا چاہئیے کیونکہ مجھے جو خوشی ہوتی ہے اُسی دن ہوتی ہے اور پیر کا نام گم شنبہ رکھا۔ لکھتا ہے مجھے جو رنج ہوتا ہے اُسی دن ہوتا ہے اس کا نام ایام ہفتہ سے گم ہو جانا چاہئیے۔ اسی نے شراب کو رام رنگی کہا مگر بقول آزاد رنگ نہ جما۔ شاہ عالم نے سرخاب کو گلسرہ کہا مگر پیش نہ گئی۔

میکس ملر نے اِن واقعات پر نظر نہ کی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ زبان انسانی دسترس سے باہر ہے اُس نے یہ نہ دیکھا کہ سگسمند اور پٹیریس نے کس زبردست طاقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جو ان کو شکست اُٹھانا پڑی۔ در اصل اِن لوگوں نے ان مصنفین کے مستند اُصولوں سے اجتناب کیا جن کا بدلنا ناممکن تھا۔ لاطینی زبان مر چکی تھی اور اس کے عظیم المرتبت مصنفین نے اپنی شاہکار تصانیف میں ایک عمدہ سلیس اور بامحاورہ لاطینی کا نمونہ پیش کر دیا تھا، جس میں ردّ و بدل کرنا زبان کے لئے تخریب کا باعث ہوتا۔ پس اگر سگسمند زبان تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور اس کے امراء اور رعایا خوشامد اور چاپلوسی میں ترمیم شدہ زبان کو تسلیم بھی کر لیتے تو ایک دوسرے درجہ کی لاطینی پیدا ہو جاتی جس کو عمدہ اور بامحاورہ لاطینی سے کوئی مناسبت نہ ہوتی۔ رواج عام کا نام زبان ہے جس طرح انسان مل کر زبان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح اس میں تغیرات بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئیے کہ تبدیلیاں اسی زبان میں ہو سکتی ہیں جو زندہ ہو۔ لاطینی زبان مر چکی تھی اور اس کے بولنے والے بھی نہ رہے تھے اور اس کے اعلیٰ نمونے مصنفوں کی کتابوں میں موجود تھے۔ ایسی صورت میں اس میں تبدیلی کا ہونا محال تھا۔ سگسمند ہی پر کیا منحصر ہے اگر تمام علیسائیت کے باوقار علماء بھی اپنی قوتیں صرف کر دیتے تو کامیاب نہ ہوتے۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کرنا کہ زبان میں تبدیلی کرنا انسان کے بس کی بات نہیں محض تحکم ہے۔ (Dogmatism)

زبان در اصل جمہوریت یا عمومیت کی طرح ہے جس طرح جمہوریت یا عمومیت میں تمام اختیارات جمہور کو حاصل ہوتے ہیں اور عوام چند معتبر اشخاص کو نظام حکومت سپرد کر کے الگ ہو جاتے ہیں لیکن ان پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں اور جب کبھی اپنی رضا یا منشاء کے خلاف دیکھتے ہیں فوراً اُن کو متنبہ کر دیتے ہیں کہ گو ان کو تمام اختیارات حاصل ہیں لیکن وہ جمہور کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتے۔ بعینہ زبان کی

مملکت میں بھی اس کے بولنے والے چند بارتبہ اور مسلّم الثبوت ہستیوں کو اختیارات دیدیتے ہیں جو کہ زبان میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ ان شہرہ آفاق مصنفین اور مقررین کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی تحریروں اور تقریروں سے لوگوں کا دل موہ کر اُن کے خیالات میں تلاطم پیدا کر دیتے ہیں یہ لوگ برابر کام کرتے رہتے ہیں لیکن جب کبھی جمہور کے مسلک کے خلاف کچھ کرنا چاہتے ہیں بدنام ہو کر گمنامی کے غاروں میں گر جاتے ہیں

اُردو زبان میں حضرت ناسخ لکھنوی کا نام کون نہیں جانتا۔ اُنھوں نے اپنی قابلیت اور ذہن سے چند غیر فصیح الفاظ کو زبان سے خارج کر دیا اور اُن کی جگہ خوش آواز اور فصیح الفاظ کا انتخاب کیا۔ مثلاً آئے ہے، جائے ہے، آؤں ہوں، جاؤں ہوں، ٹُک وغیرہ الفاظ کی جگہ آتا ہے، جاتا ہے، آتا ہوں، جاتا ہوں، اور ذرا کا استعمال کیا۔ اور جمہور نے ان پر منظوری کی مہر لگادی، اس کے خلاف ہم کو انھیں کے باب میں ایک مثال ایسی بھی ملتی ہے جہاں ان کے فیصلہ سے جمہور نے اتفاق نہ کیا۔ لفظ "پر" نہایت عمدہ اور خوش آواز لفظ ہے اور مگر کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ناسخ نے اس کی جگہ "مگر" استعمال کرنا چاہا لیکن پیش نہ گئی اور آج تک لفظ "پر" ہر شخص کی زبان پر جاری ہے

ہم اس سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسان زبان میں تبدیلی کر سکتا ہے بشرطیکہ جمہور منظور کرلے۔ ایک فرد واحد بھی زبان میں تغیرات رونما کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے کافی وجوہ ہوں، یہ نہ ہو کہ کوئی جوتا کہے اور ٹوپی مراد لے، اور سونے کے لفظ سے چلنے کا مفہوم پیدا کرے ظاہر ہے کہ ان حماقت مآب باتوں پر کس کو اتفاق ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ہیئت دانوں، منجموں اور جغرافیہ دانوں کو بھی زبان میں نئے نئے الفاظ داخل کرنے کا حق حاصل ہے، مگر ان کے لئے بھی جمہور نے چند اصول مقرر کر دیئے ہیں جن کے خلاف عمل کرنا اپنی قوت زائل کرنا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہیئت داں ایک نئے سیارے کا پتہ لگائے تو اُس کو اس کا نام رکھنے کا بھی حق ہے، مگر یہ نام کسی پرانی دیوی کے نام پر ہو تو بہتر ہوتا ہے۔ جب ہرشل نے Uranus کا پتہ لگایا تو اُس نے وفاداری کے اندھے جوش میں ملکہ وکٹوریہ کے نام سے موسوم کر کے اس کو وکٹوریہ کہا مگر جمہور نے اس سے اختلاف کیا اور مجبوراً اس کو یہ نام بدلنا پڑا۔ اٹلی کے مشہور حکیم گلیلیو نے کسی نئے جسمانی عنصر کا پتہ لگایا اور کسی شخص نے اس کے نام پر اس کا نام Galvenism. رکھ دیا اور جمہور نے اس کو منظور کر لیا۔

ان بیانات سے یہ تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جمہور کو زبان میں تبدیلی کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے البتہ فرد واحد عموماً کچھ قدرت نہیں رکھتا، مگر جمہور بھی تو کوئی آسمانی چیز نہیں۔ افراد کے مجموعے ہی کو ہم

جمہور کہتے ہیں۔ اگر افراد جمہور کی مدد نہ کریں تو اُس سے کوئی کام سرزد نہیں ہو سکتا۔ زبان میں تغیرات کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جمہور کی مقبولیت ذرا دیر میں حاصل ہوتی ہے۔

ہر شخص اپنی جگہ پر غیر شعوری طور سے اپنے اپنے کام میں مشغول رہتا ہے، اور جب بہت سے اشخاص کی متعدد کوششیں بار آور ہوتی ہیں تو ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ جمہور نے فلاں کام کیا۔ حالانکہ جمہور نے کچھ نہیں کیا بلکہ فرداً فرداً ہر شخص نے اپنا کام کیا اور ان کی مجموعی کوششوں سے جو نتیجہ نکلا اس کو جمہور کا کام قرار دیدیا گیا۔ اگر ہر فرد اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ امداد نہ کرے تو کوئی کام تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا جمہور اور فرد کے تعلقات کو ذہن میں اس طرح سمجھیئے کہ جمہور ایک بڑا کنکر ہے اور افراد چھوٹے چھوٹے ذرّات ہیں جن سے ملکر کنکر بنا ہے۔ اِن ذرّات کے باہم مِل جانے سے ان میں اس قدر طاقت آجاتی ہے کہ وہ فرداً فرداً ہر ذرّہ کو ذرا سے اشارے میں برباد کرسکتا ہے، یا یوں سمجھیئے کہ جمہور ایک بڑے دریا کا نام ہے اور افراد چھوٹے چھوٹے قطرات ہیں جن سے ملکر دریا بنا ہے۔ اگر قطرات کو دریا سے الگ کردیا جائے تو دریا کی ہستی معلوم! لیکن ایک قطرہ اور دریا میں جو فرق ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور یہی نسبت جمہور اور فرد واحد میں ہے جس طرح دریا میں خس وخاشاک بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں اسی طرح افراد جمہور کے فیصلہ کی رَو میں بہتے رہتے ہیں۔

ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ جمہور کے سامنے فرد کی کوئی حقیقت نہیں لیکن فرد کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ کاغذ کے کسی کارخانے پر غور کیجئے، ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں اور سیکڑوں مشینیں، مالک کا روپیہ اور دیگر چیزیں ان کی مدد کرتی ہیں۔ اب آپ جس مزدور سے پوچھیئے کہ تم کیا کرتے ہو تو وہ یہی کہے گا کہ میں کاغذ بناتا ہوں۔ لیکن جب کاغذ تیار ہوکر بازار میں بکنے آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کارخانے کا تیار کیا ہوا ہے، حالانکہ جب تک مزدور، مشینیں اور سرمایہ مدد نہ کرتا کاغذ کا تیار ہونا محال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی ایک مزدور کی ہستی زیادہ نہیں لیکن ہر فرد کے کام کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اگر وہ کام نہ کرتے تو کاغذ تیار ہوسکتا

بالکل یہی حالت جمہور اور فرد کی ہے، گو زبان میں سب تبدیلیاں جمہور کے فیصلہ سے ہوتی ہیں لیکن فرد واحد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ وہ ایک حد تک زبان تبدیل کرنے میں بے بس ہے۔ پس ایک فرد اگر زبان میں تبدیلی نہ کرسکا ہو اور خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اُسکی بے بسی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نوع انسان بھی زبان پر قادر نہیں بالکل فضول ہے۔ ہم نے سطور بالا میں یہ بخوبی ثابت کردیا ہے کہ انسان ہر طرح سے زبان پر قادر ہے، وہ نہ صرف زبان میں تبدیلیاں کرسکتا ہے بلکہ نئی نئی زبانیں بھی پیدا کرسکتا ہے،

مملکت میں بھی اس کے بولنے والے چند باؔرتبہ اور مسلّم الثبوت ہستیوں کو اختیارات دیدیتے ہیں جو کہ زبان میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ لوگ ان شہرہ آفاق مصنفین اور مقررین کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی تحریروں اور تقریروں سے لوگوں کا دل موہ کر اُن کے خیالات میں تلاطم بپا کر دیتے ہیں یہ لوگ برابر کام کرتے رہتے ہیں لیکن جب کبھی جمہور کے مسلک کے خلاف کچھ کرنا چاہتے ہیں بدنام ہوکر گمنامی کے غاروں میں گر جاتے ہیں

اُردو زبان میں حضرت ناسخ لکھنوی کا نام کون نہیں جانتا، اُنھوں نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے چند غیر فصیح الفاظ کو زبان سے خارج کر دیا اور اُن کی جگہ خوش آواز اور فصیح الفاظ کا انتخاب کیا۔ مثلاً آئے ہے، جائے ہے، آؤں ہوں، جاؤں ہوں، ٹک وغیرہ الفاظ کی جگہ آتا ہے، جاتا ہے، آتا ہوں، جاتا ہوں، اور ذرا کا استعمال کیا۔ اور جمہور نے ان پر منظوری کی مہر لگادی، اس کے خلاف ہم کو انھیں کے باب میں ایک مثال ایسی بھی ملتی ہے جہاں ان کے فیصلہ سے جمہور نے اتفاق نہ کیا۔ لفظ "پر" نہایت عمدہ اور خوش آواز لفظ ہے اور مگر کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ناسخ نے اس کی جگہ "مگر" استعمال کرنا چاہا لیکن پیش نہ گئی اور آج تک لفظ "پر" ہر شخص کی زبان پر جاری ہے

ہم اس سے اِس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسان زبان میں تبدیلی کر سکتا ہے بشرطیکہ جمہور منظور کرلے۔ ایک فرد واحد بھی زبان میں تغیرات رونما کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے کافی وجوہ ہوں، یہ نہ ہو کہ کوئی جوتا کہے اور ٹوپی مراد لے، اور سونے کے لفظ سے چلنے کا مفہوم پیدا کرے ظاہر ہے کہ اِن حماقت مآب باتوں پر کس کو اتفاق ہو سکتا ہے۔

اِسی طرح ہیئت دانوں، منجموں اور جغرافیہ دانوں کو بھی زبان میں نئے نئے الفاظ داخل کرنے کا حق حاصل ہے، مگر ان کے لئے بھی جمہور نے چند اُصول مقرر کر دیئے ہیں جن کے خلاف عمل کرنا اپنی قوت زائل کرنا ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہیئت داں ایک نئے سیارے کا پتہ لگائے تو اُس کو اس کا نام رکھنے کا بھی حق ہے، مگر یہ نام کسی پُرانی دیوی کے نام پر ہو تو بہتر ہوتا ہے۔ جب ہرشل نے Uranus کا پتہ لگایا تو اُس نے وفاداری کے اندھے جوش میں ملکہ وکٹوریہ کے نام سے موسوم کرکے اس کو وکٹوریہ کہا مگر جمہور نے اس سے اختلاف کیا اور مجبوراً اس کو یہ نام بدلنا پڑا۔ اٹلی کے مشہور حکیم گلیلیو نے کسی نئے جسمانی عنصر کا پتہ لگایا اور کسی شخص نے اس کے نام پر اس کا نام Galvenism. رکھ دیا اور جمہور نے اس کو منظور کر لیا۔

اِن بیانات سے یہ تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جمہور کو زبان میں تبدیلی کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے البتہ فرد واحد عموماً کچھ قدرت نہیں رکھتا، مگر جمہور بھی تو کوئی آسمانی چیز نہیں۔ افراد کے مجموعے ہی کو ہم

جمہور کہتے ہیں۔ اگر افراد جمہور کی مدد نہ کریں تو اُس سے کوئی کام سرزد نہیں ہو سکتا۔ زبان میں تغیر آنے کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جمہور کی مقبولیت ذرا دیر میں حاصل ہوتی ہے۔

ہر شخص اپنی جگہ پر غیر شعوری طور سے اپنے اپنے کام میں مشغول رہتا ہے، اور جب بہت سے اشخاص کی متعدد کوششیں بار آور ہوتی ہیں تو ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ جمہور نے فلاں کام کیا۔ حالانکہ جمہور نے کچھ نہیں کیا بلکہ فرداً فرداً ہر شخص نے اپنا کام کیا اور ان کی مجموعی کوششوں سے جو نتیجہ نکلا اس کو جمہور کا کام قرار دے دیا گیا۔ اگر ہر فرد اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ امداد نہ کرے تو کوئی کام تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا جمہور اور فرد کے تعلقات کو ذہن میں اس طرح سمجھیئے کہ جمہور ایک بڑا کنکر ہے اور افراد چھوٹے چھوٹے ذرّات ہیں جن سے ملکر کنکر بنا ہے۔ اِن ذرّات کے باہم مِل جانے سے ان میں اس قدر طاقت آجاتی ہے کہ وہ فرداً فرداً ہر ذرّہ کو ذرا سے اشارے میں برباد کر سکتا ہے، یا یوں سمجھیئے کہ جمہور ایک بڑے دریا کا نام ہے اور افراد چھوٹے چھوٹے قطرات ہیں جن سے ملکر دریا بنا ہے۔ اگر قطرات کو دریا سے الگ کر دیا جائے تو دریا کی ہستی معلوم! لیکن ایک قطرہ اور دریا میں جو فرق ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اور یہی نسبت جمہور اور فرد واحد میں ہے جس طرح دریا میں خس و خاشاک بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جاتے ہیں اسی طرح افراد جمہور کے فیصلہ کی رَو میں بہتے رہتے ہیں۔

ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ جمہور کے سامنے فرد کی کوئی حقیقت نہیں لیکن فرد کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کاغذ کے کسی کارخانے پر غور کیجئے، ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں اور سیکڑوں مشینیں، مالک کا روپیہ اور دیگر چیزیں ان کی مدد کرتی ہیں۔ اب آپ جس مزدور سے پوچھیئے کہ تم کیا کرتے ہو تو وہ یہی کہے گا کہ مَیں کاغذ بناتا ہوں۔ لیکن جب کاغذ تیار ہو کر بازار میں بکنے آتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کارخانے کا تیار کیا ہوا ہے، حالانکہ جب تک مزدور، مشینیں اور سرمایہ مدد نہ کرتا کاغذ کا تیار ہونا محال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی ایک مزدور کی ہستی زیادہ نہیں لیکن ہر فرد کے کام کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ کام نہ کرتے تو کاغذ تیار نہ ہو سکتا

بالکل یہی حالت جمہور اور فرد کی ہے۔ گو زبان میں سب تبدیلیاں جمہور کے فیصلہ سے ہوتی ہیں لیکن فرد واحد کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ وہ ایک حد تک زبان تبدیل کرنے میں بے بس ہے۔ پس ایک فرد اگر زبان میں تبدیلی نہ کر سکا ہو اور خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اُسکی بے بسی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نوع انسان بھی زبان پر قادر نہیں بالکل فضول ہے۔ ہم نے سطور بالا میں یہ بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ انسان ہر طرح سے زبان پر قادر ہے، وہ نہ صرف زبان میں تبدیلیاں کر سکتا ہے بلکہ نئی نئی زبانیں بھی پیدا کر سکتا ہے،

یادِ شباب

(از پنڈت اندرجیت شرما ماحیرہ ضلع میرٹھ)

عجب وہ نور کا منظر تھا آفتاب کے ساتھ — عیاں تھیں حسن کی نیرنگیاں حجاب کے ساتھ
سکون قلب کو ملتا تھا اضطراب کے ساتھ — مگر یہ راز کھلا دورِ انقلاب کے ساتھ
مزا حیات کا حاصل تھا کچھ شباب کے ساتھ

نہ وہ حصولِ مسرت کی آرزو باقی — شرابِ ناب کے پینے کی وہ نہ خو باقی
نہ وہ خوشی کا فسانہ نہ گفتگو باقی — گلِ حیات وہ باقی نہ اُس کی بُو باقی
کہاں وہ جوشِ جنوں سرمیں اضطراب کے ساتھ

دیا تھا جس نے کبھی روح کو پیامِ حیات — ملا تھا جس کے سبب لطفِ زندگی دن رات
بھلائے بیٹھا ہے دل اب اُسی کے احسانات — اُسی کی دل میں کھٹکتی ہے خار بن کر بات
اُسی کا نام لبوں پر ہے اجتناب کے ساتھ

گیا وہ دورِ زمانہ اُڑا وہ رنگِ چمن — نشاط و عیش کے منظر ہوئے ہیں وقفِ محن
لہو رُلاتی ہے آنکھوں کو داستانِ کہن — دلِ حزیں کو ہے اب آرزوئے گور و کفن
ثوابِ زیست کا ہے ذکر بھی عذاب کے ساتھ

کہاں وہ ساقی، وہ مطرب کہاں وہ میخانہ — کہاں وہ بادۂ گلگوں، کہاں وہ پیمانہ
ہُوا ہیں ہوش، اُڑا ہے خیال مستانہ — نہ کوئی بات ہے اگلی، نہ کوئی افسانہ
گمانِ بحر ہی جاتا رہا سراب کے ساتھ

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شب درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اسکی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

اقبالؔ

آغا حشر

(از مظفر حسین صاحب شمیم)

آغا حشر مرحوم اُردو اور ہندی کے سب سے بڑے ڈراما نگار تھے، مگر بدقسمتی سے اُن کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ چونکہ مجھے آغا صاحب کو ہر رنگ میں دیکھنے اور اُن سے ملنے کا موقعہ ملا ہے اس لئے میں آج آپ کے سامنے اُن کی شخصیت کا ایک دُھندلا سا خاکہ پیش کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں صرف وہی واقعات بیان کئے جائیں گے جو یا تو میرے ذاتی مشاہدے میں آئے ہیں یا اُنھیں میں نے خود آغا صاحب سے سُنا ہے۔

آغا حشر بنارس کے رہنے والے تھے، اُن کا اصلی نام آغا محمد شاہ اور والد کا نام آغا خلیل شاہ تھا آغا خلیل شاہ کشمیری الاصل تھے اور بنارس میں دوشالوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ آغا حشر کی والدہ کا وطن مراد آباد تھا۔ انھوں نے اُردو۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر پائی تھی، اور تیرہ چودہ برس کی عمر میں ناٹک کے شوق میں گھر سے بھاگ کر بمبئی آ نکلے تھے۔ آغا صاحب بمبئی کے ایک سستے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ وہ جس قدر روپیہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گیا۔ اب ہوٹل کا بل ادا کرنے کی فکر ہوئی اور یہ خیال رہ رہ کر ستانے لگا کہ بمبئی جیسے غدّار شہر میں زندگی کیسے بسر ہو گی اُن دنوں بمبئی میں شعروشاعری کا بڑا چرچا تھا، گھر گھر شاعری کا شوق تھا اور دوسرے چوتھے دن شہر میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بمبئی میں ایک بزرگوار گرامی سید تحمل حسین جلال پوری نامی رہا کرتے تھے۔ ساری بمبئی ان کے شاعرانہ کمالات کی قائل تھی اور پورا شہر، ان کے شاگردوں سے بھرا پڑا تھا۔ آغا صاحب نے ازل ہی سے موزوں طبیعت پائی تھی، وہ بھی ان مشاعروں میں شریک ہونے لگے، ابھی اُنھوں نے دو چار مشاعروں ہی میں شرکت کی تھی کہ یہاں کے شعرا میں اُن کی خوب آؤبھگت ہونے لگی، اور بہت سے لوگ جنھیں زبردستی شاعر بننے کا خبط تھا، معاوضہ پر اُن سے غزلیں لکھوا لکھوا کر ان مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھنے لگے۔ حضرت تحمل کو آغا صاحب کی شاعرانہ شہرت اور ہر دلعزیزی ناگوار گزری اور اُنھوں نے آغا صاحب کی شاعری پر اعتراضات کرنا شروع کر دیئے۔ اب کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ ایک طرف حضرت تحمل اور اُن کے شاگردوں کا ہجوم تھا

اور دوسری طرف تن تنہا آغا صاحب۔ دونوں جانب خوب خوب چشمکیں ہوئیں، اور بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اس کشمکش سے ایک طرف تو آغا صاحب کو روٹی کے جھگڑے سے نجات مل گئی اور دوسری طرف بمبئی میں ان کی شاعرانہ شہرت قائم ہوگئی۔ لیکن اصل میں انھیں ناٹک کا شوق بمبئی کھینچ لایا تھا، ورنہ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود تھا۔ اگر محض روٹیوں کا سوال پیش نظر ہوتا تو وہ بنارس کی دلچسپیاں چھوڑ کر بھنڈی بازار کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں زندگی گزارنے کیوں آتے؟ حسن اتفاق سے آغا صاحب کو اسی زمانہ میں ایک ناٹک کمپنی میں ایک چھوٹی سی ملازمت مل گئی۔ اس کمپنی میں ایک ہندوستانی میم بھی ملازم تھی، اس کی شیکسپیئر کے ڈراموں پر بڑی اچھی نظر تھی، اس میم سے آغا صاحب کی اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ وہ ان کی خداداد ذہانت سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے انھیں تمثیل نگاری کی طرف توجہ دلائی اور انھوں نے "محبت کا پھول" نامی ڈرامہ لکھا مگر وہ اسٹیج پر نہیں کھیلا گیا۔ اس سے پہلے بنارس میں بھی انھوں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا لیکن وہ بھی کبھی اسٹیج پر نہیں آیا۔ اصل میں بمبئی سے آغا صاحب کی ڈرامہ نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میم نے شیکسپیئر کے بعض ڈرامے ترجمہ کرکے ان کے خلاصے ان کے حوالے کیئے اور انھوں نے انھیں اردو ڈراموں کے قالب میں ڈھالا۔ اسی دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی بمبئی آنکلے اور آغا صاحب کے ساتھ رہنے لگے، یہ مذہبی مناظروں کا زمانہ تھا، آغا صاحب کو بھی اس کا چسکا لگ گیا، اور وہ اور مولانا آزاد دونوں ان مناظروں میں شریک ہونے لگے۔ چند سال اس طرح گزر گئے آغا صاحب مناظروں کے شوق میں دہلی اور پنجاب کی سیاحت کرتے رہے اور اس سیر و سیاحت کے بعد پھر بمبئی تشریف لے آئے۔ اب ان کی شہرت پہلے سے بہت بڑھ چکی تھی، چنانچہ یہاں پہونچتے ہی وہ ایک ناٹک کمپنی میں ڈراما نویسی کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ اسی دوران میں مولانا شبلی نعمانی بمبئی تشریف لائے اور حسن اتفاق سے آغا صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اس کے بعد مولانا شبلی جب کبھی بمبئی آتے آغا صاحب سے برابر ملا کرتے، اور واقعی انھیں بمبئی میں حشر سے زیادہ دلچسپ اور کون آدمی مل سکتا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں کلکتے کی ایک ناٹک کمپنی کو ایک تمثیل نگار کی ضرورت ہوئی اور اس نے آغا صاحب کو طلب کر لیا۔ آغا صاحب چند سال اس کمپنی میں رہے مگر خدا جانے بعد میں کیا پیچ پڑا کہ انھوں نے اس ملازمت کو چھوڑ کر خود اپنی ناٹک کمپنی قائم کی۔ آغا صاحب کو میں نے نہایت کم سنی میں غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں جبل پور میں دیکھا تھا۔ یہاں وہ اسی کمپنی کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ یہ کمپنی آغا صاحب کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھی مجھے اب بھی دھندلا سا خیال ہے کہ وہ رات کو تھیٹر کے باہر ایک آرام کرسی پر متمکن نظر آتے اور دوسری کرسیوں پر بعض اور لوگ بیٹھے دکھائی دیتے تھے، پاس ہی ایک حقہ رکھا رہتا تھا جس کی سٹک آغا صاحب کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔

آغا صاحب گورے چٹے اور قد آور انسان تھے، مونچھیں بڑی بڑی رکھتے تھے اور داڑھی منڈایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں مونچھیں بہت باریک رکھنے لگے تھے، ایک آنکھ سے کچھ ترچھا دیکھا کرتے تھے مگر اس عیب کا اُس وقت تک اندازہ نہ ہوتا تھا جب تک کہ کوئی شخص غور سے اُن کی جانب نہ دیکھے۔ اُن کے دوست شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم کہا کرتے تھے کہ ایک شخص بھینگا بھی ہو اور خوبصورت بھی، ایسا آدمی حشر کے سوا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ بال ہمیشہ الٹے کاڑا کرتے اور اُن میں تیز خوشبودار تیل ڈالا کرتے تھے۔ سُنا ہے کہ جوانی میں اکثر سوٹ پہنا کرتے تھے، مگر میں نے جس زمانے میں دیکھا اُس وقت کوٹ قمیص، شلوار اور سلیم شاہی جوتی پہنا کرتے تھے۔ اور سر پر اکثر بالوں کی ٹوپی یا گاندھی کیپ ہوتی تھی۔ مرنے سے آٹھ نو سال پہلے سے اکثر ریشمی برمی لنگی باندھا کرتے تھے اور کبھی کبھی سوٹ بھی پہن لیا کرتے تھے۔

میں نے جلیبور کے بعد شاید انھیں ۱۹۲۵ء میں اخبار "عصر جدید" کلکتہ کے دفتر میں دیکھا اور یہیں اُن سے تعارف ہوا۔ اُس زمانے میں آغا صاحب کا مدن تھیٹرس کلکتہ سے تعلق تھا اور اُن کی تمثیل نگاری کی شہرت کا آفتاب بام عروج پر پہونچ چکا تھا۔ وہ ہر دوسرے چوتھے دن شام کے وقت عصر جدید کے دفتر میں تشریف لاتے اور بڑی پر لطف صحبتیں گرم ہوتیں۔ اُن کی بات چیت کا انداز اتنا دلکش تھا کہ جو شخص ایک مرتبہ بھی اُن سے گفتگو کرتا اُسے ہمیشہ دوسری مرتبہ اُن کی گفتگو سننے کی آرزو رہتی، وہ بڑے موزوں طبع تھے۔ اور شاعری کے لئے اُن کی طبیعت ہمیشہ حاضر رہتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے دوست حکیم فقیر محمد مرحوم کے اصرار پر "شکریۂ یورپ" اور "موج زمزم" جیسی نظمیں بہت ہی قلیل عرصہ میں لکھ ڈالیں۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں "عصر جدید" کے ایڈیٹر مولانا شائق احمد عثمانی نے "نشتر" نام سے ایک رسالہ نکالا، رسالے کے اور حصے چھپ چکے تھے اور صرف چند صفحات چھپنے کو باقی رہ گئے تھے مولانا شائق آغا صاحب کے مکان پر پہونچے اور آغا صاحب سے کہا کہ رسالہ کے لئے کوئی نظم یا غزل عنایت فرمائیے۔ آغا صاحب نے عدیم الفرصتی کا عذر کیا اور فرمایا کہ ابھی تو کچھ بھی موجود نہیں۔ مولانا کا اصرار شروع ہوا۔ آغا صاحب نے پہلے تو مولانا کو بہت ٹالنا چاہا مگر جب وہ کسی طرح نہ ٹلے تو آغا صاحب نے فی البدیہہ ایک غزل لکھوادی جس کے تین شعر اب بھی مجھے یاد ہیں:-

جہانِ دلبری میں دلربا تجھ سا نہیں پایا
ترے حسنِ ستم کو بھی محبت آفریں پایا

یہ تارے ہیں کہ موجِ نور کے چھلکے ہوئے قطرے
کہاں سے اے قمر تو نے یہ جامِ آتشیں پایا

محبت حشر سازِ حسن کے تاروں کی جنبش ہے
اِسی سے رُوحِ شاعر نے سرودِ دلنشیں پایا

آغا حشر کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا، وہ بہت سی کتابیں اور رسالے خریدا کرتے اور انھیں ایک بار پڑھکر پھینک دیتے تھے جس کے جی میں آتا اُن کی پڑھی ہوئی کتابوں کو اُٹھالے جاتا، انھیں اس کی کوئی پروا نہ ہوتی

جس کسی کے گھر پہونچتے سب سے پہلے اُن کی نظر اُس کی کتابوں پر پڑتی، جو کتابیں پسند آتیں وہ اٹھا لیجاتے اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتے۔ جس اخبار کے دفتر میں جا نکلتے جب تک ایڈیٹر کی میز پر پڑے ہوئے تمام اخباروں کو نہ پڑھ ڈالیں اُنھیں چین نہ آتا تھا۔ اُن کا مطالعہ کا شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ اگر کبھی راہ چلتے کسی کتاب کا کوئی ورق مل جاتا تو اُسے بھی اُٹھا کر وہیں پڑھ لیتے یا جیب میں رکھ لیتے اور اوّلین فرصت میں اسے پڑھکر پھینک دیتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ اُنھیں جتنا زیادہ پڑھنے کا شوق تھا اُتنا ہی زیادہ وہ ہاتھ سے لکھنے سے جی چُراتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ خط بھی دوسروں ہی سے لکھوایا کرتے تھے۔ ڈراما لکھنے کے لئے اُن کے ساتھ ہمیشہ ایک منشی رہا کرتا تھا۔ آغا صاحب کہتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا۔ جس زمانے میں آغا صاحب ڈراما لکھواتے تھے وہ کسی سے نہ ملتے تھے۔ اُن کے ڈراما لکھوانے کی رفتار بڑی تیز تھی اُنھوں نے کئی سال ہوئے میرے سامنے مدن تھیٹرس کلکتہ کے لئے "بھیشم پرتگیا" نام ایک طویل ڈراما صرف پندرہ روز میں لکھوا دیا تھا۔ کوئی ڈراما لکھوانے سے پہلے وہ یہ کیا کرتے تھے کہ جس زمانے اور جس موضوع کے متعلق ڈراما ہو وہ اُس زمانے اور اُس زمانے کی تمام جزئیات سے واقف ہونے کی کوشش کرتے اور اس سلسلے میں جس قدر لٹریچر ملتا اُسے اچھی طرح پڑھ لیتے۔ اس کے بعد اپنے ذہن میں ڈراما کا ایک خاکہ مرتب کر کے ڈراما لکھواتے تھے، اُن کے ڈرامہ لکھوانے کا ایک خاص وقت ہوتا تھا اور عموماً یہ وہ وقت ہوتا جب وہ بالکل مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے۔ مگر جب وہ ڈراما لکھاتے تو اُس کی رفتار اتنی تیز ہوتی کہ دوسرے لوگ جو کام سال بھر میں کرتے آغا صاحب وہی کام پندرہ روز یا مہینہ بھر میں ختم کر دیتے تھے۔

آغا صاحب نے ساری زندگی تمثیل نگاری میں گزار دی اور جس دن سے اُنھوں نے اس میدان میں قدم رکھا اُس روز سے لے کر موت کے دن تک کم سے کم اُردو اور ہندی ڈرامے میں کسی کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ مگر اُن کا کوئی بھی ڈراما اب تک صحیح صورت میں چھپ کر بازار میں نہیں آیا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ آغا صاحب نے اُردو۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر ہی پر پائی تھی، اور بمبئی کے دوران قیام میں تھوڑی سی گجراتی، مرہٹی اور انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ اسی طرح بنگال میں رہ کر اُنھوں نے بنگلہ زبان بھی سیکھ لی اور اس میں اُنھیں اتنا ملکہ حاصل ہو گیا تھا کہ اُنھوں نے اس زبان میں "اپرادھی کئے" (مجرم کون ہے؟) کے نام سے ایک ڈراما بھی لکھا اور یہ کلکتے میں اسٹیج پر بھی کھیلا گیا۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے ڈرامے کے علاوہ مختلف مضامین پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع ہو گئی تھی۔ خطابت میں بھی اُنھیں

بڑا کمال حاصل تھا۔ جس مجمع میں وہ تقریر کرتے وہاں اُن کے آگے کسی دوسرے شخص کی تقریر کا رنگ جمنا مشکل ہو جاتا تھا وہ مشاعروں اور عام جلسوں میں تحت اللفظ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ مگر اُن کے پڑھنے کا انداز اتنا مؤثر اور دلکش تھا کہ بڑے بڑے شاعروں کا رنگ اُن کے آگے پھیکا پڑ جاتا تھا

اُن کا ایک منہ چڑھا ملازم تھا اُس کا نام خوشی رام تھا۔ یہ بہت زمانے سے اُن کے ساتھ تھا اور اُنھیں "بھیا" کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اسی کے ذمّہ تھا، یہ بالکل پڑھا لکھا نہ تھا مگر بلا کا ذہین تھا، چنانچہ جب آغا صاحب کوئی نیا ڈراما لکھتے تو اُسے سُنا کر اُس کی رائے ضرور لیا کرتے، اگر کوئی مقام اس کی سمجھ میں نہ آتا تو وہ اس پر دوبارہ غور کرتے اور اگر وہ کچھ اعتراض کرتا تو اُس کے اعتراض کو توجہ سے سُنتے۔ میں نے ایک مرتبہ اُن سے اس کا سبب پوچھا، فرمانے لگے کہ "ہندوستان میں ذہنی اعتبار سے اوسط درجے کے آدمی کا ذہن خوشی رام کے ذہن سے بلند نہیں ہوتا اور یہ ابتدا سے میرے ساتھ ہے، رات دن ناٹک والوں میں رہا ہے اور اسٹیج پر بھی سینکڑوں ڈرامے دیکھے ہیں۔ اگر کوئی ڈراما اسے پسند نہیں آتا تو پھر اس ڈرامے کی کامیابی بہت مشکل ہے۔" خوشی رام اب بھی حیات ہے اور پٹیالہ میں موجود ہے، اگر اس کے پاس آغا صاحب کے بعض غیر مطبوعہ ڈراموں کے مسودے نکل آئیں تو کوئی تعجب نہیں

آغا حشر میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ ہر آدمی سے اُس کے طبعی رُجحان کے مطابق باتیں کیا کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ کلکتے میں تھے تو جب کبھی ہندی یا بنگلہ کا کوئی ایڈیٹر یا ادیب مل گیا تو اُس سے بنگلہ۔ ہندی اور سنسکرت کے ادب و شعر پر گفتگو ہونے لگی، اور اگر کوئی اُردو اخبار کا ایڈیٹر آ گیا تو اُس سے سیاست پر بات چیت شروع ہو گئی۔ اگر اسی بات چیت کے درمیان میں کوئی ایکٹر آ نکلا تو اُس سے ناٹک کمپنیوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ لاہور میں بھی اُن کی یہی کیفیت تھی حکیم فقیر محمد مرحوم سے اُن کی بہت قدیم اور بے تکلفانہ دوستی تھی۔ اُن سے جب ملاقات ہوتی کبھی کسی خانگی مسئلے پر گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق شروع ہو جاتا۔ اگر آغا صاحب کو بات چیت میں بڑا کمال حاصل تھا تو حکیم صاحب بھی اُن سے کچھ کم نہ تھے۔ دونوں ایک دوسرے پر عجیب عجیب پھبتیاں کستے اور ساری محفل کشت زعفران بن جاتی اور انھیں چہلوں میں صبح سے شام ہو جاتی۔ آغا صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود کسی کے دشمن نہ تھے۔ اور جب کوئی اُن سے دشمنی کرتا تو وہ اُس کی دشمنی کو کچھ بُرا بھلا کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو ایک منٹ میں دل سے معاف کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور کے ایک فلمی رسالہ کے ایڈیٹر نے انھیں اپنے رسالے میں جی بھر کے گالیاں دیں۔ یہ بات اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو بہت ناگوار گزری۔ ان لوگوں کے کہنے سُننے سے اُنھوں نے اس ایڈیٹر پر کلکتے میں ازالۂ حیثیت عُرفی کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اُس ایڈیٹر

نے بھی اس کے جواب میں لاہور میں اُن کے خلاف نالش دائر کر دی۔ اسی زمانے میں آغا صاحب لاہور تشریف لائے۔ ہم لوگوں نے اس ایڈیٹر کو اس کی غلطی سے آگاہ کیا، اُسے بھی اس کا احساس ہوا اور وہ آغا صاحب سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو گیا، اب ہم لوگ عدالت چلے تاکہ راضی نامہ داخل کر دیا جائے۔ نہ معلوم عدالت کے دروازے پر اُس ایڈیٹر کے جی میں کیا بات آئی کہ وہ مچل گیا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر بیٹھا ہم لوگوں کو سخت ندامت ہوئی کہ آغا صاحب تو ہمارے کہنے سے یہاں تک آ گئے اور اس شخص نے عدالت کے دروازے پر یہ عجیب حرکت کی، آغا صاحب کو بھی اس حرکت سے بڑا غصہ آیا، اور وہ کہنے لگے کہ "اب جب تک اس کو جیل نہ بھجوا لوں چین سے نہ بیٹھوں گا" آخر کار چند روز بعد اس ایڈیٹر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اُس نے آغا صاحب سے صلح کر لی۔ اس کے بعد آغا صاحب اِس واقعہ کو اس طرح بھول گئے جیسے کبھی کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ جن لوگوں میں کوئی خاص بات ہوتی وہ اُن کی قدر بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ رستم جی آجہانی مینیجنگ ڈائرکٹر مدن تھیٹرس کلکتہ کے ساتھ مدن تھیٹرس کے اُس شعبہ میں جا نکلے جس کا تعلق موسیقی سے تعلق ہے۔ اِس شعبہ میں بنگال کے نامور شاعر قاضی نذر الاسلام جن کی منتخب نظموں کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے شائع کیا ہے ڈائرکٹر تھے۔ جب قاضی صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ یہ آغا حشر ہیں تو وہ ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور آغا صاحب، قاضی صاحب سے رخصت ہو کر رستم جی کے ساتھ آگے نکل گئے۔ اب آغا صاحب نے تنہائی میں رستم جی کو قاضی نذر الاسلام کی شاعرانہ حیثیت سے آگاہ کیا اور اُن کی تنخواہ میں اضافہ کرا دیا۔

آغا صاحب کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی عظمت پائی جاتی تھی، بالعموم اُن کے ساتھ ایک پرائیوٹ سکریٹری رہا کرتا تھا، اور یہ سکریٹری اکثر پارسی ہوتا تھا، نہ معلوم پارسی کو سکریٹری مقرر کرنے میں اُن کی کیا مصلحت تھی۔ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو وہ کبھی بطور خود اُس سے ملنے نہ جاتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اُس سے کہیں راہ ہٹ میں ملاقات ہو گئی اور وہ اُن کے گھر آنے جانے لگا تو یہ بھی اُس کے گھر جا نکلتے۔ مگر جن لوگوں سے تعلقات ہو جاتے وہ ان سے دل سے ملتے۔ اِن کے ملنے والوں میں سماج کے ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، ایک طرف راجہ مہاراجہ تھیٹروں اور فلم کمپنیوں کے مالک اور بڑے بڑے قابل لوگ ہوتے، اور دوسری طرف چھوٹے بڑے ہر قسم کے ایکٹر اور ایکٹرس، ارباب نشاط اور معمولی طالب علم ہوا کرتے تھے، اور وہ سب سے یکساں محبت اور لطف سے پیش آتے تھے۔

اُنھیں اداکاری اور ادا آموزی میں بھی کمال حاصل تھا، مگر جہاں تک مجھے علم ہے اُنھوں نے اسٹیج پر خود کبھی کوئی پارٹ نہیں کیا۔ البتہ ایک مرتبہ وہ یہ ضرور فرماتے تھے کہ ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں اٹلی کی ایک فلم کمپنی

بعض مناظر کی تصاویر لینے ہندوستان آئی تھی، وہ کمپنی خاموش فلمیں تیار کرتی تھی۔ اتفاق سے عین وقت پر ایک ایکٹر بیمار ہوگیا اور آغا صاحب نے اُس کی جگہ پارٹ کیا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ ادا آموزی میں آغا صاحب کا ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی حریف نکل سکے۔

ایک بار مسٹر جی۔ ایل۔ آنند ڈائرکٹر "حشر پکچرس" مجھ سے فرماتے تھے کہ آغا صاحب نے خود آتنا اچھا ادا آموز ہوکر نہ معلوم مجھے کیوں ادا آموزی کے لئے انتخاب فرمایا ہے۔ اسٹیج اور فلم کے بعض دوسرے بڑے بڑے نامور ایکٹروں سے اُن کے متعلق کم وبیش یہی رائے سُنی گئی ہے۔ جب آغا صاحب اپنے ڈراموں کے مختلف مناظر دوستوں کی محفلوں میں سنایا کرتے تھے تو سُنانے کا انداز اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ ایک سماں سا بندھ جاتا اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ آغا صاحب دن کو بہت کم باہر نکلا کرتے تھے، وہ زیادہ تر شام ہی کے وقت سیر کو جاتے تھے۔ جس زمانے میں شراب پیا کرتے تھے اُس زمانے میں عموماً کسی انگریزی شراب خانے میں جا بیٹھتے اور وہاں سے دس گیارہ بجے رات کو باہر نکلتے۔ اُنھیں چاندنی راتوں میں سیر کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ لاہور میں زندگی کے آخری ایام میں وہ اپنے ٹانگے میں بیٹھ کر اکثر آدھی رات کے بعد چاندنی راتوں میں لارنس باغ کی سیر کیا کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ جس طرح آغا صاحب ایک زبردست ڈرامہ نویس تھے اُسی طرح اُن کی گھریلو زندگی بھی ایک نہایت عجیب اور دلچسپ ڈرامہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

رُباعیاتِ شاد

(مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد)

اے شاد خودی سے جو گزر جاتے ہیں — واللہ وہی مطلوب کو پا جاتے ہیں
اللہ ہی کے ہو رہتے ہیں اللہ والے — یوں شان کو وہ اپنی دکھا جاتے ہیں

گر صبح رخ یار ہے زلفیں ہیں رات — ہیں کفر اور اسلام کے یہ ہی آیات
اللہ کو جو پہچانے تعصب سے بچے — عرفان کے اے شاد یہی تو ہیں نکات

ہے موت عناصر کا معطل ہونا — کہتے ہیں اِسی شکل کو سب لوگ فنا
آئے گی کبھی موت نہ عاشق کو شاد — حاصل ہے اُسے ذاتِ الٰہی سے بقا

روحِ بہار

(از اظہار حسن صاحب اظہار، ملیح آباد لکھنؤ)

بیٹھا تھا کل میں شب کو تالاب کے کنارے
نکھری ہوئی فضا تھی چھٹکے ہوئے تھے تارے

رہ رہ کے دل میں غم کے شعلے مچل رہے تھے
باغوں کے سرد جھونکے اشکوں میں ڈھل رہے تھے

بیٹھا تھا کچھ فسردہ اک شاخ پر پپیہا
دریائے رنگ و بو میں ڈوبا ہوا تھا صحرا

دل کو ہوائیں دامن حوروں کے دے رہے تھے
گا گا کے کشتیوں کو ملاح کھے رہے تھے

رہ رہ کے آ رہی تھی سوندھی زمیں سے خوشبو
خوشبو ٹپک رہی تھی آنکھوں سے بن کے آنسو

ہلکی ہوئی فضا میں اِک آگ جل رہی تھی
رہ رہ کے زندگانی کروٹ بدل رہی تھی

وا تھے شراب خانے مدہوش بوندیوں میں
حسرت برس رہی تھی گنجان جھاڑیوں میں

تھم تھم کے ہو رہا تھا یوں درد سا جگر میں
بھولا ہوا مسافر جیسے کسی شہر میں

سینوں میں جگنوؤں کے دل تھرتھرا رہے تھے
برسات پر پپیہے آنسو بہا رہے تھے

اتنے میں دیکھا، آئی گاؤں کی ایک لڑکی
تالاب کے کنارے مدہوش بہکی بہکی

کرتا تھا بےخودی کی ہر گام ترجمانی
سویا ہوا لڑکپن کھوئی ہوئی جوانی

نظروں میں شوخیوں کی تلوار چل رہی تھی
ہر سانس میں اک حسرت پہلو بدل رہی تھی

نیچی نگاہ سے یوں کرتی تھی وہ اشارہ
جیسے کہ آسماں پر کانپے سحر کا تارہ

آنکھوں میں اس طرح سے پھیلا ہوا تھا کاجل
جس طرح آسماں پر چھائے ہوئے ہوں بادل

اُس کی طرف چلا میں جب کچھ رہا نہ قابو
بہتے تھے ہر قدم پر آنکھوں سے میری آنسو

اُس کے قریں گیا تو بیخود سا ہو گیا میں
طاری ہوئی خموشی اور اُس میں کھو گیا میں

دیکھا جو غور سے تو کچھ بھی نہ تھا وہاں پر
بس اِک سحر کا تارا نکلا تھا آسماں پر

افسوس اُس گھڑی کچھ پہچانتا نہیں تھا
روحِ بہار تھی وہ میں جانتا نہیں تھا

رفتارِ زمانہ

موجودہ لڑائی کو ایک سال تین مہینے ہو چکے ہیں، اور جہاں تک برطانیہ و جرمنی کے درمیان خشکی کی لڑائی کا تعلق تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ برطانیہ کے بحری بیڑہ کی وجہ سے جرمنی کو ساحل برطانیہ پر فوجیں اُتارنے کی ہمت نہیں پڑی۔ البتہ ہوائی جہازوں کے حملے کبھی کم اور کبھی زیادہ برابر ہو رہے ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر لندن جنوب مشرقی انگلستان اور ویلز کے شہروں پر رہی ہے۔ اِن حملوں سے برطانیہ میں جان و مال کا ضرور نقصان ہوتا ہے لیکن جرمنی کا نقصان بھی کم نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاں تک ہوائی جہازوں اور اُن کے ہوابازوں کا تعلق ہے جرمنی کا نقصان نسبتاً بہت زیادہ ہوا ہے۔ ادھر برطانیہ کی رائل ایر فورس بھی جرمنی اور جرمنی کے مقبوضہ ملکوں، شہروں، بندرگاہوں اور دوسرے اہم مقامات پر بمباری کر کے شدید نقصان پہونچا رہی ہے۔ برطانوی حملے زیادہ تر صنعتی کارخانوں اور فوجی مقامات پر ہوئے۔ اسی لئے اب جرمنی کے ہوائی حملوں کا بھی رُخ بدل گیا ہے۔ اور اس طرف انھوں نے انگلستان کے صنعتی رقبوں پر توجہ دینا شروع کی ہے۔ چنانچہ کوونٹری اور مڈلینڈ وغیرہ پر حملے کئے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ محض ہوائی حملوں سے کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ برطانیہ سخت ترین حملے برداشت کر چکا۔ اور اس وقت تک ان شدید اور مسلسل حملوں کے باوجود اہل برطانیہ کے معمولی کاروبار میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ مثال کے لئے دیکھ لیجئے کہ قریب قریب ہر اخبار کے دفتر پر ہوائی حملہ ہوا لیکن اب تک کسی اخبار کی اشاعت ایک دن کے لئے بھی بند نہیں ہوئی۔ اسی طرح دوسرے سب کام بھی بدستور جاری ہیں۔ گورنمنٹ تباہ شدہ رقبہ میں دوبارہ تعمیر مکانات کا کام بھی ہاتھ میں لے رہی ہے۔ اس لئے عمارتوں کے سرکاری بیمہ کی اسکیم جاری کی گئی ہے اور تباہ شدہ مکانات کے مرمت کا بھی پورا انتظام کیا ہے اور مصیبت زدہ لوگوں کی دوسرے طریقوں سے بھی امداد کر رہی ہے۔ جرمنی کو بھی اب ہوائی حملوں کا تجربہ ہو رہا ہے چنانچہ میونخ پر پچھلے دنوں روس کے وزیر خارجہ کی آمد کے موقعہ پر برطانوی ہوائی جہازوں کے حملے نے برطانوی ایر فورس کی قوت کا سکہ بٹھلا دیا ہے بہرحال ہوائی حملوں سے ہٹلر کو تو کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ البتہ عوام انگلستان کے جنگی جوش میں مزید ترقی ہو گئی۔ اور لوگ اب پہلے سے بھی زیادہ ہٹلر شاہی کو ختم کرنے پر مستعد ہو گئے ہیں۔ انگلستان پر حملہ کا منصوبہ اب تک پورا نہیں ہو سکا تو اب کیا ہو گا۔ کیونکہ برطانیہ کی فوجی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ البتہ دوسرے محاذوں پر جرمنی برطانیہ کو نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس میں بھی اُسے ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً بحر روم سے برطانیہ

کو پریشان کرکے اُس کی چونا کہ بندی کرنا چاہتا تھا اس میں بھی ہٹلر کامیاب نہیں ہوا۔ اس امر میں اٹلی سے جو امداد ملنے کی توقع تھی وہ بھی پوری نہیں ہوئی۔ بلکہ اٹلی نے یونان پر جو حملہ کردیا تھا اس میں اُسے بڑی زک ملی۔ محوری طاقتوں کا عجب حال ہے۔ اُن کے قول و فعل کا کوئی اعتبار ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ جب اٹلی نے فرانس اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا تو یوگوسلاویکا یونان۔ ٹرکی اور مصر ان سب کو اُس نے پورا پورا اطمینان دلایا تھا کہ انھیں اٹلی سے کوئی گزند نہیں پہونچے گا لیکن جب جرمنی نے رومانیہ۔ بلغاریہ اور یگوسلاویکا پر اثر جمایا تو ۲۸۔ اکتوبر کو علی الصباح سفیر اٹلی نے بلا کسی وجہ کے یونان کے وزیر اعظم کو برطانیہ سے سازو باز رکھنے کا الزام لگاکر یہ مطالبہ کیا کہ ایتھنز پایۂ تخت یونان اور چند دیگر مقامات کو جنگ کے دوران بھر اٹلی کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ یہ مطالبہ کوئی خود دار خود مختار سلطنت منظور نہ کرسکتی تھی۔ چنانچہ حکومت یونان نے بھی الٹی میٹم کو رد کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطالوی فوجوں نے یونان پر دو سمت سے حملہ کردیا۔ ایک حملہ آرگائیکاسترو کے فوجی مرکز سے کیا گیا جہاں اطالوی فوجوں کا سب سے زیادہ جماؤ تھا۔ اس حملہ کا رخ سالونیکا کی طرف تھا۔ دوسرا حملہ کورٹزا کے فوجی اڈے سے یونان کے مغربی ساحل کے متوازی کیا گیا۔ جس کا رُخ شہر یانینہ کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ ایک تیسرا حملہ جزیرۂ کارفو پر کیا گیا جو البانیہ کے مغرب کی طرف بحیرۂ آیونین میں ایک اہم یونانی جزیرہ ہے اور جس پر اٹلی کا مدتوں سے دانت ہے۔ اس کے علاوہ اٹلی کی بحری و ہوائی قوتیں بھی یونان کے خلاف استعمال کی گئیں اور یونان کے پایۂ تخت ایتھنز اور دوسرے شہروں پر حملے کرکے جان و مال کا کافی نقصان پہونچایا گیا۔ یونان نے دشمن کا خوب بہادری سے مقابلہ کیا اور برطانیہ نے بھی ہر طریقے سے یونان کی مدد کی۔ برطانیہ نے کریٹ اور دوسرے اہم یونانی جزیروں میں فوجیں اُتار کر پائدار بحری و ہوائی برطانوی اڈے قائم کرلئے اور برطانیہ کے بحری بیڑے نے اطالوی جہازوں کے راستے ہر طرف روک رکھے ہیں۔ کئی مرتبہ مقابلہ ہوا لیکن اطالوی بیڑا ہمیشہ منھ چھپاکر بھاگتا نظر آیا۔ اور اب تک کسی دن ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ برطانوی ہوائی جہازوں نے اٹلی کی بندرگاہ ٹارنٹو پر بھی زبردست حملے کرکے کئی اطالوی جنگی جہاز بیکار کردیئے۔ اس کے علاوہ برطانوی ہوائی جہازوں نے نیپلز، ٹیورین، برنڈسی، میلان، درونہ اور دوسرے اہم اطالوی مرکزوں پر بمباری کرکے بہت نقصان پہونچایا ہے۔ شروع شروع میں تو اطالوی فوج دس بارہ میل تک یونانی علاقہ میں گھس گئی تھی لیکن انگریزی فوج پہونچتے ہی اطالوی پیش قدمی رک گئی۔ یونان اور اٹلی کی لڑائی میں سب سے بڑا معرکہ کورٹزہ میں ہوا جہاں گیارہ دن تک خونریز معرکے ہوتے رہے۔ آخرکار اطالوی فوج پسپا ہوتے پر مجبور ہوئی۔ اور ۲۱۔ نومبر کو یونانیوں نے کورٹزہ پر قبضہ کرلیا یہ شہر ایک بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ اور فوجی لحاظ سے یہ نہایت مستحکم مقام تھا۔ چنانچہ اٹلی نے یہاں اپنا فوجی مرکز قائم کیا تھا مگر یونانی فوج نے گرد و نواح کی تمام پہاڑیوں پر قبضہ کرکے کورٹزہ کا محاصرہ کرلیا۔ اطالوی فوج جب مقابلہ نہ کرسکی تو بھاگ گئی

اور اہل کورٹزہ نے شہر یونانیوں کے حوالے کر دیا۔ اس وقت البانیہ میں اٹلی کے خلاف جگہ جگہ بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ یونانیوں کے ساتھ البانوی بھی اطالوی فوج کے خون کے پیاسے بن گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یونانی فوج البانیہ میں پندرہ و بیس میل اندر گھس گئی ہے اور البانیہ کے کئی شہروں پر قبضہ کر لیا ہے۔ کورٹزہ میں بھی اٹلی کا کثیر سامانِ جنگ یونانیوں کے ہاتھ آگیا ہے۔ کورٹزہ کی شکست کے بعد اطالوی فوج کے پاؤں ابھی تک کہیں نہیں جمے بلکہ جو اطالوی سپاہ یگوسلاویکا میں تھی اُسے نظر بند کر دیا گیا۔

یونان کی فتح سے بلقان کی سلطنتوں بلغاریہ۔ یوگوسلاویکا۔ اور ٹرکی پر جرمنی و اٹلی کا جو رعب چھا گیا تھا وہ اب ضائع ہو رہا ہے

بلقان | اس وقت ہٹلر کی توجہ بلقان اور جنوب مشرقی یورپ کی طرف ہے۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ اُس نے سازش کر کے سب سے پہلے رومانیہ کی بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ کیرول کو اپنے بیٹے میکائیل کو اپنا تاج و تخت سپرد کر کے جلا وطن ہونا پڑا اور جنرل انٹونسکو نے وزیر اعظم نائب السلطنت اور مختارِ کُل بن کر رومانیہ کا نظامِ سلطنت بالکل نازی سانچہ میں ڈھال دیا۔ اس طرح رومانیہ کے تیل کے چشمے جرمنوں کے ہاتھ آگئے۔ بیچارہ یوگوسلاویہ ایک طرف اٹلی دوسری طرف جرمنی سے ہو کر امن کے دو پردوں میں پھنسا ہوا ہر طرح بے بس و مجبور ہے۔ بلغاریہ کو جرمنی نے کسی طرح کا لالچ دیکر اپنے اثر میں لے لیا ہے، یونان جنگ کر ہی رہا ہے، اب صرف ٹرکی بچا ہوا ہے جس پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا ہے، مگر ترک ابھی تک برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدۂ دوستی پر قائم ہیں۔

جرمنی نے ہنگری کو محوری طاقتوں میں شامل کر لیا ہے۔ بلغاریہ پہلے کچھ مرعوب تھا اور ٹرکی نے خوف سے اپنے یورپین علاقہ میں فوجی حفاظت کے انتظامات شروع کر دیئے تھے مگر اب اٹلی کی پے در پے شکستوں نے یہ طلسم توڑ دیا ہے۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ روس نے بلقان میں اٹلی و جرمنی اثر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جس سے بلقانی ریاستوں کی ہمت بڑھ گئی ہے اور بلغاریہ و یوگوسلاویہ نے محوری معاہدہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ روس نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ درۂ دانیال، باسفورس اور بحیرۂ اسود کی حالت میں وہ کوئی فرق پسند نہ کرے گا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا ہے کہ ترکی کے جرمن سفیر فان پاپن کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ جرمنی نہ بلقان میں جنگ کرنا چاہتا ہے اور نہ اس کا ارادہ ٹرکی پر حملہ کرنے کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جرمن فوج بلغاریہ کے راستہ سے یونان کے خلاف اٹلی کو مدد دینے نہ جائیگی۔ رہ گیا یوگوسلاویہ۔ آگے دیکھیئے کیا ہوتا ہے۔

اسپین و افریقہ | بحیرۂ روم میں برطانوی اقتدار ختم کرنے کے متعلق ایک اسکیم یہ بھی ہے کہ اسپین کو محوری معاہدہ میں شامل کر کے جبرالٹر پر قبضہ کر لیا جائے۔ چنانچہ اسپین کے وزیر خارجہ سانیور سونیر کئی مرتبہ برلن اور روم میں طلب کیئے گئے اور اسپین کو شمالی مراکش کا وسیع علاقہ دینے کا لالچ دیا گیا۔ اسپین ابھی تک علانیہ طور پر تو جرمنی

کے ساتھ نہیں ہے لیکن بندرگاہ طنجہ پر جو شمال مغربی مراکش میں ایک بین الاقوامی بندرگاہ ہے اُس نے بلا شرکت غیرے قبضہ کر لیا ہے۔ برطانوی بیڑے نے لیبیا کے اطالوی مرکزوں پر وقتاً فوقتاً گولہ باری کی اور فریقین ایک دوسرے پر ہوائی حملے کرتے رہتے ہیں۔ ادھر سوڈان کی سرحد کے پاس برطانوی فوجوں نے حبش کے شہر غلیاط پر قبضہ کر لیا ہے۔

مشرق اس طرف جب سے جاپان محوری طاقتوں میں شامل ہو گیا ہے اُس کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح اُس کے ہاتھ خالی ہو جائیں اور وہ جنوبی سمندر کی طرف رُخ کر سکے۔ مگر اس کے راستے میں اس وقت دو روکاوٹیں ہیں، ایک تو روس و جاپان کی ہوائی رقابت، دوسرے چین کی لڑائی جسے اب چار سال ہو گئے اور ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس لئے وہ چین سے اپنی جان چھڑانے کے لئے صلح کا خواہشمند ہے۔ اُس نے مارشل چیانگ کائی شیک سے صلح کرنا چاہی۔ مارشل ممدوح کی پہلی شرط یہ ہے کہ جاپان چین سے اپنی فوج ہٹالے۔ چنانچہ یہ معاملہ تو ابھی تک طے نہیں ہوا ہے لیکن جاپان نے چین سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ چال چلی ہے کہ اُس نے اپنی ساختہ پرداختہ نانکن گورنمنٹ کے پریسیڈنٹ وانگ چنگ وائی کو پریسیڈنٹ جمہوریہ چین کا خطاب دیدیا ہے اور اُس نے ۳۰۔ نومبر کو چین و جاپان کے معاہدہ پر دستخط بھی کر دیئے ہیں۔ مگر مارشل چیانگ کائی شیک نے اس معاہدہ کو تسلیم نہیں کیا ہے، اس لئے جنگ جاری رہیگی۔

ہالینڈ اور فرانس کے شکست پانے سے انڈوچائنا اور شرق الہند کے جزیروں کی طاقت کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے جاپان ان دونوں علاقوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ انڈوچائنا کے شمالی حصہ یعنی ٹانکن پر جس کا دارالحکومت ہنوئی ہے جاپان کا فوجی تسلط قائم ہو چکا ہے، اس کے بعد اسکا ارادہ انڈوچائنا کی دوسری ریاست انام پر قبضہ جمانے کا ہے جسکا دارالحکومت سیگاؤن ہے۔ یہ اُن سمندروں میں اہم ترین بندرگاہ ہے، یہاں حملہ کرنے کیلئے جاپان نے اپنی فوج جنوبی چین سے ہٹا کر جزیرہ ہینان میں جمع کر رکھی ہے۔ دوسری طرف جاپان نے سیام کو اُکسا دیا ہے جو انڈوچائنا سے اپنا علاقہ طلب کر رہا ہے۔ اگر جاپان کا قبضہ سیگاؤن پر ہو گیا تو اسکا اثر سنگاپور، مینیلا اور ہانگ کانگ پر بھی پڑیگا۔ لیکن یہ مقصد آسانی سے حاصل نہیں ہو سکیگا کیونکہ اس سے امریکہ کے مجمع الجزائر فلیپائن کے لئے خطرہ پیدا ہو جائیگا۔ چنانچہ اب امریکہ نے بحر اٹلانٹک اور بحر الکاہل دونوں سمندروں میں اپنی بحری، بری اور ہوائی طاقت بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ ان تمام باتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ جاپان کی روک تھام ضرور کرے گا، اور برطانیہ کا مشرقی بیڑہ بھی اس کام میں امریکہ کا ہاتھ بٹائیگا ۱۷۔ اکتوبر سے گورنمنٹ برطانیہ نے برما روڈ بھی کھول دی ہے جس کے ذریعہ سے چین کو ہر قسم کا سامان جنگ پہونچ رہا ہے

جلد ۷۵ دسمبر ۱۹۴۰ء نمبر ۶

صحتِ الفاظ

اُردو ہندی قضیہ کا ایک سبب

(از مرزا عظیم بیگ چغتائی، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

صحتِ الفاظ کا معاملہ خود زبان کا مسئلہ کہا جاسکتا ہے، اور صحتِ زبان شاید انسانی صحت کی طرح زبان کے لئے بھی ضروری ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک ایسی بات پیدا ہوئی ہے جس کا علم اُردو ادیبوں کو بہت کم ہے۔

ہندی کے حامی سب سے بڑا الزام اُردو پر یہ دیتے ہیں، کہ عربی فارسی جانے بغیر اُردو نہیں آسکتی یا بالفاظِ دیگر عربی فارسی کی مدد کے بغیر صحیح اُردو بولنا اور لکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے ہندوستان کے لوگوں کے لئے ایسی زبان بیکار ہے۔ یہی خیالات خود اُردو کے ایک ہندو ادیب "زمانہ" کے اوراق پر گمنام رہ کر پیش کرچکے ہیں

ہندی رسالوں میں مضمون لکھنے کے سبب ہندی کے خاص رسالے بھی برابر میرے پیشِ نظر رہتے ہیں، اور ہندی ادیبوں سے بھی خلوص و محبت سے تبادلۂ خیال ہے۔ اور میں نے اُن کے بہت سے تعصبات اور اعتراضات کو صاف کیا ہے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب مجھ سے بھی نہیں بنتا۔ بعض ہندی ادیب اُردو بھی جانتے ہیں اور اُردو رسالے یا تو پڑھتے رہتے ہیں یا اُن سے باخبر رہتے ہیں، اور ادھر کوئی قابلِ گرفت مضمون شائع ہوا نہیں کہ اعتراضی خط جواب طلب چلا آتا ہے۔

اعتراض کے لئے خود اُردو کے حامی گنجایش پیدا کرتے رہتے ہیں۔ صحت الفاظ کے سلسلہ میں حضرت آثر لکھنوی نے پروفیسر شادانی کی تنقید در تنقید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ الفاظ کی صحت اور اُن کے زیر و زبر کے معاملات اُردو میں بھی ایرانی ہائیکورٹ سے طے ہونگے اور ہمیں زیر کا زبر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

اِسی اُصول کی تکرار پروفیسر شادانی[۵۱] اور دیگر بلند پایہ ادیب برابر کر رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ماہ کے "ساقی" میں پروفیسر شادانی نے حضرت فانی بدایونی کے کلام میں درجنوں غلطیاں زیر زبر کی نکالی ہیں۔ جن میں بہت سی صرف فارسی ہائیکورٹ سے طے کی ہیں۔ اور اُصولاً اس بات پر سب ہی زور دیتے ہیں کہ ہر عربی اور فارسی لفظ اُردو میں بھی قطعی اپنی اصلی شان لہجہ اور تلفظ سے رہے ذرا اِدھر اُدھر ہوا نہیں کہ وہ غلط سمجھا گیا۔ چنانچہ حضرت فانی نے اپنے ایک شعر میں "اَرِنی" کے بجائے "اَرْنی" بروزن "برنی" باندھا تو یہ سخت غلطی قرار دی گئی، کیوں؟ اس لئے کہ اُردو میں لفظ آ گیا تو کیا ہے اس کو اپنی پوری عربی شان سے رہنا چاہیئے ورنہ غلط ہوگا۔

اسی قسم کا سلسلہ حضرت نشتر جالندھری نے مؤقر ماہنامہ "ہمایوں" میں عرصہ ہوا شائع کیا تھا اور تمام الفاظ جو اُردو میں عام طور پر ادیبوں کے قلم سے لکھے جا رہے ہیں اُن کے زیر زبر کو صحیح طریقے سے درست کرنے کی تاکید کی تھی۔ گویا یہ اصول بنایا گیا کہ ہر عربی اور فارسی لفظ نہ تو اپنی شان تلفظ کھوئے اور نہ معنی۔ اگر اُس کے معنی کثرت استعمال سے بدل گئے تو وہ غلط، اُس کے معنی کو ہم وسعت بھی نہیں دے سکتے

ہندی ادیبوں کا کہنا (کم از کم مجھ سے) یہ ہے کہ یہ اُصول اگر ٹھیک ہے تو پھر غریب سنسکرت اور بھاشا نے کیا گناہ کیا ہے جو اُس کے الفاظ مسخ کر ڈالے گئے۔ چنانچہ ہم نے تمہاری دیکھا دیکھی جو ایسا کیا تو آپ چڑھتے ہو۔ مثلاً ہندی رسالوں کو دیکھئے گاؤں کو گرام، بچار کو وِچار، دیسی کو دیشی، بیاہ کو وِوَاہ، وغیرہ وغیرہ اتنے الفاظ ہیں کہ اگر اِن الفاظ کو اسی اُردو کے مسلمہ اُصول سے ہم درست کریں تو اُردو بالکل ہندی ہوئی جاتی ہے۔ اور پھر اسی اُصول کو انگریزی لفظوں پر عائد کیا جائے تو پھر ہماری زبان صحیح الفاظ کا ایسا نمونہ ہو جائیگی کہ باید و شاید۔ اکتوبر غلط، اکٹوبر صحیح۔ اپریل غلط، ایپرل صحیح۔ کارتوس غلط کارٹرج صحیح۔ وغیرہ وغیرہ۔

• انگریزوں کو تو خیر بہت سے کام ہیں، مگر ہندی والوں کو ہماری طرح فرصت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب اور ایران تو دور ہے گھر کے گھر اُردو کے سب لفظ ہم نے درست کر لئے اور عوام نے تو اُن کو چھیڑا بھی نہ تھا۔

---

[۵۱] ڈاکٹر عندلیب شادانی پی۔ایچ۔ڈی۔ پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی

مؤدبانہ عرض ہے کہ رسم الخط وغیرہ وغیرہ قسم کے جھگڑوں کا تو میں جواب دے لیتا ہوں، اب براہ کرم کوئی صاحب اس کا جواب مرحمت فرمائیں۔ سردست تو میرا جواب یہ ہے کہ "اجی ان باتوں پر دھیان مت دیجیے۔"

کیا واقعی صحیح اور اچھی اُردو لکھنے کے لئے فارسی اور عربی زبان اور قواعد پر پورا یا ادھورا عبور لازمی ہے؟ ہاں!

کیا یہ واقعہ ہے کہ اُردو کے الفاظ کی صحت کا سوال عربی اور فارسی لغت سے طے ہوگا؟ ہاں!

اور کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ الفاظ کی صحت کے معاملات طے کرنے کے لئے سنسکرت کے لغت کی قطعی ضرورت نہیں؟ نہیں!

اگر اِن سوالات کا یہی جواب ہے تو پھر ان ادیبوں کی ملک میں کیا پوزیشن ہوگی جو فارسی، عربی قطعی نہیں جانتے! اُنھوں نے اُردو رسم الخط سیکھ لیا اور اُردو لکھنے پڑھنے بھی لگے، مگر کیا وہ اُردو کے ادبی حلقوں میں کسی باوقار پوزیشن کے مالک ہوسکتے ہیں۔ اِن سوالات پر ہمیں غور کرنا پڑے گا۔

اسی ماہ کے ہندی کے رسالہ "وِشال بھارت" میں بالکل اِسی قسم کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مروجہ الفاظ کی سنسکرت کی لغت سے صحت کر کے بتایا گیا ہے کہ کون لفظ اَشُدھ (غلط) ہے اور کون شُدھ ہے۔ مثلاً سُور یا سُورما اشدھ "س" کے بدلے "ش" چاہیئے۔ "جینی کی ی" کسی صورت میں جائز نہیں، "جین" ہر موقعہ پر لکھا جائے۔ "گرہستی" غلط صرف "گرہسٹ"[1] صحیح ہے۔ یہاں اُردو ہندی سوال .. نہ سمجھیے تب بھی ملک کی عام بولنے کی زبان کیا طرفہ بن رہی ہے۔ یعنی اُردو ہندی خلیج وسیع ہوتی جارہی ہے۔ ہندی طبقہ اب بولتا بھی اسی طرح ہے اور جو نہ بولے تو حضور کو مجوز کہنے والا اور وہ یاس ہوا۔

اُردو کے اُن ادیبوں کے لئے ایک خبر باعث اطمینان ہوگی جو ہندی رسالے بالکل نہیں پڑھتے مگر ہندی ادیبوں کے خلاف دھواں دھار مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ وہ خبر یہ ہے کہ ہندی کے چوٹی کے ادیب اُردو کے جان لیوا دشمن کم از کم بظاہر نہیں ہیں۔ رسالہ وشال بھارت، جس کا شمار ہندی کے بہترین رسالوں میں ہے، اس کے فاضل اڈیٹر بھائی بنارسی داس چترویدی اور پنڈت شری رام جی شرما ہیں۔ ایک دو دفعہ نہیں دس دفعہ اپنے رسالے میں بڑے پُر زور الفاظ میں اپیل کر چکے ہیں کہ اُردو ہمارے ملک کی زبان ہے اسے بھی سیکھیے۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی نے مجھے کئی دفعہ لکھا کہ مجھے سَو عمدہ اُردو کتابوں کی فہرست بھیج دو۔ جو میں خرید کر

---

[1] "گ" پر زیر زبر کچھ نہیں اور "ر" کی آواز کے شامل

اپنی لائبریری میں رکھوں، مجھے پُرزور خط لکھے کہ اپنے لڑکے سے کہو مجھے ہر ہفتے میں ایک خط اُردو میں لکھے پنڈت شری رام جی خود خوب اُردو فارسی جانتے ہیں۔ رسالہ دیکھ لیجئے، اِس ماہ کے تازہ رسالے میں حضرت آرزو لکھنوی کی غزل شائع ہوئی ہے حضرت ساغر نظامی۔ اکبر الہ آبادی۔ باسط بسوانی اور دوسرے شعرا کے کلام چھپ چکے ہیں، اور اُن پر پُر لطف تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں غرض ہندی ادیب اس بات پر بڑے شد و مد سے زور دے رہے ہیں کہ سہل اور سادہ ہندی لکھو اور سنسکرت الفاظ سے حتی الوسع بچو۔ کئی بار زور دے چکے ہیں، اور اُردو داں طبقے کے اعتراضات کا اس سرعت سے علاج کر رہے ہیں کہ اُردو مضامین بغیر ترجمہ ہوں کے توں شائع ہونے کا ایسا اچھا سلسلہ جاری ہو گیا ہے کہ ایک سرے سے سبھی ہندی کے رسالوں نے تین سال کے اندر اندر بالکل رنگ بدل دیا اور آج دیکھ لیجئے کہ ہندی کے چوٹی کے رسالے "چاند" "کرم یوگ" "نئی کہانیاں" "وینا" وغیرہ وغیرہ میں بھی اُردو شعرا کی غزلیں موجود ہیں، رباعیاں درج ہیں، منتخب اشعار شائع ہوتے ہیں۔ اور پھر سخت ہندی بھی ہے۔ حد یہ کہ سہ رنگی تصویر کے عنوان میں اُردو کا ایک اچھا شعر اسی ماہ کے "نئی کہانیاں" میں موجود ہے۔ عنوان ہے "تلاش گُل" اور شعر ہے:-

کیا جانے بہار آئی کہ خزاں، یہ باغ ہے یا ویرانہ ہے

وہ گل ہی نہیں تو کچھ بھی نہیں، دل جس کے لئے دیوانہ ہے

اُردو کے حامیوں سے میں اپیل کرونگا کہ ذرا نرمی اور صلح کا رویہ رکھیں تو زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ اُن کی تمام شکایات زیادہ تر اُن لوگوں سے ہیں جو ادیب نہیں ہیں بلکہ عموماً سیاست داں یا دوسرے لوگ ہیں۔ جبکہ ہندی ادیب اور ہندی کے چوٹی کے رسالے اُردو کے حامیوں کے اعتراضات کا احترام کرتے ہوئے یکسر روش بدل چکے اور بدل رہے ہیں، اور ایک عام تحریک ہندی کو آسان تر بنانے کی کی جا رہی ہے تو اگر یہ لوگ خواہ مخواہ موردِ الزام نہ ٹھہرائے جائیں تو بہتر ہے۔

بہر حال یہ جملۂ معترضہ تھا، اب پھر اصل مطلب پر آتا ہوں۔ ستمبر کے "زمانہ" میں قتیل اور غالب کے بارے میں جو مفید مضمون شائع ہوا ہے اُسی میں دیکھ لیجئے۔ کہ غالب کا کیا رویہ ہے۔ وہی رفتارِ کم و بیش اب بھی موجود ہے۔ حالانکہ اُس وقت صورت اور تھی موجودہ صورت اور ہے، جس کا اندازہ لگانے کے لئے میں اپنے ایک دوست کے خط کا حسب ذیل حصہ نقل کرونگا:-

"...... واہ بھائی واہ، خوب نیائے کرتے ہو، آپ تو عرب دلیش اور ایران سے آئے جو اپنی بھاشا سنگ لائے۔ اُسے ہماری بھاشا میں ملا کر اُردو بنائی، ٹھیک۔ پر تو اپنی بھاشا کی وہ پستی کی کہ ایک شبد بگڑنے نہیں دیتے اور ہماری بھاشا کے شبدوں کا کسی کا ہاتھ توڑا اور کسی کی ناک کاٹی۔ اپنے شبدوں کو تو حال تک

غالبؔ[1]

(از حضرت روشؔ صدیقی)

فروغِ انجمنِ عشق ہے کلام ترا
ربابِ شوق کو مضراب ہے پیام ترا
چھلک رہا ہے مئے آرزو سے جام ترا

وہی نسیمِ غزل کیف بار اب بھی ہے
ترے چمن میں خراماں بہار اب بھی ہے

دیا وہ کیف تجھے زندگی کی صہبا نے
کہ جس کی موج سے برہم ہزار میخانے
خودی فروز تری بیخودی کے افسانے

شکستِ ہوش سے تجھکو عجب سرور رہا
خود اپنی گم شدگی پر تجھے غرور رہا

جھکی ہوئی سی تھی کچھ چشمِ نیم خوابِ غزل
فقیہِ شعر سے اٹھتا نہ تھا نقابِ غزل
پھر ایک بار تھا خاموش سا ربابِ غزل

کہ تو نے حسنِ تغزل کو بے حجاب کیا
سکوتِ شوق کو مانوسِ اضطراب کیا

بسائے نرگسِ اردو میں تو نے خواب کچھ اور
بڑھائے گیسوئے پرخم میں پیچ و تاب کچھ اور
اٹھا اٹھا کے گرائے بھی ہیں حجاب کچھ اور

جمالِ شعر کو تمکیں فروز تو نے کیا
بدل کے ساز کو ہمرنگِ سوز تو نے کیا

[1] یہ نظم یومِ غالب پر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈکاسٹ ہوئی تھی اور اب ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے شائع ہو رہی ہے۔

کہیں تصورِ روئے نگار کا عالم
کہیں نشاطِ غمِ انتظار کا عالم
ہر اک سکوں میں نہاں اضطرار کا عالم

گدازِ عشق کی تصویر ہے غزل تیری
کتابِ درد کی تفسیر ہے غزل تیری

تباہِ شکوۂ ماضی و حال تھا ہر چند
خرابِ کیفِ نشاط و ملال تھا ہر چند
اسیرِ حلقۂ دامِ خیال تھا ہر چند

مگر جہاں بھی رہا تو بہت بلند رہا
فلک کو شکوۂ کوتاہیِ کمند رہا

ترا سرور رہا کیفِ غم سے محرم بھی
لبوں پہ موجِ تبسم بھی، چشمِ پُر نم بھی
ہے سوزِ برق بھی تجھ میں گدازِ شبنم بھی

رخِ نشاط کو اشکوں سے تو نے پاک کیا
مذاقِ درد کو کچھ اور تابناک کیا

تری نظر کبھی بربادِ امتیاز نہیں
تری مراد صنم خانۂ مجاز نہیں
تو راز داں ہے، اسیرِ حجابِ راز نہیں

خودی میں بھی نہوا ذوقِ بیخودی سے جدا
کیا نہ مرگ نے بھی تجھ کو زندگی سے جدا

شاعر

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبال

نظیر اکبر آبادی

(از مسٹر گوبند پرساد سہوی ایم اے)

اُردو شاعروں میں نظیر ہی ایسے شاعر ہیں جنھیں صحیح معنی میں ہندوستانی شاعر کہا جا سکتا ہے جب کبھی ہندوستانی تہذیب کی جو ہندو مسلمان دونوں قوموں کے ارتباط اور اتحاد کی نشانی ہے قدردانی کا وقت آئیگا تو ہندو مسلمان دونوں نظیر اکبر آبادی کو اپنا ئیں گے۔ عام اُردو شاعروں کے برعکس نظیر کی شاعری نے خالص ہندوستانی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔ اس میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا کوئی شائبہ تک نہیں آنے پایا ہے۔

نظیر کی نہ صرف زبان ہندوستانی ہے بلکہ اُن کی نظمیں مضامین اور عنوان دونوں اعتبار سے ہندوستانی سوسائٹی کا عکس ہیں۔ اکثر نظموں کے مضامین ہندوستانی دیومالا سے ماخوذ ہیں۔ اُن کے خیالات اور رائے کا فلسفہ ہندوستانی عوام کے عقائد کا آئینہ ہیں۔ ان کے قدرتی مناظر عموماً ہندوستان اور خصوصاً صوبۂ آگرہ و اودھ کے ہیں۔ ان کی تشبیہات بھی گردوپیش کے نظاروں اور ملکی واقعات ہی سے ماخوذ ہیں غرض نظیر کی رگ و پے میں ہندوستانی روح جاری وساری ہے۔ وہ مسلمان ضرور ہیں لیکن اُس سے پہلے وہ ہندوستانی ہیں۔

زبان اُن کی زبان آج کل کی اُردو یا ہندی نہیں بلکہ سراپا ہندوستانی ہے، وہ میر کی طرح نہ تھے کہ عوام سے بات کرنے میں اُن کی زبان خراب ہوتی، وہ ناسخ کی طرح ہندی کی چندی بھی پسند نہ کرتے تھے بلکہ عام بول چال میں اشعار لکھتے تھے، اور الفاظ کو اُسی شکل میں استعمال کرتے تھے جس طرح وہ اُن کے زمانے میں بولے جاتے تھے اُن کو اس کی فکر نہ تھی کہ کسی لفظ کی اصلی شکل کیا ہے، سکون اور حرکت کے جھگڑوں میں بھی پڑنا وہ پسند نہ کرتے تھے۔

زبان کے معاملہ میں اُن کا یہ جمہوری نقطۂ نگاہ اُنھیں تمام شعرائے اُردو سے ممتاز کرتا ہے، مولانا آزاد نے ان پر عامیانہ ہونے کا الزام لگایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر نے اس طرح زبان میں جو وسعت پیدا کی وہ سودا اور ناسخ سے بھی ممکن نہ ہوئی۔ آسان لفظوں اور روزمرہ بول چال کی زبان استعمال کرنے کے باوجود

اشعار میں زور پیدا کرنا مولانا حالی کا حصہ تھا۔ یا پھر یہ شاندار خصوصیت نظیر ہی کو حاصل ہوئی۔ نظیر کی زبان میں کثرت سے ہندی اور سنسکرت الفاظ ہیں کیونکہ یہ الفاظ اُن کے زمانے میں مستعمل تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام نہ غالب کے کلام کی طرح نیم فارسی ہے اور نہ دوسرے شعرا کی طرح اُس میں بناوٹ پائی جاتی ہے نظیر کی شاعری کے مخاطب عام ہندوستانی ہیں۔ انھوں نے ایسی زبان لکھی ہے جس کو عوام بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں پر میں صرف ایک شعر بطور نمونہ مشتے از خروارے لکھتا ہوں:-

تندرستی کو پنٹ فضلِ الٰہی بوجھیئے

آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھیئے

آج پنٹ، بوجھنا اور جگ کا استعمال شاید ہمارے "فارسی زدہ" اہلِ وطن کے کانوں کو اچھا نہ لگے لیکن نظیر نے کس خوبی سے اِن الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ ایک اور بند ملاحظہ ہو:-

جب تو ہوا فقیر تو ناتہ کسی سے کیا؟ چھوڑا کُٹم تو پھر رہا رشتہ کسی سے کیا؟

مطلب بھلا فقیر کو بابا کسی سے کیا دلبر کو اپنے چھوڑ کے ملنا کسی سے کیا؟

گر ہے فقیر تو تو نہ رکھ یاں کسی سے میل

یاں تو بڑی نہ بیل پڑا اپنے سر یہ کھیل

سوسائٹی | اُن کی پرورش جس سوسائٹی میں ہوئی، اُنھوں نے اُس سے دُور بھاگنا پسند نہیں کیا۔ اُنھوں نے اُس کے ہر پہلو کو بغور دیکھا اور اپنی شاعری میں اُسے ہو بہو پیش کیا۔ اُن کا کلام صرف امرا اور رؤسا کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے نہیں ہے بلکہ عوام کی چیز ہے۔ جس میں عوام کی زندگی کے بھلے بُرے دونوں پہلو پورے طور سے نمایاں ہیں۔ نظیر اپنے زمانے کی سوسائٹی کی صحیح اور مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ تیوہار اور میلوں کا حال بڑی تفصیل اور ذوق و شوق کے ساتھ لکھتے ہیں، یہاں تک کہ بُلبلوں کی لڑائی، کبوتر بازی، ریچھ کا ناچ اور پیراکی وغیرہ کا دلچسپ حال بھی اُن کے ہاں موجود ہے۔ بلکہ انھوں نے ان سب کی سچی کیفیت بیان کر دی ہے۔ تمام جزئیات کا فوٹو کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اگر اُن کے زمانے میں روزانہ اخبار نکلتے ہوتے تو شاید وہ ان باتوں کا اُن سے زیادہ صحیح اور دلچسپ بیان پیش نہ کر سکتے۔

آئیے بلدیو جی کا میلا دیکھیے:-

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ جو کہ تل دھرنے کی نہیں ہے جا

لے کے مندر سے دو دو کوس لگا باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا

ہیں ہزاروں بساطی اور سودا لاکھوں بنتے ہیں گہنے اور مالا

بھیڑ انبوہ اور دھرم دھکا جس طرف دیکھیے اہا ہا ہا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

اور یہاں نظیر ٹبٹبلوں کے لڑانے میں مصروف ہیں:-

تھیں تین کشتی میں یہ جو تھی کو اُس میں چھوڑا اُس نے تو خم بجا کر تینوں کو دھر جھنجھوڑا

پھر تو یہ ٹھیکا آکر ان کشتیوں کا کوڑا چھوٹا کسی کا ہاتھی، بھاگا کسی کا گھوڑا

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں

اس ڈھب سے ہم نے یارو کل ٹبٹبلیں لڑائیں

اور آگرے میں پیراکی کا بیان سُنیے۔ جمنا جی میں اچھے اچھے پیرنے والے اپنا کمال دکھلاتے ہیں

تربینی میں اہا ہا ہوتی ہیں کیا بہاریں خلقت کے ٹھٹھ ہزاروں پیراک کی قطاریں

پیریں۔ نہاویں۔ اچھلیں۔ کودیں۔ لڑیں پکاریں دے دے وہ چھینٹ غوطے کھا کھا کے ہاتھ ماریں

کیا کیا تماشے کر کر اظہار پیرتے ہیں

اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جاتے ہیں اُن میں کتنے پانی پہ صاف سوتے کتنوں کے ہاتھ پنجرے، کتنوں کے سر پہ طوطے

کتنے پتنگ اُڑاتے کتنے سوئی پروتے حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے

سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں

اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

اب نظیر صاحب ریچھ کا بچہ نچا رہے ہیں:-

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا لوہے کی کڑی جس پہ کھڑکتی تھی سراپا

کاندھے پہ چڑھا جھولنا اور ہاتھ میں پیالا بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا

آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچّا

جب ہم نے اُٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا

لپٹا تو وہ کشتی کا ہنر آن دکھایا وہ جو چھوٹے بڑے جتنے تھے اُن سب کو رجھایا

ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچّا

نظیر کے کلام میں مثنوی کا رنگ اور ڈراما کی کیفیت بھی ہے جس واقعہ کو لیتے ہیں اُس کا

سماں باندھ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں نظیر نہ صرف زبان کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں بلکہ وہ اپنے زمانے کی ہندوستانی طرز معاشرت اور رسم و رواج کی صحیح تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ہولی بسنت اور دیوالی پر اُن کی کئی نظمیں اس زور شور کی ہیں کہ کوئی ہندو مصنف بھی ان تہواروں کا ان سے بہتر ذکر نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عید۔ بقرعید اور شب برات پر بھی انھوں نے اسی شان اور اسی تفصیل سے نظمیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ان سب تیوہاروں میں پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ ان کی ہوبہو تصویریں اس خوبی سے کھینچکر رکھدیتے ہیں یا اصل یہ ہے کہ ان تفصیلات کو پڑھکر اُس زمانہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ہولی کے تیوہار سے نظیر کو اتنی محبت تھی کہ اس پر اُنھوں نے پانچ سات نظمیں لکھی ہیں۔ ہولی کا بیان پڑھئیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھاگن کا مہینہ ہے، ہر صبح رنگین اور ہر شام گلابی ہے۔ موسم اتنا خوشگوار ہے کہ طبیعت خود بخود جوش پر ہے۔ اُس پر راگ رنگ کا اہتمام، پھاگ کھیلنے والوں کا اژدہام عام لوگوں کا شور و غل، سب کا اُچھلنا۔ کودنا۔ باجوں کی آوازیں اور عیش و طرب کے ولولے، فضا میں عبیر گلال کا اُڑنا، ہر طرف رنگ کی بوچھار اور لوگوں کا گلے ملنا۔ ان سب باتوں کو نظیر نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی ہولی کا دن ہے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے:۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ساغر مے کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشہ میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو تال جھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب مونہوں کے لڑکے
[illegible] پڑھ پڑھ کے

کچھ ناز جتاویں لڑ لڑکے کچھ ہولی گاویں اڑ اڑکے

کچھ لچکے شوخ کمر پتلی کچھ ہاتھ چلے کچھ تن پھڑکے

کچھ کافر نین مٹکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک جگہ لوگ ہولی کھیل رہے ہیں :-

پوشاکیں چھڑکیں رنگوں کی اور ہر دم رنگ افشانی ہے

ہر وقت خوشی کی جھمکیں ہیں پچکاریوں کی رخشانی ہے

کہیں ہوتی ہے دھینگا مشتی کہیں ٹھہری کھینچا تانی ہے

کہیں لٹیاں جھمکتی رنگ بھری کہیں جوتا کیچڑ پانی ہے

ہر چار طرف خوشحالی کا یہ ہر تش بڑھایا ہولی نے

اب ایک اور زور دار نظم دیکھئے :-

پھر آنکے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر | اور عیش نے عرصہ ہے کیا تنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر | ہوتا ہے کہیں راگ کہیں رنگ زمیں پر

بجتے ہیں کہیں تال کہیں زنگ زمیں پر

ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

دیوالی کے متعلق فرماتے ہیں :-

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار | کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار | ہر اک دُکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

اور اب دیوالی کا مذموم پہلو بھی دیکھئے، یعنی قمار بازوں کا حال سنیئے :-

صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار | اُنھوں نے کھایا ہے اِس دن کے واسطے ہی اُدھار
کہے ہے ہنس کے قرضخواہ سے ہر اک اکبار | دِوالی آئی ہے سب دے دلائیں گے اے یار

خدا کے فضل سے ہے آسرا دوالی کا

اُس زمانہ کی سوسائٹی کچھ آج کل سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

ہولی، دیوالی کے بعد اب ذرا عید اور شب برات کا بھی حال سنیئے :-

اکبرآباد کی عیدگاہ [illegible]

"آتے ہیں گھر سے اپنے جو بن بن کے کج کلاہ صحن چمن ہے جتنی ہے سب صحن عید گاہ
چھاتی سے لپٹے جاتے ہیں ہنس ہنس کے خوامخواہ دل باغ باغ سب کے ہوتے ہیں فرحت سے واہ واہ
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عید گاہ میں

کچھ بھیڑ سی ہے بھیڑ کہ بے حد و بے شمار خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہیں بندھے ہر طرف ہزار
ہاتھی و گھوڑے بیل رتھ اور اونٹ کی قطار غل شور باجے بھاجے کھلونوں کی ہے پکار
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عید گاہ میں

اور عید میں گھر گھر لوگ کیسے خوش ہیں، اُس کا حال بھی سنیئے :-

روزہ کی خشکیوں سے جو ہیں زرد زرد گال خوش ہو گئے وہ دیکھتے ہی عید کا ہلال
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید لال دل کیا کہ ہنس رہا ہے پڑا تن کا بال بال
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

نظیر شب برات کا حال لکھنے بیٹھتے ہیں تو امیر غریب یہاں تک کہ پنہاری اور ملّا کے کھانوں اور فاتحہ کا بھی بیان کر دیتے ہیں۔ دیکھئے آتشبازی چھوٹ رہی ہے :-

آکر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی اوپر سے اور ہوائی کی آکر پڑی چھڑی
ہو گی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی پاؤں سے لپٹے شور مچا کر قلم تڑی
کرتی ہے پھر تو ایسی ستم گاری شب برات

مذہب نظیر کا زمانہ اٹھارھویں صدی کا نصف اور اُنیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اِس زمانے تک ہندو مسلمانوں کے مذہبی خیالات بہت کچھ ایک ہو چکے تھے۔ اُن کے لئے مذہب کا مقصد خدا اور انسان سے محبت کرنا تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ دنیا تکلیف کی جگہ ہے اور اس سے بچنے کا ذریعہ یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کو زیر کیا جائے۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو کسی گرو یا مرشد کا آسرا لینا چاہیئے۔ اِن مذہبی پیشواؤں اور دیوتاؤں کی شان میں نظیر کی نظمیں سنیئے۔ اُن کے یہاں حضرت محمد۔ پنجتن پاک۔ حضرت علی۔ کرشن جی۔ گرو نانک اور مہا دیو جی وغیرہ سب کے متعلق نظمیں موجود ہیں مذہب کے متعلق نظیر میں بڑی رواداری ہے۔ فرماتے ہیں :-

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآں عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا

آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

وہ تمام مذہبی پیشواؤں کا تہِ دل سے احترام کرتے ہیں۔ اُنھیں کوئی مذہبی رہنما غیر نظر نہیں آتا اُنھیں سب سے یکساں محبت ہے۔ آج بھی ہم کو اسی قسم کی رواداری اور یکرنگی کی ضرورت ہے۔

حضرت علی کی شان میں کہتے ہیں:۔

علی کی یاد میں رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں　　علی کا وصف کچھ کہنا سعادت اس کو کہتے ہیں

علی کی مدح کا پڑھنا کرامت اس کو کہتے ہیں　　علی کے نام کا لینا حلاوت اس کو کہتے ہیں

علی کی حب میں مرجانا شہادت اس کو کہتے ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شیعہ مسلمان انتہائی عقیدت سے بول رہا ہے۔

نظیر کو کرشن جی سے بھی اتنا ہی پریم ہے۔ اُنھوں نے کئی سو اشعار میں بھگوان کرشن کی پوری سوانحعمری قلمبند کر دی ہے۔ کرشن بھگتوں کے لئے ان کا ایک ایک شعر پریم اور بھگتی کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سب سننے والے کہہ اُٹھے جے جے ہری ہری　　ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

اور گرو نانک کی مدح اس طرح کی ہے:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو

وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو

مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو

نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

غرض اُن کی آواز ہندو مسلمان سکھ سناتنی شیعہ سنی سبھی کے کانوں تک پہونچتی ہے اور سب لوگ اُن کو بھائی نظر آتے ہیں

فلسفہ | نظیر کا فلسفۂ زندگی بھی بالکل ہندوستانی ہے۔ وہ تصوف یا ویدانت کے قائل ہیں۔ اپنی ایک مشہور نظم میں فرماتے ہیں:۔

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان　　عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

دنیا کی بے ثباتی ہندوستانی شاعروں کا عام مضمون ہے، نظیر نے بھی اسے کئی نظموں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:۔

"دو چار دن کے خاطر یاں گھر ہوا تو پھر کیا"

"آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا"

"میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے"

اسی سلسلہ میں اُن کی لافانی نظم "بنجارہ نامہ" ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور عمر کی ناپائداری دکھا کر "ترک دنیا" کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا بھی ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں کی عام تعلیم ہے اور نظیر کی بھی یہی تلقین ہے کہ ؎

"پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں"

دولت کے متعلق اُن کی تعلیم یہ ہے کہ اُس کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے، کیونکہ اس کے بغیر دُنیاداری کا کام نہیں چل سکتا۔ لیکن بخل سے اُنھیں سخت نفرت ہے، اور وہ برابر سخاوت کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ "کوڑی" "آٹا" "دال" "روٹیوں کی تعریف" "پیسے اور روپیئے کی تعریف" اُن کی وہ نظمیں ہیں جن سے دولت کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، کوڑی کے متعلق کتنا دلچسپ بند لکھا ہے:۔

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو　　رتھ خانہ فیل خانہ طویلا کہاں سے ہو

مُنڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو　　کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو

کوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں

کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

یہ نظم ترک و توکل کی تعلیم کے خلاف نہیں، بلکہ اُس کے صحیح معنیٰ بتانے کی غرض سے لکھی گئی ہے وہ "فقیروں کی صدا" میں دولت کی محبت کے متعلق کیا خوب لکھتے ہیں:۔

زر کی جو محبت تجھے پڑجائے گی بابا!　　دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا!

ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا!　　دولت جو ترے یاں ہی نہ کام آئے گی بابا!

پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائے گی بابا!

کل جُگ کے متعلق اُن کی نظم خالص ہندوستانی جذبات کی عکس ہے۔ کلجگ میں دھرم کی ہانی ہونا ہندوستانیوں کا عام عقیدہ ہے۔ نظیر سوسائٹی کی اصلاح کی کوشش سے بھی غافل نہیں ہیں، اور اپنی نظموں میں ہندو مسلمان دونوں کو بُرائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے رہے۔ کلجگ کے متعلق انھوں نے

لکھا ہے کہ یہ "کرجگ" یعنی زمانۂ عمل" ہے، اور عمل ہی سے نجات ہے۔ کرم کے فلسفے کی کس خوبی سے تعلیم دی ہے:۔

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی ساتھ لے　　نیکی کا بدلا نیک ہے، بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے　　آرام دے آرام لے دُکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہات لے

اور سُنیئے:۔

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاوگے　　تو گھر اچھا سا پاؤگے اور سُکھ سے بیٹھے کھاؤگے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤگے　　پھر کچھ بھی نہیں بن آوے گی گھبراؤگے پچھتاؤگے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

منظر اور تشبیہات نظیر نے ہندوستانی موسموں پر بھی بہت دلکش نظمیں لکھی ہیں، وہ ایران کی بہار وخزاں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ بڑے شد ومد سے یہاں کے موسموں کی کیفیت لکھتے ہیں۔ زبان بیان کی تمام خوبیاں ان مضمونوں پر قربان ہیں۔ مختلف موسموں میں جو احساسات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں نظیر نے اُن کی کیسی صحیح تصویر کھینچی ہے۔

ہندوستان کی برسات یہاں کا موسم بہار ہے، چنانچہ برسات کی ایک رات کا بیان دیکھئے:۔

ابر وہوا کے واہ وا شب کو عجب ہی زور تھے　　بھیگ رہا تھا سب چمن مینھ کے جھڑا کے زور تھے
غوک پپیہے مور تھے جھینگروں کے بھی شور تھے　　بادہ کشی کے دَور تھے عیش وطرب کے جھور تھے
باغ سے تا بہ باغباں جتنے تھے شور پور تھے　　آپڑے اس میں ناگہاں یہ جو خوشی کے چور تھے
ابر کھلا۔ ہوا گھٹی۔ بوندیں تھمیں، سحر ہوئی
پہلو سے یار اُٹھ گیا، سب وہ بہار بہ گئی

کیا زور بیان ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اندھیری رات ہے بادل گھرے ہوئے ہیں، ہوا چل رہی ہے، زور شور سے پانی برس رہا ہے اور مور اور جھینگر شور کر رہے ہیں، اور بھیگی ہوئی فضا دلوں کو سرشار کر رہی ہے۔

نظیر نے برسات پر کئی نظمیں لکھی ہیں، اُن میں سے ایک کا عنوان "کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں" ہے

ستّر بندوں کی طویل نظم ہے جس میں برسات کا کوئی پہلو نہیں جو نظم نہ کیا گیا ہو۔

اب ہندوستان کی سردی کا حال سُنیئے :-

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

پالا برف پگھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

چلّا خم ٹھونک اُچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اگھن کا مہینہ ختم ہو کر جب پوس شروع ہوتا ہے تو جاڑا پڑنے لگتا ہے، دن چھوٹا ہو جاتا ہے اور پالا گرنے لگتا ہے، چِلّے کے جاڑے تو مشہور ہی ہیں۔ اس نظم کے اندازِ بیان میں جو جو خوبیاں ہیں وہ اہلِ ذوق پر ظاہر ہیں۔

جب کبھی نظیرؔ کسی موسم کا بیان کرنے لگتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں تو ایک رومانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور حسن و اجنبیت ہاتھ باندھے حاضر رہتی ہے، دلوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ اس قادر الکلام شاعر کو بیان اور محاکات پر کتنی قدرت حاصل ہے۔

عشقیہ کلام | اُن کے عشقیہ کلام پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اُردو شعرا نے زیادہ تر غزلیں ہی لکھی ہیں اور عشقیہ اشعار کا ذخیرہ بھی اُردو میں بہت زیادہ ہے۔ مگر نظیرؔ کا رنگ تغزل کوئی اُردو کے قدیم اساتذہ سے بہت کچھ مختلف ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اُن کے کلام کے اس حصّے کو نظر انداز کریں جو فارسی شعراء کے تتبع میں لکھا گیا ہے اور صرف اُس حصّے کو دیکھیں جس میں اُن کی انفرادیت نمایاں ہے، اُن کا معشوق شاہدِ بازاری ہی کیوں نہ ہو اُن کے زمانے کے ہندوستانی سوسائٹی کے عین مطابق ہے، وہ انسان ہے، اس کے جو اوصاف اُنھوں نے بیان کئے ہیں وہ اُسے صنفِ نازک کا ایک فرد ثابت کرتے ہیں اس سلسلے میں رنگ روپ لباس و زیور اور اداؤں وغیرہ کا جو وہ بیان کرتے ہیں ان سب سے ہندوستانی معاشرت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

ہوش میں آنے نہیں دیتا ترا کاجل ہمیں ہم تو ہوں کیفی ترے پر کیا کریں اسے چشمِ یار

دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی

جس کی نوید پہنچی ہے رنگِ بسنت کو نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوشش ہو

نظیرؔ کی ایک اور دلچسپ نظم جس میں اُنھوں نے موتیوں سے سجے ہوئے محبوب کا ذکر کیا ہے

اِس سجاوٹ سے معشوق خود موتیوں کا گچھا بن گیا ہے :-

کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے
نزاکت سے عرق کی بوند بھی مکھڑے کو دھوتی ہے
بدن بھی موتی اور سر پاؤں سے پہنے بھی موتی ہے
سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی

ایک جگہ معشوق سے خطاب کر کے لکھتے ہیں :-

ہے نقش مرے دل میں ترے حسن کا ہر آن
مر کر بھی مرے دل سے نہ جاویگا ترا دھیان
زنہار نہ بھولوں گا تجھے میں ارے نادان
میں تو صفِ محشر میں بھی لونگا تجھے پہچان
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشا

اخیر میں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ چونکہ آج ہندوستانی زبان کے ایسے شعراء کی ضرورت ہے جو ہندوستانیوں کے دل کی بات اُن سے اُنھیں کی زبان میں کہہ سکیں اس لئے ہمارے شاعروں کے لیے نظیر کی تقلید ضروری ہے۔ اس سے اُردو زبان مقبول ہوگی، تلخیاں دُور ہونگی اور کامیابی کا دور آئیگا۔

نظیر کے متعلق ایک بات اور کہنی ہے، آج کل ہندوستان میں جمہوریت، مساوات، آزادی، مفلسی، بیکاری وغیرہ کے متعلق جو خیالات پائے جاتے ہیں اُن کی پُوری جھلک ہم کو نظیر کے کلام میں ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اُن کو واضح طور پر نہیں کہہ سکے بلکہ خود راہ تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر ہم آج اُن کی "شہر آشوب" "آدمی نامہ" "روٹی" "مفلسی" اور "کوڑی" وغیرہ نظموں کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ یہاں پر "شہر آشوب" کے دو تین بند لکھکر یہ مضمون ختم کرتا ہوں

بے روزگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی
کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی
ہر گھر میں اس طرح سے بھر آئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کے کوڑی نہ ہاتھ آئے
بیکار کب تلک کوئی قرض و اُدھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے
آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نہ کرے کاروبار بند

آج ہمارا حال اس سے بھی ابتر ہو رہا ہے مگر نظیر نے یہ حالات حب الوطنی سے متاثر ہو کر لکھے ہیں وہ خود کہتے ہیں :-

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
مُلّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اِس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ چار بند

اختلافاتِ اور ہندوستان

از حضرت شاد عارفی

جہاں گنگا سے کٹ جاتی ہیں شاخیں — جہاں مرکز سے ہٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں شاخوں میں بٹ جاتی ہیں شاخیں — جہاں رتبہ سے گھٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں دب کر سمٹ جاتی ہیں شاخیں — جہاں کاہی سے اَٹ جاتی ہیں شاخیں
جہاں ریتی سے پٹ جاتی ہیں شاخیں — وہاں رہتا نہیں گنگا کا دھارا

یہی اے شاد عالم ہے ہمارا

جذباتِ جنوں

(از مولوی صدیق حسین صدیقی جنوں)

بنیادِ آشیاں کو جو گھبرا کے رکھدیا — تنکوں کے بدلے برق کو لا لا کے رکھدیا
مستوں کی کیفِ مے میں سیاغر نواز یاں — اٹھلا کے پی گئے کبھی لہرا کے رکھدیا
تھی دل میں آگ عشق کی لیکن دبی ہوئی — اُن کی نگاہِ ناز نے بھڑکا کے رکھدیا
وارفتگیِ شوق میں تصویرِ یار کو — دل سے لگا لیا کبھی گھبرا کے رکھدیا
ہر بار یاس لائی ہمیں راہِ راست پر — ہر بار اک اُمید نے بھٹکا کے رکھدیا
جوشِ جنوں نے ہنس کے وہ سب کچھ اُٹھا لیا — احساسِ عقل نے جسے گھبرا کے رکھدیا

تھا دل کو اپنے ضبط پہ ناز اے جنوں بہت
ظالم نے اِک نگاہ میں تڑپا کے رکھ دیا

میر کا کلام[1]

(از میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

مطبوعہ کلیاتِ میر میں کتابت کی ہزارہا غلطیوں کی تصحیح جو میں پیش کر رہا ہوں یہ کسی اور نسخے کو سامنے رکھکر نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ میں نے محض اپنے ذوقِ سخن کی رہنمائی سے اور حضرت میر کے اندازِ سخن کو ملحوظ رکھ کر مطبوعہ غلط اشعار کو صحیح پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ (یگانہ)

جہاں پر فسانے سے ہمارے ۔۔۔ دماغ عشق ہم کو بھی کہا تھا
(پڑھے)

نہ بھکے میکدے میں میر کیونکر ۔۔۔ گرو سو جا ہے پیراہن ہمارا
(نہ بکتے)

گلی میں اُس کی گیا سو گیا جو بولا پھر ۔۔۔ مَیں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا
(نہ بولا)

شادابی و لطافت ہرگز ہوئی نہ اُس میں ۔۔۔ تیرے مسوو نیہ گرچہ سبزی نے زہر کھایا
(تیری مسوں پہ گرچہ سبزے نے)

قسمت تو دیکھ شیخ کو جب لہر آئی تب ۔۔۔ دروازہ شیر خانے کا معمور ہوگیا
(شیرہ خانے[2])

یہ سر تبھی سے گو کہ ہے میدان عشق کا ۔۔۔ پھرتا تھا جن دنوں میں تو گیندیں اُچھالتا
(گوئے ہے)

وہ موسم گل ہمکو تہِ بال ہی گزرے ۔۔۔ مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا
(وہ موسم گل)

(نوٹ: وہ روز، وہ موسم گل کنایہ ہے مدتِ قلیل سے یعنی موسم گل کے دس دن یا جوانی کی دس بہاریں)

راہ دردِ عشق سے روتا ہے کیا ۔۔۔ آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا
(ابتدائے عشق ہے)

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی چال چل ۔۔۔ اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا
(جھگڑا)

در پے دل ہی رہے اُس چہرے کے خالِ سیاہ ۔۔۔ ڈر ہمیں اِن چوٹوں کا روزِ روشن میں رہا
(چوٹٹوں)

نافع جو تھیں مزاج کو دل سو عشق میں ۔۔۔ آخر اُنھیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا
(اوّل)

وصل و ہجراں پے جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی ۔۔۔ دل غریب اُن میں خدا جانے کہاں مارا گیا
(یہ)

---

[1] اس سلسلہ کے پہلے مضامین زمانہ بابتہ جون۔جولائی ۱۹۴۱ء میں شائع ہو چکے ہیں (ا۔ ن)
[2] شیرہ خانہ یعنی شراب خانہ

جو یہ دل ہے کیا سرانجام ہوگا — تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا

ہزاروں کی یاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں (تو کیا / چھت سے) — تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بھل ہم بھی — شکستہ پارہ نے اپنے ہیں سنبھال لیا (شکستہ پائی نے اپنی)

رہوں ہوں برسوں سے ہمدوش پر کبھو آتے — گلے میں ہاتھ مرا پیار سے نہ ڈال لیا

مستی میں شکل ساری نقاش سے کھچا پر (اُن نے / کھینچی) — آنکھوں کو دیکھ اوس کی آخر خمار کھینچا

سب پہ جس یار نے گرانی کی (بار) — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

اب جھمکی اوس کی تم نے دیکھی کبھو جو یارو (جھمکی بھی) — برسوں تلک اوسی میں پھر دل سدا رہے گا (لگا رہے گا)

پایا نہ یوں کہ کرلے اُس کی طرف اشارہ (کریئے) — یوں تو جہاں میں ہم نے اُس کو کہاں نہ پایا

ایسی ہے میر کی بھی مدت سے رونی صورت (ایسی ہی میر کی ہے) — چہرے پہ اُس کے کس دن آنسو رواں نہ پایا

اُس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے (ہی) — اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا

کب مصیبت زدہ دل مائلِ آزار نہ تھا (ہی) — کون سے درد و ستم کا یہ طرفدار نہ تھا (طلبگار)

دلِ بے رحم گیا شیخ لئے زیرِ زمیں — مرگیا پر یہ کہیں گبر مسلماں نہ ہوا (کہیں)

اُن نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی جلا کے میر (جی چلا کے) — ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

کب تھی یہ بے جراتی شایانِ آہوئے حرم (بے حرمتی) — ذبح ہوتا تیغ سے یا آگ سے ہونا کباب

(نوٹ:- یہاں آہوئے حرم کنایہ ہے آلِ محمد سے، جن کی بے حرمتی و پامالی کے عرب ہمیشہ درپے رہے ہیں۔)

میری طاقت کو قبول آہ کہاں تک ہوگا (طاعت) — سبحہ اک ہاتھ میں ہے جام ہے اک ہاتھ کے بیچ

بیٹھیں ہم اُس کے سگِ کو کے برابر کیونکر — کرتے ہیں ایسی معیشت تو وہ مسوات کے بیچ (مساوات)

آئے ہیں میر منہ کو بنائے جفا سے آج (آتے ہیں / خفا سے) — شاید بگڑ گئی ہے کچھ اُس بے وفا سے آج

لو ہو میں شور ہے داماں و جیب میر (شور بور ہے) — بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

شکوۂ آبلہ ابھی ہے میر (ابھی سے) — ہے مری جاں ہنوز دِلّی دور

غیروں سے مل چلے تم مستِ شراب ہوکر — غیرت سے رہ گئے ہم یکسو کباب ہوکر (یکسر)

خبر آتی ہے سو بھی دور سے یاں — آؤ یک بار بے خطر نزدیک
بے خبر
کچھ اپنی آنکھ میں یاں کا نہ آیا — خذف سے لیکے دیکھا دربدر تک
میں دیکھا گہر
ہم آوازوں کو سیراب کی مبارک — پر و بال اپنے ایسے تھے کمر تک
پر و بال اپنے بھی ایسے تھے پر تک

(نوٹ: پر تک یعنی پارسال تک۔

گل کی جفا بھی جانی، دیکھی وفائے بلبل — یکمشت پر پڑھیں گلشن میں جائے بلبل
پڑے ہیں
اک دو چشمک ادھر اے گردش ساغر کہ کدام — سر چڑھی رہتی ہے یہ گردش ایام بہت
مدام
دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی — ہوا ناکام یہ رہتے ہیں مجھے کام بہت
ہوں تو
تو کن نیندوں پڑا سوتا تھا دروازے کو موئے ندشت — میں جو کھٹ پر تری کرتا رہا سر کو ٹپک کھٹ کھٹ
مونڈے شب
ترے ہجراں کی بیماری میں میر ناتواں کو شب — ہوا ہے خواب وسور آہ اوس کروٹ سے اس کروٹ
دشوار آہ اس
اک لطف کی نگہ بھی ہم نے نہ چاہی اس سے — رکھا ہمیں تو ان نے آنکھیں دکھا دکھا کر
دیکھی
اک رنگ پان ہی اس کا دل خون میں جہاں ہے — پھبتا ہے اس کو کرنا باتیں چبا چبا کر
دل خوں کن جہاں ہے
قدم تیرے چھوئے تھے جن سے اب وہ ہاتھ ہے سر ہے — مرے حق میں نہ ہونا ہی تھا یاں تک دسترس بہتر
جنہیں سے
غیر اور بغل گیری تری عید اور ہم سے بھاگنا — ہم یار یوں غمزدے خوش ہوئیں اغیار اس قدر
ہم یار، ہوں یوں غمزدے

قیامت تھا اس خشمگیں پر — کہ تلواریں چلیں ابرو کی چین پر
قیامت حسن تھا
پر افشانی قفس جی کی بہت ہے — کہ پروازِ چمن قابل نہیں پر
ہی
شکر کر داغ دل کا اے غافل — کس کو دیتی ہیں دیدۂ بیزار
بیدار
گو غزل ہو گئی قصیدے سے — عاشقوں کا ہے طولِ حرفِ شعار
قصیدے سی
ہر سحر ایک چلی تو ہے تو نسیم — اے سیہ مستِ ناز ٹک ہشیار
لگ چلے تو ہے
شاخ شانے نے ہزار نکلیں گے — جو گیا اس کی زلف کا اک تار
شانے سے
گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو — کہ جبہ ہے یک بار و عمامہ سربار
سربار

(نوٹ:۔ سربار یعنی بوجھ کے اوپر بوجھ۔ سربار و سرواہ فارسی کا محاورہ ہے مگر اردو میں بھی مستعمل ہے جیسے سر ہے تو سرواہ ہے۔

یہی دردِ جدائی ہے جو اس شب — تو آتا ہے جگر مژگان کے تر تک
مژگان تر

جاتیں ہیں فرشِ رہ تری مت حال حال چل — اے رشکِ حور آدمیوں کی سی چال چل
جائیں

او باشوں رہیگی گھر تجھے پانے لگے ہیں روز — مارا پڑے گا کوئی طلبگار آج کل
او باشوں ہی کے گھر

گلزار ہو رہی ہے مرے دم سے کوئی یار — ایک رنگ پر ہے دیدۂ خونبار آج کل
گلزار ہو رہا ہے مرے دم سے کوئے یار — کیا رنگ پر ہے

ٹھوکر دلوں کو لگتی لگے ہے خرام میں — لاویگی اِک بلا تری رفتار آج کل
لگتی ہے

بھلا تم نقدِ دل لیکر ہمیں دشمن گنوا تو لو — کبھو کچھ ہم بھی کر لیں گے حسابِ دوستاں در دل
دشمن تو گنوا لو

کیا کہوں کیا رکھتی تھی تجھ سے تری بیمار چشم — تجھکو بالیں پر نہ دیکھا کھول سو سو بار چشم
رکھتے تھے — تیرے — کھولی

سیکڑوں ہوں کشتی تولاویں کچھ تابِ نگاہ — ایک دو کا کام کب ہے اُس سے ہونا چار چشم
کشتے جب تو

نجانا نہ یہ کہ رکھتے ہیں کسے پیار — رہیں بے لطفیاں ہیں یاں تو باہم
نہ جانا یہ کہ کہتے ہیں — ہی

بنے کیا خال و زلف و خط سے دیکھیں — ہوئے ہیں کتنے بے کا فر فراہم
یہ

جہاں میر زیر و زبر ہو گیا — خراماں ہوا تھا وہ محشر تمام
محشر خرام

کہاں ہے تیغ و سپر آفتاب کی باری — وہ سرد مہر ہمارا بھی اب ہوا ہے گرم
بارے

داغوں ہی سے بھری رہی چھانا تمام عمر — بے پھول گل چنا کئے باغِ وفا سے ہم
چھاتی — یہ

فتنہ در سر بتان حشر خرام — ہارے کس ٹھیک سے یہ چلتے ہیں
ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

وصفِ دہن سے اُسکے نہ آگے قلم اُگے — یعنی کیا ہے خامہ نے ختمِ کلام یاں
اٹھا

خطرِ عظیم میں ہیں مرے آہ و رشک سے سب — کہ جہان رہ چکا ہے جو بھی ہے بادو باراں

اُسکے کوچے سے جو اٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں — نہ نظر کام کرے رو بہ قضا جاتے ہیں
تا — پھر

(نوٹ :- جہاں تک نظر کام کرے پھر پھر کے دیکھتے جاتے ہیں)

دیکھو خون آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے — ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھیں
دیکھوں ہوں — وہ

گدازِ عشق میں یہ بھی گیا میر — یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں
بہہ بھی گیا میر

ترے تیر ناز کی ہدف جو لئے ہوئے ہیں ظالم — مگر آہنیں توے ہیں جگرِ نیازمنداں
ترے تیر ناز کے یہ جو ہدف

ہیں صفا کیا دل تنا کہ دکھائی دیوے منھ بھی — ولے مفت اس آئینے کو نہیں لیتے خود پسنداں

کھلیں آنکھیں ہیں جو دیکھا سو غم اور چشم گریاں — کسے کہتے ہیں نجانا دل ناشاد و روئے خنداں

ہے کوئی جہاں میں جو اندوہگیں نہیں — اس غمکدے میں آہ دل خوش کہیں نہیں

گھر گھر ہے ملکِ عشق میں دوزخ کی تاب تب — بھڑکا نہ ہم کو شیخ یہ آتش کی بو نہیں

جو حیدری نہیں اُسے ایمان ہی نہیں — ہو کر شریف مکہ، مسلمان ہی نہیں

نوائے راز

(جناب ابوالفاضل راز چاند پوری)

اُس شوخ کے جلووں کا آئینہ مرا دل ہے — جو حُسن کا مرکز ہے، جو عشق کی منزل ہے

کیا چیز محبت ہے، کیا چیز مرا دل ہے — کونین کی غایت ہے، کونین کا حاصل ہے

یہ کعبہ وہ بت خانہ، کچھ فرق نہیں ان میں — اِک حُسن کی خلوت ہے، اِک حُسن کی محفل ہے

ناکامی و محرومی، رُسوائی و بدنامی — دنیائے محبت میں سب کچھ مجھے حاصل ہے

آزادی و پابندی، مختاری و مجبوری! — فطرت کی نوازش بھی صد شکر کے قابل ہے

یہ حُسن کرم ساقی! یہ کیفِ نظر قرباں! — اِک رند بلاکش بھی اِس دَور میں شامل ہے

آزادیِ گلشن کا وہ خواب جو دیکھا تھا — تعبیر تو کیا اُس کی تاویل بھی مشکل ہے

اے اہلِ چمن تم کو احساس نہیں شاید — بُلبل کا ہر اک نغمہ فریاد کا حامل ہے

پابندِ قفس رہنا، مانوسِ قفس ہونا — آسان کبھی ہوگا، اِس دَور میں مشکل ہے

کِس سوچ میں بیٹھے ہو، کیا فکر ہے اب تم کو — اے ہمسفرو اُٹھو، وہ سامنے منزل ہے

خود داری و حق کیشی، خوش بینی و حق گوئی
یہ راز کا مسلک ہے ناقص ہے کہ کامل ہے

(سانیٹ)

(از ناکام آرزو)

عروسِ فطرت کا حسن دلکش نکھار پر ہے، بہار پر ہے
فلک پہ تاروں، حسین تاروں کی محفلِ شب جمی ہوئی ہے
ہوائیں بیخود، فضائیں بیخود، تمام مستی و بے خودی ہے
زمیں پہ مستی برس رہی ہے، جمالِ فطرت نکھار پر ہے

فضا میں رقصاں ہیں چاند کی نشہ بار اور دل نشین کرنیں
وہ جانب غرب سے سیاہی لیئے ہوئے ابرِ مست اُٹھا
فغاں کہ اب پھیل جائے گا چند لمحوں میں جال ظلمتوں کا
پیامِ موت اس کو ہیں سمجھتیں لطیف اور مہ جبین کرنیں

یونہی مسرت کے کاروانِ حیات کی گھات میں ہے حسرت
بہار کی گھات میں خزاں ہے، تو پھول کی گھات میں ہے گلچیں
جو چشمِ بینا ہو تو فقط غم، وگرنہ ہے زیست خوابِ شیریں
جہانِ غم میں قدم قدم پر، ہزار غم ہیں بشکلِ راحت

او مستِ عہدِ شباب! دنیا کی ہر خوشی ہے حسین دھوکا!
محبتوں کا فسوں بھی دھوکا، شباب بھی ہے حسین دھوکا!

رباعی

دیدار سے اُحجبند کریں آنکھیں — اوپر دیکھا بلند کریں آنکھیں
کچھ ایسے مناظر نظر آئے مجھکو — دنیا کی طرف سے بند کریں آنکھیں

بنت صفدری

سادھو

(ایک قصہ)

(از مسٹر افتخار احمد صابر)

میری زندگی کی وہ زرّیں ساعت ناقابل فراموش ہے جب جبل پور آکر بندھیاچل کی سیر کو گیا اور وہاں ایک سادھو کے درشن سے اپنی روح میں ایک تازگی محسوس کی۔ میرا یہ سفر ایک دلی کشمکش کے ماتحت تھا اس لئے ظاہری ساز و سامان سے میں قطعاً معرّا تھا۔ کوئی اندرونی جذبہ تھا جس سے کھنچا جارہا تھا۔

من نہ باختیارِ خود می روم از قفائے او
آں دو کمندِ عنبریں می بردم کشاں کشاں

جبل پور سے تو کوئی ہمسفر نہیں تھا، مگر راستے میں چار آدمی جو مختلف منّتیں اُتارنے بندھیاچل جارہے تھے میرے ہمسفر ہو گئے۔ مذہبی اختلاف بھی کیا بُری چیز ہے کہ ہم سب ایک ہی جگہ جانیوالے تھے مگر ایک دوسرے سے بیگانہ تھے۔ تھوڑی ہی دُور سفر طے ہوا ہوگا کہ ایک اسٹیشن پر میرے ایک پُرانے دوست کیلاش نظر پڑے جو سوار ہونے کے لئے خالی جگہ تلاش کررہے تھے۔ اُن کی نگاہ مجھ پر پڑی اور "اختر تم کہاں؟" کہتے ہوئے میرے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ عرصہ تک عہد گزشتہ کی داستانیں دہرائی گئیں، پھر میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ میں ایک سادھو کے پاس جارہا ہوں وہ مجھے بُلا گئے ہیں مجھ سے اُن سے کسیا میں مُلاقات ہوئی تھی، وہ گوتم بدھ کی مورتی کی زیارت کے لئے آئے تھے میں بھی وہاں موجود تھا اُن کی دل میں اتر کرنے والی نصیحتوں نے مجھے غلام بنالیا۔ میں نے کہا کیا میں بھی اُن کے درشن کرسکتا ہوں؟

کیلاش:- "خوشی سے"

مَیں: "میرا مسلمان ہونا تو مانع نہ ہوگا؟"

کیلاش: "اختر! کیسی باتیں کرتے ہو فقیر کے یہاں ہندو مسلمان کا کیا سوال؟ جہاں یہ باتیں یاد سمجھو کہ یہاں سے خدا بہت دُور ہے۔"

مَیں: "کیا سادھو جی سے مَیں کچھ اپنے تشکوک بھی رفع کرسکتا ہوں؟"

کیلاش: "مجھے تو خیال ہے کہ اگر تم اس قسم کی باتیں کروگے تو وہ بہت خوش ہونگے اور نہایت شفقت سے تمہارے شکوک دُور کردیں گے"۔

میں: "کیلاش، تمھیں ہمارے شکوک معلوم نہیں اس لئے تم نے اتنی آسانی سے جواب دیدیا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ کہیں میری باتوں کو سن کر وہ مجھے اپنے یہاں سے نکال نہ دیں"۔

کیلاش: "کیا تم مجھے بھی کچھ بتا سکتے ہو؟"

میں: "کیلاش، پہلے یہ وعدہ کرو کہ خفا نہ ہوگے"۔

کیلاش: "میں وعدہ کرتا ہوں کہ خفا نہ ہونگا"۔

میں: "عرصہ سے میرے دل میں یہ خیال ہے کہ جس طرح ایک پیپل کے بیج میں پُورا پیپل کا درخت بالقوت موجود ہوتا ہے اور اپنے وقت پر وہ بالفعل درخت ہوجاتا ہے اُسی طرح عدم میں خدا پوشیدہ تھا اور جب ظہور میں آیا تو کائنات کے روپ میں نمایاں ہوگیا جس طرح پیپل کا بیج جب درخت کی صورت میں آجاتا ہے بیج نہیں رہتا اُسی طرح اب خدا کہیں چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ یہی کائنات خدا ہے اور اس طرح ہم تم سب خدا ہیں۔ مندر، مسجد، کاشانۂ دل میں وہ مقیم نہیں، یہ محض دھوکا اور فریب ہے"۔

کیلاش: "پھر تم بندے نہیں خدا ہو"

میں: "میں نے اپنا نظریہ بتادیا، اس سے جو سمجھو"۔

کیلاش: "اختر! مجھے تمھارے نظریہ سے اختلاف ہے، ہم میں اور خدا میں یہ نسبت نہیں جو تم سمجھتے ہو میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خدا کو سمندر سے تشبیہ دی جائے تو اس میں موج، قطرے، بُلبُلے سبھی موجود ہیں جس طرح یہ سب مل کر سمندر بن جاتے ہیں اُسی طرح تمام کائنات مٹ کر خدا میں مل جائیگی۔ قطرہ اُسی وقت تک قطرہ ہے جب تک سمندر سے جُدا ہے، حباب اُسی وقت تک حباب ہے جب تک اس میں ہوا ابھری ہوئی ہے موج کا وجود اُسی وقت تک ہے جب تک ہوا اُسے جنبش میں رکھتی ہے۔ اگر یہ اسباب دُور ہوجائیں تو سوائے بحر کے اور کچھ نہ رہ جائے"۔

میں: "کیا تم قطرہ، حباب اور موج کو بحر کا جزو نہیں کہوگے اور جب جزو کہوگے تو کیا یہ بحر نہیں ہوئے؟"

کیلاش: "جزو تو یقیناً ہیں مگر کُل نہیں، کیا صرف تمھارا ہاتھ اختر ہے، اگر ایسا نہیں تو قطرہ جزو بحر ہے بحر نہیں"

میں: "تو خیر ہم سب، خدا نہیں جزو خدا ہی سہی، پھر یہی اجزا ملکر خدا ہوئے، الگ خدا کہاں رہا جس کی تلاش میں ہم سب مارے مارے پھرتے ہیں"۔

کیلاش: "پھر تم اپنی پہلی تشبیہ کے تحت میں آگئے۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے میں اس تشبیہ کے مغالطے کو

ظاہر کردوں۔ تم نے پیپل کے بیج سے تشبیہ دیکر یہ دکھلایا کہ جب ظہور ہوا تو خفا جاتا رہا، حالانکہ ایسا نہیں ہیں نے جو تشبیہ دی ہے اس میں صاف ظاہر ہے کہ بحر کا وجود الگ ہے اور اُسی سے موج قطرے اور حباب ہیں۔ یہ فنا ہو کر بحر میں مل جاتے ہیں۔ تمھاری تشبیہ سے بیج غائب ہوجاتا ہے اور درخت ہی درخت رہ جاتا ہے۔ پھر پتّے۔ شاخ۔ پھول یہ سب فنا ہو کر بیج میں نہیں ملتے نہ وہی بیج قائم رہتا ہے، یعنی خدا الگ نہ رہا جس کی تلاش کی جائے"۔

مَیں: "یقیناً"

کیلاش: "میں نے جو تشبیہ دی اُس پر تمھیں کوئی اعتراض ہے؟"

مَیں: (غور کرکے) "نہیں!"

کیلاش: "اب تم دیکھو تمھاری تشبیہ سے کیا کیا نقائص پیدا ہوتے ہیں، جب تم ہر چیز کو خدا کہوگے تو تم کتنے سکنڈ تک زندہ رہ سکتے ہو، ہوا خدا ہے، پانی خدا ہے، غذا خدا ہے تم اس کو کس طرح استعمال کروگے، اور یہ چیزیں کیوں تمھارے استعمال میں آنے لگیں۔ تم اپنا ہاتھ کیوں نہیں چباتے؟ تم اپنا خون نکال کر کیوں نہیں پیتے؟ یہ صرف اسی لئے کہ وہ تمھارے اجزا ہیں یہیں سے پتہ چل گیا کہ جو چیز ہم اپنے مصرف میں لاتے ہیں وہ غیر ہے ہماری ذات نہیں"۔

مَیں: "کیلاش، تمھاری دلیل سے میری تشبیہ تو مشتبہ ہوگئی، مگر تمھاری تشبیہ بھی ناقص معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ حباب۔ موج اور قطرہ یہ سب آغوشِ دریا ہی میں ہیں الگ نہیں اس لئے کہیں الگ خدا کا تلاش کرنا بیکار ہے"

کیلاش: "تشبیہ تو ہمیشہ ناقص ہی رہیگی، کیونکہ خدا کی ذات ایسی ہے جس کی تشبیہ ناممکن ہے، ہاں ذہن کی رسائی کے لئے خفیف سا اشارہ البتہ ہم پہونچ سکتا ہے، میں نے جو کہا حقیقت یہی ہے"

قطرے میں کچھ نہیں پانی کے سوا کیا کہئے
بات کہنے کی نہیں ہے بخدا کیا کہئے

ہماری حالت تو اُس ذات بحت (پاک ومنزہ) سے ایسی ہے:

وصل ہے دل میں پرا تبک ذوقِ غم پیچیدہ ہے — بُلبلا ہے عین دریا میں مگر نم دیدہ ہے
بے حجابی یہ کہ ہر ذرّے میں جلوہ آشکار — گھونگھٹ اُس پر یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

ہم لوگوں کے اس دلچسپ مکالمہ کو ریلوے اسٹیشن کے شور وہنگامے نے ختم کردیا اور تھوڑی دیر تک مسافروں کی دھکّم دھکّا نے دماغ منتشر کردیا۔ کیلاش کو بار بار مذاق سوجھتا تھا اور مجھے مخاطب کرکے کہتا تھا

کہ اختر دیکھو بہت سے خدا ڈبّے میں گھُسے آتے ہیں۔ اپنی خدائی سبنھالو نہیں تو پس جاؤ گے۔ یہ بندھیا چل دیوی کے پریمی اُپاسک ہیں جو درشن کے لئے جا رہے ہیں، ابھی ان بیچاروں میں خدائی نہیں آئی ہے۔

۲

صبح کا سہانا وقت تھا روشنی پھیل رہی تھی، چڑیاں اپنی اپنی زبان میں تسبیح وتہلیل میں مصروف تھیں۔ ابتدائی راستے میں ہم لوگوں کے ساتھ ایک جم غفیر تھا، مگر جوں جوں آگے بڑھتے گئے بھیڑ کم ہوتی گئی کیلاش نے سب سے الگ ہو کر ایک طرف کا رُخ کیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہو گیا۔ تقریباً ایک میل چڑھائی کے بعد ایک نغمۂ دلکش کی صدا کانوں میں آئی دماغ ادھر متوجہ ہوا، غور سے سُنا تو معلوم ہوا کہ کوئی سریلی آواز میں گا رہا ہے ؎

ہے اصل وجود ایک، باقی فانی اشکال کا ہے نام وجودِ ثانی
پانی سے بخار، ابر، بوندیں، پھر برف جب گھُل گیا برف پھر ہے پانی پانی

میرا دل یہ نغمہ سُنکر مست ہو گیا، میں نے کیلاش سے کہا بھائی جہاں سے یہ آواز آ رہی ہے وہیں چلو میرا دل بیتابانہ ادھر کھنچ رہا ہے۔

کیلاش: وہیں چل رہا ہوں، گروجی کی کُٹی سے یہ آواز آ رہی ہے۔

ہم لوگ تھوڑی دیر میں وہاں پہونچ گئے، دیکھا کہ ایک بزرگ آسن جمائے ہوئے بیٹھے ہیں، چہرہ آفتاب کی طرح چمک رہا ہے چند آدمی جن میں مجھے ہر ایک باخدا معلوم ہوتا تھا مؤدب بیٹھے ہیں نہ وہاں گانجے کی چلم ہے نہ بھانگ کا کونڈا، سونٹا۔ مگر جو ہے مست سا نظر آتا ہے۔ ایک حسین نوجوان جوگی مذکورہ بالا اشعار گا رہا ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی سادھوجی نے کیلاش سے کہا "آؤ بیٹا، میں تمہارا منتظر ہی تھا" اور میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ اچھا تحفہ لائے" کیلاش قدموں پر گر پڑا اور میں دم بخود کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہنا کہ "یہ اچھا تحفہ لائے" کہیں میری بدکرداریوں کی وجہ سے گراں خاطری کی تو دلیل نہیں۔ میں اسی دھُن میں تھا کہ سادھوجی نے مجھ سے کہا میرے قریب بیٹھ جاؤ۔ میں سامنے بیٹھ گیا۔ نوجوان حسین سادھو نے ایک غزل اپنے ستار پر یوں گانی شروع کی:-

سیرِ فنا بقا میں دکھلائے کوئی مجھکو میں کون ہوں کہاں ہوں بتلائے کوئی مجھکو
آیا ہوں میں کہاں سے جاؤنگا میں کہاں کو آتا نہیں سمجھ میں سمجھائے کوئی مجھکو
ہے رشتۂ تشخص وابستہ جان و دل سے اُلجھا ہوا ہوں بیشک سلجھائے کوئی مجھکو

دریائے بیخودی میں غوطے لگا رہا ہوں شاید درِ حقیقت ہاتھ آئے کوئی مجھکو
میرا یہ جسم خاکی جام جہاں نما ہو اِس ڈھب کی چند باتیں سکھلائے کوئی مجھکو
جس جا فنا ہے فانی اور اسم و رسم سب گم بہر خدا وہاں تک پہونچائے کوئی مجھکو

حاذق یہ میری حسرت اک دم میں سب فنا ہو
ہاں تصر سا جو مُرشد مِل جائے کوئی مجھکو

سادھو: (مجھ سے مخاطب ہوکر) آپ کا یہاں کس طرح آنا ہوا؟
میں: "روانہ تو صرف سیر کی نیت سے ہوا تھا مگر اپنے دوست کیلاش کے مِل جانے پر یہ ارادہ بدل گیا اور صرف آپ کے درشن کی تمنّا رہ گئی"۔

سادھو جی نے مجھ سے میرے وطن اور میری تعلیم کی بابت دریافت کیا، پھر اس طرف کے بہت سے بزرگوں کا تذکرہ فرمایا، جونپور کے بزرگوں کے سلسلے میں فرمایا کہ وہاں میں مولانا عبدالعلیم صاحب آسی سے ملا ہوں اور اُن کی وجہ سے میری بہت سی گتھیاں سُلجھیں، ایکمرتبہ نابینا ہونے کی حالت میں بھی مِلا ہوں اُن کا یہ شعر ؎

بُلبلے کی طرح آنکھوں کو جو اندھا کرتے
تجھکو اے جانِ جہاں دل ہی میں دیکھا کرتے

پڑھکر کہا کہ اب تو آپ نے ظاہری آنکھوں کو پوشیدہ کر لیا اب تو درشن ہوتے ہونگے۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی جب تک خیال کی آنکھیں نہ بند ہو جائیں دل کی آنکھیں کیسے کھلیں"۔

میں: "سادھو جی! کیا ایشور کو دیکھ نہیں سکتے؟
سادھو: ان آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکتے، یہ تو اتنی کمزور ہیں کہ مادّی چیزوں کو بھی صحیح نہیں دیکھ سکتیں اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جن کا ہمیں احساس ہوتا ہے اس کا ذریعہ صرف آنکھ ہی نہیں، خوشبو کو سُونگھ کر، سردی گرمی کو چھُو کر معلوم کرتے ہیں، ہوا مادّی ہے مگر تم آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے، پھر خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنے کی تمنا کم عقلی اور نادانی کی دلیل ہے"۔
میں: تو کیا کسی بزرگ نے نہیں دیکھا، کسی کی آنکھ میں اتنی قوت نہیں تھی؟
سادھو: نہیں اور ہرگز نہیں، تم ایک مسلمان کے بچے ہو، قرآن شریف تو پڑھا ہوگا"۔
(میں شرم سے پسینہ پسینہ ہوگیا اور گردن جھکالی)
سادھو: شرمانے کی کوئی بات نہیں، انگریزی تعلیم اور نئی روشنی کا یہی اقتضا ہے کہ آدمی اپنے مذہب کو بھی بھُول جائے، خدا کے ماننے والوں کو خبطی وہمی سمجھے، تم نے تو ماشاء اللہ کالج میں فلسفہ لیا تھا

اگر نہیں جانتے تو میں بتاؤں قرآن شریف میں لکھا ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر (آنکھ اُس کو نہیں دیکھ سکتی مگر وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے، وہ پاک اور خبر رکھنے والا ہے۔)

میں: "حضور تو مسلمانوں کے مذہب سے اتنا واقف ہیں جتنا اکثر مسلمان بھی واقف نہیں۔ کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی نہیں دیکھا، کیا پہاڑ کا جلنا، پھٹنا، موسیٰ علیہ السلام کا بیہوش ہونا یہ سب قصّہ ہی قصّہ ہے۔"

سادھو: "قصّہ تو نہیں واقعہ ہے، مگر تم نے قصّہ کے طور پر اس کو سنا کبھی قرآن شریف کو اُٹھا کر نہیں دیکھا اور اس پر غور نہیں کیا، قرآن شریف میں تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی تمنّا کی اس پر جواب ملا کہ تم نہیں دیکھ سکتے۔ بار بار کے التماس پر حکم ہوا کہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کی تجلّی پہاڑ پر ہوئی، ادھر دیکھنا ہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے اور طُور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔"

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طُور تھا

"یہاں غور کرو کہ ذات نہیں بلکہ اس کی تجلّی کی زیارت پہاڑ کے واسطہ سے کرائی گئی، پھر بھی نہ آنکھ برداشت کر سکی نہ پہاڑ میں طاقت رہی۔ جب تجلّی کا یہ عالم ہے تو ذات کی زیارت کس طرح ممکن ہے۔ یہیں سے اس کا بھی پتہ چل جاتا ہے کہ خدا کی تجلّی کسی واسطہ اور ذریعہ سے دیکھی جا سکتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ لوگ پیر و مرشد، گرُو کی جستجو کرتے ہیں۔"

نورِ معشوقِ ازل بر دلم از یار فتاد عکس آئینہ ز آئینہ بہ دیوار فتاد

ہندوؤں میں بھگت پرہلاد گزرے ہیں اُن کی بھی امداد ستون چاک کر کے شیر کی صورت میں ہوئی تھی۔"

کیلاش: "مہاراج! گیتا میں سری کرشن جی نے خدا کی جگہ پر بجائے ضمیر غائب کے ضمیر متکلم استعمال کی ہے یعنی ہر جگہ اپنی عبادت اور اپنے میں فنا ہونے کے طریقے بتائے ہیں۔ کیا واقعی وہ خدا تھے اور اُن کا منشا اپنی پرستش کرانا یا اپنے میں لوگوں کو فنا کرنا تھا۔"

سادھو: "سری کرشن جی تو بڑے لوگ ہیں، اوتار ہیں، پیغمبر ہیں، اگر اُن کی زبان سے یہ کلمہ سُنا تو کچھ تعجب نہیں یہ حال تو بزرگوں پر بھی وارد ہوا ہے۔ کیلاش! تم نے فارسی لی تھی، فریدالدین عطار کا یہ کہنا ع

"من خدایم من خدایم من خدا"

یہ کیا ہے؟ منصور کا "انا الحق" کہنا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ ہمارے یہاں جو بزرگوں نے

"اہم برہم" کہا اسی فنائیت خدا کا نتیجہ ہے۔ بہت سے گمراہ اس حالت کو تو سمجھتے نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کو خدا سمجھکر اپنی پرستش کرانی شروع کی۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا یہ کہنا تو کسی طرح زیبا ہی نہیں، کیونکہ محمد صلعم پر بھی یہ حالت طاری ہوتی تھی جبکہ وہ اپنے کو بھی نہیں جانتے تھے چنانچہ حدیث شریف میں ایک جگہ ہے کہ ایک مرتبہ محمد صاحب اپنے حجرے میں تھے آپ کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دروازے کے پاس گئیں اور دروازہ کھولنا چاہا، حضرت نے پوچھا کون ؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنا نام بتایا، حضرت نے پوچھا کون عائشہ ؟ جواب ملا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی لڑکی۔ پوچھا کون ابوبکر ؟ حضرت عائشہ نے کہا "محمد صلعم کے دوست اور صحابی" کہا "کون محمد ؟" جب یہ حالت دیکھی تو واپس چلی آئیں۔ یہ کیا تھا وہی فنائیت ذات احدی تھی کہ سوائے اس کے اور سب فنا تھے۔"

میں: "تو آخر ہم سے اور خدا سے تعلق کس قسم کا ہے ؟"

سادھو: "صحیح طور پر تو اس کے لئے تشبیہ ممکن نہیں، مگر ذہن کو ادھر متوجہ کرنے کے لئے صرف اتنا اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ جو نسبت آفتاب کو دھوپ سے ہے وہی نسبت موجودات کو خدا سے ہے، ظاہر ہے کہ دھوپ آفتاب کی وجہ سے ہے مگر دھوپ عین آفتاب نہیں، اسی طرح مظہر عین خدا نہیں گو اس کا وجود اسی کی ذات سے ہے:-

"ذرّے میں آفتاب کے پرتو سے جان ہے"

مشہور ہندی شاعر کیشوداس نے کیا خوب کہا ہے ؎

मैं देखौं निर्धार यह, जग काचो काच सम

एकै रूप अपार प्रतिबिम्बित लखियत परत

اس دلچسپ گفتگو میں دس بج گئے۔ سادھو نے کیلاش کو مخاطب کرکے کہا "بیٹا یہ مہمان ہیں ان کے کھانے پینے کا سامان کرو پھر گفتگو ہوگی۔" یہ کہہ کر سادھو جی کُٹی کے اندر داخل ہو گئے، مجمع برخاست ہو گیا۔

(۳)

تمام دن کیلاش سے مختلف قسم کی گفتگو میں کٹا، شام کے وقت کچھ لوگ آئے سادھو جی اُن کے ساتھ باہر چلے گئے، رات بھر ہم لوگ اُسی کُٹی میں پڑے رہے۔ تقریباً ۴ بجے صبح کو سادھو جی واپس آئے اور اشنان کرکے باہر اپنے آسن پر بیٹھ گئے، ہم لوگ بھی دن نکلنے پر کل کی طرح سامنے بیٹھ گئے۔ سادھو جی نے یوں گفتگو شروع کی:-

سادھو: جب ہمیں مکان بنوانا ہوتا ہے تو انجینیر کی رائے کو تمام رایوں پر ترجیح دیتے ہیں، بیماری میں ڈاکٹر کا مشورہ قابل قبول ہوتا ہے مگر خدا تک پہونچنے کا کام ہی ایک ایسا کام ہے جس میں سب اپنی رائے کو افضل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ راستہ سب سے اہم اور دشوار ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ زیادہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جب دُنیاوی کام میں اُس فن کے ماہر کی امداد ضروری ہے تو یہ کیا اندھیر ہے کہ دین کے کام کو اپنی عقل کے حوالے کر دیں۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں اس کی رہنمائی کے لئے پیغمبر نہ آئے ہوں۔ چونکہ پیغمبر ہمیشہ نہیں رہتے اس لئے مرشد کی ذات اس میں امداد کرتی ہے تلسی داس نے فرمایا ہے:۔

राम चरन ओम्ब बिनु परमारथ की आस
तुलसी वारिध बूंद गहि चाहत उड़न आकास

مولانا آسی نے فرمایا ہے:۔

راہِ حق کی ہے اگر آسی تلاش   خاکِ پا بن مردِ حق آگاہ کی
ملنے والوں سے راہ پیدا کر   اس سے ملنے کی اور صورت کیا

میں: کیا یہ ممکن نہیں کہ خدا جو رحیم اور کریم ہے اپنے بندوں کو اپنی معرفت میں کسی کا محتاج نہ بنائے؟
سادھو: ممکن تو سب کچھ ہے مگر یہ دنیا عالم اسباب ہے جو باتیں ظہور میں آتی ہیں اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور نظر آتا ہے، اور اس کا کوئی نہ کوئی وسیلہ ضرور بنتا ہے، کیا تم نے قرآن شریف میں نہیں دیکھا یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو اس کی طرف وسیلہ اور محنت کرو اُس کی راہ میں تاکہ تم فلاح پاؤ) محمد صلعم پر وحی جبرئیل علیہ السلام کے وسیلہ سے آتی تھی، موسیٰ علیہ السلام کو تجلی پہاڑ کے وسیلہ سے نظر آئی، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا اسباب کا محتاج ہے ؎

خدا کے کام کچھ اسباب پر نہیں موقوف   ابوالبشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

قاعدہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، مگر اللہ نے اپنی یہ قدرت بھی دکھا دی کہ ایک مرد سے ایک عورت کی تخلیق کر دی۔ چنانچہ حضرت حوّا آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئیں۔ یہ خیال ہو تا کہ پیدائش کے لئے باپ ضروری ہے مگر خدا نے اپنی اس قدرت کا اظہار بھی عیسیٰ علیہ السلام کو بے باپ کا پیدا کر کے کر دیا۔ ہندوستان میں تو ایسے ایسے نادر وجود ہوئے ہیں

کہ خدا کی قدرت کے متعلق کسی حصر کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کمبھ رشی اور سیتا جی گھڑے سے پیدا ہوئیں۔ بہت سے رشی منی مادر زاد ولی تھے۔ مگر یہ مستثنیات ہیں۔ خدا نے ایک عام حکم اس انداز میں دیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِاَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

میں: "تو پھر مجھے ایسی تدبیر بتائیے کہ میں اس راستہ پر لگ جاؤں، جہاں آپ نے میرے تمام شکوک دُور کر کے ممنون کیا اسی طرح اس راستہ کی رہنمائی فرمائیے۔ اب آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں"۔

سادھو: "میں اس کا جواب کل دونگا"۔

سادھو جی حسب معمول پھر اُٹھ گئے اور دن بھر مجھے درشن نصیب نہیں ہوئے۔ ہاں کیلاش کو البتہ اپنی کُٹی میں بُلا لیا۔ سادھو جی کی وسعت معلومات دیکھکر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ انگریزی، اُردو، فارسی، عربی، ہندی، سب پر کافی عبور، اس کے علاوہ نہیں معلوم کیا کیا جواہرات تھے جو ہم لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں ہوئے جب وہ مجھ سے مخاطب ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مسلمان درویش جو اپنے فن میں کامل ہو سحر حلال کر رہا ہے، جب دوسروں سے خطاب ہوتا تو ایک جوگ راج اور ہندو دھرم کے گیانی نظر آتے۔ جب کسی انگریزی داں سے گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی اُن کے گھر کی لونڈی ہے۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا تھا کہ دیکھئے میرے سوال کا کل کیا جواب ملتا ہے، اگر مجھے یوں ہی واپس کیا تو کہیں کا نہیں رہا۔ تمام دن اور رات کیلاش اُسی کُٹی میں رہا۔ سویرے کے وقت سادھو جی باہر نکلے اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا "آخر میں تمھارے لئے دُعا کرتا رہونگا کہ یہ راہ تم پر آسان ہو جائے"۔ یہ کہہ کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک روشنی میرے قلب میں آنکھوں کی راہ سے اُترتی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ "جاؤ جو کچھ یہاں سے تمھیں ملنا تھا مل گیا اب تم بُرائیوں سے بچتے رہو اور اللہ کو کبھی نہ بھولو، پانچ سال کے بعد ایک فقیر سے ملاقات ہوگی وہ تمھیں تمھارا حصّہ دیگا" یہ کہہ کر فرمایا کہ کیلاش تم دونوں جاؤ اب یہاں ضرورت نہیں"۔ ہم لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حکم کی تعمیل میں ہم لوگ واپس ہوئے۔ واپس ہوتے وقت سادھو کی زبان پہ "اللہ کو سونپا" تھا اور ہم لوگوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان۔

سادھو

(از محمد مصطفےٰ اعزاز کلیمی، ایڈیٹر اخبار مرشد، دیوریا)

جہاں سے منہ کو موڑ کے، دیار و شہر چھوڑ کے ہر ایک رشتۂ وطن کو دل سے اپنے توڑ کے
تیری سرن میں آ گیا، ہر اک سے منہ کو موڑ کے پرارتھنا ہے ایشور یہ ہاتھ اپنے جوڑ کے
ہو گر مجھے نکالنا، تو دوسرا خدا بتا

حسین و مہ جبیں چھٹے، مکاں چھٹے مکیں چھٹے شراب تو خراب تھی، یہ جام انگبیں چھٹے
وہ گلبدن حسیں کہاں، وہ رشکِ حور عیں چھٹے کوئی نہ غیر اب رہا، عدو سے بغض و کیں چھٹے
تو اب بھی گر نہیں ملا، تو دوسرا خدا بتا

مکاں مرا بہشت تھا، اُسے بھی چھوڑ چھاڑ کر محبتوں، مروتوں کے جال توڑ تاڑ کر
ہر ایک دل کی خواہشوں کے دیو کو پچھاڑ کر تری پناہ میں نے لی، بسا گھر آہ اجاڑ کر
نہ رحم اس پہ بھی کیا، تو دوسرا خدا بتا

چمن وہ اب چمن نہیں، دمن وہ اب دمن نہیں گلوں میں وہ پھبن نہیں۔ نشاط زا سمن نہیں
خیالِ جسم ہے کہاں، حواسِ جان و تن نہیں لباسِ فاخرہ کہاں، یہاں تو اب کفن نہیں
نہ اپنا اس پہ بھی بنا۔ تو دوسرا خدا بتا

ندا یہ آئی غیب سے "اے بندۂ ہوا ہوس بنا لیا پہاڑ کو ہے تو نے اپنا کیوں قفس
خیال خام ہے ترا۔ نگہ نہیں ہے دور رس ہماری ذات کیا نہیں ہے اور کہیں نہیں ہے بس
وطن میں تیرے میں نہ تھا، تو دوسرا خدا بتا

ہمارا بندہ کب رہا، غرض سے اپنی کام ہے اسیرِ نفس غور کر، ہوس کا تو غلام ہے
بہشت تیرا گھر نہیں، خودی ترا مقام ہے نجات اپنی سلجھنے جو تجکو صبح و شام ہے
جو سب کا میں نہیں خدا۔ تو دوسرا خدا بتا

دعا ابھی نہیں یہ کی، کہ دیش کا سدھار ہو ہماری قوم جاگ اُٹھے، بھنور سے ناؤ پار ہو
نفاقِ مذہبی مٹے، تیری ہی رٹ پکار ہو صلاحیت جواں میں دے، خمار کا اُتار ہو

کہا جو کچھ تو یہ کہا "تو دوسرا خدا بتا"

تو جا یہاں سے لوٹ جا، وطن کا تو سُدھار کر وہیں ملوں گا میں تجھے، نہ زندگی کو خوار کر
یہ وقتِ امتحان ہے، قدم کو استوار کر سنبھال سب کے خُلق کو گلے لگا کے پیار کر

نہیں تو رٹ لگائے جا "تو دوسرا خدا بتا"

وہ میرے بندے کیا نہیں، جو مستِ کارزار ہیں وہ میرے بندے کیا نہیں، جو وقفِ صد ملال ہیں
وہ میرے بندے کیا نہیں، زمین کو جو وبال ہیں وہ میرے بندے کیا نہیں، جو تیرے ہمخیال ہیں

نہیں ہے ایک اگر خدا، "تو دوسرا خدا بتا"

سنبھال میرے بندوں کو، تجھے بھی میں سنبھال دوں اُٹھا تو میرے بندوں کو، تجھے بھی میں اُچھال دوں
تو راستہ اُنھیں دکھا، تیری بلا کو ٹال دوں ترقیاں انھیں دلا، تجھے بھی میں کمال دوں

نہیں تو رٹ لگائے جا۔ "تو دوسرا خدا بتا"

چند اشعار

نتیجۂ فکر حضرت محمود اسرائیلی

غم نہ ہوگا بھی تو دل چین سے کب بیٹھے گا عیش میں لذتِ آزار کا رونا ہوگا۔

رہِ نیاز سے ہو کر گیا ہے جادۂ عشق خودی کو چھوڑ، خودی سے خدا نہیں ملتا

محبت کی بنا احساس پر ہے یہ گلزارِ تخیل کا ثمر ہے

حُسن میں سوزش ہے لب پر عشق کی فریاد ہے مضطرب دونوں ہیں اِک مجبور اِک آزاد ہے

عالمِ بیخودی ہی میں سیرِ چمن کا لطف ہے حُسنِ چمن کا خوں نہ کر تجزیۂ جمال سے

گلشن میں صبا آ کر گُل خوب کھلاتی ہے پنکھڑی ہلتی ہے تتلی نظر آتی ہے

جڑاؤ ہار

(از ڈی۔ پی۔ بھٹناگر۔ کشتہ)

قسمت کی کارسازی دیکھئے کہ ماٹلڈا ملکۂ حسن و جمال ہوتے ہوئے بھی دولت و ثروت کے عزّو وقار سے محروم تھی اور مجموعۂ اخلاق حمیدہ و صفات حسنہ ہوتے ہوئے بھی دولتمندوں کی سوسائٹی میں اس کا گذر نہ تھا۔ دامن صحرا میں کھلنے والا پھول کتنا ہی خوشنما اور خوبصورت کیوں نہ ہو۔ عوام کی نظروں میں نہیں آتا۔ حسن کی زیب و زینت اور دیوتاؤں کے پرستش کے لئے بھی گلزار و باغات ہی کے پھول پسند کئے جاتے ہیں۔ افلاس و غربت ایسی چیزیں ہیں جن سے انسان کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ غریب والدین کی غریب بیٹی ہو کر ماٹلڈا کو بھی تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ایک معمولی کلرک کی شریک حیات بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ اگر وہ ان لوگوں میں نہ تھی جو ناکامیابی و نامرادی کی تلخیوں سے پریشان ہو کر زندگی کی دلچسپیوں سے منہ موڑ لیتے ہیں یا اسکی تلخیوں میں ہی غرقاب ہو جاتے ہیں بلکہ وہ آس اور امید کا دامن پکڑ کر زندگی کے اتھاہ ساگر کی عمیق گہرائیوں سے کامرانی کے انمول موتی رول لینا چاہتی تھی۔ مفلسی سے محصور چھوٹے سے مکان کی چہار دیواری کے اندر بھی وہ محلات کے عیش و آرام اور وہاں کے سامان تعیش کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ جب پروردگار نے اسے حسن بے مثل جیسی نعمت عطا کی ہے تو اسکی آرائش و زیبائش کے سامان بھی بہم پہونچائے گا اور کسی نہ کسی دن وہ وقت بھی آئیگا جب اسکو امیروں کی سوسائٹی اور دولتمندوں کے حلقہ میں درجہ امتیاز حاصل ہوگا۔ جب اسکو بھی آسودگی و خوشحالی اور ہر قسم کی آسائش میسر ہوگی۔ اور غم و فکر سے آزاد ہو کر اس کا حسن بھی گوہر آبدار کی طرح اور نکھر جائے گا۔ اور دنیا اسے ملکۂ حسن و جمال تسلیم کریگی!!!

وہ دن رات کوشاں رہتی اور پرماتما سے دعائیں مانگتی کہ اس کا شوہر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو یا اسکی ترقی کی کوئی اور ہی راہ نکل آئے مگر عرصہ تک بیچاری کی امید بر آنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ وقت ایک تیز رو دریا کیطرح گذرتا چلا گیا اور مسلسل سعی کے باوجود ماٹلڈا کا شوہر اپنی بیوی کی تمنا پوری نہ کر سکا۔ کوئی تدبیر نوشتۂ تقدیر نہ بدل سکی۔!!
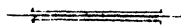
ایک روز شام کو ماٹلڈا کے شوہر نے دفتر سے آکر ایک لفافہ دیا اور نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔ دیکھو "جان من تمہارے لئے کیا چیز لایا ہوں" ماٹلڈا نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اسمیں ایک دعوت نامہ تھا۔ افسران،

محکمہ تعلیم کی جانب سے وزیر تعلیم کو مدعو کیا گیا تھا اور شہر کے رؤسا و معززین سے دعوت میں شریک ہونے کی درخواست کی گئی تھی ۔ دفتر کے چند خاص اور بارسوخ ملازمین کو بھی اس تقریب میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ماٹلڈا کا شوہر بھی انھیں خاص آدمیوں میں تھا۔ دعوت نامہ کو لیکر کسی قسم کی اظہار مسرت کرنے کے بجائے ماٹلڈا نے تنک مزاجی سے اسکو زمین پر ٹپکتے ہوئے کہا" بڑا نایاب تحفہ لائے ہو" یہ میرے کس مطلب کا ہے؟

اس خشک جواب سے بیچارہ شوہر ہکا بکا رہ گیا۔ اسکو اسکی توقع نہ تھی اسلئے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔کیوں۔مطلب کا کیوں نہیں ہے ؟ میرا خیال تھا کہ تم اس دعوت سے خوش ہوگی۔ہر روز تو ایسی تقریبیں ہوتی نہیں۔ اور پھر اس میں صرف خاص خاص لوگ ہی شامل ہوں گے ۔کیونکہ شہر کی چیدہ چیدہ خواتین اور بڑے بڑے آدمی ہی مدعو کئے گئے ہیں ۔

"ہم تو بڑے آدمی نہیں ہیں" ماٹلڈا نے جھلا کر کہا۔بڑے آدمیوں کے پاس اٹھنے بیٹھنے کے لئے ڈھنگ بھی تو بڑے ہونا چاہئیں۔یا یوں خستہ حال ہی ان لوگوں میں شریک ہوا جاتا ہے! انکی نظروں میں ذلیل و حقیر ہونے سے تو بد رجہا بہتر ہے کہ انکی حقارت آمیز نگاہوں کے سامنے ہی نہ جائے اگر اُن کے ہم پلہ و ہم پایہ نہ سہی تو کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ وہ ہمیں حقیر یا ناچیز خیال کرکے ہم سے اپنا دامن نہ بچائیں اُن کے روبرو ہماری آنکھیں نیچی نہ ہوں ۔

بیوی کی یہ تقریر سنکر وہ بڑے تشش و پنج اور تذبذب میں پڑ گیا۔اس کے ذہن میں یہ تمام باتیں آئی ہی نہ تھیں ۔مگر اب بات نباہنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی چاہیئے ۔بیوی کی تنک مزاجی پر قابو حاصل کرنے کے لئے اُس نے خوشامدانہ لہجہ میں کہا ۔ امیروں کے ہم پلہ ہونے کے لئے تم میں کمی کس بات کی ہے آخر ان میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوتا ہے ۔میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ پوشاک جو تم سنیما جاتے وقت پہنا کرتی ہو نہایت ہی دیدہ زیب اور خوشنما ہے اور اُس سے تمھارا حسن دوبالا ہو جاتا ہے"۔

مگر ماٹلڈا اپنے شوہر کی یہ تجویز سننے کیلئے تیار نہ تھی۔اُسے ان الفاظ میں خوشامد اور چاپلوسی کی بو محسوس ہوئی اور اسکی افسردہ طبیعت شگفتہ ہونے کے بجائے اور بھی پژمردہ ہوگئی اپنی بے بسی اور مفلسی کا خیال کرکے اس کا نازک اور ننھا سا دل بھر آیا۔جذبات سینے میں گھٹنے لگے گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند اُس کے دونوں ہونٹوں میں ذرا جنبش ہوئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے ۔

بیچارہ شوہر عجیب مشکل میں پھنس گیا اُس نے محبت سے بیوی کو اپنی آغوش میں کھینچتے ہوئے ۔پیار سے کہا۔"ماٹلڈا ۔ڈارلنگ بھلا اسطرح پریشان ہونے کی کیا بات ہے"؟

رخساروں سے آنسو پونچھتے اور شوہر کے دامن میں منھ چھپاتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا"کچھ نہیں"۔

"کچھ کیسے نہیں! پھر تم روئی کیوں؟"

"مجھ سے ایسی تقریب میں پرانے دھرانے کپڑے پہن کر نہ جایا جائیگا۔ اسلئے یہی بہتر ہے کہ تم اس دعوت نامہ کو اپنے کسی دوست کو دیدو"۔ یہ کہتے ہوئے ماٹلڈا نے اپنے شوہر کی طرف نظر بھر کر دیکھا تو اسکی آنکھوں سے فطری نسوانی غرور جھلک رہا تھا۔

اُس کے شوہر کو کسی طرح اسکی دلشکنی منظور نہ تھی۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد اُس نے تسلی بخش لہجے میں کہا، "اچھا ماٹلڈا بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمھاری ایک عمدہ پوشاک کتنی قیمت میں تیار ہوسکیگی؟"

شوہر کی یہ تجویز سنکر اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے۔ مگر جذبات کو دباتے ہوئے اُس نے شرمائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے کیا معلوم" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے پھر کہا "عمدہ پوشاک تو قریباً چار سو فرنک سے کم میں کیا تیار ہوسکیگی"!۔

چار سو کا نام سنکر بیچارے شوہر کے چہرے کی خوشی رنگ ہوکر اڑ گئی اُس غریب نے اتنی ہی رقم بدقت تمام اپنے لئے ایک بندوق خرید کر سیر و شکار کا شوق پورا کرنے کے لئے جمع کی تھی مگر اب اپنے شوق کا خون کرنے کے سوائے اور چارہ ہی کیا تھا۔ محبوب کی آنکھوں سے ڈھلکے ہوئے دو قطرات اشک کی قیمت لعل و جواہر سے بھی سوا ہوتی ہے بھلا ان چار سو فرنک کا کیا شمار ہوسکتا تھا۔ اسر نیاز خم کرتے ہوئے اُس نے کہا "اچھا بھئی میں تھیں چار سو فرنک دیدوں گا۔ مگر اب تم نہایت نفیس پوشاک تیار کرالو"

دعوت کا دن قریب آپہونچا۔ ماٹلڈا کی پوشاک بھی تیار ہوگئی مگر اب بھی اُس کے چہرے کی اداسی اور افسردگی دور نہ ہوئی ۔۔

نسیم صبح کا جھونکا کھاکر پھول کھل تو گیا مگر اس میں تازگی اور جاذبیت پیدا نہ ہوئی!!!

شوہر نے دریافت کیا آخر اب غمگین اور ملول ہونے کی کیا وجہ ہے؟ کیا اب بھی کسی چیز کی کمی ہے؟"

"کمی کیوں نہیں زیور کے بغیر پوشاک کیسی ہی قیمتی اور بڑھیا کیوں نہ ہو بالکل بیکار ہے زیور بغیر عورت کا جسم ننگا معلوم ہوتا ہے"۔

یہ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جو کسی طرح حل نہ ہوسکتا تھا۔ بمشکل تمام پوشاک کی کمی پوری کی گئی تھی زیور کے لئے بجٹ میں مطلقاً گنجائش نہ تھی۔ اُس نے ذرا صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "زیور کے لئے اب میرے پاس روپیہ کہاں ہے"؟ اُس نے مکرر کہا۔ "آجکل تو پھولوں کے زیورات کا بڑا فیشن ہے۔ کم خرچ بالانشین ہوتے ہیں۔ کیوں نہ پھولوں کے عمدہ عمدہ خوبصورت زیورات خرید لئے جائیں"۔

مگر ماٹلڈا کسی بات پر راضی نہ ہوئی اتریاہٹ تو مشہور ہی ہے! پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔ شوہر نے جھلاّ کر ذرا ترش لہجہ میں کہا "میرے پاس کوئی خزانہ تو دبا نہیں ہے اگر زیور کے بغیر کام نہیں چل سکتا تو فی الحال کسی ہجولی سے کچھ روز کے لئے مستعار لیلو۔ جین سے تو تمہارے بہت گہرے تعلقات ہیں آخر اسکول کی دوستی اور کس روز کام آئے گی۔ اس کے پاس جاکر مانگ کر دیکھو۔ شاید انکار نہ کرے۔"

اگلے روز ماٹلڈا اپنی سہیلی۔ جین سے ایک نہایت خوبصورت اور مرصع ہار مانگ لائی اور شام کو اسے پہن کر بڑے طمطراق سے پارٹی میں شامل ہوئی اس ہار نے اسکی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تمام حاضرین جلسہ کی نگاہیں بیساختہ اس کے حسن نظر افروز پر مرکوز ہونے لگیں۔ ہر سمت اسی کی خوبصورتی اور خوش وضعی کا چرچا ہونے لگا۔ ہر شخص اُس سے تعارف کا خواہشمند نظر آنے لگا۔ رقص کے وقت بھی ہر شخص تمنائی تھا کہ جس طرح ہو سکے اس ملکۂ حسن و جمال کے ساتھ رقص کرے۔

آج ماٹلڈا کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اسکی ہر رگ و پے میں مسرت کا ایک دریا موجزن تھا۔ فرط انبساط سے اس کا چہرہ بہار کے گل نوخیز کیطرح شگفتہ ہو رہا تھا۔ محفل نشاط اس گل رعنا کی بوئے عطر بیز سے معطر ہو رہی تھی۔ تمام شب خوب جشن رہا جب شاہ خاور کے بیدار ہونے کا وقت ہوا تو غنودگی سے لبریز آنکھوں کو ملتے ہوئے تمام لوگوں نے اس جلسہ طرب کو خیرباد کہا۔

اپنے مکان پر پہونچکر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ماٹلڈا کو جب ذرا ہوش آیا تو وہ اپنا لباس فاخرہ تبدیل کرنے کے لئے اٹھی اور آئینے کے روبرو ہوئی گلے کو ہار سے خالی پاکر اچانک چیخ نکل گئی ..... ماتھا پکڑ کر نزدیک پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن میں رعشہ آگیا۔ ناگ کی طرح ڈنس کر وہ ہار دم زدن میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اسکو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی بیچارے شوہر نے تمام راستے کی خاک چھان ڈالی پولیس کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دیدی گئی۔ اخباروں میں اشتہارات شایع کرا دیئے گئے۔ مگر گمشدہ ہار کا سُراغ نہ لگنا تھا نہ لگا تمام سعی اور دوڑ دھوپ رائگاں گئی

غریبوں پر اچانک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس سانحۂ ناگہاں نے انکی تمام خوشیوں اور امیدوں کو خاک میں ملا دیا کسی کو کیا خبر تھی کہ شب بھر کی ہنسی تمام زندگی کا رونا ہو جائے گی۔

کئی روز کی کوشش پیہم کے باوجود بھی جب اس ہار کا کہیں کچھ پتہ نہ لگا تو ماٹلڈا کے پریشان حال شوہر نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ "ماٹلڈا ہار کو لائے ہوئے تمھیں کئی روز ہو گئے ہیں۔ تمھاری سہیلی منتظر ہو گی اور زیادہ تاخیر کہیں اُس کی ناخوشی کا باعث نہ ہو۔ اور کہیں تقاضا نہ کر بیٹھے اسلیئے بہتر یہی ہے کہ تم اس کو ایک خط لکھ دو کہ ہار کی کڑیاں الگ ہو گئی ہیں اسلیئے درستی کے لئے جوہری کو دیدیا گیا ہے۔ آتے ہی فوراً واپس

کردیا جائیگا۔ تمھارا خط ملجانے سے تمھاری سہیلی کو تسلی ہوجائے گی اور ممکن ہے اس دوران میں ہم اس مشکل کو آسان کرنے کی کوئی تدبیر سوچ سکیں "

شوہر کی ہدایت کے مطابق ماٹلڈ نے اپنی سہیلی کو اسی مضمون کا خط لکھدیا۔ رفتہ رفتہ ایک ہفتہ گذر گیا مگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی نہ ان بیچاروں کی سمجھ میں کوئی ایسی تدبیر آئی جو ان کو اس آفت ناگہانی سے رہائی دلائی۔ دوڑ دھوپ کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجبور ہو کر انھوں نے ایک نیا ہار خریدنے کا فیصلہ کیا تاکہ گمشدہ ہار کی تلافی کی جا سکے۔ بازار میں تمام جوہریوں اور صرافوں کی دوکانیں چھان ڈالی گئیں مگر گمشدہ ہار کا مثل کہیں دکھائی نہ دیا بیچارے اس کوشش میں بھی ناکامیاب ہو چکے تھے کہ اتفاقاً رائیل پیلس کے ایک مشہور جوہری کے پاس مطلوبہ ہار مل گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسکی قیمت چالیس ہزار فرانک ہے لیکن نقد خریدار کو چھتیس ۳۶ ہزار میں فروخت کیا جاسکتا ہے تین روز کے اندر اندر خریدنے کا وعدہ کر کے میاں بیوی اپنے مکان پر آئے اور پس ماندہ رقم نکالکر تمام اثاثہ بیچ کر رقم اکٹھا کر کے ساہوکاروں سے قرض لیکر پرامیسری نوٹ لکھکر غرض جس طریقہ سے بھی ممکن ہوا چھتیس ہزار کی رقم پوری کر کے اور اپنے ہر عیش و آرام اور اپنے سارے مستقبل کو کلفت و آلام کے عمیق غار میں دفن کر کے ایک نیا ہار خرید لیا گیا۔ اور اگلے روز ماٹلڈا کی سہیلی کو اس کے پرانے ہار کے عیوض یہ نیا ہار بغیر اصلی راز کا انکشاف کئے دیدیا گیا۔ مالدار سہیلی نے اس ہار کو غور سے دیکھنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ دوسرے زیورات کے ساتھ اس کو بھی صندوقچہ میں رکھدیا

آہستہ آہستہ وقت ماہ و سال کی صورت میں گذرنے لگا۔ دن رات کڑی محنت و مشقت کر کے میاں بیوی کو دس سال کے بعد قرض کے بوجھ سے سبکدوشی حاصل ہوئی۔ مگر غم و فکر کے گھن نے اُن کی تندرستی کو تباہ کر دیا۔

ماٹلڈا جسکو اپنے حسن پر غرور اور خوبصورتی پر ناز تھا ایک خشک اور پژمردہ پھول کی طرح بدنما معلوم ہونے لگی تھی۔ بناؤ سنگار کی طرف اُس نے برسوں سے توجہ ہی نہ دی تھی۔ وہ سوچتی تھی جب حسن ہی نہ رہا تو اسکی آرائش کی کیا فکر ضرورت ہے۔

اچانک ایک روز آئینہ پر اسکی نظر پڑ گئی۔ اپنی صورت دیکھی تو سہم گئی۔ آنکھیں اشک آلودہ ہو گئیں وہ سوچنے لگی۔ کاش وہ حسن کے فریب میں نہ آئی ہوتی اور عارضی زیبائش کے لئے اپنی سہیلی سے ہار نہ مانگا ہوتا اور اگر مانگا ہی تھا تو وہ کھویا نہ ہوتا۔ تو آج۔ آج یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر تمام باتیں بالکل عکس ہو گئیں! اگر قسمت نے یہ دھوکا نہ دیا ہوتا تو اسکی خوشی کا سنسار اسطرح دکھ کا اتھاہ ساگر نہ بن جاتا۔ دولت اور حسن کی محفل میں وہ اس رات کو صرف چند گھنٹوں کے لئے گئی تھی اور بزم مہوشاں میں اپنے حُسن کا

پرچم لہرا آئی تھی لوگ اسکو ملکۂ حسن وجمال کے لقب سے منسوب کرنے لگے تھے اس روز اُسے کس قدر خوشی حاصل ہوئی تھی ان امیروں کی سوسائٹی میں وہ جیہ امتیاز حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مگر مقدر نے ساتھ نہ دیا۔ وہ پھر سوچنے لگی۔ مگر اس میں مقدر کا کیا قصور۔ غلطی میری ہی تھی۔ غریب ہو کر کیا ضرورت تھی کہ مانگا ہوا ہار پہنکر امیروں کو دھوکا دیا جاتا۔ کاش میں دولت کے فریب میں نہ آئی ہوتی تو میری صبر و سکوں کی دنیا تو برباد نہ ہوئی ہوتی"

کچھ عرصہ کے بعد ایک روز ماٹلڈا تفریحاً شاہراہ پر گھوم رہی تھی کہ اچانک اسکی نگاہ اپنی سہیلی جینی پر پڑی جو ایک چھوٹے سے خوبصورت بچے کے ہمراہ کہیں جا رہی تھی۔ تیز گامی سے اس کے نزدیک جاکر ماٹلڈا نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہیلو جینی۔ گڈ مارننگ" جینی اُسے مطلق پہچان نہ سکی۔ دونوں کی ملاقات ہوئے عرصہ گذر گیا تھا اور ماٹلڈا جسمانی لحاظ سے بالکل تبدیل ہو گئی تھی۔

حیرت سے تاکتے ہوئے جینی نے کہا "معاف کیجئے گا میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ کیا آپ کو دھوکا تو نہیں ہوا ہے"۔

"تمہیں غلط فہمی نہیں ہوئی جینی۔ تم نہیں جانتیں؟۔ میں ماٹلڈا ہوں"۔

"او! ماٹلڈا۔ ڈارلنگ تمھیں کیا ہو گیا۔ تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو۔ میں ہی کیا۔ کوئی بھی تمھیں پہچان سکیگا۔ آخر کیا وجہ ہوئی"

"جینی کچھ نہ پوچھو۔ ہم پر بڑا کٹھن وقت گذرا ہے پروردگار دشمن کو بھی ایسا وقت نہ دکھائے۔ مگر ہونہار کو کون ٹال سکتا ہے"

جینی۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔

ماٹلڈا نے کچھ خاموش رہ کر کہا "جینی کیا بتاؤں عجیب قصہ ہے۔ مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے" ایک لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد اُس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا "تمھیں یاد ہوگا جینی کہ ایک مرتبہ ایک تقریب میں شامل ہونے کے لئے میں تم سے تمہارا وہ جڑاؤ ہار مانگ لے گئی تھی"۔

"ہاں ہاں۔ یاد کیوں نہیں"

وہ غلطی سے کہیں اسی رات گم ہو گیا"

"گم ہو گیا! نہیں! گم کہاں ہو جاتا۔ وہ تو تمنے مجھے واپس کر دیا تھا"

"مگر وہ ہار اصل میں وہ نہ تھا جو میں تم سے مانگ کر لے گئی تھی۔ اگر تم بغور دیکھتیں تو یہ راز اسیدن تمھیں معلوم ہو جاتا۔ تمھارے ہار کے لئے گھر بھر کا اثاثہ ~~و~~ جبت کر کے اور قرض لے کر تمھارے ہار سے

مشابہ ایک دوسرا ہار خرید کر تمھیں دیا گیا - تم تو ہماری مالی حیثیت سے واقف ہی تھیں "روز کنواں کھودنا اور پانی پینا - بچا کر رکھنے کی گنجائش ہی کہاں - مگر بہن مالک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ تمام قرض بیباق ہو گیا ہے اور اب ہم کسی کے ایک کوڑی کے قرضدار نہیں مصیبت کے دس برس کاٹنے تھے وہ کاٹ چکے"

یہ داستان غم سنتے سنتے جین پر کیفیت طاری ہو گئی وہ خود کو زیادہ دیر نہ سنبھال سکی - ٹالڈا کو زور سے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اس کا دل بھر آیا - اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا - "ٹالڈا - یہ تم نے کیا کیا ہار خریدنے سے پہلے مجھے اس کی خبر کیوں نہ دی؟ میری وجہ سے کیوں اپنی زندگی تباہ کر لی -

وہ ہار جو تم مجھ سے کر لے گئی تھیں اُس کے نگ اصلی نہ تھے اس کا تمام جڑاؤ کام نقلی تھا اور اُسکی قیمت تین یا چار سو فرنک سے زیادہ نہ ہو گی"

جینی کے یہ الفاظ سنکر ٹالڈا کے بدن میں رعشہ آ گیا اور وہ غش کھا کر اپنی سہیلی کی آغوش میں گر پڑی جینی کا چھوٹا بچہ یہ منظر دیکھکر سہم گیا اور اپنی ماں کا دامن پکڑ کر رونے لگا -

(ایک فرانسیسی قصہ)

زمانہ پینتیس سال پہلے

اُسوقت سارے ہندوستان میں "بندے ماترم" کے گیت کی دھوم مچی ہوئی تھی اور ملک کے در و دیوار گونج رہے تھے چنانچہ سر آمد شعرائے لکھنؤ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی نے اسکا اردو میں ترجمہ کر کے زمانہ کو عنایت فرمایا تھا جو اُس کے نومبر - دسمبر ۱۹۰۵ء کے مشترکہ نمبر میں چھپا ہے اس دلپذیر نظم کا اوّل بند یہ ہے -

---

آہ یہ جاں بخش پانی یہ ہوائے خوشگوار
یہ تر و شاداب شیریں میوہ ہائے خوشگوار
ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں مہکی ہوئی باد جنوب
سبز کھیتوں کی فضائیں اور یہ میدانوں کی دوب
ظلِ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق دراز
خاک پر کیا کیا تری تیرے مکینوں کو ہے ناز

سرور جہان آبادی

تنقید کتب

نظم اردو[۱]

حکیم ابوالعلا ناطق صاحب لکھنوی نے نظم اردو کی ایک مستند تاریخ مسدس کی صورت میں ستاون بندوں میں مرتب کی ہے۔ ناطق صاحب ایک کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں۔ اُن کا کلام اُستادانہ حشو و زوائد سے پاک اور اُسی کے ساتھ فنی صنائع و بدائع سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے۔ لیکن اُن کی یہ نظم اردو لٹریچر میں ایک بے نظیر چیز ہے جس میں اُنھوں نے گویا ایک دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ہر بند تاریخ اردو کا ایک دور ہے۔ مثلاً زبان اردو کی بنیاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے اِس سوال کا کہ ؎

انجمن میں نغمہ آرا سازِ اردو کب ہوا ساز بزم ہند، ہم آوازِ اردو کب ہوا؟

حکیم صاحب یہ جواب دیتے ہیں ؎

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام واعظوں، سوداگروں اور صوفیوں کا ہی قیام
اہلِ ہند اہلِ عرب ہیں سب کے سب ابناءِ سام ہم نسب، ہم جنس ہندو کیا کبھی ہوتے نہ رام

– – – – – – – – – – – –

ہو گا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد جب کبھی وہ اک جگہ ہو جائیں گی آباد و شاد
دونوں قومیں ہم سخن، ہم داستاں ہو جائیں گی
مل کے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائیں گی

اس طرح ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے باہمی ارتباط سے ؎

فارسی عربی کے اسماء ہند میں داخل ہوئے اور افعال و مصادر ہند کے شامل ہوئے

اس طرح ایک نئی زبان کی بنیاد پڑ گئی، جو اس وجہ سے "اردو" کہلائی کہ اس کی وساطت کے

[۱] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مینیجر صاحب نظر المطابع لکھنؤ۔

"اہلِ اردو" یعنی لشکریوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں اور چونکہ مسلمانوں کا تسلط سب سے پہلے پنجاب میں ہوا تھا۔ ۶ "اس لیئے اردو کا اول مستقر پنجاب تھا"

اس کے بعد ؎

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں
تھے قلم اس کے بھی تلواروں کے ساتھ اسباب میں لائے قطب الدین اس کو دہلی شاداب میں

کون ہر صوبہ میں دہلی سے یہ دفتر لے گیا
ہر سپاہی اپنے ساتھ اردو کا لشکر لے گیا

اردو زبان کو "ریختہ" کہتے تھے۔ اس کی وجہ بھی ناطق صاحب کی زبان سے سن لیجیئے ؎

ہند کے پودوں میں کچھ ایران کے پیوند تھے جوڑ ان دونوں میں گویا نیشکر کے بند تھے
مختلف سب مذہب و تہذیب میں ہر چند تھے پھر بھی رسم و راہِ الفت کے تو سب پابند تھے

صورتِ شیر و شکر باہم جو تھے آمیختہ
مدھ بھرے ہونٹوں سے رس ٹپکا تو وہ تھا ریختہ

اسی طرح حکیم صاحب نے بتدریج زبان اردو کی تمام تاریخ قلمبند کردی ہے۔ اور نظم کی لڑی میں ان لوگوں کے نام بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے موتی کی طرح پرو دئیے ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی و نشو و نما میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں مثلاً۔

وجہی و احمد، ایمں، شوقی، مقیمی، نصرتی دولت و خوشنود و غواصی، ایاغی رستمی
نوری و ابن نشاطی، وجدی، طبعی، انورسی سیوک و فائز، لطیف، اشرف ضعیفی، عشرتی

ذوقی و بحری، قیاسی، مومن و ہاشم، علی
لطفی و مرزا، سراج، آزاد، داؤد و ولی

الغرض حکیم صاحب نے اس چھوٹی سی نظم میں زبانِ اردو کی پوری تاریخ قلمبند کردی ہے۔ اور زیادہ تفصیل طلب باتوں کے اندراج کی یہ صورت نکالی ہے کہ حاشیہ میں مفصل معلومات درج کردی ہیں اور ناموں کی تشریح کے ساتھ مختلف شاعروں کے کلام کے نمونے بھی درج کر دئے ہیں جس سے اردو کی ترقی پوری طرح آئینہ ہو جاتی ہے۔ بہر حال ناطق صاحب کی یہ نظم بہت گراں قدر ہے، اور ان کے فاضلانہ فٹ نوٹوں اور حاشیوں نے اس میں اور چار چاند لگادئے ہیں۔ غرض یہ کتاب اردو کی اعلیٰ جماعتوں کے کام بھی آسکتی ہے

میرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ، خواجہ حسن نظامی نے بھی اس کی تنقیدیں لکھی ہیں جو کتاب کے شروع میں درج ہیں، اور خود فاضل مصنف نے ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اُن ایک سو چھتر کتابوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے جن کا ذکر "نظم اردو" میں آیا ہے۔ غرض حکیم ناطق صاحب نے اپنی طرف سے اس کتاب کو مفید بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ۔ سب عمدہ ہے۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی[1]

یہ کتاب بہار کے نامور شاعر ادیب حضرت شاد عظیم آبادی کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے مسٹر ہمایوں مرزا مرحوم بیرسٹر حیدر آباد دکن یا اُن کی اہلیہ محترمہ صغرا بیگم کے نام بھیجے تھے اور جنھیں اب سید محی الدین قادری زورؔ نے کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے حضرت شاد کی زندگی پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کی طرح حضرت شاد بھی ہمیشہ تنگدستی اور مالی تفکرات سے پریشان رہتے تھے دوسرے یہ کہ ان کی لٹریری زندگی بہت ہی مصروف تھی اور وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے لکھاتے رہتے تھے۔ تیسری بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ شاد مرحوم خود کو بڑا زبردست شاعر سمجھتے تھے۔ چنانچہ اکثر خطوط خودستائی کے عیب سے خالی نہیں ہیں۔ بعض خطوط میں شاد صاحب نے میر انیسؔ اور لکھنؤ کے دوسرے مرثیہ گو شاعروں پر ایسی تنقیدی نظر ڈالی ہے جو شاید مداحان انیس پر گراں گذرے گی۔ جہاں تک ادبی خوبیوں کا تعلق ہے، وہ تو ان خطوط میں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن معلومات کے لحاظ سے اس کتاب کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ اوسط ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے تین سو صفحات۔

دستور الاصلاح[2]

یہ چھوٹی سی کتاب مولانا سیماب اکبر آبادی کا ادبی کارنامہ ہے جس میں شعر و سخن میں اصلاح لینے اور دینے کے طریقے بہت ہی عمدگی سے بتائے گئے ہیں اور ہندوستان کے شعرائے متقدمین و متاخرین کی اور موجودہ اصلاحات کے نمونے بھی دکھائے گئے ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ اہم حصہ وہ ہے جس میں کسی شاعر کی ایک ہی غزل پر مختلف استادوں کی اصلاحوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ۔ فاضل مصنف نے اپنی اصلاحوں کے بھی قابل قدر نمونے درج کئے ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب اُن شاعروں کے لئے خضر راہ کا کام دیگی جو اپنے کلام کو ابتذال سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ قیمت عہ

[1] قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن [2] قیمت عہ مکتبہ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ

تبصرہ کلّیات بحری

(از جناب احسن مارہروی مرحوم ومغفور)

کلیات بحری (مع مقدمہ وتشریح) مرتبہ ومؤلفہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید، ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ۔ ڈی لٹ ۔ الہ آباد یونیورسٹی

قاضی محمود بحری جو دکنی شعرا میں مشہور صاحب تصنیف شاعر ہیں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں گزرے ہیں، یہ کلیات انہیں بزرگ سے منسوب ہے ۔ اس مجلد میں ایکسو تیرہ ۱۱۳ غزلیں اور چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں، چند مثلث، مربع اور مخمس کے عنوان سے منظومات اور ایک بنگ نامہ بطور مثنوی ہے ۔ جس کے بارہ ۱۲ جام ہیں، ان منظومات کا حجم ۱۶۱ صفحہ تک پھیلا ہوا ہے اور ۳۰ صفحوں میں الفاظ کی تشریح ہے اور ۱۲۱ صفحہ کا دیباچہ ہے ۔ اس طرح یہ مجلد ۳۱۲ صفحوں کا حامل ہے ۔

باخبر اہل مذاق کو معلوم ہے کہ دہلی، لکھنؤ اور پنجاب سے بہت پہلے جنوبی ہند کے روزمرہ میں وہ زبان شامل ہوگئی تھی جس کو آج ہم اُردو کہتے ہیں ۔ ابتدائی زبان میں جیسی نامربوطی، گنجلک اور سادگی ہوتی ہے وہ بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں ۔

زبان جو ادائے بیان و مدعا کا آلہ و ذریعہ ہے، اس میں بکثرت محاورات و اصطلاحات وغیرہ کے اختلافات پائے جاتے ہیں ۔

ہندوستان کے ہر صوبے میں ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں اور ہزاروں الفاظ و محاورات اپنے انداز بیان کے ساتھ اجنبیت پیدا کر لیتے ہیں ۔ اور جبکہ تیس تیس، چالیس چالیس کوس کے فرق مسافت سے محاورہ روزمرہ اور لب ولہجہ بدلتا رہتا ہے تو سیکڑوں اور ہزاروں میل کے فاصلہ پر زمین و آسمان بدل جائیں تو کیا تعجب ہے ۔ صوبہ دکن میں فارسی زبان ابتدائی سلطنت بہمنی کے عہد سے دفتری کاروبار چھوڑ چکی تھی اور بقول "فرشتہ" اُس کی جگہ ہندوی رائج ہو چکی تھی ۔ یہ ہندوی زبان مہاراشٹر، تلنگو، ٹامل وغیرہ زبانوں سے مخلوط تھی جو رفتہ رفتہ دکنی اُردو ہو گئی ۔

جس زبان میں دکن کے شعراء سابقون الاوّلون نے سخن گستری کی، وہ زبان موجودہ زمانے کی زبان سے اتنی دُور از فہم ہے کہ اُس کے سمجھنے والے فی صدی دو بھی آج نظر نہیں آتے ۔

ایسی حالت میں اُس عہد کے روزمرہ کی تشریح معانی میں اگر کہیں کہیں کمی رہ جائے یا اُس کا مفہوم

صحیح صحیح واضح نہ ہو سکے تو یہ امر چنداں قابلِ ملامت نہیں۔ بلکہ قابلِ غور یہ بات ہونی چاہیئے کہ مرتب و مؤلف نے حتی الوسع اس تحقیق میں کتنی کاوش کی ہے اور ایسے سرمائے کو جو سرتاپا معرضِ تلف میں آ رہا تھا اپنی سعی و تحقیق سے کس حد تک اہلِ ادب کے لئے نمایاں اور اُجاگر کر دیا ہے۔ یہ بات تا بہ حدِ تمام کلیات بحری میں نظر آتی ہے۔ یعنی وہ کلام جو اپنی اجنبیت و قدامت کے سبب مٹا جا رہا تھا، اُسے مرتب نے اپنی سعی مشکور سے بچا لیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک مشکل کو اتنا آسان کر دیا کہ وہ جدید تحقیق و تفتیش سے اُس کی تکمیل کرتے رہیں۔

اِس بات کے ماننے میں کوئی عذر نہیں کہ کلیاتِ بحری کے مرتب نے بعض اشعار کا مفہوم بوجہ اجنبیت بیان اور قدامتِ زبان کما حقہٗ نہ سمجھا ہو، مگر اس کے ماننے میں تامل ہے کہ فاضل مرتّب کی اس کوتاہی کو اُس کی کم نگاہی پر محمول کیا جائے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ مرتّب نے اپنے مقدمے میں بطور دفعِ دخل یہ لکھدیا ہو

"ایک واحد نسخے کے پیشِ نظر ہونے کے سبب ممکن ہے کہ بعض قرائتیں سقیم یا قابلِ ترمیم رہ گئی ہوں، اسی طرح مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ بعض الفاظ اب بھی ایسے رہ گئے ہیں جو شرح کے محتاج ہیں، یا جن کو میں نے صحیح طور پر نہیں سمجھا ہے۔ اس میں زبان کی قدامت اور لغات کی کتابوں کے فقدان نے میری عدم واقفیت سے تعاون کیا ہے، اور اس بنا پر عذر خواہ ہوں۔"

اِس معذرت کے پڑھنے کے بعد یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ کسی تبصرے میں محض الفاظ کے غلط معانی کو معرضِ بیان میں لا کر تبصرہ و تنقید کا فرض پُورا کیا جائے۔

موجودہ زمانے کی سائنٹیفک تحقیقات میں جبکہ آثارِ قدیمہ کے کھنڈروں سے شکستہ اور مسخ شدہ اشیاء کو پا کر ہزاروں برس کے قبل کے تمدنی اور معاشرتی حالات کا پتا چلایا جاتا ہے، تو یہ کیا انصاف ہے کہ بعض عبارتوں کے صحیح نہ پڑھے جانے سے مصنّف کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا جائے۔

مرزا غالب کو گزرے ہوئے ابھی پُورے سو برس بھی نہیں ہوئے مگر اس قلیل زمانے میں اُن کے دیوان کی بیسیوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں، مگر کوئی ایک شرح ایسی نہیں ملتی جو دوسری شرح سے بالکل متفق و متحد ہو۔ اِس صورت میں ڈھائی تین سو برس قبل کے دکنی شاعر کے کلام سے جو ایہام و رعایت لفظی کا پابند ہے۔ اگر ایک نے سوک کے معنی زہرہ سمجھے اور دوسرے نے اُسے ایک قسم کا سنگار سمجھا تو یہ ایسا بڑا اختلاف نہیں جس کی وجہ سے کوئی مصنّف ناقابلِ اعتبار سمجھا جائے۔

بحری تو بہت پُرانے اور دکنی شاعر ہیں۔ اس زمانے میں میر تقی، اور مرزا غالب و رکنار حالی مرحوم کے بعض اشعار کی تلمیحات سمجھنے والے ایسے ایسے احتمالی اختراعات پیدا کر رہے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ کلیات بحری کی ترتیب کسی صورت میں ہو، اور اُس کی کوئی تحقیق مکمل نہ ہو، تو بھی اس لئے قابلِ قدر ہے کہ اس کا کلام مدوّن ہو کر بین الدفتین ہوگیا۔ اور آئندہ نسلوں کے لئے یہ آسانی ہوگئی کہ اگر کوئی ریسیرچ کرنا چاہے تو اُسے زیادہ دقت نہ ہوگی، اور عدم فراہمی کلام کی شکایت نہ رہے گی۔

کسی کمیاب بلکہ نایاب کلام کا فراہم و دستیاب ہوجانا تاریخی حیثیت سے مؤلف و مرتب کا ایسا شاہکار ہے جس کے بعد ہر قسم کا اعتراض فضول و بیکار رہے۔

ایک اعتراض کلیات بحری کے دیباچہ نویس پر یہ کیا گیا ہے کہ "اس میں بہت سی غیر ضروری بحثیں آگئی ہیں، اور پھر اُن کو بھی ضرورت سے زیادہ طول دیا ہے۔ مثلاً بحری کے ہمعصر شعرا کے حالات اور اُن کے کلام کے انتخاب کی مطلق ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ گویا اس کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی ایک موضوع پر دوسری کتاب نہ لکھنی چاہیئے، اور اگر لکھی بھی جائے تو ایک کا اقتباس دوسرے میں نہ ہونا چاہیئے۔ مثلاً سیرۃ النبی پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن پہلی تالیف سے دوسری تالیف میں اقتباس و التقاط نہ کیا جائے۔

کیا یہ ضروری ہے کہ کلیات بحری کے پڑھنے والے بحری کے تمام معاصرین و متقدمین و متاقبین کے حالات سے آگاہ و واقف ہوں گے اور اُن کو بحری کا کلام پڑھتے یا کسی ہم مفہوم مضمون پر دوسروں کے مقابلہ کرنے کا خیال نہ ہوگا۔ اگر ہوگا تو کیا فی الوقت تمام معاصرین کا کلام بھی اُن کے ذہن میں حاضر ہوگا۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو اس سے بہتر اور آسان صورت کیا ہوسکتی ہے کہ وقت کے وقت متن و حواشی کا موازنہ و مقابلہ ہوتا جائے، اور پڑھنے والے کو اپنے ذوقِ نظر کے تشنہ چھوڑنے کا موقع نہ ملے۔

ہر صاحبِ مذاق ہر بات کو اپنی پسند کے مطابق پرکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک عالم باخبر اور ایک وسیع النظر اپنی وسعتِ معلومات کی بنا پر اس قسم کی تشریح و تفصیل کو تحصیل حاصل سمجھے۔ مگر ایک طالب علم اور تشنۂ تحقیق کی پیاس نہیں بجھتی جب تک کہ ایک کتاب کے مطالعے کے وقت اُن تمام باتوں پر ایک ساتھ اور ایک جگہ عبور حاصل نہ کرلے جو اُس موضوع سے متعلق ہیں۔ اِس حالت میں یہ حواشی و تشریح اور ایسے عنوانات و تصریح بے حد ضروری اور بہت مفید ہوتے ہیں۔

بسا اوقات یہی زائد تفاصیل ایسا کام دے جاتی ہیں جو دوسری کتابوں کے تفحص سے حاصل نہیں ہوتا یہاں ایک واقعہ بطور مثال لکھتا ہوں، جو خود مجھ پر گزرا ہے۔

حیدرآباد دکن کی مشہور طغیانی (رودِ موسیٰ) کے زمانے میں مولوی عبداللہ خاں مرحوم نے تذکرۂ گلشن ہند" (مولفہ لطف) گنج باد آورد کی طرح پایا جسے انھوں نے شمس العلماء مولوی شبلی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق صاحب بی اے (سکریٹری انجمن ترقی اردو) کے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اِس

تذکرے میں مؤلف (لطف) نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ یعنی والد ماجد شاہ عبدالعزیز رحمہا اللہ کو اُردو شعرا کے زمرے میں لکھا، اور اشتیاق تخلص قرار دیا۔ پھر وثوق کے ساتھ یہ عبارت درج کی ہے کہ "اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا ہے اور زبانِ ریختہ کا مشغلہ اکثر۔" اس پر لطف یہ کہ دونوں مولاناؤں نے اس تحقیقات کو مانا اور سراہا ہے۔ اور اس جدید معلومات کی خصوصیت کی داد دی ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب اپنے مقدمے کے دفعہ ۵ صفحہ ۱۴ پر تحریر فرماتے ہیں

"بعض ایسے لوگوں کا بھی حال دیا ہے جس کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا۔"

مجھے ان اطلاعات پر شبہ ہوا اور جا بجا تحقیقات شروع کی۔ اپنے پاس جتنے تذکرے تھے اُن میں پڑھا، مگر کہیں اس کی تردید نہیں ملی۔ "معارف" اعظم گڑھ میں اس کے متعلق استفسار چھپوایا، وہاں سے بھی یہ جواب ملا:- انچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

ایک دن تذکرۂ خمخانۂ جاوید کی جلد دوم دیکھ رہا تھا، کہ اتفاقاً اُس کے تبصروں پر بھی نظر پڑ گئی شمس العلماء مولانا حالی کا ریویو پڑھا، جس کے آخر میں یہ عبارت پائی:-

"آخر میں ہم معزز مصنف کی خدمت میں اِس بات کے عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ صفحہ (۳۰۸) پر جہاں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا حال لکھا گیا ہے اُس میں چند فروگزاشتیں ہو گئی ہیں، اول تو شاہ صاحب ممدوح کا اُردو زبان میں شعر کہنا اور اشتیاق تخلص کرنا ثابت نہیں ہوا، دوسرے اُن کا وطن سرہند اور مجدد الف ثانی کی نسل سے اور فیروز شاہ کے کوٹلے میں سکونت پذیر ہونا غلط معلوم ہوتا ہے۔ کسی طرح اس غلطی کی اصلاح فرما دی جائے۔ (حالی از پانی پت)

اس انتباہ کو پڑھکر پھر پرانے قلمی تذکرے دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ شاہ ولی اللہ جن کا تخلص اشتیاق ہے دوسرے بزرگ تھے۔ اور بقول مؤلف تذکرۂ عشق و تذکرۂ گردیزی مجدد الف ثانی کی نسل سے تھے، اور یہی فیروز شاہ کے کوٹلے میں رہتے تھے

اِس واقعے سے واضح ہو گیا کہ جس بات کا پتا بعض مستند تذکروں میں نہیں ملتا اُس کا سُراغ ایک ضمنی تحریر سے صحیح صحیح ہو جاتا ہے۔ اِس وقت تک تذکرۂ لطف کی مکمل تردید کہیں نہیں دیکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ناواقف اربابِ نظر لطف کے بیان کو صحیح سمجھیں گے، اور جب اُس پر مولانا شبلی اور مولانا عبدالحق صاحب کی تصدیقی مُہریں ثبت ہونگی تو کوئی کافر ہی اِن کا منکر ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ بعض اوقات ایک اہم بات جو حواشی و تشریحات سے حل ہو جاتی ہے وہ مستقل تصانیف سے

نہیں ہوتی۔ اس بنا پر تشریح و تفصیل کو غیر ضروری و فضول سمجھنا صحیح نہیں۔ شائقین تحقیق کے لئے ایسی تشریحیں نہایت مفید اور کار آمد ہوتی ہیں جس سے نہ صرف مؤلف کی محنت اور وسعتِ نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات دوسرے کام کرنے والوں کو بہت سی کتابوں کی ورق گردانی میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا پڑتا۔ غرضکہ میرے نزدیک کلیاتِ بحری کے دیباچے میں جتنی تحقیقات جس شرح و بسط سے کی گئی ہے، وہ از سرتا پا باکار ہے بیکار نہیں۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ فاضل مرتّب نے کلیاتِ بحری کی طباعت سے پہلے اکثر ارباب علم و اصحاب ادب سے باوقاتِ مختلف اس کی ترتیب و تصحیح کے متعلق مبادلۂ خیالات کرنے کی کوشش کی۔ اور جب جواب ملنے سے مایوسی ہوگئی تو ما لا یدرك كله لا يترك كلّه پر عمل پیرا ہو کر کتاب چھپنے کے لئے دے دی۔ اِس صورت میں کہ مؤلف معذرت خواہ بھی ہے اور ارباب فن کی استمداد پر چشم براہ بھی، کسی طرح موردِ الزام نہیں ہوسکتا۔

یہ خیال قطعاً صحیح ہے کہ بحری عہد اورنگ زیب کے شاعر اور ولی دکنی سے پہلے صاحب دیوان ہیں مگر یہ تقدّم زمانی بحری ہی کو نہیں بلکہ ان سے قبل سلاطین قطب شاہی اور اُن کے درباری وغیرہ درباری بہت سے شعرار کو بھی حاصل ہے۔ مگر اس تصدیق و تسلیم کے بعد بھی یہ بات اپنی جگہ مسلّم و مثبت ہے کہ جو فضیلت ولی دکنی کے نصیب میں آئی ہے وہ اُن کے متقدمین کو میسّر نہیں

پروفیسر محمد حسین آزاد یا اُن کے بعد دوسرے اہل قلم کا یہ لکھنا کہ ولی اورنگ آبادی اُردو کے سب سے پہلے شاعر تھے، اس لئے غلط نہیں کہ جس بنا پر ولی کو مقدم مانا جاتا ہے، وہ اُن کے اسالیب بیان و سلاست زبان کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وجہی۔ ہاشمی۔ نصرتی اور قطب شاہ وغیرہ بحری سے بھی پہلے گزرے ہیں، جن میں سے بعض کے دواوین مرتّب و مکمّل پائے جاتے ہیں۔ جس طرح اِن متقدمین کو پہلا مدوّن نہیں کہا جاتا اسی طرح بحری بھی ولی کے انداز بیان سے الگ ہونے کی وجہ سے افضل نہیں مانے جاسکتے۔

بحری و ولی کا معاصرانہ تفاوت اتنا ہی مانا جاسکتا ہے کہ جتنا فرق زمانی سودا۔ میر سے انشا و مصحفی کا ہے۔ سودا و میر اور انشا و مصحفی کے کلام کو یکجا کیا جائے تو ان اساتذہ کی گویائی اور زبان کی صفائی میں بہت کم فرق نظر آئیگا۔ مگر بحری و ولی کی ہمطرح یا غیر طرح سخن آرائی کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ بحری کا انداز بیان بہت بڑی حد تک وہی ہے جو اُن سے قبل دکنی شعرار کے کلام میں پایا جاتا ہے بخلاف اس کے ولی کا دیوان بکثرت اِس انداز کا حامل ہے جس کو حاتم۔ آبرو

آرزو نے اختیار کیا اور پھر سودا۔ میر وغیرہ نے اُس کی ارتقائی صورت نمایاں کی۔

بحری کے سارے دیوان کو پڑھ جائیے، اس میں ایک شعر بھی ایسا نہ ملے گا جس کو آج کی نہیں بلکہ حاتم و آبرو وغیرہ کی زبان بھی کہا جا سکے۔ لیکن ولی دکنی کے کلام میں چند اجنبی محاورات کے علاوہ سب کا سب آج کل کا روزمرہ نظر آئیگا یہی نکتہ ہے کہ ولی کو اُن کے کلام کے صفائی اور طرز گویائی کے سبب موجودہ شاعری اور شعراء کا پیشوا کہا جاتا ہے جس کی ترکیب و ترتیب آج مسلّم مانی جاتی ہے۔ مزید ثبوت اور تصدیق کے لئے یہاں بحری اور ولی کی ہم طرح و ہم وزن ایک غزل لکھی جاتی ہے جس کو پڑھکر ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے:۔

بحری

اے سکھی میں نے دیکھیا سنگ کر کے یار کا   پُن نہ دیکھا بے سبج ہور سنگ، دل تجھ سار کا
جیو لینے جانتا ہور دلبری کے تو کلا   گھر میں ہے آگ آپنا ہور بھار گے پر یار کا
جیو جل کہتا ہوں میں پن سُن تو سنگیں ہو، تکو   بول ایس کی برہ کی پر بس میں بلکھنہار کا
گھاؤ کاری اچھ نہ جانا جیو ہور جم تل کھلے   یوں تو خاصیت دسا تجھ عشق کی تردار کا
عشق میں کچھ عدل اچھتا تو نہ اچھتا بے دھڑک   دکھ دلاور لشکری سر کاٹ سکھ سردار کا
بحریا سرپاؤں کیوں کرنا حقیقت کا سو بول   گرنا کھڑتا سر پہ تیرے یوں مجازی مار کا

ولی

جگ ستے دو جا نہیں ہے خوبرو تجھ سار کا   چاند کو ہے آسماں پر رشک تجھ رخسار کا
جب سے تیری زلف کو دیکھا ہے زاہد نے صنم   ترک کر تسبیح کو ہے مشتاق تجھ زنار کا
دل کو میرے تب ستی حاصل ہوا ہے پیچ و تاب   جب سے دیکھا پیچ تیری لٹ پٹی دستار کا
تجھ گلی کی خاک رہ جب سے ہوا ہوں لے پیا   تب سوں تیرا نقش پا تکیہ ہے مجھ بیمار کا
بلبلیں گر یک نظر دیکھیں ترے مجھ کا چمن   پھر نہ دیکھیں زندگی بھر مُکھ کدھی گلزار کا
بحر بے پایاں نے مجھ آنسو ستی پایا ہے فیض   ابر نیساں عید ہے مجھ چشم گوہر بار کا
مکھڑا اپس کا مکھ دکھا اے راحت جان و جگر   ہے ولی مدت ستی مشتاق تجھ دیدار کا

ان اشعار کا مطالعہ بغیر حجت و بحث کے ثابت کر رہا ہے کہ حاتم و آبرو اور میر و سودا کی جس شاعری نے اُردو زبان کو فروغ دیا اور جو انداز بیان شمالی ہند میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھا گیا اُس کا موجد و مروج اگر ہوسکتا ہے تو صرف ولی دکنی کا کلام ہوسکتا ہے، نہ کہ قاضی محمود بحری کا اور صرف اسی بنا پر ولی کو اُردو کا پہلا مدوّن کہا جانا حق بجانب ہے۔

اِس توضیح و تفصیل کے بعد کلیات بحری کے فاضل مرتب کی سعی و کاوش شکریہ و ستائیش کی مستحق ہے۔ جن کی بدولت ارباب فن کو ایک گم شدہ سرمایہ ہاتھ آیا اور جس کو اُنھوں نے بڑی محنت و تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے باقی رہا غلطی اور فرو گزاشت کا امکان سو وہ اس لئے قابل اعتنا نہیں کہ:۔

ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

لطفِ سخن

آثر - ولایت حسین صاحب آثر رحمانی رامپوری

مدت میں ملے ہیں تو دونوں کی یہ حالت ہے
میں بھی متحیر ہوں اور اُن کو بھی حیرت ہے

ہو جس پہ نظر اُن کی وہ صاحبِ قسمت ہے
اُن رس بھری آنکھوں میں دُنیائے مسرت ہے

تعمیرِ دلِ عاشق، تخریب میں ہے مُضمر
ہر شے کا بگڑنا ہی، بننے کی علامت ہے

پھر جانبِ دل اُٹھیں وہ جاذبِ دل آنکھیں
تاثیرِ محبت بھی، فردوسِ محبت ہے

پُر کیف مناظر ہیں، دُنیائے تخیل کے
خلوت ہے نہ جلوت ہے، جلوت ہو نہ خلوت ہے

سمجھا نہیں سکتے ہم، اے بوالہوس تم کو
دل والے سمجھتے ہیں، جو درد میں لذت ہے

اول تو آثر میں کیا اور میری محبت کیا
اس پر بھی کرم اُن کا، فیضانِ محبت ہے

اختر - جناب اختر رضوانی لاہور

اشک کی ایک بوند بھی خونِ جگر نہ ہو سکی
تجھ سے بھی کوئی کشمکش دیدۂ تر نہ ہو سکی

آج مریضِ عشق نے اتنا کہا بوقتِ مرگ
میری شبِ فراق کی کوئی سحر نہ ہو سکی

دردِ بلا اماں ملی، دولتِ دو جہاں ملی
خوب ہوا مری فغاں ننگِ اثر نہ ہو سکی

آہ جو بے اثر رہی نالہ بھی نارسا رہا
اُن کی نظر کو کیا کہوں اُن کی نظر نہ ہو سکی

کچھ مرا مستقر نہیں شام کہیں سحر کہیں
عشق میں کوئی مستقل راہگذر نہ ہو سکی

جس نے عطا کیا مذاق، جس نے دیا غمِ فراق
اپنے مریضِ ہجر کی اس کو خبر نہ ہو سکی

اختر مے پرست کی مے کدۂ بہار میں
ایک گھڑی بھی جز شراب آہ بسر نہ ہو سکی

اختر - جناب اختر بریلوی

اُس نے تو عرضِ تمنا کی اجازت دیدی
میں ہوں اس سوچ میں یارب کہ تمنا کیا ہے

درد تو بخش دیا، خیر کوئی بات نہیں
اب ذرا یہ تو کہو اُس کا مداوا کیا ہے

حال سُنتے تو مرے دل کا پتہ چل جاتا
حالِ دل تم نہیں سُنتے ہو تو کہنا کیا ہے

میں کبھی یہ نہ کہوں گا کہ کرم کیجئے آپ
آپ خود سوچیئے الفت کا تقاضا کیا ہے

رنج اُٹھاتے ہیں ستم سہتے ہیں چپ رہتے ہیں جانتے ہیں کہ شکایات سے ہوتا کیا ہے
رنج دن رات کا اختر نہیں دیکھا جاتا نہیں معلوم کہ اِس عشق میں ہوتا کیا ہے

اختر - جناب اختر ہوشیار پوری، بی اے ایل ایل بی

وہ شاخ ہی نہیں کہ جو تھی ناز مشِ چمن برق تپاں جلائے مرا آشیانہ کیا
جھکتی نہیں ہے اب یہ کسی آستاں کی سمت میری جبیں میں گم ہے ترا آستانہ کیا
چالیں ہیں آسمان کی قسمت کے کھیل میں کہتے ہیں کس کو تیر، کماں کیا، نشانہ کیا
آغوشِ دوست، صحبتِ احباب، شرب مے اور اس کے ماسوا مرا اختر فسانہ کیا

الطاف - جناب الطاف مشہدی

لٹیا ہوا ہوں سایۂ غربت میں گھر سے دور دل سے قریں ہیں اہل وطن اور نظر سے دور
اللہ رے نصیب کہ پائی ہے وہ فغاں جو عمر بھر رہی ہے فریبِ نظر سے دور
اے حسنِ بے پناہ بتائے کوئی مجھے دنیا کی کون چیز ہے تیرے اثر سے دور
اے کیف اُن کی مست نگاہوں سے چھپ کے آ اے درد دم زدن میں ہو میرے جگر سے دور
الطاف ناز اپنی گدائی یہ ہے مجھے دامن ہے اس کا سایۂ لعل و گہر سے دور

ادیب - منشی جگل کشور - دھاریوال

ڈھونڈھنے سے ڈھونڈنے والے کو کیا ملتا نہیں ہاں مگر دنیا میں کوئی باوفا ملتا نہیں
جن کے دم سے زندگی کا لطف حاصل تھا کبھی اب بساطِ دہر پر اُن کا پتا ملتا نہیں
نیک خوئی اور خوش اخلاقی ہے انساں کی صفت آدمی ملتے ہیں، کوئی با صفا ملتا نہیں
غور کر کے سن لیں شیخ و برہمن قولِ ادیب اب فقیروں کو بھی پیسہ بے صدا ملتا نہیں

بسمل - حضرت بسمل الہ آبادی

جہاں تو ہے وہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی حقیقت در حقیقت تیری پہچانی نہیں جاتی
کمالِ بندگی یہ ہے کہ محوِ بندگی ہو جا نہ ہو جب تک یہ عالم بندگی مانی نہیں جاتی
زمانے کی نگاہیں محوِ حیرت ہو گئیں کیا کیا مگر اب تک وہ جلووں کی فراوانی نہیں جاتی
حقیقت میں حقیقت آشنا ہونا تو مشکل ہے مجازی کا یہ عالم ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

دمِ فکرِ سخن ہو بحر کوئی بھی مگر بسمل
غزل میں پیرویِ نوحِ طوفانی نہیں جاتی

رفتارِ زمانہ

پچھلے نمبر میں ہم نے جنگ کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی، اس کے بعد کرسمس کے تین دن چھوڑ کر لندن اور دوسرے برطانوی شہروں پر جرمن ہوائی حملوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برطانوی ایر فورس بھی جوابی حملے کرتی رہتی ہے ان اندھا دھند بمباریوں سے نقصان تو بہت ہوتا ہے لیکن ہٹلر ان سے جو فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا وہ اُسے ابھی تک حاصل نہیں ہوا برطانیہ کی بحری اور ہوائی طاقت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور برطانیہ پر حملہ کرنے کی جو جو اسکیمیں ہٹلر نے بنائیں ان میں کوئی برطانیہ کے بحری بیڑہ کی مستعدی اور ہوائی فوج کی بہادری کے سامنے پوری نہ ہوسکی۔ مسٹر چرچل تو ابھی تک اس حملے کو ناممکن نہیں سمجھتے ہیں اور اُن کی رائے میں جاڑے کے موسم میں جہاں حملہ آور فوج کے لئے چند خاص مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں وہاں بعض باتوں کی سہولت بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن مسٹر ہنڈرسن نے جو آغاز جنگ کے وقت تک جرمنی میں برطانیہ کے سفیر تھے، بہت پہلے کہدیا تھا کہ اگر یہ لڑائی جون ۱۹۴۰ء میں ختم ہوئی تو ہٹلر کی فتح ہوگی اور اگر برطانیہ اسے نومبر ۱۹۴۰ء تک کھینچ لے گیا تو پھر ہٹلر کا منصوبہ پورا ہوگا۔ فرانس کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند ہی روز میں تمام یورپ میں ہٹلر کی فتح کا ڈنکا بج جائیگا۔ فرانس کے رہنماؤں نے بھی یہی سمجھکر اپنا ملک جرمنی کے حوالے کر دیا کہ برطانیہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکے گا۔ فرانس در کنار امریکہ میں بھی لوگوں کو یہی وسوسہ تھا اور شاید پریسیڈنٹ روزویلٹ اور بعض خاص خاص مدبّروں کے سوائے اور سب لوگ یہی سمجھنے لگے تھے کہ ہٹلر انگلستان پر حملہ کئے بغیر نہ رہیگا اور برطانیہ اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے گا۔ لیکن ڈنکرک کے بعد ہٹلر کے لئے جتنے اچھے موقعے پیدا ہو گئے تھے وہ رفتہ رفتہ سب ختم ہو چکے ہیں اور مسٹر چرچل کی رہنمائی میں برطانیہ نے اپنی حفاظت کی اس پیمانہ پر تیاریاں کرلی ہیں جو ہٹلر کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھیں۔ پچھلے چند ماہ کے واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اندھا دھند بمباریوں سے بڑی بڑی عمارتیں مسمار ہو سکتی ہیں، پُرانے پرانے گرجے ڈھائے جا سکتے ہیں، اسپتال اور اسکول برباد ہو سکتے ہیں، پُرامن شہری، بچے بوڑھے اور مرد و عورتیں بلا تخصیص اور بلا استثنا موت کے گھاٹ اُتارے جا سکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کی ہمت و استقلال میں اس ظلم و تشدد اور اہم اور بھاری نقصان سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ تمام اہل برطانیہ نے اس نازک وقت پر آزادی اور جمہوریت کی خاطر جس بہادری اور پامردی کا ثبوت دیا ہے وہ دنیا کی تاریخ کا ایک شاندار اور سنہرا باب ہوگا۔ برطانوی ایر فورس نے نہ صرف برطانیہ کی حفاظت ہی کی ہے بلکہ دشمن کے ملکوں میں بھی پانچ ہزار سے زیادہ جوابی حملے کر چکی ہے اور بحری بیڑے نے نہ صرف برطانیہ کو دشمن کے حملوں ہی سے محفوظ رکھا بلکہ سمندروں پر بھی اپنا اقتدار جمائے رکھا اس اثنا میں جرمن ڈبکنی کشتیوں نے البتہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی دکھائی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پچھلے کچھ دنوں سے برطانوی

تجارتی جہازوں کا معمولی اوسط سے زیادہ نقصان ہو رہا ہے لیکن جہاں اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی فکر ہو رہی ہے وہاں ان روزافزوں نقصانات کے پورا کرنے کا بھی بندوبست ہو رہا ہے اور امریکہ میں تین سو نئے تجارتی جہازوں کی تیاری کا آرڈر دیدیا گیا ہے بہرحال نئے سال کے لئے حالات بہت کچھ موافق ہو گئے ہیں اور بقول جنرل اسمٹس ۱۹۴۰ء میں دنیا پر جو کالے بادل چھائے ہوئے تھے وہ اب چھٹنے لگے ہیں۔ ہٹلر کو بھی جیسا کہ اسکی حال کی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے آنے والے خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ گرجتی ہوئی آواز سے برطانیہ اور اُس کی وسیع سلطنت کو ملیامیٹ کر دینے کی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ وہاں اپنی پچھلی تقریروں میں اُس نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ جرمن قوم کسی حملہ آور کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہے اور کوئی طاقت جرمن نیشن کو ورسائی جیسی ذلت آمیز صلح پر مجبور نہیں کر سکتی ہے۔

اٹلی کا اور بھی بُرا حال ہے۔ اُس نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ فرانس کی طرح برطانیہ بھی زیادہ دنوں جرمنی کا مقابلہ نہ کر سکے گا وہ جرمنی کے ساتھ ہو کر مال غنیمت کا حصہ دار بننا چاہتا تھا مگر اب لینے کے دینے پڑ رہے ہیں۔ اس نے جوش میں آکر مصر پر حملہ کر دیا تھا، جنوبی افریقہ میں سر اُٹھایا تھا اور یہ سمجھا کہ برطانیہ کو اس وقت اپنی ہی حفاظت سے فرصت نہیں وہ یونان کی کیا مدد کر سکے گا اُس نے نومبر میں یونان پر بھی حملہ کر دیا۔ لیکن انگریزوں کی بروقت امداد اور خود یونانیوں کی بہادری نے اٹلی کے دانت کھٹے کر دیے ہیں۔ یونانی اور انگریزی فوج نے نہ صرف یونان سے اطالوی فوج کو بھگا دیا بلکہ اس وقت وہ البانیہ میں گھس کر اٹلی کو شکست پر شکست دے رہے ہیں۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کا سب سے بڑا واقعہ سیدی برانی کی فتح ہے جہاں انگریزوں نے اٹلی کے ہزاروں سپاہی قید کر لیے۔ مسٹر چرچل نے بجا طور پر اس کو انگلستان کی فتح عظیم قرار دیا ہے۔ اُس معرکہ میں اٹلی کے کئی بڑے بڑے جنرل کام آئے اور کئی ایک گرفتار کر لئے گئے۔ غرض اس فتح کی تو اہمیت آئندہ چلکر اور معلوم ہو گی۔ فی الحال یونانی فوجیں البانیہ کے شمال اور جنوب دونوں طرف برابر بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ کئی اہم مقامات پر ان کا قبضہ ہو گیا ہے اور اٹلی نے جو مزید کمک بھیجی اُس سے بھی جنگ کی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ بلکہ اٹلی کی فوج کو ہر جگہ بھاگنا ہی پڑا اور مصر پر اس کا حملہ قطعی رُک گیا ہے اور جس قدر اطالوی فوج گھس آئی تھی وہ سرزمین مصر سے باہر نکال دی گئی ہے

جنوبی افریقہ میں بھی اس کا قافیہ تنگ ہو رہا ہے۔ برطانوی فوجوں کی فتح پر فتح ہو رہی ہے اور ہزارہا اطالوی سپاہی برطانیہ کے ہاتھ قید ہو گئے ہیں اور بارڈیا اور دیگر مقامات پر قبضہ کرنے کی مہم جاری ہے۔ اٹلی کا بحری بیڑہ جو بحر روم سے برطانیہ کو بیدخل کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا آجکل کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ ان سب واقعات کا نتیجہ کم سے کم مسولینی کے حق میں بہت بُرا ثابت ہوگا

اٹلی میں اندرونی خلفشار شروع ہو گیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے دلاور فوجی سردار جنرل Badoglio امیر البحر Cavagnari اور جنرل ڈی وکی کمانڈر بحر ایجین اپنے اپنے عہدوں سے برخاست یا مستعفی ہو گئے ہیں اور ملک میں ایک تلاطم برپا ہے جو کیا عجب ہے آئندہ کسی انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ہو۔

برطانیہ کے ان کامیاب مقابلوں نے فرانس کے ٹوٹے ہوئے دلوں میں بھی اُمید کی جھلک پیدا کر دی ہے۔ مارشل پیتاں نے

جن شرائط پر عارضی صلح قبول کی تھی اُس سے اب وہ ایک انچ آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہے۔ ہٹلر اس نازک وقت میں فرانسیسی بیڑے کی امداد سے انگلستان اور بحر روم میں دونوں جگہ برطانیہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے مگر مارشل پیتاں اس امداد کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اس بارے میں جو زبان دیدی تھی اُس کا پاس کر رہے ہیں۔ اور اپنے نائب موسیو لاول کو جو ہٹلر کے جا بیجا ہر مطالبہ کو منظور کرنے کی سازشیں کر رہا تھا وزارت سے برخاست کر دیا ہے۔ دوسرے وزیر بھی جو فرانس کی عزت کو خاک میں ملانا چاہتے تھے رفتہ رفتہ علیحدہ کئے جا رہے ہیں۔ جنرل ویگان مارشل پیتاں کے ہم نوا ہیں اور مارشل ممدوح نے فرانسیسی بیڑے کو جرمنی کے پنجے سے بچانے کے لئے افریقہ بھیج دیا ہے۔ جنرل ویگان بھی افریقہ میں ہر ضروری کارروائی کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ اسی وجہ سے ہٹلر جبر و تشدد سے کام نہیں لے رہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جبر و تشدد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت فرانس کے وہ اجزا جو ابھی تک فوجی حیثیت سے زیر نہیں ہوئے ہیں فوراً ہی اعلان جنگ کر دیں گے۔ ان واقعات سے جنرل ڈی گالے کی قوت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ جرمنوں نے صوبہ لورین پر قبضہ کر کے جرمن ریخ میں شامل کر لیا ہے اس علاقے سے ستر ہزار فرانسیسی ملک بدر کر دیئے گئے۔ بظاہر اسباب یہ کارروائی مارشل پیتاں کی رضامندی سے ہوئی ہے لیکن جو لوگ ملک بدر ہوئے ہیں اُن کی حالت دیکھکر فرانسیسیوں کے دلوں میں قدرتاً جرمنی سے مزید کشیدگی پیدا ہوئی ہوگی۔

رومانیہ اور یوگوسلاویہ تو پہلے ہی محوری طاقتوں میں شامل ہو گئے تھے لیکن بلغاریہ نے جرمنی اور اٹلی کی ہمنوائی سے انکار کر دیا ہے رومانیہ اس وقت جرمنی کی کڑی بندش میں پھنسا ہوا ہے۔ حال ہی میں وہاں کے بڑے بڑے مدبر سر عام قتل کر دیئے گئے، ان میں دو سابق وزیر اعظم اور ایک وزیر داخلہ بھی شامل تھے۔ جاپان سے بھی جرمنی کو کوئی خاص مدد نہیں ملی۔ اُس نے چین میں اپنی رہنمائی اور نگرانی میں ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا ہے لیکن بین الاقوامی دنیا میں اسکا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ چین کے قوم پرست پوری سرگرمی اور قابل تعریف مستقل مزاجی سے اپنی آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں وہ جاپانی فوج کو کئی اہم مقامات پر شکست دے چکے ہیں۔

روس بھی جرمنی کی چالوں سے بے خبر نہیں ہے۔ شروع ہی سے اسٹالین تمام دنیا کے لئے معمہ بنا ہوا ہے۔ بلقان میں وہ جرمن پیش قدمی کو بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ رومانیہ میں کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ جو جبر و تشدد ہو رہا ہے اُس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ روس اور جرمنی کے تعلقات بگڑ چکے ہیں چنانچہ حال میں اسٹالین نے اپنے ملک کے نام ایک پیغام بھیجا ہے جس میں اُس نے لکھا ہے کہ روس کو ہر وقت بیرونی حملے کی مدافعت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ حملہ صرف جرمن نازیوں کی طرف ہی سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال روس پھونکتا ہے اور جرمنی سے اُس کا ساتھ تیل پانی کا ساتھ ہے۔ انگریزوں کے ابتدائی رویہ سے وہ بہت کچھ بدظن رہا مگر اب جب سے انگلستان کی روسی سفارت پر مسٹر اسٹفارڈ کرپس گئے ہیں روس کی قدرتی بدظنی رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے تاہم لارڈ ہیلی فیکس وزیر خارجہ کی موجودگی میں روس کے شبہات کا پورے طور پر دور ہونا ممکن نہ تھا۔ لارڈ لوتھین سفیر امریکہ کی افسوسناک وفات سے مسٹر چرچل کو لارڈ موصوف کو وزارت سے ہٹا کر اُنھیں سفیر کی حیثیت سے امریکہ بھیجنا پڑا

اور وزیر داخلہ کی جگہ مسٹر ایڈن کی تقرری ہوئی ہے جو جرمنی اور اٹلی کے ہمیشہ سے مخالف رہے ہیں۔ اس رد و بدل کا روس اور برطانیہ کے باہمی تعلقات پر اچھا ہی اثر پڑیگا۔ ادھر امریکہ میں پریسیڈنٹ روزویلٹ تیسری دفعہ پریسیڈنٹ منتخب ہو گئے ہیں گو اُن کے مدمقابل مسٹر ولکی بھی برطانیہ کے دوست تھے لیکن پریسیڈنٹ روزویلٹ اپنی انتہائی طاقت سے برطانیہ کی امداد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ برطانیہ کو ادھار سامان جنگ دینے پر بھی تیار ہیں اور اس کے لئے ایک نیا فارمولا نکال لیا ہے کہ جو ضروری سامان برطانیہ نقد قیمت پر نہ لے سکے وہ اسے جنگ کے دوران بھر کے لئے مستعار دیدیا جائے اور جنگ کے بعد اسے یا تو قیمت ادا کر کے مال کو خریدنے یا اسے واپس کرنے کا اختیار رہیگا۔ اس طرح امریکہ برطانیہ کو اربوں کا سامان جنگ دیتا رہیگا۔ پریسیڈنٹ موصوف نے مزدوروں کے کام کرنے کے گھنٹے بھی بڑھا دیے ہیں اور ان سے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی اپیل کی ہے۔ محوری طاقتوں کی دھمکیوں سے بھی وہ بے پرواہ ہیں ان کی ہدایت سے امریکہ کے محکمہ اسلحہ سازی نے برطانیہ کے لئے ڈھائی ارب قیمت کا سامان جنگ تیار کرنے کا ٹھیکہ منظور کرلیا ہے۔ آجکل امریکہ میں ہر ماہ ڈھائی ہزار ہوائی جہاز سات سو جنگی ہوائی جہاز ... ٹینک دس ہزار آٹومیٹک رائفلیں تیار ہونے لگی ہیں۔ امریکہ میں مختلف قسم کے جنگی جہاز بنانے کے چالیس نئے کارخانے قائم ہوئے ہیں۔ غرض اس وقت بین الاقوامی صورت حالات برطانیہ کے بہت موافق ہے۔ ایک واقعہ البتہ اس کے خلاف ہوا ہے یعنی اسپین نے ٹینجیر کے بین الاقوامی علاقے کو جو ۱۹۲۳ء سے برطانیہ فرانس اور اسپین کے مشترکہ انتظام کے ماتحت تھا۔ اب بالکل اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں اٹلی کو بھی اس انتظام میں شامل کرلیا گیا تھا۔ چار سال ہوئے بارہ سال (۱۹۴۸ء تک) اس انتظام کو قائم رکھنے کا ازسرنو معاہدہ ہوا تھا۔ لیکن اسوقت اسپین نے اپنے کسی شریک کار سے مشورہ کئے بغیر محض ایک جنبش قلم سے سب کو بیدخل کر کے ٹینجیر کو خالص اسپین کے جغرافیہ میں شامل کرلیا ہے۔ معاہدوں کی ایسی علانیہ خلاف ورزی اسی وقت ہو سکتی تھی۔ فوجی حیثیت سے ٹینجیر بحر روم کا مغربی دروازہ ہے اس لئے اس سے برطانیہ کا بیدخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن اسپین ابھی تک اپنی پچھلی خانہ جنگی کی بدولت کسی نئی لڑائی میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہے ورنہ ٹینجیر کی طرح آج جبرالٹر پر بھی قبضہ کر کے برطانیہ کو زیادہ پریشان کرسکتا تھا۔ جبرالٹر پر حملے کا اندیشہ تو ابھی تک رفع نہیں ہوا ہے لیکن اس کی پوزیشن اب پہلے سے بہت مضبوط ہوگئی ہے اور امید نہیں کہ بحر روم کی یہ کنجی آسانی سے ہٹلر کے ہاتھ آجائے۔

اب ہٹلر کے لئے یہی چند باتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو وہ خود برطانیہ پر حملے کرے یا فرانسیسی بیڑے کی مدد سے مغربی بحر روم پر یورش کرے یا اسپین کو ملا کر جبرالٹر پر دھاوا کرے۔ یا بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ کو ملا کر بلقان ہوتے ہوئے مشرق ادنےٰ پر پیش قدمی کرے۔ مگر اس وقت کوئی تدبیر پوری ہوتی نہیں پڑ رہی ہے اور عجب نہیں کہ جلد ہی اُس کی مشکلات بہت بڑھ جائیں گی۔

ہندوستان کے حالات

پچھلے دو ماہ کے اندر صاحب وزیر ہند اور حضور والسرائے کی کئی تقریریں ہوئیں۔ ہزایکسلنسی لارڈ لنلتھگو کی میعاد عہدہ

اپریل ۱۹۴۱ء میں ختم ہونے والی تھی لیکن بادشاہ سلامت نے اس میں ایک سال کی توسیع کر دی ہے۔ آپ نے مرکزی لیجسلیچر کے سامنے ایک اہم تقریر کی اور حال میں کلکتہ میں ملک کے مشترکہ چیمبرس آف کامرس کے اجلاس میں ایک طولانی تقریر کے دوران میں بھی آپ نے ۸۔ اگست کے اعلان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ جو مراعات دی جاسکتی ہیں وہ اس اعلان میں دیدی گئی ہیں آپ نے کہا کہ انتظامی کونسل کی توسیع سے ملک میں قریب قریب نیشنل گورنمنٹ قائم ہوجائیگی۔ توسیع شدہ کونسل کے ارکین کو حکومت کے اصلی اختیارات حاصل ہونگے۔ آپ نے صاحب وزیر ہند کے اس قول کو بھی دُہرایا کہ اگر ایک مرتبہ والسرائے کی انتظامی کونسل میں ہندوستانیوں کی کثرت ہوجائے تو پھر یہ کثرت ایک مستقل چیز ہوجائیگی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ ممبرانِ کونسل کی حیثیت صرف افسرانِ محکمہ کی نہ ہوگی بلکہ انھیں پورے اختیارات حاصل ہونگے اور انھیں کی رائے اور ذمہ داری پر سب کام انجام پائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ابتک اِس سلسلے میں ہمیشہ گورنمنٹ ہی نے پیش قدمی کی ہے مگر جو کچھ ممکن تھا گورنمنٹ کر چکی ہے اب خود ہندوستانیوں کو قدم اُٹھانا چاہیئے۔

وزیر ہند مسٹر ایمری نے بھی اس عرصے میں کئی تقریریں کیں۔ جن میں انھوں نے ہندوستانیوں سے اتحاد و یگانگت کی اپیل کی۔ آپ نے کہا کہ ہندوستانیوں کو ایسی تجویزوں پر غور کرنا چاہیئے جن سے ملک میں اتحاد و یگانگت قائم ہو۔ آپ نے بھی والسرائے کی توسیع اور جنگی مشاورتی کمیٹی کی قائمی کی تجویزیں قبول کرنے پر زور دیا۔ وزیر ہند کی سب سے عمدہ تقریر وہ تھی جو انھوں نے انگریزی بولنے والے اصحاب کی انجمن میں لندن میں کی اور جس میں انھوں نے انگریز۔ ہندوستانی۔ ہندو مسلمان سیسائی سب سے یہ اپیل کی کہ وہ ہر معاملے میں سب سے پہلے ہندوستان کا خیال مقدم رکھیں۔ انھوں نے ہندو مسلمان راجہ رعایا سب کے لئے قابل قدر نصیحتیں کیں اور خود انگریزوں سے بھی سب سے پہلے ہندوستان کے مفاد کا خیال رکھنے کی استدعا کی۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ ہر صورت اور ہر حالت میں ہندوستان کی سیاسی یگانگت قائم رکھنا لابدی ہے۔ والیانِ ریاست سے اپنی ریاستوں میں آئینی اصلاحات اور رعایا پروری کی اسکیمیں جاری کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن عام ہندوستانیوں کے نزدیک ان کی تقریروں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ہمارے ملکی مطالبات پورے ہوسکیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ اخلاقی جرأت اور حسن سلوک کا وقت ہے محض تقریروں سے دلوں کی پیاس نہیں بجھ سکتی اور نہ ملک کی سیاسی گتھی سلجھ سکے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بخوبی ثابت ہے کہ ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ عام خواہش یہی ہے کہ جس طرح ہوسکے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان غلط فہمیاں جلد سے جلد رفع ہوجائیں۔ پچھلے کرسمس کے موقعہ پر مختلف سیاسی پارٹیوں کے متعدد ممبرانِ پارلیمنٹ نے انگریزوں کی طرف سے اہل ہند کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں اس بات کا اطمینان دلایا گیا ہے کہ انگلستان کے عوام ہندوستان کو سلطنت برطانیہ میں ہر حیثیت سے برابر کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی آزادی کے راستے میں حکومت کا پس وپیش نہیں بلکہ خود ہندوستانیوں کا باہمی اختلافات حائل ہے ورنہ جس اسکیم کو ہندوستانی آپس میں طے کرلیں انگلستان کی پارلیمنٹ اُسے خوشی سے قبول کرے گی۔ انگلستان کی بعض نامور

خاتونوں نے بھی اسی قسم کا ہمدردانہ مراسلہ بھیجا ہے۔ یہاں کنور سرجگدیش پرشاد صاحب سابق ممبر وائسرائیگل کونسل نے کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے بااثر انگریز اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی قائم کرنے کی تجویز کی ہے سر تیج بہادر صاحب سپرو نے بھی اسی سلسلے میں ایک اہم بیان شائع فرمایا ہے جس میں آپ نے فریقین کی غلطیوں کا ذکر کرکے سمجھوتہ کرانے کی آمادگی ظاہر فرمائی ہے بشرطیکہ مہاتما گاندھی و مسٹر جناح آپس میں تبادلہ خیالات کرکے اُن سے اسکی خواہش کریں مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے براہ راست مسٹر جناح سے اپیل کی ہے کہ وہ جلد ہی کانگریس سے بات چیت کرکے سمجھوتہ کرنے کی کوشش شروع کردیں۔ غرض ملک میں ہر طرف مصالحت کی خواہش عام ہے اور اس وقت ملک کے ہر حصے میں کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان تصادم سے پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک پورے زور کے ساتھ جاری ہے ملک کے بڑے بڑے لیڈر جو کل تک ایوان وزارت میں حکومت کی مسند پر بیٹھے ہوئے ملک کی حکمرانی کر رہے تھے آج جیل خانوں میں بادشاہ سلامت کے مہمان بنے ہوئے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو چار سال کیلئے قید کردیا گیا ہے پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر کو قید کے علاوہ چھ ہزار کا جرمانہ کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی نے کرسمس میں ستیہ گرہ بند کردیا تھا لیکن گورنمنٹ نے اسی دوران میں مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس کو بھی گرفتار کرلیا۔ ۶ جنوری ۱۹۴۱ء سے ستیہ گرہ کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے جس میں چند ہی دنوں میں ہزارہا محبانِ وطن گرفتار ہو کر جیل خانوں کو آباد کردیں گے۔ گورنمنٹ کا خیال صحیح نہیں ہے کہ عوام ملک کا دل اس ستیہ گرہ سے بے اثر ہے۔ ان گرفتاریوں پر ملک بھر میں ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں، اسکولوں اور کالجوں کے نوعمر طالب علموں میں ہر جگہ خلفشار پھیل رہا ہے یہ سب علامتیں ہیں اس بے چینی کی جو اندر ہی اندر ملک میں پھیل رہی ہے اور جس سے خاص و عام سب رفتہ رفتہ متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کوئی جماعت ہٹلر کی فتح یا نازیوں کی حکومت نہیں چاہتی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عام لوگ برطانیہ کو خود بیں، تنگ دل اور سخت گیر سمجھ رہے ہیں اور اس لڑائی کو اپنی لڑائی نہیں سمجھتے۔ اس وقت برطانیہ کی جو کچھ امداد ہو رہی ہے وہ یا تو بیکاری کے سبب ہو رہی ہے یا سرکاری دباؤ کا نتیجہ ہے یا اُس کی حیثیت بیوپار کی ہے۔ ہندوستان کے لوگ خصوصاً ہمارے نوجوان جب آزادی اور جمہوریت کا ذکر سنتے ہیں تو یہی سوال کرتے ہیں کہ آخر ہندوستان کو ان نعمتوں سے جن کی خاطر اہل برطانیہ اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔ برٹش گورنمنٹ وائسرائے کی انتظامی کونسل کی توسیع کو بہت کچھ سمجھتی ہے اور اس سے زیادہ کچھ دینے کو تیار نہیں ہے۔ لیکن کنور سرجگدیش پرشاد جو سالہا سال اس کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں اور جن کی تمام عمر گورنمنٹ ہی کا کام کرتے ہوئے بسر ہوئی ہے اس کو کافی نہیں سمجھتے اور کونسل کے ممبروں کو محکموں کے معمولی افسروں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے وہ حکومت کے پورے اختیارات سیاہ و سفید حاصل کرنے کے درپے ہے۔ اس کی طرف سے راجہ گوپال آچاریہ صاحب گورنمنٹ سے یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اُسے اس سے بحث نہیں کہ یہ اختیارات کس کو دیئے جائیں مسلم لیگ کے لیڈروں کو ملیں یا کانگریس کے رہنماؤں کو۔ مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس ملکی حفاظت کے لئے تلوار اٹھانے

کا بھی ذکر کر چکے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ابھی تک برطانوی مدبروں کو ہندوستان کے مسئلہ کا حل سوچنے کا دھیان ہی نہیں ہوا اور نہ ان کو اسوقت اس پرغور کرنے کی مہلت ہے۔ لیکن مسٹر چرچل کو اس مسئلہ کو بھی ایک اہم جنگی مسئلہ سمجھنا چاہیئے، ان کے حسن تدبیر و دوراندیشی ہمت اور قوت عمل سے اس کا حل بعید نہ ہونا چاہیئے۔ ایک اہم اور نازک تاریخی موقعہ پر فرانس و انگلستان کی مشترکہ یونین کی تجویز انھیں کے دماغ سے نکلی تھی۔ کیا وہ اسی قسم کی تجویز ہندوستان کے لئے نہیں سوچ سکتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان اور انگلستان کا تعاون ابھی بہت دنوں تک دونوں کے لئے بہت کچھ فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ مساوات اور برابری کے اُصول پر دونوں ملک امداد باہمی سے ایک دوسرے سے غیر معمولی امداد کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس اس وقت تک برطانیہ کو اس کا احساس ہی نہیں ہوا، ورنہ آج ہندوستان اپنے قدرتی ذرائع سے پُورا فائدہ اُٹھانے کے قابل ہوتا۔ اس کی صنعت و حرفت کو بلا روک وٹوک ترقی کرنے کا موقعہ دیا گیا ہوتا تو برطانیہ کو اس وقت امریکہ کا دست نگر نہ ہونا پڑتا، اور مشرق کیا یورپ میں بھی کسی کی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ حال میں سلطنت کے مشرقی ملکوں کے سرکاری نمایندوں کی جو کانفرنس ہوئی اس میں بھی ملکی کارخانہ داروں کو اس بات کا گلہ رہا کہ انھیں اندرونی مباحثوں میں حصہ لینے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اس وقت تک بھاری قیمت کی کوئی چیز مثلاً موٹر کار، ہوائی جہاز وغیرہ ہندوستان میں تیار نہیں ہو سکتی ہے۔ آج بھی اس ملک کی حکومت کی باگ ڈور چھ ہزار میل دُور صاحب وزیر ہند ہی کے ہاتھ میں ہے، اور تازہ واقعات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ خود حضور والسرائے کو ذرا ذرا سے معاملے میں برطانوی ارباب حل و عقد کی رہنمائی کا دست نگر رہنا پڑتا ہے اور یہ افسران بالا قابو یافتہ جماعتوں کا رخ دیکھ دیکھ کر قدم اُٹھاتے ہیں۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں بہت سی ملکی کانفرنسیں ہوئیں مگر ہندوستانی مسیحی کانفرنس کے صدر ڈاکٹر راجندر راؤ نے اپنی تقریر میں بڑے معرکہ کی بات کہدی کہ برطانیہ اپنی رائے کے مطابق ہندوستان کی ضروریات پُوری کرنا چاہتا ہے حالانکہ اُسے خود ہندوستان کے مطالبات منظور کر لینا چاہیئے۔

نوٹ

زمانہ بابت جنوری ۱۹۴۱ء قریب قریب تیار ہے اور عنقریب ہی حاضر خدمت ہوگا۔ اس کے کئی اہم مضامین ناظرین کو خاص طور پر پسند آئیں گے۔ ہماری کوشش تو یہی ہے کہ آیندہ سال مضامین کے اعتبار سے "زمانہ" کے معیار میں مزید ترقی نظر آئے۔ مگر ناظرین "زمانہ" کا بھی فرض ہے کہ وہ اس کی توسیع اشاعت کی فکر کر کے ہماری امداد فرمائیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے چند علم دوست احباب کے نام و پتے لکھکر منیجر رسالہ کے پاس بھیجدیں تاکہ ان کے پاس نمونے کے پرچے وغیرہ بھیجکر خریداری کی تحریک کیجاسکے۔ ملک کے اہل الرائے اصحاب "زمانہ" کے مستقل معیار کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہمارے معزز ناظرین "زمانہ" کے نہ صرف استقلال و استحکام بلکہ اسکی مزید ترقی کی عملی کوشش فرمائیں۔

تصحیح و معذرت "زمانہ" نومبر صفحہ ۲۹۸ پر حضرت جگر بریلوی کی رُباعی کا دوسرا مصرعہ غلط چھپ گیا ہے صحیح مصرعہ یوں ہے:-
"پابند خیال ہوتے ہیں سب اعمال"
ہمکو افسوس ہے کہ اس پرچے میں نظم روح بہار کے بعض اشعار غلطی سے ایسے شائع ہو گئے ہیں جو مصنف کی نظر ثانی کے محتاج تھے۔ ایڈیٹر

ایڈیٹوریل نوٹ

ناظرینِ "زمانہ" سے ایک ضروری گذارش

زمانہ کی زندگی کا ایک سال اور ختم ہوگیا۔ آیندہ نمبر سے اس کا انتالیسواں [۳۹] سال شروع ہوگا۔ اردو میں کسی دوسرے رسالہ کی اتنی عمر نہیں ہے۔ پھر بھی ابھی خدمت کا حق اور حوصلہ بہت کچھ باقی ہے اور ہماری یہی تمنا ہے کہ آپ کا زمانہ اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ عرصہ دراز تک اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند اور وسیع پیمانہ پر ملک کی علمی خدمت کرتا رہے۔ اسکا پہلا پرچہ فروری سنہ ۱۹۰۳ء میں شایع ہوا تھا اُسوقت مشکل سے دو ایک اردو رسالے نکلتے تھے۔ نئے طرز کا رسالہ صرف ایک ہی سر شیخ عبدالقادر صاحب کا "مخزن" تھا۔ اس کی تقلید میں متعدد پرچے جاری ہوئے۔ لیکن ان میں کوئی بھی زیادہ دنوں تک پنپ نہ سکا۔ اکبر مرحوم نے اسی سلسلے میں ایک رباعی لکھکر زمانہ کو عنایت فرمائی تھی۔

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے
افسوس کہ مفلسی نے چھاپا مارا آخر احباب کے دیوالے نکلے

زمانہ بھی مدتوں مالی مشکلات میں پھنسا رہا اور اب بھی اسکی حالت قابل اطمینان نہیں ہے تاہم شکر ہو کہ یہ اپنی زندگی قائم رکھے ہوئے ہے اس اثنا، ملک میں ادبی ذوق کو خاصی ترقی ہو گئی ہے اور اردو میں اچھے اچھے رسالے شایع ہو رہے ہیں۔ مگر شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اخلاقی اور ادبی حیثیت سے ایک خاص اور مستقل معیار رکھنے والے پرچوں میں اسوقت بھی آپ کا رسالہ زمانہ اپنے طرز کا اکیلا پرچہ ہے جسکی تمام قوت اردو ادب کا معیار بلند کرنے کی کوشش میں صرف ہو رہی ہے اس نے بلا تفریق مذہب و ملت اردو کے انشا پردازوں اور ملکی رہنماؤں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کردیا ہے۔ اس کے صفحات انسانی دلچسپی کے ہر موضوع کیلئے کھلے ہوتے ہیں اور زندگی کا کوئی پہلو نہیں جس پر زمانہ کے مضمون نگار صاحب سنجیدگی۔ متانت اور معقول پسندی کیساتھ غور نہ کرتے ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ محدود ذرایع اور عام بے حسی کی بدولت زمانہ کو اپنے خاطر خواہ خدمت کا موقعہ نہیں ملا تاہم اس نے اردو ادب میں اظہار خیالات بحث و مباحثہ اور تنقید و تبصرہ دونوں کا ایک خاص معیار قایم کردیا ہے اور اس معیار کے قدردانوں کی بھی ایک اچھی خاصی جماعت پیدا کرلی ہے۔ اسلئے ہمارا خیال ہے کہ موجودہ دور ترقی میں بھی اردو ادب کو "زمانہ" جیسے رسالے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے

کہ ہندوستان میں ادبی تحریکات و خدمات عام طور پر ایک فرد واحد ہی سے وابستہ رہتی ہیں زمانہ اور اس کے ہفتہ وار رفیق آزاد کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اور یہ ایک دلشکن حقیقت ہے کہ ابھی تک ان پرچوں کی زندگی کی بنیاد مضبوط نہیں ہوئی اور دونوں کا دارومدار ایک شخص واحد کی کوششوں پر ہے۔ اڑتیس سال کی مسلسل خدمت کے بعد بھی یہ حالت بڑی حوصلہ شکن ہے کہ ہم "زمانہ" کی زندگی حوادث سے محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔ زبانی قدردانی اور ہمدردی کی کمی نہیں مگر ابھی تک اس کے پاس کوئی مستقل سرمایہ ہے اور نہ کوئی مستقل کارخانہ یا باضابطہ جماعت اسکی اشاعت کی ذمہ دار ہے۔ اسکے قلمی معاون اور مضمون نگار ملک میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں مگر اس کے خریداروں کی تعداد ابھی تک اطمینان بخش نہیں ہے ہم اپنے قلمی معاونین کے زیر بار احسان ہیں۔ ہمارے احباب کا حسن سلوک ہے کہ وہ زمانہ کے لئے بلا کسی معاوضہ کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کرکے ہر قسم کے اعلےٰ سے اعلےٰ مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ہمارے پاس ان کے شکریہ کے لئے الفاظ نہیں ہیں مگر رسالہ کے لئے چند مستقل کام کرنے والوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس کہ ہم انکا جانفشانی کا بھی کوئی خاطرخواہ صلہ نہیں دے سکتے اور جتنے اصحاب ہمارے شریک کار رہے یا اسوقت ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں سب کے سب برائے نام معاوضے پر کام کرتے رہے ہیں۔ اگر ہمارے رفیق ایثار سے کام نہ لیتے تو اب تک زمانہ نہ معلوم کب کا بند ہو چکا ہوتا۔ نظر۔ سرور۔ احسن۔ زمانہ نے جس محنت و محبت سے کام کیا ہے اسکی یاد ابھی دلی سکون و مسرت کا سرمایہ ہے۔ اسوقت بھی زمانہ کی زندگی زیادہ تر اعزازی کام کرنے والوں پر منحصر ہے مگر یہ حالت کوئی اطمینان بخش حالت نہیں کہی جاسکتی اور جب تک زمانہ خود اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کشمکش کے دور میں وہ اپنے مستقل کام کرنے والوں کی روزمرہ ضروریات کا کفیل ہو سکے اسکی زندگی معرض خطر ہی میں رہیگی۔

ایسی صورت میں جبکہ انسانی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اور خانگی حادثات نے ناچیز ایڈیٹر کی ہمت و قوت میں بھی فرق ڈالدیا ہے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ زمانہ کے قدردان اس کو اس قابل بنادیں کہ یہ خیر جاری کی طرح عرصہ تک بلا منت ملک کی ادبی خدمت کرتا رہے۔ اس کے خاص احباب مدہوش۔ فراق۔ سہیل سلیم سوریہ۔ تاب۔ جوش اور کلام کو امکانی امداد سے کبھی دریغ نہ ہوگا لیکن انکی امداد بھی اسیوقت فائدہ بخش ہو سکتی ہے جب زمانہ کی مالی حالت تھوڑی سی بہت قابل اطمینان ہوجائے اور یہ اپنا اور اپنے مستقل کام کرنے والوں کا بار خود اٹھا سکے یا کوئی باضابطہ جماعت یا بلند مرتبہ ہستی اسکی اشاعت کی ذمہ دار ہوجائے بعض احباب کی تجویز ہے کہ ۔۔۔ ذمہ داری کے اصول پر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کردی جائے اور وہی اس کی اشاعت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لیلے۔ بعض اصحاب کی رائے ہے کہ اس کے لئے کچھ فنڈ اکٹھا کرکے ایک انتظامی بورڈ کے سپرد

کردیا جائے، اس سلسلے میں پچھلے سال ایک علم دوست مہربان نے خود پانچسو روپیہ دے کر زمانہ کا امدادی فنڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن ہم کو بذات خاص اس تجویز کی کامیابی میں شبہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کی تحریکیں لبند پایہ سرپرستی اور خاص سرگرمی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتیں اور یہاں ان دونوں باتوں کی کمی ہے۔

عرصہ ہوا ایک جلیل القدر علم دوست حاکم صوبہ نے زمانہ کے لئے ہندوستان کی ایک بڑی ریاست سے سرپرستی کی تحریک کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اُسوقت یہ تجویز گوارا نہوئی اب ضرور کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جب ذاتی نفع کا سوال نہیں ہے تو اس قسم کی امداد لینے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہیئے تھا کم سے کم اس کی بدولت وہ بیش بہا ادبی خزانہ جو زمانہ کی پرانی جلدوں میں کس مپرسی کی حالت میں دفن پڑا ہے منظر عام پر لایا جاسکتا تھا یہ علمی سرمایہ اردو ادب کو بہت کچھ مالا مال کرسکتا ہے۔ لیکن یہ قصہ پرانا ہے اور اس قسم کے اور بھی کئی قصے ہیں جنکے بیان کا اسوقت موقع نہیں ہے۔ بہرحال اسوقت زمانہ پبلشنگ کمپنی کے علاوہ اور کوئی قابل عمل تجویز سامنے نہیں ہے زمانہ اور ہفتہ وار اخبار آزاد کا (جو ۲۸ سال سے زمانہ کے اصولوں پر شایع ہورہا ہے)۔ جاری رکھنا پچھلی جلدوں کے منتخب مضامین اور دوسری مفید کتابوں کی اشاعت کا کام یہ کمپنی اپنے ذمے لے سکتی ہے اسی سلسلے میں دفتر زمانہ کے ساتھ اردو کی ایک پبلک لائبریری بھی قائم کی جاسکتی ہے جسکی بنیاد کے لئے ایڈیٹر زمانہ کا ذاتی کتب خانہ موجود ہے اس تجویز میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ اس قسم کی تحریک کی کامیابی کے لئے بہت سے ہمدردوں کی امداد کی ضرورت ہے۔ ہم امداد اس لئے کہتے ہیں کہ اس قسم کی کمپنی کے حصہ دار عرصہ تک کسی مالی نفع کی امید نہیں کرسکتے ہاں انھیں اسبات کا اطمینان ضرور حاصل ہوگا کہ انھوں نے تھوڑے سے ایثار سے ایک مستحق ادبی تحریک کی مستقل امداد کردی۔ بہرحال دس روپیہ کے پانچہزار یا ۱۰۰ روپیے کے پانچسو حصے بک سکیں تو یہ کمپنی قائم ہوسکتی ہے

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے قدر دان زمانہ کو اس امداد کا مستحق سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اور ہم ان سے زمانہ کے استحکام و استقلال کیلئے کچھ مالی ایثار کی درخواست کرنے میں حق بجانب ہیں یا نہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس تجویز میں ذاتی نفع کا خیال نہیں ہے اور ہم خود زمانہ کی امکانی خدمت کے لئے حسب سابق آیندہ بھی بلا خیال معاوضہ تیار ہیں۔ ہمارے بعض خاص احباب کا اصرار ہے کہ اس قسم کی کمپنی قائم کرنے کی کوشش ضروری ہے۔

ہم ناظرین زمانہ سے فرداً فرداً اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں مناسب غور و فکر کے بعد ہمکو اپنی رائے سے مطلع کریں سب سے پہلے ہمکو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ زمانہ کے قدردان اسکی زندگی قائم و برقرار رکھنے کے لئے کیا امداد دے سکتے ہیں اگر دس دس روپیہ کے حصے قرار دیئے جائیں تو ہمارے مہربان اگلی فرصت میں ہمکو بتلائیں کہ وہ کتنے حصے خرید سکتے ہیں انہیں کے جوابات پر اس تجویز کے متعلق فیصلہ کیا جاسکتا ہے

زمانہ کی توسیع اشاعت کا مسئلہ بھی ہمدردان رسالہ کی فوری توجہ کا محتاج ہے - کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنے علم دوست احباب میں کم سے کم دو اصحاب کو زمانہ کا خریدار بننے کی سفارش کریں - اس طریقے سے بھی زمانہ کو بہت کچھ مدد پہونچ سکتی ہے اور جنگ کا زمانہ جب کہ کاغذ اور تمام سامان طباعت گراں ہو رہا ہے آسانی سے کٹ سکتا ہے - اس وقت انھیں وجوہ سے اسکی ترقی کی بہت سی اسکیمیں رکی ہوئی ہیں -

بہرحال ہم یہ درخواست رسمی طور پر نہیں کر رہے ہیں بلکہ زمانہ کو واقعی اپنے سب ہمدردوں کی عنایت و اعانت کی ضرورت ہے - ہم کو امید ہے کہ ہماری درخواست بے اثر نہ رہیگی اور نیا سال "زمانہ" کے لئے مبارک ہوگا - خدا کرے ناظرین زمانہ کو بھی نیا سال مبارک ہو

ایڈیٹر

اطلاع ضروری

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اس نمبر سے ختم ہوگیا اور اب آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی ہے اس لئے اُن سب صاحبان سے درخواست کی جاتی ہے کہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے دس دن کے اندر "زمانہ" کا آیندہ سالانہ چندہ مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں - ورنہ جنوری ۱۹۲۱ء کا پرچہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (.V.P.P) ارسال ہوگا -

(۱) جن صاحبوں کا حساب جولائی یا دوران سال کے کسی دوسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُن کی قیمت وصول ہونے سے باقی رہگئی ہے وہ بھی براہ عنایت ۲۲ جنوری ۱۹۲۱ء تک رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری ۱۹۲۱ء کا پرچہ سالانہ چندہ کیلئے وصول طلب پارسل (.V.P.P) سے روانہ ہوگا -

(۲) جن صاحبان کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہو وہ براہ کرم اس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں، تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۲۱ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر زمانہ صرفہ ڈاک کے نقصان سے محفوظ رہے -

(۳) باقیدار اصحاب جو آیندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے عندیہ سے مطلع فرمائیں -

نوٹ: - منی آرڈر بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ مع نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں تاکہ رقم مرسلہ صحت کے ساتھ درج حساب ہوسکے -

منیجر "زمانہ" کانپور

خطوط محمد علی

یہ اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور ملک کے سربرآوردہ حضرات کو لکھے تھے ان میں سے چند خطوط اخبارات و رسائل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اور بقیہ "محمد علی میوزیم" کتب خانہ جامعہ سے لئے گئے ہیں۔

کسی شخص کے خط صحیح معنوں میں اسکی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں وہ جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ اُس کے دل پر گذرتی ہے۔ بلا تکلف اپنے دوستوں کو لکھ دیتا ہے۔

مرحوم جو بزرگوں کے وفادار اور نیازمند، دوستوں کے جاں نثار اور عاشق زار بے باک، اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرے، حق کی خاطر اپنے اور بیگانے دونوں کی پروا نہ کرنے والے اور مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم تھے۔ کا یہ حال تھا کہ وہ سیاست تک میں زمانہ سازی اور ظاہرداری کے قائل نہ تھے۔ اور اپنے دوستوں کو لکھنے میں تکلف نہ برتتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ خطوط ایک ہنگامہ خیز دور کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اُس محمد علی کی تصویر ہیں۔

صدر دفتر مکتبہ جامعہ قرول باغ نئی دہلی

شاخیں:- ۱ مکتبہ جامعہ، جامع مسجد دہلی ۲ مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور ۳ مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ ۴ مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی

۱ کتب خانہ، عابد شاپ حیدرآباد دکن

ایجنسیاں:- ۲ سرحد بک ایجنسی، بازار قصہ خوانی پشاور

پرنٹر خواجہ عبدالوحید انتظامی پریس کان پور

ایڈیٹر و پبلشر، منشی دیا نرائن نگم

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقا، مجلس انتظامی،
مجالس شعبہ جات نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ
اور اراکین دارالترجمہ دس کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۳۔ طیلسانین رجسٹر شدہ دو کتابیں بی۔ اے۔ اور انٹرمیڈیٹ
کے طالب علم تین کتابیں ایم۔ اے۔ ال ال۔ بی و تحقیقاتی جماعتوں کے
طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب
ایک آنہ یومیہ فی کتاب دیرانہ لیا جائیگا۔

۵۔ بشرط موقع کتابیں مکرر جاری کی جاسکینگی مگر اس غرض کے
لیے کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہوجائیں تو مستعیر پر ذمہ داری
عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان سیاہی یا پنسل سے
نہ لگایا جائے۔

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں
جاری نہ کیجا سکینگی فقط